[illegible]

سلسلۂ دار المصنفین

(۹۹)

حیاتِ شبلی

یعنی

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے

از

سید سلیمان ندوی

فہرستِ مضامین

حیاتِ شبلیؒ

مقدمہ

۱ - ۵۷

اعظم گڈھ اور اس کے اطراف

۵۰ — ۵۷

ولادت اور تعلیم و تربیت

۵۸ — ۹۱

مضمون	صفحہ

سیاسیات

۵۰۵ - ۹۳۶

مراثی وقطعات

۴۳۵ - ۴۳۹

فہرست رجال حواشی

"حیات شبلی"



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ شبلی

پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراقِ سوانح ہیں جس نے تیس برس (سنہ ۱۸۸۴ء سنہ ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پُرشور رکھا۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود — زیں نوا ہا کہ درِیں گنبدِ گرداں زدہ است

سوانح کے ذرائع علم | خاکسار نے استاد مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس (سنہ ۱۹۰۵ء سنہ ۱۹۱۴ء) تک مسلسل گذارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں اور رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، یہ دس برس درحقیقت ان کی تیس برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے، بلکہ ان ہی کو ان کی ستاون برس کی زندگی کا حاصل کہا جا سکتا ہے خود ان ہی کا شعر[1] ہے:

ساغرِ زندگیم حیف کہ جز دُرد نداشت — جز ہمیں جرعۂ آخر کہ بہ پیمانہ زدہ ام

ان کے اس مصروف ترین حصۂ زندگی کے اکثر لمحات میری نظر کے سامنے گذرے ہیں، اس لئے اس کے از روئے علم بقدرِ بشری مجھے پوری واقفیت ہے اور اس واقفیت نے اس کتاب کی تالیف میں مدد دی۔

[1] مولانا کا شعر ہے اصل میں زدہ ام ہے۔

مولانا کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے واقعات، اُن کے اعزہ و احباب اور ان کے ابتدائی شاگردوں سے پوچھے اور ان کے تعلیمی حالات خود مولانا کی زبان سے وقتاً فوقتاً سنتے رہا، علی گڈھ کے قیام کے وقت کا بڑا حصہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پڑھنے اور ان سے بہم پہنچا، اور ان کی پوری زندگی کا خاکہ ان کے مکاتیب کے مرقع میں بہ آسانی مل گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ راقم رسالہ کو اس زمانہ کے قریب [illegible] مولانا کی زندگی ہی میں [illegible] میں ان کے خطوط و مکاتیب کے جمع کرنے کا خیال آیا، اور اس وقت اس کا مقصد خطوط کے علمی و ادبی ذخیرہ کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی سوانحعمری کا خیال آیا تو نظر آیا کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ان مکاتیب کی تالیف و اشاعت کے ذریعہ درحقیقت صاحب مکاتیب کے سوانح زندگی کے ذخیرہ کو میرے ہاتھوں بلاقصد و ارادہ پہلے ہی سے محفوظ کرا دیا تھا، اسی طرح مولانا کے سوانح کی تالیف، واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتیب کی یہ دونوں جلدیں بے حد کارآمد ہوئیں، اور اسی لئے سوانح و واقعات کے ذکر میں مکاتیب کے خط کا حوالہ نمبر اور تاریخ کے تعین کے ساتھ دیا گیا ہے، تاکہ ہر شخص بہ آسانی واقعہ کی تحقیق کر سکے، اور اس نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ حیات شبلی درحقیقت مولانا شبلی کی خود نوشت سوانحعمری ہے۔

بڑی تسکین اس سے ہوئی کہ بحمد اللہ اس وقت ہمارے درمیان مولانا کے ایک صاحب اکرم اور ان کی زندگی کے اکثر واقعات کے شریک و مشیر و ہمدم جناب نواب صدیار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی موجود ہیں جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی، اسی طرح مولانا

کے علی گڈھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین صاحب سے قیام علی گڈھ اور تعلقات تحریر کے واقعات کی تفتیش کی گئی، انھوں نے مری فرمائش پر کچھ واقعات لکھ کر بھی بھیجے۔

مولانا کی زندگی میں ان کی سوانح عمری کا خیال

میری یہی، مجھے مولانا کی زندگی تک کبھی یہ وہم بھی نہیں آیا کہ یہ ہستی مقدس جلد ہمارے درمیان سے اٹھ جائے گی۔ اس لئے ان کے سوانح حیات کے قلم بند کرنے کا خیال بھی نہیں ہوا۔ البتہ بعض دوسرے لوگوں کو ضرور اس زمانہ میں ادھر توجہ ہوئی لیکن ان کے جواب میں مولانا نے کسی کو اپنی حیات کی مختصر سی کیفیت لکھ کر بھیج دی۔ اور کسی کو کچھ کہہ کے ٹال دیا۔ چنانچہ رسالہ ادیب الہ آباد کے ایڈیٹر شاکر صاحب میرٹھی نے اپنے رسالہ میں چھاپنے کے لئے کچھ حالات لکھ کر بھیجنے کی درخواست کی تو جواب میں لکھا: "یہ بوالعجبی ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھ کر بھیجوں۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک صاحب کچھ واقف تھے، وہ آپ سے ملتے تھے، ان کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ جانتے ہیں، وہ لکھیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔" (مکاتیب اول مکتوب الیہ نمبر ۳۵)

لیکن نہ مجھے لکھا گیا اور نہ میں نے لکھا۔

مسلم ریویو الہ آباد کے جس مضمون کا حوالہ ہے وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے جو انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے، اور مولانا سے شخصی طور پر واقف تھے، یہ مضمون اگست ۱۹۲۶ء کے رسالہ مسلم ریویو الہ آباد میں چھپا تھا اس مضمون کے لئے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوا دیئے تھے، جو تعلیم و سفر و قیام علی گڈھ کے چند سرسری واقعات پر مشتمل ہیں۔

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات دریافت کئے تو ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم کچھ قیام علی گڈھ اور کچھ اپنی تالیفات و اداروں کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا، اور آخر میں فخر کر یہ لکھ دیا کہ "خود اپنا آپ کیا گاؤں"۔

مولانا کی ترتیب سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہشمند منشی سید اقتدار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے، شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ جس طرح انھوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی لائف لکھی ہے (یعنی) اس طرح لکھی ہے کہ طرز انشاء کے پہچاننے والوں کو وہ بظاہر خود صاحب سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں انھوں نے خود مولانا سے خواہش کی، مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا، چنانچہ مولانا ابو الکلام کو لکھنؤ سے ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو وہ لکھتے ہیں "یہاں اور منشی اقتدار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی کو وہ باتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگتے ہیں، میں نے لکھا ہو کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ مل جائیں گے، لیکن عالم الاسرار خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوا لیجئے، بھی بتاؤ تو وہ دے لگے، لا کھیں تو کس کو خوشی ہوگی" (مکاتیب ابو الکلام۔ ۳)

منشی سید اقتدار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہیں آئے

ا یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپا ہو۔ ۲ عالم اسرار تو خدا کے سوا کوئی اور نہیں، مگر یہاں مقصود بعض مخفی حالات کا علم ہے۔ (س) ۳ اس فقرہ سے، مشکل اور ترتیب کا مفہوم سمجھا جائے، مقصود یہ ہو کہ منشی صاحب مرحوم صرف اردو فارسی کا علم رکھتے تھے، گو خوش سلیقہ اور سنجیدہ تھے، تاہم سوانح پر لکھنے کے لئے علوم اور فنون کا سیہ اور ادب تاریخ پر اطلاع ضروری تھی، اس لئے مولانا کا خیال تھا کہ وہ ان کی سوانحمری کے غرض سے

[illegible]

چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا، انھوں نے ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا:- "میری لائف میرے بعد لکھیے گا، زندگی میں لائف کیونکر ہوگی" (مکاتیب ج ۱ مکتوب نمبر ۳۳)

یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے دس ہی مہینوں کے بعد کاتب کی لائف یعنی زندگی واقعۃً پوری ہو جائے گی، بہرحال منشی صاحب موصوف نے مولانا کے اس جواب کے بعد مجھے گھیرا کہ میں مولانا کے قلم سے اُن کی خواہش کی تکمیل کرا دوں اور اسی غرض کے لئے انھوں نے فروری سنہ ۱۹۱۳ء میں مجھے یہ خط لکھا، میں نے مولانا سے ان کی سفارش کی تو مجھ کو جواباً ارشاد ہوا: "منشی صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہو تو تم ہی لکھنا" (مکاتیب سلیمان ج ۲)

ہائے! ان کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف کیسی پوری ہوئی، سچ مچ میں دنیا کے اور کاموں سے آخر فارغ ہی ہو کر ادھر متوجہ ہوا،

وفات کے بعد ان کے سوانح پر مضامین اور رسالے

راقم نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے مختصر حالات پہلے تو الغزالی کے ایک نئے اڈیشن میں جو اسی زمانہ میں رحیم المطابع لکھنؤ میں چھپ کر تمام ہوا تھا، بطور دیباچہ کے لکھے، پھر اسی کو معارف اگست سنہ ۱۹۱۶ء میں چھاپ دیا، اور مولانا کے مرض الموت کے حالات، وفات اور آخری احوال پر مسلسل تین مضمون فروری سنہ ۱۹۱۵ء کے زمیندار لاہور میں لکھے، مولانا کے دوسرے قدیم احباب وغیرہ میں سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء میں، مولوی عبد الحلیم صاحب شرر نے اپنے دلگداز میں، خواجہ غلام الثقلین صاحب نے اپنے رسالہ عصر جدید مورخہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں، سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے رسالہ اردوئے معلی

میں اور مولانا عبداللہ عمادی نے زمیندار مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء میں، اور بہت سے اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں نے ان کے حالات، مرثیے اور نوحے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھے اور شائع کئے، مگر ان میں استناد کے قابل یہی تین چار، اوّل الذکر مضامین ہیں، اور اُس وقت سے لیکر اس وقت تک مولانا کے حالات کے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اُس کا ماخذ زیادہ تر پہلا اور کچھ دوسرا اور تیسرا اور چوتھا مضمون ہے۔

اُن کی سوانحعمری مستقلاً لکھنے کی کوشش سب سے پہلے منشی محمد مہدی صاحب نائب مہتمم تاریخ بھوپال نے کی، انھوں نے تیسیر پاشا سیرزادہ کے ضمن میں مولانا کے حال میں ۱۹۲۵ء میں ایک رسالہ تذکرۂ شمس العلما مولانا شبلی کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔

حیاتِ شبلی کی ترتیب کا آغاز و انجام

خاکسار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی حالات کے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق و شریک کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کے متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کردیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مولانا مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے، ال ال بی، ایم ال اے وکیل اعظم گڈھ کے سپرد کیا گیا، کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو

اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڈھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زورِ قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی۔ ان کا یہ مضمون "سیرتِ شبلی" کے عنوان سے الاصلاح سرائے میر میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا، اس کے بعد وہ شبلی کی عمری اور اس کے سیاسی فرائض میں ایسے الجھے کہ پھر سیرتِ شبلی کے مسودہ کو تمام کرنے کے لئے وہ مناسب وقت و فرصت کا انتظار ہی کرتے رہ گئے

اسی ریت و لعل میں سالہا سال گذر گئے، اس اثنا میں مولانا کے بہت سے احباب اور ان کے سوانح کے مطالعہ کے مشتاق اسی اشتیاق میں چل بسے، یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء آگیا، یعنی مولانا کی وفات اور دارالمصنفین کی بنیاد پر پچیس پچیس برس گذر گئے، احباب کا تقاضا ہوا کہ دارالمصنفین کی پچیس برس کی سلور جوبلی منائی جائے، میرا اصول یہ ہے کہ

نمی روم بہ رہے کہ کارواں رفتست

اس پامال رسم کو چھوڑ کر یہ خیال آیا کہ اس جوبلی کی یادگار میں خود موضوعِ جوبلی یعنی مولانا شبلی کی سوانح عمری کا وہ کام کیوں نہ انجام دیدیا جائے جو سالہا سال سے فرصت کے انتظار میں پڑا ہے، چنانچہ بسم اللہ کر کے ۱۹۴۰ء میں اس کا آغاز کر دیا، آخر تین برس کی محنت میں ۱۹۴۳ء میں یہ انجام کو پہنچا، اور اسی زمانہ میں اس کی چھپائی بھی شروع ہوگئی، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس طرح صاحبِ سوانح کی وفات ۱۹۱۴ء والی یورپ کی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی ان کی یہ سوانح عمری کی تالیف بھی ۱۹۴۳ء والی جنگِ عظیم میں واقع ہوئی جس سے زیادہ مقداروں میں کاغذ کے ملنے کی دقت ایسی ضخیم کتاب کی چھپائی میں بارج ہوتی رہی، اور آخر کی

بکسی شخص سے یہ مشکل حل ہوئی، اور چھپنے کی صورت نکلی،

معاونوں کا شکریہ میں آخر میں اپنے اُن تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں مجھے مدد دی، بالخصوص مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا جن کے مجموعہ اوراق کے سبب سے مکاتیب کی ورق گردانی اور کاغذات اور مسودات کی تلاش کی مصیبت سے بہت کچھ نجات ملی، اور مولوی اقبال احمد سہیل صاحب کا جن کی تحریر سے اعظم گڈہ کے بعض علمی واقعات اور مولانا کے خاندانی اور ابتدائی حالات کے جاننے میں بڑی مدد ملی، اس کے بعد محبی منشی محمد امین صاحب زبیری کا جو علی گڈہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے پرانے فائلوں سے بہت سی مفید تحریریں نظمیں اور واقعات نقل کر کرکے مجھے بھیجتے رہے،

سب سے زیادہ مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ کے ان آٹھ سو صفحوں کو بڑی محنت سے حرف حرف پڑھا اور کہیں کہیں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر کچھ کچھ بڑھایا، اور اس طرح میرے بیانات پر اپنی ذاتی واقفیت کی مہر سے گویا توثیق کی، فلِلّٰہ الحمد،

حیاتِ شبلی کے مقصد و مقتضا خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانحِ عمریوں کے مجموعہ اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اُس کو بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ اُلجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے، اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے

تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں، اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا
کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہیں کیونکہ
محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے
وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے اُن ہی پر پڑتی ہیں، اور اُن کے تکرار و اعادہ میں
اُن کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں
باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہیں، اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں

فعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ   ولکن عین السخط تبدی المساویا

رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے
بہرحال شبلی شبلی تھے، جنید و شبلی نہ تھے۔

عہد جدید کا عالم اول | مولانا کا رنگ ان قدیم علماے دین کا نہ تھا جن کا پاک مشغلہ صرف
خانقاہوں میں رشد و ہدایت اور مدرسوں میں درس و تدریس ہو، اگر ایسا ہوتا تو ایسے بزرگوں
کے تذکروں کے لکھنے کا جو پرانا دستور چلا آتا ہے تذکرہ نگار کو اس سیدھے رستہ پر چلنے میں
کوئی دشواری پیش نہ آتی، بلکہ یہ عہد جدید کے سب سے پہلے عالم کی زندگی کے سوانح ہیں جن میں
قدیم کے ساتھ ایسے جدید رجحانات بھی پہلو بہ پہلو ہیں جو عہد قدیم کی مانوس نگاہوں میں کبھی
کبھی کھٹک پیدا کردیتے ہیں، کیونکہ ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی اس لئے وہ
قدیم و جدید کے ایک ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے
مرج البحرین یلتقیان، اور اسی لئے اُن کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علماے دین کے کارناموں

سے نہیں مختلف ہیں، وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید علوم کے بہت سے آراء و خیالات سے واقف بھی تھے، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں بھی رہے تھے، ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاپرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے، اور نئے زمانہ کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے، اور یہ سب گوناگوں رنگ اُن کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں، جن کی تفصیل ان اوراق میں نظر آئے گی،

کتاب کے ضمنی مباحث اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانحعمری نہیں، بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضرور تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں دیارِ مشرق میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہو جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے،

تصویر رسمِ زمانہ کے مطابق عام لوگوں کو اس میں صاحبِ سوانح کی عکسی تصویر بھی ضروری معلوم ہوتی ہوگی، مگر لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے ان کی جو سچی اور اصل تصویر اس پوری کتاب میں نظر آتی ہے، وہ اس فریب نظر والے گناہ بے لذت رسمی تصویر سے زیادہ پائدار اور زیادہ قیمتی ہے، البتہ اس کی کوشش ہے کہ ان کی جسمانی فانی تصویر کے بجائے ان کے باقیات

صالحات کاموں کی تصویر سے ان اوراق کو مزین کیا جائے، یعنی ان عمارتوں کی تصویریں دیدی جائیں جن میں ان کے اعمال صالحہ اور صدقات جاریہ مجسم ہیں،

کتاب کا نام کتاب کا نام بھی خود صاحب سوانح کا فیض انتخاب ہے مولانا ابوالکلام کے نام والے اوپر کے خط میں حیاتِ شبلی خود ان کے قلم سے نکلا ہے، اور پسند کے قابل ہے،

محسن کی شکرگذاری اس حیات شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح استاد مرحوم کے احسانات کے بارے میں سبکدوش ہوگیا تو یہ ناشکری ہوگی، کیونکہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، اور اُن کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہی ہے، سب سے اوّل یہ کہ انھوں نے اس بے مایہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استطاعت کے بموجب دین وقت کی کوئی خدمت بجا لاسکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو طالب علم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دستگیری فرمائی کہ حصول علم اور شوق مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا، اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم وفن کے آستانہ پر لاکر کھڑا کردیا، اور سب سے آخر یہ کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بشکل وصیت اس کو سرور کائنات، فخر موجودات، رحمتِ عالم، سید اولاد آدم **محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کی سرکار اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اوّل پہنچا یا یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع وتنقید اور تالیف وتحقیق کی خدمت ابتدا ہی میں سپرد فرمائی، جو الحمدللہ یہاں اُس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے،

اور انشاء اللہ وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار لغزشوں کے باوجود حجاز کے بجائے ترکستان جانے کی غلطی اس سے سرزد نہیں ہوئی، اور ساری علمی و عملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اسی سایۂ رحمتؐ کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا، اور اس طرح سرکارِ مدینہؐ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہِ قبول کے قابل ٹھہرا اور تلافیِ مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا، ع

حلِ ایں نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد

ہیچمدان سلیمان

۲۵ محرم ۱۳۶۲ھ

۲ فروری ۱۹۴۳ء



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حیاتِ شبلی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین

اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ حنیف کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس وعدہ کا پورا ہونا بالکل یقینی ہے، لیکن اس کے یقینی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس کے لئے ظاہری تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ اس کی یہ تدبیر بھی فرماتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق ایسے اشخاص پیدا فرماتا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرکے دینِ الٰہی کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کام کبھی کبھی ایسوں سے بھی لیا جاتا ہے جو اپنے ظاہری اعمال کے لحاظ سے اس کے مستحق بھی نہ تھے،

داد او را قابلیت شرط نیست ۔۔۔ بلکہ شرط قابلیت دادِ اوست

ہر مسلمان سپاہی جنید و شبلی نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہی ایک کام کہ خدا کی راہ میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی جنت کا دروازہ اس کے لئے فوراً کھل جاتا ہے،

پچھلی صدیوں میں جو کچھ پیش آیا اور ہر دور میں اسلام کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت اور وقت کی دینی ضرورت کے مطابق اشخاص جس طرح پیدا ہوتے رہے، ان کے حالات تاریخ کے صفحوں میں مذکور ہیں، خود ہندوستان میں دیکھئے کہ گو آل تیمور سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت سے فائدے پہنچے، مگر ان کے بعض فرمانرواؤں کی کوتہ اندیشی سے دو رخنے بھی پیدا ہوگئے، ایک یہ کہ ایرانی امراء کو سلطنت میں اقتدار حاصل ہوگیا، اور دوسرا یہ کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے ان کی بہت سی مذہبی رسموں کو علی الاعلان قبول کر لیا گیا، آخر ان ہی دونوں رخنوں سے وہ سیلاب آیا جس نے ان کو بھی ڈبو دیا اور اسلام کی بنیادوں کو بھی درہم برہم کر دینا چاہا، لیکن اس وقت سرہند و دہلی کے دو خانوادوں سے وہ اشخاص پیدا ہوئے، جنھوں نے ان فتنوں کے منہ بند کئے اور اسلام کے قلعہ کو اس سرزمین میں از سر نو محفوظ کیا، تیموریوں کا دور جب ختم ہوا، اور سکھوں نے سر اٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خاندانوں سے وہ اکابر اٹھے جنھوں نے پورے ہندوستان کو جگا دیا، اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغ دین کا ولولہ پیدا کر دیا،

انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا، عیسائی مشنریوں نے اپنی نئی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیئے

دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پاکر ان پر حملہ کی جرأت پائی، اور سب سے آخر میں یورپین علوم وفنون وتمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی، خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مولانا رحم علی صاحب منگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے، اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو ردِّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں، اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف، اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل، اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود اُن ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابلِ شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا،

آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائیدِ غیبی ہی کا نشان تھا، اور پھر جس طرح عقائدِ حقہ کی اشاعت اور ردِّ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا، اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں

یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانینِ فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کئے، ان کا اصل جواب تو وہ علماء دے سکتے تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح جو قدیم فلسفہ میں ماہر تھے، اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف ہوتے، مگر بہرحال مالایدرک کلہٗ لایترک کلہٗ، کہ اگر پیدا نہ ہو سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق اُن ہی لوگوں میں سے جو گو نیم عالم تھے، لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے علوم و خیالات سے کچھ کچھ واقف تھے، سر سید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا، اور ان سے بہتوں کو ایک معنی کر فائدہ بھی پہنچا، لیکن چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں، اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بہ مراحل دور تھیں، ان کی غلطیوں کا سبب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ وہ اپنے زمانہ کی طبیعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی مان کر مسائلِ شرعیہ کو اُن کے مطابق کرنے لگے اور یہ وہی غلطی تھی جس میں بہ مقابلۂ فلسفۂ یونان تیسری اور چوتھی صدی میں باطنیہ فرقہ کے علماء اور مصنفین مبتلا ہو چکے تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ علماء و فلاسفہ جو کچھ کہتے ہیں وہی انبیاء اور رسل علیہم السلام کہتے ہیں، اس لئے دونوں میں ایسی تطبیق دی جائے کہ انبیاء کا کلام کسی نہ کسی تاویل سے عقل و فلاسفہ کے خیال کے مطابق ہو جائے، لیکن متکلمین اہلِ سنت نے یہ غلط راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ

یہ کیا کہ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا اُس کو قطعی و یقینی مان کر عقل و فلاسفہ کے ان مسائل کی جو قطعاً مخالف تھے، دلائل سے غلطی ثابت کی، اور جو کسی قدر تصحیح سے صحیح ہو سکتے تھے، اس کی تاویل کر دی، اور جو تمام تر مطابق تھے یا کم از کم مخالف نہ تھے، یا انبیاء علیہم السلام نے اُن سے نفیاً یا اثباتاً بحث ہی نہیں کی تھی، ان کی توثیق کی،

اس سے آگے بڑھ کر ایک اور دور آیا، جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے، اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے،

مولانا شبلی مرحوم کا کام متعدد وجوہ سے اہمیت خاص رکھتا ہے، مرحوم جن معترضین کے جواب کے لئے اٹھے وہ ان پڑھ منبریوں میں نہ تھے اور نہ مناظرانہ یا الزامی جواب ان کے لئے کافی تھے، ان کے جواب دینے کے لئے ضرورت یہ تھی کہ ایک ایک کونہ سے نادر کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی کی جائے، ان کے بتائے ہوئے حوالوں کی غلطی اور کمزوری بتائی جائے اور اس کے بالمقابل اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و تمدن کے شاندار واقعات اور اہم کارناموں کو ابنائے زمانہ کے سامنے لایا جائے، تاکہ اسلام کی تاریخی و تمدنی عظمت اور علمی جلالت سب کے سامنے آجائے جس سے قوم کے افسردہ دلوں میں از سرِ نو تازگی اور امنگ بھی پیدا ہو، اور دشمنوں کو اپنے اعتراضات

کی بے مائگی کا بھی اندازہ ہو،

مرحوم کا مقصدِ زندگی اگر یہیں تک ختم ہو جاتا تو بھی کام نسبتہً ہلکا ہوتا، مگر اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پوری کرتا رہے، یہی دو چیزیں ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہیں، اور اُن ہی کی تفصیل اس کتاب کی غرض و غایت ہے،

اس دوسری غرض کے لئے اُنھوں نے ایسے پرزور مضامین لکھے اور تقریریں کیں جن سے یہ ثابت ہو کہ ہماری عربی تعلیم کا پرانا نصاب اصلاح کا محتاج ہے، اور ہمارے علماء کو زمانہ کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہئے، شروع شروع میں ہر نئی تحریک کی طرح اسکی بھی مخالفت کی گئی، اور شدید مخالفت کی گئی، مگر جب لکھنؤ میں دار العلوم کی بنیاد ڈال دی گئی اور اس کے نتائج سامنے آنے لگے تو رفتہ رفتہ مخالفت کی آواز دھیمی پڑتی گئی، اور مولانا اور مولانا کے تلامذہ کے ہاتھوں حیدرآباد سے بہاول پور تک، اور خاص طور سے صوبہ ہائے متحدہ اور بہار کے مدرسوں اور ڈھاکہ اور حیدرآباد کے مشرقی و دینی شعبوں میں عظیم الشان اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں، یہاں تک کہ اب صوبۂ متحدہ کی مقدس مذہبی درسگاہوں تک اُس کے اثرات پہنچ رہے ہیں،

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء کے وجود سے پہلے ہی اس کے متعلق سب سے پہلی آواز سفرِ روم و مصر و شام میں ۱۸۹۲ء ۱۳۰۹ھ میں اٹھائی تھی، اور ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ اور مصر کے

مذہبی مدرسوں اور خاص طور سے جامع ازہر کے نصاب و طریق تعلیم و تربیت پر بڑی دلسوزی
سے افسوس و حسرت کے آنسو گرائے، افسوس کے یہ قطرے بے اثر نہ رہے، اس کے چند سال بعد
سنہ ۱۹۰۵ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی، اس کے متعلق سید رشید رضا
اڈیٹر المنار مصر نے مسلسل مضامین لکھے، ۳۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۲۱ھ کے المنار میں اپنی اصلاحی
تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نامور علماء کے نام سنداً پیش کئے وہ یہ تھے
شیخ احمد جان روسی، شیخ شنقیطی مغربی (مراکش) اور شیخ شبلی نعمانی ہندی، اس کے بعد اگر
سنہ ۱۹۱۳ء کی تحریک جامعہ مدینہ کی کامیاب ہو جاتی تو اصلاحِ مدارس کی یہ تحریک ساری
دنیائے اسلام میں پھیل جاتی، مولانا اس ماحول میں جس کو ہندوستان میں تعلیم جدید نے پیدا
کیا تھا، ۱۴ برس کے قریب رہے تھے، ان کو خوب معلوم ہو چکا تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ
کس رخ پر ہے، اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم و فنون کا کیا حال ہوگا، اور جو شکوک و
شبہات اس تعلیم کی بدولت پیدا ہو رہے ہیں، ان کے جواب دینے کے لئے کس استعداد
کے علما کی ضرورت ہے، ساتھ ہی مصر و شام و ترکی کی سیاحت نے علماء کے جدید فرائض
کی ضرورتوں کو ان پر آئینہ کر دیا تھا، اور ان ہی وجوہ سے ان کو اپنی تحریک کی ضرورت کا
وہ شدید احساس تھا جو دوسرے علما کو نہ تھا،

اس اصلاحی تحریک کی دو دفعات پر مولانا کو بہ شدت اصرار تھا، ایک یہ کہ قدیم
یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں، دوسری یہ کہ علما، تعلیم
یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے جواب

غلطیوں کی اصلاح کے لئے انگریزی پڑھیں، اس سلسلہ میں دو واقعے مجھے یاد آئے، ایک دفعہ تنہائی تھی تو خاکسار نے عرض کیا کہ قدیم فلسفہ و منطق کی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے سے آپ کا مقصد کیا ہے، فرمایا: یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں اور نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علماء کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علمائے اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے ان مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا، اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں، اور نئے شبہات کے تحقیقی جواب دیں،

مجھے مولانا کی اس رائے سے کہ دار العلوم کے تمام طلبہ کے لئے انگریزی لازمی کیا جائے اتفاق نہ تھا، چنانچہ ایک دن موقع پا کر میں نے عرض کی کہ آپ مدرسہ میں انگریزی کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں، انھوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا دیکھ رہے ہو کہ نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے، اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اہل مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے، اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزوں کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا، اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی

اب بھی دیکھو جب مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے، تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل کے انگریزی ترجمہ سے بجھاتے ہیں، فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے، کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں ہے؟

یہ خیالات ان کے بیسیوں مضامین اور متعدد تقریروں میں بار بار دہرائے گئے ہیں، اور عباسیہ کے زمانہ میں علوم یونانی کی اشاعت اور علم کلام کی ایجاد سے اس کی اصلاح کی مثال برابر ان کے سامنے رہی، ایک تقریر میں وہ پوری تفصیل کے بعد فرماتے ہیں:

علماء کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہئے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے بخلاف ہیں، اور ان کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے، کیونکہ جب امام غزالی کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے، تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی حق تلفی کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے، اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک وشبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے، صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں، ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں، جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں، اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔" (خطبات شبلی صفحہ ۹)

اسی خیال کے بموجب انھوں نے خود سبقت کی اور اپنے بل بوتے کے مطابق قدیم علم کلام میں سے جدید علم کلام کے عناصر جمع کئے، اور الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام

اور الکلام میں اُن کو ترتیب دیا۔ مگر ان کتابوں میں دو قسم کی کمیاں محسوس ہوتی ہیں، ایک یہ کہ جدید علوم و مسائل سے اُن کی واقفیت بھی محض سُنی سُنائی ہی تھی، یا ثانوی درجہ کی تھی، اس لئے وہ ان مقامات کی پوری تحدید نہ کرسکے جہاں سے اسلامی مسائل پر زد پڑتی تھی، دوسری کمی یہ ہوئی کہ انھوں نے اسلام کے صحیح عقائد کو متکلمین و حکماء اسلام کی کتابوں سے چن کر یکجا کیا، حالانکہ ان کا اصلی سرچشمہ کتابِ الٰہی اور سنتِ نبوی تھی، اگر یہ دونوں چیزیں براہِ راست سامنے رکھی جاتیں، تو منزلِ مقصود کا صحیح پتہ لگ جاتا، اخیر زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ نے یہ نقطۂ نظر ان کے سامنے کر دیا تھا مگر تصنیفی عمل کا وقت گذر چکا تھا، البتہ سیرتِ نبوی کی تکمیل کا موقع اُن کو ملتا تو ضرور وہ اسکی تلافی کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور کہنی ہے کہ امام غزالی وغیرہ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے یونانی تراجم کو براہ راست درس میں داخل نہیں کیا، بلکہ ان علوم کو پڑھ کر انھوں نے خود یا دوسرے مسلمانوں نے ان علوم پر اپنی اسلامی طرز پر جو کتابیں لکھیں اُن کو علماء کے درس میں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ان علوم کو خود مسلمان بنایا، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دیا، مولانا کے سامنے بھی جیسا کہ اوپر کی تقریر میں ہے یہی چیز تھی، مگر افسوس کہ اس پر عمل اب تک اس لئے نہ ہو سکا کہ ان علوم کو علماء اب تک حاصل نہ کرسکے، اور ان کی ان کی تصنیفات کا زمانہ تو یہ مراحل دور ہے، تاہم جو اصل نکتہ ہے، وہ یہی ہے کہ پہلے ان جدید علوم کو مسلمان بنانا چاہئے، پھر ان کو مسلمانوں میں رواج دینا چاہئے، ورنہ نتیجہ اس کے وہی باطنیت اس زمانہ میں بھی پھیلے گی جو امام غزالی سے پہلے پھیلی تھی، بلکہ میں

کہتا ہوں کہ مختلف تحریکوں اور تصنیفوں کے ضمن میں وہ پھیل بھی رہی ہے،

یورپ کے اس نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے بہت کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہوگیا تھا، اس دور میں تاریخ نے وہ اہمیت پائی جو اس کو پہلے نصیب نہ تھی یہاں تک کہ اس کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کا جز اور علمی تحقیقات کا بڑا شعبہ بنایا گیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم ملکوں کی درسگاہوں میں اُن ملکوں کی تاریخ کو دھندلا کر کے دکھانا ضروری قرار دیا گیا، اور اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ وہ اپنی نسلی و قومی برتری کا اعلان کریں، اور اپنے مقابلہ میں اپنی محکوم قوموں کی تاریخ و تمدن کے روشن چہرہ پر ایسے نئے طرز سے ایسی سیاہی پھیر دیں کہ ان کو خود اپنے اسلاف سے آپ نفرت آنے، اور اہل یورپ کے کارناموں کے سامنے اُن کو اپنے مذہبی و تمدنی و سیاسی و قومی کارنامے پھیکے نظر آئیں اور اس طرح اُن کا مذہب جو اُن کی تمام تحریکات کی روح ہے، ہمیشہ کے لئے مردہ ہو جائے

اس کام کے لئے سب سے پہلے انھوں نے خود سرور کائنات علیہ السّلام والصلوٰۃ کی ذات پاک کو چنا اور اس کو اپنے ہر قسم کے اعتراضوں اور شبہوں کا مورد ٹھہرایا، اس کے بعد خلفاے راشدینؓ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور سلاطین اسلام رحمہم اللہ کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنایا اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی سلطنتوں کو طرح طرح سے ظالمانہ ثابت کرنے کے لئے سچ جھوٹ کسی سے دریغ نہیں کیا، اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور تمدنی کارناموں کو اتنا بگاڑ کر دکھانے لگے کہ خود مسلمان نئے تعلیم یافتوں کو اپنی تاریخ سے آپ گھن آنے لگی، اور مسلمان بچے جب اسکولوں اور

کالجوں میں زیر درس تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں پڑھتے تھے، تو شرم سے گردن جھکا لیتے تھے، اس طرح مسلمانوں کو طرح طرح کے علمی و سیاسی فریبوں سے خود اسلام سے برگشتہ کیا۔

چونکہ ہندوستان، مصر، مراکش، الجزائر، تونس وغیرہ اسلامی ملکوں میں ان یورپ والوں سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتیں تھیں، اس لئے اُن کے تاریک پہلوؤں کو دکھائے بغیر ان کے کارنامے چمک نہیں سکتے تھے، اس بنا پر مسلمان بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کو برا کہنا اور بُرا دکھانا ان کے مصنفوں کا سب سے بڑا فرض ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں دشمنوں کا یہ حملہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا، ہندوستان میں ان حملہ آوروں کے سب سے پہلے علم بردار ڈاکٹر اسپرنگر تھے، جو اُس زمانہ میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ کار بھی تھے، ان کے بعد صوبہ یوپی کے سابق گورنر سر ولیم میور صاحب بھی آئے، اور لوگ اسی طرح آتے رہے، انگلستان میں بھی یہ کام مدت سے انجام پا رہا تھا، اور انگلستان کے سوا فرانس اور جرمنی میں جن کو مشرق کی شہنشاہی کا دعویٰ تھا، یہ کام پوری مستعدی سے جاری تھا، ڈاکٹر جے اے مولر، ڈاکٹر وِل، وان کریمر، برتھالمی سینٹ ہیلیر، نولڈیکی، ولہاؤسن، گولڈزیہر، رینان وغیرہ یورپ کے فضلا باری باری سے اس کام کو انجام دیتے رہے، اور سب سے آخر میں انگلستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ صاحب اُٹھے، یہاں تک مصر و شام کے عیسائیوں نے بھی ان کی تقلید میں اس کام کو شروع کیا، جن میں سب سے زیادہ بدنام اہلال مصر کا اڈیٹر جرجی زیدان تھا، یہ لوگ مشنری نہ تھے، اور نہ مناظرہ پیشہ عیسائی واعظ تھے، بلکہ اُن کا شمار یورپ کے

فضلا میں تھا، یہ اپنے اغراضِ فاسدہ کے زہر پر ہمیشہ علمی تحقیقات کا غلاف چڑھایا کرتے تھے،
اور خود مسلمانوں ہی کی کتابوں سے کھوج کھوج کر اپنے کام کا سامان نکال لاتے تھے،
اور اس کے لئے سچ یہ ہے کہ وہ بڑی عرق ریزی کرتے تھے، نادر عربی کتابوں کی تلاش
و جستجو کرتے تھے، محنت کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان مسالوں پر اپنی تصنیف و تحریر کی بنیاد
ڈالتے تھے، اور اب بھی وہ اپنے ان کاموں میں اسی طرح مصروف ہیں،

ایسے ہوشمند حریفوں کے مقابلہ کے لئے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل
اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے ان ہی کے طریقہ تحقیق
اُن ہی کے اسلوب پر اُن کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی نسیم
جو ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور
ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی،

اس سلسلہ کا آغاز مولانا نے اپنی "گذشتہ تعلیم" سے کیا، جس میں دکھایا کہ مسلمانوں نے
علوم و فنون کو ترقی دے کر دوسری قوموں کی زبانوں سے کتابوں کو اپنی زبان میں ترجمہ
اور دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع درسگاہوں کو قائم کر کے دنیا کی ترقی میں کیا کارنامہ انجام دیا
ہے، پھر آگے چل کر معلومات کے اضافہ کے بعد اس مضمون کو متعدد عنوانوں میں تقسیم کر دیا

مسلمان بادشاہوں کے خلاف ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی سب سے
زیادہ نفرت انگیز پروپگنڈا جزیہ کے نام سے جاری کیا جاتا تھا یعنی وہ محصول جو مسلمان
بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے، اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت

میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا یعنی کوئی غیر مسلم رعایا اس
مذہبی ٹیکس کے ادا کئے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں کر سکتی
تھی اور اس میں شک نہیں کہ بعض فقہا نے یہی کہا ہے کہ جزیہ غیر مسلم کو قتل نہ کئے جانے کا
معاوضہ ہے جس کو وہ ادا کرتا ہے، لیکن یہ مسلک اُن مسلمان قوموں کا نہ تھا جن کو
ہندوستان کی فرمانروائی نصیب ہوئی، مولانا نے بڑی تحقیق سے اس بات کو پایۂ ثبوت
کو پہنچایا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے یعنی اسلامی ملکوں میں اُن غیر مسلموں
سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، کہ وہ انکی
فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا، تاکہ مسلمان سپاہی بیرونی حملہ آوروں سے
ان کی جان و مال کی حفاظت کریں، اسی لئے جب خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے
زمانہ میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے اور مسلمانوں نے
اُن کی اس خدمت کو قبول کیا ہے تو وہ اس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دئے گئے ہیں، مولانا کا
یہ مضمون شائع ہوا تو لوگوں کو اُن کی اس اچھوتی تحقیق پر حیرت ہوگئی، اور تعلیم یافتہ
مسلمانوں کو اس کی اتنی خوشی ہوئی کہ مولانا کی یہ تنہا تحقیق ہی ان کے نزدیک اُن کے
کارنامۂ فضیلت کے لئے کافی تھی، مولانا کا تمام تر استدلال کتب فتوح و تاریخ سے تھا،
اس لئے ممکن ہو کہ بعض لوگوں کو اس کے ماننے میں اب بھی تامل ہو، لیکن حقیقت یہ
ہے کہ فقہائے اسلام رحمہم اللہ گو اس بارہ میں مختلف ہیں کہ جزیہ بقاء علی الکفر یعنی غیر مسلم
ہونے کا معاوضہ ہو (ہدایہ) قتل کا بدل ہے یا قتال کا (فتاویٰ سراجی و فتح القدیر) یا

اس بات کا کہ ان کو اسلامی ملک میں سکونت کی اجازت دی گئی ہے۔ (مبسوط ص ۷۸ ج ۱۰)
تاہم وہ اذ جن کی نظر جزیہ کے ساتھ اہل ذمہ کے شرائط مصالحت اور اس کے مصارف
پر ہے انھوں نے صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ فوجی خدمت سے استثنا کا معاوضہ ہے۔

پانچویں صدی کے فقہ حنفی کے مشہور امام سرخسی المتوفی سنہ ۴۹۰ھ مبسوط میں معترض
کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اگر جزیہ کفر کا معاوضہ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمان
دنیا کے چند خزف ریزوں کو لے کر کفر کی بقاء کو انگیز کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

ثم يأخذ المسلمون الجزية منهم خلفا عن النصرة التي فاتت بإصرارهم على الكفر لأن من هو من أهل دار الإسلام فعليه القيام بنصرة الدار، وأيد أنهم لا تصلح لهذه النصرة، لأنهم يميلون إلى أهل الدار المعادية فيتشوشون علينا أهل الحرب، فيؤخذ منهم المال ليصرف إلى الغزاة الذين يقومون بنصرة الدار، ولهذا يختلف باختلاف حاله في الغنى والفقر؛

پھر مسلمان ان ذمیوں سے اس ذاتی جسمانی امداد کے معاوضہ میں جس کے یہ ذمی اپنے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اہل نہیں ہیں جزیہ لیتے ہیں، اسلئے کہ دارالاسلام کی حفاظت ہر اس کے سب بسنے والوں پر یکساں واجب تھی اور یہ ذمی جسمانی امداد کے قابل نہیں کیونکہ وہ دل میں دشمنوں کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں تو اگر انکو اسلامی فوج میں داخل کیا جائے تو وہ دشمنوں کو مدد پہنچائیں گے اسلئے ان کی جسمانی مدد کے بدلے ان سے مال لیا جاتا ہے تاکہ ان کی امدادی رقم مسلمان غازیوں پر صرف کیجائے جو دارالاسلام کی طرف سے لڑتے ہیں اور اسی لئے ان ذمیوں کی مالی حالت کی کمی اور زیادتی کے سبب ان کے جزیوں کی رقم بھی کم و بیش رکھی گئی ہے کیونکہ امداد کرنے والوں

فانه معتبر باصل النصرة. والفقير لو كان مسلما كان ينصر للدار بدنه راجلا ووسط الحال كان ينصر للدار راكبا والفائق في الغنى يركب ويركب غلاما فما كان خلفا عن النصرة يتفاوت بتفاوت الحال ايضا، (مبسوط سرخسي جلد ۱۰ ص ۸۰ مصر)

بھی اس حیثیت کی کمی بیشی کا اعتبار رکھا گیا ہے کیونکہ اگر مسلمان نادار ہو تو وہ صرف اپنی ذات کو پیادہ ذاتی کو تیار ہوگا اور متوسط الحال مسلمان گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے گا اور زیادہ متمول مسلمان خود بھی سواری پر جائے گا اور اپنے غلام کو بھی اپنے ساتھ سوار کرکے لیجائیگا، انہی حالات کے مساوی ذمیوں سے بھی جزیہ کم بقدر حال وصول کیا جائیگا یعنی جس طبقہ کا مسلمان سپاہی جتنا خرچ کریگا اس طبقہ کو ذمی ہوں انکے مطابق جزیہ لیا جائیگا۔

اسی اعتراض وجواب کو سید محمود آلوسی مفتی بغداد اپنی مشہور و مقبول تفسیر روح المعانی میں نقل کرکے کہتے ہیں:۔

ويجاب بانها بدل عن النصرة للمقاتلة منا وبهذا تتفاوت لان كل من كان من اهل دار الاسلام يجب عليه النصرة للدار اما بالنفس والمال وحيث ان الكافر لا يصلح لها لميله الى دار الحرب اعتقادا قامت الجزية المأخوذة منه المصروفة الى الغزاة مقامها. (جلد عاشر)

اور اس کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ یہ جزیہ جہاد (مسلمان سپاہیوں کی جسمانی و ذاتی امداد) کا مالی معاوضہ ہے، اور اسی سے اس کی مقدار حیثیت مالی کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے کیونکہ دار الاسلام میں سب رہنے والوں پر دار الاسلام کی امداد جان و مال کو ضروری ہے، اور چونکہ کافر غیر مسلم سے اس کی امید نہیں کیونکہ وہ جھکاؤ دار الحرب والوں کی طرف اعتقاداً میلان رکھتا ہے لہذا ان سے جزیہ (مالی معاوضہ) لیا جاتا ہے جو ان مسلمان سپاہیوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

علماے احناف کا یہی مسلک ہے چنانچہ ہدایہ کتاب الجزیہ اور اس کی شرح فتح القدیر میں یہ مسائل مذکور ہیں، اس باب میں مولانا کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے امام سرخسی کے نظریہ کی تائید میں مغازی و فتوح کی کتابوں سے تائیدی واقعات یکجا کر دیے جس نے نظریہ کو نقد کا ناقابلِ تردید مسئلہ بنا دیا، مخالفینِ اسلام کی طرف سے اس پر بڑا غلغلہ بلند تھا کہ اسلامی ملکوں میں غیر مسلم رعایا کو عام حقوقِ زندگی بھی حاصل نہیں، اتفاق سے اسی زمانہ میں آرمینیا کا واقعہ پیش آیا یعنی ٹرکی نے آرمینیا کے عیسائیوں کی بغاوت کو زبر جبر بزور ختم کر دیا تو یورپ کے اصحابِ قلم نے اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں پر مظالم کے دردناک مرثیے چھاپے، اور اس کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا، اس موقع پر مولانا نے آرمینیا کے مفروضہ مظالم کے اسباب الگ لکھے اور "حقوق الذمیین" لکھ کر یہ بتا دیا کہ اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں وہ تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہیں، بلکہ انکی بلندی تک یورپ کی سلطنتوں کے عدل کا پر پرواز ہنوز نہیں پہنچا ہے۔

اس مضمون نے مخالفوں کی آنکھیں بھی کھول دیں، اور اس وقت سے برابر عیسائی اہلِ قلم اس کے جواب میں مصروف ہیں، اور سب سے آخری کتاب اس کے جواب میں پروفیسر پادری اے ایس ٹرٹین (سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی) کی کتاب "غیر مسلم رعایا مسلمان خلفا کے زیر حکومت" (The Caliphs and Their non-moslem Subjects ۱۹۳۰ء) ہے۔

عیسائی یورپ نے خلفاے راشدین اور خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے خلاف ایک بہت بڑا الزام یہ قائم کیا تھا کہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو جو دنیا

کی صدیوں کی محنتوں کا خزانہ تھا، جلا کر خاک کر دیا، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام علم کا دشمن ہے، گو اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ ہر خرافات کا مجموعہ علمی خزانہ ہونے کا مستحق کہاں تک ہو سکتا ہے، تاہم مولانا شبلی آگے بڑھے اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزام مسلمانوں پر سراسر غلط ہے، بلکہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں صدیوں پہلے اسکو برباد کر دیا تھا، یہ تحقیق بھی بہت مقبول ہوئی، اور اس کے بعد خود یورپین محقق مصنفوں نے اس الزام کی تردید کی ہے، شام کے جرجی زیدان نے مولانا کے مضمون کا جواب لکھا تو اللہ تعالیٰ نے راقم اثم کو توفیق بخشی کہ اس کا جواب لکھے، چنانچہ وہ الندوہ میں شائع ہوا،

اسی جرجی زیدان نے قبۂ اسلام میں بیٹھ کر تمدن اسلامی کے نام سے متعدد جلدوں میں اسلامی عربی تمدن کی تاریخ لکھی اور اس میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے بظاہر عرب خلفاء کے محاسن اور درحقیقت اُن کے معائب کا دفتر تیار کیا کہ نادان مسلمان اس کے شکر گذار رہیں، لیکن دانا دشمنوں نے اس کی اصل حقیقت کو سمجھ کر اس کی یہ قدردانی کی کہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور مسلمان طالبعلموں کے سامنے اس زہر آلود خوانِ کرم کو رکھنا طے ہوا، اُس وقت ساری دنیائے اسلام اور علمائے اسلام میں سے مولانا ہی کا قلم نیام سے نکلا اور مصنف کے سارے اعتراضات کی صفوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا، ان کی یہ خدمت ایسی قیمتی ثابت ہوئی کہ مصر کے علماء نے اس کی پوری قدر کی اور مولانا کی جلالتِ مرتبت کا اعتراف کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف انگریز مورخوں نے سیاسی اغراض کی خاطر ہندو

پر عالمگیر کے مفروضہ مظالم کی یہ تشہیر کی کہ خود مسلمانوں کو بھی اس کا یقین آگیا، اور پھر ہندوؤں میں جدونا تھ سرکار جیسے محقق پیدا ہو گئے جنھوں نے عالمگیر کو اس بنا پر کہ وہ اکبر کے بعد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تخیل کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا تھا، ہر الزام کا مورد بنایا، اس وقت سارے ہندوستان میں صرف مولانا ہی کا قلم تھا جو نیام سے باہر آیا اور تمام اعتراضات کے مفصل جوابات دیئے، یہ اب تک اس باب میں بے مثال تصنیف ہے اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے، اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو پوری آب و تاب سے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے جمع کیا، اور ان کو شائع کیا، اسلامی کتب خانے، اسلامی شفاخانے، ہندوستان پر اسلامی حکومت کے اثرات، تزک جہانگیری وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں، یہ کہنا بہت آسان ہے اور ایک حد تک سچ بھی ہے کہ یہ سلاطین مسلمان ضرور تھے، مگر اسلام یا اسلامی طرز حکومت کے تمام تر نمائندے نہ تھے، اس لئے ان پر اعتراضات کرنے سے اصل اسلام پر زد نہیں پڑتی، لیکن اسلام کے ۱۲۰۰ برسوں کے اندر مسلمان بادشاہوں اور اسلامی حکومتوں نے اپنے مسلمان ہونے کا کوئی پاک اثر اگر ظاہر نہیں کیا تو اسلام کی بے تاثیری کی دلیل اس سے بڑھکر کیا ہوگی،

اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تلاش و محنت اور اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے عہد حال کے اقتضا کے مطابق یہ تصویر ایسی عمدہ کھینچی کہ دیکھنے والوں کی زبان سے بیساختہ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ نکل گیا، انھوں نے دنیا

کی تاریخوں کو چیلنج دیا کہ اس شبیہ مبارک کی مثال اگر اس کے مرقع میں ہو تو پیش کرے،

آجکل کی سیاسی و اقتصادی تحریکات کے انقلابی دور میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام کیا ہے، ڈھونڈھنے والے ڈھونڈھ رہے ہیں اور لکھنے والے لکھ رہے ہیں، لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس کام کا مسالہ اُن کو کہاں سے ہاتھ آرہا ہے، الفاروق سے، اس سے یہ معلوم ہوگا کہ اُن کی دوربیں نگاہ نے اس ضرورت کا پہلے ہی احساس کیا تھا

الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے، کہ اس میں حضرتِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ خاکہ تو ہماری قدیم کتابوں میں بحمداللہ پوری طرح موجود ہی ہے، مصنف نے صرف اس گوشہ کو اجاگر کیا ہے جو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اور جس کی ضرورت اُن کے عہد میں بہت شدید تھی، پھر بھی یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ الفاروق نے کتنے گرتوں کو تھام لیا اور کتنے دلوں میں اسلام کی صداقت کا بیج بو دیا، اسی طرح اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جزئی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے، والعصمۃ للہ وحدہٗ،

تاریخی مسائل کی تحقیقات کا جو پرواز یورپ نے قائم کیا ہے، اور یورپ کے مستشرقین جس وسعتِ نظر، جستجو، اور نادر کتابوں کے مطالعہ اور نامعلوم گوشوں سے اہم نتائج کی تلاش کرتے ہیں، مولانا نے اپنی اس تصنیف اور دوسری تصانیف اور اپنے تمام مضامین میں اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، جس کی مدح و ستائش کا اعتراف خود یورپ کے

مستشرقین نے علی الاعلان کیا، اور اس طرح اسلام کی سربلندی کا جھنڈا جس کو وہ جھکا دینا چاہتے تھے مولانا کے دست و بازو نے اُس کو علی حالہٖ بلند رکھا اور اس کے لئے وہ ساری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں،

عیسائی مدت سے کوشاں ہیں کہ وہ قرآن پاک کو محرف ثابت کر سکیں، اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدلیس اور دسیسہ کاری کیا کرتے ہیں جس سال انھوں نے وفات پائی ہے، اسی سال اپریل ۱۹۱۴ء میں لندن سے ایک غلغلہ بلند ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر منگانا نے لائبریری کے ایک گوشہ میں قرآن پاک کا ایک ایسا پرانا قلمی نسخہ پایا ہے، جو موجودہ قرآن سے بہت مختلف ہے، ڈاکٹر منگانا نے اس کی پوری تشہیر کی چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۴ء کو ٹائمز آف لندن نے اس پر ایک آرٹکل لکھا اور بڑے دعوے سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان کے مقابلہ کے لئے بھی مولانا ہی کا قلم میدان میں آیا، اور متعدد مضامین میں، اس کا جواب دیا، اور اس تحقیق کا سارا تار و پود بکھیر دیا،

اس زمانہ میں علما جو کچھ لکھتے تھے وہ عربی میں یا فارسی میں، مولانا نے بھی علی گڈھ سے پہلے تک اسکات المعتدی عربی میں لکھی، فارسی نامے بڑی کوشش سے لکھتے تھے، صرف ایک رسالہ قرأت فاتحہ خلف الامام کے رد میں اُردو میں لکھا، مگر اس کو اپنے نام سے نہیں چھپوایا، لیکن جس طرح ہمارے علمائے کرام نے زمانہ کی زبان بدلنے کے ساتھ عربی کی جگہ مفید عام تالیفات فارسی میں شروع کردیں، اور پھر فارسی کا چلن بدلنے پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی و حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی و حضرت مولانا

اسمٰعیل شہید رحمہم اللہ تعالیٰ نے اُردو میں تالیف شروع کی۔ مولانا نے بھی عربی اور فارسی کو چھوڑکر اردو کی طرف توجہ فرمائی، اور اُس زبان کو جس کی نسبت بطور معذرت میرتقیانان میں یوں فرماتے ہیں ج حرف بہ اُردو زدن آئین نہ بود، اپنی نکتہ سنجیوں اور خوش بیانیوں سے یہ عروج بخشا کہ علماے زمانہ کے لئے اس میں لکھنا پڑھنا مطلق عار نہ رہا، اور بیشمار کتابیں اُن کے قلم سے اس زبان میں تالیف پائیں، اس سے آگے بڑھکر یہ کہ اس میں بعض علماے اعلام نے بھی کتابیں لکھیں جو اپنی ہدایت و افادت اور مضامین کی بلندی و ندرت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، مگر بیان کے اشکال، تعبیر کی دقت علمی و فنی اصطلاحات کی کثرت اور فلسفیانہ طرز بیان کے تتبع کے سبب عوام تو عوام بہت سے خواص کے دسترس سے بھی وہ باہر ہیں، مولانا نے اپنے لئے بیان کی سہولت، عبارت کی روانی، ترتیب کی خوبی، عام فہم الفاظ کے انتخاب اور تشبیہ و استعارہ کی عمدگی سے وہ طرز نکالا کہ اُن کی کتابیں ادب و انشا کا اعلیٰ نمونہ قرار پائیں، اور تعلیم یافتہ تو تعلیم یافتہ حضرات علما کو بھی بالآخر اس کی تقلید سے چارہ نہ رہا، اور اب تو وہ علمی و مذہبی علوم کی ٹکسالی زبان بن گئی ہے،

اس موضوع پر ایک اور رُخ سے نظر کیجئے، اُس وقت تک حضرات علما جس قسم کے مضامین پر رسائل تالیف فرما رہے تھے، وہ دو تین موضوعوں سے باہر نہ تھے، تصوف فقہ کے اختلافی مسائل کی تحقیق یا فرقِ باطلہ کی تردید، مولانا نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو اس محدود رقبہ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا، تاریخی، فقہی، تمدنی، ادبی، علمی، فلسفی، سیاسی غرض ہر نوعِ سخن میں وہ گلباری کی کہ ساری زمین قسم قسم کے پھولوں سے پُربہار ہوگئی، اور

اب اس کی تقلید میں علما کی تحریریں اور تالیفیں بحمداللہ کہ اپنی وسعت روز بروز بڑھا رہی ہیں۔
اس موضوع کا ایک اور گوشہ بھی پردہ کشائی کا محتاج ہے۔ علمائے کرام کا بڑا مشغلہ اس عہد میں مناظرہ تھا اور اس وقت کا علم کلام گویا یہی طرز سخن تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تالیفات کے لئے اس کوچہ کو اختیار نہیں کیا۔ مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ساری عمر اسی موبدانہ مناظرہ ہی میں گذر گئی۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ چار فریقوں میں مناظرے جاری تھے، حنفی اور اہل حدیث، سنی اور شیعہ، مسلمان اور عیسائی، مسلمان اور آریہ۔ اب ذرا مولانا کی تالیفات پر نظر ڈالئے۔ بقول انھی کے

گرچہ سرو برگ سخن دیگر است | شمع ہمان است ولگن دیگر است

انھوں نے مناظرہ کی بدنما شکل کو بدل دیا اور احقاق حق اور ازہاق باطل کے لئے زمانہ کے مطابق ایک اور دلنشین شکل پیدا کر دی۔ ان کی سب سے پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع حنفی اور اہل حدیث کا مناظرہ نہیں؟ ان کی دوسری کتاب الفاروق کیا شیعہ وسنی مباحث کا فیصلہ نہیں؟ ان کی باقی کلامی و تاریخی کتابیں عیسائی مشنریوں اور مستشرقوں اور ہندو معترضوں کے جواب میں نہیں؟ لیکن بات یہ ہے کہ قدیم مناظرانہ قیل و قال کا طریق خوبی تعصبات، جوابی الزامات، بدنما طعن وطنز، سوء تعبیر اور نامناسب و شتم سے اتنا بدنما ہوگیا تھا کہ اس نے تاثیر و تاثر اور قبول حق کی ساری صلاحیت اپنے اندر سے کھو دی تھی حالانکہ احقاق حق اور ازہاق باطل ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے، اور کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے مولانا کی ژرف نگاہی نے لڑائی کے میدان کو نہیں بلکہ

جنگ کے نقشہ کو بدل دیا، انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ، نہ الزام اور، نہ جواب کے بجائے اپنے ہی دعووں کو ایسے دلنشین، دلچسپ اور محققانہ طریق استدلال سے بیان کیا جائے کہ بیان کی ندرت طریق تعبیر کی سنجیدگی، اور دلائل کی قوت خصم کو جواب کے قابل ہی نہ رکھے، چنانچہ سیرۃ النعمان، اور الفاروق، اور الجزیہ وغیرہ کے جوابات میں جواب دینے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر پھر بھی وہ اپنی جگہ پر رہیں اور اُن سے ہزیمت نہ پہنچا، اور علما نے بھی اس پرواز پر کتابیں لکھنی شروع کر دیں، جو مفید حال ہیں،

مولانا سے پہلے ہمارے علما پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ اُن کی نظر درسی کتابوں اور اُن کے شروح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا کسی اور علم و فن کی کتاب سے استفادہ قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انھوں نے ہر علم و فن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بکثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے گوشہ گوشہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا، اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں اُن کے حوالے دیئے، نصاب تعلیم میں اُن میں سے بعض کو داخل کیا، طلبہ اور علما کو اُن کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں، اور ہم نشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، ندوہ کے ایک اجلاس میں علما کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ توسلف

کے علوم و فنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جانفشانیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علما جو ان علوم کے اصل وارث تھے ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائیکہ ان کی تلاش و تصحیح و مطالعہ و اشاعت کی زحمت اٹھائیں۔ مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علما میں ناکام نہیں رہی

ان ہی دو غرضوں کے لئے دار المصنفین کا خاکہ ان کے دماغ میں آیا تھا، جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ تھا۔ ان کو جب کوئی نئی قلمی کتاب ہاتھ آتی یا کوئی نادر کتاب چھپکر آتی تو ان کی سرخوشی کا عجیب عالم ہوتا تھا، قلمی کتابوں کو ہر قیمت پر خریدنے کو تیار ہو جاتے تھے، اگر ہاتھ خالی ہوتا تو حیدرآباد وغیرہ سرکاری کتب خانوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے دوستوں کو اس کی خریداری کی ترغیب دیتے، جن میں سب سے پہلا نمبر ان کے حبیب کرم مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کا تھا اور اس کی خبر دوستوں کو اور عزیز شاگردوں کو دیتے تھے، چنانچہ مکاتیب کے اوراق ان بشارتوں اور خوشخبریوں سے معمور ہیں،

مولانا خود بھی اس علمی تبلیغ کو اپنی زندگی کا ایک اہم فرض سمجھتے تھے، چنانچہ وفات سے ڈیڑھ سال پہلے اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبد الباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:۔

بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، الرا اعرف بنفسہ لیکن صحیح علمی ذوق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا

اگر ہمیں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسٹر گزٹ کے مصنوعی محاسن کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ (۵ھ)

مولانا کو اپنی اس علمی دعوت و تبلیغ اور ادبی تعلیم و تربیت میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کے ہاتھ ہے، اُن کی یہ کامیابی صرف ان کے حلقۂ تلامذہ تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے حلقوں کے علما اور تعلیم یافتہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور برابر متاثر ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کے طریقۂ تحریر، اسلوبِ تحقیق اور طرزِ تنقید کی تقلید سے اب کوئی حلقہ خالی نہیں رہا۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ علما میں باہم ایسا رشتۂ اتحاد ہو اور بحیثیت ایک جماعت کے اُن کا یہ علمی و مذہبی وقار ہو کہ سارے مسلمان ان کی پیروی کو اپنا شعار بنا لیں اور ان کو پوری قوم پر پورا اختیار حاصل ہو اور حکومت وقت اُس وقت ان کے سامنے سر جھکا دے گی چنانچہ وہ اپنی اس تقریر میں جو علما کے فرائض پر ندوہ کے ایک اجلاس میں کی تھی، فرماتے ہیں:۔

"۔۔غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں، ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو، لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیونکہ علما جب تک قوم کے اخلاق قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔اسوقت ندوہ دعوی کر سکتا ہے کہ اوقاف کے

لاکھوں روپیے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بے دردی سے برباد ہو رہے ہیں، ندوہ کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں، اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرے۔

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اس وقت ابتری کی حالت میں ہے، اس کی اصلاح کر دیجائے اور گورنمنٹ کو اس دعویٰ پر بہت کچھ لحاظ ہوگا۔

ندوہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں عدالت میں فقہی مسائل کے لئے قاضی و مفتی مقرر کئے جاتے تھے وہ قاعدہ مسرفوسے قائم کیا جائے۔

ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہو گی کہ تمام جماعت اسلام اس کی ہدایتوں کی پابند ہو، اس کے فتووں کے آگے سر جھکائے، اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کرسکے، اس صورت میں ندوہ تمام قوم کو بیہودہ مراسم سے خلاف شرع باتوں سے ناجائز امور سے بزور روک سکتا، اور جماعت اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ کا بزور پابند کرسکتا ہے، یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا، بلکہ اتباع سنت کا اور اتفاق باہمی کا ہوگا۔" (خطبات شبلی ص ۳۳ و ۳۴)

مولانا کی نگاہ میں علماء کے فرائض کتنے وسیع تھے، وہ خود اس وسعت پر عامل اور دوسروں کو بھی اسی وسعت خدمت کی طرف دعوت دے رہے تھے، علماء میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے، مسلم لیگ کے زاویۂ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین

اور بیسیوں تنظیمیں کھیں، احرار اسلام کی رہنمائی کی اور اُن کی بے راہ روی پر اُن کو ٹوکتے بھی رہے۔ ہندوستان میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعی اول تھے، اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد تعطیل جمعہ، اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومت وقت کے سامنے پیش کر کے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر اُن کا یہ بڑا احسان ہے، اس روشنی میں دیکھئے تو اب آجکل جو حضرات علماء میں سیاسی گرمی ہے، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے، اور ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کے لئے جو دوڑ دھوپ ہے اور مختلف سیاسی گروہوں میں منقسم ہو کر بھی بہرحال سیاسی مسائل سے جو وابستگی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے۔

مولانا نے علماء کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور رجحانات کی پرورش کی، اور اُن کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی اس کا یہ مختصر خاکہ ہے، ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لئے تدریج کی ضرورت تھی، اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے چنانچہ ۱۹۰۳ء میں ایک دوست کو لکھتے ہیں

"سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علماء وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں، الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا تاریخ علم کلام، پھر اعلیٰ سطح یعنی علم کلام جدید ہے جو زیر تصنیف ہے...... غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علماء بدستور بلکہ اور لوگ بھی ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو اُن سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں بلکہ مع میں تو ڈوبا ہوں وے یار کو بھی لے ڈوبوں گا" (مہدی ـ ۱۳۰)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی ان احتیاطوں کے باوجود علماء اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور عجب نہیں کہ

انھوں نے اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس کی ہو گی، ایک زمانہ تک ان کو اس پر تعجب آتا رہا کہ سلف میں بھی بہت سے علماء اور ائمہ گذرے ہیں جن کے بہت سے خیالات اور نظری عقائد جمہور علما سے مختلف تھے، مثلاً وہ قدری تھے یا مرجئی تھے، پھر بھی وہ مقبول تھے اور لوگ اُن کی قدر کرتے تھے، پھر وہ خود ہی مجھ سے اس کی وجہ ظاہر فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہ نظری خیالات اُن کے زہد و عبادت و اتقا کے ساتھ تھے، اس لئے وہ مقبول تھے اور یہاں یہ کیفیت نہیں، اس کے بعد وہ دور آیا جب ان کا خیال ادھر رجوع ہوا کہ اختلافِ خیال کے باوجود وہ علماء میں کھپ سکتے ہیں، اور ان کی تصنیفات کے اختلافی حصّہ سے قطع نظر کر کے ان کے کارآمد حصّوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ دس برس کے بعد مئی ۱۹۱۳ء میں ایک صاحب نے اس زمانہ میں جب بعض علماء نے سرکارِ بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ سیرت کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو از راہِ ہمدردی لکھا تھا کہ سیرت کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو، مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

"آجکل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں، لیکن ان ہی دینداروں کو میں نے دیکھا ہے کہ نماز بھر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دینداری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا،

یقین فرمائیے۔ زمانہ کی خرابازاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے۔ خواص تک عوام بن گئے ہیں۔ حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہو گیا ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے نصاب پر جو کچھ یہ حضرات لکھ رہے ہیں، کیا سچائی پر مبنی ہے۔ صرف یہ کاوش ہے کہ ان کا نام کیوں نہیں لیا گیا۔

قرآن شریف پر نقطے حجاج بن یوسف نے لگائے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ حجاج پر قوم کو بھروسا نہیں۔ بلکہ وہی منقط قرآن آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ عمارت کعبہ بھی حجاج کی ہے۔

بلاغت کا پورا فن جس سے قرآن مجید میں ہر جگہ کام لیا جاتا ہے، جاحظ جیسے لوگوں کا جرجانی، سکاکی کا بنایا ہوا ہے۔ یہ سب معتزلی تھے۔ کسی نے نہیں کہا کہ ان پر قوم کو اعتماد نہیں۔ تفسیر کشاف تمام محدثین پڑھتے تھے، حالانکہ اس میں اعتزال بھرا ہوا ہے۔

قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ اس کو خود بھروسا ہوتا ہے کہ وہ غذا صاف کرے گی۔ جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں۔

ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں۔ اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں۔ تاہم چونکہ مخلص ہیں، اس لئے شور و شر نہیں چاہتے۔ کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں بتا دیتے ہیں۔ (عبدالحکیم-۲)

لیکن ایک ہی سال کے بعد ۹ رمئی ۱۹۱۳ء کو جب مناز عاتِ ندوہ کے سلسلہ میں دہلی کے بعض علماء نے علم الکلام اور الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر جب ان کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا:۔

"میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائلِ فقیہ دونوں میں حنفی ہوں" (دیکھئے زیر عنوان عقائد و خیالات ص ۳۴)

اس اعلان کے ۶ ماہ بعد مولانا نے وفات پائی،

یہاں پر ایک بات نوکِ زبان پر آئی جاتی ہے، مسلمانوں کو شکوک و شبہات اور الحاد و بیدینی سے بچانے کے لئے جو تدبیر ہمارے عام متکلمین نے اختیار کی، وہ بھی گو اپنی جگہ پر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض علوم زمانہ کے ذریعہ مسلمانانِ زمانہ کو زمانہ کی غلطیوں سے بچا کر یقین و اذعان کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کی یہ تدبیر نہیں، متکلمین کے علاج سے یہ ہو سکتا ہے کہ بیماری کے کچھ عوارض زائل ہو جائیں، لیکن اس سے صحت کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور جس زمانہ میں ہوا، روم و مصر و شام و ایران میں یہ فلسفیانہ علوم اور الٰہیات کے یہ شکوک و شبہات پورے کے پورے موجود تھے، مگر اس کی اصلاح علم کلام کی ایجاد سے نہیں کی گئی، بلکہ قوتِ ایمان اور حسنِ عمل کی زندہ مثالوں نے ان کے شکوک و شبہات کے پردوں کو چاک کر دیا، تعلیم یافتگانِ نبوت جہاں پہنچے، سیدھی، سادی اور بے پیچ و پیچ خدائی منطق جو قرآن کی صورت میں تھی، اور اسوۂ رسول جس کے وہ خود نمونہ تھے، یہ دو چراغ ان کے ہاتھ میں تھے،

جن کوے کر وہ آگے بڑھتے گئے، اور تاریکی کا پردہ چاک ہوتا گیا، صحابہ کے دور کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا دور آیا، ان کے زمانہ میں ہذیل، علاف، نظام اور جاحظ وغیرہ متکلمین بھی تھے، مگر تاریخ بتا سکتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ کس رخ سے بہتا رہا اور دین واخلاق کی خشک زمین کس سے سیراب ہوتی رہی، یہی صورت حال اس دور کے بعد بھی رہی شیخ الرئیس بوعلی سینا اور حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ ایک زمانہ میں تھے، مگر روحانی ہدایت کہاں سے ملی اور حضرت ابوسعید کا حکیم مشرق بوعلی سینا کو یہ فرمانا اب بھی صادق ہے "آنچہ تو می گوئی من می دانم وآنچہ تو می دانی من می بینم" دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے صرف اپنے ملک کو دیکھئے، میر زاہد، ملا جلال، عبدالحکیم سیالکوٹی، بحر العلوم، میر زاہد اور شرح مواقف پر حاشیہ چڑھانے والوں نے کتنے دلوں کو منور کیا، اور چشت وسہرورد کے خانوادوں نے اپنے نور باطن سے لاکھوں قلوب کو روشن کر دیا، بات یہ ہے کہ علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کر سکتا ہے، لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں،

اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ فن کلام بیکار و ہیچ ہے، ایسا سمجھنا غلطی ہے، ملت اسلامیہ ایک عالمگیر سلطنت ہے، اس میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر امراء اور وزراء تک کی یکساں ضرورت ہے، جس سلطنت میں وزیر ہی وزیر ہوں سپاہی نہ ہوں وہ کب دشمنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، لیکن ہر ایک ملازم اور عہدہ دار کا ایک خاص مرتبہ اور درجہ ہے، ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور موہبت کے مطابق مختلف عہدوں اور جو کچھ کام کے لائق بنائے گئے ہیں، وزراء ہیں جو سلطنت اور فرمانروائی کے فریضہ کو انجام دیتے ہیں، امراء ہیں جو

رموز سلطنت سے۔ شیر او رکار پرداز ہیں، سپاہی ہیں جو ملک کے ہر سرحدی درہ اور دشمنوں کے حملوں کے مقامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی بہت سلطنت کے انتظام اور اس کی حفاظت وبقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے، ان میں سے اگر وزراء اور امراء یہ سمجھیں کہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں تو سلطنت کے انتظام وحفاظت کے اسرار سے ناواقف ہیں، اور اگر سپاہی یہ سمجھیں کہ سلطنت کے لئے وہی سب کچھ ہیں، وزراء اور امراء کی ضرورت نہیں تو وہ بھی اس سلطنت کے خیر خواہ نہیں، کہ وہ نہ ہوں تو ملک میں تباہی برپا ہو جائے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ مرکزی سلطنت کے مصالح وحکم کے واقف کار، اور سلطنت کی پالیسی کے ذمہ دار اور اس کے کلی نفع وضرر کے نگراں وزراء اور امراء ہی ہیں، سپاہیوں کے متعلق صرف اتنے ہی حصہ کی حفاظت فرض، اور اسی کے مصالح وحکم کی رعایت ان پر واجب ہے جن کی حفاظت کا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے؛ متکلمین کی مثال اس سلطنت کے مجاہد سپاہیوں کی ہے جو دین کو معترضوں کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے، اپنے علم وفن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں، اور حضرات محدثین وفقہاء وصوفیہ صافی کی مثال سلطنت کے وزراء اور امراء کی ہے جن کے ہاتھ میں حکومت کی پالیسی، سلطنت کے مصالح وحکم کی نگرانی اور ساری سلطنت کے حسن انتظام اور اجرائے احکام کی طاقت ہوتی ہے، فوج کا ہر دستہ اپنی جگہ پر اپنے

ل امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں یہی فرمایا ہے اور ان کو حارس دین من تخیلات المبتدعہ کا خطاب دیا ہے، اور حج کے قافلہ کے محافظ دستوں سے ان کو تشبیہ دی ہے۔ (باب العلم الذی ہو فرض کفایہ)

مفروضہ حصّہ ملک کی فوجی حفاظت کا ذمہ دار ہے، اگر سلطنت کی پالیسی اور رموز مملکت اور ساری سلطنت کے حسنِ انتظام اور اجرائے احکام سے اس کو تعلق نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر وہ یہ کہیں کہ قت کے کلی مصالح وحکم کے وہ نگراں ہیں تو وہ غلطی کریں گے اور اگر اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء یہ سمجھیں کہ دشمنوں سے حفاظت کے یہ فوجی دستے بیکار ہیں تو وہ بھی غلطی پر ہیں،

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح ذہن میں آجاتی ہے کہ ہمارے متکلمین نے اپنے مناظرانہ التزامات کے سلسلہ میں عقائد کا جو دفتر تیار کر رکھا ہے اس کو قت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں، وہ تو ان کے فنی مفروضات تھے جن کو دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے کھڑے کیے تھے، اسی طرح حضرات محدثین وفقہاء کو چاہیے کہ ان متکلمین کے ان فنی مفروضات پر، اس وقت تک اُن کو قت کا باغی وطاغی ٹھہرا کر ان کو کافر نہ بنایا کریں، جب تک وہ یہ دعویٰ نہ کرنے لگیں کہ ان مدافعی مناظروں میں ان کی زبان وقلم سے جو کچھ نکل رہا ہے وہی عین اسلام ہے، اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں تو یہ سرحدی حفاظت کے بجائے جو اُن کا فریضہ ہے مرکزی سلطنت کے اساس و انتظام مملکت کے رموز و اسرار و قواعد و احکام میں مداخلت ہے، جس کا دوسرا نام طوائف الملوکی یا بغاوت ہے، اسی لئے یہ بات بطور اصول کے مان لی گئی ہے کہ "لازم مذہب مذہب نہیں" یعنی متکلمین کے آراء و نظریات سے جو غلط نتائج لازم آجائیں، وہ ان کا عقیدہ نہیں قرار دیا جائے گا،

مگر گروہ راسخین کو چھوڑ کر بجز اللہ تمام متکلمین حق اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ آخر عمر میں جب جنگجویانہ قویٰ میں افسردگی آتی ہے اور عقل کے بلند بانگ دعووں کی حقیقت سے اُن کو آگہی ہو جاتی ہے تو دلائل و براہین عقل کے بجائے وحی الٰہی اور تعلیم نبویؐ کی صداقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں. اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام ہی چھوڑ کر فقہ کا دامن پکڑا تھا، امام ابوالحسن اشعری نے چالیس برس کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر قبول حق کا اعلان کیا کہتے ہیں کہ جب امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر دھری تھی، اور سبکی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم ان کی آخر زندگی کا مشغلۂ حیات تھی، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ملا علی قاری نے متعدد محدثین اور متکلموں کی نسبت لکھا کہ ان کا خاتمہ عقل کی کوتاہی کے اعتراف اور وحی نبویؐ کے عقیدہ کے اقرار پر ہوا، مرتے وقت امام جوینی کی زبان پر یہ تھا" میں اسلامی علوم کو چھوڑ کر عقل کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو افسوس ہوتا، اب میں اپنی ماں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" یا یہ کہا کہ اب میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں" اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی شہرستانی اور خسروشاہی وغیرہ متکلمین سے منقول ہیں،

---

[1] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری ہند ص۔ عقیدۂ حمویہ کبریٰ رسائل ابن تیمیہ مصری ۱ ج، اجتماع الجیوش الاسلامیہ ہند و صواعق مرسلہ ابن قیم مصر ص،

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اپنے ذاتی تحقیق و تجربہ کے بعد علم کلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، مولانا شبلی مرحوم نے بھی الغزالی میں اس کو نقل کیا ہے، جو بلفظہ یہاں درج ہے،

اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس (علم کلام) سے حقائق کھل جاتے ہیں اور ان کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے لیکن افسوس علم کلام اس بلند مقصد کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس سے کشف حقیقت کے بجائے خبط اور گمراہی زیادہ بڑھتی ہے اور یہ بات اگر کوئی محدث (یعنی ظاہر پرست) کہتا تو تم کو خیال ہوتا کہ آدمی جس چیز کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہو جاتا ہے لیکن یہ بات وہ شخص یعنی خود امام صاحب) کہتا ہے جس نے علم کلام کو اس حد تک حاصل کیا کہ متکلمین اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے، بلکہ اسی علم کلام ہی میں کمال حاصل کرنے کی غرض سے اور علوم سے جو اس فن سے مناسبت رکھتے تھے، واقفیت پیدا کی، یہ سب کرکے وہ علم کلام سے بیزار ہو گیا،

امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے:

میں نے کلام کے سارے مباحث اور فلسفہ کے سارے ابواب پر پوری طرح غور و خوض کر لیا تو میں نے دیکھا کہ ان سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب، اور میں نے پایا کہ منزلِ مقصود تک لے جانے والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا

ل الغزالی ص۱۰۳ مولانا نے اس کے لئے احیاء العلوم کے باب ذکر علوم کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ بیان در حقیقت احیاء العلوم کی کتاب قواعد العقائد کی فصل ثانی میں ہے،

راستہ ہے، اور جس کو میری طرح ان علوم کا تجربہ ہو گیا، اس کو یہی معلوم ہو گا۔[1]

حافظ ابن قیم نے اس کتاب سے کچھ اور فقرے نقل کئے ہیں،

اب ہم کہتے ہیں کہ اے کاش ہم پیدا ہی نہ ہوتے اور اسی مقام پر میں نے کہا ہے،

نهاية اقدام العقول عقال　　وغاية سعي العالمين ضلال

عقلوں کے قدم کی انتہا ناکشودگی ہے　　اور دنیا والوں کی کوششوں کی حد گمراہی ہے

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　سوى ان جمعنا فيه قيل وقال

ہم نے اپنی ساری عمر کی بحث سے سوا اس کے اور کچھ نہ کیا کہ لوگوں کے اقوال کا دفتر جمع کر لیا،

واعلم ان بعد التوغل في هذه المضائق والتعمق في الاستكشاف عن اسرار هذه الحقائق رأيت الاصوب الاصلح في هذا الباب طريقة القرآن العظيم والفرقان الكريم وهو ترك التعمق والاستدلال باقسام اجسام السموات والارضين على وجود رب العالمين ثم المبالغة في التعظيم من غير خوض في التفاصيل،[2]

اور جان لو کہ ان تنگ راہوں میں گھسنے اور ان حقائق کے اسرار دریافت کرنے کے لئے غور و فکر کے بعد مجھے اس باب میں صحیح و مناسب طریقہ قرآن پاک ہی کا نظر آیا، اور وہ عقلی کرید کو چھوڑ دینا اور آسمان و زمین کے عجائبات سے اللہ کے وجود پر دلیل قائم کرنے کا طریقہ اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بدل اعتقاد تفصیلات میں پڑے بغیر،

امام موصوف نے مرض الموت میں جس کا زمانہ ممتد رہا، ۲ محرم ۶۰۶ھ کو اپنے ایک شاگرد کو اپنا ایک وصیت نامہ لکھوایا تھا جس کو تذکرہ نویسوں نے بعینہٖ نقل کیا ہے، اس

۱؎ شرح حدیث النزول ابن تیمیہ ص۱۰۰ امرتسر ۲؎ اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص۱۲۲ امرتسر،

میں موصوف نے اپنی عمر بھر کی علمی تحقیقات اور کلامی مباحث کا آخری نتیجہ یہ پیش کیا ہو،

ولقد اختبرتُ الطرقَ الکلامیۃ	میں نے تمام کلامی اور فلسفیانہ طریقوں کو آزمایا
والمناھج الفلسفیۃ فما رأیت	تو میں نے اُن کا فائدہ اوس فائدہ کے برابر
فائدۃ تساوی الفائدۃ التی	نہیں پایا، جس کو میں نے قرآن عظیم میں پایا؛
وجدتھا فی القرآن العظیم،	

(طبقات الاطبا ابن ابی اصیبعہ صفحہ ۲۴)

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ "میں محض اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا امیدوار ہو کر مر رہا ہوں "؛ اس وصیت نامہ کے آٹھ مہینے دس دن کے بعد یکم شوال ۶۰۶ھ کو انھوں نے وفات پائی

غرض یہ احوال جس طرح دوسروں کو پیش آئے، اس حیات نامہ کے ہیرو کو بھی پیش آئے اور آخر اس کو یہ کہنا پڑا،

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود ۔۔۔ گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

سنہ ۱۹۱۱ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ پر حاضری کے لئے بیتاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث کو چھوڑ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی، ان کے پاس نہ اب ابن رشد وغزالی ورازی وبو علی سینا کا گذر ہے نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے شب وروز ہیں اور کتب احادیث وسیرت کا مطالعہ، تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش، اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، جہاں بیٹھے کھری چارپائی ہو یا

چھائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا، اور ان ہی درباریوں کی ہم نشینی میں اُن کا سارا وقت گذر جاتا اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہیں اور دربارِ رسالت کا آستانہ" (مکاتیب اوّل جلد حکیم ۳) چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھایا تھا یہی ان کی مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط و کتابت تھی، اس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط مکاتیب کو پڑھ ڈالئے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت و حفاظت اور سیرتِ نبویؐ یہاں تک کہ دمِ نزع بھی اخیر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ **سیرت** ہی،

سیرت کی حیثیت اُن کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی اصطلاح میں سیرت تھا۔ فرماتے ہیں:

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور سفیرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے"۔ (مقدمۂ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمۂ اسلام کے دوسرے جز یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری تفسیر و تشریح کا نام تھا اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا اور اسی کو وہ سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ (مکاتیب اوّل حصہ اضافہ ۲)

کیا ان کے اس کام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے نہیں کیا جا سکتا کہ ادھر ان کے قلم نے سیرت کی تصنیف کا اعلان کیا اور ادھر مسلمانوں کی زبانوں سے بیک دفعہ لبیک کی صدا بلند ہوئی اور امداد کی ندا دے کر خود ایک والیہ ملک آگے بڑھی اور اب جدھر سنو سیرت سیرت کا لفظ ہر مسلمان کی زبان پر تھا پھر اس کی دوہری مقبولیت کا نشان دیکھئے وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں، اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیب اللہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی۔ اس کوشش میں مقدس علما بھی شریک ہو گئے، نو تعلیم یافتہ اہل قلم بھی، گم کردہ راہ مدعی اسلام فرقے بھی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابرِ کرم سے محروم نہ رہی ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کے چھینٹوں نے اس کے سمندروں کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو سرسبز و شاداب کر دیا، بحرِ ہند کے سواحل مالابار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہو گئیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اس کی فوج ظفر موج سے معمور ہو گئی، تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی، اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا، اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نامور ہوا جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑ سے لیکر بحرِ ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا۔

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پُرشور کر دیا، اور غزنی سے لیکر پنجاب تک یک تخت اسلام کی حکومت قائم کر دی چھٹی صدی میں غوری آئے تو انھوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرنگیں کر دیا، وہ دن ہے آج

آج کا دن ہو کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہو جس میں لاکھوں توحید کے حلقہ بگوش اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہیں،

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان

جس طرح ہندوستان کو خراسان وما وراء النہر و عراق و عجم کے تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا اسی طرح اس کے دل و دماغ کو انہی ملکوں کے ارباب کمال نے اپنا جگہ دار بنایا، قطار در قطار علما بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے، اس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا، اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا، ملتان اور سندھ کے بعد اُن کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوتی، سلطان شمس الدین التمش نے جب ۶۰۷ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علما سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے،

غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ-۶۸۶ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد وغیرہ جیسے ارباب کمال تھے، جن کے علم و فضل کی رونق سے دلی بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی،

علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ-۷۱۵ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، ضیاء الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین یحیٰی، محی الدین کاشانی، قمر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیالیس علما دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے،

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی دہلوی، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال تھے، جن کے دامن تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جون پوری پرورش پاکر ملک العلماء بن کے نکلے۔

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم

اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علماء کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ، بخارا، کاشان، فرغانہ (ترکستان)، رے اور دمشق کے علماء کے نام تھے تو اب ملتان، بھکر، ہانسی، دہلی، تھانیسر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے جاتے ہیں، ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے، بھکر سندھ میں ہے، ہانسی پنجاب کے موجودہ ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے۔

مورخ ضیاء برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (۶۹۵ھ تا ۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علماء کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں، وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں: "در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت و در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و رے و روم و در ربع مسکوں نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موے می شگافتند و ہر سالے چندیں طالبان علم از ایشاں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت می رسیدند، و مستحق جواب دادن فتویٰ می شدند و بعضے از ایشاں استاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند، چنانچہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرپاہی و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم

لہ مضمون "اسلامی نصاب درس" مولانا سید عبدالحئی مرحوم الندوہ فروری ۱۹۰۹ء۔

و مولانا ظهیر الدین لنگ و قاضی مغیث الدین بیانه و مولانا رکن الدین سنامی و مولانا تاج الدین کلاهی
و مولانا ظهیر الدین بهکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کولی و مولانا وجیه الدین پایلی و
مولانا منهاج الدین تاجی و مولانا نظام الدین کلاهی و مولانا نصیر الدین کره و مولانا نصیر الدین صابونی
و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا کریم الدین جوهری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمید الدین مخلص مولانا
برهان الدین بهکری و مولانا مجد الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ و مولانا وجیه الدین مطو و مولانا علاء
کرک و مولانا حسام الدین بن شادی و مولانا حمید الدین بیانی و مولانا شهاب الدین ملتانی و مولانا
فخر الدین هانسوی و مولانا فخر الدین شاقلی و مولانا صلاح الدین سترکی و قاضی زین الدین ناقله و مولانا
وجیه الدین رازی و مولانا علاء الدین صدر الشریعه و مولانا میران ماریکله و مولانا نجیب الدین ساوی و
مولانا شمس الدین تمر و مولانا صدر الدین گنه بک و مولانا علاء الدین وجودی و مولانا شمس الدین یحیی
و قاضی شمس الدین گازرونی و مولانا صدر الدین آدری و مولانا معین الدین لونی و مولانا افتخار الدین
رازی و مولانا معز الدین اندهپتی و مولانا نجم الدین انتشار و چهل و شش استاد مذکور که من القاب اسامی
ایشان نوشته‌ام آنند که من در پیش بعضے تلمذ کرده‌ام و بخدمت بعضے رسیده، و بیشترے را در مسند افادت
و درس و محافل و مجالس دیده، و بسیاران از شاگردان مولانا شرف الدین پوشنجی و استادان دیگر که من
القاب ایشان نیاورده‌ام در عهد علائی بر صدر حیات بوده، و مدام سبق می‌گفتند. در آخر عهد علائی
مولانا علم الدین نبیره شیخ بهاء الدین زکریا که جهان علم و عالم دانش بود در دهلی رسیده، و اگر من خواهم که همه
تاریخ عهد استادان و متعلمانے که در علم استادی رسیده بودند ذکر کنم بتطویل انجامد و از غرض باز مانم افسوس
هزار افسوس که قدر و قیمت بزرگی و فضل آن استادان سلطان علاء الدین نه دانست که یک حق از صد

[1] ملتانی.

حقوقِ ایشان نگزاردہ، و نہ معاصرانِ عہد دانستہ کہ خاکِ قدم آنچناں استادان را در چشمِ جہاں بیں
خود کشند، و نہ من کہ مولف ام دراں ایام خبرے از جلال و کمالِ ایشاں ادراک کردم، و امروز کہ قرنی بیشتر
گذشت کہ آں عدیم الامثال بجوارِ رحمتِ رب العالمین پیوستہ اند و بدرگاہ و قربِ حضرتِ بے نیازی
ترقی کردہ و بعد از ایشاں نہ چو ایشاں و نہ ہزارم بجزوِ ذاتِ ایشاں مرا دیگرے در نظر آمدہ۔ بعضے کہ قدر
قیمتِ ایشاں در یافتہ ام کہ اگر در کمالاتِ علوم و تفنن ہر یکے مجلسے بہ نویسم مقصر باشم۔ و دراں ایام کہ
استادان کہ ہر یکے ابو یوسف قاضی و محمد شیبانی عہد و عصرِ خویش بودند بر صدرِ حیات افادت می کردند
اگر مفتیِ طمطراقِ استاذی بر سر کردہ از خراسان و ماوراءالنہر و خوارزم و یا از شہرے دیگر در دہلی برسیدی
کمالاتِ علومِ بزرگانِ مذکور را مشاہدہ کردی سبق درست گرفتے و بہ تمہ پیشِ ایشاں بہ زانوے ادب
در آمدی، و اگر در حیاتِ آں استادان تصنیفی جدید ہر علمے کہ فرض کنند از بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق
شہر آوردندی کہ اگر استادانِ شہرہا آں تصنیف را استحسان و اعتبار کردندی [illegible] و شہرہ
آمدے، و مقصود از ذکرِ ایشاں در تاریخ علائی آن است کہ چہ حضرت و عہدے بود کہ دراں عہد و عصر
چندیں متفننانِ نفائسِ علوم بر صدرِ حیات در افادتِ علوم مشغول باشد و چگونہ آں عہد مستثنائے
عصر و آں شہر مستثنائے شہرہاے ربع مسکون نباشد۔ (فیروز شاہی برنی صفحہ ۳۵۳ کلکتہ)

علم کا قافلہ پورب کو

ان بزرگوں کی نسبتِ وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں
ایک طرف اگر کاشان، فاریاب، رے، گازرون وغیرہ کے نامور تھے، تو ان کے پہلو بہ پہلو آپ
ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام (پٹیالہ)، بیانہ (ریاست بھرت پور)، ہانسی، پنجاب
دلی، اندرپت (دہلی کے پاس)، کڑہ (الہ آباد کے پاس)، کول (علی گڑھ)، پائل، سرکوہ (بانکی؟)

کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں یعنی علم کا قدم اب عجم سے بڑھ کر پورب کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ ان بزرگوں کی عظمت و جلالت یہ بھی کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی و رازی کا ہمسر بتاتا ہے جن کی توثیق و سند سے بخارا و سمرقند و خوارزم اور عراق کے اماموں کی تصنیفیں معتبا اور تربیا پاتی تھیں۔

بدایوں غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی، اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل **بدایوں** معلوم ہوتی ہے حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاحِ معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملا دیا، اسی نام میں اس سرزمین کے دوسرے امور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (اُستادِ نظام الاولیاء) اور شیخ جمال بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ نخشبی بدایونی وغیرہ ہیں، خواجہ نخشبی بدایونی وہ ہیں جنھوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطے اڑائے ہیں، تصوّف میں اُن کی دو کتابیں سلک السلوک اور "کلیات و جزئیات" ہمارے کتبخانہ میں ہیں،

کڑہ بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑہ اب بھی ایک قصبہ ہے مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے شرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا، سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بدنداں ہے اسی شہر میں دریا کنارے گذرا تھا، عہد علائی میں مولانا نصیر الدین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور ان کے بعد مولانا مظہر کڑہ کا نام آتا ہے جن کے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڑھ کو ہاتھ آئے ہیں، یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے مرید تھے[1]

اودھ بدایوں اور کڑہ سے ملا ہوا وہ صوبہ ہے جس کو اودھ کہتے ہیں، یہ اصل میں اُس شہر کا نام تھا

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۸۰

جس کو رام اور لچھمن کے مولد بننے کا فخر حاصل ہو جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں نے اس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا، اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا۔

دلی جب زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے نور سے جگمگا رہی تھی، اس کی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں، اس مطلع خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا اس کا نام شمس الدین یحییٰ الاودی ہے، یہ اودھ کے تھے، اسی نے اودھی کہلاتے ہیں، اسی زمانہ میں اس تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی، اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے،

ان سے پہلے مولنا فرید الدین کا نام آتا ہے جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے، مولنا فرید الدین اودھی اور نظیر الدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحییٰ اودھی ہیں، اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی ہیں، اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا،

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے لکھتے ہیں: "مولنا علاء الدین نیلی کہ خلیفۂ سلطان المشائخ بود . . . . در کشف بعض کشاف و مفتاح شغل نہ داشت در مجلس مولنا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود، قاری کشاف خدمت مولنا علاء الدین نیلی اودھی بود، و خدمت مولانا شمس الدین یحییٰ و علمائے اودھ سامع بودند ترحم"

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درگاہ میں اودھ کے علماء کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا جنہیں سے تین نے خاص امتیاز پایا،

١- شمس الدین محمد بن یحییٰ (اودھی) المتوفی ٧٤٧ھ

٢- نصیر الدین محمود چراغ دہلی (اودھی) المتوفی ٧٥٧ھ

٣- شیخ علاء الدین نیلی (اودھی) المتوفی ٧٦١ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کی پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے خلفاء میں اودھ کے قصبہ گوپامئو (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے، اودھ کے علماء جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگتے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوتا کہ راستہ میں اُن سے ملتے جائیں، سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے: "یاران اودھ چنانکہ مولانا شمس الدین یحییٰ و شیخ نصیر الدین محمود و مولانا علاء الدین نیلی و عزیزان دیگر چوں از خدمت سلطان المشائخ باز می گشتند فرمان می شد چوں در گوپامئو برسید خواجہ مبارک را ببینید" (ص ٢٣٠) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار گوپامئو (ہردوئی) کے ادھر ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے اودھ سے اصل مقصود قوا جودھیا ہے، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا، ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (ص ١٩١) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں، جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ٨٨١ھ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں، ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے، جس کو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر (قدس سرہٗ) سمنانی المتوفی ٨٠٨ھ کی خوابگاہ بننے کی عزت حاصل ہے،

قنوج اور کڑا — دلی اور مالک پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا، اس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کڑہ (الہ آباد) تھی مالک پورب کے دونوں بازوؤں پر یہ دو شہر آباد تھے، ان

دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی، قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہت اور پورنیہ ہو کر بنگال، اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کڑہ سے پار ہو کر جونپور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھ کر بنگال، یہی دونوں راستے آج بھی ہیں، ایک ای، آئی ریلوے ہے اور دوسری پی، این، ڈبلیو،

ظفرآباد اور جونپور سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دورے ہندوستان کے مغربی اور شرقی حصوں میں اتصال بڑھ گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا، اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خاں، اور دوسرے کا فخر الدین جونا تھا، پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفرآباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) نے جونپور آباد کیا، یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی کیونکہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جونپور میں قیام کیا تھا۔[1]

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جونپور و ظفرآباد کے حلقہ میں اسلامی نوآبادیوں نے وسعت پائی، ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جونپور کو اپنا مرکز بنایا، اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملیگا: "در حوزۂ جون پور رفت، یعنی اقطاع قنوج و کڑہ (الٰہ آباد) و اودھ و سندیلہ (سندیلہ؟) و دلمئو و بہرائچ و بہار و ترہت را در قبض و تصرف خود آورد"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج، بہرائچ اور الٰہ آباد سے لیکر بہار اور ترہت (مظفر پور و دربھنگہ وغیرہ) تک ملک پورب کی وسعت تھی، آٹھویں صدی کے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں: بدر الدین اودھی، تاج الدین کڑوی، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال ستر کھ (بارہ بنکی)

---

[1] خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ و لکھنوتی کی منزلیں تاریخوں میں پڑھو۔ [2] آئین اکبری جلد ۲ نولکشور۔ [3] مبارک شاہی ص ۱۴۰، فرشتہ میں ۷۹۶ھ ہے۔

آباد ہوا، اسی طرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو ارباب فضل وکمال نے پورب کا رُخ کیا، اس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار شرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی، شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی، اور جونپور آکر رخت اقامت ڈالا، بادشاہ وقت نے بیش از بیش قدر دانی کی،

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا، ان کے تین لڑکے ہوئے صفی الدین، فخر الدین، اور رضی الدین تینوں نے اپنے نانا کے درس وکمال سے فیض پایا، شیخ صفی الدین نے درس و افادہ کا بازار گرم کیا، عربی صرف ونحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی ان ہی کی تصنیف ہے، شیخ صفی الدین اسی زمانہ میں، ردولی جاکر سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی سے جو ان دنوں وہاں مقیم تھے مرید ہوئے، شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر ہوئے، ان بھائیوں کی اولاد نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی، جن کے سلسلہ میں اب تک شیوخ کی خاندانی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے، شیخ صفی الدین نے ۸۲۰ھ میں وفات پائی، شیخ صفی کے ایک بیٹے ابو المکارم اسمٰعیل المتوفی ۸۵۴ھ تحریری ہیں جن کے لئے صفی نے دستور المبتدی لکھی، اور انہی کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں،

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا، اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پاکر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد کے پاس جس کا نام مسجد اٹالہ ہے دفن ہوئے یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی، قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلی سے لائے تھے، دلی میں انھوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی

قصیدہ لامیہ مشہور روزگار ہے، تحصیل علم کی جونپور کی سند پر جب اکثر وہ بیٹھے تو ان کے فیض کمال سے مشرق کی ساری سرزمین سلطانجی کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں یہ فیض جاری ہوا،

اودھ صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا، اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا جو بعد کو فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا حضرت شاہ ابو العباس المتوفی ۷۳۲ھ اور شیخ بہاء الدین کبیر المتوفی ۸۵۵ھ شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کر رہے ہیں۔ اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دار السلطنت بنایا ۱۱۹۳ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا، مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہو چکی تھی،

لکھنؤ لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا، چونکہ قنوج اور جونپور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی اس لئے رفتہ رفتہ اس کی آبادی بڑھنے لگی، تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملے کے بعد ۸۰۱ھ میں ملتا ہے، تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا، اور ظفر خاں نے گجرات میں خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج و اودھ و کڑہ اور جونپور میں اور خضر خاں نے لاہور و دیپالپور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں، تو ملو اقبال خاں نے دو آبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی، مبارک شاہ نے پورب میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیئے، اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے، فرشتہ میں ہے "ملو اقبال خاں بہ قنوج رفتہ خواست کہ بر جونپور و لکھنؤ لشکر کشد" [۱۵۹] ۸۰۹ھ اس سے معلوم ہوا کہ جونپور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی،

اسلام کی بہت سی آبادیاں ان نفوس قدسیہ کی یادگار ہیں جو آبادیوں سے نفور ویرانوں اور سنسان

سیدانوں کی نمائش میں رہتے تھے، لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے،

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانہ میں تھے، اور جنھوں نے ۷۸۵ھ میں وفات پائی ہو، ان کے مرید و خلیفہ شیخ قوام الدین تھے، محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ "مقبرۂ او در لکھنؤ است یزار و یتبرک"[1] ۸۴۰ھ میں وفات پائی، ان کے مرید و خلیفہ شیخ سارنگ تھے جنھوں نے ۸۵۵ھ میں رحلت کی، ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ مینا ہیں جن کا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پاس) ہے، مخدوم شیخ مینا نے ۸۸۴ھ میں انتقال فرمایا،

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے، کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی کے کنارے لکھنؤ آکر بسے تھے، تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے، اور شیخ موصوف سے ملنے کے لئے وہ لکھنؤ وارد ہوئے، اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں جو بڑے عالم ہوئے ہیں، ان کی اولاد اب تک لکھنؤ، دیوہ اور [illegible] میں آباد ہے[2]، شیخ اعظم پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم و فضل کا مرکز بنایا، وہ اس تحفہ کو جون پور سے لائے،

تیموری حملہ کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جونپور گئے تھے ان میں سے قاضی عبدالمقتدر دہلوی کے پوتے شیخ ابوالفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر و مدرس تھے، اور قاضی شہاب الدین کے معاصر و ہم استاد تھے، ۸۵۴ھ میں وفات پائی[3]، ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان ہوئے، اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی، شیخ اعظم کے تلامذہ شیخ صفا لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیرآبادی

۱؎ صفحہ [illegible]، ۲؎ تاریخ علمائے ہند ص [illegible]، ۳؎ اخبار الاخیار ص [illegible]، ۴؎ تاریخ علمائے ہند ص [illegible]،

المتوفی ۹۲۲ھ میں شیخ کا مزار خیرآباد میں اب بھی مرجع خلائق ہے۔

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور قدیم خاندان شیخ مینا الدین لکھنوی کا ہے، ان کے صاحبزادہ شیخ الاسلام سعد اللہ فرزند لکھنوی ہیں، ۹۲۰ھ میں وفات پائی، ان کے جانشین اور صاحبزادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں، اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں، ہمارے کتب خانہ میں شیخ امین کے مکتوبات اور ان کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں، ان کے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنھوں نے ۹۷۳ھ میں وفات پائی، تاریخ علماے ہند کا بیان ہے[1]

"مدام بدرس و افادۂ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسۂ وے طلبۂ مستعد رجوع می کردند" شیخ امین الدین کے صاحبزادہ شیخ حامد تھے جن کے نام مکتوبات میں متعدد خط ہیں، اس نسخہ کے آخر میں اس خاندان کی ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہے: شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین ابن شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ بن ناز از خویشان اشرف شیخ شیخ مینا الدین بن بندگی حضرت مخدوم قطب فخر الدین ہوئی۔

لکھنؤ کے پاس گسنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، یہاں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر بن شیخ سلطان جو مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث کی اولاد سے تھے پیدا ہوئے، انھوں نے لاہور جا کر علم کا فیض حاصل کیا، اور لکھنؤ آکر درس و افادہ کی مسند بچھائی، جو چالیس برس تک جاری رہی، لکھنؤ کے اطراف میں ان کے ذریعہ بڑا علم پھیلا، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا وسط ہے، ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب کا ہے جن کی نسبت سے لکھنؤ میں اب تک گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے، ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی، ان کا اصل وطن جونپور کے ضلع کا مشہور قصبہ منڈیاہو ہے، مگر عمر لکھنؤ میں گذری اور یہیں دفن ہوئے، شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ

[1] تاریخ علماے ہند ص ۷۵۔

شیخ محمد آفاق لکھنوی، محمد رضا لکھنوی، اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی در اصل پٹنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، تقدیر لکھنؤ لے آئی، اور اپنے پیر کے پائینتی آسودہ ہیں۔

موجودہ اعظم گڈھ اور غازیپور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڈھ کے ضلع میں ہے۔ یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے۔ اُن کے صاحبزادہ شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے۔ میر محمد شفیع بھی شیخ عطاء اللہ کے شاگرد تھے۔ شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر محمد شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کی۔ اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے، اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علماء ان کی شاگردی پر نازاں ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی، اور لکھنؤ کی خاک میں شیخ پیر محمد کے پہلو میں

فرنگی محل

اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے جو لکھنؤ کے اُفق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے، اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر ان کے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا۔ یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا، یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہا تھا جس میں مولانا حالی وغیرہ نامور پیدا ہوئے، دوسرا حصہ اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں۔ اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے۔

[illegible]

میر فتح اللہ شیرازی

میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لیکر ہندوستان وارد ہوئے اور ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہنچے، اکبر نے بڑی قدر کی۔ ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا، اور وہیں خاک میں مل گیا۔ ہندوستان میں متاخرین علمائے ایران کی معقولی کتابوں کا رواج میر موصوف ہی کے ذریعہ پھیلا۔ میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں: "تصانیف علمائے متاخرین ولایت

مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان میر بہ ہندوستان آورد، و در حلقۂ درس او نیز و جم غفیر از حاشیہ نشل میر استفادہ کردند و از آں عہد معقولات را رواج دیگر پیدا شد (صفحہ ۲۴۳)

ملا عبدالسلام لاہوری میر فتح اللہ شیرازی کے دامنِ تربیت میں جن باکمالوں نے پرورش پائی ان میں ایک ملا عبدالسلام لاہوری ہیں، ساٹھ برس تک درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھا ۱۰۳۷ھ میں نوّے سال کی عمر میں وفات پائی،

ملا عبدالسلام دیوہ اودھ میں (موجودہ بارہ بنکی کے ضلع میں) دیوہ ایک مشہور قصبہ ہے، اس سرزمین نے ملا عبدالسلام لاہوری کے ہمنام ملا عبدالسلام دیوہ کو پیدا کیا، ملا صاحب پورب میں ایک حد تک پڑھ پڑھا کر لاہور گئے اور ملا عبدالسلام لاہوری کے درس میں بیٹھے، اور مدرس بن کر نکلے، گو شاہجہاں نے فوج میں محکمۂ افتا کا منصب ان کو دیا تھا، مگر لاہور کی آب و ہوا ان کو آخر پھر دیوہ کھینچ لے گئی، اور وہاں جم کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے ذریعہ معقولات کا رواج ہندوستان کے مشرق و مغرب میں شروع ہوا،

ملا دانیال چوراسی ملا دیوہ کے کئی شاگرد مشہور ہوئے، پچھم میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب میں ملا دانیال چوراسی (الہ آباد)، شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ نعمت اللہ آبادی، ملا دانیال چوراسی کے شاگرد ملا قطب الدین سہالوی تھے،

شیخ محب اللہ الہ آبادی خیرآباد کے مشہور قصبہ کے پاس صدرپور ایک مقام ہے، وہاں ایک فاروقی خاندان آباد تھا، اس خاندان میں ایک بزرگ شیخ محب اللہ پیدا ہوئے جنھوں نے لاہور جا کر ملا عبدالسلام دیوی سے کسبِ کمال کیا، اور واپس آکر الہ آباد کو اپنے فیضِ تربیت کا مرکز بنایا، ان کو ہندوستان کے

ل مآثر الکرام ص ۲۳۲

محی الدین ابن عربی کہا جائے تو بجا ہو اسی نے ابن عربی کو شیخ اکبر کہا جاتا ہو تو ان کو شیخ کبیر اسی خاندان کے آخری یادگار مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی تھے،

قاضی محمدی

شیخ محب اللہ الہ آبادی کے شاگردوں میں کئی اصحاب باکمال ہوئے جنھیں سے قاضی محمدی الہ آبادی میر سید کبیر قنوجی اور میر سید محمد تقی فیاض اور وجیہ کے نام مشہور ہیں شیخ نے ۱۰۵۸ھ میں وفات پائی

قاضی محمدی الہ آبادی کے زمرۂ تلامذہ میں ملا قطب الدین سہالوی بھی داخل ہیں ملا صاحب نے قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی کی اس سلسلہ سے ملا قطب الدین فرنگی محل لکھنؤ اور دائرہ شاہ محب اللہ الہ آباد کے سنگم مجمع البحرین ہیں،

شیخ آصف الہ آبادی

قاضی محمد آصف الہ آبادی ملا عبد السلام دیوہ کے ممتاز شاگرد و محل میں خیرآباد کے پاس کے گاؤں صدر پور کے رہنے والے تھے اور الہ آباد میں قاضی تھے، ان کے شاگرد شیخ محمد افضل الہ آبادی ہوئے

شیخ محمد افضل الہ آبادی

غازی پور کے ضلع میں سید پور شرفا کا مشہور قصبہ ہے اسی قصبہ میں وہ نامور بزرگ پیدا ہوئے جن کو دنیا شیخ محمد افضل الہ آبادی کے نام سے جانتی ہے الہ آباد کے بارہ دائروں میں ایک دائرہ اسی فخر فضیلت کی کشش سے پیدا ہوا ہے انھوں نے قاضی آصف الہ آبادی اور ملا نور الدین جونپوری سے فیض پایا شیخ کو اپنے زمانہ میں قبول خاص و عام حاصل ہوا ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی مزار الہ آباد میں ہے،

شیخ افضل کے تلامذہ میں ایک ان کے صاحبزادہ شیخ محمد یحییٰ خوب اللہ المتوفی ۱۱۴۴ھ میں اور شاہ خوب اللہ کے جانشین شاہ محمد فاخر الہ آبادی المتوفی ۱۱۶۴ھ اور شیخ محمد ناصر ہیں، اس سلسلہ فیض نے پورب کے اضلاع کو سرسبز و شاداب کیا، اور ظاہر و باطن کے برکات سے بھر دیا،

ملا قطب الدین سہالوی ملا قطب الدین سہالوی نے جیسا کہ اوپر گذرا شیخ دانیال چوراسی اور قاضی گھاسی الہ آبادی سے کسب فیض کیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر ہمارے قصبات تک دار العلوم تھے، ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درسگاہ ترتیب دی اور جوق جوق طلبہ دیار و اطراف سے آنے لگے لیکن زمینداری کے ایک جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور نیتی پور کے خانزادوں کے ہاتھ سے شہادت پائی، ان کے مشہور تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، حافظ امان اللہ بنارسی، قاضی شہاب الدین گوپاموی، حاجی صبغۃ اللہ خیرآبادی محدث، اور مولوی اسمٰعیل اورنگ آبادی وغیرہ ہیں۔

ملا قطب الدین شمس آبادی ملا صاحب کے مطلع درس سے جو پہلا آفتاب چمکا، وہ سید قطب الدین شمس آبادی ہیں، سید موصوف اصل میں اینٹھی کے رہنے والے تھے جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد اس قطب نے اینٹھی کے بجائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا، یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں قنوج کے پاس ہے۔[1] آزاد لکھتے ہیں، بہ وطن شمس آباد دست افادہ گسترد و جم غفیرے را بافاضۂ دانش و بینش بمرتبۂ کمال و تکمیل رسانید آخر شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہو گیا۔

قاضی محب اللہ بہاری اس جم غفیر میں جو ملا شمس آبادی کی دانش گاہ سے مرتبۂ کمال کو پہنچے ایک نامور شخص نیتی پور سے آکر شامل ہوئے، یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑا محب علی پور سے، دنیا ان کو قاضی محب اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم کے نام سے پہچانتی ہوگی، تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے، یہ عالمگیر کا زمانہ تھا، محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے، ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور شیخ فرید الدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاند پورہ میں دفن ہوئے، بعض

---

[1] میر آزاد نے مآثر الکرام میں ذکر قطب الدین شمس آبادی کا شاگرد لکھا ہے جو عرب جا کر شیخ طاہر فتنی اور ابراہیم کردی مدنی سے حدیث پڑھی۔

صاحبوں نے ملا محب اللہ بہاری کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا ہے[۱]

حافظ امان اللہ بنارسی | قاضی محب اللہ بہاری کے ایک اور معاصر امام وقت تھے، ان کا نام حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین ہے، بنارس وطن تھا، ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیر زمانہ سے درس لیکر فارغ ہوئے تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا، حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جونپوری نے ملا باقر داماد استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا، حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے، شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جن پر خود پیر کو فخر تھا، ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی، ان کی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے، اور میں نے اس کی زیارت کی ہے،

ملا نظام الدین فرنگی محل | ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا، جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا، اسی مناسبت سے وہ فرنگی محل کہلاتا تھا، یہی وہ فرنگی محل ہے جو آگے چل کر یورپ کا سب سے بڑا دار العلوم بنا،

ملا قطب الدین کے کئی صاحبزادے تھے، مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوئے جن کی نسبت سے عربی کا درس نظامی مشہور ہے، موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود ان کے والد ماجد کا آغوش تربیت ہے، باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علما کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا، اپنے والد کے شاگردوں ملا قطب الدین شمس آبادی اور حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا اور آخری تکمیل شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے کی، ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ

[۱] حاشیۂ شرح مواہب از مولوی عبد الحلیم لکھنوی، معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں کو تطبیق یعنی ملا قطب الدین سہالوی اور ملا قطب الدین شمس آبادی میں جو دونوں استاد و شاگرد ہیں التباس ہو گیا ہے،

ملا نظام الدین کی ذاتِ گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے، یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا، میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے معاصر ہیں، اپنے تذکرہ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں: "و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اعتبار و اشتہار عظیم یافت، امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بہ مولوی دارند، و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند، و کسے کہ سلسلۂ تلمذ با وی رساند بین الفضلا علم امتیازی افرازد، و مرحوم بسیار را دیدہ شدہ کہ تحصیل جا ہائے دیگر کردہ اند، و برائے اعتبار خاتمہ فراغ از مولوی کنند" ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی، ابدی آرام گاہ لکھنؤ ہے۔

مدرسین فرنگی محل

ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً ڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتمۃ العلماء مولانا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک یہ چشمۂ فیض یکساں جاری رہا، اور اب بھی انکی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ قائم ہے۔

ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادہ ملا عبد العلی ہیں، جن کے دم سے یہ چشمۂ فیض ترقی کر کے دریائے فیض بن گیا اور دنیا نے ان کو بحر العلوم کہہ کر پکارا، یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر پہلے رامپور، پھر بوہار ضلع بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہو کر بحرِ ہند کے کناروں سے مل گیا، مدراس میں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے جن کے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں، ان میں سے ملا کمال الدین، ملا حسن، ملا مبین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں، اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے۔

ملا کمال الدین اور ملا حمد اللہ

ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور باکمال شاگرد ہیں، ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی ۱۱۷۵ھ اور دوسرے ملا حمد اللہ سندیلوی المتوفی ۱۱۶۰ھ، یہ ملا حمد اللہ وہی ہیں جن کی کتاب حمد اللہ مشہور ہے، انھوں نے سندیلہ میں اپنی درسگاہ جمائی جس سے بہت سے نامور پیدا ہوئے

ملا باب اللہ جون پوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری

ملا محمد اللہ کے ایک نامور شاگرد ملا باب اللہ جون پوری ہیں، اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں، جن کا حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد درسِ نظامی میں لیاقت کی آخری منزل ہے، اکبر نامہ[۱] ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اور بہار میں مخدوم شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے ۱۱۸۰ھ[۱] سال وفات ہے،

سلسلۂ خیر آباد

ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلوی ہیں فضل و کمال کا یہی وہ نخلِ بارور ہے جس سے خیر آباد کی وہ شاخ نکلی ہے جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے، اور جو سلسلۂ خیر آباد کے نام سے مشہور ہے، ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا حمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسبِ فیض کیا، اور طلبہ کو اپنی تصنیف و تدریس کی دولت سے مالا مال کیا، اور بارہویں صدی کے آخر میں ۲۳ محرم ۱۱۹۸ھ کو اس دنیا کو الوداع کہا، ملا محمد اعلم کے شاگردوں میں ان کے بھانجے مولوی سید عبد الواجد خیر آبادی کامل ہوئے، اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعلم کے شاگرد ملا ارشد تھے، اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبد الواجد خیر آبادی، ملا عبد الواجد سے ملا نظام الدین اعلم اور ملا نظام اعلم سے مولانا فضل امام خیر آبادی نے پڑھا، مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمد نامہ ان ہی کی آمد طبع کا نتیجہ ہے ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی،

مرحوم کے جانشین صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی تھے جن کے دمِ عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے، دیار و اطراف سے طلبہ نے ان کی

۱؎ تذکرہ علمائے ہند میں ۱۱۳۰ھ لکھا ہے، یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ وہ حضرت مرزا جانجاناں علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور مرزا صاحب ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کے ایک رسالہ پر تقریظ لکھی ہے، جب مرزا صاحب [illegible] برس کی عمر میں مرشد نہیں بن سکتے تھے، اور نہ تقریظ لکھ سکتے تھے، مرزا صاحب [illegible] نے باب [illegible] میں ان کا واقعہ [illegible] نقل فرمایا ہے اور تاریخ ۱۱۸۰ھ لکھی ہے، (مکاتیب مرزا صاحب)

۲؎ یہ گاؤں [illegible] ضلع پٹنہ کے قریب ہے۔

طرف رجوع کیا، اور منطق و فلسفہ کو کثرت سے ملک میں رواج دیا۔ شروح و حواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں، داخلِ درس ہوئیں۔ فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ اور شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ کتابیں جو عربی طلبہ کی تعلیم کے لئے لکھیں، اور مقبولِ عام ہوئیں۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی، اور وہ بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔ ان بزرگوں میں جن تین ارباب کمال کی درسگاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف الصدق مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی، مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری جون پوری۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رامپور کی قدردانی سے رامپور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا۔ مولانا برکات احمد صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے، ان کے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے۔ مولانا برکات احمد صاحب نے رئیسِ ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا۔ مولانا ہدایت اللہ خاں رامپور سے جونپور آئے، اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی۔ ان میں ہر ایک کی درسگاہ سے سینکڑوں علماء تعلیم پا کر نکلے۔

فرنگی محل کا اخیر دور

اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دارالعلوم میں فضل و کمال کی بیسیوں بساطیں بچھی رہیں ان ہی میں سے مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے۔ مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی احمد ابوالرحیم صاحب فرنگی محلی کے صاحبزادہ اور جانشین تھے، ان کے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحبزادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے، اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے، والد کے بعد ان کی جگہ یہ مفتی ہوئے، روز و شب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت

انجام دیتے، جب [illegible]ھ میں سلطنتِ اودھ کی بساط الٹی تو علم کا یہ مرکز جونپور کے مدرسۂ امام بخش میں منتقل ہوگیا، یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے، اور وہیں [illegible]ھ میں ابدی نیند سو گئے،

مفتی محمد ابوالرحم کے دوسرے صاحبزادہ کا نام مولوی اکبر تھا، ان کے بیٹے مولوی امین اللہ اور ان کے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے، مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علماء مفتی ظہور اللہ، مفتی محمد اصغر، مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا، اور یہ شہرت حاصل کی کہ علماء نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، [illegible]ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندا کی طلب پر باندا گئے، اور کئی برس رہ کر وہاں سے واپس آکر جونپور کے مدرسۂ امام بخش میں مدرس ہوئے، اور نو سال تک جونپور ان کی شمعِ وجود سے پرنور رہا، ۱۲۸۵ھ میں ایک عالم کو شمامۂ علم سے معطر فرما کر حیدرآباد میں وفات پائی،

انہی کے صاحبزادہ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں، زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد سے وراثت پائی، باندہ میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جونپور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی، سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، اور درس و تدریس شروع کیا، کتابیں لکھیں، بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے، فقہ و حدیث و اصول کی معرکۃ الآراء کتابیں چھاپیں، علماء سے مناظرے کئے، ان کی شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی، اور سینکڑوں علمائے اعلام ان کی درسگاہ سے کامل ہو کر نکلے، اور ملک ملک میں پھیلے، ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالمِ جاودانی کا سفر کیا، علماء کو مولانا کی ناگہانی وفات کا وہ صدمہ ہوا، کہ شمس العلماء مولانا سید عظیم آبادی نے یہ تاریخِ وفات کہی،

سـ فرنگی محل زعلم تھی

مولانا عبدالحی صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولانا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی، یہ ملا بحر العلوم کے پوتے اور اپنے والد مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کے شاگرد تھے،

اخیر زمانہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس محفل کے چراغ سحر تھے،

علمائے جونپور | پورب کے دوسرے علمی مرکز جونپور کا نام بار بار آیا ہے مگر ابھی تک وہاں کے ارباب کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے تیموری حملے کے بعد ۸۰۴ھ میں جب جونپور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم وفضل کی مسند بھی بچھی، اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں، لیکن اس سے چند سال پہلے جونپور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفر آباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا،

علمائے ظفر آباد | یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ظفر آباد شہزادہ ظفر خاں کے نام پر بسا تھا، مگر یہ اس قصبہ کی شاہانہ تاریخ ہے، اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی کہتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۹۰ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کیساتھ ملا قطبی کوئی ایک مجاہد بھی شریک تھے، اس وقت ظفر آباد کے مقام پر راجہ دیوپال نام ایک راجہ تھا، ان مجاہدنے رزم ہوسنا کیا اور شہید ہو کر یہیں دفن ہوئے، بعد کو یہ جگہ گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہوئی اور اس وقت یہ مزار شیخ شمس خاں پور کے رقبہ میں داخل ہے،[1]

مخدوم شیخ صدر الدین چراغ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں ۶۹۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، یہ شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے، شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر ارشاد کی تعمیل کو عزت سمجھتے تھے، شیخ صدر الدین پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہو کر ظفر آباد میں

قیام پذیر ہوئے، مشہور ہو کہ غیاث الدین تغلق نے ان سے اپنی ایک بیٹی کا نکاح کر دیا تھا، اور ان کے لئے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا، جو "چراغ ہند کے محل" کے نام سے ابتک مشہور ہو، اس عمارت پر فارسی کا یک کتبہ منقوش تھا[1]

بعہد ملک ذو القرنین ثانی	بنائے شرع را از عدل بانی
غیاث الدین و دنیا بو المظفر	سلیمان خاتم و جمشید افسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم	کہ بر وی شد جہانداری مسلّم
برآمد این حصار چرخ ایوان	کہ در رفعت گذشت از فرق کیوان
دوشنبہ بست و پنجم روز بودہ	ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں ساعتی در وقت مسعود	ز ہجرت سال ہفصد بست و یک بود (۷۲۱ھ)
مظفر شد چو شد معمور این شہر	ظفرآباد نامش بودہ در دہر

اس کتبہ سے پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۰ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو بسایا تھا۔[2]

چنانچہ اسی کے بعد سے ظفرآباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے، تاتاریوں کے حملے کے زمانہ میں ایک بزرگ مع پنج صاحبزادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے، بعد کو ان کے ایک

---

[1] شاہان شرقی کی یادگاریں، انگریزی، خان بہادر فصیح الدین مرحوم کلکتہ چھاپ ۱۹۲۲ء ص ۲۳ [2] اس مقام پر فرشتہ ص ۳۰۶ و مبارک شاہی ص ۸۶ کی اس نقل کو دور کرنا ہو کہ حضرت غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ یکم شعبان ۷۲۰ھ لکھی ہو، مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہو اور صحیح وہ ہو جو فیروز شاہی ص ۴۲۸ میں ضیاء برنی نے اور تاریخ بدایونی ص ۲۲۲ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے یعنی ۷۲۰ھ۔

صاحبزادہ سید تاج الدین کڑہ کے ناظم مقرر ہوئے، اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم اسد الدین نے پورب میں ظفرآباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا، اور مخدوم آفتاب ہند ظفرآبادی کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۷۹۲ھ میں وفات پائی، ان کا مزار اور ان کی اولاد اب تک ظفرآباد میں ہے۔

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا، اور دلی بادشاہ تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میر منشی مقرر ہوئے، اور آخر میں ترک منصب کرکے حضرت نظام الاولیاءؒ کے حلقہ میں آئے، دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی یادگار چھوڑا۔[1]

پورب میں علمی ترقی کے چار دور

پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں، ایک سلطنت شرقی[2] کا عہد، دوسرا لودیوں کا، تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ، اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر۔

شرقی سلطنت کا دور

پہلا دور ۷۹۶ھ سے شروع ہو کر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے۔

یہ عہد حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا، قنوج کو لیکر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں، قصبوں میں قاضیوں مفتیوں

[1] تجلی نور، نور الدین ظفرآبادی جلد دوم صفحہ [illegible]۔ [2] سلاطین شرقی کے نام اور زمانے یہ ہیں:

۱۔ سلطان الشرق خواجہ جہاں، ۷۹۶ھ۔ ۸۰۲ھ	۴۔ سلطان محمود شرقی، ۸۴۴ھ۔ ۸۶۲ھ
۲۔ مبارک شاہ شرقی، ۸۰۲ھ۔ ۸۰۴ھ	۵۔ سلطان محمد شاہ شرقی، ۸۶۲ھ۔ ۸۶۳ھ
۳۔ سلطان ابراہیم شرقی، ۸۰۴ھ۔ ۸۴۴ھ	۶۔ سلطان حسین شاہ شرقی، ۸۶۳ھ۔ ۸۸۱ھ

اور شیوخ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جاری تھیں، اور ہر جگہ علم و فضل کی مسندیں بچھی تھیں اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اُس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے آج بھی ان اطراف میں شرفاء کے جو خاندان آباد ہیں، ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں، اور جن کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ انہی شرقی بادشاہوں کا فیض ہے یا پھر آخر میں سلطان عالمگیر کے عطیے ہیں، سادات اور صدیقی، فاروقی اور انصاری شیوخ کی آبادیاں قنوج سے لیکر جونپور سے گذر کر غازی پور تک پھیلی تھیں، خانقاہیں اشغال واوراد سے اور درسگاہیں علم کے طلبگاروں سے بھری پڑی تھیں، شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفرآباد اور جونپور کے در و دیوار کو پُر نور بنا دیا تھا، علماء اور اہلِ ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں :-

۱- نور الدین ابی محمد بن مخدوم سید اسد الدین المتوفی ۸۲۲ھ ،

۲- قطب الدین ابو الخیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی ۹۰۹ھ میں وفات پائی ،

۳- ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفرآباد المتوفی ۸۳۹ھ ،

۴- قاضی تاج الدین ناجی ظفرآبادی المتوفی ۸۳۱ھ ،

۵- قاضی نصیر الدین گنبدی قاضی جونپور، شاگرد قاضی عبد المقتدر دہلوی، المتوفی ۸۱۸ھ ،

۶- ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، دنیا بادشاہانِ اسلام کی اس علمی قدردانی کو یاد رکھے تو اچھا ہو کہ ملک العلماء جب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو آیا، مزاج پرسی کے بعد پانی کا ایک پیالہ لیکر مولانا کے سر پر پھرا کر یہ دعا مانگی کہ خداوندا

یہ جان تو دور کر کے اس کے بدلے میں میری جان صدقے میں قبول فرما، آخر دونوں آگے پیچھے سنہ [illegible]ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے،

۷۔ ملا شیخ عبدالملک عادل فاروقی بن نواب عماد الملک وزیر سلطنت شرقی شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی المتوفی سنہ [illegible]ھ۔

۸۔ ملا علاء الدین عطاء الملک برادر شیخ عبدالملک شاگرد قاضی شہاب دولت آبادی، یہ قاضی صاحب نے اپنی فارسی شرح کافیہ میں انہوں اس شاگرد کا ذکر کیا جو کہ اسی کے پاس خاطر سے لکھی گئی،

۹۔ شاہ ابوالفتح جون پوری نبیرہ قاضی عبدالمقتدر دہلوی المتوفی سنہ [illegible]ھ،

۱۰۔ شیخ محمد عیسیٰ جون پوری شاگرد قاضی دولت آبادی،

۱۱۔ قاضی سماء الدین قتلغ خان وزیر سلطان شرقی المتوفی سنہ [illegible]ھ،

یہی وہ زمانہ ہے جب ظفرآباد اور جون پور کے بعد فیض آباد کے اطراف اور لکھنؤ میں علماء اور مشائخ اپنی درسگاہیں اور خانقاہیں اور شرفاء اپنے گھرانے آباد کر رہے تھے چنانچہ لکھنؤ میں شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ فراز کندوری المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ قوام الدین المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ سارنگ المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ محمد اعظم لکھنوی، شیخ سعد الدین لکھنوی المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ ضیا لکھنوی شاہ ضیاء المتوفی سنہ [illegible]ھ، خیرآباد میں شیخ سعد الدین خیرآبادی المتوفی سنہ [illegible]ھ، رودولی میں مخدوم احمد عبدالحق المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ امین الدین المتوفی سنہ [illegible]ھ، شیخ صفی الدین ان کے بھائی قاضی رضی الدین اور بیٹے شیخ ابوالمکارم اسماعیل المتوفی سنہ [illegible]ھ، کچھوچھہ (فیض آباد) میں مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی سنہ [illegible]ھ، دریاباد میں شیخ محمد مخدوم بخش المتوفی سنہ [illegible]ھ، اور اجودھیا میں شیخ سراج الدین چشتی المتوفی سنہ [illegible]ھ تعلیم و ارشاد کی

مسندوں پر جلوہ آرا تھے،

مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے مکتوبات میں ایک خط قاضی شہاب دولت آبادی کے نام ملتا ہے جس میں سلطان ابراہیم شرقی سے کسی سفارشِ خیر کا تذکرہ ہے، شیخ سعد الدین لکھنوی اور سلطان شرقی کے وزیر سماء الدین قتلغ خان کے درمیان دوستی کے تعلقات مستحکم تھے، شیخ کے صاحبزادہ شیخ امین الدین لکھنوی کے مکتوبات[1] میں ایک خط وزیر موصوف کے نام موجود ہے جس میں شیخ سعد الدین لکھنوی کی وفات کا پورا حال لکھا ہے، سماء الدین قتلغ خاں گو وزیر تھے، مگر اپنے زمانہ کے مشہور علما میں تھے،

لودیوں کا زمانہ | اگرچہ سلطان حسین شرقی کی نالائقی اور غرور ونخوت سے ۸۸۳ھ میں سلطان بہلول لودی کے ہاتھ سے شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، مگر خوش قسمتی سے اس وقت لودیوں[2] کا جو خاندان دلی کے تخت پر فرمانروا تھا وہ علم وفن اور فضل وکمال کا پورا قدر شناس تھا، ان کے زمانہ میں ہندوستان نے علم وتہذیب اور صنعت وزراعت کے کاموں میں بڑی ترقی کی، بلکہ شرقی بادشاہوں نے اس سرزمین میں تہذیب وتمدن کے جو پودے لگائے تھے وہ لودیوں کے عہد میں پوری طرح بار آور ہوئے،

غازیپور میں پھول اور پھل لگائے گئے سکندرپور زیبا سلطان سکندر لودی کی آبیاری سے چنبیلی وہاں کے عطر کی چنبیلی اب تک مشہور ہے، اور گلابوں کا تختہ بن گیا، جونپور ان پھولوں کے تیلوں اور عطروں سے مشام جان کو معطر کرنے لگا، اور اب تک کر رہا ہے، یہی عطر پروری علمی میدانوں میں بھی ہوئی یعنی

---

[1] ... [2] تذکرۃ المصنفین [3] لودی پٹھانوں کی سلطنت ۸۵۵ھ سے ۹۳۲ھ تک رہی ہے تاہم ۹۳۲ھ میں بابر نے ابراہیم لودی کا خاتمہ کیا اور تیموری سلطنت کی بنیاد ڈالی، لودی سلطانوں کے نام اور زمانے یہ ہیں:-

۱- سلطان بہلول لودی، ۸۵۵ھ — ۸۹۴ھ

۲- سلطان سکندر لودی، ۸۹۴ھ — ۹۲۳ھ

۳- سلطان ابراہیم لودی، ۹۲۳ھ — ۹۳۲ھ

علوم و فنون کے گلستانوں میں نئے سرے سے بہار آئی، تیموری بادِ صرصر نے جن پودوں کو مرجھا دیا تھا، ان میں دوبارہ جان پڑی، اور دلّی سے پھر جونپور تک علم کے قافلے پھر آنے جانے لگے۔ ہندوؤں میں فارسی تعلیم کا رواج بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا،

لودیوں کے خاندان میں سکندر لودی کا زمانہ سب سے بہتر تھا، غرض اس نے اطراف و دیار سے علماء کو جمع کیا، اور نئے سرے سے علم کو فروغ دیا[1]، خود شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا، اس کے عہد کے مشہور شاعر شیخ جمالی ہیں، جنھوں نے ملکوں کی سیاحت کی تھی، اور ملا جامی کی صحبت سے جامِ فیض پیا تھا، اسی زمانہ میں دو بھائی ملتان سے ادھر آنکلے، شیخ عبداللہ تلنبی[2]، اور شیخ عزیز اللہ تلنبی، پہلے نے دہلی کو، اور دوسرے نے سنبھل (مراد آباد) کو اپنا مرکز بنایا، ملا بدایونی لکھتے ہیں: "و از جملہ علمائے کبار در زمانِ سلطان سکندر، شیخ عبداللہ تلنبی در دہلی و شیخ عزیز اللہ تلنبی در سنبھل بودند، و ایں ہر دو عزیز بہنگامِ خرابی ملتان بہندوستان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادند، و قبل از شیخ عزیز شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نبود[3]۔" ملا بدایونی اپنے بزرگوں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شیخ عبداللہ کی درسگاہ سے میاں لادن، جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گوالیاری اور میران سید جلال بدایونی وغیرہ جیسے چالیس علمائے متبحر پڑھ کر نکلے[4]، سلطان لودی خود درس میں شریک ہوتا، اور اس خیال سے کہ سلسلۂ درس میں شاہی آداب و تکلفات سے خلل نہ پڑے، چپکے سے صفِ پائیں میں آکر بیٹھ جاتا تھا، اور آخر میں سلام مسنون کر کے رخصت ہو جاتا تھا[5]۔

شیخ عبداللہ نے ۹۲۲ھ میں وفات پائی۔

---

[1] دیباچہ اخبار الاخیار شیخ دہلوی صفحہ ۵ مطبوعہ احمدی مطبع دہلی ۱۳۲۲ھ [2] تلنبہ ملتان میں ایک گاؤں تھا۔
[3] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [4] تاریخ بدایونی ذکر سکندر لودی [5] ایضاً۔

پورب میں ان دونوں سوزیوں کی درسگاہ بہت مشہور تھی، ایک میاں حاتم سنبھلی المتوفی ۹۲۰ھ اور دوسرے ملا الہداد جونپوری المتوفی ۹۲۳ھ پہلے کی نسبت ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ انھوں نے عمر میں تیس دفعہ سے زیادہ مفتاح کا، اور چالیس دفعہ سے زیادہ مطول کا درس دیا، اور دوسرے کی نسبت لکھا ہے کہ انھوں نے فقہ میں ہدایہ کی، نحو میں کافیہ کی شرحیں، اور تفسیر مدارک پر حاشیہ لکھا،

مولانا الہداد جونپوری اس عہد میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو شرقیوں کے زمانہ میں قاضی دولت آبادی کی تھی، پورب مولانا الہداد کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں سے معمور ہو رہا تھا جونپور کے محلہ رضوی خاں میں مولانا کی درسگاہ تھی، مگر اب نشان تک نہیں، ان کے صاحبزادے شیخ بھکاری جونپوری تھے، سلطان سکندر کا عہد پایا تھا،

سکندر لودی کے زمانہ میں عرب سے ایک اور خضر طریقت کا ورود ہندوستان میں ہوا، یہ سید رفیع الدین محدث شیرازی ہیں، یہ معقولات میں محقق جلال الدین دوانی کے، اور حدیث میں حافظ شمس الدین سخاوی کے شاگرد تھے ۹۵۴ھ میں وفات پائی، ان کی ذات معقول و منقول دونوں کا مرج البحرین تھی،

ان بزرگوں کے علاوہ پورب کی زمین اس زمانہ میں حسب ذیل اکابر کے وجود سے فیضیاب تھی،

۱۔ شیخ معروف چشتی جونپوری مرید مولانا الہداد جونپوری،

۲۔ شیخ دانیال جونپوری استاد سید محمد جونپوری،

۳۔ شاہ حسن غازی پوری مرید علی غازی سید المتوفی ۹۰۰ھ،

۴۔ سید محمد جونپوری، المتوفی سنہ ۹۱۰ھ،

۵۔ شیخ حسن بن طاہر بہاری جونپوری المتوفی ۹۰۹ھ دہلی میں مزار ہے۔

۶۔ شیخ محمد حسن بن شیخ حسن جون پوری، المتوفی ۹۴۳ھ دہلی میں دفن ہوئے،

۷۔ قاضی صلاح الدین خلیل جون پوری، نبیرہ قاضی نظام الدین کیکلانی،

تیموریوں کا زمانہ ۹۳۲ھ سے تیموری سلاطین کا دور شروع ہوا علم و فن نے ملک میں وسعت پائی، سلاطین اور امراء کی قدر دانیوں نے ہر جگہ علم کے بازار کو رونق پر رونق دی، اس عہد میں سید عبد الاول جون پوری ذکر کے قابل ہیں جو شاید ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری لکھی، قاضی صلاح الدین خلیل کے شاگرد تھے، اور غالباً حدیث کا فیض گجرات و حرمین کے سفر سے لائے، بیرم خان خاناں کی دعوت پر دہلی آئے، اور آخر وہیں کی خاک ان کی ابدی خوابگاہ ہوئی، ۹۶۸ھ وفات کی تاریخ ہے،

دوسرے بزرگ ملا یوسف مشہور بہ قاضی خاں ظفر آبادی ہیں، شیخ حسن بن طاہر سے فیض علم پایا، ہمایوں نے ہر چند چاہا کہ وہ اس کی نذر قبول فرمائیں، مگر دست قناعت شرمندۂ احسان نہ ہو سکا، ۹۷۰ھ وفات کا سال ہے،

تجلی نور ص ۲۰۰

تیموری عہد کا شباب شاہجہاں کا زمانہ ہے، پورب کی سرزمین اس زمانہ میں علم و فن کے ستاروں کی کثرت سے آسمان بنی ہوئی تھی، ان ستاروں میں آفتاب کی حیثیت استاد الملک ملا محمد افضل جونپوری کو حاصل تھی، ان کے پدر بزرگوار رداوندہ سے چل کر ہندوستان آئے اور ہندوستان میں بھی یہ سعادت خطۂ پورب کو حاصل ہوئی، وہ ردولی میں قاضی مقرر ہوئے، ۹۹۲ھ میں یہیں ملا محمد افضل کی پیدائش ہوئی، پنجو الساجد کو ابتدائی کتابیں پڑھ کر پچھم کا رخ کیا، دہلی پہنچ کر ملا شیخ حسین شاگرد ملا طاہر لاہوری

سے فن کی کتابیں پڑھیں، اور حدیث کا درس ملا ابو حنیفہ شاگرد مخدوم الملک حکیم علی گیلانی سے پایا، علوم وفنون کی تکمیل کے بعد جون پور کو اپنے فیض وبرکات کا مرکز بنایا، اس درسگاہ کے فیض نے جونپور کو دارالعلم بنادیا اور شاہجہاں کی زبان سے وہ فقرہ کہلوادیا جو ابد تک یادگار رہیگا،

"پورب شیراز ماست"

اس مطلع علم سے جو علماء وقت چمکے ان میں دو آفتاب و ماہتاب ایسے ہیں جن کے علم کی روشنی کبھی ماند نہ ہوگی، ایک دیوان عبدالرشید المتوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے ملا محمود جونپوری المتوفی ۱۰۶۲ھ استاد اکثر کہا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد دو ایسے علماء وقت کبھی کہیں نہیں پیدا ہوئے، دیوان عبدالرشید وہ ہیں جنھوں نے فن مناظرہ میں رشیدیہ لکھی جو ہمارے نصاب درس میں داخل ہے، شاہجہاں کے بار بار اصرار پر بھی خلوت خانۂ قناعت سے باہر قدم نہیں رکھا، ملا محمود نے دنیا کو فلسفہ میں شمس بازغہ اور بلاغت میں فرائد جیسی کتابیں دیں، پہلے شاہجہاں کے دربار میں تھے پھر ایک درویش (ملا میر لاہوری) کا طعنہ سنکر جون پور میں درسگاہ جماکر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اٹھے،

استاد الملک کے دوسرے شاگرد ملا ضیاء الدین محدث، شیخ چندن محدث اور ملا شیخ احمد زین زاہد المتوفی ۱۰۹۵ھ ہیں، استاد الملک کی نسبی نسل آگے نہیں چلی، البتہ ان کے بھائی شیخ محمود ان کے بیٹے شیخ حامد ان کے بیٹے ملا محمد یوسف، ان کے پوتے شیخ احمد اور ان کے بیٹے قاضی سلطان قلی خاں قاضی کوڑہ جہان آباد وغیرہ ایک دوسرے کے بعد دیئے سے دیا جلاتے رہے،

[illegible]

عہد شاہجہانی و عالمگیری میں قاضی محمد حسین جونپوری (جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں سے ایک ہیں) ملا محمود ثانی جونپوری شاگرد دانشمند خاں، شیخ محمد ماہ جونپوری، شیخ شمس الدین جونپوری

ملا نور الدین جونپوری اور آخری دور میں ملا بابا اللہ جونپوری شیخ محمد افضل سندیلوی (غازیپوری) (الٰہ آبادی) علم و فن کے نامور فرمانروا گذرے،

عالمگیر کے زمانہ میں شمالی کا آفتاب بلند ہوا یعنی ملا قطب الدین، ملا نظام الدین، ملا کمال الدین اور ان کے اساتذہ اور معاصرین شیخ محب اللہ صدر پوری الٰہ آبادی، قاضی آصف صدر پوری الٰہ آبادی، ملا حمد اللہ سندیلوی، ملا امان اللہ بنارسی، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا محب اللہ بہاری وغیرہ پیدا ہوئے، جن کے بدولت اودھ کے حدود سے لیکر بہار کی آخیر سرحد تک علم و فن اور فضل و کمال کی بنا پڑ گئی،

غرض اس وقت شاہجہان اور عالمگیر کی فیاضی اور علمی قدردانی کے بدولت قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تک میں علما اور مدرسین پھیلے تھے، بادشاہوں کی طرف سے اُن کو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں جنکے سبب سے وہ بے نیاز ہو کر علم و فن کی خدمت میں لگے تھے، ان میں کچھ ایسے مستغنی بھی تھے جنھوں نے یہ درد سر نہیں خریدا، اور اپنا سارا کاروبار خدا کے سپرد کرتے رہے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد جب جگہ جگہ نئی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں، پورب کے جو قصبے اپنی مردم خیزی میں نامور ہوئے اُن کے نام ترتیب سے یہ ہیں، بدایوں، امروہہ، سنبھل، مرادآباد، رامپور، بریلی، شاہجہانپور، فرخ آباد، قنوج، شمس آباد، سندیلہ، بلگرام، خیرآباد، صفی پور، ملیح آباد، کاکوری، نصیرآباد، (رائے بریلی)، لکھنؤ، مانک پور، کڑا، الٰہ آباد، خاص پورب میں جونپور، غازی پور، سید پور، گھوسی، بھیرا، چریا کوٹ، شمس پور، مئو وغیرہ،

جون پور کے مدرسے | ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی کے عہد سے لیکر آخیر زمانہ تک جون پور میں جو درسگاہیں علماء مدرسین کے زیر اہتمام عہد بعہد قائم ہوتی رہیں، ریاض[1] جون پور کے مصنف نے اپنی کتاب

---

[1] مؤلفہ سید محمد مہدی جون پوری، مطبوعہ ۱۲۹۶ھ ؁ ۱۸۸۱ء

کے آخر میں اس کی حسب ذیل فہرست دی ہے اور لکھا ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ تک وہ قائم تھے،

۱- مدرسہ ملک اصلاح قاضی شہاب الدین دولت آبادی المتوفی سنہ ۸۴۹ھ،

۲- مدرسہ مولانا الہداد المتوفی سنہ ۹۲۳ھ،

۳- مدرسہ ملا محمود صاحب شمس بازغہ المتوفی سنہ ۱۰۶۲ھ،

۴- مدرسہ ملا عبدالباقی،

۵- مدرسہ ملا نورالدین،

۶- مدرسہ مفتی سید مبارک،

۷- مدرسہ ملا محمد حنیف،

۸- مدرسہ ملا شیخ حامد،

۹- مدرسہ ملا شیخ محمد ماہ،

۱۰- مدرسہ ملا محمود، اکبر سے محمد شاہ تک،

۱۱- مدرسہ ملا محمد افضل " "

تجلی نور تاریخ جونپور کی تلاش سے چند مدرسوں کے نام اور معلوم ہوئے ہیں،

۱۲- مدرسہ میر محمد صلح،

۱۳- مدرسہ ملا صدر جہاں سنہ ۱۱۱۹ھ،

۱۴- مدرسہ ملا شمس الدین، سنہ ۱۱۹۰ھ،

۱۵- مدرسہ حافظ غلام شاہ،

۱۶- مدرسہ میر محمد عسکری، سنہ ۱۱۱۹ھ،

۱۷- مدرسہ مولوی ثناء اللہ،

۱۸- مدرسہ مولوی عطاء اللہ،

۱۹- مدرسہ سید ضیاء الدین خاں،

۲۰- مدرسہ معین الدین حکاک،

۲۱- مدرسہ اسد الملک المتوفی سنہ ۱۰۶۲ھ،

۲۲- مدرسہ شیخ رکن الدین " سنہ ۱۱۳۱ھ،

۲۳- مدرسہ ملا عبدالباری خضری " سنہ ۱۰۳۶ھ

۲۴- مدرسہ خانقاہ رشیدیہ، ملا مرادی " سنہ ۱۰۶۹ھ

۲۵- مدرسہ ملا شمس پہ " سنہ ۱۰۳۵ھ،

۲۶- مدرسہ ملا شیخ محمد صادق " سنہ ۱۰۶۳ھ،

۲۷- مدرسہ ملا خلیل " سنہ ۱۰۶۹ھ،

۲۸- مدرسہ ملا وہاب اللہ،

۲۹- مدرسہ ملا جمیل " سنہ ۱۱۲۳ھ

اودھ کی نوابی کا زمانہ: تیموریوں کے اخیر دور میں لکھنؤ میں شیوخ نے طاقت پائی تھی، عالمگیر کے زمانہ میں فدائی خاں یہاں کے حاکم تھے، ان کے بعد شیوخ میں سے نواب ابو المکارم خاں نے جن کے نام سے لکھنؤ میں مکارم نگر کا محلہ آباد ہے لکھنؤ کی حکومت پائی، مگر رعایا ان کی سخت گیری سے تنگ آگئی تھی، اسی وقت جب کہ محمد شاہ کے زمانہ میں برہان الملک[1] سعادت خاں (المتوفی ۱۱۵۱ھ) نے ۱۱۳۶ھ میں اودھ کی صوبہ داری پائی وہ مذہباً شیعہ تھا اس نے اپنے صوبہ میں بہت سے علمی خاندانوں کی جاگیریں، معافیاں اور وظیفے ضبط کر لیے نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خاندان جو درس و تدریس اور علم کی اشاعت میں مصروف تھے، نوکری اور سپاہ گری کی خدمت پر مجبور ہوئے، برہان الملک کے بعد اس کا بھانجا اور داماد صفدر جنگ صوبہ دار ہوا ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کا صوبہ بھی اسی کے سپرد ہوا، جس میں جون پور وغیرہ قصبات داخل تھے، نوابوں نے یہاں کے علما اور شرفا کی جاگیریں اور معافیاں بھی ضبط کیں، اور اہل علم کے خاندان تباہ حال ہو گئے، میر آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں: "پورب شہرستان ہیں اوراق و دقائق جویان نفس و آفاق جلوہ پیرا باد کہ سرزمین پورب از قدیم الایام معدن علم و فضل است، سید محمد کرمانی صاحب سیر الاولیاء کہ مرید سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی است قدس سرہ می گوید کہ مولانا فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ بود، مولانا علاء الدین نیلی اودھی پیش شیخ الاسلام قاری کشاف خواند

---

[1] نوابانِ اودھ کا سلسلۂ حکومت یہ ہے:-

۱- برہان الملک سعادت خاں، ۱۱۳۶ھ - ۱۱۵۲ھ (۱۷۲۲ء - ۱۷۳۹ء)
۲- ابو المنصور خاں صفدر جنگ، ۱۱۵۲ھ - ۱۱۶۷ھ
۳- نواب شجاع الدولہ، ۱۱۶۷ھ - ۱۱۸۸ھ
۴- آصف الدولہ یحییٰ خاں، ۱۱۸۸ھ - ۱۲۱۲ھ
۵- نواب سعادت علی خاں، ۱۲۱۲ھ - ۱۲۲۹ھ (۱۷۹۷ء - ۱۸۱۳ء)
۶- نواب غازی الدین حیدر، ۱۲۲۹ھ - ۱۲۴۳ھ (۱۸۱۳ء - ۱۸۲۷ء)
۷- نصیر الدین حیدر، ۱۲۴۳ھ - ۱۲۵۳ھ (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء)
۸- محمد علی شاہ، ۱۲۵۳ھ - ۱۲۵۸ھ (۱۸۳۷ء - ۱۸۴۲ء)
۹- امجد علی شاہ، ۱۲۵۸ھ - ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۲ء - ۱۸۴۷ء)
۱۰- واجد علی شاہ، ۱۲۶۳ھ - ۱۲۷۲ھ (۱۸۴۷ء - ۱۸۵۶ء)

مولانا شمس الدین یحیی و دیگر علمای اوده سامع بودند. ترجمهٔ مولانا شمس الدین یحیی در اوایل این فصل گذشت. مکرّم
جمیع صوبه جات هند به وجود عاملان علوم تفاخر دارند سیما صوبه‌های پایهٔ تخت خلافت که به واسطهٔ مرجعیت عامّه
کمالات هر قسم در آنجا فراهم می آید، و از تراکم افکار و تجاذب عقول اهل هر عصر کمالات نفس ناطقه را به علم عقلی و نقلی و
به غیر آن به پایهٔ بالاتری رسانند. اما صوبهٔ اوده و اله آباد خصوصیتی دارد که در هیچ صوبه نتوان یافت. چه تمام
صوبهٔ اوده و اکثر صوبهٔ اله آباد به فاصلهٔ پنج کروه و نهایت ده کروه تخمیناً آبادی شرفا و نجباست که از سلاطین و
حکام وظائف و زمین مدد معاش داشته اند، و مساجد و مدارس و خانقاهات بنا نهاده، و مدرسان عصر در هر جا
ابواب علم به روی دانش پژوهان کشاده، و صلای الطلب العلم در داده، و طلبهٔ علم خیل خیل از شهری به شهری
می روند و هر جا موافقت دست بهم داد به تحصیل مشغول می شوند. و صاحب توفیقان هر معموره طلبهٔ علم را نگاه
می دارند و خدمت این جماعه را سعادت عظمی می دانند. صاحبقران ثانی شاهجهان انار الله برهانه می گفت،
"پورب شیراز مملکت ما است" و تا عهد دولت ۱۱۱۸ خلد نشین روایه واقعی هنگامهٔ علم و علما درین گل زمین گرمی داشت
تا آنکه برهان الملک سعادت خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاه حاکم صوبهٔ اوده شد، و اکثر بلاد و محال صوبهٔ
اله آباد نیز مثل دارالخیر جونپور و بنارس و غازی پور و کره مانکپور و گوره و جهان آباد و غیرها ضمیمهٔ حکومت
گردید، او وظائف و سیورغالات خانواده‌های قدیم و جدید یک قلم ضبط شد و کار شرفا و نجبا به پریشانی کشید،
و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشته به پیشهٔ سپاه گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل به آن درجه نماند
و مدارسی که از عهد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمن‌های ارباب کمال بیشتر برهم خورد، انّا
لله و انّا الیه راجعون. و بعد انتقال برهان الملک نوبت حکومت به خواهرزادهٔ او ابو المنصور خان صفدر جنگ
رسید و وظائف و اقطاعات به دستور زیر ضبط ماند، در اواخر عهد محمد شاه ۱۱۶۱ تیغ تسلط بر اطراف صوبه داری اله آباد

نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد، و تتمۂ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفتِ ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط در آمد، در عہدِ محمد
شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار بر اربابِ وظائف تنگ تر گرفت، و تا ہمین تحریر کتاب
ایں دیار پامالِ حوادثِ روزگار است، لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْراً، باوجود ایں خرابیہا رواجِ علم خصوصاً
معقولات بہ کیفیتے کہ آنجا است در قلمرو ہندوستان ہیچ جا نیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طراز اند و بہ وصول
اعلیٰ مراتب کمال ممتاز، مصرعہ

"اصد جہاں کہ دولت باز ایں خرابہ جاے است"

(مآثر الکرام دفتر اول صفحہ ۲۲۲)

بنگالی مورخ مسٹر لا اپنی کتاب "ترقیِ تعلیم ہند بعہد مسلمانان" میں لکھتا ہے:-

"تذکرۂ علماء اور سیر الملوک میں جن کے اقتباسات تذکرہ میں موجود ہیں، اس شہر کے متعلق دلچسپ تفصیلات
ہیں، جن سے نہ صرف وہاں کے علماء اور طلبہ کی نجی زندگی، بلکہ دوسرے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، ان سے
پتہ چلتا ہے کہ جب سے اس شہر کی بنیاد ڈالی گئی، ہندوستان کے تمام حصے خصوصاً صوبۂ اودھ اور الٰہ آباد کے لوگ یہاں
تحصیلِ علم کے لئے جمع ہوتے تھے، سلطان ابراہیم شرقی کے عہد میں یہ شہر اس کا پایۂ تخت ہوا، اس وقت یہاں
سینکڑوں مدرسے اور مسجدیں تھیں، طلبہ اور اساتذہ کو جاگیریں ملتی تھیں، تاکہ وہ تمام مادی ضرورتوں سے
بے فکر ہو کر علم و فن میں مشغول رہیں، ہمایوں کی حکومت میں بھی جونپور علم و فن کے مرکز کی حیثیت سے مشہور
رہا، اس کی شہرت جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی قائم رہی، شاہجہاں نے تو اس کو شیرازِ ہند کا نام
عطا کیا، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے عہد تک یہ دستور رہا، کہ دہلی کے فرمانروا جونپور کے حاکم کے
پاس برابر فرامین بھیجا کرتے تھے کہ وہ شہر کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی
نہ کریں، جونپور کے واقعہ نگار ہر مدرسہ کی روداد احتیاط سے مرتب کیا کرتے تھے، اگر رودادوں سے کسی مدرسی

کوئی احتیاج معلوم ہوتی تو امداد دی جاتی شہزادے اور امرا جب اس شہر سے گذرتے تو یہاں کے مدرسوں کا معائنہ کرتے اور سلاطین دہلی کو خوش کرنے کے لئے ان کو عطیے دیتے ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء) میں نواب سعادت خاں نیشاپوری اودھ، بنارس اور جون پور کا صوبہ دار مقرر ہوا، ایک بار وہ اس شہر میں آیا، لیکن یہاں کے علما اس سے ملنے نہیں آئے جس سے اس نے اپنی اہانت محسوس کی، انتقاماً اس نے ان کی تمام جاگیریں اور وظائف ضبط کرلینے کا حکم جاری کر دیا، حکم کی تعمیل ہوئی جس کے بعد سے جون پور برباد ہو گیا، طلبہ اور اساتذہ منتشر اور مدرسے خالی ہو گئے، ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں نواب آصف الدولہ نے مختار الدولہ کی مرضی کے مطابق ان جاگیروں کو واپس کرنے کا حکم دیا، لیکن ایلچ خاں نے احتجاج کیا، اسی زمانہ میں جون پور انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔"

(پروسیڈنگ آف محمڈن ریڈنگ، از، ان، ان، لا، صفحہ ۱۰۲-۳)

اس کے بعد ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے حوالے سے وہ کہتا ہے:۔

"وارن ہیسٹنگز نے شاید اس شہر کا معائنہ کیا تھا، سرازرٹ تو اس شہر میں ضرور آیا ۱۷۸۸ء میں ڈنکن کی آمد کا ذکر روداد (PROCEEDINGS) کی ان جلدوں میں موجود ہے جو بنارس کے کلکٹر و کمشنر کے کاغذات کی الماریوں میں منتقل رہی ہیں، وہ اس شہر کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کرتا ہے، اس کے زوال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور ارباب علم کا مستقر تھا، اسی لئے اس کو ہندوستان کا شیراز کہتے تھے۔

یہاں کے مدارس کی گذشتہ شہرت کے قصوں کے سوا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے لیکن مسٹر ڈنکن کے مذکورۂ بالا بیان کے علاوہ اور بھی بہتر اسباب موجود ہیں جن کی بنا پر ہم اس شہر کو ہندوستان کا شیراز یا ازمنۂ وسطیٰ کا پیرس کہہ سکتے ہیں، فیروز شاہ نے اپنے بھائی کی شہرت اور عظمت کے مطابق اس کو علوم و فنون کا مرکز بنانا چاہا،

جون پور کے بزرگوں نے فنون کی سرپرستی کرنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھا چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شاہی پایۂ تخت میں جب ہنگامے شروع ہوئے تو شہر کے علماء اور فضلا منتشر ہوگئے۔ اسی زمانہ میں جون پور کی پُرامن اور پرسکون فضا میں علوم و فنون کا فروغ ہوا۔ محمد شاہ کے عہد میں بھی جون پور میں [illegible] مشہور مدارس تھے۔ اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔ ان مدارس میں سے ایک کے بانی کا انتقال چودھویں صدی کے وسط میں ہوا۔ دوسرے کا سترھویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہاں صرف مدارس کے علوم ہی کا فروغ نہیں ہوا بلکہ یہاں کی حسین مساجد فن تعمیر کی ترقی کی بھی شہادت دیتی ہیں۔"

(دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا جلد اول (جونپور کی شرقی تعمیرات) از فوہرر و اسمتھ [illegible])

بہرحال ان سیاسی و مذہبی حوادث کے طوفان میں بھی علم و فضل کی وہ شمعیں روشن رہیں جن کی روشنی شاہانہ عنایتوں کے چشمۂ نور سے مستعار نہ تھی۔ اس زمانہ میں پورب کا خطہ اور خصوصیت کے ساتھ جون پور اور غازیپور کے اطراف میں ایسی شاندار بستیاں تھیں جن کے بوریائے فقر کی بلندی شاہی سے کم نہ تھی جیسے مولانا محمد حسن چریا کوٹی شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی، شاہ ابو الغوث گرم دیوان ساکن بھیرا (اعظم گڈھ) المتوفی [illegible] و مولانا شاہ محمد علی بھیروی نبیرۂ شاہ ابو الغوث گرم دیوان (اعظم گڈھ) شاگرد ملا بحر العلوم، ملا وہاب اللہ جون پوری شاگرد ملا محمد اللہ سندیلوی، شاہ نثار علی جونپوری المتوفی [illegible] شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی، مولوی کرامت اللہ چریا کوٹی شاگرد میر عسکری جونپوری و ملا محمد اللہ سندیلوی، شاہ محمد افضل غازیپوری الہ آبادی المتوفی [illegible]، ملا محمد ماہ دیوگامی (اعظم گڈھ) شاگرد ملا رکن الدین ہیرا بادی و دیوان عبد الرشید جون پوری، قاضی خوب اللہ جونپوری المتوفی [illegible] قاضی حسن سعید خاں جونپوری المتوفی [illegible] مولانا میر محمد عسکری شیعی المتوفی [illegible] مولوی عبد الغفار

سومگھر پوری (اعظم گڈھ) المتوفی سنہ [illegible]ھ مولانا غلام حسین جونپوری مصنف جامع بہادر خانی المتوفی سنہ [illegible]ھ، ملا ابوالخیر بن قاضی ثناء اللہ (ساکن نادہ پرگنہ مندیاہو ضلع جونپور) وغیرہ۔

دلی کے آخری خانوادۂ علم کا شہرہ عروج پر

آخری زمانہ میں جب دلی میں تیموریوں کا چراغ گل ہو رہا تھا، رشد و ہدایت کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا اور دلوں میں علم و فن کی خدمت کا نیا ولولہ پیدا ہوا، دلی کے خانوادہ میں اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ المتوفی ۱۱۷۶ھ کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز صاحب المتوفی ۱۲۳۹ھ اور اُن کے بھائیوں اور عزیزوں کا دور تھا، دور دور سے طلبہ دلی آتے تھے اور عقل و نقل کے چشموں سے سیراب ہو کر واپس جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ شاہ عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ معقولات میں میرزاہد ہروی کا اور حدیث میں شاہ ولی اللہ صاحب کے واسطہ سے مدینہ منورہ کے علماء اور محدثین سے فیضیاب تھا، اور مرج البحرین کا یہی رنگ فکر ان کے اخلاف میں نمایاں تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب (۱۲۳۰ھ) شاہ رفیع الدین صاحب (۱۲۳۳ھ) شاہ عبدالغنی صاحب، اور اُن کے اخلاف میں شاہ محمد اسحاق صاحب المتوفی ۱۲۶۲ھ نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب، اور مجددی خاندان کے ایک اور بزرگ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی کے دم سے نئی رونق پیدا ہوئی، اور وقت آیا کہ ہندوستان میں اسلام کا چہرہ اُن تمام بدعات و خرافات کے داغ سے پاک ہو جو جہالت اور غیر قوموں کے میل جول سے پیدا ہو گیا تھا، تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں شاہ صاحب کے خاندان میں دو ستارے اس وقت چمکے، مولانا اسمٰعیل صاحب شہید دہلوی (۱۲۴۶ھ) اور مولانا عبدالحی صاحب دہلوی۔ مولانا شاہ اسمٰعیل، شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے اور شاہ عبدالغنی صاحب کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحی

صاحب المتوفی ۱۲۴۳ھ شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور امام الزماں مولنا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید اور داعی تھے۔

اس دور آشنا تحریک نے جو عوام میں وہابیت کے نام سے مشہور ہوئی مسلمانوں میں مراسم شرک غیر شرعی رسم و رواج اور بدعات کے مٹانے میں بڑا کام کیا۔ ان بزرگوں کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد سارے ملک میں پھیل رہے تھے جس سے پورب کا خطہ خاص طور پر متاثر تھا، خاص جون پور اور اس کے اطراف میں متعدد بزرگ اس نیک کام میں لگے ہوئے تھے۔

۱۔ مولوی کرامت علی جون پوری نے اپنے لئے بنگال کے علاقہ کو پسند کیا، اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا کام اُن سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، اور فقہ میں مفتاح الجنۃ ان کی مشہور کتاب ہے ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ اس خاندان کے اخلاف نسلاً بعد نسلٍ اب تک اس فرض کو کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں۔

۲۔ مولنا محمد فصیح صاحب غازی پوری جو شاہ فضل سید پوری غازیپوری الٰہ آبادی کے پڑپوتے تھے، بنارس میں حضرت سید احمد صاحب بریلوی اور مولنا اسمٰعیل شہید صاحب سے فیض حاصل کیا۔ بہار، بنارس، اعظم گڈھ وغیرہ میں ان کے ذریعہ دین کی خدمت ہوئی ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ شاہ عبدالعلیم صاحب فصیحی غازی پوری اُن کے بیٹے اور شاہ ابو الخیر صاحب فصیحی غازیپوری ان کے پوتے تھے۔

۳۔ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری ستدابو ضلع جون پور کے رہنے والے تھے، حضرت شیخ محمد کرنی ظفر آبادی کی اولاد میں تھے، مولنا فضل رسول صاحب بدایونی اور مولنا احمد اللہ انامی شاگرد مولنا شاہ اسحاق دہلوی اور دوسرے بزرگوں سے پڑھا اور آخر مولنا اسمٰعیل شہید اور مولنا عبدالحی صاحب

دہلی سے علوم کی تکمیل کی، کچھ دنوں باندہ میں نواب باندہ کے ہاں رہے، خرجون پہنچ کر طرح اقامت ڈالی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، کچھ دنوں کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور وہیں حج و زیارت کے بعد [illegible]ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات بابرکات سے پورب کے خطہ میں بڑا فیض پھیلایا، سیکڑوں علماء آپ کے درس سے کامل ہو کر نکلے، اور دور دور تک دین کے اثر کو وسیع کیا، بدعات کو مٹایا، اور علم دین کو رواج بخشا، اس بابرکت فیض سے اعظم گڈھ کے اس حصہ میں بھی جہاں اب تک عربی اور مذہبی تعلیم کا رواج نہ تھا (یعنی اعظم گڈھ کی مسلم برادری میں) عربی تعلیم کا خیال پیدا ہوا، اور آپ ہی کی تحریک سے جون پور میں منشی امام بخش صاحب نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ان کے مشاہیر تلامذہ میں حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں، مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی جونپوری، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا سید محمد یعقوب دیسنوی بہاری، مولانا مصطفیٰ خیر بہاری مدرس مدرسہ خانقاہ سہسرام، مولانا شجاعت حسین بہاری، مولانا ولی محمد صاحب سکروری (اعظم گڈھ) محمد عمر غازیپوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی (استاذ مولانا شبلی مرحوم) مولانا حکیم اللہ ساکن بستی وغیرہ۔

اہل حدیث اور خالص حنفی

دہلی کے اس خاندان کے فیض تعلیم سے دو اہم سلسلے چلتے ہیں، ہندوستان میں اب تک ترکستان و خراسان کے اثر سے صرف فقہ حنفی کا رواج تھا، عرب کے خال خال شافعی آتے تھے، مگر ان کا اثر سواحل تک محدود تھا، اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جب ہند کی طرف عرب کی آمد و رفت کا دروازہ کھلا، تو ہندوستان اور عرب میں علمی تعلقات کا آغاز ہوا، چنانچہ شیخ بہلول حضرت

مجدد الف ثانی کے شیخ الحدیث) اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس فیض کو وہیں سے لائے، اس سے
حنفیت کے غلو کے ساتھ حدیث وسنت کی پیروی کا خیال دلوں میں پیدا ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب
مرحوم نے جب عرب کا سفر کیا، اور مختلف مذاہب کے علماء سے فیض پایا تو ان کا مشرب زیادہ وسیع ہوگیا،
وہ عملاً گو حنفی ہی رہے، مگر نظری اور علمی حیثیت سے وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، اس شان کا علانیہ جلوہ
ان کی مسوی ومصفی شرح موطا میں نظر آتا ہے، بانکی پور کے مشہور کتبخانہ میں صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ ہے
جس پر شاہ صاحب کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنے کو عملاً حنفی اور علماً وتدریساً حنفی وشافعی
لکھا ہے، اور اپنی بعض تالیفات میں قرأت فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کو ترجیح دی ہے جو فقہ حنفی کے خلاف ہے
شاہ صاحب کے بعد یہ رنگ اور نکھر گیا، مولنا شاہ اسحاق صاحب، مولانا شاہ عبدالغنی صاحب،
مولنا شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولنا عبدالحی صاحب دہلوی نے رد بدعت اور توحید خالص کی اشاعت
میں جو جد وجہد فرمائی، اُس نے دلوں میں سنت کی پیروی کا عقیدہ راسخ کر دیا، ان کے شاگردوں میں
یہ دونوں رنگ الگ الگ ہوگئے، شاہ اسحاق صاحب کے نامور شاگردوں میں مولنا شاہ عبدالغنی
صاحب مجددی مہاجر اور مولنا احمد علی صاحب سہارنپوری ہیں، مولنا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے ممتاز
شاگرد مولنا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولنا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہا اللہ بانی مدرسہ دیوبند
ہیں، اور پورب میں مولنا شاہ اسمٰعیل صاحب کے شاگرد مولنا سخاوت علی صاحب جونپوری
وغیرہ ہیں، اس سلسلہ میں رد بدعت اور توحید خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ
نمایاں رہا، مولنا شاہ اسحاق صاحب کے ایک دوسرے شاگرد[2] مولنا سید نذیر حسین صاحب بہاری

---

[1] زبدۃ المقامات [2] مولنا سید نذیر حسین صاحب کی مولنا شاہ اسحاق صاحب کی شاگردی کا مسئلہ بھی

دہلوی کا ہیں۔ اس دوسرے سلسلہ میں توحید خالص اور رد بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلہ کا نام اہلحدیث مشہور ہوا

تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علماء تھے،

مولانا سید نذیر حسین صاحب کے ذریعہ سے اہل حدیث کے سلسلہ کو بڑی ترقی ہوئی، موصوف کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا، انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر اپنے طریقہ کی اشاعت کی، اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں، پنجاب میں مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا عبدالمنان وزیرآبادی وغیرہ، یوپی کے خطہ میں مولانا امیر حسن سہسوانی، مولانا بشیر صاحب قنوجی، مولانا عبداللہ صاحب سنوی غازیپوری، مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) اہل حدیث و احناف میں ما بہ النزاع بن گیا ہے، احناف انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو شاہ صاحب سے بے پڑھے صرف تبرکاً اجازہ حاصل تھا، اور اہلحدیث ان کو حضرت شاہ صاحب کا باقاعدہ شاگرد بتاتے ہیں، مجھ کو نواب صدیق حسن مرحوم کے مسودات میں مولانا نذیر حسین کے حالات کا مسودہ ملا ہے اس میں بتصریح مذکور ہے کہ ۱۲۴۳ھ میں شاہ صاحب کے درس حدیث میں وہ داخل ہوئے، عبارت یہ ہے: "در ہمیں سال ۱۲۴۳ھ وائمۃ شیخ [illegible] حدیث شریف از مولانا محمد اسحاق مرحوم مغفور شروع نمودہ [illegible] مولوی [illegible] کابلی و مولوی عبداللہ سندھی و مولوی نوراللہ سروانی و حافظ محمد فاضل سورتی وغیرہم [illegible] خواندہ [illegible] جامع صغیر [illegible] مولوی بہاء الدین [illegible] قاضی [illegible] پانی پتی و نواب [illegible] خاں دہلوی [illegible] وغیرہم [illegible] شروع نمودہ [illegible] خواندہ [illegible] جامع ترمذی و نسائی [illegible] امام مالک [illegible] مولانا [illegible] اجازۃ [illegible] الوفاق [illegible] شاہ صاحب [illegible] تحریری انھوں نے [illegible] شوال ۱۲۷۰ھ کو حاصل کی ہو جب شاہ صاحب ہندوستان کو ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے،

مولنا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (دربھنگہ) مولنا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری اعظم گڈھ میں، اعظم گڈھ
کے ضلع پر خصوصیت کیساتھ مولنا فیض اللہ صاحب مئوی شاگرد مولنا سخاوت علی صاحب جونپوری
مولنا عبداللہ غازیپوری اور مولنا سلامت اللہ جیراجپوری کا زیادہ اثر پڑا، ملک میں اس سرے سے اس
سرے تک ان تینوں فرقوں میں مذہبی مناظرہ کا بازار گرم رہا، یہی وہ مذہبی ماحول ہے جس میں مولنا
شبلی مرحوم کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا،

پورب کے دو تین مدرسے انگریزی عہد میں جب انگریزی عملداری شروع ہوئی تو پورب میں پھر سے نئے مدرسوں
کی بنیاد پڑی، جن میں سے بعض بعض نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے دو ذکر کے قابل ہیں، مدرسۂ
اسلامیہ امام بخش جونپور اور مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور،

مدرسۂ اسلامیہ امام بخش جونپور جونپور میں منشی امام بخش ایک رئیس تھے، انگریزوں کی شروع عملداری
میں جب سررشتہ داری بڑی اہمیت رکھتی تھی وہ غازیپور میں فوجداری کے سررشتہ دار تھے، اس سے بڑی
نیک نامی اور دولت پیدا کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی تحریک سے غالباً ۱۲۶۶ھ میں انھوں نے جونپور
میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی،[1] ۱۲۸۰ھ میں انھوں نے اپنی تمام املاک کا چوتھائی حصہ وقف کر دیا اور
بقیہ جائداد اپنے بیٹے مولوی حمید حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ کے سپرد کرکے ہجرت کے قصد سے مکہ معظمہ
روانہ ہوئے، وہاں ایک ہی سال کے بعد ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی، ان ہی مولوی حمید حسین کے فرزند
و جانشین نواب عبدالمجید خاں بیرسٹر مرحوم تھے اور اب ان کے صاحبزادہ نواب سر محمد یوسف ہیں،
مولوی حمید حسین خاں نے اپنے والد کی وفات کے چودہ برس بعد ۱۲۹۵ھ میں انتقال کیا،

---

[1] القول الجلی فی تذکرۂ سخاوت علی ص۳۵ مثنوی تذکرۂ اسدی ص۹ جونپور۔

حیدر حسین صاحب کے زمانہ میں پانچ سو ماہانہ مدرسہ کے مصارف کے لئے دیئے جاتے تھے، مدرسہ میں دو مدرس تھے، اور سو کے قریب طالب علم پڑھتے تھے۔[1]

اس مدرسہ میں صدر مدرسی کی خدمت کے لئے مولانا سخاوت علی صاحب نے ۱۲۶۶ھ میں فرنگی محل کے نامور عالم مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کا انتخاب کیا، جو باندہ میں مولانا کے ساتھ رہتے تھے، اور جنھوں نے بہت کچھ مولانا سے کسب فیض کیا تھا، موصوف نو برس تک یہاں رہے، مولانا عبد الحی صاحب مرحوم فرنگی محلی کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گذرا، ۱۲۷۵ھ میں مولانا عبد الحلیم صاحب لکھنؤ جا کر ۱۲۷۷ھ میں حیدرآباد گئے، ان کی جگہ پر مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی جو مولانا عبد الحلیم صاحب کے استاد تھے، مدرسہ میں آئے، موصوف کے زمانہ میں مدرسہ کی دھوم دور دور پہنچی اور لائق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہوا، ان ہی میں مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ہیں، جنھوں نے مفتی صاحب سے علوم و فنون کے سبق لئے، اور مشہور روزگار ہوئے، مفتی صاحب نے چند روز کے بعد حجاز کا سفر کیا، اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، موصوف کے حواشی بر ملا حسن وغیرہ کے چند نسخے دار المصنفین میں ہیں، جن میں سے ایک پر مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی کے دستخط بتاریخ ۱۲۸۲ھ ثبت ہیں۔

[1] ۱؎ راحت جون پور صفحہ ۳۲ الفرقان لکھنؤ ۲؎ مولانا سخاوت علی ۳؎ مولانا فاروق صاحب نے ۱۲۸۲ھ میں درخواست داخلہ میں ایک مثنوی لکھی تھی، اور ان کی خدمت میں پیش کی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دلم در شوق نقش نارسا است
چو مہ سر نقش درماز است

آگے چل کر ہے:-

جناب اوستاد کعبۂ جاہ
دلیل راہ مردان حق آگاہ

محمد یوسف معنی را عزیزے
عزیز دو علم بخشش بہر چیزے

ادب گیرد بہ پیش ارسطو
بہ پیش بو علی ہم کرد زانو

(تاریخ عجائب شماره ۲۰۹)

اس مدرسہ کے آخری نامور مدرس مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری شاگرد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے، جن کے فضل و کمال کے آوازے ابھی تک ہندوستان پُر شور ہیں ۱۸۶۱ء میں مدرس ہوئے، ان کے لائق شاگردوں میں مولانا شیر علی صاحب، مولانا احسن صاحب بہاری، مولانا سلیمان اشرف صاحب بہاری، مولانا لطف الرحمان صاحب بردوانی وغیرہ تھے، مولانا شبلی نے بھی چند روز اُن سے پڑھا تھا، اور اُن سے راہ و رسم رکھتے تھے، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی،

مولوی لطف الرحمان صاحب بردوانی ۱۸۹۷ء میں مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے جب یہ خبر مولانا شبلی کو معلوم ہوئی تو اپنے ایک شاگرد کو جو جونپور میں پڑھتا تھا، اور جس نے یہ خبر دی تھی، لکھا "مولانا ہدایت بکمال مدرسہ دلم درد آمد کہ پسر دون لطف الرحمان وغیرہ مایہ کار تعلیم و تعلّم گشتہ است آوخ از دست فلک کہ جان جائے افادت مفتی محمد یوسف صاحب اکنوں ایں شعر بزبان حال دارد،

از ہجوم چند در دیراں ما جا نماند
آں قدر آباد شد آخر کہ ما ہی خواستیم

(۵۔ نومبر ۱۸۹۷ء)

مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور | فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ غازیپور میں طلوع ہوا، نام مولانا رحمت اللہ صاحب تھا جو چار واسطوں سے ملا قطب الدین سہالوی کے سلسلۂ اولاد میں تھے اپنے چچا ملا ظہور اللہ سے تعلیم پاکر غازی پور میں قیام کیا، اور چشمۂ رحمت کے نام سے وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس میں معروف ہوئے ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، مشہور اردو شاعر شوق و لکھنوی فرنگی محلی المتوفی ۱۹۱۰ء بھی ان کے استاد تھے، جن کا ذکر مکاتیب شبلی کے ایک نامۂ فارسی میں ہے، اس مدرسہ کے دوسرے مشہور استاد مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اور مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی و مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی

و مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی و مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی) ہیں، ایک زمانہ میں اِس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، پورب کے اچھے اچھے طلبہ نے یہاں پڑھ کر فروغ حاصل کیا اور فروغ پایا، مدرسہ اب تک چل رہا ہے مگر اب اُس کی شہرت اگلی سی نہیں،

اعظم گڈھ اور اُسکے اطراف

اعظم گڈھ ایک نئی آبادی ہے، البتہ اُس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں، اور پہلے وہ جون پور میں شمار ہوتے تھے، اس لئے موجودہ ضلع اعظم گڈھ کے اکثر اگلے مشاہیر جون پوری مشہور ہوئے، اُس زمانہ میں سرکار جون پور کی وسعت آجکل سے مختلف تھی،

سرکار جون پور کا رقبہ | اِس موقع پر ایک اصطلاحی غلطی کا دور کرنا ضروری ہے، مغلوں کے زمانہ میں ملک کی جو تقسیم تھی وہ موجودہ انگریزی تقسیم سے بالکل الگ تھی، آئین اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں سرکار جون پور کا رقبہ موجودہ فیض آباد کی سرحد سے لیکر موجودہ غازی پور کے حدود تک پھیلا تھا، جن کو آج کل اضلاع مشرقی کہتے ہیں، سرکار جون پور اس زمانہ میں ۴۱ محال یعنی پرگنوں پر منقسم تھی، ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام آئین اکبری میں گنائے گئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڈھ اور موجودہ ضلع بلیا کا پرگنہ سکندر پور، غازی پور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری، اور فیض آباد کے پرگنے چاند پور، بزر ٹانڈہ اور سرہر پور سب سرکار جون پور میں داخل تھے، یہی سبب ہے کہ ان مقامات کے اکابر اور مشاہیر باہر کی دنیا میں **جون پوری** ہو کر روشناس ہوئے،

اعظم گڈھ | اعظم گڈھ کا ضلع گو انگریزی عہد میں پیدا ہوا ہے مگر اُس کا نام و نشان بہت پہلے سے ملتا ہے، اعظم گڈھ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں، ایک حصہ میں اکثر راجپوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہے

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آباؤ اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کرکے یہاں آئے یا آباد ہوئے۔ اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو ملکی کہا جاتا ہے

اعظم گڈھ کے نومسلم خاندان

نومسلم خاندانوں میں سے جو وقتاً فوقتاً اسلام کے خلعت سے سرفراز ہوتے رہے دو قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک وہ لوگ جو اپنی اصل نسل میں بالکل خالص رہے۔ ان میں قابل ذکر اعظم گڈھ کے بانیوں اور سدھاری متصل اعظم گڈھ کے بابوؤں کے خاندان ہیں، اور جو اب تک اسی طرح بے میل مسلمان راجپوت ہیں۔ دوسری قوم وہ ہے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگی۔ ان کو عرف عام میں راوتارہ کہتے ہیں، جو حقیقت میں اصل ہندی لفظ راوت کی خرابی ہے۔ یہ راوت کا لفظ پہلے راجپوتوں کے لئے بولا جاتا تھا، اور اب بھی کہیں کہیں بولا جاتا ہے۔ امیر خسرو دہلوی قران السعدین میں کہتے ہیں ع راوت ترکش زن و ناوک فگن (ص ۳۳ مطبوعہ علیگڈھ) مرہٹی میں راوت سوار سپاہی کو کہتے ہیں، اور وہ بہت سے خاندانوں کا سرنام ہے۔

اعظم گڈھ

گڈھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جز گڈھ ہے، ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا یعنی کسی زمیندار یا رئیس نے اپنے اپنی رعایا کے لئے کوئی گڈھ بنایا، اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا۔ اعظم گڈھ بھی اسی قسم کا شہر ہے راجہ اعظم جن کے نام کی طرف یہ نسبت ہے، اعظم گڈھ کے مسلمان راجپوت راجاؤں میں سے تھے، اس راجہ کا خاندان یہاں اب بھی موجود ہے۔ [illegible] اس کا قلعہ عرف عام میں کوٹ (قلعہ) کہلاتا ہے اور اس کے متصل کی آبادی کا نام محلہ کوٹ ہے۔

اعظم گڈھ کا بانی

روایت یہ ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورث اعلیٰ [illegible] جا کر مسلمان ہو گیا

جہانگیر نے اس کی بڑی قدر کی، اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا، اور چوبیس پرگنوں کی ریاست
بھی عطا کی، یہ سب پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڈھ میں واقع تھے، تزک جہانگیری کے سال چہارم میں دولت خاں
نام ایک امیر کا ذکر موجود ہے، شہنشاہ لکھتا ہے۔ "دولت خاں بفوجداری صوبہ الہ آباد و سرکار جونپور تعیین یافتہ بود
شد و از ذات خود بر منصب او کہ ہزاری بود پانصدی افزودہ شد" (تزک جہانگیری جشن چہارمین نوروز)

اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بطور یادگار باقی تھا جس کی نقل شروع انگریزی عملداری
میں شامل مسل ہو کر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں محفوظ ہے۔ اس فرمان کی اصل عبارت یہ ہے:۔

"دریں وقت بیمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شدہ، کہ ابھن سنگھ زمیندار [illegible]
نظام آباد از بندۂ مقبول بارگاہ والا جاہ بدین اسلام درآمد نظر بر استحقاق بخطاب راجہ نادر دولت خاں مخاطب
شدہ و بست و دو پرگنہ از صوبہ الہ آباد ابتدائے نیسان خریف [illegible] حسب الحکم مرحمت فرمودیم باید کہ فرزندان [illegible]
کامگار و اولاد [illegible] ذوی الاقتدار و حکام کرام و عمال کفایت فرجام و متصدیان مہمات دیوانی و مستحفظان مہمات
سلطانی و جاگیرداران حال و استقبال [illegible] ابداً مستقر و مستمر [illegible] این حکم مقدس [illegible] زمینداری پرگنات
بخطاب مذکورہ نسلاً بعد نسل و بطناً بعد بطن خاندانہ [illegible] بحال و برقرار داشتہ چیزے [illegible] مال واجب
سرکار مبلغ یک لک و بست و [illegible] روپیہ [illegible] در قبولیت مجرا دادہ باشند کہ [illegible] سرحد [illegible]
ابواب زمینداری صرف معیشت خود پرداختہ [illegible] تغیر و تبدیل این امر مقدس مصون و محروس دانستہ
سند مجدد طلبند از [illegible] تبلیغ و الا انحراف نہ ورزند" (یازدہم شہر ربیع الاول [illegible] سنہ چہارم جلوس [illegible])

پشت پر ضمنی عبارت یہ ہے:۔ "بر کتاب حسب ضمنی بست و دو پرگنہ [illegible] یک لک ۲۵ ہزار [illegible] پرگنہ
نظام آباد، پرگنہ [illegible]، پرگنہ [illegible]، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ [illegible]، پرگنہ [illegible]

لے [illegible]

پرگنہ چیا کوٹ، پرگنہ قریات متو، پرگنہ جاہانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ سونا تھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بھیری آئندہ

پرگنہ پچوتر، پرگنہ سید پور بھیتری، پرگنہ ظفر آباد، پرگنہ بھوردانوں، ابواب زمینداری سی صد یک روپیہ ،،

یہ جن پرگنوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر اب اعظم گڈھ میں اور کچھ غازی پور میں ہیں،

راجہ دولت خاں جیونگر میں لاولد فوت ہو گئے، وہیں ان کی قبر ہے، ان کے بعد ان کے بھتیجے ہرجنس

ہرجنس کو ریاست کا مالک بنا گئے تھے، آگے کے سلسلہ میں ایک نامور بکرماجیت نامی ہوا جس نے پھر

اسلام قبول کیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں، اور عظمت خاں، اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں

اعظم گڈھ کی بنیاد ڈالی، اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڈھ بسایا، جو اب تک اسی نام سے

اسی ضلع میں آباد ہے،

جب سرکار جون پور میں اودھ کی نوابی قائم ہوئی، تو اعظم گڈھ کے راجوں اور اودھ کے نوابوں

میں کئی دفعہ لڑائیاں ہوئیں،

عظمت خاں کے بیٹے مہابت خاں بڑے دبدبے کے راجہ ہوئے، ان کی حکومت پرگنہ گھوسی سے پرگنہ

اترولیا ضلع گورکھپور تک اُن کی حکومت قائم ہوئی، آخر نواب سعادت علی خاں سے لڑ کر گورکھپور میں

قید ہوئے، جہاں ۱۷۳۸ء میں وہ فوت ہو گئے، اُن کے بیٹے ارادت خاں نے صفدر جنگ نواب اودھ

کے مقابلہ میں نواب احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کی مدد کی،

۱۷۵۸ء میں ارادت خاں کی جگہ اُس کا بیٹا جہان خاں ریاست کا مالک بنا، لیکن ارادت خاں

کے رہتے ہی جہان خاں کے چچا جہانگیر خاں کے بیٹے اعظم خاں ثانی نے ریاست پر قبضہ کرنا چاہا، اور

آخر ناکام رہ کر جون پور میں پناہ لی، جہان خاں اور نواب اودھ کے عامل نظام آباد کے درمیان ۱۷۶۱ء

میں لڑائی ہوئی جس میں دونوں مارے گئے، اور فضل علی خاں نے غازی پور شہر پر قبضہ کر لیا،

محمد آباد گوہنہ (ضلع اعظم گڈھ) میں حضرت غلام فرید صاحب فاروقی ایک فاضل اجل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، جب فضل علی خاں نے اعظم گڈھ پر قبضہ کیا تو موصوف کو بڑی تمناؤں سے لکھا، کہ آپ تشریف لائیں، اور اس خطہ کی حکومت قبول فرمائیں، انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا،

بیچارہ خر آرزوے دُم کرد　　　نایافتہ دُم دو گوش گم کرد

آخر فضل علی خاں تین برس کے بعد غازی پور اور اعظم گڈھ دونوں سے الگ کر دیئے گئے[1]،

شجاع الدولہ نے جب ۱۷۶۴ء میں بکسر میں انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کر لیا، یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر تھا، سنگار درپن اس کی ہندی کی تصنیف ہے، [illegible]ء میں وفات پائی، اس کے درباری شاعر برجیو مصر نے اعظم خاں کی تعریف میں اعظم خانی ستاسائی لکھی جس کے صلہ میں شاعر نے [illegible] میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۰۰ بیگھہ زمین انعام میں پائی، اس کے کچھ دنوں کے بعد نواب اودھ کے وزیر [illegible] خاں نے اس علاقہ کو جہاں یار خاں سے چھین کر نوابی میں شامل کر لیا، اور یہ اودھ کی حکومت کا ایک چکلہ (ضلع) بن گیا[2]، اور نواب کی طرف سے ایک عامل رہنے لگا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں یہاں مرزا عطا بیگ خاں کابلی عامل تھے، لکھنؤ اور جونپور کے بیچ میں اعظم گڈھ کا علاقہ پڑتا تھا، اس نے اعظم گڈھ کے عامل اس راستہ کی حفاظت کرتے تھے[3]،

[1] تجلی نور ص ۸۳ تین برس کا تعین گزیٹیر میں ہے، [2] اعظم گڈھ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ص [illegible] [3] میر علی تقی [illegible] نواب ابراہیم خاں عظیم آبادی اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور و ممتاز ادیب و شاعر و مورخ تھے، ریاض الانشاء ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، مرشد آباد وغیرہ کے امرا و [illegible] اور دوسرے [illegible] کے نام خطوط ہیں، اس مجموعہ میں مرزا عطا بیگ خاں عامل اعظم گڈھ کے نام بھی ایک خط ہے، اس مجموعہ سے ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ [illegible] نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی نے اردو اور فارسی کے جو تذکرے لکھے ہیں وہ درحقیقت انہی کے مرتب کئے ہوئے محمد علی [illegible] کی تصنیف ہیں، اس مجموعہ کا قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، [illegible] میں چھپ بھی گیا ہے،

تک یہ چکلہ دار یا عامل اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ کا ایک تاریخی پتھر اس وقت لکھنؤ کے عجائب خانہ میں رکھا ہے اس میں حکومت کے تمام شہروں کے درمیان کا فاصلہ تخمینی کے قاعدہ سے لکھا ہے اس میں لکھنؤ اور الہ آباد کے بعد تیسرا نام اعظم گڈھ کا ہے۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں جب یہ علاقہ انگریزی عملداری میں شامل ہوا تو جہان خاں کے بیٹے نادر خاں کو جو یہاں کے عاملوں سے برسرپیکار رہتا تھا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی پنشن اور بارہ گاؤں کی زمینداری دے کر ضلع میں امن و امان قائم کیا، جہان خاں نے سنہ ۱۸۲۶ء میں انتقال کیا، ان کی جگہ ان کے بیٹے مبارک خاں نے لی جن کو راجہ کا موروثی خطاب دوبارہ ملا، مبارک خاں نے سنہ ۱۸۷۲ء میں وفات پائی اور ان کے صاحبزادہ راجہ سلامت خاں مسند نشین ہوئے، راجہ صاحب گورنمنٹ اور عام پبلک میں نہایت مقبول تھے مولانا شبلی مرحوم ان ہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے اور اکثر ان کا نام عزت سے لیتے تھے سنہ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

اعظم گڈھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات

شاہ گنج سے جو شاہ عالم کے نام سے آباد ہوا اور جو جون پور میں شامل ہے دو فرلانگ آگے سے اعظم گڈھ کا ضلع شروع ہو جاتا ہے شاہ گنج سے چند میل دور بہ سمت مشرق سرائے میر آباد ہے جس نے حضرت شیخ میر عاشقاں علیہ الرحمۃ کی نسبت سے سرائے میر کا نام پایا ہے یہاں ان کا مزار اب تک یادگار ہے، اور اب اس کی شہرت کا ذریعہ وہ مدرسہ اسلامیہ ہے جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے جس کو سنہ ۱۹۰۸ء میں یہاں کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا، اور جس سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کو تعلق خاص رہا ہے۔

سرائے میر کے دس میل بہ جانب مشرق نظام آباد کا قصبہ ہے، یہ بہت سے علماء و اہل اللہ کا مولد و مسکن رہا ہے، سنا ہے کہ دیوان عبد الرشید صاحب رشیدیہ کا اصل وطن یہی تھا حضرت میر عاشقاں کے پیر حضرت

شاہ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ عرف شاہ قدن یہیں مدفون ہیں،

سرائے میر سے ۸ میل کے فاصلہ پر عینہ نگر ایک مقام ہے جو یہاں کی پرانی آبادی ہے، اور جس میں پرانے قلعہ کے آثار اب تک نظر آتے ہیں، دوسری پرانی آبادی اہل کی ہے، جہاں پرانے اشراف سکونت گزیں ہیں، سرائے میر سے متصل پھریہا نام ایک گاؤں ہے جہاں انصار کا ایک گھرانا آباد ہے، یہی گاؤں مولانا شبلی کا ننھیال، اور مولانا حمید الدین صاحب کا وطن ہے،

اس کے بعد اعظم گڈھ کا شہر آتا ہے، اس کی مشرقی سمت میں دوسرے مشہور مواضعات اور قصبے ہیں، ان میں سب سے پرانا گھوسی کا قصبہ ہے، جہاں کے مولانا غلام نقشبند تھے، جو لکھنؤ میں قیام کے باعث لکھنوی مشہور ہوئے، اور آج سے چالیس پچاس برس پہلے یہاں مولوی عبدالقادر صاحب نام ایک مشہور عالم اور زمیندار تھے، جن کو امامت کا دعویٰ تھا، اور ہمیشہ گاڑھے کا عمامہ باندھتے، اور گاڑھے کی عبا اور کپڑے پہنتے تھے، اور اسی لئے ان کی شان میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی نے جو اعظم گڈھ میں زمانہ تک مہتمم بندوبست رہے تھے، عربی کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا آدھا مصرع مولانا شبلی مرحوم کی زبانی مجھے یاد رہ گیا ہے ع تَعَمَّمْ تَقَمَّصْ وَانْتَطِقْ أَوْ تَسَرْبَلْ، موصوف کے پاس ایک عمدہ کتاب خانہ تھا جو اب بھی ان کے صاحبزادہ کے پاس ہے،

انہی اطراف میں اعظم گڈھ کا دوسرا مشہور قصبہ چریاکوٹ ہے جو قدیم آبادی ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے، اور اس میں شیوخ اور راجپوتوں کی آبادی بتائی ہے، یہ غازی پور اور اعظم گڈھ کے بیچ میں واقع ہے، عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی یہاں آباد تھے، اسی خاندان سے مولانا قاضی علی اکبر اور ان کے صاحبزادے مولانا عنایت رسول اور مولانا فاروق تھے،

اعظم گڈھ اور چریا کوٹ کے بیچ میں مئو ناتھ بھنجن واقع ہے جس کا حوالہ اعظم گڈھ کے راجاؤں کے شاہی
فرمان میں ہو سکتے ہیں کہ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لئے اس کا شاہی[1]
نام جہان آباد رکھا گیا تھا، شہزادی نے اپنے شوق سے یہاں کپڑے بننے کے کاریگروں کو جمع کیا، اور
ایک جامع مسجد بنوائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے، اس قصبہ نے کپڑے کی کل
صنعت وحرفت کے ساتھ علم وفن کی خدمت بھی انجام دی، قدیم شاہی مسجد میں اب بھی ایک نیا مدرسہ
مفتاح العلوم قائم ہے اور اس کے پرانے حجروں کی جگہ اب نئے حجرے بن رہے ہیں، اس قصبہ میں
کثرت سے علما پیدا ہوئے، اور اب بھی ہیں، مولنا عبداللہ صاحب غازیپوری کا اصل وطن یہی ہے،

مئو اور اعظم گڈھ کے بیچ میں محمد آباد گوہنہ نام مشہور قصبہ ہے حضرت مولنا غلام فرید صاحب
جن کا ذکر اوپر گذرا یہیں کے باشندے تھے، انگریزی عہد میں یہاں کے شرفاء نے تعلیم پاکر اعلیٰ انگریزی
عہدے حاصل کئے جن میں قابل ذکر ڈپٹی محمد کریم صاحب ہیں جو علی گڈھ میں تقرر کے زمانہ میں سرسید
کے رفقا میں تھے، اور دوسرا خاندان جسٹس سید عبدالرؤف صاحب کا ہے، اسی قصبہ سے متصل ولید پور
کا قصبہ ہے جہاں کے مولنا محمد کامل تھے، جو [illegible] میں جون پور میں منصف مقرر ہوئے، اور
بعد کو بستی وغیرہ اضلاع میں اس خدمت پر مامور ہوئے، ساتھ ہی صوفی کامل بھی تھے، مریدی کا بڑا
حلقہ تھا، مولنا فاروق صاحب چریا کوٹی کی پہلی شادی ولید پور میں انہی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی

محمد آباد کے قریب مبارکپور نام ایک قصبہ ہے جو پرانے زمانہ سے پارچہ بافی کا مرکز ہے، اور جہاں
پچھلے زمانہ میں چند نامور علما پیدا ہوئے ہیں،

---

[1] یہ نام ان فرامین میں ہے جو اس قصبہ کے لوگوں کے قبضہ میں اب تک موجود ہیں،

حسب نسب مولد | اعظم گڈھ کی دوسری سمت میں ایک پرگنہ سگڑی ہو، یہ بھی قدیم آبادی ہو، آئین اکبری میں اس کا نام ہو، اور اس کو راجپوتوں کا مسکن بتایا ہو، چنانچہ اب بھی اس علاقہ میں راجپوت آباد ہیں، اسی پرگنہ میں بندول کا قصبہ ہو، جس کو مولانا شبلی کے مولد بننے کا فخر حاصل ہو، مولانا نے اپنے اس مولد کی تعریف میں تفریحاً یہ شعر کہے ہیں،

فضل بندول اگر تو نشناسی	آدمی نیستی تو نسناسی
نتواں یافت ہیچ جائے چو او	خرم و سبز و دلکشائے چو او
ہست از غایت فرح بسرشت	مرغزارے مگر ز باغ بہشت

مولانا کی پیدائش سے پہلے جا ہو یہ بیان مبالغہ سے خالی نہ ہو مگر ان کی پیدائش کے بعد تو یہ یقیناً مبالغہ سے خالی ہو، اسی کے قریب بالکل ملی ہوئی خانقاہ نام قدیم شرفا کی ایک آبادی ہو، یہی وہ مقام ہو جو ڈپٹی محمد خلیل صاحب اور ان کے صاحبزادہ جسٹس اسمٰعیل صاحب جج (ہائی کورٹ الٰہ آباد) کا اصل مسکن ہو، اسی کے قریب جیراج پور بھی ایک آبادی ہو جس میں متعدد علما پیدا ہوئے جن میں سے ایک مولانا سلامت اللہ صاحب ہیں،

خانقاہ | خانقاہ میں غالباً صوفیائے کرام کا کوئی خاندان آباد تھا جس کے سبب وہ خانقاہ کے نام سے مشہور ہوا، یہی وہ جگہ ہو جس کی مسجد کا ذکر مولانا کے قصیدۂ کشمیریہ میں ہو، اور جس کے لئے اپنی جائداد متروکہ کے ایک حصہ کی وصیت اس میں لکھی تھی،

خانہ بر مسجد پارینہ کہ در خانقہ است	کز بے مہری اخستہ و بے برگ و نوا ست

نسب | بندول میں بھی راجپوتوں ہی کی آبادی تھی جس کے مورث اعلیٰ آج سے چار سو برس پیشتر مسلمان

ہوئے تھے، اسی خاندان میں مولانا شبلی مرحوم کی پیدائش ہوئی کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہندی نژاد راجپوت آگے بڑھ کر اس قابل ہوا کہ رسول مطلبی و ہاشمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مدارج و سعادت سے دنیا کو آشنا کرے، فاروق اعظم کی سطوت و عظمت کا دلوں میں سکہ بٹھائے، نعمان بن ثابت کوفی امام اعظم کے فقہ و قانون کے مصالح و حکم کو نیا جلوہ دے فصحائے عرب و ایران کی نکتہ سنجیوں کی شناسائی دے، اور غزالی و رازی اور مولانائے روم کے اسرار حقیقت کو برملا فاش کرے، ڈاکٹر اقبال نے جو خود بھی ایک ہندی نژاد برہمن تھے، کیا خوب کہا ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

مولانا کا خاندانی سلسلہ دیہی نسل راجپوتوں کا ہے جو راوت کہلاتے ہیں، شجرہ نسب یہ ہے،

شیوراج سنگھ = سراج الدین

شہباز
شیخ سہراب
شیخ احمد چودھری
شیخ لعل محمد
شیخ صدی چودھری
شیخ محمد اسمٰعیل
شیخ امان اللہ
شیخ محمد فرجان
شیخ محمد قاسم — شیخ محمد تاج — شیخ محمد رضا
شیخ کریم الدین
شیخ عباد اللہ
منشی شیخ حسن علی صاحب
شیخ حبیب اللہ — شیخ عجیب اللہ — شیخ نجیب اللہ
علامہ شبلی — محمد مہدی — شیخ محمد اسحاق — محمد جنید
شیخ محمد حامد — محمد فاروق — احمد
شیخ محمد احمد
جسٹس شیخ اقبال احمد — سلطان احمد

قبولِ اسلام خاندان کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ کے قبولِ اسلام کی خاندانی روایت یہ ہے:

"ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو [illegible] علاقۂ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا، اتفاقاً دیر ہوگئی، دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کرکے مکان پر پہنچے، بھوک پیاس سے بیتاب ہو رہے تھے، گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے، یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں اتار دیں، ان کی بڑی بھاوج جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں، اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے، اب تک بے آب و دانہ تھیں، بگڑ کر بولیں: کیا نرے ترک ہی ہوگئے، جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے، اور سارا کھانا بھرشٹ کر ڈالا، ایک چھوت برت عورت کے اس چبھتے ہوئے طعنہ نے وہ کام کیا جو سینکڑوں علماء کے بحث و مناظرہ اور وعظ و تبلیغ سے ممکن نہ تھا، شیوراج سنگھ نے بھاوج کا فقرہ سنا تو کہا مجھے ترک ہونے کا طعنہ دیتی ہو تو میں سچ مچ ترک ہوا جاتا ہوں، چنانچہ اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خانقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی جسمانی پیاس بجھائی، بلکہ دینِ حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے، اور سراج الدین اسلامی نام قرار پایا، خاندان کی دوسری شاخ بدستور ہندو ہی رہی، اور اب تک یہ لوگ بندول کے قریب دھرسن نامی ایک موضع میں آباد ہیں[1]"۔ یہ تو خاندانی روایت ہے، لیکن قرینہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیوراج سنگھ خانقاہ کے کسی بزرگ کی صحبت اور تعلیمات سے دل ہی دل میں متاثر ہو رہے تھے، اور آہستہ آہستہ ہندو دھرم کی بندشوں سے آزاد ہوتے جا رہے تھے، اسی سلسلہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اسی سے بھاوج کا طعنہ بھی بجا تھا، اور دفعۃً شیوراج سنگھ نے خانقاہ کی مسجد کی راہ بھی اسی نے لی، یہ واقعہ شاہانِ شرقی کے زمانہ کا ہے۔

خاندانی حالات سراج الدین نے قبولِ اسلام کے بعد اپنا حصۂ زمینداری الگ کرلیا، جس کو اس خاندان

[1] سیرتِ شبلی، از مولوی اقبال احمد خاں سہیل ایم اے، ایل ایل بی، مضمون مطبوعہ الاصلاح نومبر ۱۹۳۶ء ص۸ و ص۹۔

نے مزید رسوخ حاصل کیا یعنی اس کو آس پاس کے مواضعات کی چودھرائی کا منصب مل گیا جو اثر و اقتدار
کے لحاظ سے آجکل کی تحصیلداری سے کچھ اونچا تھا، یہ منصب مدت تک اس خاندان میں قائم رہا،
سراج الدین کے پوتے سہراب نے دنیاوی عزت کے علاوہ مذہبی اعزاز بھی حاصل کیا یعنی دینی باطنی
کیفیت میں یہ ترقی کی کہ ان کے مرشد نے ان کو بیعت کی اجازت دی، اور شیخ کے معزز لقب سے
سرفراز کیا، اسی لئے نومسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف یہ لوگ خان کے بجائے شیخ کہلانے لگے

ننھیال انصاری

شاید اسی لئے نومسلم راجپوتوں کے عام دستور کے خلاف ان لوگوں نے شادی بیاہ
میں صرف اپنے ہی خاندان تک محدود رہنے کی پابندی نہیں کی بلکہ دوسرے مسلمان شرفاء کے
خاندان میں بھی شادیاں کیں چنانچہ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کی شادی انصاری شیوخ
کے گھرانے میں ہوئی جو پھریہا میں آباد ہیں شیخ صاحب کے خسر اور مولانا کے نانا کا نام حاجی قربان قنبر انصاری تھا

بزرگوں کے حالات

مولانا کے جد اعلیٰ شیخ کریم الدین صاحب گورکھپور کے ابتدائی انتظام کے زمانہ میں
بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے، اور اپنی ذاتی آمدنی سے بڑھاوا حسام الدین پور نام ایک علاقہ خریدا
جس میں دس بارہ گاؤں تھے، یہ علاقہ اب تک اسی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہے،

مولانا کے دادا منشی حسن علی مرحوم اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڑھ میں
مختار تھے، اور مولانا کے نانا شیخ قربان قنبر انصاری انگریزی تسلط کے ابتدائی زمانہ میں اعظم گڑھ کے
ایک مشہور وکیل تھے، مولانا سے سنا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے، ان کے اشعار بھی سناتے تھے جو
شاید اہلبیت رضی اللہ عنہم کی منقبت میں تھے، مولانا حمید الدین مرحوم مصنف نظام القرآن انہی شیخ
قربان قنبر انصاری کے پوتے ہیں،

شیخ حبیب اللہ مولانا کے دادا نے چار اولادیں چھوڑیں حبیب اللہ، محب اللہ، عجیب اللہ، نجیب اللہ

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ تھے انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی پڑھی اور اس میں خاص ذوق

پیدا کیا چنانچہ مولانا نے شعرالعجم میں ان کے اس حسن ذوق کی ایک مثال لکھی ہے، فرماتے ہیں،

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے نظیری کا یہ شعر پڑھا،

اول از شرم و گنہ جامہ رعنائی را | سر بہ بستان چو در آید بچمن یغمائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں اس لئے شعر اگر گنہ کے

بجائے "کشد" کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا

سوچ کر کہا کہ نہیں یہی لفظ "کند" شعر کی جان ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان

دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا جامہ اتار لیتا ہے جامہ اتارنے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مثلاً کوئی شخص

گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اتار کر رکھدے یا اس کا بوجھ اتارے، دوسرے یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اتروا

جائیں یا چھین لئے جائیں، فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن اور جامہ کندن، چونکہ یہاں

مقصود یہ ہے کہ معشوق تعصب کے طور پر سرو کا کپڑا اتار لیتا ہے، اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن

سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی[لہ]

لہ شعرالعجم حصہ دوم

اس زمانہ میں فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کے بعد لوگ قانون کا امتحان دیتے تھے چونکہ شیخ صاحب

کے گھر میں زمینداری اور متعلقات و قانون عدالت کا چرچا تھا اس لئے الٰہ آباد ہائیکورٹ کی وکالت حاصل

کی، اور اس پیشہ میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے،

ان کی جوانی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا، دوسرے شہروں کی طرح اعظم گڈھ میں بھی شورش

ہوا جو فی جیل خانہ کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کیا گیا، اس زمانہ میں یہاں ونیلس صاحب کلکٹر تھے ان کے ساتھ مل کر شیخ صاحب نے پورے پرگنہ سگڑی میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں گاؤکشی کا جو مشہور ہنگامہ اعظم گڈھ میں ہوا اس میں بھی امن وامان قائم کرنے میں گورنمنٹ کو مدد دی، اس کے ایک سال بعد ۱۸۹۴ء میں شہر میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا جس سے شہر خطرہ میں تھا، اس وقت حکام کے ساتھ مل کر شہر اور دریا کے بیچ میں ایک بند بندھوانے میں بڑی مدد دی،

اسی طرح شہر اور ضلع کے پبلک کاموں میں وہ ہمیشہ شریک اعظم رہے، اس زمانہ میں میونسپلٹی کے صدر (چیرمین) ضلع کے حکام ہوتے تھے اور ان کی ماتحتی میں شہر کے معززین آنریری سکریٹری ہو کر عملاً تمام اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، شیخ صاحب جب تک ان کی صحت کام دیتی رہی اس خدمت کو اعزازی طور سے انجام دیتے، بے نیفِ فطرت نے فراخ دستی کے ساتھ فراخ دلی بھی عطا کی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ شیخ صاحب گورنمنٹ اور پبلک دونوں کی نگاہ میں محترم تھے، اس زمانہ کی سیاست میں ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی اس لئے وہ ہندو مسلمان ہر ایک کے کام آتے تھے اور ہر ایک انکی عزت کرتا تھا

اس زمانہ میں نیل کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، شرقی اضلاع میں کثرت سے نیل کی کاشت ہوتی تھی اور چپارن و گورکھپور سے لے کر اعظم گڈھ تک نیل کی کھیتی کثرت سے ہوتی اور نیل کی کوٹھیاں جاری تھیں، شیخ حبیب اللہ صاحب کی بھی نیل کی کوٹھیاں تھیں جن سے سال میں خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم کے مکاتیب میں کہیں کہیں اس کا ذکر ہے[1]، اس زمانہ میں زمیندار دیسی شکر بھی بناتے تھے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، شیخ صاحب نے بھی دیسی شکر کے کارخانے قائم کئے تھے، انگریزوں کے دور میں

[1] مکاتیب شبلی اول صفحہ ۱۳ و دوم نامہ فارسی نمبر ۱،

علاقہ میں اپنی ذاتی آمدنی سے خرید کر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، چنانچہ گنگا گھر وغیرہ کے گرد سے دریاباد کا علاقہ جو اس
خاندان کی ملکیت میں ہے انہی کا حاصل کیا ہوا ہے، وکالت و زمینداری اور نیل اور شکر کی تجارت سے ان کی
تقریباً تیس ہزار سالانہ کی آمدنی تھی، اور سرکار کو چھ ہزار سالانہ کی مالگذاری دیتے تھے،

غرض علمی قابلیت، قانونی لیاقت، اخلاقی شرافت، دنیاوی وجاہت، ہر دلعزیزی، دولت
و ثروت، اور سعادتمند اولاد ہر طرح کی نعمت شیخ صاحب کے حصہ میں آئی تھی، مذہبی مذاق بھی رکھتے تھے
چنانچہ مولوی محمد کامل صاحب ولید پوری کے مرید خلیفہ الٰہی شاہ صاحب ساکن سہرہ ضلع جونپور کے مرید تھے
شیخ صاحب کے دوسرے بھائیوں نے فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق
فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، چنانچہ مکاتیب میں مولانا کا ایک فارسی خط ان کے ایک چچا کے نام
جو غالباً شیخ حبیب اللہ ہی موجود ہے[1] جس میں پوری انشا پردازی صرف کی گئی ہے، شیخ حبیب اللہ صاحب
کے نام ایک اردو خط بھی مکاتیب[2] میں ہے، اس میں بھی شاہانہ تکلفات ہیں، اور ان کو علی گڑھ آنے کی
دعوت اور بعض علمی اطلاعات درج ہیں، انہی شیخ حبیب اللہ صاحب کے پوتے جسٹس محمد اقبال ہائیکورٹ
الٰہ آباد کے جج ہیں،

شیخ حبیب اللہ صاحب کو اپنے بھائیوں کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی، چنانچہ انہوں نے جو جائداد
حاصل کیں وہ صرف اپنے نام نہیں رکھیں، بلکہ برابر برابر سب بھائیوں کو بانٹ دیں،

والدہ ماجدہ مولانا کی والدہ جو حاجی قربان قنبر انصاری مرحوم کی صاحبزادی تھیں، نہایت نیک
اور دیندار بی بی تھیں، تہجد تک ناغہ نہیں کرتی تھیں، مولانا اکثر اپنی والدہ مرحومہ کی نیکیوں کا ذکر

[1] مکاتیب دوم نامہ فارسی (۱) میں ان کا ذکر ہے [2] مکاتیب دوم نامہائے فارسی (۳) [3] مکاتیب اول،

فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کو سحر خیزی کی عادت انہی کے حسن تربیت سے ہوئی، شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو شادی کر لی تھی اس سے وہ بہت دلگیر رہا کرتی تھیں، اور آخر عمر میں ۱۸۹۹ء سے پہلے وفات پائی[1]، مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں دو چار شعر اور لکھے جن کو بعد میں کاٹ دیا تھا انہی میں ایک بند کا مصرع یہ تھا ع

ماتم مادر دلگیر بھی دیکھا میں نے

اور ان کی یادگار میں اپنے نیشنل اسکول میں جو آجکل شبلی ہائی اسکول اعظم گڈھ ہے ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں قصر المنازل کے نام سے ایک ہال بنوایا تھا۔

اولاد شیخ حبیب اللہ صاحب مرحوم کے انکی ان بیوی سے چار بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی، بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد شیخ صاحب کے سامنے ہی مر چکی تھی، بیٹوں میں سب سے بڑے علامہ مرحوم تھے، ان سے چھوٹے مسٹر مہدی حسن مرحوم تھے، ان کی غیر معمولی ذہانت و طباعی اور خردانہ اطاعت و پاس ادب کا اعتراف

---

[1] مولانا نے جنوری ۱۸۹۸ء کو خود ایک عزیز کو جن کی والدہ کا ابھی انتقال ہوا تھا ایک تعزیت کا خط لکھا جو چھپا اپنی ماں کی وفات کے ساتھ اپنے احساس غم کا تذکرہ کیا ہے، مذکورہ اس ہال پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

هو اللہ

این ایوان دلکشا کہ قصر المنازل ایں مدرسہ است

از زر عطیہ خاص

مولوی محمد شبلی صاحب

المخاطب بہ

شمس العلماء

سکرٹری ایں مدرسہ و فیلو آف یونیورسٹی الہ آباد

بہ یادگار

والدۂ مرحومۂ ایشاں تغمدہا اللہ بغفرانہ

بماہ دسمبر ۱۸۹۸ء شعبان ۱۳۱۶ھ

تعمیر یافت

مولانا کو ہمیشہ رہا اور مولانا کو بھی ان سے مخصوص محبت تھی چنانچہ جب اپریل ۱۹۰۰ء میں وہ انگلینڈ کو روانہ ہوئے اور شیخ صاحب مرحوم نے اس تقریب میں ایک جلسہ منعقد کیا تو مولانا مرحوم نے ایک نہایت لطیف نظم لکھی جس کا خاتمہ اس مشہور دعائیہ مصرعہ پر تھا ع "بسلامت روی و باز آئی" اس نظم کے صرف دو شعر اقبال سہیل صاحب کو یاد رہ گئے۔

خار در دیدۂ عدو شکنی — حاسداں را جگر گداز آئی

ما بنادیدہ در رہت باشیم — کہ تو ناگہ ز در فراز آئی

مسٹر مہدی حسن مرحوم نے بی۔ اے تک ولایت ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرسٹری پاس کی اس نواح میں چونکہ یہ نیا واقعہ تھا اور شیخ صاحب مرحوم نے بڑے امنگ اور حوصلہ مندی سے ان کی تعلیم دلائی تھی، اس لئے ۔۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو ان کی واپسی پر بڑی دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا تھا، اور اس تقریب میں ایسا عظیم الشان جشن منایا گیا، کہ سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت کی گئی، جو اعظم گڈھ کی تاریخ میں پہلا اور غالباً آخری واقعہ تھا، افسوس کہ یہ ہنگامہ سرور زمانہ کی نظر بد سے بچ نہ سکا اور جو توقعات مسٹر مہدی حسن کی غیر معمولی قابلیت سے وابستہ تھیں پوری نہ ہو سکیں، ولایت ہی میں ان کی صحت خراب ہو چلی تھی، جو مراجعت کے بعد بھی سنبھل نہ سکی بمجبوراً اپنی حیثیت سے اتر کر ۱۹۰۶ء میں ان کو منصفی قبول کرنی پڑی اور چند سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۱۰ء میں اعزہ کو داغ مفارقت دے گئے مرحوم کی یادگار، ایک صاحبزادی تھیں، جو مولانا کے ماموں زاد بھائی حاجی شیخ محمد صاحب سے بیاہی تھیں، وہ بھی ۱۹۳۶ء میں کم سنی میں لاولد فوت ہوئیں،

لہ تاریخ وفات ۱۹ جون ۱۹۳۵ء ہوا دیکھئے (ص ۱۰۳)

مولانا کے منجھلے بھائی مولوی شیخ محمد اسحاق مرحوم الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک کامیاب وکیل تھے اور قابلیت قانونی کے علاوہ اپنی خوش مزاجی اور وسعت خلق کی بنا پر نہایت ممدوح رہے، مگر انھوں نے عین جوانی میں اگست ۱۹۱۰ء میں وفات پائی، مرحوم نے ایک بیٹا عزیزی محمد فاروق سلمہٗ اور دو صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں، بڑی صاحبزادی آنریبل جسٹس اقبال احمد سے اور چھوٹی مولانا حمید الدین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محمد عباد سے بیاہی تھیں، چھوٹی نے چند سال ہوئے اور بڑی نے اسی سال ۱۹۳۹ء میں وفات پائی،

مولوی محمد اسحاق مرحوم کی جواں مرگی کا حادثہ مولانا مرحوم کے لئے ناقابلِ برداشت تھا جس کا شاہد حال ان کے مرثیہ کا ایک ایک شعر ہے، اور آخر یہ کانٹا اُن کی جان لیکر نکلا،

مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد جنید نعمانی مرحوم جو تقریباً مولانا کے صاحبزادے حاجی محمد حامد صاحب کے ہم عمر تھے، کچھ دنوں اعظم گڈھ وکالت کرنے کے بعد منصفی پر چلے گئے، اور تقریباً پچیس برس کی عمر میں جبکہ وہ بمقام کان پور سب جج تھے دہلی میں جہاں وہ بغرض علاج گئے تھے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے، یہی وہ جنید ہیں جن کی نسبت مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے مرثیہ میں یہ کہا تھا،

"خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید"

مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ مرحوم نے ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی جن سے ایک صاحبزادے محمد مہدی مرحوم تھے، یہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح قابل اور ہونہار تھے، اور گریجوٹ ہو چکے تھے، مگر جس روز ڈپٹی کلکٹری میں ان کے انتخاب کی اطلاع آئی اسی دن چند گھنٹے پہلے دورہ دل کی علالت

میں وفات پاچکے تھے، مہدی مرحوم کی وفات کے بعد شیخ صاحب کو اپنی اولاد کا یہ دوسرا داغ بھی دیکھنا مقدر تھا، ایسے سعادتمند اور کامیاب بیٹے کی مرگ ناگہاں وہ بھی عین عنفوان شباب میں انتہائی جانکاہ حادثہ تھا، مرحوم نے ایک بچہ مظفر حسین اپنی یادگار چھوڑا، اس حادثہ کے بعد قدرتی طور پر شیخ صاحب مرحوم کی تمام دلبستگی اور بزرگانہ محبت کا مرکز یہی بچہ تھا، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے، چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنے پدر بزرگوار کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی اس کی جانب اشارہ ہے،

پسندید اینکہ بیکس و بے خانماں شود | ہاں آں قدر بجاں کہ مظفر جواں شود

ولادت مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جو عام طور پر غدر کے نام سے مشہور ہے، اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڈھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے،

نام والدین نے بچہ کا محمد شبلی نام رکھا، عجب نہیں کہ یہ نام شیخ صاحب نے اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا ہو، جیسے بڑے کا نام جنید رکھا تھا، وہ بھی اسی ذوق کا پتہ دیتا ہے، شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شبلی بغدادی المتوفی ۳۳۴ھ کا نام مشہور ہے، مگر درحقیقت یہ نام نہیں، ان کا نام ابوبکر دلف بن جحدر بتایا جاتا ہے، اور شبلی ان کے وطن شبلیہ (واقع اشروسنہ ترکستان) کی طرف منسوب ہے، یہ نسبت ان پر ایسی غالب آئی کہ اس نے نام کی جگہ لے لی،[1]

ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی ہی لکھتے تھے، بعد کو صرف شبلی کر دیا، اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے،

لطیفہ :- مولانا شروانی صاحب فرماتے ہیں میرے بڑے پھوپھا عنایت اللہ خاں صاحب جو کالج پر سرسید کے ابتدائی ہمدرد و مخلصوں میں تھے، انکی عنایت کی یادگار اب بھی یونیورسٹی میں قائم ہے، علامہ شبلی کے تقرر کے

[1] انساب سمعانی،

ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی و حنیفہ نام سے تو کہا گیا یہ بغداد سے آئے ہیں،

نعمانی کی اس نسبت سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کی اولاد سے ہیں، یا وہ اپنے کو اُن کے خاندان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابتدا میں نہایت سخت حنفی تھے، اور حنفی کہلانا اپنے لئے موجب فخر سمجھتے تھے اور طبیعت جدت پسند تھی اس لئے حنفی کے بجائے اپنے آپ کو نعمانی کہا، بلکہ یہ نسبت انھوں نے خود سے اختیار نہیں کی، اُن کے استاذ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی نے اُن کا لقب نعمانی رکھدیا تھا، مولانا فاروق مرحوم بھی سخت غالی حنفی تھے، اور ان دونوں مولانا عبداللہ صاحب دہلوی ثم غازیپوری کے سبب سے جو اسی ضلع کے رہنے والے تھے، مقلد و غیر مقلد کی صدائیں ان اطراف میں بلند تھیں، اور حنفی و اہل حدیث میں معرکے برپا تھے، اور طرفین میں مناظرے اور رسالہ بازی جاری تھی، اسی ماحول میں استاد نے اپنے شاگرد کو نعمانی کہہ کر پکارا، جو بعد کو شاگرد کے نام کا جزو بن گیا،

مولانا نے ابتدائے جوانی میں اردو میں اپنا تخلص تسنیم رکھا تھا، فارسی میں شبلی اکثر اور ایک آدھ غزل میں نعمانی بھی رکھا ہے،

بخواہی کہ زکوئے تو رفت نعمانی	گماں برم کہ ازیں پس دگر نمی آید

دو شعروں میں پورا نام ہی تخلص میں ڈال دیا ہے،

اگر شبلی نعمانی ایں پردہ دری از چیست	اینہا کہ ز خود گفتی من نیز خبر دارم
ہم ز فیض شبلی نعمانی است	ایں کہ در ہر شیوہ یکتا بودہ ام

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی صرف وزن کے سبب سے ہوا، اسکا مطلب یہ نہیں کہ نعمانی ان کا تخلص تھا،

بچپن مولنا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گذرا، فطرۃً ذہین تھے، اور حافظہ بھی قوی تھا، بہت ہی بچپنے کی بعض باتیں سناتے تھے، ایک دفعہ کا اسی عمر کا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ چاندنی رات تھی، صحن میں لیٹے تھے، اور لوگ اٹھا کر ان کو سائبان میں لے جانا چاہتے تھے، اور یہ نہیں جاتے تھے، کسی نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا، فوراً جواب دیا واہ چاند تو نکلا ہے، پانی کیسے برسے گا، لوگ اس پر ہنس پڑے مگر اس ذہانت کے ساتھ ان کی اس طفلانہ سادگی کا قصہ بھی سنئے، ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ مقرر تھا، ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا، شیخ صاحب کا ایک پرانا ملازم ان کی دیکھ بھال کرتا تھا وہی پیسہ دیا کرتا تھا، مولنا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ بیٹھتے، اور ضد کرتے تو وہ پیسہ کو آگ پر رکھ دیتا اور کہتا کہ ابھی پیسہ بن رہا ہے، اور آخر وہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا،

تعلیم و تربیت مولنا کی والدہ مذہبی تھیں، اور خود شیخ صاحب بھی اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا سے ناآشنا تھے، اس لئے اپنی پہلی اولاد کو خدا کا نام لے کر علم دین کی خدمت کے لئے وقف کیا، بعد میں جب سرسید مرحوم کی (جو بنارس اور غازی پور وغیرہ مشرقی اضلاع میں بہت دنوں تک حاکم عدالت رہے) تقریر و تحریر کے اثر سے بہت کچھ متاثر ہو گئے تھے، اسی لئے اپنے دوسرے بچوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلوائی

شیخ صاحب مرحوم نے قدیم رواج کے مطابق بڑی دھوم دھام سے اپنے بڑے بیٹے کا مکتب کیا، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، اُن کے گاؤں کے قریب جیراجپور کے ایک بزرگ حکیم عبداللہ صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء تھے، جو مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے شاگرد تھے، وہی پہلے معلم مقرر ہوئے، چنانچہ مولنا نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے پائی، اور کچھ دنوں مولوی شکر اللہ صاحب المتوفی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء سے جو سیرۃ

ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اور منشی محمد یوسف صاحب زنگی محلی کے شاگرد تھے، پڑھا،

فطری شاعرانہ کمال

مولوی حمید اللہ صاحب موصوف بیان فرماتے تھے کہ مولوی شبلی میں بچپن ہی سے شاعرانہ کمال پائے جاتے تھے، ایک رات کو میں سو رہا تھا قریب ایک بجے کا وقت تھا ایکا یک میری آنکھیں کھل گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی شبلی ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعۂ تاریخ لکھ رہے ہیں، حالانکہ اُن کا یہ بچپن تھا، مولوی محمد عمر صاحب بزرگانِ قدیم کی ایک مجسمہ یادگار رہتے، وہ مولانا مرحوم کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بچپن کے دوست تھے وہ بہ سبیل تذکرہ ایک روز فرماتے تھے کہ مولانا میں ادبی مذاق بھی بچپن ہی سے تھا، اس زمانہ میں جب وہ محض مبتدی تھے، کوئی اچھی نظم دیکھتے تو اس کے پڑھنے کے لئے بیتاب ہو جاتے، اور کوئی اچھا شعر سنتے تو ان کو وجد آجاتا،[1]

وہ خود مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے تھے، کتابیں الٹتے پلٹتے اور شعراء کے دیوان پڑھتے اور مناسبتِ طبع سے ان کے اچھے اشعار یاد ہو جاتے تھے؛[2]

مدرسہ عربیہ اعظم گڈھ

شیخ صاحب مرحوم اور شہر کے دوسرے اہلِ استطاعت اصحاب نے مل کر اعظم گڈھ ہی میں علوم عربیہ کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں پہلے تھوڑے عرصہ تک مولانا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد خاص مولوی فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا نے اسی مدرسہ

---

[1] مضمون مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم بی اے وکیل اعظم گڈھ، معارف جلد سوم صفحہ ۱۹۱ ۔ [2] یہ [illegible] اعظم گڈھ کے باشندے تھے تیزی میں مطب کرتے تھے اور اسی تعلق سے زیادہ پٹنہ میں رہتے تھے، وہیں ۱۲ ربیع الاول [illegible] میں وفات پائی، ان ہی کے صاحبزادہ مولوی ابو الکلام محمد علی [illegible] تھے جو مولوی سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد [illegible]

میں مولوی صاحب موصوف سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں،

مولانا علی عباس صاحب چریا کوٹی سے تلمذ

تذکرۂ علمائے حال میں جو ۱۳۱۴ھ میں مولانا کے علم و شہرت سے لکھا گیا[1] مولانا کے استادوں میں ایک نام مولانا علی عباس صاحب چریا کوٹی کا لکھا ہے،

مولوی علی عباس صاحب چریا کوٹی بن شیخ امام علی ماں کی طرف سے ملا باب اللہ جونپوری کی اولاد سے تھے بڑے منطقی، مناظرہ پسند اور عربی کے شاعر و ادیب تھے ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی۔[2]

مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جون پوری

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے جو مولانا کی جوانی کے دوست تھے مولانا کے حال میں لکھا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حنفیہ امام بخش جون پور میں غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری سے جو سلسلۂ خیرآباد کے نامور مدرس تھے، چند روز پڑھا تھا، مولانا کے مکاتیب فارسی میں بھی اس مدرسہ کے چند حوالے آئے ہیں، جن سے اس مدرسہ سے اُن کے تعلق کا پتہ چلتا ہے،

لیکن درحقیقت مولانا کی تعلیم کا حقیقی سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں،

مولانا فاروق صاحب

مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی[3] ان دنوں چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس تھے

---

[1] مؤلفہ مولانا محمد ادریس صاحب نگرامی مطبوعہ نول کشور لکھنؤ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۲ [3] مولانا محمد فاروق عباسی اور مولانا عنایت رسول عباسی چریا کوٹی اس زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، یہ دونوں قاضی علی اکبر ابن قاضی عطا رسول چریا کوٹی کے صاحبزادے تھے، اور معقول و منقول و ریاضی ہر قسم کے علوم سے مالا مال تھے مولانا عنایت رسول صاحب ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، علوم معقول و ریاضی و حساب و ہیأت مولوی احمد علی چریا کوٹی سے، اور علوم منقول مولانا فضل رسول صاحب بدایونی المتوفی ۱۲۸۹ھ سے جو دو واسطوں سے [illegible] کے شاگرد تھے حاصل کیا، اور حدیث مولانا حیدر علی رامپوری شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے ٹونک جاکر پڑھی، واپس آکر عبرانی پڑھنے کا شوق ہوا، تو اس زمانہ میں کلکتہ جاکر یہودیوں سے عبرانی پڑھی، اور توراۃ و انجیل و زبور اور صحف انبیاء بنی اسرائیل پر عبور پایا، آخر وطن آکر قیام کیا۔ ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی، سید احمد خاں مرحوم بنارس میں غازی پور کے قیام کے زمانہ میں ان کے علم و فضل سے واقف ہوئے، اور توراۃ و انجیل و زبور کے مباحث کے حل کرنے میں [illegible]

ان کی تعلیم و تدریس کا شہرہ دور دور پھیلا تھا، اور شیخ صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان کے پیر اخی شاہ صاحب (ساکن سہرہ ضلع اعظم گڈھ) کے پیر مولانا کامل صاحب ولید پوری کے داماد تھے اس لئے شیخ صاحب نے مولانا کو انہی کے پاس غازیپور بھیجا، غازیپور میں گنگا کے کنارے قدیم شرفا کا ایک محلہ ہے، جس کو میاں پورہ کہتے ہیں، یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان آباد ہے، جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اسی خاندان کے مشہور افراد تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ … پوری مدد کی، اور بعض بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے، امرتسر کے مطبع … میں … چھپے
مولانا محمد فاروق صاحب نے … بھائی مولانا عنایت رسول کو پڑھا، علاوہ ازیں ریاضیات کا فن مولانا … صاحب فرنگی محلی (بانی چشمہ رحمت غازی پور) سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے، اور … مولوی ابوالحسن صاحب منطقی سے، اور بعض علوم … فرنگی محلی سے پڑھے، علوم متداولہ منقول و ریاضی و ادبیات … کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی، ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علیحدہ ہو کر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہو جاتا، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے تو چشمہ رحمت غازیپور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڈھ کے مدرسہ میں آئے، کانپور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں جو اب بھی قائم ہے کچھ دنوں رہے، الہ آباد کے مدرسہ … العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۶ھ میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، … استعفا دے کر … اس کے بعد ۱۳۲۳ھ میں جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معتمد مقرر ہوئے، موصوف نے ترک ملازمت کر کے یہاں … شروع کی، اور بعض شائق انگریز حکام کو عربی پڑھائی، آخر میں ۱۳۲۵ھ میں مولانا شبلی مرحوم نے پھر ان کو دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلایا، چند روز … غازیپور گئے تھے، کہ اسباب و سامان یہاں آئیں … اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی۔

مولانا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم و نثر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، اور اس زمانہ کے مذاق کے مطابق صنائع و بدائع کا خاص شوق رکھتے تھے، مثلاً غیر منقوط لکھا کرتے تھے، مولانا کی تصنیفات میں سے عربی و فارسی نظم و نثر کے بعض رسائل یادگار ہیں، مثلاً منظومہ نحو، فارسی خالق باری، کشف … اور تعلیقات … کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا میرے پاس ہے، اور وہ شاعری بھی کرتے تھے، چنانچہ ان کے دو اردو مسدس چھپے ہیں، ایک مسدس فاروقی جس میں اعظم گڈھ کے … کے ہنگامہ کا ذکر ہے، اور دوسرا مسدس … جو مسدس حالی کے جواب میں ہے … مولانا کامل صاحب ولید پوری کی صاحبزادی سے دو صاحبزادے ہیں، شمس العلماء مولانا محمد امین صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب کیفی چریاکوٹی۔

دوسری شادی غازیپور میں کی تھی جس سے کئی صاحبزادے ہوئے مگر ان میں سے عربی تعلیم صرف ایک نے پائی یعنی …

سورت اقبال شاہ وجیہہ کی بنوائی ہوئی مسجد کا اب دریا نہایت دلکش منظر ہے، اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے مولانا شبلی مرحوم غازیپور میں اسی مکان کی کوٹھری میں رہتے تھے، خاکسار جب غازیپور گیا تھا تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی،

استاد کی نسبت شاگرد کا بیان

اکتوبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں مولانا شبلی مرحوم نے اپنے استاد کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ معتبر بیان ان کے متعلق کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، لکھتے ہیں:-

"مولانا موصوف چریا کوٹ کے رہنے والے تھے، جو اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، انھوں نے اپنے نسبی بھائی مولوی عنایت رسول صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے تمام علوم و فنون کی تکمیل کی تھی، علم ادب اگرچہ بطور خود حاصل کیا تھا، تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم و ناثر تھے،

مزاج میں سخت وارستگی بے پروائی اور بے تکلفی تھی، اس نے ایک جگہ قیام نہیں کرسکتے تھے، نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے، اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کرسکے، نہ اس کی ان کو پروا تھی، علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا، بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے، اور وہ بھی ناتمام رہ گئے، تمام مسائل علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے، اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے تعرض کرتے تھے،

میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ ان ہی سے پڑھیں، اور میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں، فارسی کا مذاق بھی ان ہی کا فیض ہے، اکثر

اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے۔

چونکہ ان کی کوئی علمی تصنیف شائع نہیں ہوئی اس لئے ہم چند اشعار درج کرتے ہیں کہ نمونۂ از خروارے

رسیدی ور بودی ہر دل وزخش چشمے — بیک گردش چو جام بادہ کارم ساختی رفتی

گلستاں مری غنچہ را در خون جگر کردی — نسیم آسا سمند ناز بر گل تاختی رفتی

ندارد دل دگر تاب طپیدن — نگاہ خویش را رم آشنا کن

ندارد چشم من تاب جمالت — بیا چوں مردمک در دیدہ جا کن

زمانہ گر ز خوبا حکم تو پیچد سر — دو دستہ شب ز روزش بہ تیغ شود

مولنا فاروق مرحوم منطق کی تعلیم صرف نظری ہی نہیں بلکہ عملی بھی دیتے تھے، یعنی نسب اربع قضایا اور اشکال سب کی باقاعدہ مشق کراتے تھے، اور اس کے لئے شرح مطالع کا درس خاص طور سے دیتے تھے، چنانچہ مولنا شبلی مرحوم کو بھی ان کی مشق کرائی تھی، اور اس کا درس دیا تھا، دارالعلوم میں مولنا فاروق صاحب نے ہماری جماعت کو بھی تہذیب اسی اصول سے پڑھائی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولنا شبلی اپنی تحریر و تقریر میں منطقی ترتیب کے خوگر اور مناظروں میں مشاق ہوگئے تھے، اور منطق اور فن مناظرہ کے اصول سے ان کا ہر قدم اٹھتا اور پڑتا تھا،

استاد و شاگرد میں اتحاد مذاق کی متعدد جہتیں جمع ہوگئی تھیں، اسی اتحاد مذاق نے استاد و شاگرد کے معنوی رشتہ کو اور زیادہ قوی کردیا، اور بالآخر جس طرح استاد کی کشش شاگرد کو غازی پور کھینچ کر لے گئی تھی اب شاگرد کی کشش استاد کو اعظم گڈھ کھینچ لائی، یہ واقعہ غالباً ۱۲۹۰ھ کے پیش و پس کا ہے، اسی مدرسہ میں جو شیخ صاحب نے قائم کیا تھا مولنا فاروق صاحب مدرس اول ہوئے، باہر سے بھی کچھ طلبہ کھینچ کر آنے

جس میں سے صرف ایک کا نام مجھے معلوم ہے ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم جو ڈاکٹر انصاری کے مختصر نام سے معروف تھے، اور جو یوسف پور ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے، ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم عبدالوہاب صاحب جو حکیم نابینا کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، اسی زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھتے تھے، غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں حکیم صاحب سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے، اور اس مدرسہ کا حال پوچھتے تھے[۱]،

مولانا شبلی جیسا طباع تلمیذ، اور مولانا فاروق کا سا متبحر استاد، فیضِ تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، چند ہی دنوں میں یہ جوہرِ قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں، اور ہونہار شاگرد استاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا، چنانچہ مولانا فاروق صاحب اسی زمانہ میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے تھے، "انا اسدٌ وانت شبلی" (میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر)، اس میں شبلی کی تلمیح قابلِ توجہ ہے،

فلسفہ کی تعلیم پر استاد نے پوری ہمت صرف کی تھی، اور شاگرد نے بھی پوری محنت سے حاصل کی تھی، ایک خط میں خود لکھتے ہیں :- "میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا، اور مدتوں اس میں منہمک رہا" [illegible] اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے علم کلام کی مہارت اور دلچسپی میں اس فن کی مہارت نے خاص طور سے مدد دی، مولانا کو سالہا سال کے بعد بھی جب فلسفہ کا مشغلہ چھوٹ گیا تھا، فلسفیانہ مباحث پر تمام عبور حاصل تھا، کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں ہمارے درجہ میں شمس بازغہ کا سبق شروع ہوا، اور اس اہتمام سے شروع ہوا کہ ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب پوری تیاری سے اس کو پڑھاتے تھے، اور مولانا درجہ میں آکر اس پر اعتراض وارد فرماتے تھے اور دونوں میں دیر تک رد و قدح جاری رہتی تھی اور ہم لوگ محوِ تماشا رہتے تھے

[۱] افسوس کہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۰ھ مطابق سنہ ۱۹۶۰ء میں دلی میں وفات پائی،

ہمارے عزیز دوست مولانا سید مناظر صاحب گیلانی ان دنوں ٹونک میں سلسلۂ خیرآباد کے مشہور مدرس مولانا حکیم ابو البرکات صاحب سے فلسفہ پڑھتے تھے، جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے تو راستہ میں لکھنؤ میں ہم لوگوں کے پاس ٹھہر جاتے، مولانا کا قیام اس زمانہ میں ندوہ ہی میں تھا، مولوی مناظر صاحب ان کے پاس ایک دو دفعہ ملنے گئے تو سلسلۂ خیرآباد کے تعلق سے ان سے بعض فلسفیانہ مسائل امتحاناً پوچھے اور اس کے بعد ان پر ایسی اچھی بحث فرمائی کہ مولوی مناظر صاحب اب تک اس کی مدح فرماتے ہیں۔

مدرسۂ اسلامیہ اعظم گڈھ کی ویرانی کا منظر

مولانا نے قریب قریب درجۂ فراغ تک اسی مدرسہ میں مولانا فاروق صاحب سے تعلیم پائی، یہ مدرسہ اعظم گڈھ کی موجودہ آبادی سے دکھن طرف پرانی تحصیل کی عمارت سے متصل واقع تھا، اب یہاں کوئی آبادی باقی نہیں رہی ہے، اور یہ سارا حصہ کھیت ہو گیا ہے، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ مولانا مرحوم آخر عمر تک جب کبھی اعظم گڈھ آتے تو اکثر اس موقع پر تشریف لے جاتے، اور تاثر کی جو کیفیت اس وقت مولانا پر چھا جاتی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی زبان و قلم اس کی تعبیر سے عاجز ہے، ایک مرتبہ وہ بھی ساتھ تھے، شام کا وقت تھا اور غالباً جنوری یا فروری کا مہینہ، سرسبز و شاداب کھیت لہلہا رہے تھے، بہار کا روح انگیز موسم، شام کا سہانا وقت کھیتوں کی طراوت بخش ہریاول، ایک ایسا روح پرور سماں تھا کہ مغموم سے مغموم دل بھی تھوڑی دیر کے لئے باغ باغ ہو جاتا، مگر مولانا تھے کہ چلتے چلتے دفعۃً ایک کھیت کی مینڈ پر رک گئے، آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے، اور اپنے دلگداز لہجہ میں یہ اشعار ترنم فرماتے رہے۔

جائیکہ بود آں دلستاں با دوستاں در بوستاں — شد زاغ و کرگس را مکاں شد مرغ و ہما را وطن

از تیرباز رنگی ایواں ہمی بینم تہی — وز قد آں سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

بجاے علم جہاں گرد گروں نہاد ستند ہے　　　　بجاے چنگ و نے آواز زاغ ست و زغن

جب ذرا سکون ہوا تو ارشاد فرمایا: میری آنکھوں میں وہ سماں پھر رہا ہے جب اسی مقام پر مولنا فاروق مرحوم شرح مطالع کا درس دیا کرتے تھے، یا آج یہ عالم ہے کہ در و دیوار کے نشان تک باقی نہیں رہے،

قفانبک من ذکری حبیب ومنزل

رامپور اور لاہور کے تعلیمی سفر [illegible]

علامہ مرحوم نے درسیات کی تکمیل اگرچہ مولنا فاروق ہی سے کر لی تھی، لیکن ان کے ذوق علمی نے ان کو دوسرے خرمنوں کی خوشہ چینی پر آمادہ کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ادب، فقہ اور حدیث کے جو اساتذہ اپنے اپنے فن میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے ان سے بھی استفادہ کرنے کا شوق دامنگیر ہوا، مولنا کے والد مرحوم اس کو غیر ضروری سمجھتے تھے، علاوہ بریں وہ باضرورت شدید اپنے نور دیدہ کو آنکھ سے اوجھل کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، مگر مولنا کی والدہ نے جو بہت باہمت خاتون تھیں مولنا کی بیتابی شوق کو ناکام دیکھنا گوارا نہ کیا، انہی کی ہمت افزائی کا اثر تھا کہ بالآخر مولنا نے طلب علم کے شوق میں دیار وطن کو پیچھے چھوڑ کر خیر باد کہا،

اس زمانہ میں مدارس کا رواج کم تھا، زیادہ تر مشاہیر علما اپنی اپنی جگہ پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے، یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں تھیں، لکھنؤ میں مولنا عبد الحی فرنگی محلی مرحوم کے دم سے بازار علم تازہ تھا، سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث، اور دیوبند میں مولنا محمد قاسم کی بدولت خاتم المحدثین مولنا شاہ عبد العزیز مرحوم کا سلسلۂ فیض جاری تھا، رامپور میں خلد آشیاں نواب کلب علیخاں کی جوہر شناسیوں نے ہر فن کے ارباب کمال یکجا کر دیئے تھے، راقم نے خود استاذ مرحوم کی زبانی سنا ہے

گو اول اول ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم کی شہرت کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامۂ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے، اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لئے زانوے ادب تہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے، اور رامپور کا رخ کیا، یہاں اس وقت دو باکمال اپنے اپنے فن میں یکتا و روزگار تھے، معقولات میں سلسلۂ خیرآبادی کے خاتم مولانا عبدالحق خیرآبادی، اور فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی، ابتداءً مولانا کی خواہش تھی کہ دونوں سے استفادہ کریں، مگر ان بزرگواروں میں معاصرانہ چشمک اس حد تک تھی کہ ایک کا شاگرد دوسرے کے حلقۂ درس میں باریاب نہ ہو سکتا تھا، مجبوراً مولانا کو انتخاب کرنا پڑا،

مولانا ارشاد حسین رامپوری

معقولات میں مولانا فاروقی کے فیض سے خود علامۂ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافہ کی توقع محض امید موہوم تھی، اس لئے صرف مولانا ارشاد حسین[1] کے شرف تلمذ پر اکتفا کی، علامۂ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا، اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے، مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے، مولوی نذیر حسین صاحب کی ارشاد الحق کے جواب میں انتصار الحق ان ہی نے لکھی ہے، اور علامۂ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا، غالباً یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو، بہرحال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب

---

[1] مولانا ارشاد حسین صاحب حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے، کتب معقول لکھنؤ میں پڑھی تھیں، اور باقی علوم مولانا [illegible] صاحب اتقانی ہو جو ابن احمد کے نبیرہ باکمال عالم تھے حاصل کئے تھے، شاہ احمد سعید مجددی دہلوی کے مرید تھے، ظاہر و باطن دونوں آراستہ تھا، نواب کلب علی خاں مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ۱۰ جمادی الاخری [illegible] میں وفات پائی، تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرہ کاملان رامپور حافظ احمد علی خاں شوق ص ۳۰،

کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی، یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی،

دیوبند کی حاضری اس زمانہ میں دیوبند کے مدرسہ میں مولانا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے پڑھتے تھے، اس کشش سے وہ دیوبند گئے اور ایک مہینہ کے قریب تک تعلیم میں شرکت نہیں کی، مگر فرائض کا علم یہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ یہیں پڑھا، مدرسۂ دیوبند کے کتب خانہ میں بعض کتابیں اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں جن پر مولانا نے اپنا نام لکھا تھا، وہ نسخے بھی وہاں اب تک ہیں، اور ان پر اُن کا نام لکھا اب تک موجود ہے،

مولانا فیض الحسن لاہور اس زمانہ میں مولانا فیض الحسن[1] سہارنپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو، طلب کی تشنگی نے اس چشمۂ فیض سے بھی شادکام ہونا چاہا، اور سفر پنجاب کے لئے کمربستہ ہو گئے، اولاً مولانا کے والد اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے، دوسرے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ تعلیم ختم ہو چکی، اب وکالت کے امتحان کی تیاری کریں، مگر آخرکار مولانا کے عزم و استقلال کو یہاں بھی فتح ہوئی، اور صرف پچیس روپیہ زاد راہ لیکر لاہور چل کھڑے ہوئے، اُن دنوں

[1] مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سلسلۂ خیرآباد کے حلقۂ درس میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے، مولانا خیرآبادی معقولات اور ادب عربی دونوں کے استاد تھے، عربی قصائد اُن کے یادگار ہیں، موصوف نے ۱۲۷۸ھ میں قید فرنگ میں جزیرۂ انڈمان میں وفات پائی، مولانا فیض الحسن صاحب کا بڑا فیض یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے عربی ادب میں انقلاب پیدا کردیا، اور متاخرین کی بجائے طلبہ کو قدیم شعرائے ادب کی طرف متوجہ کیا، حماسہ کا درس ان ہی نے رائج کیا، اور حماسہ کی شرح فیض کے نام سے ۱۲۹۵ھ میں لکھی، ان کا عربی دیوان اُنکے شاگرد مولانا حبیب الرحمن صاحب نے ۱۳۳۳ھ میں حیدرآباد میں چھپوا دیا ہے، اور مولانا فضل حق صاحب نے یہ فیض حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے حاصل کیا تھا، حضرت شاہ صاحب ہی کے ایسے ادیب شاعر تھے کہ خود عربی کے اہل زبان اُنکا لوہا مانتے تھے،

اعظم گڑھ تک ریل نہ تھی، اعظم گڑھ سے جون پور تک تین روپیہ کا یکہ کرایہ کیا، اس پار آئے، جون پور سے سہارنپور
تک سات روپیے کا اور سہارنپور سے لاہور تک پانچ روپے کا ٹکٹ لیا، طبیعت چونکہ ہمیشہ سے خوددار واقع
ہوئی تھی، اس لئے عربی کے عام طالب علموں کی طرح خانۂ خدا میں ناخواندہ مہمان بن کر جاگیری روٹیوں
سے شکم سیری گوارا نہ کر سکے، ایک روپیہ مہینہ کے کرایہ کا ایک چھوٹا سا مکان یا کرہ لیا، اور آٹھ
دس روپئے میں دو مہینے کسی نانبائی کی دکان سے کھانے کا بندوبست کیا، اور اتنے زمانہ تک تنگ دستی
کی تکلیف کو جتنی خوشی جھیل لیا، مگر والد بزرگوار کو اس لئے زحمت نہ دی کہ وہ اس سفر کے لئے روپیہ بھیجتے

یہ پوری داستان خود مولانا کی زبان سے سنئے، دو مہینوں کے بعد جب ہاتھ بالکل خالی ہو گیا
تو مجبوراً اپنے والد ماجد کو لکھا: "مرا دو ماہ می گذرد کہ ترکِ وطن کردہ ام و بے گانگاں بسر بردہ ام، بست و پنج
روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تا جون پور رفت، ہفت روپیہ صرف ریل تا سہارنپور
شدہ بود و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دو روپیہ باقی می ماند، اول کہ در پنجاب رسیدم دو یک روپیہ بہ حوائج
ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید صرف شد،

مکانے بہ کرایہ یک روپیہ گرفتم، و دو ماہ را دو روپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند بہ صرف طعام آمد،
اگر اضافہ دو روپیہ چنداں کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از دو تصور نیست، چوں مزاج عالی از ہمہ کے برہمی داشت
از تجویز ارسال صرف باز ماندم اکنون کہ مشغول افتادہ است، دیگر چہ گویم۔" (مکاتیب نامہ فارسی ۱۰)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دلدادگان کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی
پڑتی ہیں، اسی سلسلہ میں طریق درس کی داستان بھی سننے کے قابل ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے
بزرگوں میں علمی شغف کتنا تھا، موجودہ دور کے آرام طلب طالب علم اور عیش پسند استاد اس کا

تصور بھی نہیں کرسکتے،

مولنا فیض الحسن مرحوم کالج میں ملازم تھے، اس لئے زیادہ وقت وہیں صرف ہوجاتا بقیہ وقت بھی خالی نہ تھا، کیونکہ متعدد ایسے اشخاص اس وقت استفادہ کررہے تھے جن کا کالج سے کوئی تعلق نہ تھا، اور ہر ایک کے اوقات مقرر تھے، اس ماحول میں اگر کوئی اور استاد ہوتا تو مولانا شبلی جیسے فارغ التحصیل طالب علم کو درس دینے سے یقیناً انکار کرتا اور مولنا کے بجائے کوئی دوسرا طالب علم اسی استعداد کا ہوتا جس کو انہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہرگز غریب الوطنی کی زحمت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا، مگر ایک طرف تو مولنا شبلی کا عزم راسخ بے نیل مرام واپس آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، دوسری جانب مولنا فیض الحسن کا ذوقِ افاضہ ایسے مشتاق و مستعد طالب علم کو محروم دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا، آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اسی میں مولنا ادبیات کا درس لیا کریں، یعنی آنے جانے میں معلم یا متعلم کا جو قدم بھی اٹھے وہ بھی افادہ و استفادۂ علم سے خالی نہ ہو،

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو باز م نہ داشت
دانہ می چیدم من آں روز کہ خرمن داشتم

اسی تعلیم کے زمانہ میں تعطیل ہوئی، اور مولنا فیض الحسن صاحب دو ماہ کے لئے سہارنپور اپنے وطن تشریف لے گئے تو اس خیال سے کہ ناغہ نہ ہو شاگرد نے بھی ساتھ ہی سفر کا ارادہ کیا، چنانچہ والد کو لکھتے ہیں، "حضرۃ استاذ بہ وطن خویش یعنی سہارنپور تشریف خواہند برد، ایں قدر ناغہ نتواں کرد، لہٰذا عزم سہارنپور است دیگر ہر چہ مرضی باشد، مولنا کے لئے مولنا فیض الحسن صاحب کی یہ صحبت بہت مؤثر ثابت ہوئی، اور واقعہ یہ ہے کہ اسی درس نے مولنا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حد کمال کو پہنچایا، مولنا فاروق

مرحوم نکتہ آفرینی کے دلدادہ تھے، اور وہ متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبی ہو شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا، مگر لاہور آئے تو دنیا بدل گئی جمہرا جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ اور رفتہ زبان دل میں اُتر گئی یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ گویا حفظ کر ڈالا، اور آخر عمر تک بلا ناغہ صبح کو حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے،

جمہرۃ العرب شعرائے جاہلیت کے قصائد کی دوسری کتاب تھی جو مولانا فیض الحسن صاحب کے ذریعہ سے اُن تک پہنچی اور پڑھی، اور اس کو استاد سے مانگ کر ساتھ لائے، اور مولانا فاروق صاحب کو دیکھنے کو دی، ایک خط میں لکھتے ہیں :۔" از جناب حضرت مولانا فیض الحسن بے دریے یک نسخہ جمہرۃ العرب

از مولوی فاروق صاحب طلب دارد و بمن بنویس"۔ (زمانۂ فارسی ۲۲)

مولانا کو سادہ عربی نگاری کا شوق جاحظ کی کتابوں سے پیدا ہوا تھا جو انھیں علی گڈھ آنے کے بعد ملیں، مگر پھر بھی اُس کا تخم مولانا فیض الحسن صاحب ہی کی صحبت میں پڑ چکا تھا، چنانچہ اسی زمانہ کا ان کا ایک عربی خط مجھے ملا ہے جو آگے نقل ہوگا،

مولانا فیض الحسن صاحب کا سب سے بڑا فیض قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی بھی تھی، مولانا فیض الحسن صاحب اسی اصول سے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ اپنے خاص طالب علموں کو پڑھاتے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے بتاتے تھے، مولانا شبلی مرحوم میں یہ ذوق اخیر تک رہا، ندوہ کے ایک جلسہ کی تقریر میں جو چھپی ہوئی ہے، ادھر اشارے ہیں، حیدرآباد میں اس موضوع پر پوری تقریر فرمائی، دارالعلوم ندوہ میں آکر چند طالب علموں کو جن میں یہ خاکسار بھی تھا قرآن پاک کے اعجازی نکتوں پر متعدد درس دیئے،

غرض اس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے فضل الدت ودرس کا نقش علامہ مرحوم پر کس قدر گہرا پڑا تھا یہی وجہ تھی کہ استاد مرحوم کو اپنے اساتذہ میں سے مولانا فیض الحسن صاحب کے ساتھ خصوصی شیفتگی تھی، مولانا کے ان جذبات کی ہلکی سی جھلک اس مرثیہ میں صاف طور پر نمایاں ہو، جو مولانا فیض الحسن مرحوم کی وفات پر خاص عالمِ تاثیر میں لکھا ہو، اس مرثیہ کا پہلا بند ان اشعار سے شروع ہوتا ہو،

دریں آشوبِ غم خود دم نبود گر نالہ زن گریم — جہانے را جگر خوں شد ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسینِ صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد — ہنر بر خویشتن گرید چو من بر خویشتن گریم
گہے بے خود بہ بے ہم گشتنِ بزمِ ہنر نالم — گہے بے خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم

آگے چل کر دوسرے بند میں فرماتے ہیں،

نہ گریم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید — عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستاں بودن
بہ تمکینِ دری بر جادۂ پیشینیاں رفتن — بہ آہنگِ حجازی یادگارِ پارستاں بودن

مولانا فیض الحسن صاحب نے ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں وفات پائی، سید سجاد حیدر صاحب (یلدرم) بیان کرتے تھے کہ مولانا کو اس سانحہ کا حال کالج میں عین درس میں معلوم ہوا، سننے کے ساتھ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ہم طالب علموں سے کہا کہ چلے جاؤ، اور اسی اثر میں ان کا وہ مرثیہ لکھا جو ان کے کلیات میں ہے،

مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے تعلیم حدیث

اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب طلبہ ہر قسم کے علوم و فنون سے فراغت پا لیتے تھے، تب حدیث پڑھتے تھے۔ اسی اصول پر مولانا نے دوسرے تمام علوم سے فراغت پا کر حدیث کی طرف توجہ فرمائی، اور جس طرح انھوں نے دوسرے

فنون کی تعلیم کے لئے ان ہی اساتذہ کا انتخاب کیا جو اس فن میں یگانہ تھے، اسی طرح حدیث کیلئے بھی انھوں نے اس زمانہ کے سب سے نامور محدث کا انتخاب کیا، مولانا اپنے شیخ حدیث کو اکثر "ہمارے مولانا" کہا کرتے تھے،

مولانا احمد علی سہارنپوری، اپنے زمانہ میں علم حدیث کے امام مانے جاتے تھے، پہلے ہندوستان میں مولانا شیخ وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری، اور مولانا عبدالحئی تلمیذ مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے حدیث پڑھی، پھر ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ جاکر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی، اور سند و اجازت حاصل کی، اس زمانہ میں علمائے احناف میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، علاوہ درس و تدریس کے مولانا سہارنپوری کا اہم کارنامہ یہ ہے، کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کرکے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی، مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کئے، اس زمانہ کے اکثر بڑے بڑے علمائے احناف محدث سہارنپوری کے شاگرد تھے، اللہ تعالیٰ نے علم کیساتھ عمل، اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی، پہلے کتابوں کی تصحیح و طباعت کی، پھر دوسری تجارتوں میں مصروف ہوئے، باایں ہمہ مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے، کہ وہ بیحد منکسر، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور جماعت میں شامل ہو کر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے، مولوی شبلی صاحب مرحوم فرماتے تھے، کہ ایک دفعہ بازار میں مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا کہ سودا میں لے لوں، مگر مولانا کسی طرح آپ

راضی نہ ہوئے اور خود اپنے ہاتھ سے لیکر گھر واپس آئے،

۶ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو سہارنپور میں وفات پائی،

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی مال و دولت سے بھی متمتع فرمایا تھا حج سے واپس آکر دہلی میں مطبع قائم کیا اور کتب حدیث کی طبع و اشاعت فرمائی، اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر میں سب کچھ لٹ گیا، دو برس تک اپنے مکان ہی میں بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس کمپ میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جا کر کاروبار جاری کیا، جب سے آپ کو پانچسو اہوار کی آمدنی تھی، اس زمانہ میں بھی شیخ صاحب کی اجازت سے صبح سے نو بجے تک مسجد حافظ جمال الدین صاحب میں جا کر درس دیتے تھے، تقریباً دس برس کلکتہ میں قیام رہا، اس کے بعد جب آپ کی عمر ساٹھ برس کی ہوئی تو استعفا دے کر کلکتہ سے چلے آئے، اور پھر وطن میں بیٹھ کر ہمہ تن درس حدیث میں مصروف ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے آپکے درس میں بھی برکت بخشی، اور سیکڑوں علماء اس فیض سے سرفراز ہوئے۔

آپ کی سند حدیث کو ہم یہاں تبرکاً اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا شبلی کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ سے ہو سکتی تھی[1]،

سند حدیث بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد فیقول العبد الضعیف احمد علی عفی اللہ عنہ ان الشیخ الناسک الحافظ احمد علی السہارنپوری قد حصل قراءۃ کتب الحدیث وسمعہا عندی فی مکۃ المعظمۃ زادہا اللہ شرفاً وتکریماً بعد التحصیل ان الحافظ الموصوف قرأ طرفا

[1] یہ سند اور مولانا احمد علی صاحب کے حالات ہیں نے ان کے صاحبزادہ مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری مرحوم کی خط لکھ کر منگوائے تھے" س"۔

من الصحيح البخاري وطرفا سمع بقراءة الغير علي وكتاب تيسير الاصول الجامع لابي عيسى الترمذي

وشمائله وكتاب النسائي وابن ماجة القزويني والموطا للامام محمد بن الحسن الشيباني

ومسند ابي حنيفة من رواية الحصكفي والعلامة محمد بن محمد الجزري صاحب الحصن الحصين

قراءة علي من اولها الى آخرها بلا مشاركة الغير في القراءة وكتاب الصحيح لمسلم وسنن ابي

داؤد ايضا اسندهما علي بتمامها قراءة وسماعة ومسند الدارمي قرأ علي قدرا معتدا

وشيئا من الجامع الصغير للسيوطي ومشكوة المصابيح والحصن الحصين والحزب الاعظم

والورد الاعظم لعلي القاري وايضا سمع بقراءة الغير علي شرح النخبة في اصول الحديث وقرأ

علي من التفاسير شيئا من المعالم للبغوي والبيضاوي والجلالين وجامع البيان في

تفسير الرحماني وحصل لي الاجازة والقراءة والسماعة من الشيخ الاجل والحبر الاكمل الذي

فاق بين الاقران بالتمييز على الشيخ عبد العزيز رحمه الله تعالى وحصل له الاجازة

والقراءة والسماعة من والده الشيخ ولي الله بن الشيخ عبد الرحيم الدهلوي واسانيده

اكثر الكتب موجودة في تصانيفه وقد اجزت الحافظ الناسك الشيخ احمد علي لقراءة

الكتب المذكورة ان يشتغل بها ويعلم المستفيدين بالشروط المعتبرة عند اهل الحديث

والله المستعان وعليه التكلان وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين ه

محمد اسحق

طالب علمی میں مناظروں کا شوق

مولانا کی تعلیم میں منطق کی مشق کی جو کوشش مولانا فاروق صاحب نے فرمائی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر بلکہ ہر موقع

گفتگو میں منطقی ترتیب استدلال اور اصولِ مناظرہ کو پیشِ نظر رکھتے تھے، اور اس حیثیت سے وہ ان کے
عہد کے طالب علمانہ حلقوں میں ان کا نام خاص امتیاز رکھتا تھا، وہ جب طالب علموں کی کسی مجلس
میں پہنچ جاتے کسی نہ کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی اور یہ اس زمانہ کا عام طرز تھا کہ طلبہ میں بات بات پر
مناظرے ہوتے تھے، اس طرز میں ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ تیز اور ذہین طلبہ کی علمی مشق اس کے ذریعہ
سے بڑھ جاتی تھی، مسائل زبانی یاد رکھنے کی عادت پڑتی تھی، اور باہمی منافست اور مسابقت میں
طالب علم شروح و حواشی پڑھنے، سوال و جواب کرنے، اور ہر روز کچھ آگے بڑھنے کے خوگر ہو جاتے تھے۔

مولوی حافظ شاہ تجمل حسین[1] صاحب (دیسنوی بہاری) جو مؤلف کے ہم وطن اور رشتہ میں چچا
تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی اور بعض بعض مدرسوں میں اُن کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں
میرے سامنے دونوں کی ملاقات ہوئی، اور بے تکلفی کی طالب علمانہ باتیں شروع ہو گئیں، مولانا
نے حافظ صاحب سے فرمایا کہ "تم تو میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب) پڑھائی تھی

[1] حافظ شاہ تجمل حسین صاحب مرحوم نے بڑے بڑے علما کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے واقعات و حکایات دلچسپ
ہوتے تھے، تو سننے والوں کو بڑا کیف آتا تھا، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، بڑے
باغ و بہار آدمی تھے، فکر و غم کبھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا، باتیں بہت ظریفانہ کرتے تھے، ہر محفل اور ہر مجلس میں
دلچسپ ثابت ہوتے تھے، اونچے اونچے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں نواب امتیاز علی صاحب وزیر کے زمانہ میں
بھوپال میں بضمن علما ان کا وظیفہ تھا اور وہیں رہتے تھے، وہ کبھی کسی سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے، اور کبھی کسی
کی کڑوی سے کڑوی بات کا جواب نہیں دیتے تھے، ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے تھے، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب
کی مدتوں صحبت اٹھائی تھی، ان کے حالات میں فیض رحمانی وغیرہ کئی کتابیں ہیں، مولد ابی القاسم نیرہ بھی
ان کا چھوٹا سا رسالہ ہے، عمر بھر جہاں گردی میں بسر کی، اخیر عمر میں اپنے وطن دیسنہ (ضلع پٹنہ) میں بڑی عمر
پاکر ۲ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ کو وفات پائی، اور وہیں وہاں کی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے، مکاتیب
شبلی نادری و میں انہی حافظ تجمل حسین صاحب کا ذکر ہے۔

حافظ صاحب نے جواب دیا، تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ مجھ کو زیر بحث بناکر اپنی منطق صاف کرتے تھے، پھر حافظ صاحب نے اپنا دوسرا احسان یاد دلایا کہ وہ یاد ہے جو سہارنپور کی جامع مسجد میں تم سے اور مفتی عبداللہ ٹونکی سے مناظرہ ہوا تھا اور پنجابی طلبہ ان کے ساتھ اور پوربی تمہارے ساتھ تھے، اور آخر مناظرہ نے مجادلہ کی صورت اختیار کر لی، اور ہم لوگ تم کو اپنی حفاظت میں لیکر قیامگاہ پر لوٹے، وہ یہ کہہ رہے تھے اور مولانا مسکرا رہے تھے،

مولانا نے خود بھی مکاتیب میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو اپنا ہم سبق لکھا ہے (شروانی ۹۱) ہم سبقی سہارنپور میں ہوئی جب وہ اور مولانا دونوں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے زیر تعلیم تھے، مفتی صاحب کے صاحبزادہ مفتی انوار الحق صاحب کی کتاب اثبات الوجود پر الندوہ (ستمبر ۱۹۱۰ء) میں لکھتے ہیں:- وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم اور مولانائے ممدوح (مفتی عبداللہ صاحب) ایک ساتھ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے فیض سے خوشہ چینی کرتے تھے، سہارنپور جانے کے لئے جب مولانا گھر سے نکلے تو پہلی منزل لکھنؤ پڑی، یہاں ان کے بعض احباب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب سے پڑھتے بھی تھے، وہ طالب علموں کے مجمع میں وارد ہوئے، حیدر بخش[1] کی مسجد میں جاکر ٹھہرے اور مناظرہ

[1] یہ مسجد لکھنؤ میں چوک کے بیچ میں اب بھی ہے، اوپر مسجد ہے نیچے دکان ہے، مسجد میں ایک دو چھوٹے حجرے ہیں، یہ مسجد ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے ایک طرف فرنگی محل ہے جہاں عربی کے طلبہ پڑھتے تھے، اور دوسری طرف جھوائی ٹولہ ہے جہاں طب پڑھنے والے پڑھتے تھے، اس لئے یہاں علوم عربیہ اور فنون طبیہ کے طالب علموں کا ہمیشہ جمگھٹ رہتا تھا، کوٹھریوں میں طلبہ کا مختصر سامان رہتا تھا، صحن میں ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا تھا، گو حالات بدل گئے ہیں مگر اس مسجد کی یہ خصوصیت اب بھی کسی قدر باقی ہے، طالب علمی میں سیکڑوں علمائے جید نے قیام کا شرف بخشا ہے، میرے استاذی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حیدر بخش مرحوم واجد علی شاہ کی کسی بیگم کی سرکار میں ملازم تھے،

شروع ہو گئے، مولانا نے جب اسکات المعتدی لکھی ہے تو اس کے جواب میں مولوی نور محمد صاحب پنجابی نے ۱۳۰۹ھ میں تذکرۃ المنتہی لکھی اس کے دیباچہ میں مولانا کے متعلق عربی میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے

"مصنف اسکات المعتدی جب (پنجاب) رامپوری استاد مولانا ارشاد حسین کے پاس جا رہا تھا تو لکھنؤ میں ٹھہرا اور یہاں طالب علموں کی گرفت میں آ گیا تھا، طالب علموں سے مناظرے کرتا تھا، اور اس میں غیظ و غضب ظاہر کرتا تھا اور گفتگو میں بند ہو ہو جاتا تھا، تو جس کا حال طالب علموں کے مقابلہ میں یہ ہوا ہو وہ علمائے محققین کے مقابلہ میں کیا ہوگا"

مولانا جب رامپور پہنچے ہیں تو یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور میں مولانا عبد الحق خیرآبادی بن مولانا فضل حق خیرآبادی کے سبب سے معقولات کا بڑا شہرہ تھا، ہر طرف منطق اور فلسفہ کے پیچ در پیچ مباحث پر علماء کی آستینیں چڑھی رہتی تھیں، یہی اثر وہاں کے طلبہ پر بھی تھا، مولانا رامپور پہنچے تو ہر طرف سے طالب علموں نے گھیر لیا، آخر ہر طرف سے ہٹ کر مولانا ارشاد حسین صاحب کے درس میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئے،

مولوی عبد الحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ جب مولانا شبلی علی گڑھ سے جا رہے تھے تو لکھنؤ ٹھہر گئے، اور میں وہیں داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا، اور ان کے چہرہ سے محسوس کرتا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) کی خدمت پر دس پندرہ روپیہ کے ملازم تھے، داروغہ اس زمانہ میں نگروں کا کام کرتے تھے، اس زمانہ میں بیگمات جو پاپوش پہنتی تھیں ان میں موتی ٹکے رہتے تھے، یہ پاپوشیں پرانی ہونے پر داروغہ صاحب کو مل جاتی تھیں، وہ ان کے موتی الگ کر کے جوہریوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے، اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، اور اسی سے بڑی دولت پیدا کر لی تھی، انہی نے یہ مسجد خانہ باخ شاہ [illegible] کے قریب بنوائی تھی، اور مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی نے اس کا افتتاح پہلے وعظ سے فرمایا، مولوی حفیظ اللہ صاحب اسی زمانہ میں مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی سے پڑھنے کیلئے لکھنؤ تشریف لے گئے، اور مولانا عبد الحی صاحب کی سفارش سے اسکا ایک حجرہ ان کو رہنے کیلئے ملا، فرماتے تھے کہ اس وقت وہ بالکل تازہ بنی ہوئی تھی،

کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بیگانگی کی تصویر دیکھتے تھے، گویا وجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں سے تھے، جس وحشت و بیگانگی کا ذکر مولنا شبلی فرماتے ہیں، وہ اسی مناظرانہ عادت کا اثر تھا،

تکمیل مولنا احمد علی صاحب کا آستانۂ علم مولنا کی آخری درسگاہ تھی، اس وقت سنن ترمذی کا درس ہو رہا تھا، کہ مولنا کے والد اور خاندان کے بعض اعزہ نے حج کا قصد کیا، مولنا کو بھی اس سفر کا شوق دامنگیر ہوا، مگر ادھر حدیثِ رسول کی کشش تھی، اور ادھر روضۂ رسولؐ کی، اس کشمکش میں مولنا نے خود اپنے شیخ کو اپنا رہبر بنایا، اور ان سے مشورہ چاہا، فرمایا کہ پڑھنا تو ہر وقت ہو سکتا ہے، اور یہ سفر ہر وقت میسر نہیں آسکتا، چنانچہ مولنا نے بھی عزم سفر کیا، اور سہارنپور سے بمبئی کو روانہ ہو گئے،

اس وقت مولنا کی عمر ۱۹ برس کی تھی، اور کل مدتِ تحصیل چودہ برس ہے[1]، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۳ء سے تعلیم شروع اور ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں تمام ہوئی،

سفر حج ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء بمبئی سے حاجیوں کے اس مقدس قافلہ کے ساتھ مولنا بھی حجاز کو روانہ ہو گئے، اس واقعہ کا ذکر مولنا نے اپنے اس قصیدہ کے ایک شعر میں کیا ہے جس میں انھوں نے سنہ ۹۲ء میں سفر قسطنطنیہ کے واقعات کو نظم کیا ہے،

فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدا ——— خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر

مولنا کے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض سے ایک مثنوی کے وہ چند شعر ملے ہیں جن کو مولنا نے روضۂ اطہر کے سامنے پڑھا تھا،

---

[1] تذکرۂ علمائے حال مولوی ادریس صاحب نگرامی مطبوعۂ نولکشور و انگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب خازن پور شائع شدہ مسلم ریویو الہ آباد اگست سنہ ۱۹۱۰ء۔ صفحہ ۱۵۳ ۔

اے بکرم کارِ جہاں کردہ ساز — مرحمہ را پیشِ تو روئے نیاز

چوں بہ درت آمدہ ام با اُمید — از کرمِ خویشش مکن نا اُمید

چوں بہ درت آمدم اُمیدوار — سایۂ لطفے ز سرم بر مدار

اس مذہبی سفر میں مولانا کی علمی تگ و دو بھی جاری رہی، چنانچہ مدینہ منورہ میں جو کتب خانے ہیں، ان سب کی سیر کی، فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو ذخیرہ وہاں دیکھا کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آیا، ابن عبد البر کی کتاب "التمہید" کا جو موطا امام مالک کی شرح اور حدیث کی دائرۃ المعارف ہے، ایک مرتبہ ذکر آگیا تو فرمایا میں نے مدینہ منورہ میں اس کا قلمی نسخہ دیکھا تھا۔

اس سفرِ حج کے بعض عجیب اثر انگیز واقعات سنایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے، کہ ایک صاحبِ حال ہندی حاجی کے والہانہ شوق کا یہ عالم تھا کہ برہنہ پا کوے یار کی منزلیں طے ہو رہی تھیں، تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو رہے تھے، وہ چلتے چلتے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے تھے، اور موچنے سے کانٹے نکال رہے تھے، مولانا بھی جا کر سامنے کھڑے ہو گئے، بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نہایت پُر سوز لہجے میں یہ شعر پڑھا،

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے — کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

اس سفر میں اہلِ عرب کی فیاضی، سادگی، غیرتمندی، اور شریفانہ اخلاق کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا، چنانچہ مثال کے طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی میں اپنے شتربان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا تو وہ ہرگز تنہا نہ کھاتا اور ھلمّوا کہہ کر آس پاس کے اور بدوؤں کو جمع کر لیتا اور سب کو تقسیم کر لینے کے بعد خود کھاتا، اتفاقاً ایک مرتبہ اس کو صرف ایک بوٹی دی گئی جو کسی طرح قابلِ تقسیم

تھی مگر شتربان نے اب بھی دوسرے ساتھیوں کو بلا کر ایک ایک ریشہ تقسیم کیا تو مولنا نے اس سے پوچھا کہ آخر اس سے کیا نتیجہ ہوا، نہ تمہیں کو مزا ملا، نہ تمہارے کسی ساتھی کو، شتربان نے اس کا جو جواب دیا اس سے عرب کی شرافتِ قومی کا پتہ چلتا ہے، اس نے کہا:۔ یا شبلی ھٰذا عار علینا ان ناکل وحدنا (اے شبلی اکیلے کھا لینا ہمارے نے عار ہی) مردانہ غیرت و خودداری اور شریفانہ عفو و درگذر کی مثال میں یہ واقعہ بیان فرماتے کہ ایک بار کسی منزل میں مولنا کے ساتھیوں نے ہانڈی چڑھا رکھی تھی، ایک بڈھا بدو بار بار ادھر سے گذرتا، اور اس سے گرد اڑتی تھی جو ہانڈی میں پڑتی تھی، مولنا کے ایک رفیقِ سفر نے بار بار منع کیا مگر وہ نہ مانا، عاجز آکر انھوں نے اس بدو کو ایک تھپڑ کھینچ مارا بدو کے لئے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی، غصہ میں جو اس نے ایک آواز دی تو اس پاس کے تمام بدو جمع ہوگئے، یہ بڈھا بدو جوشِ انتقام میں بیتاب تھا، زمین سے تھوڑی سی خاک لیکر کفِ دست پر رکھتا اور پھونک مار کر اڑاتا کہ اس طرح تم کو برباد کردوں گا، مولنا نے اس سے بہت بجا جت سے معافی مانگی تو معاف کیا، بہت ممکن ہو کہ علامہ مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر کی معنوی اسی واقعہ سے ماخوذ ہو:

مشت خاکے در ہوا یش پریشاں کردہ ام	یادی پرسید شبلی را کہ چوں بر باد رفت

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ غالباً ۱۹۰۵ء میں وہ علامہ مرحوم سے حماسہ پڑھتے تھے، ایک دن ابن زیابۃ التیمی کا یہ شعر سبق میں تھا،

والقبس لا اتبع تزدادہ	الرمح لا املأ کفی بہ
اور زین کے کھسکنے سے میں نہیں کھسکتا	نیزہ کو مٹھی بھر کر نہیں پکڑتا

اس شعر کی شرح میں مولنا نے حج کا ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بدوی نے ان کو نیزہ بازی

کا طریقہ عملاً سکھلایا، تب جا کر اس شعر کا مفہوم مجھ طور پر سمجھ میں آیا، فرمانے لگے کہ اہلِ عرب نیزے کے ڈانڈ کو مضبوط نہیں پکڑتے بلکہ گرفت ڈھیلی رکھتے ہیں، اور ہتھیلی اور انگلیوں سے جو حلقہ نیزہ کی گرفت کے لئے بناتے ہیں اس میں قصداً خلا چھوڑتے ہیں، اور نیزہ بازی کے وقت سارا زور بازو کی جنبش پر صرف کرتے ہیں، تاکہ حریف کے جسم میں نیزے کی انی کافی حد تک پیوست ہو سکے، اسی طرح عملی اور کتابی زبان کا فرق بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ دورانِ حج میں جب مجھے عربی میں گفتگو کرنی پڑی تو نحو کی پوری پابندی کرتا اور گفتگو میں بھی اعراب کا پورا پورا لحاظ رکھتا، یہ دیکھ کر جمّال نے آخر ایک روز کہا کہ "یا شبلی انت نحوی" میں نے بوجہ ناواقفیت پہلے اس کو اپنی علمی لیاقت پر محمول کیا، مگر بعد کو پتہ چلا یہ تعریض تھی نہ کہ تحسین،

پہلا قومی کام ۱۸۷۷ء جس زمانہ میں مولانا تعلیم سے فارغ ہوئے، دنیائے اسلام میں ایک بہت بڑی تحریک پھیل رہی تھی، وہ "اتحادِ اسلامی" کی تحریک تھی، اس تحریک کے پہلے داعی سید جمال الدین افغانی مرحوم تھے، جنھوں نے آخر میں قسطنطنیہ میں قیام کر لیا تھا، یا قیام کرنے پر مجبور رہتے، بہرحال سلطان عبد الحمید خاں نے جو سلطانِ روم کے نام سے اس زمانہ میں مشہور تھے اس تحریک سے فائدہ اٹھا اور دنیائے اسلام کی عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا کی حیثیت سے اُن کو ہر جگہ خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین تسلیم کیا گیا، اور اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، جس وقت یہ تحریک اٹھی تو روس نے جس کی حریص نگاہیں آبنائے باسفورس کی زرّیں شاخوں پر ہمیشہ پڑتی رہتی تھیں، اور جس کی سلطنت میں تین کروڑ ترک مسلمان بستے تھے، جن سے وہ ڈرتا تھا، اس بات کا تہیہ کر لیا کہ وہ اس سلطنت کو مٹا کر دم لے گا، انگریز گو باسفورس کے ساحل پر روسیوں کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے،

لیکن دل سے یہ چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط ہو جائیں تاکہ کروڑوں مسلمان جو اس کی سلطنت میں بستے ہیں وہ ترک سلطان کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں حالانکہ یہ خیال سراب سے زیادہ بے حقیقت تھا،

انہی حالات میں ۱۸۷۷ء میں روس اور روم (ترک) کی جنگ شروع ہوئی، اس جنگ نے اسلامی دنیا میں آگ سی لگا دی، ہر جگہ سلطان کی فتح و نصرت کی دعا، مانگی جانے لگی، زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے جانے لگے، اور سلطان کی حمایت میں بڑے زور شور سے تقریریں ہونے لگیں اور تحریریں لکھی جانے لگیں، مولانا شبلی مرحوم کا آغاز شباب تھا، اس چنگاری نے ان کے تمام قویٰ کو مشتعل کر دیا تھا، انہوں نے بڑی مستعدی سے اعظم گڈھ میں چندہ جمع کرنا شروع کیا، اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ جن کا نام حسین حبیب آفندی تھا قسطنطنیہ روانہ کیا، اپنے دوست حکیم محمد عمر صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- "چندہ ایں شہر تا بہ دو ہزار و ششش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ ہزار متجاوز گردد ...... سپاس ایزد کہ روسیان تہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند، ہشت ہزار طعمۂ جحیم شدند، و بست و چہار ہزار زخمہائے گراں برداشتہ بر بستر خاک طپیدند، نسیم فتح و ظفر بر پرچم علم سلطانی وزید، و بادشاہ گرینڈ ڈیوک نکلس از بیم ضربت دلیران ترک از میان رمیدہ "[1]

سفرنامہ میں لکھتے ہیں "حسین حبیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی میں ترکش کانسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے، کہ محاربۂ روس میں میں نے بحیثیت سکریٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی "اسی سفرنامہ میں عثمان پاشا کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں جو ان کے سفرنامہ کی تاریخ

[1] مکاتیب فارسی ۹۲

ہے۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ پلونا کے شیر عثمان پاشا کے شجاعانہ کارناموں کی یاد اُن کے دل میں کس طرح باقی تھی: "یہ وہی نامور جنرل ہے جس نے پلونا میں چھبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے جس کے مقابلہ میں شہنشاہ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے، روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی اور عینو ں تک اپنا مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے، اور بچہ بچہ اس نامور بہادر کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ کسی فوجی افسر سے نہیں ملا لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا۔"[1] مولانا مرحوم کے دل میں اسی زمانہ سے جس اتحاد اسلامی کا جذبہ پیدا ہوا واقعات بتائیں گے کہ اخیر اخیر وقت تک وہ ان کے دل سے نہیں نکلا، بلکہ وقتاً فوقتاً اور اندر ہی اندر جڑ پکڑتا گیا،

ان ایام میں مولانا کے علمی اور ادبی مشاغل ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۳ء تک

مولانا ۱۸۷۶ء تک اعظم گڑھ اور اس کے اطراف میں رہے، کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا، مگر ان تمام بے اطمینانیوں اور ہنگاموں کے ساتھ ان کے علمی، ادبی مذہبی اور قومی مشاغل ہر حال میں جاری رہے،

تعلیم و تدریس کی خدمت ہمارے علماء کی زندگی کا لازمی جزو رہا ہے، خواہ کوئی وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتا کی مسند پر یا کسی سرکاری خدمت پر، کیونکہ یہ مشاغل دنیا ان کو ...

[1] سفرنامہ غازی عثمان پاشا کی ملاقات ۱۴۰

اہلی ذہن سو فاضل نہیں رکھتے تھے، چنانچہ فرنگی محل کے وہ اکثر علما جو نوابی کے زمانہ میں افتا کی خدمت پر مامور تھے، یہاں تک کہ مولانا کے استاذ الاستاذ مفتی محمد یوسف صاحب بھی جب تک لکھنؤ میں مفتی رہے، درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے رہے، یہی حال اُس زمانہ کے دوسرے سرکاری عہدہ دار علما کا تھا، مثلاً مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سررشتہ دار دہلی، مفتی عنایت احمد صاحب، مفتی صدرالدین صاحب دہلی، مفتی سعداللہ صاحب مرادآبادی وغیرہ، یہ سب لوگ بڑے سرکاری عہدوں کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف تھے، مولانا کے استاذ مولوی محمد فاروق صاحب کبھی کبھی وکالت کیا کرتے تھے، ساتھ ہی وہیں مقدمات کے کاغذوں کے ساتھ طلبہ کے اسباق کی کتابیں بھی کھلی رہتی تھیں،

شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویو الہ آباد میں مولانا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے، اور جس کے واقعات خود مولانا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے: "تکمیل سے فراغت کے بعد انھوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کئے۔"

اُس زمانہ میں مولانا جن لوگوں کو پڑھاتے رہے اُن میں سب سے پہلا اور بڑا نام تو خود مولانا کے ماموں زاد بھائی مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کا ہے، جو عمر میں مولانا سے سات آٹھ برس چھوٹے تھے، دوسرے صاحب مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم ہیں جو مولانا کے نہایت عزیز اور سلیم شاگرد تھے، ان کی کتابیں پوری نہیں ہوئیں، لیکن ان کا فارسی مذاق بہت اچھا تھا، وہ اسی زمانہ میں یعنی ۱۸۸۰ء میں عدالت میں نقل نویس ہوئے، اور بعد کو ترقی کر کے جج کے عہدہ تک پہنچے

مولانا کے اکثر پرانے خطوط اور قصائد ان ہی کے پاس محفوظ تھے، تیسرے صاحب دینا پارہ (اعظم گڈھ) کے مولوی محمد عمر صاحب تھے، جو بعد کو جون پور کے مدرسہ میں چلے گئے، مولانا کی ابتدائی فارسی غزلیں اور نامے انہی سے ملے، اسی زمانہ میں اپنے دلی دوست و ہم وطن حکیم مولوی محمد عمر صاحب بندولی کو فارسی میں خط لکھتے ہیں:۔ "دریں فرصت بہ ادب کار دارم، خود چیزے از ادب می خوانم، و دیباب حماسہ بہ دیگرے می آموزم" (مکاتیب نامہائے فارسی ۷)

معلوم نہیں یہ حماسہ کس کو پڑھاتے تھے، اکبر صاحب اور عثمان صاحب وغیرہ بعض دوسرے عزیزوں کو بھی اس زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھایا کرتے تھے، ۱۰ مارچ ۱۸۸۱ء کو اپنے ایک شاگرد مولوی محمد عمر صاحب دینا پاروی کو لکھتے ہیں:۔ "دریں روزہا دکاں کشادہ ام و تن بہ آموختن کساں در دادہ" (نامہ فارسی - ۱۳)

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا شغل شعر و شاعری تھا، اس زمانہ کے بعض سربرآوردہ علما جیسے مفتی صدر الدین آزردہ جو غالب کے ہمعصر اور دوست تھے، فارسی کے ساتھ اردو کے بھی شاعر تھے، مولانا فیض الحسن صاحب عربی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے، مولانا فاروق صاحب خود بھی شاعر تھے، اور نہ صرف شاعر تھے بلکہ موسیقی کا فن بہت اچھا جانتے تھے، مولانا فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اکثر رات کے تیسرے پہر اٹھا دیتے اور پوچھتے، شبلی بھیرویں سنو گے؟ پھر گا کر بتاتے، قومی جلسوں میں مولانا شبلی مرحوم جب پر اثر لے میں اپنے قصیدے پڑھتے تھے فرماتے تھے کہ وہ بھی استادی کا فیض تھا،

اس زمانہ میں عموماً فارسی غزلیں کہتے، فارسی قصیدے لکھتے، فارسی نامے بڑی محنت سے انشا کرتے، اور اردو شاعری کا تو ان دنوں عام چرچا تھا، خود اعظم گڈھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں

پڑھی جاتیں، واہ واہ کا شور بلند ہوتا،

اُن کی ہی زمانہ کی ایک چیز رزمیہ کابل و قندھار ہے، وہ صفر ۱۳۰۰ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۰ء کی لکھی ہوئی ہے، اُس کی نقل ہمارے سامنے ہے، انگلستان میں کوئی انگریز تھا جس نے محاربہ کابل و قندھار میں شرکت کی تھی، اور انگریزی شعر میں اس کا کچھ حال نظم کیا تھا، اس نے مولانا کے والد سے خواہش کی کہ اس کو کوئی اُردو نظم میں ترجمہ کر دے، یہ کام مولانا نے اپنے ذمہ لیا، اور وہ ترجمہ نثر میں سن لیتے اور اس کو نظم کر لیتے، شروع کے شعر یہ ہیں:۔

دشنۂ تیغ و سناں کی داستاں	رایت و طبل و نشاں کی داستاں
پہلوانانِ جہاں کی داستاں	شاہ کے اعوان و انصار کی داستاں

حکمرانِ بحر و کاں کی فتح ہے
قیصرِ ہندوستاں کی فتح ہے

والیِ کابل نے کی جب سرکشی	ملک میں اپنے سفارت منع کی
غیرت نے ڈالا تھا طرحِ آشتی	ہو چلا تھا کچھ خیالِ خودسری
روس پر تھا جو گمانِ اعتبار	ہاتھ سے چھوٹی عنانِ اختیار
سنتے ہی فرمانِ والائے جہاں	ہو گئی آراستہ فوجِ گراں
تھا رسالہ دلاوراں بنگال کا	ساتھ جس کے ہم ہو گئے رو گزا

اس کے بعد انگریز افسروں کا اور سفر کی منزلوں کا اور واپسی کا تذکرہ ہے، جنرل جیمس اور ڈاکٹر وائٹ کے نام اس میں خصوصیت سے لئے گئے ہیں،

اس زمانہ میں مولانا کا دوسرا کام غیر مقلدوں کا رد تھا، اس رد میں جو ان کو غلو تھا اس کی پرورش میں ان کے استاد مولانا محمد فاروق صاحب کا خاص ہاتھ تھا۔ بندول اور جیراج پور دونوں گاؤں بالکل ملے جلے ہیں، بیچ میں شاید ایک میل سے بھی کم کا فصل ہو، بندول مولانا شبلی کا، اور جیراجپور مولانا سلامت اللہ[1] صاحب کا وطن تھا، مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جاکر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی، پھر بنارس میں پڑھا، اور پھر دہلی پہنچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی، اور اس کے بعد نہایت انہماک کے ساتھ اپنے وطن واپس آکر ترک تقلید، اور آمین بالجہر رفع یدین، اور قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لئے وعظ و تبلیغ شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اعظم گڈھ کے اطراف میں تقلید و عدم تقلید اور ان فقہی مسائل کا شور مچ گیا،

خود مولانا شبلی کے حقیقی ماموں اور مولانا حمید الدین صاحب کے عم محترم مولوی محمد سلیم صاحب جو پھریا ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے اور مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی، قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری اور مولانا عبد اللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، پورے غیر مقلد تھے (مکاتیب میں ان کا ذکر ہے ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء میں وفات پائی) ان کے سبب گویا یوں کہئے کہ خود مولانا شبلی کے خاندان میں اگر تفرقہ پڑ گیا تھا،

[1] مولانا سلامت اللہ صاحب حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری (استاد جامعہ ملیہ دہلی) کے والد بزرگوار تھے مولانا سلامت اللہ صاحب آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی طلب پر بھوپال چلے گئے تھے، نواب صاحب نے وظیفہ کر دیا تھا، اور بھوپال کے بعض مدرسوں کے اہتمام کی خدمت سپرد کر دی تھی ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں وفات پائی ہمارے استاد مولانا حفیظ اللہ صاحب بھی اُن کے ابتدائی شاگردوں میں ہیں،

غرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر مولنا شبلی نے غیر مقلدین کے رد کے لئے کمر ہمت باندھی، سنا ہے کہ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی، اپنے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے، جن میں بعض چھپے اور بعض قلمی رہے، اُدھر سے مولنا سلامت اللہ صاحب اور اُدھر ضلع اعظم گڈھ کے مولوی اسد اللہ صاحب المتوفی سنہ ۱۳۳۲ھ جو مولانا محمد صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، مقابلہ کو نکلے، دونوں طرف سے رسالے لکھے گئے، مناظرے ہوئے، اشتہارات ہوئے اور وہ سب کچھ ہوا جو ہونا چاہئے،

اس عہد میں مولنا شبلی مرحوم نے جو رسالے لکھے، ان میں سے صرف ایک کا مجھ کو علم ہے اور وہ ظل الغمام فی مسئلۃ القرأۃ خلف الامام ہے، یہ چالیس صفحوں کا اردو رسالہ ہے، جو سنہ ۱۲۹۲ھ میں کانپور کے مشہور مطبع نظامی میں چھپا تھا، یہ مولنا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں ہے، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترک قرأت کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا ہو اور آخر میں مخالف کے حدیث و فقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے،

اس رسالہ کا دیباچہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

"کیا عبرت کا مقام ہے، کیا افسوس کا وقت ہی، زمانے کا دور آخر ہے، اہل بزم اٹھتے جاتے ہیں، محفل برہم ہو چلی، سحر ہونے کو آئی، وہ روشن اور بزم افروز شمع اسلام سنبھالے رہی ہے، اودھر بادِ مخالف کے جھونکے چلنے لگے، اب تک تو خیر تھی کیونکہ وہ شمع ہنوز حمایت علما کی فانوس میں

اغیاروں کے دستِ ستم سے محفوظ تھی، لیجیے اب اپنے بیگانے ہو گئے، خود محل والوں میں سے حضرات غیر مقلدین چاروں طرف سے اُسے گل کرنے کو دوڑے، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ[1]

جمعیتِ اسلام برہم ہو چکی تھی، اعداء نے دین کو بیکس و بیچارہ سمجھ کر دستِ تعدی دراز کر رکھا تھا، وقت یہ تھا کہ ہم سب ایک بنتے، دینی عزت کو دنیاوی جاہ و وقار کے ساتھ حاصل کرتے، ملحدوں کے تیر بارانِ اعتراضات کو استدلال و احتجاج کی سپر پر روکتے، جس طرح اسلام ہمیشہ مظفر و منصور رہتا آیا ہے، آج بھی اس کے نقارۂ فتح و ظفر کی صدا غنیم کے لشکر میں گونجتی، مگر ان بیدردوں کو اس سے کیا غرض، انہوں نے نام و نمود کے پیچھے جمعیتِ اسلام کو وہ درہم برہم کیا کہ جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان ہل گئے، اور اس کی مضبوط و پائدار بنا متزلزل ہو گئی، جمیع جماعت میں تفرقہ پڑ گیا، سب و شتم سے گذر کر طعن و ضرب کی نوبت پہنچی، رفتہ رفتہ گورنمنٹ کو دخل دینا پڑا، اور ہماری مذہبی نزاع جس میں علماء اور مجتہدین کے فیصلے ناقابلِ تسلیم قرار دیئے گئے تھے، اب حکامِ انگریزی نے فیصل کئے، فَاعْتَبِرُوْا يَا اُوْلِي الْاَبْصَارِ،

غیر مقلدین اگر اپنے استنباطات کو صحیح سمجھتے تھے، سمجھے، اور اس پر کاربند ہوتے، مگر یہاں تو وہ مثل ہے

ع میں تو ڈوبا ہوں وے تجھ کو بھی لے ڈوبوں گا۔

اشتہار جاری ہوئے، رسالے چھپے، آخر اس پر دم لیا کہ ہم مذہبِ حنفی پر اعتراضات رکھتے ہیں جو جواب دے انعام لے، علمائے حنفیہ کو اول تو درس و تدریس و دیگر مشاغلِ علمی سے فرصت کہاں، دوسرے وہ سمجھے کہ قلم اٹھائیے تو کس پر، جواب لکھیے تو کس کا، اس تمام فرقۂ جدیدہ میں دو ایک کے سوا کسی نے درسِ نظامیہ کی پوری کتابیں بھی نہیں پڑھیں، نہ کسی کا اعتماد علماء میں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا احمد علی محدث مرحوم

---

[1] آیت قرآنی میں قصداً تبدیلی کر دی ہو ۔۔ س

وجناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس دیوبند و جناب مولانا محمد عبدالحئی صاحب وغیرہم کو بہت کم اس بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا، ادھر یہ بھی خیال کہ کس سے مقابلہ کیجئے اسمانوں سے

راز معشوق نہ افشا ہو جائے　　　　ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

حضرات غیر مقلدین اس بے اتفاقی اور عدم التفات کو دلیل عجز سمجھے اور بھی تیز ہوئے، قلم خشک میدان مناظرہ میں کود پڑے، مگر علمائے حنفیہ ان چھوٹی چوڑوں کے مقابل آنے کیوں لگے، تاہم اگر کسی عالم حنفی نے عنانِ التفات ایک ذرا ادھر پھیری تو مدتوں کے لئے فرصت ہو گئی، ایک انتصار الحق کا جواب مرپٹ کر اثناعشریہ عا آٹھ دس برس میں تیار ہوا سو بھی کیا، کافذ بادی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ہرچند اس شور و فتنہ انگیزی پر بھی ہم کو خانہ جنگی سے احتراز رہا ہے، مگر صرف اس خیال سے کہ (شعر سعدی)

چو باسفلہ گوئی بہ لطف و خوشی　　　　فزوں گردش کبر و گردن کشی

مناسب معلوم ہوا کہ تھوڑی سی دار و گیر کر دی جائے، اس پر بھی اگر باز نہ آئے تو پھر پوری خبر لی جائے،

اصل مقصود

واضح ہو کہ اس فرقہ نو کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن و حدیث کے پیرو ہیں، اور بہ مقابلہ حدیث نبوی کسی امام و مجتہد کے قول کو سند نہیں لاتے، اس رسالہ میں بضمن مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام دو باتوں کا ثابت کرنا منظور ہے، ایک یہ کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب قرآن و حدیث سے صاف صاف ثابت ہے، پس غیر مقلدوں کا یہ بیان کہ چونکہ امام صاحب کا مذہب احادیث کے خلاف

ہے، اس لئے ہم اس پر عمل نہیں کرتے، باطل از راہ فریب و مکر ہے، دوسرے یہ کہ حضرات غیر مقلدین حدیثوں میں کس قدر کذب و افترا کو کام میں لاتے ہیں اور عوام کو دامِ فریب میں پھنساتے ہیں، اے برادرانِ اسلام اس رسالہ کو خوب غور و فکر سے دیکھو اور جب تمہیں ثابت ہوجائے کہ یہ لوگ حدیثوں کی سند میں فریب اور کذب اختیار کرتے ہیں تو ان سے بیزار ہوجاؤ، اور پھر ان کے دامِ فریب میں نہ آؤ،

امرِ اوّل واضح ہو کہ غیر مقلدین کا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا امام کے پیچھے واجب ہے، ہر نماز میں خواہ وہ سری ہو خواہ جہری، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مقتدی کو کسی قسم کی نماز میں قرأتِ فاتحہ کرنا مستحب بھی نہیں اور وجوب کا تو کیا مذکور، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں جس سے ہمارا مدعا ثابت اور اُن کا دعویٰ باطل ہوتا ہے "

اس مقدمہ کو میں نے یہاں اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا، نیز یہ کہ دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا، دعویٰ اور دلیل کی ترتیب اور الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھا کر کہنے کا سلیقہ ان میں فطری تھا، تیسری بات اس سے اُن کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے جو اس نازک زمانہ میں باہمی فرقہ آرائیوں سے اُن کے دل کو پہنچا تھا،

احناف میں مولانا ابو الحسنات عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں ایک معتدل روش رکھتے تھے یعنی ان کو اس مسئلہ میں وہ غلو نہ تھا جو اس زمانہ کے دوسرے علمائے احناف کو تھا، مولانا موصوف نے سنہ ۱۲۹۰ھ میں "امام الکلام فیما یتعلق بالقرأة خلف الامام"

کے نام سے ایک مفصل کتاب بطور رسالہ کے لکھی تھی، اور اس میں فقہائے اربعہ کے مسالک کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، اور نتیجہ یہ نکالا تھا کہ ائمۂ احناف کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا نہ پڑھنا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض پڑھنے کے بھی قائل ہیں، اور کم از کم مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا نہ حرام ہے نہ مکروہ، بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شافعیوں کی طرح اس کا پڑھنا ہر حال میں واجب نہیں سمجھتے۔ آخر میں مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی تحقیق یہ ظاہر فرمائی ہے کہ جہری میں امام کے سکتات میں یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنے میں جہاں جہاں امام چپ ہو اور سری میں عام طور سے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے۔

عام علمائے احناف کی طرح مولانا شبلی مرحوم کا یہ خیال تھا کہ امام کے پیچھے قرأت فاتحہ نہ صرف یہ کہ واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، اسی بنا پر "اسکات المعتدی علی انصات المقتدی" کے نام سے ۸۴ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا، اور مشہور مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۹۸ھ میں اس کو چھپایا، اس کے چھپوانے کا خرچ ان کے چچا شیخ حبیب اللہ نے اپنے ذمہ لیا (مقدمہ رسائل) رسالہ چھپا اور شائع ہوا، اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، یہاں تک کہ ہندوستان سے نکل کر مصر و شام اور روم تک پہنچ گیا، ۱۳۱۰ھ میں جب مولانا نے اسلامی ملکوں کا سفر کیا تو اس رسالہ کے مصنف کی حیثیت سے بعض علماء نے ان کی بڑی قدر کی تھی، مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کا خود ذکر کیا ہے، (ص ۳۲)

اس رسالہ میں مولانا شبلی نے متن میں "قال بعض العلماء" لکھ کر مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی تحقیق کا رد کیا تھا، اور بین السطور میں مولانا عبدالحی صاحب کے نام کی بھی

تصریح کردی تھی، لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، رسالہ کی زبان بہت ہی ادیبانہ ہے، دیباچہ میں مشکل الفاظ قصداً لائے گئے ہیں، جو خاص مولنا فاروق صاحب کا ڈھنگ تھا۔

یہ رسالہ جب مولانا عبدالحی صاحب اور اُن کے شاگردوں تک پہنچا تو انھوں نے اس کے جوابات لکھے اور چھپوائے، ان میں سے پہلا جوابی رسالہ مولنا عبدالحی صاحب کے شاگرد مولنا نور محمد صاحب ملتانی نے لکھا، رسالہ کا نام "تذکرۃ المنتھی فی ردّ اسکات المعتدی" ہے، ان ہی کا دوسرا مختصر رسالہ "الافادات فی ردّ الاسکات" ہے، اور تیسرا "التنبیہات علی ہفوات الاسکات" ہے، چوتھا رسالہ "الایماضات الی اغلاط مصنف الاسکات" حافظ ملا شبیب حنفی کابلی باجوری کا ہے، یہ مجموعہ ۱۲۹۰ھ میں مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں چھپا، اسکے آخر میں حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے ایک شاگرد عزیز کی مدحیہ تاریخ ہے، گو خود مولنا عبدالحی صاحب نے اس رسالہ کا براہ راست جواب نہیں دیا، لیکن چند سال کے بعد انھوں نے اپنے رسالہ "امام الکلام" کو دوبارہ چھپوایا تو "غیث الغمام" کے نام سے اس پر ایک حاشیہ بڑھایا جس میں منجملہ اور دوسری باتوں کے مولنا سے تعرض کئے بغیر اُن کے اعتراضوں کے جواب دیے ہیں،

مولانا فرماتے تھے کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ مولنا عبدالحی صاحب فرنگی محل سے جاکر

---

[1] ایماضات کے مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے "لکنہ لما کان ظنّ العوام انہ قد اصاب فی ما رام علی انہ لایکاد ان یحوم حول المرام، صرفتُ الیہ عنان العنایۃ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے مولنا شبلیؒ کے رسالہ کو پسند کیا تھا، اور اس کی مقبولیت ہو چکی تھی،

ملا تھا تو مولنٰا ممدوح نے احناف کی باہمی خانہ جنگی پر افسوس ظاہر کیا، اور فرمایا کہ ہم آپس میں لڑتے ہیں اور اہلحدیث کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وہ کس طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے رہتے اور کام کرتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ مولنٰا کا اشارہ میرے رسالہ کی طرف تھا، اس لئے مجھے ندامت ہوئی :

اس رسالہ میں بھی وہ دو باتیں جو ان کے فضل و کمال کا طرۂ امتیاز تھیں موجود ہیں، ایک منطقیانہ ترتیب و حسنِ استدلال اور دوسری عربی انشا پردازی، اسی لئے جن لوگوں نے اس کے جواب لکھے انھوں نے بھی اپنے جوابی رسالوں میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا، مگر مولانا ان جوابی رسالوں کے جواب کے لئے بھی پوری طرح تیار تھے۔ نامۂ فارسی ۱۰ میں، ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں :-

" انشاء اللہ در اندک زمانے از عہدۂ رد تذکرہ بدری آیم مرد ماں گویند کہ ایاضات و رسالۂ دیگر ہم از حافظ صاحب است، تا حال بر علم و استعداد حافظ صاحب اعتمادے داشتم، اکنوں آں ہم برخاست، انشاء اللہ در قریب وقتے بہ فارسی پوری بسم و دریں اغلاط و یا نفر ہائے مصنف تذکرہ و ایاضات ہم باز خواہم گفت :

اس تذکرہ اور ایاضات سے اوپر کے وہی دونوں رسالے مقصود ہیں،

اردو زبان و ادب کی طرف گو ان دنوں مولنٰا کی توجہ بہت کم تھی، پھر بھی مولنٰا کے شباب کا یہ عہد وہ تھا جب لوگ ادھر متوجہ ہو چکے تھے اور ہر قسم کے اخبارات اور رسالے نکلنے لگے تھے سنہ ۱۸۷۷ء سے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم کا ظریفانہ اخبار اودھ پنچ نکلنا شروع ہوگیا

تھا، اس زمانہ میں اس اخبار میں اچھے اچھے ادیب اور شاعر مضمون لکھا کرتے تھے، اخبار سیاسیات میں کانگریس کا حامی تھا، اور سر سید کی مخالفت میں نہایت شوخ مضامین لکھا کرتا تھا، مولانا مرحوم اس اخبار کو ان دنوں بڑی دلچسپی سے پڑھا اور زبان کا لطف اٹھایا کرتے تھے، میر اکبر حسین (یعنی اکبر الٰہ آبادی) سے مولانا کی واقفیت اسی اخبار کے ذریعہ علی گڈھ جانے سے پہلے ہو چکی تھی، اور اودھ پنچ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں مولانا کو اخیر زمانہ تک یاد تھیں، اور خود مجھے سنائی تھیں؛

اس زمانہ میں لکھنؤ سے اردو غزلیات کا ایک دلچسپ ماہوار گلدستہ پیام یار کے نام سے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے، چوک میں دار وغہ حیدر بخش کی مسجد کے پاس ان کی دوکان تھی[1]

[1] مرزا محمد عسکری صاحب بی اے (لکھنؤ) مترجم تاریخ ادب اردو جو مولانا کے پرانے ملنے والے تھے، اپنی اس کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: "منشی نثار حسین مرحوم اڈیٹر پیام یار، مولانا کے ایک مخلص دوست تھے، ان کی چوک میں عطاری کی دکان تھی، جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو نیری منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے، اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے، یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی عبد الحلیم شرر، شوق قدوائی، اذن صاحب خورشید، ابو صاحب جلیس، سید منشی نثار حسین رضوی وکیل مرحوم اور دوسرے مخلص احباب جمع ہوتے، اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے، وزیر تنبولی کی خوش ذائقہ گلوریوں اور حسین بخش ساقی کے شربت سے احباب کی ضیافت کی جاتی، کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھیں مٹکاتے اور ہنستے اس جلسہ میں شریک ہو جاتے، اور اپنی پرلطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے، ایک دن جب کہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے، شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی، وقت ۔۔۔ بجے شام کا ۔ چوک میں بڑا مجمع تھا، تعزیے سجے ہوئے اور باجوں وغیرہ کے غل پڑ رہے تھے، شور و غل اور بھیڑ کی کوئی حد نہ تھی، سب لوگ اس سیر میں مشغول، مگر مولانا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مطالعہ میں جو کسی کو تحفہ کے طور پر ملی تھی مشغول و منہمک تھے، گو یا مجھ دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا، اور اپنا کام کرتے رہے ... کتاب اسی عالت

اور مسجد کی سامنے والی گلی میں ان کا عطر کا کارخانہ تھا، اور اسی میں ان کے اس گلدستہ کا بھی دفتر تھا، جو ہر مہینہ مشام روح کو اپنے کلام سے معطر کرتا تھا مولانا اس کو بھی پڑھتے تھے، اور شاید اسی تعلق سے انہی منشی ممتاز حسین صاحب کے ذریعہ سے مولانا کی مثنوی "صبح امید" اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پہلی دفعہ چھپی،

اس زمانہ کی بعض اردو غزلیں مکاتیب میں ملتی ہیں اور بعض پرانے شاگردوں کی بیاضوں میں نقل ہیں،

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا، جو اس زمانہ میں بھی موجود تھا، گو اس زمانہ کا نقطۂ نظر کچھ اور تھا، فرماتے تھے کہ اعظم گڈھ میں کتابوں کی کوئی دکان تھی، مولانا اکثر اس میں چلے جاتے، اور شام تک علمی کتابیں پڑھا کرتے، یا دواوین دیکھا کرتے، اس زمانہ کے خطوں میں بھی اس کا تذکرہ ہے، مولوی محمد عمر صاحب دینا پاری کو فارسی میں، ۲۸ مارچ ۱۸۸۱ء کو بستی سے جہاں وکالت کر رہے تھے، جون پور لکھتے ہیں:

"در انجا کتابہائے نایافت فراہم آمدند" (نامۂ فارسی ۲)

ابن ابی حجلہ تلمسانی حنفی، المتوفی ۷۷۶ھ کی ایک تالیف کا نام دیوان الصبابہ ہے، اس میں اس نے عرب عشاق کے واقعات اور عشق و محبت کی لطیف عربی نظمیں اور غزلیں جمع کی ہیں، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا شبلی کے پاس تھا، جو اس وقت دارالمصنفین میں ہے، اس دیوان کے اوراق میں مولانا کے دست خاص کا ایک عربی خط کسی کے نام لکھا رہ گیا ہے، اس نسخہ پر سعد الدین حیدر علوی ۱۲۳۹ھ کی مہر ہے، اور آخر میں سعد الدین حیدر صاحب

کی تحریر ہے کہ یہ نسخہ میرے ماموں سید محمد حسن خاں نے ۱۳۲۲ھ میں مجھے عنایت فرمایا۔ بہرحال اس دیوان کے اوراق میں مولانا شبلی مرحوم کی حسب ذیل عربی تحریر ہے،

سلام علیکم

هذا دیوان الصبابة یصل الیکم، واما انا فلا یمکننی حضوری لدیکم لا لانی اشتغلت بامور غیر طائلة وقعدت همتی، و صرفت عنان العنایة الی الدنیا الدنیة وبرئت من تحصیل کمال العلم والادب ذمتی، فانی بحمد الله خلقت وکسب الفضل سیط من دمی، فهو لا یفارقنی ان شاء الله فی حالتی وجودی وعدمی، بل لانی لما لازمت هذه العهدة الرذیلة ادوم التفکر فی حالتی، فیزید همی ویزید ادعلاقتی ویبید کمال الانصاف، ماهذا

سلام علیکم

یہ دیوان الصبابہ آپ کے پاس جاتا ہے میں خود نہ آسکوں گا اس لئے نہیں کہ میں کسی غیر مفید شغل میں مصروف ہوں اور میری ہمت بیٹھ گئی ہے اور میں نے عنانِ توجہ دنیائے دنی کی طرف موڑ دی ہے اور علم و ادب میں حصولِ کمال کی کوشش سے میں نے اپنی ذمہ داری اٹھالی ہے بحمد اللہ اس طرح بنا ہوں کہ فضل و کمال کے حصول کا جذبہ میرے خون میں ملا ہوا ہے جو انشاء اللہ مجھ سے نہ جیتے نہ مرتے کبھی جدا ہوگا، بلکہ میرے نہ آنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے جو یہ معمولی سی ملازمت کر لی ہے اس کے سبب سے میں ہمیشہ اپنی نسبت سوچا کرتا ہوں اس سے میرا حزن و ملال بڑھ جاتا ہے، انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے اور میری نسبت اس کے سوا

الا المجوس والاحتساف فصبر	کچھ بھنا مرنج ظلم ہے، صبر اس حالت میں
جمیل وھو حسبی ونعم الوکیل	خوب ہے، اور اللہ تعالیٰ مجھے بس ہے،
(م، ش نعمانی)	اور کیسا کارساز ہے،

یہ خط غالباً ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء کا ہے، کیونکہ مولوی محمد عمر صاحب کی بیاض دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "م ش نعمانی" کرکے دستخط وہ اسی زمانہ میں کرتے تھے، اس خط سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کی عربی انشا، اسی زمانہ میں کیسی صاف، و فصیح اور خالص عربی میں ہونے لگی تھی، اور جو ہندوستانیت اور متاخرین کے تکلفات بارد سے بالکل پاک ہے، دوسرے نادر کتابوں کے دیکھنے اور پڑھنے کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ ان کا مرغ ہمت اپنے لئے ہمیشہ کسی بلند آشیانہ کا طالب تھا،

اسی دور ابتدا میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"نفسے چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آمدہ وہم سزاے آں است کہ سرشتہ اش بہ ایں چنیں کار پایند باشد، دیگراں ندانم تا در سر چہ دارند من خود دریں خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ ایں ہمہ خوار سیاہ جہاں شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے تجمل پادری کرد جہاں خواہم بود کہ ہستم" (مکاتیب فارسی ۱۱)

وکالت کی تعلیم ۱۸۷۹ء و ۱۸۸۰ء

ہر باپ کی طرح مولانا کے والد بھی یہ چاہتے تھے کہ پڑھنا پڑھانا جو ان کے نزدیک بے شغلی کا ایک کام تھا چھوڑ کر وہ کسب معاش کی طرف متوجہ ہوں، اور لڑکے تو مولانا کے والد کی نگاہ میں وکالت کا پیشہ موزوں نظر آیا کیونکہ اعظم گڑھ میں اس وقت مولانا کے والد اور ماموں بڑے کامیاب وکیل تھے اس لئے قدرتی طور پر مولانا کے والد نے یہی شاہراہ عمل ان کے لئے تجویز کی، مگر خود مولانا کی بلند فطرت

اور مذاقِ سلیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"از تعاول دہرہ حفظِ قانون مشغول ہستم سلیم محروی ہم درین کا ساندۂ زمانۂ فارسی۔۔۔"

بایں ہمہ باپ کے حکم سے مجبور ہو کر باولِ ناخواستہ قانون کی ورق گردانی شروع کی ہر روز کچھ قانونی دفعات یاد کر لیتے اور اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کو جو اس زمانہ میں انگریزی پڑھ رہے تھے، سنا دیا کرتے، امتحان کا وقت آیا تو مولانا امتحان دینے کے لئے تیار نہ تھے، مگر والد کے اصرار سے امتحان کی فیس بھیجی گئی، اتفاق یہ کہ اتنی ہی تیاری پر مسٹر مہدی مرحوم کو بھی تفریحاً امتحانِ وکالت میں شرکت کا خیال پیدا ہوا، اور فیس بھیجدی، حالانکہ نہ اُن کا ارادہ وکالت کا تھا، نہ انھوں نے پوری تیاری کی تھی، صرف مولانا کے اسباق سُن سُن کر کچھ مسائل حافظہ میں رہ گئے تھے،

مولانا کو غالباً اپنے جوابی پرچوں کی کمزوری کا احساس تھا اس لئے امتحان دے کر وہ الٰہ آباد میں کالون صاحب سے جو اُن کے والد کے دوست تھے اور جو اُن دنوں اس امتحان کے ممتحن ہوا کرتے تھے ملے لیکن جب ان سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس سال ممتحن نہیں تو ملول ہوئے، دیوانِ حافظ میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا،

انچہ سعیست من اندر طلبت بنمودم ۔۔۔ ایں قدر ہست کہ تغییرِ قضانتواں کرد

اس شعر نے اور بھی افسردہ خاطر کیا، اور لوگوں کا یہ طعن کہ انگریزی کے بغیر کوئی بڑی ڈگری نہیں مل سکتی دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا، اپنے بھائی مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"چناک الٰہ دی با کالون صاحب برخوردم از نام ونسب پرسید ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام پیش آمد"

حضرت خواست کہ امسال صحف اردو نگریستن نخواہم، دل زدو بجائے رسیدم، واز دیوانِ غیب
تفاؤل خواستم، ایں شعر برآمد۔

آنچہ سعی است من اندر طلبت بنمودم ایں قدر ہست کہ تغییر قضا نتواں کرد

ناامیدی و غیر مقدم گفتم، و درپس زانوئے حرماں نشستم، جانا درد دل خواہی گفت کہ ایں ہمہ آزادی
بہ بیچہ دل بستن و کلاشے آمدہ و بر سر پای شکستن یعنی چہ، مگر چوں اں کردہ کہ سر بسنگ آمد، و فسحتہا از دل
از تراکم افکار تنگ آمد، دو سہ سالے است کہ پائے طلب در دامن کشیدم و بچیزے نرسیدم، و خوشتراں
گزینہ کہ غیر از تعلم انگریزی نخواہی بسر بردا، و ایں خود چہ حرف است، بجہے رہائیں کہ ہیچ از انگریزی
نخواندہ اند، و باز بمناصب جلیلہ می رسند، آخر در تحصیلداری وغیرہ دو خود دشمر و طاغیست، فی الجملہ ستیزہ
چرخ و آویزشِ بخت برآنم آوردہ کہ لختے از عمر بادیہ پیمائی و ہرزہ درائی گذرانم[1]۔ بہرحال نتیجہ وہی ہوا
جس کا ڈر تھا، مولانا امتحان میں ناکامیاب رہے، اور عجیب بات یہ کہ مہدی حسن پاس ہو گئے۔
اس واقعہ سے مولانا کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی، اور تہیہ کر لیا کہ اب وکالت پاس کر کے
دم لیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے پہلے قانون کی ایک ایک کتاب کو بالاستیعاب
پڑھ کر اصولی کلیات مرتب کئے، اور دفعات کے جزئیات کو محفوظ رکھنے کے خیال سے چند
مختصر اشارات وضع کئے، اس طرح پر ایک اپنا خلاصہ مرتب کیا، اس دماغی کاوش کی بدولت
مسائلِ قانونی پر خود عبور ہو گیا، اور دوسرے سال [illegible] میں پاس ہو گئے، مولانا کا یہ خلاصہ
اتنا کارآمد ثابت ہوا کہ اس کی مدد سے اُن کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے

[1] مکاتیب نامہائے فارسی ۔ ۴۴

اعظم گڈھ میں وکالت ۱۸۸۳ء

کامیابی کے بعد اپنے والد کے اصرار سے وہ وکالت پر آمادہ ہوئے، مگر اس راہ میں اُن کی ایمانداری اور سچائی کی بنا پر ہر قدم پر اُن کو مشکلات کا سامنا ہوا۔ اُن کے یہ دن عجیب کشمکش میں گذرے۔ علی گڈھ جانے کے بعد ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء کو اپنی موجودہ چھوٹی نوکری سے گھبرا کر دوبارہ وکالت کا خیال کرکے کانپتے تھے۔ اپنے چچا کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "والد قبلہ را جز بوکالت روے ورا ہے نیست دبایں آزردہ دلی اگر بوکالت ساختہ باشم و در تطر اضعاف مرا درین میان جز نے خواہد بود، در غلق والد قبلہ ستیم بجنین خواہد بود، آہ! از این ہنگام کہ دولت روے گرداند وکار بدست من افتد و دامان آشوب و دے بجائے نمانم و خواست و ناخواست روے بوکالت آرم و خویش را ملازمہ تمھم مرد مان را بہرزہ و لاف فریب وہم درین خواری بخویش در پذیرم و ہم درین ذلت و خستگی صد دشنام بازہم" (۳) بہرحال مولانا نے والد کے کہنے سے ۱۸۸۳ء میں اعظم گڈھ میں وکالت شروع کی، مگر اس عزم اور ارادہ کے ساتھ کہ ایک حرف بھی حق و صداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا۔ ظاہر ہے کہ ضلع کی وکالت ان شرائط کے ساتھ نبھ نہیں سکتی تھی، چند دنوں کے تجربہ نے خود مولانا کے والد پر یہ حقیقت واضح کردی کہ اس ورع و تقویٰ کے ساتھ ان سے یہ وکالت کا پیشہ جو قدم قدم پر رنگ آمیزی کا محتاج ہے چل نہیں سکتا۔

ملازمت ۱۸۸۳ء

وکالت کے بعد پڑھے لکھے آدمیوں کا شغل ملازمت سمجھا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی سرکاری ملازمت بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، نواب وقار الملک وغیرہ بہت سے مشہور اکابر قوم نے ادنی معمولی ملازمتوں سے ترقی پائی تھی۔ شیخ

صاحب کا خیال بھی قدرتی طور پر اسی جانب مائل ہوا، اور مولانا کو عدالت کلکٹری میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت دلوا دی، تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، جس میں سے نو روپے تو مکان سے کچہری تک کرایۂ آمد و رفت میں اٹھ جاتے تھے۔ اس کے بعد قرق امین کی اسامی عارضی طور پر خالی ہوئی تو اس کی بھی قائم مقامی کی، اور امانت کے فرائض اس دیانت سے انجام دیئے کہ اہل معاملہ کے ہاں پانی پینا تو بڑی چیز ہے ان کے سایۂ دیوار میں آرام کرنا بھی معصیت سمجھتے گرمیوں کا موسم، رمضان کا مہینہ، تپتی ہوئی دوپہر اور جھلسا دینے والی دھوپ میں، روزہ رکھے ہوئے گاؤں گاؤں گھوڑے پر سوار پھرا کرتے تھے۔ افطار و سحر کا کوئی سامان نہ ہوتا۔ سائیں دال چاول ابال دیتا اسی کو کھا لیتے۔ ان مصائب کو پھر بھی وکالت پر ترجیح دیتے،

چنانچہ اپنے ایک عزیز کو اسی زمانہ میں ۲۵ اگست ۱۸۸۲ء کو ایک خط لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں ”ماہے دو در کار امانت روز از شب نشناختم و در راہ طلب از غایت جد و جہد تاب و تواں در باختم غریب تر حالیست منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن با آمیزش کسے نمی دادم اکنوں از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بجائے رخش افتادہ است، اگر حسن و صفائے من کہ ایں ہمہ محنت بر دو نقش گداز گی

از آں دوست تر دارم کہ ترہاتے چند در ہم بافتہ، دروغ راست مانا را پیش کساں جلوہ ظہور و فروغ قبول دہندہ“ (نامہ فارسی ۲۰) مولانا مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اور محنت و دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے، مگر ان کو افسروں کی دربارداری کا سلیقہ کہاں تھا، اور اس کے بغیر ملازمت اور وہ بھی ماتحتی کی، ملتی کیونکر، اور مل بھی جائے تو چلتی کے دن، چنانچہ امانت کے اس چند روزہ دور دوش کا انجام خود انہی کی زبانی سنیے، اسی خط میں فرماتے ہیں: ”وہر چند کوشیدم

راہ پر خطر و دو اسپہ تاختم و در آنجا ایں کار بہر کس و ناکس ساختم مگر ایں ہمہ بجائے نہ رسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامنِ قناعت کشیدم فرمانِ تقدیر ہم نہ داد و ہمانا بہ سند کارگذاری بہ رسید۔" (نامۂ فارسی ۲۰)

نیل کا کام [illegible]

مولانا کے والد زمینداری کے ساتھ نیل سازی کی تجارت وسیع پیمانہ پر کرتے تھے، اور اپنے علاقہ میں نیل کے متعدد کارخانے (جو ان اطراف میں گودام کہے جاتے ہیں) کھول رکھے تھے، مولانا کی بے شغلی دیکھ کر ان کے والد نے اس کام کی نگرانی اُن کے سپرد کی، صبر و شکر کے ساتھ کچھ دنوں یہ کام بھی سرانجام دیا، ایک دوست کو لکھتے ہیں "چو ازیں کشمکش فارغ نشستم دیگرے دردسرے یعنی کارم بہ گودام و متعلقاتِ او افتاد و ہر چند آں چناں کارے سزائے ایں ہیچ کارہ نبود مگر مرا از امتثالِ امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نہ بود" (۲۴ نامۂ فارسی)

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

بستی میں وکالت (اخیر [illegible])

اس زمانہ میں ضلع بستی میں مولوی محمد کامل صاحب ویدپوری منصف تھے، وہ اتفاق سے اعظم گڑھ آئے اور مولانا کو وکالت کے لئے اپنے ساتھ بستی لے گئے، چنانچہ [illegible] میں چند مہینے بستی میں وکالت کی،

مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی پر اپنا آپ تبصرہ

خوش قسمتی سے ہم کو مولانا کا ایک خط جو ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء کو سید محمد فاروق صاحب شاہپوری کے نام لکھا گیا تھا مل گیا ہے، مکتوب الیہ نے یہ خط معارف نومبر ۱۹۲۳ء میں چھپوایا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں: "علمی شوق والد اور گھر کی تربیت کا اثر تھا، خاندان میں علم کا چرچا تھا، اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے، اس زمانہ

کی طالب علمی بہت مشکل تھی یکہ پر سفر کرتے تھے، پیدل بھی چلنا پڑتا تھا، یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا، دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا، یہ خاص التزام رہا (اور اس میں میں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصولِ فقہ کے لئے ان ہی علماء کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا، جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے، مثلاً حدیث کے لئے مولانا احمد علی سہارنپوری، ادب کے لئے مولانا فیض الحسن لاہوری،

والد اور تمام خاندان کی مرضی بلکہ حکم تھا کہ میں علمی مشاغل کو چھوڑ کر وکالت اور ملازمت کروں، چنانچہ مجبور ہو کر امتحان دیا اور کامیاب ہوا، چند روز وکالت کی لیکن وکالت اور ملازمت سب چھوڑ دی، اور علمی اشتغال میں مصروف ہوا، اور اس لئے معمولی معاوضہ پر اول علی گڑھ کی پروفیسری لطف سے ہوا ۔۔۔ ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی، لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا شغل جاری رکھا، اور یہ فطرت تھی۔" مولف: ان چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور وکالت سے بعدم مناسبت کے سبب تنگ دل رہتے تھے، بایں ہمہ ان کی بلند نظری اور علوئے ہمت ان کو ان کے روشن مستقبل کی بشارت دیتی تھی، ۲۵ اگست ۱۸۸۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ع بایں ہمہ خوار بے بہا شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے بہ بجنم یاد آوری کرد جہاں خواہم بود کہ ہستم" (زمانۂ فارسی ۲۰)

علی گڑھ کا سفر ۱۸۸۳ء اور سرسید سے ملاقات

آخر وہ وقت بھی آگیا جو اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کے لئے مقرر تھا، علی گڑھ کی تحریک اس زمانہ میں سب سے بڑی تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی تعلیم سے آراستہ کیا جائے، سرسید مرحوم چونکہ مشرقی اصلاح

میں بہت دنوں تک رہے تھے، اس نے اس تحریک نے ان اطراف کے مسلمانوں میں کوئی اثر پیدا کر دیا تھا، اور خود مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی ہوگئے تھے، اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد اپریل ۱۸۷۵ء میں انگریزی پڑھانا شروع کی، اور ان کو علی گڑھ کالج کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا، جہاں وہ ۱۸۸۱ء تک رہے، اور وہیں سے اُسی سال انٹرنس پاس کی اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شیخ صاحب مولانا کو لے کر مہدی حسن مرحوم سے ملنے کے لئے علی گڑھ تشریف لے گئے، مصادیق غیبے "آورد ہی آمداں یارے کہ ما می خواستیم" مولانا گئے تو خالی ہاتھ نہیں گئے، سرسید کی مدح میں عربی کا ایک قصیدہ لے کر ساتھ گئے، سرسید نے اس قصیدہ کو دیکھا تو اس کے تیور، زبان، اور طرز ادا کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے، اور قصیدہ کو اپنے اخبار علی گڑھ گزٹ (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء[1]) میں چھپوا دیا،

المجد یعجب علما حیثما یصل	والعلم عن قومنا لا زال یرتحل
بزرگی وہاں جاتی ہو علم کو بھی ساتھ لے جاتی ہو، حالانکہ علم ہماری قوم سے رخصت ہو رہا ہے	
نالوا من الذل ما لا نالہ احد	اذ لا یری فیھم علم ولا عمل
ہماری قوم کو وہ ذلت حاصل ہو جو کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان میں نہ علم نظر آتا ہے نہ عمل	
ولا تزال تری ینشتُّ شملھم	فی کل یوم وقد ضاقت بھم حیل
اُن کا شیرازہ برابر بکھر رہا ہے اور ان کیلئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں	

[1] علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء جلد ۱۶ نمبر ۴۲ ص ۱۱۶۵،

لا یرغبون الی ما کان ینفعهم — فجل صنعتهم للغو والخطل

مفید چیزوں کی طرف ان کا میلان نہیں ہے — ان کا تمام تر کاروبار گمراہی اور پریشان نظری ہے

تراهم الیوم فی کرب وفی قلق — فلا افاد فتیلا ما به اشتغلوا

آج تم ان کو رنج و غم میں مبتلا دیکھ رہے ہو — لیکن شغل نے ان کو ذرہ بھر بھی فائدہ نہیں پہنچایا

لا ینتهون وقد ذاقوا وبالهم — عن سوء صنع فقد باؤا بما عملوا

باوجودیکہ اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ چکے لیکن — ابھی باز نہیں آئے نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے اعمال کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں

وهل یجازیهم الا بما اکتسبوا — من کان من عنده الاحکام تنفصل

خدا جس پر معاملات کا فیصلہ کرنا ہی ہے اس کے سوا — ان کو اور کوئی معاوضہ دے سکتا تھا

فمن سعی الیوم فی اصلاح حالهم — فالله جازیه یوما یقطع الامل

پس جس شخص نے ان کی اصلاح کے لئے کوشش — کی خدا اس کو قیامت میں صلہ دے گا

ان کنت تسئلنی من هذه صفته — فتلک الامام فریدهم والسید البطل

اگر تم مجھ سے پوچھو کہ وہ کون ہے؟ تو میں کہوں گا — امام سردار، بہادر سید،

هو الذی فاق فی الآفاق منزلة — ونال ما لم تنله الاعصر الاول

وہ وہ ہے کہ تمام ملک میں بلند رتبہ ہوا اور وہ — بات حاصل کی جو قدما کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی

من اقبل الدین والدنیا علیه معا — والآن فی نجح ما قد رام مشتغل

جس کو یک ساتھ دین و دنیا دونوں نصیب اور اب تک — اپنے مقاصد کی کامیابی میں مشغول ہے

نال المکارم من آبائه وسعی — فی المکرمات علی آثار ما فعلوا

بہتیرے بار ہا دوسرے فضائل حاصل کئے اور	اس شاہراہ میں ان ہی کے نقش قدم پر چلا
فإنه سيد الأعراب والعجم	قد قال يا أمتي لما دنا الأجل
اس کے کہ وہ عرب و عجم کے سردار تھے اور	ان کی موت کا وقت آیا تو صرف یا امتی کا نعرہ لگایا
وهكذا أضحى هذا السيد العلم	يقول يا لهف قومي ليتني ما عملوا
اسی طرح اس نامور شیخ نے کہا کہ افسوس میری قوم	نے جو کچھ کیا، برا کیا،
يا خير من سيط حب القوم من دمه	أحسن ولا تبتئس من سوء ما عملوا
اے ان لوگوں میں بہتر جن کے خون میں قوم کی محبت	پیوست تھی، ان کی قوم کو جو برائیاں کی ہیں ان پر غم نہ کر
أحسن إليهم ولو جازوك سيئة	ولا تبال بما قالوا وما فعلوا
ان کے ساتھ احسان کر گو وہ تیرے ساتھ برائی	کریں اور جو کچھ وہ کہیں اور جو کچھ کریں اس کی پروا نہ کر

اس قصیدہ میں اگرچہ فن کی بعض کمزوریاں ہیں، لیکن اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے جب یہ فن ہندوستان میں مفقود تھا اور متنبی وغیرہ شعرائے متاخرین کے تتبع کے سوا ہندوستان کے علمائے ادب کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا، ادب عربی کی یہ نئی شاہراہ جو مولانا فیض الحسن صاحب کی رہنمائی سے ان کو نظر آئی خاص توجہ کی مستحق ہے، اس قصیدہ میں صاف نظر آتا ہے کہ شاعر خاص عرب شعراء کے کلام کی نقل کرنا چاہتا ہے، قصیدہ میں سرسید کی صرف دو باتوں کی تعریف ہے، ایک ان کے حسب ونسب وسیادت کی، اور دوسرے ان کے قومی کاموں کی، ان دونوں باتوں کے بیان میں کسی قسم کا مداحانہ غلو اور پیشہ ور شاعروں کی طرح گداگرانہ مذلت وابتذال نہیں، اور یہی چیز شاعر کی بلند خیالی، عزت نفس، اور ذہنی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔

غالباً اس پہلی ملاقات کا ہلکا اثر سرسیّد کے دل و دماغ پر اس لئے بھی رہ گیا ہوگا کہ وہ مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پوری طرح واقف، اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کے فضل و کمال کے خوشہ چیں تھے۔

علی گڑھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء

اس واقعہ کے سال ڈیڑھ سال بعد کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی، اس وقت اس دھندلی سی یاد کو تیز کرنے کا موقع آیا، مولانا فیض الحسن کی تصدیق و توثیق سے درخواست بھیجی اور بستی سے جہاں وہ وکالت کرتے تھے، لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے۔[1] اس زمانہ میں محمد آباد ضلع اعظم گڑھ کے ڈپٹی محمد کریم صاحب وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، مولانا علی گڑھ جا کر ڈپٹی صاحب کے یہاں مقیم ہوئے اور ڈپٹی صاحب کی وساطت سے سرسید کے عزیز دوست اور رفیق کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں[2] سے ملے، انھو

---

[1] مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ نے مولانا کی وفات پر جو مضمون دلگداز میں لکھا تھا اس میں اس موقع پر لکھتے ہیں، علی گڑھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انھوں (مولانا شبلی) نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کر لیا، چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے، میں اس وقت وارد و خدا بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا۔

[2] مولوی سمیع اللہ خاں دلی کے خاندان سے تھے، عربی کے فارغ التحصیل عالم، مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے شاگرد، ان کی قانونی نکتہ سنجی مسلم تھی، اودھ ہائی کورٹ میں وکالت کی، نامور ہوئے، انگریزی داں وکلاء آئے تو رفتہ رفتہ سب جگہیں ان کو دی گئیں، مولوی صاحب کا باوجود دیوانی حاکم ہونے کے رعب اس قدر تھا کہ سارا ضلع مرعوب تھا، ایک بار پنڈت اجودھیا ناتھ کو بحث کرتے وقت سر اجلاس ڈانٹا اور پنڈت نے معافی چاہی، بہت وجیہ اور شاندار دار السلطنت کے اعلیٰ شرفا کا نمونہ تھے، سرسید کے دستِ راست، آخر میں دونوں میں بعض مسائل میں سخت اختلاف ہوگیا، اور وہ

نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، اور سرسید سے ملایا۔[۱]

بہرحال دونوں کی پسند سے مولنا کا تقرر اسسٹنٹ عربک[۲] پروفیسر کے عہدہ پر جنوری ۱۸۸۳ء کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپئے ماہوار پر ہوگیا، اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے کالج کا کام شروع کیا۔ کالج میں ایف اے اور بی اے کے لڑکوں کو فارسی اور انٹرنس اور سکنڈ کے لڑکوں کو عربی پڑھانے لگے۔[۳] کالج کے فارسی کورس میں ان دنوں قرۃ نادرہ اور دیوانِ عرفی شامل تھا یہی دونوں کتابیں پڑھانے کو ملیں۔[۴]

بہرحال اُس وقت چالیس روپیہ ماہوار کی نوکری مولنا کے حساس دل کے لئے ایک چھپا زخم تھا، اسی زمانہ میں ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔ "ایں جاکہ آرمیدہ ام دایں مدت بر خود پسندیدہ ۔۔۔ مذدانم کہ تا چرخ دریں پردہ چہ نیرنگ باخت است۔"[۵] مولنا ایک دفعہ فرماتے تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں، اس ترتیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) علی گڈھ سے علیحدہ ہو کر الٰہ آباد چلے آئے، اور یہاں (الٰہ آباد) یونیورسٹی کے قریب مسلم ہوسٹل کی عمارت بنوائی جو اب تک یادگار ہے، ان کے صاحبزادہ نواب سر بلند جنگ بہادر مرحوم تھے۔ ۔ مولنا حبیب الرحمن خاں شروانی

[۱] مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی نے مولنا کی وفات پر ۳۰ جنوری ۱۹۱۵ء کے علی گڈھ گزٹ میں اس موقع پر لکھا ہے "نوجوانی میں علی گڈھ تشریف لائے۔ خان بہادر محمد کریم اس زمانہ میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے، مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا، کتنے آدمی ان کی جوہر شناسی کے بدولت کیا سے کیا ہوگئے، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ان کو کالج کی پروفیسری کے لئے انتخاب کرکے سرسید احمد خاں کے سامنے پیش کیا۔" [۲] اس وقت کالج میں عربی پروفیسر مولوی محمد اکبر صاحب تھے [۳] مکاتیب فارسی ۵ [۴] مکاتیب فارسی ۵ [۵] مکاتیب فارسی۔

میں مولنا کی کرسی سب سے پیچھے تھی، بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر انکو یہ نظم جب بنیز نہ رہی، بہرحال چونکہ علمی شغل تھا اور علمی صحبت، اس لئے اس اذیت کے لئے انھوں نے اس تلخی کو گوارا کیا، آگے چل کر مولنا کی تنخواہ ستر روپیہ ماہوار ہو گئی، اور عربی کے پروفیسر ہو گئے، اور قرآن پاک اور دینیات کا درس بھی دینے لگے، کالج کے علاوہ شہر کے بعض طلبہ بھی کبھی آکر پڑھتے تھے، علیگڈھ میں مولنا مفتی لطف اللہ صاحب کی درسگاہ عربی طلبہ کا مرجع عام بنی ہوئی تھی، اُن سے جو لوگ پڑھنے آتے تھے اُن میں سے جس کو ادب کا شوق ہوتا وہ مولانا سے پڑھنے آتا تھا، مولانا ماجد علی صاحب جنھوں نے بعد کو بحیثیت مدرس کے شہرت حاصل کی، وہ مولنا کے ادب میں اسی زمانہ کے شاگرد ہوں گے، مکاتیب میں آتا ہی ہے، کہ "مولوی ماجد علی میرے شاگرد ہیں، ادب مجھ سے پڑھتے ہیں" (شروانی، ۹)

قیام | مولانا جنوری میں ڈپٹی محمد کریم صاحب کے یہاں مہمان رہے، یکم فروری ۱۸۸۳ء کو شہر میں پانچ روپیہ ماہوار کا ایک مکان لے کر اس میں اٹھ گئے، مولانا کے بھتیجے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم اور ان کے چچا زاد بھائی محمد عثمان صاحب اور ایک اور عزیز عبد الغفور صاحب تعلیم کی غرض سے اُن کے ساتھ گئے تھے، چنانچہ یہ مختصر قافلہ اسی مکان میں جاکر مقیم ہوا،

لیکن اس مکان سے کالج دور تھا، اس لئے آنے جانے کے لئے سواری کا انتظام کیا، مولنا اس مکان میں کئی مہینے رہے، اس مکان کے قریب خواجہ محمد یوسف صاحب[1] وکیل علی گڈھ

---

[1] خواجہ محمد یوسف نے متوسطات تک عربی تعلیم پائی تھی، مولنا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، نیز مولوی سمیع اللہ خاں کے ہم وطن تھے، ان کا تفوق مسلم تھا، خصوصاً قوت جرح میں، سرسید کے ہوا خواہ و مددگار تھے، مخالفت کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں کا ساتھ دیا، (حبیب الرحمن)

دوالد خواجہ عبدالمجید صاحب بیرسٹر) کا مکان بھی تھا، ۱۰ر اپریل ۱۸۹۰ء کو اپنے عزیز شاگرد محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا جو مکاتیب میں شامل ہے، اس خط سے اس مکان کی وضع رہنے سہنے کا انداز اور اس زمانہ کے احباب اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے،

علی گڑھ کے ابتدائی مشاغل اور احباب

عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کو اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمھیں ہو یا نہ ہو مگر میں تمھاری طرف سے فرض کر کے اپنے طریق معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان و شوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دوگے اور سادے فقروں پر قناعت کروگے، میں جس مکان میں رہتا ہوں شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکھن کی طرف ایک خوشنما محراب دار، چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ بچھا ہے، زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھنچا ہوا ہے، صدر مقام کے داہنی جانب ترکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیمپ جڑا ہوا ہے جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے، اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرہ کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے،

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے، اور وہیں ایک شاہ مشہور جو سارے

شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اُردو ہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں، اور تحسین کرتے ہیں، خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے،

مولوی سمیع اللہ خاں سے بھی ملتا رہتا ہوں، اور بفضلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی، مدرسے کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں،

افسوس کہ میرے قصیدہ کی متعدد کاپیاں نہیں، ایک پرچہ جو میرے پاس تھا وہ اس قدر سارے مدرسہ میں ہفتوں تک دست بدست پھرا کہ گل ول کر پرزے پرزے ہوگیا، اگرچہ بہت لوگوں نے اس کی نقلیں بھی کرلیں، مگر چھپا ہوتا تو خوب ہوتا،

مرثیہ[1] (جو تم بھی دیکھ چکے ہوگے) جن لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے از بس پسند فرمائی ہے میر اکبر حسین[2] صاحب بھی ان میں داخل ہیں،

یہاں ایک شخص عبد الحمید نامی اہلمد محکمۂ کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں، اور کتابوں کے بڑے شائق ہیں، بہت ساحصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں، اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے قرضہ کتابیں بھیجا کرتے ہیں:

---

[1] سالار جنگ اوّل کا مرثیہ مراد ہے، جو دیوان میں شامل نہ ہوا، مگر علی گڈھ گزٹ میں چھپا ہے،
[2] مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی مراد ہیں، وہ اس زمانہ میں علی گڈھ میں منصف تھے،

سرسید سے میل جول | مولانا چونکہ کالج کے احاطہ سے باہر رہتے تھے اس لئے دونوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع کم ملتا تھا، مگر جیسے جیسے ایک دوسرے سے ملتے گئے ایک دوسرے کی قدر پہچانتے گئے، مولانا کو سرسید کے کتب خانہ کی ضرورت تھی، اور سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو علمی مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کو مدد دے سکے۔ سرسید کے بنگلہ کے قریب ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس کا نشان اب بھی باقی ہے، سرسید نے مولانا کو اس میں جگہ دی، اور وہ شہر سے اٹھ کر اس بنگلہ میں چلے آئے، یہاں آجانے کے بعد دونوں کی روزانہ ملاقات ضروری ہوگئی، اگر مولانا کسی دن نہ جاسکتے تو آدمی بھیجکر بلواتے، اور مختلف علمی اور قومی مذاکرے درمیان ہوتے،

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ سید صاحب بوعلی سینا کی اشارات جو فلسفہ کی اہم کتاب ہے دیکھ رہے تھے، کوئی مقام ایسا تھا جس کو وہ حل نہیں کر سکتے تھے، اتنے میں وہ جا پہنچے سید صاحب نے کہا خوب آئے، یہ مقام سمجھ میں نہیں آتا، مولانا فرماتے تھے کہ بلا قصد میری زبان سے نکل گیا کہ آپ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، کہنے کو تو کہدیا مگر سخت شرمندگی ہوئی، سید صاحب چپ رہے، مولانا نے کتاب کا مطلب سمجھایا تو اُن کے چہرہ پر بشاشت آئی،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر جو مولانا کے پرانے دوست تھے، اور اُس زمانہ میں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، مولانا شبلی کے پاس علیگڈہ جاکر کبھی کبھی مہمان ہوتے تھے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:-

"علی گڈہ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے

ے مکان میں جگہ دی، جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا، اور ایک خاموش مقام تھا، ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط بڑھایا، اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی،

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور محققانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے، اور تحقیق و تدقیق کے لئے انھیں اکثر حدیث و فقہ اور تاریخ وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی، اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا قائل ہوتے جاتے تھے، اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش و جستجو اور جلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے، اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا، مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی، اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں، سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم

جو ان دنوں شائع ہوئی تھی، "صبحِ اُمید" ہے، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت، اور سیّد صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے، اور اسی زمانہ میں علی گڈھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔

علی گڈھ میں ابتدائی مشاغل

تعلیم و تدریس کے علاوہ علی گڈھ میں مولانا کے ابتدائی مشاغل شعر و شاعری تک محدود معلوم ہوتے ہیں، ان ہی لوگوں سے اُن کو دلچسپی تھی، جن کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، فارسی نامے اب بھی لکھے جاتے تھے، مگر اب قلم نے اردو خط کا بھی آغاز کر دیا، فارسی میں غزل اور قصیدے اور اردو میں صرف غزل لکھتے تھے، ۲۰ اپریل ۱۸۸۳ء کے مذکورۂ بالا خط سے اُن کا شاعرانہ ذوق بالکل نمایاں ہے، اردو غزلیں بھی لکھ لکھ کر وطن کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیجتے، مکاتیب جلد اوّل میں محمد سمیع صاحب کے خطوط میں کئی اُردو غزلیں نظر آئیں گی، ان غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں، ۱۰ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:- "آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں، مگر تماشہ ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کرتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی، دو تین شعر مزے کے ہیں، تمھیں بھیجتا ہوں۔"

پھر ۲۶ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط میں اپنی دو اردو غزلیں محمد سمیع صاحب کو اور ایک فارسی مولوی حمید الدین صاحب کو بھیجتے ہیں، ۸ فروری ۱۸۸۴ء کو پھر ایک اردو غزل محمد سمیع صاحب کو ان کے خط میں سنائی جا رہی ہے، اسی تاریخ کے خط میں ایک قصیدہ عیدیہ کے لکھے جانے کی بشارت ہے، جو ۱۸۸۴ء میں لکھا جا چکا تھا اور گزٹ میں چھپا تھا، اور دیوان

میں بھی شامل ہے، اسی خط میں اپنے فارسی دیوان کے مرتب کیے جانے کے خیال کا بھی اظہار ہے۔
۲۰ مارچ ۱۸۸۲ء کو یہ خیال اتنا غالب ہوتا ہے کہ اپنے استاد مولانا محمد فاروق صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ اُن کے فارسی کلام کو دیکھ لیں کیونکہ وہ چھاپا جائے گا، اسی تاریخ کے خط میں ایک فارسی واسوخت اور ایک اردو نامہ لکھے جانے کی خبر دی ہے، فرماتے ہیں: "قابل دید ہیں، خود اپنی زبان سے سناؤں گا" (ضمیمہ ۱۰) ۲۲۔ اپریل ۱۸۸۲ء کے خط (ضمیمہ ۱۲) میں فرماتے ہیں: "واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں یعنی ۹۰ شعر، اور اسی قدر نامۂ اردو کے، حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا، میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سرِ دست چھپ جاتا مگر روپیہ نہیں۔"

کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کی شہرت

اب کالج میں مولانا کے شعر و سخن کے چرچوں سے چمکنے لگا، انہی دنوں اپریل ۱۸۸۲ء میں حیران و فراواں کے قافیہ اور "چہ کنم" کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی، لڑکوں میں چرچا ہوا، بعض نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے کیا حاصل؟ آخر اس زمانہ کے دو مشہور فارسی شاعروں خواجہ عزیز الدین[1] صاحب مصنف قیصر نامہ پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ، اور غالب کے شاگرد دبیر دہلوی کو نظم یا ان کر مولانا اور حزیں دونوں کی غزلیں بحذفِ مقطع بھیجی گئیں، دونوں نے تسلیم کیا کہ مولوی شبلی نے جو لکھا وہ اہلِ زبان کا کلام ہے، حضرت تیر نے تو بہت تعریف کی اور لکھا کہ سلف کے کلام کا ہم پلہ ہے۔ (مکاتیب اول ضمیمہ ۱۲)

[1] خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے لکھنؤ میں اس زمانہ میں انکی فارسی دانی کی دھوم تھی، ان کا فارسی کلیات چھپ گیا ہے

مولانا کی یہ غزل دیوان میں نہیں صرف دو شعر ہیں،

خود گرفتم کہ بہ زلفش نفروشم دل و دیں   در بغارت برد آں نرگسِ فتاں چہ کنم

چاکے از دستِ جنوں بہرِ من باشد گو   در مخانش نفرستم بہ گریباں چہ کنم

لیکن مولانا کے ایک پرانے شاگرد کے ذریعہ سے ہم کو یہ پوری غزل مل گئی ہے، مطلع یہ ہے:

گر کمِ عقل بہ گیرم منِ حیراں چہ کنم   می دہ بہ بنیچہ ام بادہ فراواں چہ کنم

یہ پوری غزل دوسرے موقع پر ہدیۂ ناظرین ہو گی،

اسی واقعہ کا یا اسی قسم کے دوسرے واقعہ کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے اُس تبصرہ میں کیا ہے جو انھوں نے مولانا کے مجموعۂ نظم فارسی کے پہلے اڈیشن پر لکھا تھا، اور جو ۲۰ ستمبر ۱۸۹۳ء کے علی گڈھ گزٹ میں چھپا تھا، وہ لکھتے ہیں، "مجھے ایک دفعہ کا ذکر خوب یاد ہے کہ انھوں نے (مولانا شبلی نے) اپنی غزل کے اور شیخ علی حزیں کی غزل کے اشعار ملا کر لکھے اور قدر شناسانِ سخن نواب ذوالقدر خاں بہادر خواجہ غلام غوث صاحب رئیس جنابِ نواب ضیاء الدین خاں فردوس مکاں کے پاس اس درخواست سے بھیجے کہ جو اشعار اس غزل میں آپ کو زیادہ پسند آئیں، ان پر صاد لگا کر میرے پاس عنایت فرمائیے، ان مبصرانِ سخن نے مولوی صاحب کی استدعا کے موافق غزل کے اشعار پر صاد لگا کر بھیجا تو زیادہ تر صاد مولوی صاحب ہی کی غزل پر تھے"۔ اس حوصلہ افزائی کا غالباً یہ اثر ہوا کہ مولانا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) اُن سے آگے چل کر مولانا کے عزیزانہ و بزرگانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، مولانا لکھنؤ جاتے، تو ان سے ملتے، بلکہ ان کے پاس ٹھہرتے، اخیر اخیر زمانہ میں غالباً ۱۹۱۱ء میں ایک دفعہ خاکسار بھی مولانا کی ہمراہی میں خواجہ صاحب کے یہاں گیا تھا، بڑے اہتمام سے انھوں نے کشمیری چائے پلائی تھی، ۸۰ برس کی عمر پا کر ۱۹۱۵ء میں وفات پائی،

نے حزین کی تتبع میں اور بھی غزلیں لکھیں (دیکھیے ۱۲)

مولانا کی ان شاعرانہ جولانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کا کوئی جلسہ ہوتا اُس کے پروگرام میں مولانا کی نظم ایک ضروری چیز ہو گئی جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

نیا رنگ اب مولانا ایسی آب و ہوا میں تھے، جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، نئے زمانہ کے نئے اثرات، قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے، ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علیحدہ کرنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی، بحمد اللہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی۔

جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ اب تک جدید تعلیم کے محاسن و معائب کی خبریں مولانا دور سے سنتے تھے، اور اب اُن کو اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جانے کے چند ہی مہینوں کے بعد اپنے وطن میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت کم ظرف ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں، آہ! بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نو عمر لڑکے بھکو بالک کی نسبت (اس زمانہ میں باپ بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی چیز میں کچھ کر سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"[1] اس بیباکانہ اظہار بیان سے معلوم ہوگا کہ نئی تعلیم کی ظاہری

[1] مکاتیب حالی۔

چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اور حق و باطل کی تمیز کی پوری بصیرت ان میں موجود تھی۔

علی گڑھ کے اثرات : موضوع شعر میں تغیر

بہرحال علیگڈھ تحریک کے بعض مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا۔ ان میں سے سب سے پہلی چیز ملت کی بربادی کا درد اور احساس ہے۔ ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن و عشق کی جھوٹی کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے، اب قوم و ملت کے عشق سے خوں فشاں ہونے لگے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے؟ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع بن گیا۔ اسی سال ۱۸۸۱ء میں جو عید آئی وہ ان کو خون کے آنسو رلا گئی۔ ایک قصیدہ عیدیہ لکھا جس میں عید کی آمد کی خوشی، سامان اور دوگانۂ عید کی کیفیت کے بعد ملت کے درد پر جو آنسو بہائے ہیں ان کے چند قطرے یہ ہیں۔

حیف کیں شور و طرب یک دو نفس بیش نماند … چہ کند عید بہ روے کہ بود جگر گداز

جیشِ اسلام چو با شد ہدفِ تیرِ بلا … خود چو بیچ بافت بہ ایشاں فلک عربدہ ساز

فرقِ نبود بحقیقت ز محرم تا عید … آہ از فتنہ گری ہاے سپہرِ کج باز

خود جہاں جمع کری داشت بجز تیغ و قلم … خود جہاں قوم کہ بود است ہمہ پایہ فراز

اینک آں قوم بحالیست کہ نتواں گفتن … خود ببیں تا بچہ انجام رسید آں آغاز

شرحِ ایں حادثہ از شبلیِ دل خستہ مخواہ … شب بود کوتہ و افسانہ درازست دراز

یہ اثر روز بروز تیز ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۵ء میں مثنوی صبح امید لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پُر درد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ امید کے طلوع کی خوشخبری سنائی۔ مثنوی بار بار چھپی اور مقبولِ عام ہوئی۔

سرسید نے ایک بار نمائش گاہ کے موقع پر علی گڑھ میں ایک قومی مشاعرہ کا جلسہ کیا۔ جس میں قوم کے حالِ زار کو پُر اثر منظر دکھایا۔ اس میں خود سرسید اور دوسرے اکابر نے تقریریں کیں، اور نظمیں پڑھیں۔ مولانا نے اس میں اپنا وہ اردو مسدس پڑھا جو اسی مثنوی کے ساتھ چھپا ہے۔ انھوں نے اس مسدس کو اپنے پُر درد و پُر سوز لہجہ میں جب پڑھا تو سب کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں تفصیل آگے آتی ہے۔[1]

بہرحال اس وقت سے مولانا کی نظموں کا موضوعِ سخن بدل گیا۔ کالج کے یونین میں، ایجوکیشنل کانفرنس میں، اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں وہ نظمیں پڑھیں کہ جب وہ پڑھی جاتی تھیں تو صدر سے لے کر پائیں تک سارا مجمع اثر میں ڈوب جاتا تھا۔ ان کی یہ نظمیں دیوان میں موجود ہیں۔ اور ہر شخص آج بھی ان کو پڑھ کر ان کی تاثیر کا امتحان کر سکتا ہے۔

انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس

علی گڑھ تحریک کا دوسرا اثر اُن پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر شدت سے مسلّم ہو گئی۔ اپنے عزیزوں اور برادری کے لوگوں کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا کام انھوں نے خود شروع کیا۔ اُنکے مکاتیب میں ان کے عزیزوں کے نام کے خطوط انگریزی تعلیم کی طرف انہماک اور اُس کے حصول کی تاکید سے بھرے ہوئے ہیں۔ علی گڑھ کے چار ہی مہینے کے قیام کے بعد انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ اپنے شہر میں وہ انگریزی تعلیم کا ایک اسکول جاری کریں چنانچہ ۲۰ جون ۱۸۸۳ء میں نیشنل اسکول کے نام سے ایک انگریزی مدرسہ شہر اعظم گڈھ میں قائم کیا۔ خود سکریٹری ہوئے اور عزیزوں کو ممبر بنایا۔ اُن کے والد بزرگوار اور دوسرے عزیزوں اور احباب نے اس کی امداد میں شرکت کی۔ اس کی عمارت اور تعمیر کے لئے اپنے خاندان کی ملکیت سے زمین دلوائی، علاوہ اور برادری کے لوگوں سے چندے لئے۔ اور صرف ایک ماسٹر اور تین طالب علموں

[1] مولانا شروانی فرماتے ہیں: "میں بھی اس مجلس میں شریک تھا، نظم کی تاثیر اور خواجہ حالی کی پُر درد آواز ابھی تک دل کے کانوں میں گونج رہی ہے" حیات ۱۲۰

سے کام شروع ہوا، رفتہ رفتہ مدرسہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ١٨٩٢ء میں مڈل اسکول اور ١٨٩٥ء
میں ہائی اسکول ہوگیا، مولانا کے مکاتیب میں اُن کے عزیزوں کے نام کے خطوط میں اس اسکول
کا جس کثرت سے ذکر ہے، اور اس کی طرف اپنے عزیزوں کو جس شدت کے ساتھ متوجہ کیا ہے
اس سے اُن کے انہماک کا پتہ چلتا ہے، جو ان کو قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کیلئے پیدا ہوگیا تھا،
برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لئے "موازنۂ ترقی قومی" کے نام سے ایک مجلس
کی بنیاد ڈالی، جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں
تقسیم ہوتی ہے، مولانا کے مکاتیب میں اس موازنۂ قومی کا ذکر بار بار آیا ہے،

ایک دوسرا اسکول اپنے گاؤں بندول میں قائم کیا، جو غالباً ابتدائی تھا اور آگے نہ بڑھ
سکا، دسمبر ٩٠ء شہر پٹنہ میں سرسید کے رفقاء میں سے قاضی رضا حسین صاحب اور دوسرے اعیانِ
شہر کی کوشش سے اینگلو عربک اسکول قائم ہوا تھا جو اب تک قائم ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں کا خاص
مدرسہ ہونا، اور اس میں آٹھ لڑکوں میں سے پانچ مسلمان لڑکوں کا انٹرنس پاس کرنا ایسا واقعہ تھا
جس پر خوشی کی جاتی تھی، چنانچہ ٥۔ مئی ١٨٩٠ء کو مولانا فخر و مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع اپنے
عزیزوں کو بھیجتے ہیں، "ابکی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس
میں پاس ہوئے جن میں پانچ مسلمان ہیں" (٢٠ دسمبر ٩٠ء) مولانا کو انگریزی کی ضرورت کا احساس تھا
ہوگیا تھا کہ علماء کے لئے بھی اس کا جاننا ضروری سمجھتے تھے، اس احساسِ ضرورت کا ایک دلچسپ
واقعہ انھوں نے ١٩١٢ء میں ایک تقریر میں بیان فرمایا تھا، علماء کے لئے انگریزی دانی کی ضرورت
کے سلسلہ میں فرمایا، "جب میں ٹرکی سے واپس آیا تھا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی، ایک رات کو

۱۲- یہ تار دیا، میں نے اس کو کھولا، دل میں دہ بجا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے، خدا جانے کیسا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سر سید مرحوم کے نواسے کے پاس گیا، انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے اور آپ کو ترکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارکباد دیتے ہیں، یہ حال ہم مولویوں کا ہے۔[۱] اسی لئے وہ ندوہ کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر مصر تھے، چنانچہ دارالعلوم ندوہ کے نصاب میں اس کے داخل کئے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی (شروانی ۱۰۹۲۲) مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر انہی کے اصرار سے ۱۹۰۵ء میں انگریزی ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شریک کی گئی۔ غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے، مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی۔ فرمایا، عجیب بات کہتے ہو، اگر آج ہمارے فقہا انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے۔ اصل یہ ہے کہ مولانا کو یہ احساس تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کر سکتے تھے، اس لئے من نکردم شما حذر بکنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علما ایسے ہوں جو اس خدمت کو بجا لا سکیں۔

تاریخی ذوق اب تک مولانا کا تاریخی ذوق نمایاں نہ تھا، لیکن کالج پہنچنے کے ساتھ یکایک ان کا تاریخی ذوق ابھر آتا ہے۔ مولانا کی طبیعت میں اس ذوق کا بیج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر لائٹنر (G.W.LAITNER) کی کتاب سنین اسلام کے مطالعہ سے پڑا۔ ڈاکٹر لائٹنر مشرقی دنیا کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج لاہور کے بانی اور پرنسپل تھے، انھوں نے عربی کے طالبعلموں کے لئے

---
[۱] روداد ندوہ اجلاس لکھنؤ ۱۸۹۹ء، ص ۱۱۵۶

میں مورخین اسلام کے نام سے اردو میں اسلام اور عرب کی ایک مختصر سیاسی اور علمی تاریخ دو جلدوں میں لکھی تھی، اصل کتاب کی تالیف اور اضافہ میں مولنا فیض الحسن صاحب سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج اور مولوی غلام مصطفیٰ صاحب نے مدد دی تھی، اور اس کی اردو زبان کے درست کرنے کا کام مولنا محمد حسین آزاد نے انجام دیا تھا، غالباً تاریخ کی یہی پہلی کتاب تھی جو عربی خواں طالبعلموں کے ہاتھوں میں آئی، اور غالباً مولانا کو یہ کتاب ان کے لاہور ہی کے زمانۂ قیام میں ہاتھ آئی، میں نے سنا ہے کہ مولنا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات کے واقعات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

مولانا جب علی گڈہ پہنچے تو اس کتاب کی یاد ان کو پھر آئی، اس کا نسخہ مولانا سے ان کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب نے لے لیا تھا، ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ اپنا نسخہ ان سے منگواتے ہیں (ربیع ۱۰۱) اس سے پہلے ۹ جنوری کو مولنا محمد حسین صاحب آزاد کو خط لکھواتے ہیں کہ کتاب کا ایک نسخہ الہ آباد ایک صاحب کے پاس بھیجا جائے۔ (ربیع ۹۰) اس سے ایک سال پہلے ۱۸۸۲ء میں مولانا نے جو فارسی عیدیہ قصیدہ لکھا تھا اس میں تاریخ اسلام کے بعض ممتاز شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں،

اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعہ سے تھے، جب وہ علی گڈہ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا،

تصنیفی ذوق | مولانا میں تصنیفی ذوق تو پہلے سے موجود تھا، اُن کی پہلی عربی تالیف اسکات المعتدی اور فقہ حنفی کے بعض دوسرے متفرق رسالے چھپ چکے تھے، یہاں اگر ان کے تصنیفی ذوق کا محور بدل گیا، مولانا مجھ سے فرماتے بھی تھے، اور مکاتیب میں اڈیٹر زمانہ کے ایک استفسار نامہ کے جواب میں بھی لکھتے ہیں:- "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں، اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئیں، جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا" یہ یکجا کتابیں سرسید کا کتب خانہ تھا، فرماتے تھے کہ سرسید نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے دیکھنے کی عام اجازت دے دی تھی، تو میرا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہتا کبھی تھک کر زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتا، سرسید نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سامنے کرسی رکھوا دی، اس حکایت کی تصدیق مکاتیب سے بھی ہوتی ہے، ۱۰، ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں:- "سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں یورپ میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں" (ج ۲ ص ۳) یورپ والوں کے طرز پر تاریخی واقعات کی ترتیب اور نتائج کے استنباط کا نمونہ مولانا کے سامنے گبن کے رومن امپائر کا اردو ترجمہ ہے، جس کو سرسید نے اپنے لئے کرایا تھا، ایک خط میں ۱۰، ستمبر ۱۸۸۳ء کو لکھتے ہیں "گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپے کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے" (ج ۲ ص ۳) اس کے بعد دوسری کتاب جو ان کے ہاتھ میں آئی وہ مشہور عربی داں انگریز مسٹر پامر کی

لہ تاریخ گبن کے ترجمہ کا یہ مسودہ کالج کی لائبریری میں تھا جو سرسید کے بعد چوری گیا، اور آخر مولوی حالی کو

حیاتِ ہارون الرشید ہی، اس کا ترجمہ مولانا کے زیر نظر تھا جس کی شہادت مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ نے جو ان کے معاصر ہیں دی ہے، مولانا نے المامون میں گبن کا کئی مقامات پر اور پامر صاحب کا ایک دو جگہ ذکر کیا ہے،

تصنیف کی تیاری ان کتابوں کے مطالعہ سے مولانا کو پہلے پہل ایک مکمل اسلامی تاریخ کا خیال آیا اور پھر وہ گھٹ کر تاریخ بنی العباس تک محدود ہو گیا، اور غالباً اس کے لئے ان کے سامنے منتخبین اسلام کا نقشہ تھا، چنانچہ اس دوران میں انھوں نے وطن سے منتخبین اسلام کا نسخہ منگوایا (دیکھیے ۱۱) اور اسی سال ۱۸[illegible]ء میں تاریخ بنی العباس کا کام بڑی محنت سے شروع کیا، (دیکھیے ۱) اور ۹ اپریل ۱۸[illegible]ء کو خلیفہ معتصم کے حالات تک وہ پہنچ چکے تھے، (دیکھیے ۱۰) لیکن یہ کام اتنا لمبا تھا کہ اس کو چھوڑ کر ہر خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، اور اس کو نامور فرمانروایانِ اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا،

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۳۰) اس کا پتہ لگا، مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی نے وہ نسخہ لا کر مولانا حالی کے حوالہ کیا، مولانا حالی ایک خط میں مولانا حبیب الرحمن شروانی کو لکھتے ہیں: "۳۰۰ صفحہ کی ایک ضخیم جلد خوشخط قلم سے لکھی ہوئی جس کے ترجمہ کی اجرت میں سید صاحب نے مولوی ابو محسن صاحب کو جو حیدرآباد میں نوکر ہیں، ایک ہزار روپیہ دیا تھا، [illegible] جا بجا ملی ہیں، گر چوہے نے بعض کو جو حاشیہ پر تھیں کتر کر وہاں اور کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، اور اکثر جگہ پہلے مرکی سرخی سیاہ قلم سے کاٹا ہے، اور پھر کاغذ اس پر چپکا دیا ہے، گر ہر ایک چتی چپلی کھائی ہے، اس کے سوا اس مسودہ کے بہت سے ورق دیمک نے [illegible] موجود ہیں، بہرحال یہ مسودہ میرے قبضہ میں آگیا ہے، کہئے تو محسن الملک کے پاس بھیجوں اور کہئے نواب عزیز خاں صاحب کے پاس روانہ کر دوں، مگر مجھ کو آپ کی نگہداشت پر زیادہ اطمینان ہے، اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی کی خدمت میں بھیجوں۔ (مکتوبات حالی ص ۱۳۰ جلد اول)

مثنوی صبح امید

بہرحال ۱۸۸۳ء تک کا زمانہ انھوں نے کامل مطالعہ اور تصنیف کی تیاری میں گذارا، اس وقت تک اُن کی جو چیز منظرِ عام پر آئی وہ ان کے فارسی قصائد تھے ۱۸۸۳ء میں سب سے پہلے ان کی مثنوی صبح امید چھپ کر شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے ادبار اور تنزل کا افسانہ اور علی گڈھ کی تعلیمی تحریک کا خوش آیند مرقع ہے، جس کو صبح امید سے انھوں نے تعبیر کیا تھا، مولانا نے گو بعد کو اس مثنوی کو اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے یہ اب بھی تعریف کے قابل ہے،

یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی

کالج پہلا مقام تھا جہاں اس وقت مشرق و مغرب کے اساتذہ یکجا تھے اور ایک دوسرے کے خیالات و معلومات سے متاثر ہو رہے تھے؛

مولانا کو کالج آکر سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان کو یورپ کے خیالات اور علمی تحقیقات سے آگاہی کا موقع ملا، اس کے لئے سب سے پہلا مسالہ تو سرسید کے کتب خانہ سے اُن کو ہاتھ آیا، اس کے بعد خوش قسمتی سے اس وقت کالج میں پروفیسر آرنلڈ جیسا ایک انگریز عالم یہاں موجود تھا، پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے تعلقات کی دلچسپ داستان ایک شاہد عینی کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولانا شروانی لکھتے ہیں: "بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست اُستاد کالج میں تھا، یہ دونوں دلدادگانِ علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں، پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا، یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں، قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض ہو سکتے ہیں، علامہ شبلی کی صداقت اور قوتِ دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب

نہیں ہوئے، بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول صحیح تھے انکو اخذ کیا، نہ صرف اخذ کیا بلکہ انکو اپنی زندگی کا رہبر بنایا، باقی چیزوں کو رد کردیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا، اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جو ہیرے آبدار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلود ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی، علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلے کا حل کرنے والا ہے۔" کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولنا شبلی ایسے گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بیگانگی دور ہو گئی تھی، پروفیسر ممدوح روزانہ ان کو فرنچ پڑھانے، ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے، اور وہ خود مولنا سے عربی پڑھتے تھے، اس سلسلہ میں تعلیم کے علاوہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات اور معلومات سے بھی روزانہ واقف ہوتے تھے، مولنا اپنی مجلس میں پروفیسر صاحب کے بہت سے واقعے سنایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کا جو وقت انھوں نے مقرر کیا تھا، اس میں ایک منٹ کا فرق کبھی نہیں پڑتا تھا، ایک دفعہ چند منٹ کی دیر ہو گئی تو اتنی معذرت کی کہ مجھے شرمندگی معلوم ہوئی، اور کہنے لگے کہ یورپ میں وقت کی بڑی قیمت ہے، فرماتے تھے کہ آرنلڈ صاحب نے انگریزی میں لکھی ہوئی کوئی عربی گرامر لے کر چپکے چپکے از خود عربی صرف و نحو کے مسئلے پڑھنے شروع کئے، چند روز کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ دیکھئے میں عربی عبارت پڑھتا ہوں کہیں غلطی تو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد عبارت پڑھی، ایسی صاف اور صحیح پڑھی کہ حیرت ہو گئی، پروفیسر صاحب کا ایک عربی خط مولانا کے پاس تھا، اور مجھے دکھایا تھا، اس کی عربی کی تعریف کرتے تھے، اس کا ایک فقرہ مجھے اب تک یاد ہے، "وحیلتی تعرمت الشلاح

(میری بیوی آپ کو سلام کہتی ہے) یہ فصیح ترین عربی ہے اس کے بجاے یہ مضمون اگر کوئی مولوی لکھتا تو شاید یہ لکھتا وزوجتی تسلم علیک۔

پروفیسر آرنلڈ[1] اور مولنا کے اِن ہی تعلقات کا اثر تھا کہ پروفیسر صاحب سنہ ۱۹۰۴ء میں جب انگلستان جانے لگے تو مولنا بھی اُن کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لئے آمادہ ہوگئے اور آخر ان ہی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تنہا گئے، اور ان ہی کے متعلق آگے

---

[1] پروفیسر آرنلڈ کالج میں دس برس رہ کر فروری ۱۸۹۸ء میں علی گڈھ سے لاہور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر ہوگئے۔ وہیں انھوں نے عربی صنعت میں سوانح سبیل فی معرفۃ المعرب والدخیل لکھی، لاہور کے قیام میں ان کے سب سے لائق شاگرد ڈاکٹر اقبال ہوئے، ڈاکٹر اقبال اور مولنا میں تعلقات کی زنجیر وہی تھی علی گڈھ سے ان کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا جس میں مولنا شبلی مرحوم نے حسب ذیل تقریر کی تھی :- "یہ یورپ کی تلوار نہیں جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بگوش کردیا ہو بلکہ یورپین قوموں کی خوش اخلاقی ہو جس نے تمام دنوں کو تسخیر کیا ہے، اور آرنلڈ اس خوش اخلاقی اور پسندیدہ خصائل کی ایک زندہ تصویر ہے" مولنا نے اس زمانہ کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فرنچ پڑھا کرتے تھے ایک واقعہ بیان فرمایا جو انھوں نے آرنلڈ صاحب کے نیک اخلاق کی شہادت میں پیش کیا یعنی آرنلڈ صاحب ہر روز صبح کے چھ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لایا کرتے تھے ایک دن مجھ پر صرف دو منٹ زیادہ گذر گئے، اور میں دیکھتا کیا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ سرپٹ بھاگے چلے آرہے ہیں، مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہوکر فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! ہم آپ کا مجرم ہو ہم نے آج دیر کی آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں۔ مولوی صاحب نے بڑے افسوس سے فرمایا کہ وہ اس نظم کو تیار نہ کرسکے جو ان کا ارادہ تھا کہ آرنلڈ صاحب کی جدائی پر لکھیں گے، لیکن اس نظم کے بجائے اس وقت صرف دو اشعار پڑھے اور وہ یہ تھے :

> آرنلڈ آنکہ دریں شہر و دیار آمد و رفت
> دلبرے بود کہ ما را بکنار آمد و رفت
>
> آمد آں گونہ بکالج کہ بہ گلزار نسیم
> رفت زانساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

لوگوں کو یہ شعر اس قدر پسند آئے کہ تین تین دفعہ پڑھوا کر سنے" (کالج میگزین فروری ۱۸۹۸ء)

سفر روم کے قصیدہ میں یہ شعر لکھا ہے، ع • آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استاد مرا؛

آرنلڈ اور شبلی کے سلسلۂ کلام کی، دو حکایتیں مولانا کی زبان سے سنی ہوئی مجھے اور یاد ہیں، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ کوئی یورپین فاضل علی گڈھ آکر مجھ سے ملا، اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا، اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی، دو سال کے بعد اُس نے فارسی ادب پر کوئی کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی، جو بہت غنیمت تھی، مولانا فرماتے تھے کہ اس کو دیکھ کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) وہ لاہور سے ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے، مولانا اس زمانہ میں حیدرآباد تھے، ان کو پہنچانے حیدرآباد سے بمبئی گئے، اور کوئی قصیدہ دیا (دیکھو قصیدہ ۲۰) انگلستان پہنچ کر وہ انڈیا آفس میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک وہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کے سرکاری مشیر ہوئے اور ۱۹۲۱ء سے آخر تک وہ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے،

مولانا کی زبان سے پروفیسر آرنلڈ کا نام بیسیوں دفعہ سنا تھا، جب مجھے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ملاقات کا شوق تھا، اتفاق یہ کہ وہ خود ملنے آئے اور مولانا شبلی کی نسبت سے بہت محبت سے ملے، وہ اس زمانہ میں انڈیا آفس کے مشرقی صیغہ میں ملازم تھے، ہندوستان میں سرسید احمد ان کے دوستوں کے جو خیالات خلافت عثمانیہ کے بارہ میں تھے اور مولانا شبلی نے جو مضمون علی گڈھ میگزین میں لکھا تھا وہ ان سب سے واقف تھے، وہ بار بار اگر مجھے مولانا کے اس مضمون کی طرف متوجہ کرتے تھے اور میں جواب دیتا تھا کہ اس کی حیثیت تاریخی ہے مذہبی نہیں، اس زمانہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کے سامنے جب ہمارے وفد نے اس مسئلہ کو پیش کیا تو وزیر اعظم کی امداد و مشورہ کے لئے پروفیسر صاحب بھی وہاں موجود تھے، ان کے ذریعہ سے مجھے انڈیا آفس کے کتب خانہ کے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی،

وہ ۱۹۳۰ء میں مصر کے جامعہ مصریہ میں مسلمانوں کے فنون لطیفہ پر لکچر دینے مصر آئے تھے، یہاں سے واپس جا کر ۹ جون ۱۹۳۰ء کو اچانک انتقال کیا، ان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے معارف اپریل ۱۹۳۰ء، ان کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ پریچنگ آف اسلام کی تصنیف اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب میں شرکت ہے،

مجھے بہت تعجب ہوا، میں نے اپنے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا، انھوں نے پوچھا کہ آپ ان سے
کب ملے تھے؟ فرمایا دو سال ہوئے، جواب دیا مولانا یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے
ایک دفعہ فرماتے تھے کہ میں نے آرنلڈ صاحب سے کہا کہ ہم لوگ اپنے استادوں کی جیسی عزت
کرتے ہیں وہ آپ لوگ نہیں کرتے، آرنلڈ صاحب نے کہا: "بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں علم ہر روز
آگے کو بڑھ رہا ہے، اس لئے ہر شاگرد اپنے استاد سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے، اس لئے وہ اس کی زیادہ عزت
کہاں تک کرے"

یہ دونوں واقعے اس بات کا نمونہ ہیں کہ یورپ کے سیاسی لوگوں کو چھوڑ کر ان دنوں یورپ کے
فضلا بھی اپنی قوم کی دماغی فضیلت اور ذہنی برتری کا سکہ کس طرح ایشیا والوں کے دلوں میں بٹھاتے
تھے، حالانکہ آرنلڈ صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ مجسم علم تھے، اور علم کی خدمت کے سوا ان کا
کوئی اور مطمح نظر نہ تھا، مولانا شبلی مرحوم نے سفرنامہ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے اس کی تصدیق
ہو سکتی ہے:- "لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا جس نے تھوڑی دیر تک مجھ کو سخت پریشان
رکھا، ۰۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی
کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا
اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں
آنے لگے، اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان
کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ
گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر

بربادی ہوتا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹہ کے بعد انجن درست ہوا، اور بدستور چلنے لگا، مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے حرف شناس ہو گئے تھے، اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے، آرنلڈ صاحب سے انھوں نے فرنچ سیکھنی شروع کی، کیونکہ اسلامی مباحث پر اکثر کتابیں فرنچ اور جرمن میں تھیں، اس لئے ان دو میں سے کسی ایک زبان کو جانے بغیر اسلامیات کے متعلق اہلِ یورپ کی تحقیقات اور کاوشوں سے براہ راست واقفیت ممکن نہ تھی، مولانا، آرنلڈ صاحب سے موسیو سیدیو کی کتاب تمدنِ اسلام سبقاً پڑھتے تھے، اور جس نسخہ میں پڑھتے تھے وہ تبرک دار المصنفین کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہے،

مولانا کو یورپین تصانیف اور مطبوعات سے جو واقفیت ہوئی اس کا ایک دوسرا ذریعہ بھی تھا جس کا تعلق علی گڈھ سے نہیں بلکہ حیدرآباد سے ہے، مولوی سید علی بلگرامی جو عربی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور جرمن وغیرہ بہت سی زبانیں جانتے تھے، اور جو یورپ کے فضلاء اور ان کی تصنیفات سے براہ راست تعلقات رکھتے تھے اور اُن کے کتب خانہ میں ان معلومات کا بڑا سرمایہ تھا، ان سے اور مولانا سے ملاقات گو ۱۸۸۹ء میں ہوئی، مگر تعارف کا آغاز المامون کی اشاعت سے ہو گیا تھا یہ تعارف، ملاقات کا اور ملاقات تعلقات کا ذریعہ بن گئی، مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے مولانا کو یورپ کی مطبوعات کے بہت سے نسخے بھی نذر کئے تھے جو مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں تھے اور جن کو بعد کو انھوں نے ندوہ میں وقف کر دیا، اور اس وقت وہ وہاں موجود ہیں، فہرست ابن ندیم کا نسخہ اسی زمانہ میں مولانا کو ان ہی سے ملا تھا، سید علی بلگرامی نے اس کے یونانی ناموں کے

میجر ملفظ انگریزی میں اُس کتاب پر اپنے قلم سے لکھے تھے، مولنا کا مضمون تراجم اسی نسخہ پر مبنی ہو،

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی سید علی صاحب بلگرامی جب حیدرآباد سے الگ ہو کر ہردوئی میں رہنے لگے تھے تو مولانا سے ملنے لکھنؤ آئے، اسی زمانہ میں مولنا دارالعلوم ندوہ کے مہتمم تھے، مدرسہ میں ان کی تقریر کا انتظام ہوا، اُس تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا۔ "اگر آپ کو یورپ کی کوئی زبان علم کی خاطر سیکھنا ہو تو فرنچ یا جرمن پڑھئے، انگریزی تو بنیوں کی زبان ہے۔"

مولنا نے کتب خانۂ اسکندریہ کی تحقیق پر جو رسالہ لکھا تھا اس میں بعض یورپین مستشرقوں کے مضامین کا ترجمہ مولوی سید علی بلگرامی ہی نے کر کے دیا تھا، جو رسالۂ مذکور کے ساتھ انہی کے نام سے چھپا ہے،

علی گڈھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام اور تاریخ اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں، مولنا ان کے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابلِ اعتراض باتوں کا جواب دیتے تھے،

چنانچہ مسٹر پامر نے اپنی انگریزی کتاب ہارون الرشید کی لائف میں مسلمان بادشاہوں پر مذہبی تعصب کا جو الزام قائم کیا تھا، مولانا نے المامون میں ضمناً اس کا پورا جواب دیا ہے، اسی طرح پروفیسر شیلڈون ایموس Sheldon Amos نے جو اس زمانہ میں لندن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر تھے اپنی کتاب "رومن سول لا" میں فقہ اسلامی کا رومن لا سے ماخوذ ہونا ثابت کیا تھا، مولنا نے سیرۃ النعمان کے ایک حاشیہ میں اُس کا مدلل جواب لکھا ہے، ان کتابوں کا یا ان کے مفید مطلب ابواب کا ترجمہ ان کے شاگرد ان کے لئے کر دیا کرتے تھے،

مصری مطبوعات کا سرمایہ | اسی سلسلہ میں کا لج پہنچکر مصر کی نئی عربی مطبوعات اور تصنیفات سے بھی مولانا کو آگاہی ہوئی مصر کی حالت اس لحاظ سے ہندوستان سے بہتر تھی کہ وہ ہندوستان کی طرح انگریزوں کا پورا غلام نہ تھا اور نہ وہاں کے علمی حلقہ پر انگریزی کا تسلط تھا، یورپ کی قوموں اور زبانوں میں سے مصر کو سب سے پہلے فرانیسی سے سابقہ پڑا، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں جب مصر پر قبضہ کیا تو وہ قبضہ گو بہت جلد اٹھ گیا مگر اس کا علمی و ادبی تسلط اس سرزمین سے نہیں اٹھا اس نے مصر کو یورپ کی زبانوں میں سے "بنیوں کی انگریزی زبان" سے واسطہ نہیں پڑا بلکہ یورپ کی ایک ایسی زبان سے واسطہ پڑا جو سرتاپا علمی تھی، اور جس میں اسلامی معلومات و تحقیقات کا بڑا سرمایہ تھا، بہرحال مولانا مرحوم کے پاس مصر و شام کے مصنفوں اور ادیبوں کی کتابیں براہِ راست آتی تھیں، اور وہ خود بھی وہاں سے ہر نئی کتاب جو طبع سے چھپ کر نکلتی تھی منگوا لیا کرتے تھے، جدید فلسفہ جدید ہیئت، جدید طبیعیات اور عربی صرف و نحو و بلاغت پر نئی نئی طرز کی جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ ان کے پاس پہنچتی تھیں، اور مولانا ان کے ذریعہ سے یورپ کی جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرتے تھے، اسی طرح قدما، کی تصانیف جو متاخرین کی کتابوں کا ماخذ ہیں اور جو متاخرین کی کج بیچ اور پیچیدہ منطقیانہ طرزِ تعبیر کے بجائے زیادہ واضح اور صاف ہیں، مولانا ان کے پورے قدر دان تھے، وہ جہاں سے مل سکتیں اُن کو منگواتے تھے اور پڑھتے تھے، قلمی ہوتیں تو اُن کی نقلیں لیتے،

عربی اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا اور سمجھنا اس زمانہ میں ہر مولوی کا کام نہ تھا، تمام ہندوستان میں شاید مولانا پہلے شخص تھے جنھوں نے اُن کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا، بلکہ اعلا

وغیرہ مصر کے عربی رسالوں میں ان کے مضمون بھی چھپتے تھے، ایک خط میں وہ اپنے عربی اخبارات اور اپنے یہاں آنے والے رسالوں کے یہ نام لکھ کر بھیجتے ہیں:۔ ثمرات الفنون قسطنطنیہ، اسلام طرابلس، المؤید، المنار، الہلال، المقتطف، (ریاض حسن خاں۔۱)

آگے بڑھ کر جب مولنا کے فضل و کمال کا شہرہ یورپ کے علما تک پہنچا تو انھوں نے بھی مولنا سے تعلقات پیدا کئے، اور وہ یورپ کی مطبوعات اُن کو کبھی کبھی ہدیہ بھیجتے تھے چنانچہ

	ڈوزی کا مشہور عربی لغت انگلستان سے مسٹر تھارنٹن (Thornton) نے ۱۶۔ اپریل ۱۸۹۰ء میں ہدیہ بھیجا تھا، اس کتاب کے پہلے صفحہ پر مولنا کی یہ یادگار تحریر ہے۔

اهدی الیّ هذا الکتاب مسٹر تھارنٹن (Thornton) احد کبار الانکلیز فی عاصمتهم

شبلی النعمانی ۱۶ اپریل ۱۸۹۰ء، ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۰۷ھ

مولنا کی یہ بھی عادت تھی کہ جب انگریزی کی نئی کتابوں کے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے اُن کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمائش کرتے کہ فلاں مقام یا بحث کا خلاصہ لکھ کر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئے معلومات اگر تمھاری نظر سے گذرے ہوں تو مطلع کرو، چنانچہ مکاتیب میں اُن کے خاص خاص دوستوں اور شاگردوں کے نام جو خطوط ہیں ان میں یہ باتیں اکثر نظر آئیں گی،

کالج پر مولنا کے اثرات

محمڈن کالج علی گڈھ، اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی جو نئے

تمدن وتہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا، اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح
سب میں سماگیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجاے خود ایک کمال ہے، اور کالج نے
قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپقلش اور کش کش نہ ہونے پائی
جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا،

اس بزم میں گو دوسرے علما بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے وہیں رہے، لیکن مولنا شبلی کا
حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے، اور ہر علمی بحث میں اُن کا قول فیصل تھا، وہ اپنے فضل و
کمال کی بنا پر بجاے اس کے کہ نئے علوم وفنون کے اہلِ کمال سے مرعوب اور اپنے علوم
اُن کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علماے اسلام کی قدر ومنزلت کو
بڑھا دیا، اور اپنے قدیم علوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز
پروفیسروں کو اُن کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا، اور ایسے زمانہ میں جبکہ کالج میں ہر طرف سے
نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی ایک مولنا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل
بارش کے طوفان میں اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا
کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا،

کالج کوئی پرانے طرز کا عربی کا مدرسہ نہ تھا، جہاں عربی شرح وحواشی کا درس دیا جاتا ہو،
سرتاپا جدید علوم وفنون کے جوہر یا مناظر کا تماشا گاہ تھا، اس فضا میں طلبہ کے اندر اپنے پرانے
علوم فارسی ادب، اور عربی زبان کا ذوق پیدا کر دینا کتنا مشکل کام تھا، مگر مولنا نے کالج میں
اس مشکل کام کو ایسا انجام دیا کہ کئی ہونہار طلبہ نے ان علوم میں ناموری حاصل کی، مولوی حمید الدین

صاحب، مولوی بہادر علی صاحب، مولوی داؤد بھائی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں،

مولنا نے آگے چل کر کالج کے طلبہ کو قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اس درس کو ایسا دلچسپ بنادیا کہ طلبہ بڑی توجہ سے اس کو پڑھنے لگے، اور ان میں قرآن پاک کا ذوق پیدا ہونے لگا، محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ "میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانہ کی یادگار ہے" سید سجاد حیدر صاحب کہتے تھے کہ مولنا قرآن کے درس کے وقت قرآن پاک کے اصول بلاغت، اور صنائع و بدائع کو بتاتے تھے، اور ان صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرنے لگتے تھے،

طلبہ میں ذات پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت، اور واقفیت پیدا کرنے کے لئے عربی میں سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام لکھا، اور وہ کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا، اور شاید اب تک ہے، اسی سلسلہ میں مولنا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں کی بنیاد ڈالی، شروع شروع میں یہ جلسے خود اپنے بنگلہ پر کرتے تھے، اور تھوڑے سے آدمی مدعو ہوتے تھے، نشست کرسی، اور منبر پر ہوتی اور مولنا خود سیرت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی پہلو پر تقریر فرماتے تھے، رفتہ رفتہ ان جلسوں کی دلچسپی بڑھنے لگی تو ۳۰ اکتوبر ۱۸۹۱ء[1] کو سیرت و میلاد کا پہلا عام جلسہ نہایت شان و شوکت سے سالار منزل میں ہوا، اور کچھ عرصہ بعد اسٹریچی ہال میں ہونے لگا، انگریزی کے طالب علموں میں جہاں کی فضا ہی کچھ اور ہوتی ہے مذہبی رنگ پیدا کرنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مولنا نے کالج میں اس کام کو جس طرح انجام دیا اسکا بیان خود انہی کی زبان سے سنئے۔

[1] کالج فنڈس گزٹ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۲۹ء از مضمون خان صاحب میر ولایت حسین صاحب،

”اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ گرمی کا، اور واقعی آپ سنئے اور میں دل سے مچلتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے سب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رُخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ مجمع الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی۔ اے سکریٹری ہے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لڑکوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے:
اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ بعض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔ مغرب کی نماز سبحان اللہ کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل بچھا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ مہتمم خاص ہیں۔ اور تین ہزار چندہ خود دیں گے۔ میں نے بھی ۵۰ روپے دیے ہیں۔ سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاؤڑا لیں گے، اور مسجد کی نیو کھودیں گے۔ لاگت کا تخمینہ ستر ہزار روپیہ ہے۔
مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔ اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔ اس جوش مسرت میں اور بھی لکھتا، مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحٰق و عثمان یاد آ گئے۔ اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔

ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے۔ حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا

سے خالی نہیں، خیر خدا توفیق دے۔" (مکاتیب محمد علی ۔ ۱)

مولانا نے کالج میں بیٹھ کر تالیف و تصنیف کا جو کام انجام دیا اس نے کالج کے ماحول کو شاداب علمی رنگ میں رنگ دیا، اس زمانہ میں مولانا حالی بھی اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے اور بھی دوسرے اہل علم کی آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس کا مجموعی اثر اور بھی زیادہ تھا، طلبہ میں بھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا، اور ان کی زندگیوں میں علمی رنگ نمایاں ہوا، مولوی عزیز مرزا مرحوم، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، اور مولوی عبد الحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو (بشرطیکہ وہ مانیں) اسی آب و ہوا کی پیداوار ہیں، جن طالب علموں میں تحریر و انشا کا ذوق تھا، وہ ذوق بھی مولانا کی تحریک سے ابھر کر نمایاں ہوا، اس سلسلہ میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم مولوی سید محفوظ علی صاحب بدایونی اور شیخ محمد عنایت اللہ صاحب وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، جن طالب علموں کو شعر و سخن کا چسکا تھا وہ مولانا کی سخن سنجیوں سے متاثر ہوئے، مولوی ظفر علی خاں، مولوی ہدایت اللہ صاحب (سی پی) اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر کی سخنوری اگر تنہا مولانا کی نہیں تو مولانا شبلی اور مولانا حالی دونوں کی دوگونہ تاثیروں کی رہین منت ہے، ان صاحبوں میں سے جنھوں نے مولانا کے اس فیض اثر کو تسلیم کیا ہے ایک قابل ذکر ہستی مولوی مسعود علی صاحب بی اے، متخلص بہ محوی کی ہے، جو حیدر آباد دکن میں پہلے جج تھے، اور اب دار الترجمہ میں ہیں، اور فارسی کے خوش مذاق شاعر ہیں، ان کا مجموعۂ نظم فارسی نذر عقیدت کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکا ہے، اس کے مقدمہ میں مولانا مرحوم کے فیض صحبت، اور فیض تعلیم کا اعتراف فرمایا ہے، لکھتے ہیں:۔ "علی گڑھ کالج کے بانے

کورس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، مولانا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے، اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعرگوئی کی علت سے پاک وصاف ہوگئے، اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی، اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہو سکا (دیباچہ د) مولانا شروانی فرماتے ہیں "مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے، تاریخ وادب فارسی کا ذوق انہیں سے نشوونما پذیر ہوا تھا" اور جو طلبہ شاعر نہ بن سکے وہ مولانا کے ترنم کی نقل اتار کر ایسی نظم خوانی کرنے لگے کہ جس مجلس میں پڑھتے اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتے، مولانا شرر لکھتے ہیں ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے، اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے پسند کیا، اور طلبہ نے اُسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دُھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا" مولانا کی یہ شاعری کی قوت بھی کالج کی ناموری میں بہت کام آئی ہے، جتنے اکابر اور امرا یہاں اس زمانہ میں آئے اُن کو درد وقت سے آشنا اور کالج کی ہمدردی اور اعانت کی طرف ملتفت کرنے میں مولانا کی شاعری نہیں ساحری بڑا کام دیتی تھی، چنانچہ وہ اسکو کبھی قرطبہ کبھی بغداد اور کبھی صفاہاں بتاتے تھے، اور مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی امیدگاہ ٹھہراتے تھے،

بر سر مدرسۂ او ہر کہ بود طالب فن ‖ آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گذرد

گر بدیں گونہ بود گرمیِ ہنگامۂ او	خورد غوطہ ز بغداد و صفاہاں گنبد
ہر دم ایں مدرسہ لاریب بزرگی گردد	اندکے باش کہ ایں قطرہ گہر می گردد
تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود	بوئے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود
تا ابد طالب فن رشد بدو خواہد کرد	تا ابد قبلۂ دانش طلباں خواہد بود

ذاتی طور پر مولانا نے ہمیشہ امراء کی مدح سرائی کو عار سمجھا، لیکن قومی ضرورت کی بنا پر وہ اس ننگ کو گوارا کر کے فرمائشوں کی تعمیل کرتے تھے، مگر یہ بات اُن کو دل سے پسند نہ تھی، اس لئے یہ فرمائشی نظمیں اُن کے فارسی کلیات میں جگہ نہ پا سکیں،

ابھی مولانا کالج میں گئے ہی تھے کہ چند روز کے بعد فروری ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور مدبر مدار المہام سر سالار جنگ اوّل نے انتقال کیا، سالار جنگ محسنین کالج کے قافلہ سالار تھے اس لئے ان کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور کالج اُن کے ماتم میں ایک روز بند ہو گیا، بلکہ تعزیت فارسی کی، اور اظہارِ غم کیلئے ایک خاص جلسہ ہوا، مولانا نے اس سانحہ پر فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جسکو انہوں نے جلسہ میں پڑھ کر سنایا،

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانے است نوحہ گر	آہ ایں چہ ماتم است کہ خوں شد دلِ جگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر	ہم شرع را فسانہ کنوں ہست یا دگر

سالار جنگ مرد جہاں گشت دیدہ تر

شادی ز دل رمیدہ و دل زاں رمیدہ تر[1]

[1] اس بند کے بعد مرثیہ کے دوسرے اشعار حسب ذیل ہیں،

ہم ملک را پناہ و ہم اسلام را مدار	کز وے بود نظام ریاست شد استوار

([illegible])

یہ مرثیہ شاید اس لئے بھی کلیات میں جگہ نہ پاسکا کہ مولانا کے خصوصی مذاق سے اسکا رنگ ہلکا اور پھیکا ہو لیکن بہرحال اسکو مولانا سے نسبت ہے اور اسکا علیگڑھ سوسائٹی پر اثر ہوا تھا اسلئے یادگار کے طور پر یہاں یہ مرثیہ نقل کر دیا جاتا ہے، یہ بہت ابتدائی کلام ہے اس لئے صرف زبان اور شاعری کی حیثیت سے

آئین و رسم و داد ز دہر بر قرار — بیداد بیں کہ گردش چرخ ستم شعار
آں را کنوں بخاک برابر گرفتہ است — ہر کس چو شمع ز آتش غم در گرفتہ است
آں کز فلک بہ درجہ او سر نہادہ است — افسر بہ فرق خود ز سر خود نہادہ است
چرخش کنوں بخاک برابر نہادہ است — طرح جفائے تازہ ستمگر نہادہ است
تا ایں خبر بگوش و بر زن فتادہ است — کہ بر جہاں ز بار دو گردوں فتادہ است
ایں مرد ے کہ عرش نبود عرش کے بہ مہر — آئینہ دار طلعت او بود ماہ و مہر
ہم دانشش نصیب و ہم از داورش بہر — شاہے چنیں نگر کہ بیک جنبش سپہر
در تنگنائے تیرہ مغاک آرمیدہ است — خورشید زیر پردۂ خاک آرمیدہ است
امروز فرد در ہمہ کشور جز او کہ بود — بخت و پناہ شرع پیمبر جز او کہ بود
زیب و طراز مسند و افسر جز او کہ بود — با آسماں بجاہ برابر جز او کہ بود
اکنوں اگر کنارہ ازیں خاکداں گرفت — آوازہ اش محیط زمین و زماں گرفت
آں کس کہ بود دولت دیں در پناہ او — آں کس کہ آسماں نرسیدے بجاہ او
اکنوں کہ گشت خلد بریں جلوہ گاہ او — رحم است بر ریاست و روز سیاہ او
مرگے کہ کرد فانی و جاں باز داشتست — دردے بود کہ ہیچ مداوا نہ داشتست
آں داد جاں کہ بود و دانش یگانہ بود — پاکیزہ و شرع کہ بہ عالم فسانہ بود
فرزانۂ ہنرورے کہ مثل در زمانہ بود — تا بنگریم تیر اجل را نشانہ بود
خار است اینکہ بر ہمہ را در جگر شکست — بار غم است اینکہ فلک را کمر شکست
از زلزلش اگرچہ جہانے بجاں بود — ما ہر دو نجم خواستۂ آسماں بود
باشد جہاں چہ سود بود وچہ زیاں بود — اکنوں دعائے شبلی دل خستہ آں بود
کو را بود بہ رحمت پروردگار جائے — خود زیر سایۂ حرم کردگار جائے

اس کو پڑھا جائے،

مارچ ۱۸۸۸ء میں مدار المہام وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کالج میں آئے تو مولانا نے کھانے کے بعد سید محمود کی فرمائش سے فارسی کے چند بند پڑھے جن میں پہلا بند یہ تھا

اے دل ایں مایۂ انتظار کہ بود   آخر ایں مستی از خمار کہ بود

چشم شوقت براہ گذار کہ بود   ہوس سرمۂ غبار کہ بود

ایں بہیں خانہ جلوہ گاہِ کہ ہست

پردۂ دیدہ فرش راہِ کہ ہست

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اس بند کے پڑھتے وقت عجب سماں بندھ گیا تھا جتنے مجلس حقیقت میں بیتاب ہوگئے، سید محمود انتہا کر ہر بند کو کئی کئی بار پڑھواتے تھے، وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا کہ افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی پوری داد دیتا"

۱۸۹۰ء میں نواب اقبال الدولہ وقار الامراء بہادر مدار المہام حیدرآباد دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے موقع پر سرسید کی تحریک پر ایک قصیدہ[1] لکھا اور پڑھا جس میں مسلمانوں کے ادبار، علی گڑھ تحریک اور کالج کی خصوصیات اور امیدوں کا دلچسپ اور مؤثر بیان تھا۔

---

[1] قصیدۂ خیر مقدم نواب وقار الامراء بہادر:

درجہاں چوں سخن از شوکت و از شاں گذرد   نام دستور دکن بر سرِ عنواں گذرد

صدرِ جم مرتبہ نواب وقار الامراء   آنکہ گردوں بہ رخش بندۂ فرماں گذرد

اے خوشا بخت کہ آں داور جمشید حشم   بسرِ مدرسہ با ایں سرو ساماں گذرد

ایں دبستاں بہ مثل تازہ گلستانے ہست   خواجہ ابریست کہ بر طرف گلستاں گذرد

یہ قصیدہ بھی کلیات میں شامل نہیں، مگر مطالعہ کے قابل ہے، کالج کی تعریف میں، اوپر جو شعر نقل کئے گئے وہ اسی قصیدہ کے ہیں، یہ پورا قصیدہ آپ کو حاشیہ میں ملیگا،

گنبد افتادہ بہ کوکبۂ جاہش در ا — تشنہ جگر گر برود چشمۂ حیواں گردد

ابر دیدی کہ گہر ریزد و در بر سر خاک — موکب خواجہ بہ تبریز بدخشاں گردد

بہ مثل واقعۂ مور و سلیماں باشد — گر حدیث از شرف و پایۂ ایماں گردد

داد و راد مدح تو اندازۂ ما نیست ولے — خوش بود گر سخن از عالم احساں گردد

یادگار کرم دولت آصف جاہی است — بہ نظر ہرچہ دریں منزل ویراں گردد

میوزیم کو شرف نسبت نامش دارد — جائے آن است کہ از عالم کیواں گردد

خاص و عام ہمہ از فیض کفش سیراب اند — ابر ہم بر چمن و ہم بہ بیاباں گردد

صاحبا گوش بہ من دار کہ تا شرح دہم — آنچہ بر ما ز سیہ کاری دوراں گردد

بود روزے کہ گراں پایگی رتبۂ ما — بیش از آں بود کہ در وہم سخنداں گردد

حالیا کار بآں بے سروپائی بکشید — کہ بہ ہر کو در سد بر زدہ داماں گردد

بگذرد از غم و آزار پیاپے بر ما — آنچہ بر شیشۂ زافتادن سنداں گردد

ہرچہ از بےکسی و ذلت و خواری بینی — خود عیاں است و مپرس آنکہ پنہاں گردد

گرد ایں کتب و ایں مدرسہ برپا گشت — بیم آں بود کہ ایں درد ز درماں گردد

ایں مسیحانہ اگر ہمہ مداوی خواست — بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گردد

بر سند بہ در او ہر کہ بود طالب فن — آنکہ گوہر طلبد جانب عماں گردد

گرچہ ایں گوشہ بود گرمی ہنگامۂ او — خود ز غرناطہ و بغداد و صفاہاں گردد

بردم ایں مدرسہ ریب دگری گردد — وہ کہ باشی کہ ایں قطرہ گہری گردد

تا خود از دانش و فن نام و نشاں خواہد بود — جوے ایں فیض بدیں گونہ رواں خواہد بود

تا بہ طالب فن روے بدو خواہد کرد — تا بہ قبلۂ دانش طلبا خواہد بود

گر بہ جنگ و بود مائدۂ فیض دراز — یک جہاں زلہ ربائے سرخواں خواہد بود

اسی طرح جب ۱۳۰۵ھ میں نواب آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدرآباد دکن علی گڈھ آئے تو مولانا نے سرسید کی فرمایش سے رودکی کے مشہور قصیدہ پر ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا، خود مولانا نے شعرالعجم جلد اول میں رودکی کے بیان میں ایک حاشیہ دے کر لکھا ہے:۔ "جس زمانہ میں مَیں علی گڈھ میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڈھ میں آئے، سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے، اور وہ تم لکھو، میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:۔

ہمچناں باشیم گرم گفتگو — قاصد از در ناگہاں آید ہمی

ناگہاں شور مبارکباد و بس — ایں ہمہ شورش بزباں آید ہمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶)

دولت افزا دشادی بزباں خواہد راند — خصم را دیدہ ز حسرت نگراں خواہد بود

ہست چوں در کنف قیصر و دارائے دکن — ایمن از فتنۂ و آسیب زماں خواہد بود

ملک تحت وثب تیز حوادث بودہ است — آستانش حرم امن و اماں خواہد بود

آنکہ پاست در اندیشہ و از فضل خدائے — آنچہ اندیشہ نمودیم ھماں خواہد بود

گر بہ آئینی سلطنت بہرہ بیابیم ز علم — رخش اقبال دگر در تہ راں خواہد بود

باز در راہ طلب گرم بخیزیم ز جائے — خواب دوشینۂ ما چند گراں خواہد بود

مے تواں فلغلۂ اوج و ترقی انگیخت — تا کجے برلب ما آہ و فغاں خواہد بود

بود آں ہم کہ بہ نیرنگے یار شود — چرخ تا چند بکام دگراں خواہد بود

ہاں بہ بینی کہ نژاد عرب و آل ترے — ایں چنیں خستۂ و رسوائے جہاں خواہد بود

آں چمن زار کہ پروردۂ ابر کرم ست — ہاں میندیش کہ تاراج خزاں خواہد بود

بس بود رنگ نہ داریم بسر تاج و کلاہ — بخت زیں پیش چو در فکر زیاں خواہد بود

باہمہ خستگی آں فطرت بابائی ہست — خاک گشتیم و ہنوز آں شر سودا باقی ست

آسماں جاہ ورسوے فلک دکن جانب ہندوستان آید ہمی

مولنا کا ذخیرۂ ادب جب تک زندہ ہے، کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندۂ روزگار ہیں، اور رہیں گے۔

علاوہ ازیں مولنا کے پے بہ پے محققانہ مضامین، تعلیمی کانفرنس کے خطبے، اور عالمانہ تصانیف نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کالج کا نام روشن کرنے میں بڑی مدد دی، اس زمانہ میں کالج ہر قسم کی علمی وادبی تحریکات کا مرکز تھا، یہیں سے نئی کتابیں نکلتی تھیں، نئی تصنیفات شائع ہوتی تھیں، اور نئے نئے محققانہ مضامین کی اشاعت ہوتی تھی، ہندوستان سے نکل کر روم، شام، مصر مولنا جہاں گئے علی گڈھ کالج کی شہرت کے دائرہ کو بڑھاتے چلے گئے، اُس زمانہ میں ریاست بھوپال وغیرہ میں کالج کا نام اور اس کے ساتھ حسن ظن اور ریاست کی امداد کا خیال مولنا کی ان ہی تصنیفات کا نتیجہ ہے، اسی طرح حیدرآباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو کالج کی طرف جس معجزانہ کارنامہ نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ بھی مولنا کی یہی تصنیفات تھیں، اس کا ذکر سرسید کے ان خطوط میں ہے جو انھوں نے نواب عماد الملک کو لکھے ہیں۔

مولانا نے اپنی ان تصانیف کے ذریعہ جو کالج کے زمانہ میں لکھیں کالج کی صرف معنوی ترقی ہی میں مدد نہیں کی، بلکہ جہاں تک ہوسکا انھوں نے اس زمانہ کی اپنی تمام تصنیفات کالج کے نذر کرکے اس کی مالی امداد میں بھی حصہ لیا، چنانچہ ان کی یہ فیاضی یاد رکھی جائے گی کہ کالج کے زمانۂ قیام تک انھوں نے اپنی تصانیف سے ایک حبہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ اُن کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ تین تین مہینوں میں ان کا پہلا وظیفہ ختم ہوجاتا تھا، ایک بار مولنا کے ایک

دوست نے ایک کلب قائم کیا اور اس کے لئے ان سے اُن کی تصنیفات ہدیۃً مانگیں تو ان کو افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑا "میں اپنی تصنیف نذر نہیں کرسکتا، میری تصنیفات جو اس وقت معرضِ بیع میں ہیں، المامون و الجزیہ ہیں، یہ دونوں کتابیں سید صاحب نے کالج کے لئے چھاپی ہیں، مجھ کو حقِ تصنیف میں صرف ایک نسخہ عنایت ہوا تھا وہ دے نہیں سکتا، اس وقت تک میں نے اپنی کسی تصنیف کو خود چھاپ کر اس سے فائدہ اٹھایا"؛ اس کی تصدیق خود سرسید کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے ۲۰۔ مارچ ۱۸۸۹ء کو نواب عماد الملک بلگرامی کے نام لکھا ہے، لکھتے ہیں :- "پچاس نسخے المامون کے میں نے خدمتِ عالی میں روانہ کئے ہیں، "گذشتہ تعلیم مسلمانان" کے نسخے صرف معدودے چند رہ گئے ہیں، اس لئے وہ نہیں بھیج سکا، آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا غالباً آپ کو خیال ہوگا کہ ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حقِ تصنیف وغیرہ کالج کے نذر کردی ہیں، اُن کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا، اور آیندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدہ کے لئے لکھتے ہیں، اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں، ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے المامون کے بلاقیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے، میں نے ہرچند اصرار کیا کہ جس قدر تمھارا دل چاہے لو، ہرگز نہ مانا، مجھ سے خرید کیں، اور اپنے دوستوں کو بھیجے ہیں" (خطوط سرسید ۱۲۳)

کالج میں عربی زبان کی ترقی، اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لئے انھوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی، اس لجنۃ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے، اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، دوسری انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم تھی جس میں اُردو کے عام مضامین پڑھے جاتے

اور تقریریں کی جاتی تھیں، اُن میں بھی مولانا کا حصہ تھا، ان ہی دونوں انجمنوں نے مل کر شمس العلما[ئی] کے خطاب پر مولانا کو تہنیت دینے کے لئے ۱۹۔ جنوری سنہ ۱۸۹۴ء کو جلسہ کیا تھا جس میں تمام اکابر...

یہاں طلبہ کی سب سے بڑی مجلس کا نام یونین تھا، اور جواب بھی ہے، مولانا اس میں بھی حصہ لیتے، اور طلبہ میں حسنِ تقریر کا سلیقہ پیدا کرتے تھے، یہ وہی یونین ہے جس نے سفرِ روم و مصر و شام سے واپسی پر مولانا کے لئے ۱۰۔ دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء میں بزمِ دعوت ترتیب دی تھی، اور جس میں مولانا نے یہ قصیدہ پڑھا تھا،

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد
کہ سفر یادِ سفر کردۂ ما باز آمد

از سفر شبلیِ آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبلِ شیراز بہ شیراز آمد

کالج امروز بآں فرّ و شانست کہ بود
بزم دا گری ہنگامہ ہمانست کہ بود

یونین آنکہ باشیوۂ گفتار آموخت
ہم بدانسان ہنر آموز بیانست کہ بود

ایک دفعہ ۱۹۔ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گذشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے بہتر تھا؟ مولانا نے اپنی ایک مدلل تقریر میں یہ ثابت کیا کہ بے شبہہ مسلمانوں کا گذشتہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے بہتر تھا، یہ تقریر ایسی مؤثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا، یہاں تک کہ مسٹر سید محمود نے بھی اُن سے موافقت کی، (دیکھو ۳۴)

مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرزِ حکومت بہتر ہے یا شخصی؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرزِ حکومت کی تائید کی، اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور مؤثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے اُن کی موافقت میں رائے دی،

یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا چنانچہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی، بلکہ ایک مضمون بھی لکھا اور تب جاکر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سر سید نے اپنا یہ مضمون "ایشیائی اور اسلامی طرزِ حکومت" کے عنوان سے ۲۰ جون ۱۸۸۸ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا

۱۸۹۲ء میں جب مولانا نے کتب خانہ اسکندریہ کا مضمون لکھا ہے اور اس سے چار برس پہلے ۱۸۸۸ء میں الجزیہ پر جو مضمون لکھا تھا جس نے تحقیق کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی، تو سر سید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تفہیم کے لئے ایک مجلس بنائی جائے چنانچہ ۱۸۹۱ء کے انسٹی ٹیوٹ میں سر سید نے اس کا اعلان کیا، اور مولانا مرحوم کے یہ مضامین اس سلسلہ میں داخل کئے گئے، اور مولانا کو اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا، ان کے ان مضامین کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی شائع کئے گئے، عربی میں خود مولانا نے اپنے قلم سے اپنے رسالہ الجزیہ کا ترجمہ کیا، اسی سلسلہ کا مولانا کا لکھا ہوا مشہور رسالہ "حقوق الذمیین" ہے۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ کالج کی طرف سے "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" کے نام سے ایک ضمنی رسالہ نکلتا تھا جس میں کالج کے حالات، مجلسوں کی رودادیں، انجمنوں کی تقریریں، اور اکابر کالج کے مضمون چھپتے تھے، ۱۸۹۴ء میں یہ مستقل علمی رسالہ بنا، اس نئے انتظام میں مولانا مرحوم نے اس کے اردو حصہ کی اڈیٹری قبول فرمائی اور اس کا مقصد خود مولانا کے الفاظ میں یہ قرار پایا "اس خیال سے اس کے منتظموں نے اس کو اور زیادہ وسعت دینی چاہی، تاکہ وہ بالکل ایک علمی میگزین بن جائے جس میں کالج کی علمی خبروں کے علاوہ مسلمانوں

کے علوم و فنون، تاریخ اور لٹریچر کے متعلق مفید اور پُرزور مضامین لکھے جائیں، اس غرض سے اس کے ۴۸ صفحے اردو کے لیے مخصوص کر دیے گئے، اور اس صیغہ کا اہتمام خاص میری سپردگی میں دیا گیا، میں اس رسالہ کے ترقی دینے میں حتی الامکان کوشش کروں گا۔" مولانا کا خیال تھا کہ اسلامی سلطنتوں کے اہم تمدنی اور انتظامی صیغوں پر اس میں مضامین لکھے جائیں اور جب وہ معتدبہ حد تک پہنچ جائیں تو ان کو مستقل کتابوں کی صورت میں شائع کیا جائے، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا مضمون انھوں نے جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں "اسلامی حکومتیں اور شفاخانے" کے عنوان سے شائع کیا، اور اس کے دیباچہ میں اس مقصد کی پوری توضیح کی، یہ رسالہ پوری طرح کامیاب ہوا، اور اس میں مولانا شبلی کے علاوہ، مولانا حالی اور مولانا ذکاء اللہ صاحب وغیرہ کے مضامین ماہ بماہ چھپتے رہے، اس کے جون نمبر میں مولانا کا وہ خطبہ چھپا جو انھوں نے ۱۲۔ اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں "علما کے فرائض" پر دیا تھا، ۱۸۹۶ء میں "حقوق الذمیین" کا معرکۃ الآرا مضمون اسی کے اپریل اور مئی نمبر میں شائع ہوا، اس آخری نمبر میں قدیم اسلامی کتب کی اشاعت کی تجویز مولانا نے پیش فرمائی، اور "ندوۃ العلماء" کے تیسرے سالانہ جلسہ کی روداد اپنے قلم سے لکھ کر شائع کی، ان کے علاوہ اس رسالہ میں "املا اور صحت زبان" اور "سر سید اور اردو لٹریچر" وغیرہ مضامین ان کے قلم سے نکلے، غالباً اس رسالہ میں مولانا کا یہ آخری مضمون تھا جو جون ۱۸۹۸ء کے پرچہ میں نکلا، اسی مہینہ سر سید نے وفات پائی، اور کچھ روز کے بعد مولانا بھی علٰحدہ ہو گئے، ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند،

کانفرنس کی خدمت

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا نام پہلے سر سید نے ایجوکیشنل کانگریس رکھا تھا،

چنانچہ ۱۸۸۶ء تک وہ تعلیمی کانگریس کہلاتی تھی (خطوط سرسید بنام محمود ص ۱۳۲) مگر جب انڈین نیشنل کانگریس
نے شہرت پائی تو پروفیسر آرنلڈ کے مشورہ سے کانگریس کے بدلے کانفرنس کہلانے لگی) بہرحال یہ تعلیمی مجلس مولانا کے
علیگڑھ جانے کے چند سال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی اور اس کا پہلا ابتدائی اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڑھ میں ہوا
جس میں کل ساٹھ ستر آدمی شریک تھے اور مولوی سمیع اللہ خاں صدر نشین، اس اجلاس میں مولانا کی شرکت
بعض ریزولیوشنوں کی تحریک و تائید تک رہی۔ دوسرے اجلاس میں جو ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ء
کو لکھنؤ میں ہوا، مولانا نے اپنا مشہور مقالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" لکھ کر پڑھا جس سے مسلمانوں
کی اپنی پچھلی تاریخ کا کارنامہ سن کر آنکھیں کھل گئیں۔ اس اجلاس کی آخیر تاریخ میں انھوں نے اپنا
قصیدہ "عیدیہ" جس کو وہ ۱۸۸۴ء میں لکھ چکے تھے اپنے خاص انداز میں پڑھ کر سنایا۔ یہ قصیدہ کلیات
میں شامل ہے۔ اس میں تشبیب کے موقع پر دوگانۂ عید کی کیفیت، نمازیوں کا ہجوم، اسلامی جوش
کا سماں دکھایا ہے۔ پھر گریز کے موقع پر مسلمانوں کی موجودہ عبرت انگیز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے
مولانا نے جلسہ میں جب یہ قصیدہ پڑھا تو تمام حاضرین ایک عجیب اثر سے متاثر ہو گئے
اسی لئے پہلی دفعہ یہ قصیدہ "گذشتہ تعلیم" کے ضمیمہ کے طور پر چھپا ہے۔ اسی اجلاس میں سرسید نے
یہ تجویز پیش کی تھی کہ انگریزی کے جو چھوٹے چھوٹے اسکول جابجا قائم ہو رہے ہیں یہ قوم کے
لئے مضر ہیں؟ اس پر مخالف و موافق تقریریں ہوئیں، مولانا نے بھی گویا مخالفت ہی میں
تقریر کی، اور سرسید کی تجویز بڑی اکثریت سے نامنظور ہو گئی۔

کانفرنس کا تیسرا اجلاس دسمبر ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ہوا، اس میں غالباً مولانا نے شرکت نہیں
کی، چوتھا اجلاس ۱۸۸۹ء میں پھر علی گڑھ میں ہوا، مولانا نے اس میں اپنا وہ ترکیب بند پڑھا جس کا مطلع ہے

گذشتہ تعلیم مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

جز تو می بود بنیگ کرد ببیں زینت و شاں | چیست کیں بزم بآئین دگرست طراز
با ہمہ فرّ و فرِ با ہمہ تمکین و شکوہ | چارمیں مجلسِ تعلیم نہادند آغاز

کانفرنس کے آسمان پر اس وقت مولانا حالی، مولٰنا نذیر احمد اور مولٰنا شبلی تینوں آفتاب و ماہتاب جمع تھے، تینوں کا تذکرہ اس شان سے اس ترکیب بند کے دوسرے بند میں آیا ہے، اور اپنا ذکر کس خاکساری لیکن کس خوبصورتی سے کیا ہے:-

گہ از ینسو سے حالیِ آزادہ سخن | واں نذیر احمد طوطیِ شکر خا بنگر
آں یکے را بلب آں نغمہ جانسوز ببیں | واں دگر را بکف آں دفترِ انشا بنگر
پس ازاں با ہمہ فرومایگی و بے پایگی | شبلیِ دل زدہ را زمزمہ پیرا بنگر

پانچواں اجلاس ۱۸۹۰ء میں الٰہ آباد میں ہوا، اس کانفرنس کے متعلق اپنے ایک عزیز کو لکھا: یہ کانفرنس میں مجمع تو بہت نہ ہوگا لیکن بڑے بڑے لائق آدمی جمع ہوں گے اور اپنا جوہر کمال دکھائیں گے۔" (مکاتیب ۴۰) اس کانفرنس میں مولٰنا شریک ہوئے اور یہ تجویز پیش کی: "اس جلسہ کی یہ رائے ہے کہ اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علوم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کئے تھے اُن پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے، اس رسالہ میں ہر ایک امر اور مسائل و مباحث کو با تفصیل بحوالہ اسناد ثابت کیا جائے"

اس تجویز کو پیش کرتے وقت انھوں نے اس پر ایک مختصر سی عالمانہ تقریر کی، جو کانفرنس کی اُس سال کی روداد میں ہے، سر سید نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا: "یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت بڑی ضرورت ہے، تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں، مگر

بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون؟ ہمارے ہاں ایک مثل ہے، جو بوے وہی کاٹے، یعنی ہر گز شبلی ہی مسلمانوں کے لٹریچر کی شبلی ہی لکھیں گے، تمام دنیا سے باتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔

اس تجویز کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ۱۸۸۷ء ہی میں آچکا تھا، چنانچہ گذشتہ تعلیم کے ایک شذرہ پر انھوں نے لکھا تھا: "اگر زمانہ نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ میں لکھوں گا، اور شاید اسی انجمن (کانفرنس) کے کسی دوسرے جلسہ میں پیش کرنے کا اتفاق ہو" (ص ۵۱)، مگر مولانا کو اس کا اتفاق نہیں ہوا، اور نہ اس تجویز کی تفصیل میں کوئی مستقل کتاب لکھی، البتہ بعد کو الندوہ میں یونانی منطق اور یونانی فلسفہ کے مختلف مسئلوں پر متعدد مضامین لکھے،

۱۹۰۲ء میں کانفرنس پہلی دفعہ دہلی میں ہو رہی تھی، مولانا نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ایک خط میں لکھا ہے کہ وہ اس میں شرکت نہیں کریں گے، فرماتے ہیں:- "دسمبر میں غالباً آپ کا قصد اس غرض سے ہے کہ کانفرنس دہلی میں شریک ہو سکو، لیکن میرا قصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس غالباً پھیکی ہوگی، مولوی حشمت اللہ و میرزا حیرت کی بڑ بڑ سن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد صاحب بھی غالباً چپ رہیں، اور بولیں بھی تو ان کا وزن ایرن ہو چکا" (اسحاق ۴۰) ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں مولانا نے ایک اردو ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کے شروع کے شعر یہ ہیں،

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں — یہ اُن کی بزم ہو جو یادگار نسلِ عدناں ہیں
فیلِ اللہ سے حماں نوازی جنکو پہنچی ہے — ہزاروں کوس سے آ آکے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

مولنا نے خلافِ معمول یہ قصیدہ اردو میں کہا۔ اور ترنم کے بغیر سادہ رنگ میں پڑھا۔ میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مولنا شبلی چونکہ فارسی میں کہتے ہیں جس میں ایک خاص قسم کی شان ہے اور پڑھتے بھی ترنم سے ہیں جس سے سننے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے ورنہ فی نفسہ ان کی شاعری میں کوئی کمال نہیں۔ مولنا نے یہ سُن کر اس دفعہ اپنا قصیدہ بھی اردو میں کہا، اور سنایا بھی سادہ طریقہ سے، مگر محفل پر رنگ وہی چھایا رہا، اس نظم کا مضمون بھی مولنا حالی کی نظموں سے ملتا جلتا ہے،

سرسید کی وفات کے بعد بھی مولنا کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے، ۱۹۰۰ء میں نواب محسن الملک نے امرزکیا کہ اس سال رامپور کی کانفرنس میں وہ شریک ہوں (اسحاق ۔ ۱) ۱۹۰۲ء میں خیال تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کردینا چاہتی ہے، اس سے اس سال کی کلکتہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ بی اے کی ڈگری کے لئے فارسی بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا پسندیدہ امر ہے، اور یہ کہ نصابِ تعلیم جو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مروج ہے، اس میں اصلاح و ترقی کی گنجایش ہے، مولنا نے اس تجویز کی تائید میں ایک نہایت پر زور اور مدلل تقریر کی جس میں انھوں نے مخالفین کے اس اعتراض کا کہ فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوتِ متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں، اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون اور

حقیقی شاعری ہو۔ ایسی خوبی سے جواب دیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے، انھوں نے بتایا کہ علوم و فنون کی وہ تمام شاخیں جو عربی میں ہیں، وہ فارسی میں بھی موجود ہیں، فلسفہ، منطق، اور علم طب کی مکمل تصانیف اس میں ہیں، اور مسلمانوں کے پچھلے عہد زریں کی تاریخ کی وہی تنہا سرمایہ دار ہے، پھر انھوں نے مسلمان بادشاہوں کی فارسی میں خود نوشت سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا جس کا جواب کسی زبان میں موجود نہیں، اس کے بعد انھوں نے فارسی کی فضیلت شاعری کو بڑی خوبی سے بیان کیا، ساتھ ہی ساتھ مثال کے طور پر فارسی کے بیسیوں اشعار پڑھ کر سنائے سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا تھا، اسی سلسلہ میں مولانا نے ہفت بند کاشی کے اشعار جب اپنے خاص انداز میں پڑھے ہیں تو کانفرنس مجلس ماتم بن گئی، اس وقت بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر اوڈبرن بھی اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی اس تقریر کا حوالہ دے کر کہا کہ مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ میں مولانا شبلی کی طرح پرتاثیر تقریر کر سکوں[۱]۔

۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور مولانا اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے ۱۹۰۳ء میں دہلی میں تاجپوشی کے موقع پر جو کانفرنس ہوئی اور جس کے صدر ہز ہائی نس آغا خاں تھے: "اسلام کی بے تعصبی" پر ایک عالمانہ لکچر دیا، اس لکچر کو مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر

---

[۱] میں نے یہ واقعہ اس کانفرنس کے ایک شریک منشی محمد صدیق صاحب مختار دیسنوی بہاری سے سنا جو میرے ہم وطن مخدوم تھے، اور سرسید کے معتقدوں اور ان کی تحریک کے پرانے حامیوں میں تھے، مولانا شیروانی فرماتے ہیں: "میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا، لفٹنٹ گورنر نے خاص طور پر مولانا شبلی سے درخواست کی تھی کہ وہ کلکتہ آئیں، اور مدرسہ عالیہ کو مفید بنانے کی کوشش کریں، مولانا نے وعدہ کیا مگر بعد میں کلکتہ میں طاعون پھیلا، اس لئے نہ جا سکے۔"

ابن بشیر نے جلسہ میں کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ سے قلمبند کر لیا تھا، اور بعد کو چھاپ کر شائع کیا، لیکن چونکہ تقریر ادھوری تھی اور مطالب بھی ناقص تھے اس لئے مولانا نے اخبار میں لکھا کہ یہ اُن کی بعینہ تقریر نہیں،

سنہ ۱۹۰۶ء میں نواب سلیم اللہ خاں نواب ڈھاکہ اور محسن الملک کے اصرار سے ڈھاکہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور میرزا شجاعت علی خاں کونسل ایران کی صدارت میں ۲۲ - دسمبر کو تاریخ اسلام پر لکچر دیا۔ (ریاض حسن - ۱۰۰)

اس کے علاوہ بھی کانفرنس کے مختلف جلسوں میں شریک ہوتے رہے، اور اس کی دلچسپی کو بڑھاتے رہے۔ غالباً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے عہد نظامت میں کانفرنس سے انکی دلچسپی بہت کم ہو گئی، اور اس کی جگہ ندوہ کے اجلاسوں نے لے لی،

نینی تال کا سفر مئی سنہ ۱۹۰۸ء

مئی سنہ ۱۹۰۸ء کی گرمیوں میں سرسید نینی تال گئے تھے، یہ رمضان کا مہینہ تھا، مولانا بھی اُن کے ساتھ نینی تال گئے، اور سید صاحب کے ساتھ ایک کوٹھی میں ٹھہرے چونکہ کسی پہاڑی مقام کا یہ پہلا سفر تھا اس لئے ایک خط میں پہاڑی منظر کی دلچسپ کیفیتیں لکھ کر بھیجیں، مرقع کے لحاظ سے مولانا کا یہ خط اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے:-

"تمام راستہ قدرت الہی کی نیرنگی وعظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے، اگر اس پہاڑ میں سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے،

ان قدرتی مناظر کی دلچسپیاں ایک طرف، مگر ایک غیر معمولی ذہانت کے مالک کی نظر ان ظاہرداریوں سے ہٹ کر ان کی معنویت کی طرف منتقل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی۔ ان پہاڑوں کا کاٹنا، ان میں رستے بنانا، کج پیچ بلکہ پُرپیچ راستوں کو اوپر چڑھنا، اور ان پر بڑے بڑے مکانات بنانا، پانی اور روشنی کا انتظام کرنا، ان باتوں سے مولانا کا ذہن انگریزوں کی بے ہمت، اور پُرجوش محنت کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ایک ترقی یافتہ قوم کا اصلی جوہر ہے، اس کے علاوہ انھوں نے دوسرا نتیجہ جو نکالا وہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے: "یہاں جو کچھ آرام ہے وہ یہ ہے کہ کسی وقت یہاں آفتاب کی عملداری نہیں ہونے پاتی، رہی بات جس کے لئے انگریزوں نے لاکھوں کروڑوں روپے صرف کر دیئے ہیں، درحقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہئے، کہ صحت سب چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں، رمضان تو خوب گذرے گا، مجھ کو اگر دلچسپی ہے تو اسی سے" ایک دوسرے عزیز کو لکھتے ہیں: "مجھ کو نینی تال میں کچھ دلچسپی نہیں، بس اتنا ہے کہ روزے یہاں گرمی نہیں دکھاتے" (صحیح - ۲۲)

ان پہاڑوں پر جو لوگ گئے ہیں ان کو تجربہ ہے کہ یہ پہاڑی مقامات درحقیقت انگریزوں نے اپنی بے تکلف زندگی کے لئے بنائے تھے کہ وہ کھلے بند وہاں عیش و لطف اٹھا سکیں، اس لئے ہر چیز وہاں انھوں نے اپنے مذاق کی بنائی ہے، انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانیوں نے بھی وہاں جانا شروع کیا، اور وہ انگریزوں کے لئے وہاں یارِ شاطر نہیں، بارِ خاطر بن گئے ہیں، اور جو ہندوستانی ان کے یارِ شاطر بنے وہ اپنے سے کھو گئے۔ اس حیثیت سے اس مقام کا جو اثر مولانا کی طبیعت پر پڑا وہ یہ تھا: "...... مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ

سید، مقتضائے بشریت ہو کر میں اس کو فرحت نہ بخشی مان لوں گا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہوا و ہوس پر جان دیتے
ہیں، ان کا مذہب کیا پوچھنا۔ ع ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست (مکاتیب بنام شیخ حبیب اللہ)

اس سفر کا ایک تاریخی پہلو یہ ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"
کا پہلا خاکہ مولانا کے ذہن میں یہیں آیا، یہی کا مہینہ تھا، اور دسمبر میں اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا
تھا، یہیں سے ۳ مئی ۸۷ء کو مولانا نے اپنے ایک عزیز کو اس مضمون کی اطلاع دی (ربیع ۴۴)
قصیدۂ بہاریہ جو ۸۷ء میں مکمل ہوا بلکہ نا تمام رہا، اس کا خیال بھی پہلے پہلے اسی
بہارستان میں آیا تھا، اور اسی کے لئے کلیاتِ غالب کا نسخہ یہاں منگوایا تھا، تاکہ توارد مضمون

تصنیف کا آغاز

۱۸۸۶ء

۸۶ء میں مولانا نے علمی کوچہ میں قدم رکھا تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہ
ان کے جو کمالات ظاہر ہوئے تھے وہ شاعری تک محدود تھے، مگر وہ اندر ہی اندر اسلام کی
خدمت کا صحیح راستہ ڈھونڈ رہے تھے، زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موزوں جو تلاش کر رہے تھے بالآخر
ان کو نظر آیا کہ یورپ کی چیرہ دستی کا جو رعب مسلمانوں پر چھا گیا ہے، اور جس کے مقابلہ میں
اُن کو نہ صرف اپنا حال بلکہ ماضی تک تاریک نظر آتا ہے اس کو دور کیا جائے، اس وقت
یورپ کے اہلِ قلم اور مصنفین کا یہ کارنامہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تاریخ پر جو ناز تھا اس کو مٹانے
کے لئے اسلام، سلاطینِ اسلام، اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر لوگوں میں

پھیلا رہے تھے، تاکہ مسلمانوں کی نئی پودھ کو خود اپنی قوم سے نفرت ہونے لگے، اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں، چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو چلی تھی، اور مسلمانوں کو خود اپنی تاریخ سے گھن آنے لگی تھی، اور یورپ کی ترقیوں کو دیکھکر ان کو چکا چوندھ لگ رہی تھی، مولنا نے ان کی اس تدبیر کو سمجھا، اور اسی کے مقابلہ کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی،

اس سلسلہ میں مولنا نے اپنی پہلی تصنیف جس کا نام مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے ۱۸۸۷ء میں لکھی، اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ اس سال لکھنؤ کے ممتاز وکیل منشی امتیاز علی صاحب (والد منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری) کی دعوت پر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑے زور و شور سے لکھنؤ میں ہونے والا تھا، اس لئے سر سید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی، (سر سید بنام عماد الملک صفحہ ۱۳۰) مولانا نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا عنوان اپنے لئے پسند کیا، سر سید نے اس عنوان کا عام اعلان کیا، ۲۰ مئی ۱۸۸۷ء کے ایک خط میں مولنا نینی تال سے لکھتے ہیں: "محمڈن تعلیمی مجلس اس سال لکھنؤ میں ہوگی، اشتہار میں شائع کیا گیا ہے کہ شبلی مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک وسیع مضمون پڑھے گا، شاید یہ مضمون جی لگا کر لکھوں، اور گرانمایہ لکھوں" (دیبچ-۲۲) یہ گرانمایہ مضمون لکھا گیا، اور ۲۰ دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ کی شاہی بارہ دری میں جو مقام اجلاس تھا، پڑھکر سنایا گیا، مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی یہ پہلی آواز آئی، سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی، یہی وہ مطلع ہے جس سے علامہ شبلی کی شہرت کا آفتاب سب سے پہلی دفعہ طلوع ہوا، اس خطبہ میں مولنا نے تفصیل

سے مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم اور اسلامی مدرسوں کے نام اور خصوصیات و حالات، بیان کئے تھے۔ یہ ملک میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی۔ اس نے خطبہ ہی خطبہ نہ رہا، بلکہ الگ رسالہ کی صورت میں چھپا۔ اسی لئے مولنا نے اس کو اپنی سب سے پہلی تالیف قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں:- "اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ (یعنی مولنا) تاریخی تحقیق و تنقید میں مصروف تھے، جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر اُن کا لکچر تھا، جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو ہوا ہے، تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں اُردو میں نئی طرز کی پہلی سوانح عمری "حیاتِ سعدی" مولنا حالی نے لکھی اور مولنا شبلی نے پسند کی، ایک خط میں ۱۰ - مارچ ۱۸۸۶ء کو لکھتے ہیں:- "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔" (مکاتیب - ۱۵)

دوسری تصنیف المامون اس کے بعد اُردو کی دوسری نئی طرز کی سوانح عمری المامون ہے، جو ۱۸۸۷ء میں نکلی، یہ مولنا کی پہلی مستقل تصنیف ہے، جو اُن کے نامور فرمانروایانِ اسلام کی پہلی کڑی ہے، اس کو تاریخ بنی العباس کا نمونہ کہنا چاہئے، یہ تصنیف ایسی مقبول ہوئی کہ مولنا فرماتے تھے کہ تین مہینے میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا، اور دوبارہ چھپا۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:- (گذشتہ تعلیم کے بعد) اسی نوعیت کی اُن کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم پسند کی گئی، اور اس کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولنا شبلی کس

قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آیندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں۔ المامون کی تصنیف کی تحریک میں مسٹر پامر کی کتاب ہارون الرشید کو بھی دخل ہے جس کو پڑھ کر مولنا کے دل میں المامون لکھ کر مسٹر پامر کے زہر کے لیے تریاق کا خیال آیا۔

مولنا شیروانی سے تعلقات — المامون اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھہری، اس پر اخبار میں بہت سے ریویو نکلے، اُن میں سے قابلِ ذکر ریویو اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا جسکو ملک نے اب صدر یار جنگ مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام سے جانتا ہے۔ مولنا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱۔ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اُس کے اڈیٹر کے پے در پے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا، مولنا شیروانی لکھتے ہیں:

"علامہ مرحوم سے میری سب سے اوّل ملاقات اندازاً ۱۸۸۹ء میں ہوئی، آغاز تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا بعض اہم مسائل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا۔

رسی آنکہ بہ ردِ من چو من — خامہ گیری و حرف بنگاری

رامپور کے سرکاری کتب خانہ اور مدرسہ عالیہ میں ۱۸۸۹ء — رامپور سے مولنا کو پرانا تعلق تھا، اُن کی طالب علمی کا زمانہ یہاں بھی گذرا تھا، اُن کے استاد مولنا ارشاد حسین صاحب مجددی اب تک زندہ تھے، اور اُن سے نیازمندی کی وابستگی بھی تھی، اب اُن کے تعلق کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوئی، اس زمانہ میں نواب کلب علی خان والی رام پور کا انتقال ہو چکا

تھا، ان کی جگہ نواب مشتاق علی خاں مسند نشین تھے، اور ریاست کا سارا نظم و نسق جنرل عظیم الدین خاں مرحوم مدار المہام کے ہاتھ میں تھا، یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس زمانہ میں سرسید کی طرح جدید انگریزی طور و طریق و تمدن کو اختیار کیا تھا، بڑی شان و شوکت اور دبدبہ و عظمت کے آدمی تھے، نجیب آباد کے خاندان کے تھے، تیر کے شکار اور فنونِ جنگ میں نام کیا تھا، سرکار انگریزی میں اُن کو بڑا اقتدار حاصل تھا، اور جنرل کے عہدے سے ممتاز تھے، سارا ریاست میں اُن کے زور پنجہ اور مضبوط دست و بازو کی دھوم تھی، اور لوگ اُن کے نام سے کانپتے تھے، موصوف نے اپنے زمانہ میں جو بڑے بڑے کام کئے ان میں سے ایک مدرسۂ عالیہ رامپور کی تنظیم ہے، ہمارے استاذ مولانا حفیظ اللہ[1] صاحب جو مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، اس کے مدرسِ اوّل مقرر ہوئے،

---

[1] مولانا حفیظ اللہ صاحب ۱۸۵۷ء کے قریب پیدا ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں چھ ماہ کے تھے، اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندی قریب محمد آباد جائے سکونت ہے، فارسی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی، اور اس کی تکمیل چشمۂ رحمت غازی پور میں کی، عربی تعلیم بنارس جا کر شروع کی، جہاں مولوی سلامت اللہ صاحب جیراج پوری عربی کی اعلیٰ کتابیں اس وقت پڑھ رہے تھے، ایک سال کے بعد پھر وہاں سے غازی پور پہنچے اور مولانا غلام جیلانی صاحب نامی ایک فاضل وقت سے جو مولانا عبد الحلیم صاحب فرنگی محلی (والد ماجد مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی) کے شاگرد تھے، متوسطات تک تعلیم پائی، اس کے بعد غالباً ۱۸۷۰ء میں وہ لکھنؤ جا کر فرنگی محل میں مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کے حلقہ میں داخل ہوئے اور وہیں علوم کی تکمیل کی، معقولات اور ریاضیات میں خاص طور سے کمال پیدا کیا، فراغت کے بعد استاد کے حسب الحکم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرسی قبول کی، وہاں سے مولانا عبد الحی صاحب کی سفارش پر وہ مدرسۂ عالیہ رامپور میں صدر مدرس ہوئے، اور مولوی عبد الحق صاحب

مولانا شبلی کے رسالہ گذشتہ تعلیم نے عربی مدرسوں میں اصلاح کا خیال پیدا کر دیا تھا، اور اس بنا پر کہ تصنیف را مصنف نیکو کند بیان، خود مولانا سے اصلاح پسند حکام نے مشورے چاہا، چنانچہ جنرل صاحب ممدوح نے اس مدرسہ میں سالانہ امتحان لینے اور مدرسہ کے متعلق را دینے کے لئے جن علما کو تکلیف دی تھی ان میں ایک مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا کی دلچسپی کی بڑی چیز وہاں کا کتب خانہ بھی تھا، الماموں کی اشاعت نے اس راز کو بھی فاش کیا کہ مولانا کو نوادر کتب سے نہ صرف دلچسپی بلکہ عشق ہے، اس لئے نوادر قلمی کتابوں کی قدر و قیمت اور ترتیب کے لئے وہی سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ جنرل صاحب موصوف نے

(حاشیہ صفحہ ۱۶۴) خیرآبادی سے ان کے مناظرے رہے، زمانۂ قیام رامپور میں منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے خاص تعلقات پیدا ہو گئے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں علم ہیئت کی کتاب تصریح پر نواب حامد علی خان کے ابتدائی عہد میں حاشیہ لکھا، جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے، وہ دس برس کے قریب رامپور میں رہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ دارالعلوم میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور سنہ ۱۹۰۸ء تک برابر اس عہدہ پر قائم رہے، اس کے بعد وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مدرس عربی ہوئے اور شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے، سنہ ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن پاکر حجاز گئے، اور فریضۂ حج ادا کیا، واپسی کے بعد لوگوں کے اصرار سے پھر دارالعلوم ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی، اور کئی سال تک مفوضہ خدمت انجام دے کر سنہ ۱۹۳۰ء میں وطن واپس آئے، جہاں اب تک بحمد اللہ بخیر و سالم ہیں،

مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی شاگردی کے باوجود آخر عمر میں وہ عامل بالحدیث ہو گئے ہیں، عدم تقلید کا میلان پہلے سے تھا، جو شاید اوائل عمر میں مولوی سلامت اللہ صاحب کی صحبت کا اثر ہو، غرض دس بارہ برس سے اب وہ عامل بالحدیث ہیں،

مولانا کی صحت و توانائی قابل رشک تھی، اور اب بھی ہے، سیر و شکار، اور تفنگ اندازی کا شوق ہے، تعجب نہیں کہ جنرل عظیم الدین خان کا فیض ہو،

۱۸۸۹ء میں مولٰنا مرحوم سے اس کتب خانہ کی ترتیب، اصلاح و ترقی پر ایک مفصل رپورٹ
لکھنے کی خواہش کی چنانچہ مولٰنا نے تین روز رہ کر اور کتب خانہ کو ہر طرح دیکھ کر ایک رپورٹ
مورخہ ۱۰۔ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو لکھ کر پیش کی، اس میں الماریوں کی ترتیب، فہرست لکھنے کا طریقہ، کتابوں
پر نمبر ڈالنے کی کیفیت، نوادر کے انتخاب اور حفاظت کے طریق، اور دوسری ضروری ہدایتیں
درج فرمائیں، اور منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی مرحوم نے فہرست کا جو نمونہ بنایا تھا، انکو
کسی قدر اصلاح کے بعد پسند فرمایا، اور اسی طریق پر پورے کتب خانہ کی کتابوں کی از سر نو
ترتیب کا مشورہ دیا، کتبخانہ کی ترتیب میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں حروف تہجی
کے اعتبار سے ترتیب دی گئی تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلیات، رند اور کتاب الخراج قاضی ابو
یوسف دونوں ایک صف میں تھیں، مختلف علمی رسائل کے مجموعے بے جوڑ رسالوں کیساتھ
مجلد تھے، نوادر کا انتخاب صرف خوشخطی اور حسن ظاہری کی بنا پر کیا گیا تھا، اور اچھی اچھی کتابیں
چھانٹ دی گئی تھیں، مولٰنا نے فن اور مطالب کے لحاظ اور دوسری معنوی خصوصیات
کی بنا پر نوادر کے دوبارہ انتخاب کی رائے دی، کچھ دنوں بعد نواب مشتاق علی خاں کا انتقال
ہوا، اور کونسل قائم ہوئی، اور جنرل صاحب موصوف کونسل کے صدر ہوئے، (اس وقت نواب
حامد علی خاں نابالغ تھے) تو مولٰنا شبلی مرحوم کی تجویزوں پر پوری طرح عمل ہوا، فن وار رجسٹر
بنائے گئے، اور ۱۸۹۱ء میں کتب خانہ کے لئے ایک نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی، اور ۱۲-۱۰-
۹۲ء کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، (دیباچہ جلد اول فہرست کتب خانہ رام پور) مگر
افسوس کہ جنرل صاحب موصوف اس سے ایک سال پہلے اس دنیا سے رخصت

ہو چکے تھے۔ [1]

کہ نواب رامپور کے موجودہ ناظم مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہے کہ مولانا کی

---

[1] جنرل موصوف کی موت بلکہ شہادت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ۱۹۰۳ء کی بات ہے کہ وہ رات کو ایک تقریب سے تنہا قیام پر واپس آ رہے تھے کہ چند آدمیوں نے ان پر پیچھے سے ایک ساتھ فائر کیا، گولی ٹھیک نشانہ پر پڑی، اور اس پر بھی اُن میں اتنا دم خم تھا کہ چند قدم چل کر ایک دوست کے دروازے تک پہنچے اور وہیں گر کر ٹھنڈے ہو گئے۔ اس واقعہ کا اثر سارے ملک پر پڑا۔ ایک عالم اور شاعر کا دل ایسے علم دوست مصلح کے سانحہ سے کیسے متاثر نہ ہوتا، چنانچہ مولانا نے اُن کا مرثیہ لکھا جو ۲۴۔ اپریل ۱۹۰۳ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں مولانا کے اس خط کے ساتھ چھپا ہے،

"جناب اڈیٹر صاحب! اگرچہ ہم خاک نشینوں کو ملکی ارکان سے بہت کم واسطہ رہتا ہے، تاہم جو واقعہ عظیم آشوب اور جانگداز ہوتا ہے وہ کسی کو بے اثر نہیں چھوڑتا۔ اس قحط الرجال میں جنرل اعظم الدین خاں سے جو بہادرانہ اور ملکی قابلیتیں ظہور میں آئیں، اُن کے لحاظ سے ان کی عبرت انگیز موت عجیب سانحہ حادثہ ہے۔ مجھ کو اس مرحوم سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا، لیکن اُن کے مردانہ اوصاف اکثر سنے اور دیکھے تھے، اس خبر کے سننے سے نہایت قلق ہوا، اور یقین ہو گیا کہ خدا ہی کو منظور ہے کہ ہماری قوم میں لائق لوگ نہ رہنے پائیں۔ اسی رنج و قلق میں کچھ اشعار مرثیہ کے موزوں ہوئے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں، امید ہے کہ اخبار کے کسی گوشہ میں جگہ دی جائے۔"

مرثیہ کلیات میں شامل ہے، موقع کے لحاظ سے چند شعر یہ ہیں:۔

تا کے ز غم نہاں نگریم	گویند مگو چہاں نگریم
در ماتم خان اعظم الدین	چوں قصۂ خوں چکاں نگریم
در خاک شد آں امیر یکتا	یا تہمتن و رفتہ در چاہ
جان یکے بہ شب شد و خاست	تا باز رود بسوے ہیجا
کم حوصلگان سخن چہ سنجند	بودند نشستہ در کمیں گاہ
کا مسکر چو در صف بلا آمد	آں کج روشان دوں بد گاہ

اکثر اصلاحی تجویزوں پر عمل کیا گیا، کتابیں زبان اور فن پر منقسم ہوئیں، متعدد مجموعے بھی از سرِ نو مرتب کئے گئے۔

مولانا نے اس کے بعد بھی کئی دفعہ اس کتب خانہ کو دیکھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا، سب سے آخری بار ۲۰۔ اپریل ۱۹۱۳ء کو اس کو ملاحظہ فرمایا، اور اپنے ہاتھ سے اس پر چند سطریں لکھیں جنمیں اس کتب خانہ کی اہمیت کا اعتراف فرمایا ہے[1]

مولانا نے کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست کی تحریر پر جو رپورٹ لکھی ہے، وہ آج معمولی بات معلوم ہوگی، مگر آج سے پچاس برس پہلے کا زمانہ سامنے لائیے، جب مشرقی کتبخانے نئی ترتیب سے آشنا نہ تھے، اور نہ علماء کے سامنے اس کام کا کوئی نمونہ تھا، اس کتب خانہ کی اس علمی ترتیب سے جو فیض علماء اور اہلِ علم کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے، وہ ان ہی جنرل مرحوم کی کوشش اور مولانا کے حسنِ تجویز کا فیض ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷)

یک بار بر او گشاد از دور — شستش تیر و یکے خطا نہ شد آہ
بر چہرہ اصبر ہمی نیفگند — بالی بجہ زجائے جانکاہ
بر خاک فتاد و باز برخاست — میں طے بجنود پارۂ راہ
آسودہ بہ راہ و وز اں پس — افسانۂ عمر گشت کوتاہ
اے کشتۂ ظلم ہاں خبر گیر — ایں نالۂ ما بگوش در گیر
برخیز و باں بہ رسم پیشیں — ہم تیغ بدست و ہم سپر گیر
ترکانہ کلاہ بفرق بشکن — چار آئینہ و زرہ ببر گیر
آں رونق رفتہ باز آر — آں آئینہ را دگر بزر گیر

[1] مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے مولانا کی روداد اور معائنہ کی دونوں تحریریں معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع کر دی ہیں۔

لطیفہ | آجکل مجھے دسمبر ۱۹۶۲ء میں رامپور جانے کا اتفاق ہوا، تو وہاں کے بزرگوں کی زبان سے ایک دلچسپ حکایت سننے میں آئی جس سے اُس زمانہ کا ماحول اور علماء کے حسنِ اخلاق اور سادہ مزاج کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ مولانا کسی تقریب سے رامپور میں وارد تھے۔ جنرل صاحب مرحوم نے اس حسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ ایک عام جلسہ کیا، اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جس میں بعض علماء بھی تشریف لائے۔ جلسہ میں جب مولانا تشریف لائے تو جنرل صاحب نے اُن کی آمد پر چیرز دیئے، اور ساتھ ہی سب نے تالیاں بجائیں۔ علمائے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے پُرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالی پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں، انھوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مولوی شبلی کیسے ہی بددین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے۔ جنرل صاحب کو اُن کی یہ توہین کرنی نہیں چاہئے تھی۔ اب جب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوئے تو خود ان بزرگ نے تالیاں بجائیں، اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالی پیٹو، انھوں نے مہمان کی توہین کی ہے، ان کی بھی توہین کرو، اور اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسہ سے اٹھے اور اپنی پالکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے، جنرل صاحب کو ان کی ناراضی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اسکو شاباشی دی گئی ہے، قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے تو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں، اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے، اس لئے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ سے اسکو ٹھونکتے ہیں، یہ تالی نہیں ہے۔" اس تاویل سے ان نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہو گئی اور جلسہ میں

واپس تشریف لے آئے۔

تیسری تصنیف سیرۃ النعمان

مولانا نے اس کے بعد جیسا کہ انھوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں لکھا ہے "الفاروق" کی طرح ڈالی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کا کام تھوڑے دنوں کے لئے روک دیا، اور سیرۃ النعمان کی طرف توجہ کی ۱۸۹۰ء میں اس کی بنیاد پڑی، اور اسی سال یعنی دسمبر ۱۸۹۰ء میں اس کا پہلا حصہ ختم کر دیا[1]، اور دوسرا حصہ جو بہت محنت سے لکھا گیا تھا، اس کا کام ۱۸۹۱ء میں شروع[2] ہوا، اور اسی سال کے اخیر یعنی دسمبر ۱۸۹۱ء میں وہ بھی ختم ہوا[3] ۱۸۹۱ء کے اخیر میں کتاب پہلی بار چھپی، اور ۱۳ جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کے نسخے اعظم گڈھ بھیجے گئے[4]

یہ کتاب[5] درحقیقت مولانا کے اسی ذوق و شوق کی دوسری شکل ہے، جو ان کو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور فقہ حنفی سے ہمیشہ سے تھا، بقول مولانا کے ع شمع ہمان است لگن دیگر است

مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں: "اعظم گڈھ اور دیہات و اطراف میں اس کتاب کے بہت سے نسخے شائع ہونے چاہئیں، جو حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چند اشتہارات بھی بھیجے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے واقف ہونا چاہئے۔" (مکاتیب ۲۹) یہ کتاب بھی کالج کی طرف سے چھپی تھی ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، چنانچہ ۴ اپریل ۱۸۹۲ء کو لکھتے ہیں: "سیرۃ النعمان کب کی ہو چکی، دوسری بار چھپ رہی ہے" (مکاتیب ۲۹)

---

[1] (مکاتیب ۵۵) [2] (مجموعہ ۲) [3] (مکاتیب ۲۰) [4] (مکاتیب ۲۹) [5] مصنف نے یہ کتاب جس محنت سے لکھی اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ دوران مطالعہ میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی، اس کے بارہ میں اساتذۂ وقت سے انھوں نے استفسارات کئے، چنانچہ انھوں نے اپنے استاذ مولانا ارشاد حسین صاحب سے جو استفسار کیا تھا اس کی نقل مع جواب مولانا ارشاد حسین صاحب کے مجموعۂ فتاوی ارشادیہ میں نظر سے گذری، استاد و شاگرد دونوں کے خطوں کو تبرکاً یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان نے ملک میں مولانا کو کافی حد تک روشناس کر دیا تھا، اور لوگ اس نادرِ روزگار کو جو اپنی قومی تاریخ کے ان قابلِ فخر کارناموں کو منظرِ عام پر لایا تھا ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) مولانا شبلی مرحوم کا خط بخدمت مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی کے نام اور ان کا جواب

مخدوم و مطاع ما دامت افضالہم - بعد ادائے مراسم تحیت و تسلیم آنکہ ملازمان عالی کو معلوم ہوگا کہ بہت جلد جدید امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں جس کے لئے میں نے بہت کچھ مواد تاریخی فراہم کئے، اس وقت جو جزو زیرِ تحریر ہے وہ اُن کے فتاوے ہیں، متعدد ایجاب میں ان کے چند فتاوے مذکور ہیں لیکن دو جگہ مجھ کو شک پیدا ہوا اس لئے ان کو عرض کرتا ہوں کہ تشفی فرمائی جاوے، اصل عبارت لکھ کر شبہ لکھتا ہوں۔ قال یا ابا حنیفۃ یا ابا الخطاب ما تقول فی رجل غاب عن اھلہ اعواما ونعی الیھا فظنت امرأتہ انہ میت فتزوجت ثم قدم زوجھا الاول وقد ولدت ولدا فنفاہ الاول وادعاہ الثانی - وکل واحد منھما قذف فما الذی انکر الولد

مجھے اس میں شبہ یہ ہے کہ دونوں زوجوں میں سے کسی نے اس کو زانیہ نہیں کہا پھر قذف کے کیا معنی، باقی یہ امر کہ ولدیت کے ادعا اور انکار سے ضمناً قذف لازم آتا ہے اس پر دو سوال ہیں (۱) کیا ایسی دلالتِ التزامی سے قذف کا جرم قائم ہو سکتا ہے؟ (۲) وہ عورت درحقیقت زانیہ ہوئی یا نہیں، اگر ہوئی تو کیا واقعیت کا اظہار قذف میں داخل ہے؟ ایسا تفصیلی جواب عنایت ہو جو اصل مسئلہ کو حل کر دے اور امام صاحب کے اس سوال کی حقیقت کھول دے،

دوسرا فتویٰ یہ لکھا کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھے تھے، ایک شخص پر سانپ آگرا، اس نے دوسرے پر پھینک دیا، اسی طرح تین چار آدمی تک نوبت پہنچی، آخر میں اس نے ایک شخص کو کاٹ لیا، اور وہ مر گیا، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ اگر گرنے کے ساتھ سانپ نے کاٹا تو اخیر پھینکنے والے پر دیت لازم آئے گی، اور اگر وقفہ ہوا تو کسی پر نہیں، اس پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شخص نے پھینکا یہ اس کا اضطراری فعل تھا، اس اضطراری فعل پر وہ کیوں ماخوذ ہوا، فقہ میں اس کے متعلق کیا امر قرار دیا ہے، جواب جلد تر مرحمت ہو، ورنہ میرا حرج ہوگا،

حیدرآباد کا سفر ۱۸۸۲ء سر سید نے کالج کے چندہ کے لئے حیدرآباد کا پہلا سفر ۱۸۸۲ء میں کیا تھا جب حیدرآباد میں سر سید کے دست و بازو نواب وقار الملک انتصار جنگ، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی معزز عہدوں پر مامور تھے۔ دوسرا سفر ۱۸۸۸ء میں اُس وقت کیا جب یہ اکابر سرکار نظام کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس سفر میں سر سید تنہا نہ تھے، بلکہ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا جس میں ان کی تحریک کے بہت سے عمائد و ارکان شریک تھے اُن میں سے ایک مولنا شبلی بھی تھے۔

اس سفر میں مولنا شبلی کی ہمرہی اس حیثیت سے تعجب انگیز ہے کہ وہ کوئی ایسا سرکاری امتیاز یا شانِ ریاست نہیں رکھتے تھے جس کی بنا پر وہ اس وفد کے رشتہ میں منسلک ہو سکتے مگر واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں اس وقت دو بلگرامی بھائی ایسے تھے جو علم کے حقیقی قدر دان اور شیدا تھے، یعنی مولوی سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، سر سید نے نومبر ۱۸۸۲ء میں نواب عماد الملک کو اپنی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ بھیجی تو اس کے ساتھ مولانا کا رسالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم بھی بھیجا، اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا۔ "مولوی شبلی صاحب

(بقیہ حاشیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ از محمد ارشاد حسین عفی عنہ، مولوی صاحب محبی و مخلصی مولوی محمد شبلی صاحب وفقہم اللہ تعالیٰ، اما بعد، پس از سلام مسنون مطالعہ نمایند، رقیمہ کریمہ ورود مسعود یافتہ باعث مسرت و کشف منہ جو شد، حال کم فرصتیہائے فقیر آں مخلص را معلوم است، پس بقدر ضرورت جواب دفع اشتباہ محلہ چند نوشتم و تفصیل آں بر وقت ملاقات وصول فرصت موقوف است........الخ

یہ پورا جواب فتاوی ارشادیہ مطبوعہ میں مذکور ہے۔

نے تاریخ ، مضمون "گذشتہ تعلیم مسلمانان" اختیار کیا وہ رسالہ مرسل ہوا میں سمجھتا ہوں کہ نہایت عمدہ اور مفید چیز تیار ہو گئی ۔" (خطوط سرسید بنام عماد الملک ۱۳۔۳) اس کے بعد ان کے پاس المامون بھیجی گئی اور وہ بھی قدر و منزلت سے دیکھی گئی ، ساتھ ہی الفاروق کی تالیف کا خیال بھی پیش کیا گیا ، نواب عماد الملک مرحوم نے ان کی تصنیفات کی قدر کی ، المامون کے پچاس نسخے منگوائے اور ان کی مدح و توصیف فرمائی ، اس سلسلہ میں سرسید نے ۲۰ مارچ ۱۸۹۵ء کو نواب عماد الملک کو ایک لمبا خط لکھا جس میں ارقام فرماتے ہیں : "ان کو (مولوی شبلی صاحب کو) آپ کی ملاقات کا نہایت شوق پیدا ہوا ہے ، میرے دل میں کچھ خیالات خام سفر ہندوستان کے پیدا ہوئے ہیں ، ان خیالات خام کا جن میں غالباً امید کامیابی نہیں ہے ۔ پھر کسی وقت ذکر کروں گا مگر وہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں ، اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہے اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدرآباد لاؤں گا تاکہ آپ کو وہ اپنی نگہ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں ، اور کیسے ہیں ۔" (ص ۱۲۳) مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ "وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں ۔"

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے اس سفر کے حالات ایک فارسی قصیدہ میں ذکر کئے ہیں جو ان کے کلیاتِ فارسی میں چھپا ہوا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علی گڈھ سے سرسید کے ساتھ نہیں چلے تھے بلکہ وہ شاید اپنے وطن میں تھے ، وہاں سے لکھنؤ اور کانپور ہو کر اس سفر کے لئے روانہ ہوئے ، سرسید کا قافلہ اس سے پہلے چل چکا تھا ، اس لئے راہ میں ملاقات نہیں

ہوئی، اس سوء اتفاق سے مولنا پریشان خاطر تھے، اتفاق سے ریل میں دو اور معزز مسلمان مسافر ساتھ سوار ہوئے، جو مولنا کے غائبانہ مشتاق تھے، انھوں نے مولنا کا نام سنا تو بڑے تپاک سے ملے، اور رات بھر خدمت کرتے رہے، مولنا جب بھوپال پہنچے تو معلوم ہوا کہ کل وہ قافلہ یہاں سے آگے کو روانہ ہو گیا، وہ آگے بڑھے اور آخر تین رات دن کے سفر کے بعد آ پہنچے

حیدرآباد میں سرسید اور ان کے رفقاء کی بڑی قدر و منزلت ہوئی، سرکاری مہمان خانہ میں اتارے گئے، احبابنے دعوتیں کیں، جلسے ہوئے، اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نے جنھوں نے ابھی ابھی اختیار پایا تھا وفد کو حضوری کا شرف بخشا، اور ایک ہزار ماہوار کی پہلی شاہانہ امداد کو دوچند یعنی دو ہزار ماہانہ کرنے کا حکم فرمایا، نواب اقبال الدولہ وقار الامراء کی صدارت میں بشیر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید اور ان کے رفقاء نے تقریریں کیں، مولنا حالی نے اپنا اردو، اور مولنا شبلی نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ پڑھا، جس میں یہ تمام واقعات یعنی بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا، وقار الامراء کا آگے بڑھ کر فرمان پڑھنا اور دو ہزار ماہوار کا حکم ہونا سب مذکور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ کی تکمیل حضور میں پیشی کے بعد حیدرآباد میں کی گئی ہے، مولنا فرماتے تھے کہ حیدرآباد میں قیام گاہ کی چھت پر میں چلا گیا تھا اور منع کر دیا تھا کہ کوئی وہاں نہ آئے اور وہیں ٹہل ٹہل کر شعر کہہ رہا تھا کہ مولوی سید علی بلگرامی یہ کہتے ہوئے سیدھے وہاں پہنچ گئے کہ میں کسی کے روکے نہیں رک سکتا، یہ ان سے پہلی ملاقات تھی

یہ قصیدہ جب جلسہ میں پڑھا گیا تو ایک سماں بندھ گیا تھا، اس قصیدہ کے شروع میں اس دور دراز سفر کی غرض کی تمہید، پھر مسلمانوں کی تباہ حالی کی تصویر اور اس کے بعد علیگڑھ

کی تعلیمی تحریک کی تشریح ہی آخر میں دربار میں پہنچے اور باریاب ہونے کا کیا اچھا مرقع کھینچا ہ

پس بفرمودۂ دانش ز علی گڈھ آخر — کاروان شد سوے اقلیم دکن راہ گراے

بہ نیایش بہ درِ دولتِ سلطان فہیم — ہم بہ فرمانِ ادب پشت نمودیم دوتاے

از پیِ کرنش و تسلیم بہ آدابِ نیاز — عرضِ مطلب ننمودیم و ستادیم بپاے

شاہ از لطف اشارت بہ نشستن فرمود — امر چون فوقِ ادب بود نشستیم بجاے

پس ازاں محمد شاہ عماد الدولہ — کہ دبیریست ہنرپرور و معنی پیراے

با ادب آمد و توقیعِ ہمایوں بخواند — ما ہمہ گوش برآوازش و افگندہ سراے

شہ بدستور گرامایہ فرستاد پیام — کاینک آن مبلغِ پیشینہ دو چندان فزاے

بسکہ زیں مژدۂ جاں بخش بخود بالیدیم — غنچہ ساں در برِ ما تنگ ہمی گشت قباے

چون بہ پاداش ز اندازۂ خواہش بخشید — بیش ز اندازۂ خواہش دہدش اجر خداے

شاہ تنہا نہ کرم کرد و نوازش فرمود — کہ شدیم از ہمہ اعیانِ دکن بہرہ رباے

آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ — بازوے دولت و دستورِ شہِ ملک آراے

واں وقار الامرا زبدۂ اعیانِ دکن — آں ہنرپرور و دانا دل و فرخندہ لقاے

پایۂ ما بفزودند و کرم فرمودند — شکرِ این منتِ احسان چہ توان کرد اداے

شایگاں گشت تقاضی و ازیں چارہ نبود — خوشتر آن ست کہ اکنون کنم آہنگِ دعاے

یارب آں باد کہ شہ با ہمہ اعیان و وزیر — تا بود باشد و گردوں بدرش ناصیہ ساے

بعد ازیں چند دعاہا کہ پذیرد ز خدا — خویش را گرچہ دعا یاد کنم نیست بجاے

یعنی از نسبتِ آں شاہ گرامی باشم
شہ نظام ست و بہ زیبد کہ نظامی باشم

مقطع میں حضور نظام کے لقبِ شاہی کی مناسبت سے نظام اور نظامی کی کیسی اچھی مناسبت پیدا کی ہے،

مولنا شبلی اپنی نظمیں جس دلکش انداز میں پڑھتے تھے، وہ بیحد مؤثر تھا، یہ قصیدہ پڑھا تو در و دیوار سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہوگئی، نواب وقار الامراء نے اپنے محل فلک نما میں مولنا حالی اور مولنا شبلی کو بلا کر دوبارہ اُن کے قصیدے سنے، اور بیحد متاثر ہوئے، اور آخر حضور تک یہ روداد پہنچی، اور مولنا سے سنا ہے کہ خود اعلیٰ حضرت نے مولنا سے اس قصیدہ کو اپنے سامنے پڑھواکر سننا چاہا، مگر ریاستوں میں ہر چیز سیاست اور سازش بنجاتی ہے، دراندازوں نے یہ زور لگایا کہ یہ تجویز عمل میں نہ آسکی،

حیدرآباد سے واپسی کے وقت نواب سید علی حسن خاں مرحوم خلف نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اصرار سے چند روز یہ قافلہ بھوپال ٹھہرا، وہ کیونکر ٹھہرا، اور کیسے ٹھہرا اس کی تفصیل اس حیثیت سے خاص دلچسپی رکھتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے سرسید اور علی گڈہ تحریک کی نہایت سخت مخالفت تھی، گو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کا اس سے ایک سال پہلے ۱۸۹۰ء میں انتقال ہوچکا تھا، مگر شاہجہان بیگم مرحومہ والیۂ بھوپال خود نواب صاحب مرحوم کے اثر سے سرسید کی تحریک کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں، ایسی حالت میں سرسید اور اُن کے رفقا، کا یہاں ٹھہرنا سخت مشکل کام تھا،

میں نے نواب علی حسن خاں مرحوم کے عزیز خاص خواجہ سید رشید الدین صاحب مودودی کو جو اُن دنوں وہیں نورمحل میں رہتے تھے، یہ پوری روداد اس طرح سُنی ہے،

بھوپال میں قیام

اس زمانہ میں بھوپال نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے علماء وفضلاء کا مرکز تھا، نواب صاحب مرحوم اور دوسرے علماء کے نزدیک سرسید کا نام لینا بھی جرم تھا اور والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ بھی اسی خیال کی تھیں، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادہ حسام الملک صفی الدولہ نواب سید محمد علی حسن خاںصاحب کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ فطرت کی طرف سے مذاقِ سلیم لے کر آئے تھے، فارسی کے خود بھی شاعر تھے، اور شعروسخن کے قدردان بھی تھے، پہلے پہل اسی تعلق سے مولانا شبلی کا نام اُن کے کانوں تک پہنچا، اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں مولانا کی گذشتہ تعلیم اُن کی نظر سے گذری، اور اس کے بعد المامون اُن تک پہنچی، ان کتابوں کو دیکھ کر ان کی حالت ہی عجیب ہوئی، ان کتابوں کے متعدد نسخے چپکے چپکے ڈاک سے منگوائے جاتے اور قدردانوں میں تقسیم ہوتے، اس کے ذریعہ سے کالج کے ساتھ اُن کی دلچسپی اور ہمدردی بڑھتی گئی، اب ۱۸۸۸ء میں جب سرسید کا قافلہ بھوپال سے گذرا اور حیدرآباد سے کامیاب واپس ہوا تو نواب صاحب ممدوح نے منشی محمد امتیاز علی صاحب کے ذریعہ سے جو اُس زمانہ میں بھوپال میں وزیر تھے، بیگم صاحبہ کو یہ سمجھایا کہ سرسید اپنے عقیدہ میں کیسے ہی ہوں، مگر چونکہ بڑے بڑے انگریز حکام سے اُن کی دوستی ہے اس لئے ریاست میں ان کا مہمان ہونا انگریز حکام کی خوشنودی کا باعث ہوگا، اس رائے کو بیگم صاحبہ نے بھی پسند فرمایا اور واپسی میں سرسید

اور ان کے رفقا کو بھوپال میں سرکاری مہمان بنا کر روک لیا گیا، اور بیگم صاحبہ اُن سے ملنے پر راضی ہوئیں، ملاقات میں سرسید نے قوم کی بیکسی اور تباہی کی ایسی پُردرد تصویر کھینچی کہ وہ بے اختیار ہوگئیں، اور کالج کو دس ہزار روپیہ اپنی طرف سے اور دس ہزار اپنے جاگیرداروں کی طرف سے عنایت کیا، اور سرسید ہنسی خوشی علی گڈھ روانہ ہوئے،

مولنا شبلی مرحوم یہاں نواب علی حسن خاں صاحب کے پاس ٹھہر گئے، اس وقت اُن کے علم و فضل کے یہ نئے مناظر علما میں اچنبھے کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، شہر کے اکثر علما، اور شعرا نے اُن سے ملاقاتیں کیں، دن دن بھر یہ صحبت اتنی طول کھینچی کہ مولنا گھبرا جاتے تھے، مولانا کی اور نواب صاحب کی یہی پہلی ملاقات تھی جو بڑھتے بڑھتے محبت اور قدر شناسی کی اخیر حد تک پہنچ گئی تھی، اور جس کے کچھ شواہد مکاتیب شبلی میں نواب صاحب کے نام کے خطوط میں نظر آئیں گے،

مولانا نے جو فارسی قصیدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا تھا وہ پہلی بار اسی سفر میں اور اسی بھوپال میں صاف ہوا اور چھپا تھا،

سلسلۂ علالت کا آغاز اور سفر کشمیر کا خیال اپریل ۱۸۹۲ء

علی گڈھ کی آب و ہوا مولنا کے مزاج کے موافق نہ تھی خصوصًا سرسید کے جس بنگلہ میں وہ رہنے لگے تھے وہ نشیب میں تھا، اور وہاں پانی رہتا تھا، اس لئے وہ جگہ ملیریائی تھی، اور مولنا کو ملیریا کی شکایت پیدا ہوگئی جس کے حملے اخیر اخیر تک ہوتے رہے، اس کا پہلا حملہ ۱۸۹۲ء میں شروع ہوا، چنانچہ یکم اپریل ۱۸۹۲ء کو وہ مولوی حمید الدین صاحب کے قلم سے لکھواتے ہیں، "تین چار مہینے سے

اگر ضبط نہیں رہتا، آج پانچواں دن ہے کہ بہت سخت بخار آیا، ایک سو چھ درجہ پر حرارت تھی پانچ دن تک یکساں حالت رہی، اور نہایت سخت تکلیف رہی۔ . . . . گو ذہن جو بہت سی کمزوری ہے تو کان سے بہت اونچا سننے لگا ہوں۔" (مہیج-۳۱) پھر ۵-اپریل کو لکھواتے ہیں:-" بخار کے دورے ہو جاتے ہیں، آج ڈاکٹر نے بڑے سروسامان سے بخار کے روکنے کے لئے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔" (مہیج ۳۲) ممکن ہے کہ مولانا کی نگاہ میں کشمیر کی تعریف میں عرفی کا یہ شعر رہا ہو،

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید　　　گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

مولانا کو خیال ہوا کہ اس سوختہ جانی کی حالت میں کشمیر کا سفر کیوں نہ کیا جائے چنانچہ ۵-اپریل ۱۹۱۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھواتے ہیں:-" میں انشاءاللہ اگر اچھا ہو گیا تو اسی مہینہ میں کشمیر جاؤں گا، اور ڈیڑھ دو مہینہ وہاں رہوں گا، اگر تم کشمیر تک چلو، تو ضرور چلے آؤ، سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہوگا تمہارے ذمہ، باقی اقامت کا خرچ میرے ذمہ، علاوہ میری ہمراہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں۔ یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں، اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئیگا مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے۔" (مہیج-۳۳) خاک کشمیر کی جاں بخش آب و ہوا کا قیاس کیجئے کہ عرفی اس کا تخیل ایک شاعر کو کتنا بدمست بنا سکتا ہے۔ اس کے پانچ دن بعد ۱۰-اپریل کو ان ہی عزیز کو لکھتے ہیں:" اپنے ارادہ سے جلد مطلع کرو، میں انشاءاللہ اسی مہینہ کے آخر میں روانہ ہو جاؤں گا . . . . . کشمیر میں جانے سے ممکن ہے کہ تمہارے ظاہری رنگ میں فرق آئے، یعنی شستوان از زنگی سیاہی دفع ہو جائے۔" یہ مزاح کی بہار بھی اس علالت میں اسی کشتِ زعفران کے

خیال کیا اثر ہے، مگر بہرحال اس سفر کی نوبت اس سال نہ آئی، تبدیل آب وہوا کی اس سے بہتر صورت نکل آئی یعنی صحت کے بعد مئی ۱۸۹۲ء میں روم وشام کے سفر پر روانہ ہو گئے، اور کشمیر کا سفر کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رہا،

سفر قسطنطنیہ مئی ۱۸۹۲ء | علمی شوق کے پورا کرنے کے لئے دور دراز مقامات کا سفر کرنا، اگرچہ ہمارے اسلاف کا قدیم ترین شیوہ تھا، لیکن موجودہ علمی دور کے تنزل اور انحطاط میں یہ صرف ایک افسانہ ہی افسانہ رہ گیا تھا جو ہمارے خون کے بجائے صرف ہماری علمی صحبتوں میں گرمی پیدا کر سکتا تھا،

تنگنائے اعظم گڈھ سے نکل کر اگرچہ علی گڈھ میں مولانا کے پرپرواز کے لئے ایک وسیع فضا مل گئی تھی تاہم کتابوں سے جو عشق ان کو پیدا ہو گیا تھا اس کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع فضا کی ضرورت تھی،

اب ان کو علمی تشنگی بجھانے کے لئے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہیں، سمندر درکار تھا، الفاروق جس کے لکھنے کے لئے وہ بیتاب تھے، اس کے لئے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس لئے مصر وشام، اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے کنگھالنے کی حاجت تھی،

اس کے علاوہ ان کے دل میں گذشتہ شاہانہ اسلامی شان وشوکت کی واحد یادگار ترکی کے ساتھ جو عقیدت ومحبت تھی، اس نے بھی ان کو مجبور کیا کہ وہ عمر میں ایک دفعہ دیار محبوب کی سیر کریں،

اپنے سفرنامہ کے دیباچہ میں وہ خود اپنے اس ذوق وشوق کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں،

"قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا۔" انھوں نے سنہ ۱۹۰۵ء میں قسطنطنیہ کے سفر کا ارادہ کیا، اور اپنے ساتھ اپنے ایک عزیز کو بھی لے جانا چاہا، چنانچہ ان کو ایک خط میں لکھا کہ:- "ہاں وہ ضروری امر جو اس خط لکھنے کا باعث ہوا یہ ہے کہ میں انشاء اللہ مئی سنہ ۱۹۰۵ء میں ضرور قسطنطنیہ روانہ ہو جاؤں گا، اور غالباً چھ مہینے وہاں قیام کروں گا میں چاہتا ہوں کہ تم ساتھ چلو، صرف راستہ تم کو تعلق نہیں، تم کو بلا تنخواہ چھ مہینے کی رخصت بھی مل سکتی ہے۔ تم اس تجویز کے ہر پہلو پر غور کر کے مجھ کو جواب لکھو، میرا سفر ہر طرح قطعی ہو چکا ہے۔" لیکن چند در چند اسباب سے اس سال یہ سفر ملتوی رہا، بلکہ یہ عزم ایک ضعیف سا خیال ہو کر رہ گیا، لیکن سنہ ۱۹۰۶ء میں اس سفر کی تکمیل کے چند قدرتی اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ دوبارہ اس خیال کو تحریک ہوئی، ان دنوں مولانا اکثر بیمار رہے، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آ کر تبدیل آب و ہوا کا ارادہ کیا، اور مکان وغیرہ کے بندوبست کے لئے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خطوط لکھے اور کشمیر کا خیال جیسا کہ گذر چکا زیادہ غالب تھا، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ آج ہی کل میں ولایت جانے والے ہیں، اب دفعۃً مولانا کو خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کی رفاقت خوش قسمتی سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے نہایت خوشی ظاہر کی، اور سفر کے ضروری کاموں میں کافی مدد دینے کا وعدہ کیا،

اس وقت جہاز کی روانگی کو کل تین چار روز باقی رہ گئے تھے، اعزہ و احباب نے

سنا تو سخت متعجب ہوئے، اور اکثروں نے کہا کہ اس عجلت اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کونسی دانشمندی کی بات ہے؟ لیکن مولنا کا جواب صرف یہ تھا۔

انچہ بارا بادمن کشتی در آب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی تھی اور مولنا کو تین مہینے کی رخصت کا مزید حق حاصل تھا، اس طرح چھ مہینے کی رخصت لی، اور ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۲۹-اپریل ۱۸۹۲ء کو علی گڈھ سے روانہ ہوگئے، بجانسی سے مسٹر آرنلڈ کا ساتھ ہوا، اور بمبئی پہنچکر حاجی محمد اللہ بن داؤد کے باغ میں قیام کیا،

بمبئی پہنچنے کے دوسرے ہی دن جہاز روانہ ہوگیا، پہلی مئی کی صبح کو نو بجے جہاز پر سوار ہوئے، بارہ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا، اور مولنا نے چھ مہینہ کے لئے ہندوستان کو خیرباد کہا، راستہ میں مسٹر آرنلڈ نے مولنا سے عربی پڑھنی شروع کی، اس سے جو وقت بچتا وہ دریائی سفر کے سیر تماشے میں صرف ہوتا،

مناظر کی خوش آیند دلچسپی نے شاعر کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کی، مولنا نے سفر کے حالات پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہنا شروع کیا، جو سفرنامہ اور کلیات دونوں میں موجود ہے،

۷ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا، عدن میں مولنا کو مسافروں کی دلچسپی کی ایک بڑی چیز یہ نظر آئی کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں، اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لئے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں،

اور کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے ہیں، اور نعلین بجاتے ہیں، اُن کا منشا کل یہ ہے کہ لوگ دوانی، چونی، پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے ہیں وہ سمندر میں پھینک دیتے ہیں اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، مگر ایک دردمند دل تھا جو اس منظر کو دیکھ کر بیتاب ہو رہا تھا، یہ مولانا شبلی تھے، مورخ اسلام کے دل کو ٹھیس لگی کہ وہ عرب جو کبھی دنیا کے فاتح اور کشور کشا تھے آج ان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے حریفوں کے سامنے مسخرگی کر کے پیٹ پالتے ہیں، یہ خیال آنا تھا کہ مولانا کی زبان سے بے اختیار "قم یا عمر" کے الفاظ نکل گئے بعد کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ عرب نہیں، سمالی ہیں تو تسکین ہوئی۔

۱۳ مئی کو جہاز سوئز پہنچا، خوانچے اور پھیری والوں میں سے ایک نے مولانا کو ہندوستانی سمجھ کر اردو میں گفتگو شروع کی، مولانا کو بڑا تعجب ہوا، اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی تو اردو کی عالمگیری پر اُن کو اور بھی تعجب ہوا (مجھے بھی ۱۹۲۰ء میں یورپ جاتے ہوئے پورٹ سعید میں یہی اتفاق پیش آیا، جب ڈونگی پر بیٹھ کر جہاز سے ساحل پر آیا اس کا ملاح بے تکلف اردو بولتا تھا، حالانکہ وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جہاز ہر روز یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، اُن ہی جہاز والوں سے ملنے جلنے میں ان سے یہ زبان سیکھ لی)

۱۴ مئی کو جہاز پورٹ سعید پہنچا، جہاز سے اتر کر جب مولانا نے ساحل پر قدم رکھا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور حیرت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ یہ حرمین محترمین کے بعد پہلا موقع تھا کہ انھوں نے سلطنت اسلام کی آبادی دیکھی، یہاں سے مسٹر آرنلڈ الگ ہوئے، وہ یورپ کو روانہ ہوئے

اور مولنا قسطنطنیہ کے جہاز پر سوار ہوے، یہان سے مولنا کی دلچسپی کا نیا سامان یہ پیدا ہوا کہ مسلمان اور شامی عرب مسافرون کی صورتین جہاز مین نظر آنے لگین، اتنے دنوں میں مسلمانون کی صورت کو ترس گئے تھے،

۱۵ مئی کو جہاز یافہ پہنچا جو شام کا ساحلی شہر ہے اور ۱۶ مئی کو بیروت، گو وقت نہ تھا مگر ایک ایسے اہم شہر کے دیدار سے محرومی جس کو خیال کی آنکھوں سے وہ تاریخ کے صفون پر بارہا دیکھ چکے تھے گوارا نہ ہوئی اور ایک آدمی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کر آئے، ۱۷ مئی کو جہاز سائپرس پہنچا جس کو عربی میں قبرص کہتے ہیں، قبرص وہ مقام تھا جو ایک اسلامی مورخ کی نگاہ میں دلچسپی کا بڑا سامان رکھتا تھا، مولنا اس کے شہر لیماسون مین اترے، سب سے پہلے جامع مسجد میں گئے مسجد ہی سے متصل ایک اسلامی مکتب نظر آیا، اس میں چلے گئے وہاں کے مدرس سے جو ایک عالم تھے ملے، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، اور ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا، اس نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو مولنا پر عجیب اثر ہوا، ان کو خیال آیا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان اور کہاں بحر روم کا یہ دور دراز جزیرہ، اس مقدس کلام میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برق رو ین کر دوڑ گئی،

۱۸ مئی کو جہاز روڈس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ بھی ابتدائی اسلامی تاریخ کا دلچسپ موضوع ہے، اسی لئے مولنا اس کی سیر کے بہت مشتاق تھے، لیکن، اتفاق سے رات کا وقت تھا اس لئے اس کی سیر سے محروم رہ گئے، ۲۰ مئی کو صبح کے وقت ازمیر (سمرنا) پہنچے اور یہاں جہاز دو روز تک مقیم رہا اور مولنا نے تفصیل کے ساتھ یہاں کی سیر کی جمعہ کی نماز

جامع حصار میں پڑھی، مسجد سے متصل ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر اس کتب خانہ میں گئے، وہاں چند علماء، اور ترکی محکمۂ تعلیم کے کچھ افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور ملتزم کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، یہ لوگ فارسی سمجھتے تھے، اُن کی اجازت سے مولانا نے اس مسئلہ پر ایسی عمدہ تقریر کی کہ سب نے پسند کی۔

یہاں سے ۱۰ رمئی کی شام کو روانہ ہو کر ۲۳ رمئی کو صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، اور قلیون اور ملاحوں کی کشمکش سے رہائی حاصل ہونے کے بعد ایک کشتی میں بیٹھ کر کنارے آئے، اسی کشتی میں شیخ عبدالفتاح سے اُن کی ملاقات ہوئی، اور یہی اتفاق ملاقات اُن کی تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی، دونوں نے ساتھ سرائے میں جا کر قیام کیا، چھ سات دن تک اس سرائے میں رہے، پھر باب عالی کے پاس ایک اچھا مکان کرایہ پر لیا، اور چند روز کے بعد دوسرا مکان لیا، اور اخیر تک اسی میں مقیم رہے،

شیخ عبدالفتاح جن سے مولانا نے دوستی پیدا کی تھی شام کے ایک خاندانِ مشائخ سے تھے جن کو ہندوستان سے بھی ایک طرح کا تعلق تھا، حضرت خالد نقشبندی جو خالد رومی کے نام سے بھی مشہور ہیں، وہ ملک شام سے ہندوستان آکر دہلی میں حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمۃ کے مرید ہوئے تھے، اور یہاں سے نقشبندی طریقہ کی تعلیم پا کر اپنے وطن واپس تشریف لے گئے، اور ہندوستان کی اس دولت کو روم و شام میں جا کر لٹایا، اور نقشبندیہ طریقہ کو جاری کیا، شیخ عبدالفتاح کا نام سن کر اُن کی زیارت کے لئے شامی عربوں کا گروہ در گروہ آنا شروع ہوا، اور اس ذریعہ سے مولانا کی ملاقات بھی ان سے ہونے لگی، ان ہی آنے والوں

میں ایک نوجوان شامی عالم شیخ علی ظبیان تھے، ایک دن وہ شیخ عبدالفتاح سے ملنے آئے تو مولنا بھی پاس ہی بیٹھے تھے اور سامنے مولنا کی عربی تصنیف اسکات المعتدی رکھی تھی شیخ علی ظبیان کی نظر اس پر پڑی تو کہا "آہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا، اور انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا شکر اللہ مساعیہ" شیخ علی ظبیان کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس رسالہ کے مصنف یہی ہیں تو اٹھکر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مولنا کو اس بات سے کہ ان کی ایک معمولی سی تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے تحسین و قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی شیخ علی ظبیان سے مولانا کے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے، اور وہ اس سفر میں ان کے بہت مدد و معاون ثابت ہوئے چند روز کے بعد انھوں نے مولنا سے منطق پڑھنی شروع کی، ان کے ساتھ فواد بک وغیرہ چند اور نوجوانوں نے بھی شرکت کی،

کتبخانوں کی سیر

اس سفر سے مولنا کا اصلی مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا قسطنطنیہ میں کتب خانے بہت دور دور واقع تھے، مولنا ایک ایک کتبخانہ، اور ہر کتب خانہ کی ایک ایک نایاب کتاب جو ان کے مقصد سے تعلق رکھتی تھی دیکھتے پھرتے تھے، اور اس غرض سے ان کو روزانہ تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا تھا لیکن وہ نہایت جنسی خوشی کے ساتھ روزانہ یہ تکلیف اٹھاتے تھے، اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ان کتب خانوں کی سیر کرتے رہتے تھے، چنانچہ قسطنطنیہ سے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں۔" (مسرسید ۱)

یہاں جو کتابیں نظر سے گذریں، اُن میں سے سرسید کو ان کے فلسفیانہ مذاق کے مطابق جن تصنیفات اور مصنفوں سے باخبر کیا ہے اس کا تھوڑا سا حال سرسید کے نام کے خطوں میں ہے۔ ۲۲- مئی کو وہ قسطنطنیہ پہنچے اور تین ہی روز کے بعد ۲۵- مئی کو وہ اُنھیں خط لکھتے ہیں: "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ دو تین سو یا اس سے زیادہ روپے بھیج دیں کہ جو کتاب جس وقت ہاتھ آئے لے لی جائے، یا نقل و کتابت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابیں یہاں بہت ہیں اور نادر ہیں، لیکن کہاں تک لکھوائی جا سکتی ہیں، امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں، اور بو علی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں، ....

ابن رشد کی کتابیں یہاں بھی نہیں۔"

پھر ۱۵- جون ۱۸۹۲ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، (یعنی خریدنے کے لئے نہیں ملیں) مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، صرف مطبوعہ کتابیں خریدی جا سکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتدبہ ہے، یہاں امام غزالی کی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات[1] کا نسخہ بھی ہے، بو علی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کے اصلی ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں...... معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبد القاہر جرجانی کی تفسیر ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں۔"..........

۵- جون ۱۸۹۲ء کو اپنے والد ماجد کے نام لکھتے ہیں: "کتابیں یہاں عجائب و غرائب ہیں لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہو سکتیں، نہ حافظہ ان کے لئے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل

[1] سرسید نے مکاتبات امام غزالی کا جو نسخہ شائع کیا ہے، کیا وہ وہیں سے منگوایا گیا تھا۔

زیادہ سفر کرتا ہوں، کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں، ماموں صاحب سے فرما دیجئے کہ تکمیل یہاں عینی بخاری کی شرح چھپ رہی ہے، نو جلدیں چھپ چکیں، نہایت عمدہ چھپ رہی ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ بعض تحقیقات ان میں ایسی ہیں جو فتح الباری میں نہیں مل سکتیں، قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی، ایک مشترکہ کمپنی ڈیڑھ دو لاکھ کے سرمایہ کی ہے جس نے عظیم الشان مطبع قائم کیا ہے، اسی میں یہ کتاب چھپ رہی ہے۔

سفرنامہ میں مولانا نے یہاں کے کتب خانوں کے علمی سرمایہ پر جو رائیں ظاہر کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتب خانوں میں کیا کیا دیکھا، فرماتے ہیں:۔ "میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے دنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے یہ بھی غنیمت ہے" اسی سلسلہ میں ابن سینا کی حکمت مشرقیہ کا ذکر کیا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ "مشہور حکما اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بوعلی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہیں، اکثر یہاں موجود ہیں" اسی سلسلہ میں مولانا نے تاریخ و ادب کی حسب ذیل نادر کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسرار البلاغہ جرجانی، دلائل الاعجاز جرجانی، البیان والتبیین جاحظ، تذکرہ ابن حمدون، معجم الادبا یاقوت، کتاب الاشراف بلاذری، تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب القضاۃ وکیع، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ الاسلام ذہبی، تاریخ الحکما قفطی، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم ابن جوزی، مرآۃ الزمان سبط ابن جوزی، مسالک الابصار ابن فضل اللہ عمری، عقد الجمان بدرالدین عینی، تاریخ دمشق ابن عساکر، رحلۃ ابن خلدون، نہایۃ الادب نویری، طبقات کبریٰ ابن سعد

طبقات الامم صاعد اندلسی، سیرۃ العمرین ابن جوزی، کتاب الصناعتین عسکری، شرح تبریزی بر حماسہ، دیوان ابونواس کمل، سرقات المتنبی ابن عمید، مجموعہ رسائل ابواسحاق صابی وغیرہ۔

کیا زمانہ کی نیرنگی ہے، جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے یہ محنت شاقہ اٹھائی تھی، وہ ان ہی کے زمانہ سے چھپ کر عام ہونے لگی تھیں، اور اب تو شاید اُن کی ان پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ چھپی ہو، ایک مختصر اور تاریخ کبیر بخاری تھی وہ بھی دائرۃ (المعارف) حیدرآباد میں چھپ رہی ہے، تاہم اس سے مولانا کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر فن میں ان کی نگاہ انتخاب اُسی پر جاکر رکی جو انتخاب کے قابل تھی، اور وہ مولانا ہی تھے جنھوں نے اِن کتابوں کے ناموں سے ہندوستان کو سب سے پہلے روشناس کیا،

الفاروق کے لئے جن کتابوں سے معلومات ان کو مل سکتے تھے، اُن کو مطالعہ کیا، اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاۃ محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں، اور مصنف نے الفاروق کے مقدمہ اور حاشیہ میں بھی اس کی تصریح کردی ہے،

مدارس کا معائنہ

کتب خانوں کے بعد یہاں کے مدارس دیکھنے کی چیز تھے اور مولانا کو جو شوق و ذوق یہاں تک کھینچ کر لائی تھی اس میں اس چیز کا مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھا، سفرنامہ میں فرماتے ہیں:- "اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا تو یہاں کی طرز تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا" چنانچہ اسی لئے اس پر بہ نسبت اور باتوں

کے زیادہ توجہ کی، اور جہاں تک ہو سکا اس کے لئے کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، وہ چند بار سررشتہ کے دفتر میں گئے، تعلیم کے افسروں سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے اسکول اور کالج خود جا کر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملے، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، وہ ہندوستان کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں تھے جو مسلمانوں کی نئی امیدوں کا مرکز تھی اور خود پرانی تعلیم کے مدرسوں کی پیداوار تھے، اس لئے دونوں کے حسن و قبح سے واقف تھے، اور یہ جاننے کے لئے بیتاب تھے کہ اس ملک میں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے قدیم و جدید کو کس طرح پیوند دیا گیا ہے، لیکن جب یہاں پہنچکر انھوں نے دیکھا کہ یہاں بھی قدیم و جدید کے درمیان وہی حد فاصل قائم ہے تو ان کے دل کو چوٹ لگی، ایک خط میں مرتیہ کو لکھتے ہیں:۔ افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے، اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پرتو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا جدا رکھے گئے ہیں، اور جب تک یہ ڈانڈے نہیں ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکیگی، یہی کمی ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے، نئے طریقہ کے جو اسکول اور کالج تھے مولانا نے ان کو ایک ایک کر کے دیکھا، مکتب حربیہ (ملٹری کالج)، مکتب الحقوق (لا کالج)، مکتب الصنائع (ٹکنیکل کالج)، مکتب بحریہ، مکتب الزراعۃ (ایگریکلچرل کالج)، مکتب سلطانی، مکتب ملکیہ (سول سروس کالج) وغیرہ میں گئے، وہاں طلبہ کے رہنے سہنے کے طریقوں کو خود سے دیکھا، ان کے بورڈنگ کے انتظام اور طرز طریق پر غائر نگاہ ڈالی، اور ان میں جو باتیں قابل ذکر تھیں ان کو سفرنامہ میں ذکر کیا ہے، تاکہ وہ کالج میں رائج کی جائیں۔

اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ " یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو

بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے، اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے، مجھکو یہ بات بہت پسند ہوئی، ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے" مولانا حالی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا، اور اس کے رواج دینے کی کوشش کی، اس وقت کالج میں جس یونیفارم کا رواج ہے وہ اسی تجویز کی ادھوری تعمیل ہے، حیات جاوید میں لکھا ہے۔ "پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لئے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے، یونیفارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہوسکا، لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہوس میں آکر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے ہمچشموں کو دیکھ کر خود بخود ترکش لباس اختیار کرلیتے ہیں" (ص ۲۰۵ ج ۲)

اسی طرح مولانا سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں: "ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے، اور دولت مند ترکوں کی طرف سے اُن کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کرسکتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جاکر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کرسکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے، اور غرباء کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے، بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا، اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا۔ . . . . . میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع

خوراک، مکان، فرنیچر کا ٹھیک ٹھیک کر دیا جائے، اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹادی جائیں
اگر یہ نہیں تو کالج میں تو تربیت کی روح نہیں۔" (سفرنامہ ۹۰) مکتب ملکیہ یعنی سول سروس کے
کالج میں جب وہ گئے ہیں تو اتفاق سے ظہر کی نماز کا وقت آگیا، اس وقت کوٹ پتلون
میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے، وہ سماں مولانا پر اثر کر گیا، لکھتے
ہیں:- "اس اثنا میں ظہر کا وقت آگیا، مسلمان ترکوں نے نماز کی تیاری کی، عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے
تھے، اور اس لباس میں اُن کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا، اور وقار واحترام کے ساتھ قطار
در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی قیود سے آزاد
ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے۔" (ص ۹۲) ترکی کے مصنفین اور ادباء
سے بھی ملاقاتیں کیں، اور جدید ترکی ادب کا جو سرمایہ پیدا ہوا تھا اس کا بھی اندازہ لگایا،
یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور علمی رسائل دیکھے، اور ان کی ظاہری شکل وصورت،
چھاپہ کی خوبی، ٹائپ کی خوبصورتی، صفائی، اور مضامین کے تنوع اور بلندی سے اُن کو خوشی
ہوئی، مگر یہ دیکھکر افسوس کیا کہ حکومت نے سیاسیات کے میدان کو اتنا تنگ اور محدود
کر دیا ہے کہ اس نمک کے بغیر وہاں کا ہر بہتر سے بہتر کھانا بھی بدمزہ ہو رہا ہے،

یہاں ہر طرف ترکی زبان کا ماحول دیکھ کر مولانا نے ترکی پڑھنی شروع کی، چنانچہ اپنے
والد کو لکھتے ہیں:- "ترکی پڑھنی میں نے شروع کر دی ہے، دیکھئے پوری بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔"
ملا محمد آفندی موصل کے رہنے والے ایک مترجم جو فارسی اچھی طرح جانتے تھے، مولانا
نے ان ہی سے ترکی سیکھنی شروع کی، مولانا نے گو سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جو ٹوٹی پھوٹی ترکی میں نے

ان سے سیکھی تھی وہ بھی اب محفوظ نہیں، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی ترکی سیکھ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک استاد زادہ مولنا محمد امین صاحب چریا کوٹی خلف مولنا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کو اس زبان میں اپنا شاگرد بنایا، اور وہ بعد کو ترکی اچھی طرح سیکھ گئے، اخیر اخیر زمانہ تک مولنا کا یہ حال تھا کہ ترکی اخبار ہم لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے، اور عربی لفظوں کے سہارے سے اُس کا کچھ حاصل نکال لیتے تھے،

یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر مولنا کو جو خوشی ہوئی اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر اُن کو تکلیف ہوئی، بلکہ یہاں تک اُن کی رائے ہوئی کہ موجودہ پرانی تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی، (سفرنامہ ص ۴۸)

قسطنطنیہ میں مولنا کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طالب علم بیس ہزار سے کم نہ تھے، مگر سب کی حالت افسوسناک تھی، اُن کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک، صحن مختصر، مکانات بند بند، ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ و خیرات، بایں ہمہ مولنا نے ان مدارس کو دیکھ کر ترکوں کی اس علمی فیاضی کا اعتراف کیا کہ وہ ہر چند کم حیثیت سہی، تاہم آج سینکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے، اور انصاف یہ ہے کہ یہ مدرسے جب زمانہ کی یادگار ہیں اُس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کریباے خود ایک اقلیم ہے، حکومتِ اسلام کی شش صد سالہ مدت کی

ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں، (سفرنامہ ص۳۶)

اس تفاوتِ حال کا سبب تو ظاہر ہے کہ ترکوں کی اسلامی سلطنت باقی تھی اور ہندوستان کی مٹ چکی تھی، بہرحال یہ تو دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قدیم مدارس کی اس حالت کو دیکھ کر اُن کو بڑا رد ہوا، آج ترکی میں جو مذہبی و تمدنی انقلاب برپا ہے، وہ حقیقت یہ ہے کہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری کا نتیجہ ہے اور ہر قدیم کو مٹا کر ہر جدید کی طلب کا جو شوق جنون کی حد تک مصطفیٰ کمال پاشا کے دور میں پیدا ہوا وہ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدیم و جدید تعلیم کے درمیان تطبیق کی کوئی کوشش اتنے زمانہ تک وہاں نہیں کی گئی، میں نے اپنے سفر افغانستان میں افغانستان کے وزراء اور امراء کی خدمت میں یہی عرض کیا تھا، اور اسی نتیجہ سے اُن کو ڈرایا تھا،

مولانا کے دل کو ترکی میں جس دوسری چیز سے تکلیف پہنچی وہ یہ تھی کہ یہ ساری رونق یہ ساری چہل پہل، یہ ساری ترقی جو کچھ تھی وہ سلطنت کے دم سے تھی، اس میں ترکی قوم کی کوشش دخل اور جد و جہد کا کوئی حصّہ نہ تھا، وہ اسی طرح سُست و ساکن اور بے خبر تھی جیسی خود ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم، یہ دیکھ کر ان کے دل پر جو اثر ہوا، اس کو سفرنامہ میں ان لفظوں میں لکھتے ہیں:

"سیاسی تمدن کا، یہی اثر ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزادخیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے.......اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ.......تمام کالج اور اسکول جن کا ہیچ ذکر کیا حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولتمند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہوسکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں جب قوم کی تمام فرقے

کورنش انجام دیا کرتی ہے، اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بے کار ہو جاتی ہیں۔

مولانا کی دوررس نظر نے ترکی کی جس بیماری کا اُن دنوں احساس کیا تھا، اسی کا علاج
مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی حکمت اور تدبیر سے کیا یعنی ترکی سلطنت کو ترکی شہنشاہی سے
نہیں، ترکی قوم کے ذریعہ سے زندہ کرنا۔ البتہ اس راہ میں مصطفیٰ کمال سے جو بے اعتدالی ہوئی اُس
کا افسوس ہے۔

قسطنطنیہ کے سفر میں جو چیز انھوں نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ محکوم اور حاکم ملکوں کا
تفاوت، اور غلام اور آزاد قوموں کی ذہنیتوں کا فرق ہے، وہ خود ایک غلام ملک کے باشندے
تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ
چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی، اور اپنی زبوں حالی
کا احساس اور قوی ہو گیا، تاہم جب اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں
میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روحِ مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوا ہوگا
دلِ بیتاب سے جوشِ سرور کی جو موجیں اٹھتی ہیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ
کو رسم سلاملق کا دلفریب سماں اور عید کے موقع پر موکبِ سلطانی کا پُرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور
تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بیخودی سی چھا جاتی، مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں
موکبِ سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے، جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا ایک چھلکتا
ساغر ہے، اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس ۔۔۔ خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

تندے بود خسرو انجم ہنوز   دیدۂ من باز و بجز انجم ہنوز

مگر یہ کیفیت کیوں تھی، کیا محض اس لئے کہ دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار کے نظارے نے ان کو مرعوب کر دیا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس جاہ و حشم کے آئینہ میں اُن کو اسلام کی حیاتِ ملی کا تابناک چہرہ نظر آ رہا تھا، عیدگاہ میں جہاں سلطان کی آمد کا سماں دکھایا ہے فرماتے ہیں:۔

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید   مہر جہاں تاب خلافت دمید

قاعدۂ دولت و دیں را مدار   آئینۂ رحمت پروردگار

شاہ فلک کوکبہ عبد الحمید   ایدک اللہ بنصرٍ مزید

فرۂ شاہی بہ جبیں آشکار   حاشیہ پوساں بہ یمین و یسار

آگے چل کر دعائیہ اشعار میں اُن کے جذبات اور نمایاں ہو جاتے ہیں،

جز تو کہ ہست ای خسرو انجم سپاہ   آنکہ بود شرع نبی را پناہ

تازگی بدر و حنین از تو ہست   زیب و طراز حرمین از تو ہست

چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است   زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

یہ نظم دراصل نہ شخصی مدح تھی، نہ ممدوح کو سنا کر صلہ حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی بلکہ قومی حیات کی رجز خوانی تھی اور ملی تفاخر کا جوش تھا جو بے ساختہ زبانِ قلم سے تراوش کر گیا ہے،

بزم سلاملق دیکھنے کے بعد موقف پر جو کیفیت طاری تھا اس کی تصویر ان کے سفر نامہ سے زیادہ ان کے ایک مکتوب میں ہے، جو مکاتیب میں شامل ہے، یہ خط چونکہ عین اسی دن لکھا گیا ہے اس لئے

اس سے ان کے تاثر کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ۱۵ جون ۱۹۰۵ء کے خط میں اپنے والدؒ کو لکھتے ہیں۔

قبلہ ام!

آج میں نے عجیب دلآویز خواب دیکھا ہے "عجیب" اس لئے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں، اور دلآویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے، مفصل سنئے، آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق موکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا، میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا، جامع حمیدیہ میں داخل ہوا، سلطان المعظم بڑی شوکت و شان سے آئے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا، کیونکہ یہ سیر صرف ان لوگوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو گذرگاہ سلطانی پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور پھر نماز کے ختم ہونے تک جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔

محل سلطانی سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک نہایت پرتکلف جامع مسجد ہے جو سلطان کے نام سے حمیدیہ مشہور ہے، اس گذرگاہ میں ایک مکان ہے، اور دور دور ملکوں سے آئے ہوئے معزز سیاح یا عہدہ دار جو موکب ہمایونی کی سیر کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی معزز شخص کے ذریعہ سے اجازت حاصل کرتے ہیں، اور اس مکان کی چھت پر بیٹھکر یہ تماشا دیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے، کیونکہ سواری کے وقت دور تک چاروں طرف فوج کا دائرہ ہوتا ہے، اور کوئی شخص اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا، حسین حبیب آفندی (سابق سفیر بمبئی) نے مجھ کو اجازت

۱؎ جنگ روم و روس میں مولانا نے چندے ان ہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ بھیجے تھے، یہی ذریعۂ تعارف تھا۔

دلانے کا وعدہ کیا تھا، مگر اتفاق سے وہ دیر میں آئے، ادھر سواری کا وقت قریب آگیا اور طرّاق
اور دور باش کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مجبوراً میں مسجد میں داخل ہوا، اور صفِ اوّل میں
جا کر بیٹھا۔ سلطان کی گاڑی زینہ تک آتی ہے اور وہ اتر کر فوراً مسجد کے بالائی حصّہ پر جہاں
نہایت مقرب اور مخصوص لوگوں کے سوا کوئی نہیں جا سکتا تشریف لے جاتے ہیں، وہاں
ایک مقصورہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے منبر کے بائیں طرف ہے، یہ سلطان کی نماز کی جگہ ہے
جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اور کوئی شخص ان کو
دیکھ نہیں سکتا۔ خطیب نے جب سلطان کے مقصورہ کی طرف نگاہ اٹھا کر بڑے جوش سے یہ کہا
اَللّٰھُمَّ انصر مولانا السلطان الغازی عبد الحمید خان تو میرے بے اختیار
آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور دیر تک دل کا یہ حال تھا کہ امڈا چلا آتا تھا۔ خطیب نے پہلے
صحابہؓ کا نام پڑھا اور سلطان کا نام آیا تو ایک زینہ اتر آیا تاکہ ظاہر ہو کہ سلطان اگرچہ آج خلیفہ
ہیں، تاہم ان کا رتبہ حضرت صدیقؓ و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔ نماز کے
بعد حسین حبیب آفندی نے اتفاقاً مجھ کو دیکھ لیا اور مسجد کے صحن میں جہاں پاشا اور سردارانِ
فوج حلقہ باندھے کھڑے تھے لے جا کر کھڑا کر دیا اور لوگوں سے کہہ دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے
سلطان مقصورہ سے اتر کر زینہ کے قریب پردہ کے اوٹ میں بیٹھے اور فوجیں سامنے سے
گذرنی شروع ہوئیں، دو گھنٹہ کامل ایک عجیب تماشا نظر آتا رہا، تقریباً دس ہزار فوج تھی، مختلف
رسالے اور ہر رسالے کے تمام ساز و اسلحہ جدا جدا تھے، میں کیا کہوں، ترکی جوانوں کی دلیرانہ
صورتیں، چمکتے ہوئے اسلحہ، موزوں اور باقاعدہ رفتار، گھوڑوں کی جست و خیز، پاشاؤں کا

زرکار، لباس جگمگاتے ہوئے تھے، عجیب سماں تھا جو کسی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا، اخیر میں دونوں شہزادے آئے، بڑے کی عمر دس برس کی ہو لیکن جس شان و شوکت سے وہ گھوڑے پر سوار تھا بڑے بڑے دلیروں کے وہ تیور نہیں ہو سکتے، فوجیں گذر چکیں تو سلطان گاڑی میں سوار ہوئے اور ہمارے سامنے سے گذرے، سواری مقابل آئی تو تمام حلقہ نے رکوع کے قریب جھک کر سلام کیا، سلطان دونوں ہاتھوں سے اُن کا جواب دیتے تھے، یورپ کے اکثر معزز اشخاص یہ تماشا دیکھنے آئے تھے، حالانکہ یہ معمولی چیز ہے اور ہر جمعہ کو ہوتی ہے، عید کے دن کہتے ہیں کہ قیامت کا سماں ہوتا ہے، خدا وہ دن بھی دکھلائے،

خدا نے یہ دن بھی اُن کو دکھایا، اس دن سلاملق نہ تھی، اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی لیکن شان و شوکت، جاہ و جلال، جوش و اثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، قریباً ۸ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تماشا بندھا رہا، اس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد، یکایک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں معلوم ہوا کہ تمام وزراء، پاشا، افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدہ دارانِ ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زریں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس، تمام میدان جگمگا اٹھا، یہ صف جا چکی تو سلطان کا جاہ و جلال آرا نظر آیا، گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ

آہستہ قدم اٹھاتا تھا، اور ہر قدم پر اس زور سے پادشاہم چوق یشا (زندہ باد) کا نعرہ بلند ہوتا تھا کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا، مولانا عید کا یہ سماں دیکھ کر واپس آئے تو اُن کا دل شاعرانہ جذبات سے معمور تھا، چاہا کہ جو تماشا انھوں نے دیکھا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھائیں، مثنوی عید یہ کے نام سے یہ نظم ان کے سفرنامہ اور کلیات میں درج ہے، اسی مثنوی کے وہ چند شعر ہیں جو اوپر گذر چکے

مولانا کا یہ سفر جیسا خاص علمی اور تعلیمی مقصدوں کے لئے تھا، ویسے ہی اُ سنے بھی نے انکی عزت افزائی کا ایک ایسا سامان پیدا کر دیا جس کے حصول کی کوشش کیا وہم و گمان بھی کسی غیر ملک کے آدمی کو نہیں ہو سکتا تھا، اور جس کے عطا میں اعتراف کمال کے سوا دینے والے کی کوئی سیاسی مصلحت بھی نہیں ہو سکتی،

جنگِ روم و روس کی وجہ سے شیر پلونا غازی عثمان پاشا کا نام اُن دنوں بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اور اس جنگ سے جو ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس لئے قسطنطنیہ پہنچ کر اس نامور ترکی سپہ سالار کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوا، یہی کشش ان کو غازی موصوف کے در دولت تک کھینچ لے گئی،

پہلی ملاقات کے بعد پاشا نے موصوف نے مولانا سے دوسری ملاقات کی خواہش کی، مولانا نے دوسری بار اُن سے ملاقات کی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تپاک سے ملے اور کہا کہ جب یہاں سے جاؤ گے تو مجھ سے مل لیجئیگا، اسی اثنا میں انھوں نے مولانا کے لئے سلطان سے تمغۂ مجیدی کے عطا ہونے کی درخواست کی تھی، اور وہ منظور بھی ہو گئی تھی، لیکن مولانا کو خود اس کی خبر نہ تھی، ایک دن دوپہر کے وقت مولانا اپنے مکان میں سو رہے تھے، کہ اکے

ایک دوست دوڑے ہوئے آئے اور مولنا کو جگا کر کہا یا شبلی واللہ لقد طلع لک النشان
مولنا کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا لیکن قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو یہ خبر صحیح نکلی، دوسرے
دن تمام احباب مبارکباد دینے آئے، اور مولنا نے اس خوشی میں ایک مختصر سا جلسۂ دعوت
ترتیب دیا، دعوت کی صبح کو مولنا عثمان پاشا کی ملاقات کو گئے تو سب سے پہلے دربان نے کہا
"تمغۂ مجیدی مبارک" پاشائے موصوف نے بھی ملاقات کے ساتھ ہی مبارکباد دی، تمغہ سامنے
میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا، پھر مولنا کے حوالہ کیا،
مولنا سروقد کھڑے ہوگئے اور سلطان کو دعا دی، رخصت کے وقت پاشائے موصوف
نے مولنا کو اپنی عکسی تصویر بھی عنایت کی، تمغہ کے ساتھ ایک فرمان بھی عطا ہوا جو سفرنامہ
میں نقل ہے،

اس تمغہ اور فرمان کے ملنے کی تاریخ ۱۴ محرم سنہ ۱۳۱۰ھ ہے، مولانا نے ہندوستان پہنچکر بھی
اس تمغہ کو استعمال کرنا چاہا لیکن گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ۲ مئی سنہ ۱۸۹۰ء کے قانون کے مطابق
اس کی اجازت نہیں دی،

قسطنطنیہ سے روانگی قسطنطنیہ میں مولنا قریب تین مہینے تک رہے، ان تین مہینوں
کا ہر روز کسی نہ کسی کتب خانہ یا کالج یا مدرسہ کے دیکھنے میں صرف ہوا جس کے تفصیلی حالات
سفرنامہ میں مذکور ہیں، یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں، اس سے فراغت ہوگئی تو یہاں سے
طبیعت ایسی اچاٹ ہوئی کہ قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھویں رات کو جو سلطان کی تخت
نشینی کی رات ہے بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، لیکن مولنا اس کا بھی انتظار نہ کرسکے،

اور ۹ محرم ۱۳۳۰ھ کو چل کھڑے ہوئے،

بیروت! ساتویں دن بیروت پہنچے اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہے، بیروت میں قیام کی اصلی وجہ شیخ طاہر مغربی کی ملاقات کا شوق تھا، یہ شیخ رہنے والے تو شمالی افریقہ کے کسی ملک کے تھے، مگر زیادہ تر یہ مصر اور شام میں رہتے تھے، یہ زندہ کتب خانہ تھے قلمی کتابوں اور کتبخانوں کی نادر کتابوں کے نام اُن کی نوکِ زبان تھے، اُن کی یادداشت (کناشہ) میں ہر کتب خانہ کے نوادرات کے نام درج تھے، توجیہ النظر وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں،

بیروت خود بھی اس وقت شام میں شامی عرب عیسائیوں کی جدید علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز تھا، علمی انجمنیں، ادبی مجلسیں، اور نئے علوم و فن کے کالج، اچھے اچھے عربی مطبعے قائم تھے، جن سے عربی ادب کی عمدہ عمدہ کتابیں چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اور ان ہی مطبعوں سے عربی اخبار اور رسالے نکل رہے تھے، اور عربی زبان میں نئے علوم اور نئے نئے خیالات کے اضافے ہو رہے تھے، مولانا نے ان سب پر غائر نظر ڈالی اور وہاں کی علمی ترقیوں سے پوری واقفیت حاصل کی جس کا پورا مرقع سفرنامہ میں موجود ہے،

بیت المقدس بیروت سے مولانا کے شامی دوست شیخ علی ظبیان اپنے والد کے اصرار سے دمشق چلے گئے، اور مولانا نے ۰۔ صفر ۱۳۳۰ھ کی شام کو بیت المقدس کی راہ لی اور وہاں پہنچکر وہاں کے ہندوستانی زاویہ میں قیام کیا، اور وہاں کی مقدس عمارتوں کی زیارت، اور وہاں کے مفتی شہر سید طاہر اور دوسرے علماء و فضلا سے ملاقاتیں کیں، اور بعض مجلسوں

میں علمی مسائل پر گفتگو کی یہاں سے فارغ ہو کر مصر کا رُخ کیا، اور اسکندریہ سے ریل پر بیٹھ کر قاہرہ پہنچے

قاہرہ

قاہرہ میں مولانا نے مصر کے قدیم تعلیمی مرکز جامع ازہر میں رواق الشامیین کے ایک حجرہ میں قیام کیا، اور وہاں ایک مہینہ سے زیادہ مقیم رہے چونکہ قاہرہ قدیم وجدید دونوں قسم کی تعلیم کا مرکز ہے، اس لئے مولانا نے یہاں کے نظامِ تعلیم کو نہایت غور سے دیکھا، اور ان کو نظر آیا کہ جو مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے، اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے مولانا کو صرف ایک کالج جس کا نام دار العلوم تھا نظر آیا جو مولانا کے خیال میں دونوں ذاتوں کو ملانا چاہتا تھا، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پوری طور پر کامیاب نہیں ہوا تھا، دار العلوم کے علاوہ مولانا نے متعدد مدرسے اور کالج مثلاً مدرسۃ الحقوق، مدرسۃ الترجمہ، مدرسۃ الطب وغیرہ دیکھے اور اُن کے متعلق مفید و مستند معلومات حاصل کیں۔

مصر میں سب سے زیادہ مولانا کی دلچسپی کی جو چیز تھی وہ جامع ازہر تھا، مولانا نے اسی میں قیام کیا تھا لیکن دورانِ قیام میں وہ جس نتیجہ پر پہنچے اس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے، "مجھ کو تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو جس کے طالب علموں کی تعداد ۱۰ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امیدیں ہو سکتی تھیں لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے، اور کرتا جاتا ہے تربیت سماعت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں، اس سے حوصلہ مندی کی بلند نظری، جوش، ہمت، خوش

تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں جن کے عزیز اور نہایت قریب
عزیز (چچا ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے معزز عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل
بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں اس لئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا
شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دناءت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسے کی ترکاری خریدتے
ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ براس سیدنا الحسین یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم ویسی
قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے
ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں ازہر ان سے بھی گیا گذرا ہے، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری
کا ہے یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے، اور دونوں کے لئے متعدد کتابیں مقرر ہیں
منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی
و بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایان نہیں۔" مدارس کے ساتھ
مولانا کا ایک بڑا مطمح نظر کتب خانے تھے، مصر میں سب سے بڑا کتب خانہ کتبخانہ خدیویہ تھا جو اب
کتبخانہ مصریہ کہلاتا ہے، مولانا نے اس کو جا کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ "ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت
حسن انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے" اس وقت اس کتب خانہ
میں ہر علم و فن کی چودہ ہزار سات سو پانچ عربی کتابیں موجود تھیں (اب تو اس کی تعداد اس سے
دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے) مولانا نے اس کتب خانہ کو بڑی تفصیل سے دیکھا، اور ہر علم و فن
کے نوادر کتب کی ایک فہرست مرتب کی جو ان کے سفرنامہ میں موجود ہے، تاریخ اور ادب کی
جن نادر کتابوں کو مولانا نے اس وقت چنا تھا، ان میں سے اکثر آج کل چھپ چکی ہیں، البتہ تفسیر

اور حدیث کی جن کتابوں کے نام لئے ہیں ان میں سے اکثر اب تک غیر مطبوعہ ہیں،

مدارس اور کتب خانوں کے ساتھ مولانا نے مطابع، اخبارات، انجمن، کلب، اور مصر کے عجائبات وغیرہ دیکھے، مصر میں قدیم و جدید تعلیم ساتھ ساتھ جاری تھی اور دونوں تعلیم کے ارکان وہاں موجود تھے، مولانا نے اس موقع کو غنیمت جان کر دونوں سے ملے، نئے تعلیم یافتوں میں سے علی پاشا مبارک، علی پاشا ابراہیم، امین بک فکری، اور حمزہ فتح اللہ سے اور پرانے تعلیم یافتوں میں سے شیخ حمزہ فتح اللہ اور شیخ محمد عبدہ سے خاص طور پر ملے، اور ان سے عربی تعلیم اور عربی مدارس کے نظام پر گفتگو کی،

مصر میں عربی زبان پر جو نئے انقلابات آئے، اور نئے خیالات، نئی چیزوں، اور نئی باتوں کے لئے جو نئے عربی الفاظ بن گئے تھے یہاں مولانا کو ان کی واقفیت کا پورا موقع ملا، اور غالباً ہندوستان کی عربی دنیا میں عربی کے نئے نئے الفاظ کی واقفیت کا پہلا براہ راست ذریعہ مولانا ہی کی ذات تھی، مولانا نے اپنے سفرنامہ کے آخر میں بہت سے نئے الفاظ کی فہرست شامل کر دی ہے،

صحت پر عمدہ اثر مولانا کے اس سفر کی ایک ضمنی غرض صحت کی بحالی تھی، بحمد اللہ کہ اس سفر میں یہ غرض بھی پوری ہوئی، مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے، ایسی تندرستی پھر ان کو نصیب نہیں ہوئی،[1]

واپسی اور سفر کے تاثرات اور نتائج مولانا کا یہ علمی سفر مصر میں تمام ہو گیا، وہ وہاں سے سیدھے ہندوستان تشریف لائے، اخیر اپریل ۱۸۹۲ء سے ان کا سفر شروع ہوا تھا، اور اسی

[1] سفرنامہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء،

سال کے شروع نومبر میں ختم ہوا، ان چھ مہینوں میں دنیائے اسلام کے ان ممتاز حصوں کو دیکھ کر جن کو اسلام کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے مولانا کے حساس دل کو اسلام کی گذشتہ علمی یادگاروں کو دیکھ کر جہاں مسرت ہوئی وہیں مسلمانوں کی موجودہ پست حالت کو دیکھ کر ان کو بڑا رنج ہوا، قسطنطنیہ ہی میں مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر مولانا نے اپنے والد ماجد کو لکھا: "اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی و قوت کی نسبت بالکل برباد ہو گئی ہیں کیونکہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں، تاہم سفر بے شبہ ضروری تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا، افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہو جاتی ہے۔"

ان فقروں سے اندازہ ہوگا کہ کیا چیز ان کو ہندوستان سے کھینچ کر اس بحر و بر اور دشت و جبل میں لے گئی تھی، ان کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی، اور طریقہ تربیت اور درسگاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو، اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بندوبست نہ ہو تو کم از کم عربی درسگاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر رہیں، اور نصاب میں متاخرین کی شروح و حواشی کے بدلے قدماء کی اصل کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں، درسگاہیں عالیشان، رہنے کے گھر صاف ستھرے، اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی، حوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو، لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں، سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا"

مولانا کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام و دستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (دستور) جس کو سیاح روم و شام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے، اس کو نظر آئے گا کہ روم و شام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے اپنے سفرنامہ کے شروع میں اپنے اس سفر پر خود تبصرہ کیا ہے جس سے بہتر تبصرہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، فرماتے ہیں، "ٹرکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا بیان ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے، معمولی دوکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جاتی ہے، نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے، پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے، اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں، ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجائے

کل قوم پر دسی حیف الاعجب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اسی پر قانع ہی موجودہ حالت تو یہ ہے وَلَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔

کالج میں خیر مقدم | کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی ترقیت کا یہ پہلا سفر تھا، اس نے جب مولانا ہندوستان واپس آکر کالج میں پہنچے تو واپسی سفر کی مبارکباد میں متعدد جلسے منعقد ہوئے، سب سے پہلے ۱۲ نومبر ۱۸۹۳ء کی شام کو اسکول اسٹاف کی طرف سے مولانا کو ایک دعوت دی گئی جس میں سرسید اور کالج کے پروفیسر بھی شریک تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے ایک مختصر تقریر میں مولانا کے دور دراز سفر سے بخیریت واپس آنے کا شکرانہ ادا کیا اور مولانا کے حوصلے ہمت اور سفر کی تکالیف کی خوشی خوشی برداشت کی تعریف کی، اور ان کے اُن احسانات کا ذکر کیا جو ان کی تحقیقات علمی سے قوم اور قومی کالج کے لئے متصور تھے، اور آخر میں مولانا کو تمغۂ مجیدی ملنے پر مبارکباد دی، ان کے بعد چودھری خوشی محمد خاں ناظر نے جو ان دنوں وہاں فورتھ ایر کلاس میں پڑھ رہے تھے، مندرجۂ ذیل نظم پڑھی،

بازوقت گرمی بزم سخن آید ہمی | جبل گم گشتہ در صحن چمن آید ہمی
زینت ہر بزم و زیب انجمن آید ہمی | آں ادیب و شاعر و شیریں سخن آید ہمی

واپس آئے سیر روم و شام و مصر و زنگ سے | آشیاں، جبل کو لایا سیکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیئے | تپ کی شدت تھی مگر گوشین کا کر چل دیئے
بجز احباب سے دامن چھڑا کر چل دیئے | ایک فقرے کو بھی ڈھارس بندھا کر چل دیئے
ہرچہ باد ا باد من کشتی در آب انداختم | خانہ بر موج سمندر چوں حباب انداختم

اس کے بعد ۲۔ دسمبر ۱۸۹۲ء کو کالج اسٹاف کی طرف سے مولنا کو ایک شاندار ڈنر دیا گیا جس میں مولنا نے ایک ترکیب بند پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں :۔

قاصد خوش خبر امروز نواساز آمد	کہ سفر یار سفر کردہ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید	یا مگر بلبل شیراز بشیراز آمد
دوستاں مژدہ کہ آں بلبل خوش لہجہ کہ بود	اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد
رفت ہر چند بسے بے سروساماں ازما	شکر ایزد کہ باایں برگ باایں ساز آمد

پورا قصیدہ کلیات میں موجود ہے۔

سفر نامہ کلیات اور رسائل

۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۶ء تک

سفر نامہ — اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کا تقاضا ہوا کہ سفر کی سوغات لایئے یعنی سفر نامہ لکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے دوران سفر میں تو مولنا کو یہ خیال تھا کہ وہ اپنا سفر نامہ ترتیب دیں گے چنانچہ ۹۔ مئی ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں سرسید کو لکھتے ہیں :۔ " حالات دلچسپ ہیں اور سفرنامہ کے لئے بہت سامان مل جائے گا " (سرسید ۔ ۱) لیکن واپسی کے بعد مولانا نے احباب کے اصرار کے باوجود اس خیال کو ترک کر دیا ۱۳۔ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں :۔ " سفرنامہ کے لئے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہو گئی ہے لیکن میرا ارادہ اب تک لکھنے کا نہیں ہے جس کے متعدد اسباب ہیں " (اسحاق ۔ ۲۰) مولانا نے ان اسباب کی تشریح نہیں کی لیکن

ان متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب کا ذکر سفرنامہ کے شروع میں کیا ہے یعنی یہ کہ سفرنامہ کے لئے جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی حالت، انتظام کا طریقہ عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق مستند واقعات ہیں، اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں جس قدر ہونے چاہئیں، غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے، وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہے ان کی دعوت میں یہ ماحضر پیش ہے۔

لیکن ان اسباب میں سے جو اصلی سبب تھا اس پر اب بھی پردہ پڑا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس کے زمانہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی ترکی کے ساتھ بڑھ رہی تھی حالانکہ اس جنگ میں انگریزوں نے ترکوں کا ساتھ دیا تھا، اور ان ہی کے اشارے سے ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کے لئے چندے کئے تھے، اور بڑا جوش پھیلا تھا، پھر بھی انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی کے ساتھ یہ عقیدت دل سے پسند نہ آئی، اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کی ہمدردی سراسر یونانیوں کے ساتھ تھی، مگر کامیابی ترکوں کو نصیب ہوئی، اس کامیابی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر معمولی خوشی ہوئی، اور تمام ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے اس کی خوشی منائی گئی جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کا منہ چڑھایا گیا، اسی لئے سرسید نے جو ہر حال میں انگریزوں کو راضی رکھنا چاہتے تھے، مسلمانوں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے، اور اس کے خلاف بہت سخت مضمون لکھا، اور

اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے ترکی کی عقیدت جاتی رہے، اور اتحاد اسلامی کی جو تحریک جڑ پکڑ رہی ہے وہ کمزور پڑ جائے،

مولانا کا ترکی کا سفر خواہ کتنے ہی علمی پردہ میں چھپا ہو، پھر بھی اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ہندوستان، اور ترکی کے درمیان تعلقات کی پہلی کڑی تھی، اور مولانا اسلامی ہندوستان کے پہلے سفیر تھے، جو ترکی گئے،

قسطنطنیہ کے قیام کے زمانہ میں اپنے جوش و خروش کو پوری طرح دبانے کے باوجود وہ شیر پلیونا جنرل عثمان پاشا تک پہنچ ہی گئے، اور وہاں سے تمغہ مجیدی کا تحفہ ہندوستان لائے اس واقعہ نے اندر ہی اندر انگریزی حکومت کے ارباب بست و کشاد کو چراغ پا کر دیا، آپ جب مولانا واپس آئے تو اسلامی ہندوستان کے سیاسی مصلحت شناسوں کے حلقہ میں یہ سمجھا گیا، کہ معلوم نہیں اس سفرنامہ میں کیا کیا زہر ہو اور اس کا اثر کالج کی زندگی پر جو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی کیسا پڑے،

بہرحال جب یہ طے ہو گیا کہ اس سفرنامہ میں شہد ہی شہد رہیگا کوئی زہریلی چیز نہ ہوگی تو اس کے لکھنے کی اجازت ملی، اور وہ لکھا گیا، ۲۶- مارچ ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں: "میں آج کل سفرنامہ لکھ رہا ہوں"۔ (مسیح ۲۳) اسی لئے یہ سفرنامہ خالص علمی اور معاشرتی پہلوؤں تک محدود رہا، پھر بھی یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس سفرنامہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ترکی کی محبت کا بیج نہیں بو دیا، اور اسی لئے انگریزوں نے مولانا نے اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کیا جس کی تفصیل آگے کہیں آئیگی،

مولانا کو خیال تھا کہ اس دور کے سفرنامہ سے لوگوں کو پوری دلچسپی نہیں ہوگی، اسی لئے اس کی مقبولیت کی طرف سے دل میں شبہ تھا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں: "معلوم نہیں اس سفرنامہ سے ملک کو کہاں تک دلچسپی ہوگی، اس کا اندازہ ہو تو اسی حساب سے جلدیں چھپیں۔" اب تک مولانا کی ساری تصنیفات کالج نے اپنی طرف سے چھپوائی تھیں، مگر یہ سفرنامہ ان احتیاطوں کے باوجود بھی شاید اس بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ٹھہرا، اس کا پہلا اڈیشن مفید عام آگرہ میں جو اس زمانہ کا اچھا مطبع تھا ۱۹۰۳ء میں چھپا۔ مہدی افادی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو لکھتے ہیں: "سفرنامہ میرے پاس کہاں ہے، گو میں آج سفر میں تھا، اب علی گڈھ پہنچا ہوں، لیکن صرف اس کی جلدیں یہاں نہیں رہیں، اگر وہ کہیں ہو جس وقت کہتے ہیں دیں گی فوراً تعمیل ارشاد ہوگی، آپ وارث ہیں۔" (مہدی افادی ص ۹۰) یہی وہ کتاب ہے جس سے کالج اور مولانا کی تصنیفات میں ھذا فراق بینی و بینک کا اصول جاری ہوا، اور "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی" کی پرانی شریعت منسوخ ہوئی۔

کلیاتِ فارسی [illegible] ابھی اس زمانہ کو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے، جب فارسی کا ایک دیوان اس عہد کے اہل ذوق کے سلسلۂ تصنیفات کی پہلی کڑی ہوتی تھی، اسی لئے مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے جمع اور طبع کرنے کا خیال بہت دنوں سے تھا، مگر چونکہ طبیعت میں ابھی جھجک باقی تھی، اس لئے چاہا کہ سارا کلام استاد کی نظر سے گذر جائے۔ کالج میں جانے کے دوسرے ہی سال، ۲۰ مارچ ۱۸۸۴ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھا: "میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا، اس واسطے اگر آپ اسے دیکھ لیں تو بہتر ہے، حضرت موصوف نے منظور

فرمایا ہے: میرے پاس جو کلام ہے وہ میں بھیجدوں گا، مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمھارے پاس ہیں، نہایت جلد مولانا کے پاس اس نشان سے بھیجدو، بیاض، عدالت خفیف: مولانا کی شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ ایک بیاض میں جمع تھا، مولانا نے غازی پور میں ایک جلد ساز کو وہ بیاض جلد باندھنے کو دی تھی اور وہ وہاں سے غائب ہو گئی، لوگوں کو غازی پور کے ایک نوجوان فارسی شاعر ابوالقاسم محتشمی مرحوم پر شبہہ تھا جو بعد کو حیدرآباد میں شعرا کے سلسلہ میں منسلک ہو گئے تھے، اور جوانی ہی میں وفات پائی، لوگ کہتے تھے کہ وہ ان ہی نظموں کو حیدرآباد میں اپنے نام سے سناتے پھرتے تھے۔[1]

پھر اسی قسم کا واقعہ ۱۹۰۶ء میں پیش آیا، اور کسی نے مولانا کی بیاض کے آدھے حصہ پر ڈاکہ ڈالا، ۸ جولائی ۱۹۰۶ء کو ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "میری بیاض کا تقریباً آدھا حصہ چوری ہو گیا، نہایت افسوس ہے" (مکاتیب ۲/۲) مولانا نے کالج میں آکر جو قصائد لکھے اور خصوصیت کے ساتھ سفر روم میں جو نظمیں لکھیں اس نے فارسی کے اہلِ ذوق میں آگ سی لگا دی، اردو میں نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولانا حالی نے ڈالی ہو یا شمس العلماء آزاد نے، مگر ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی، اور اس میں نئے خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آبحیات بن گئی،

[1] یہ روایت میں نے جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب (برادر نسبتی نواب علی حسن خان) سے سنی جو مولانا کے پرانے دوست ہیں۔

مولنا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی کے شاعر اور اس زبان کے جوہری تھے، مولنا کو لکھا کہ وہ ان انمول موتیوں کا ہار اہلِ نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں: مولنا نے یہ سمجھ کر شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس خط کا برا مانا اور ان کو لکھا کہ ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے۔ نواب صاحب نے دوبارہ لکھا کہ مقصود یہ نہیں ہے بلکہ آپ کی متفرق نظموں کے جمع اور طبع کرنے کی تحریک کرتا ہوں۔ مولنا نے ان کی اس تجویز کو پسند کیا، نواب صاحب نے ان کے کلام کا جو حصہ جمع کیا تھا ان کے پاس بھیج دیا، کچھ اخباروں سے جمع ہوا، اپنے وطن میں ایک عزیز شاگرد کو ۲۶۔ مارچ ۱۹۰۸ء کو یہ لکھا:- "میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لئے گیا، اور امید ہے کہ جلد تیار ہو جائے، اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہو سکا اشعار جمع کئے گئے ہیں کہ کوک بلکہ جامع نواب

سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں مرحوم ہیں،

میاں مہدی کے واپس آنے پر میں نے مشن اسکول کے جلسہ کے لئے ایک نظم لکھی تھی۔ "آمدہ" اس کی ردیف ہے اگر تم اس کو بہم پہنچا کر بھیجدو تو وہ بھی چھپ جائے، تمہارے ذریعہ سے اگر اس مجموعہ میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہو تو اضافہ کرو، لیکن اس کے ساتھ جلدی شرط ہے کیونکہ عید تک چھپکر شائع ہو جانا مقصود ہے (صفحہ ۱۰۹) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سے کچھ سرمایہ نہیں نکلا، آمدہ والی نظم بھی دیوان میں شامل نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم بھی نہ مل سکی، مہدی مرحوم اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے تھے اسی لئے اسی زمانہ میں یہ نظم لکھی گئی تھی[2]

[1] بروایت جناب خواجہ سید رشید الدین صاحب [2] اس نظم کے دو شعر مہدی مرحوم کی تعلیم کے سلسلہ میں

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے قصداً اپنے کلام کا انتخاب بڑی بے دردی سے کیا، اور صرف وہی نظمیں اور غزلوں کے وہی شعر لئے جو ان کے انتخاب میں آئے۔ جیسا کہ دیوان کے حصۂ تشبیب و غزل کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ "چہ گم" والی غزل کے بھی دو ہی شعر لئے اور نہ خود انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کی چھپی ہوئی بعض نظمیں اس میں جگہ پا سکیں؛ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مدحیہ نظمیں جو صرف کالج کے خیال سے بعض امراء کے خیر مقدم یا مرثیہ میں لکھیں، وہ چونکہ طبع غیور پر بار تھیں، اس لئے ان کو بقائے دوام کا خلعت پہنانا نہ چاہا،

بہرحال اس قطع و برید کے بعد ایک مختصر سا "مجموعۂ نظم شبلی" مرتب ہوا، اور منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس سے جو ان دنوں اپنی صفائی اور چھپائی کے حسن و خوبی میں ممتاز تھا، بڑے اہتمام سے چھپا اور اہلِ ذوق میں مقبول ہوا۔

رسائلِ شبلی

۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک مولانا کے قلم سے بہت سے محققانہ تاریخی مضامین نکلے اور ملک کے مشہور رسالوں میں چھپے، یہ مضامین زیادہ تر مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے متعلق تھے، ان میں یا تو اسلام کے آئینہ سے اس گرد و غبار کو صاف کیا گیا ہے، جو یورپین تعصب کی آندھی نے اس پر ڈالا تھا، اور یا مسلمانوں کے عہد تہذیب کے مرقع کی کوئی پرانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴) اوپر لکھے گئے ہیں،

خار در دیدۂ عدو شکنی — حاسداں را جگر گداز آئی

ما بنادیدہ در ربت باہم — گر تو ناگہ ز در فراز آئی

عجب نہیں کہ اسی نظم کے چند اشعار کو خفیف رد و بدل کے ساتھ عطیہ فیضی بیگم کے سفر یورپ کے موقع پر ان کو لکھ کر بھیجے تھے جو خطوطِ شبلی میں موجود ہیں،

تصویر جو نگاہوں سے اوجھل ہوچکی تھی، دوبارہ منظر عام پر لائی گئی ہے،

یورپ نے تمام علمی دنیا میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انھوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتبخانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے وہاں قائم تھا جلا کر خاک کردیا، اور دنیا گذشتہ انسانی دماغوں کے معلومات سے محروم ہوگئی، مولانا نے اس کی تردید میں ۱۸۹۲ء میں کتب خانہ اسکندریہ پر مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہوچکا تھا، اور مسلمانوں کی فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، اس لئے یہ مسلمانوں پر سراسر افترا ہے، اور اس افترا کا بانی چھٹی صدی ہجری کا ایک عیسائی مورخ ابو الفرج ملطی ہے، اس مضمون کے ساتھ مسٹر کریل وغیرہ بعض یوروپین مستشرقوں کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شائع ہوئے، جن میں مسلمانوں کے سر سے اس الزام کی تردید کی گئی تھی، یہ مضمون اتنا جامع اور مدلل تھا کہ مخالفین تک کو بھی اس کے ماننے سے چارہ نہ رہا، اس مضمون کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا،

مولانا کے اس مضمون کے بعد سے خود یورپ کے عیسائی فاضلوں نے اس الزام کی تردید میں بہت سے فاضلانہ مضامین لکھے ہیں، جن میں اکثر کے ترجمے الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڈھ، اور دکن حیدرآباد وغیرہ میں شائع ہوچکے، اور اب کوئی لکھا پڑھا آدمی اس الزام کو نہیں دہراتا،

اسی سال ۱۸۹۲ء میں حیدرآباد دکن کے مشہور علمی رسالہ حسن میں اسلامی کتبخانوں کی تاریخ پر مولانا کا محققانہ مضمون شائع ہوا، اور معلوم ہوا کہ دنیا کے کس کس حصہ میں مسلمانوں

نے علم و فن کی کتنی دولت جمع کی تھی، رسالہ کے دستور کے مطابق مولنا کو اس مضمون پر ایک اشرفی انعام ملی،

۱۸۹۵ء میں علی گڈھ میگزین کی اڈیٹری کی ذمہ داری جو مولنا کے سر ڈالی گئی، اس سے مجبور ہو کر بھی مولنا کو اس زمانہ میں متعدد مضامین لکھنے پڑے جن میں ایک اسلامی حکومتین اور شفا خانے والا مضمون ہے، جو جولائی ۱۸۹۵ء کے میگزین میں چھپا، اور اسلامی سلطنتوں کے تمدنی شعبوں کے سلسلہ کا ایک حلقہ بنا،

مسلمان بادشاہوں پر بڑا الزام تھا کہ انھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا پر جزیہ کا ظالمانہ ٹیکس لگا کر بڑی توہین کی، ہندوستان کی تاریخوں میں بھی اس کو بار بار دہرایا گیا ہے، تاکہ ہندو کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت بیٹھ جائے، مولنا نے رسالہ "الجزیہ" لکھکر اس خوبی سے اس کی حقیقت واضح کی کہ علمی دنیا پر اس تحقیق سے حیرت چھا گئی، سر سید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا، اور خود مولنا نے اپنے قلم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس طرح مشرق و مغرب دنیا کے دونوں حصوں میں یہ آواز پھیل گئی، یہاں تک کہ مصر کے مشہور اخباروں، رسالوں اور تصنیفوں میں اس کے خلاصے اور اقتباسات چھپے،

۱۸۹۶ء کے شروع میں ترکی کے صوبہ آرمینیا میں بغاوت ہوئی، تو ترکوں نے اس کو بزور دبایا، اس پر یورپ کے اخباروں نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ اسلام نے ہمیشہ اپنی غیر مسلم رعایا پر ایسا ہی ظلم کیا ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں مسئلہ آرمینیا پر ایک سیاسی مضمون ۱۲- فروری ۱۸۹۶ء کے اخبار آزاد لکھنؤ میں چھپوایا، جس میں ترکوں کے عدل و انصاف

اور آرمینیا کے مسئلہ کی حقیقت ظاہر کی، ساتھ ہی اس عنوان پر کہ "اسلام کے قانون میں ذمی (غیر مسلم) رعایا کے کیا حقوق ہیں؟" ایک نہایت مفصل مضمون لکھی جو علی گڑھ میگزین کے مارچ اور اپریل ۱۸۹۴ء کے پرچوں میں چھپا، اور شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا،

الغرض ۱۸۹۸ء تک اس قسم کے اہم مضامین کا ایک مجموعہ فراہم ہوا، اور رسائل شبلی کے نام سے ملک میں شائع ہوا، مولانا کے قلم سے یکم فروری ۱۸۹۸ء کا لکھا ہوا مقدمہ اس میں لگا ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے کا کیا باعث ہوا، فرماتے ہیں:۔

"مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے اس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے؛ اگرچہ اس مقصد کے لئے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا لیکن چونکہ قوم کو حوصلہ اور غیرت دلانے کے لئے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا کہ تمھارے اسلاف نے یہ کارہائے نمایاں کئے تھے، تم کو بھی انہی کے نقش قدم پر چلنا چاہئے؛ اس لئے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ ان کو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا، رفتہ رفتہ ان پر فخر و ناز کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی، یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتدا ہوئی اور بعض بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے، لیکن چونکہ یہ ان کا اصلی کام نہ تھا اس لئے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا،

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جس میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں، اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کے ترجمے کئے، نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کس قدر بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم تعمیر کئے،

یہ رسالہ اگرچہ ناتمام تھا یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا، تاہم چونکہ ہماری زبان میں اس وقت تک اس مضمون کے متعلق اس قدر سرمایہ بھی نہیں دیتا ہوا تھا، نہایت مقبول ہوا، اور یونانی ترجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں،

قبول عام کی بنا پر مجھ کو خیال ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہو گیا ہے جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہو لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دھوکا تھا، مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخواں فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے، اس لئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے، خواہ مخواہ اس کو قبول ہو جاتا ہے،

اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود اس شور و غل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہے تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سینکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کئے گئے، اور کئے جاتے ہیں، نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا،

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجھ کو بالکل افسردہ کر دیا تھا لیکن یورپ میں جو اورینٹل کانفرنس قائم ہے اس کی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی، اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جس میں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی و عملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے، چنانچہ پہلے سال جو اس کا اجلاس ہوا اس میں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم ادب، فلسفہ اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ تیار کیا جائے، کانفرنس کے سلسلہ سے الگ یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے کہ مسلمانوں نے خاص علم

کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں۔ یہ دیکھ کر مجھ کو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں وہ درحقیقت ہمارا کام ہے، اور یہ ایک بے غیرتی کی بات ہے کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اٹھائیں۔ اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا، اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے۔"

مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تمدنِ اسلامی کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے، اور انہی کو دیکھ کر اسی رنگ (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) اُس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔

الفاروق کی تصنیف پر اختلاف رائے سنہ ۱۸۹۲ء

مولانا نے الفاروق لکھنے کا ارادہ اس سفر کے بعد ہی کیا تھا، بلکہ کچھ لکھ بھی لیا تھا، اور اس کی شہرت لوگوں میں پھیل چکی تھی، لیکن تاریخ طبری جو اس کے لئے بہت ضروری کتاب تھی وہ چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ دنوں کے لئے رُک جانا پڑا، سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں جو جنوری سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی، وہ رقم طراز ہیں:۔

"اس سفر کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتدبہ حصہ لکھ بھی لیا تھا، لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لئے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا، اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں، ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔"

کوتاہ بینوں کی جن بدگمانیوں کی تردید اس بیان میں مولانا نے کرنی چاہی ہے ان میں سے کم از کم ایک بدگمانی بے اصل نہ تھی، اور وہ کالج کی وہی مصلحت بینی تھی یعنی یہ کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعی کا فرق [illegible] دے۔ اُس زمانہ میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابلِ تعظیم نام نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کا تھا، سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ وہ شیعہ ہیں اس لئے یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب ہوگی، یہ بات اندر ہی اندر چل رہی تھی اور ہنوز فیصلہ نہیں ہو پایا تھا لیکن مولانا نے اس کے لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا، اس لئے وہ اس مصلحت پیش بیکار بند ہونا نہیں چاہتے تھے، بالآخر یہ طے پایا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب ممدوح کے سامنے کر دیا جائے، چنانچہ سرسید نے اُن کو خط لکھا، ان کا جواب جیسا کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا یہ آیا کہ "اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حیف ہو کہ اس کی سوانحعمری بھی نہ لکھی جائے" اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف و تحسین بھی کی۔

اتفاق سے سرسید کے خطوط میں نواب عماد الملک کے نام ایک خط مل گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نواب عماد الملک کو الفاروق کی تالیف سے جتنا اختلاف تھا، اس سے زیادہ خود سرسید ہی کو تھا، یہ خط کافی بڑا ہے، مگر پڑھنے کے لائق ہے، یہ خط ۱۰ مارچ ۱۸۸۹ء کا ہے

لے اس کی تائید مولانا شروانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں: "مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا مصمم ارادہ ترک فرما چکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو، عماد الملک نے جواب میں لکھا کہ اسلام میں دین و دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہے، لہذا ان کی سوانح لکھنے سے مولوی شبلی کو نہ روکئے، سرسید نے یہ خط مولانا کے سپرد کر دیا کہ وقت پر کام آوے، یہ واقعہ خود سرسید نے مجھ سے بیان کیا تھا۔

"شروانی"

ابتدائی تمہید کے بعد ہے،

" جناب مولوی شبلی صاحب کی نسبت جو فقرہ آپ نے تحریر فرمایا تھا، وہ میں نے ان کو سنایا، ان پر چار حالتیں گذریں، جب تک میں پڑھتا رہا حیرت میں رہے اور تردد رہا کہ درحقیقت یہی الفاظ لکھے ہیں پھر میں نے ان کو وہ خط دیا کہ اس فقرہ کو وہ خود پڑھیں، جب کہ انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی الفاظ ہیں تو ان کو ندامت اور افتخار اور مسرت تین حالتیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں، ندامت تو اس لئے تھی کہ وہ اپنے نزدیک اپنے تئیں اس لائق نہیں سمجھتے جس طرح ان کی نسبت آپنے اپنے خیالات ظاہر فرمائے، افتخار اس لئے تھا کہ آپ جیسے شخص نے ان کی تصنیفات کی اس قدر قدردانی، اور درحقیقت ان کا یہ فخر واجب تھا، طلاما وجہال کی واہ واہ سے نہ ان کا دل خوش ہو سکتا اور نہ کچھ فخر ہو سکتا تھا، بلاشبہ آپ کی قدردانی باعث فخر ہو سکتی ہے، مسرت ان کو بے انتہا اس لئے ہوئی ہو کہ چونکہ وہ آپ کی نیک طبیعت اور مزاج سے واقف نہ تھے ان کو دل میں افسوس تھا کہ آپ ان کی پہلی تحریرات سے کسی قدر ناراض ہیں، دفعتہً ان کا وہ خیال زائل ہوگیا، اور بے انتہا مسرت ان کو ہوئی میں نے آپ کا نام کسی قدر بے ادبی سے لیا، کیونکہ اس وقت جو میرے دل میں آیا اسی طرح آپ کا نام لینا ادب تھا، میں نے کہا تم سید حسین کو نہیں جانتے ہیں نے آج تک ان کا سا نیک دل اور پاک باطن ظاہر و باطن حاضر و غائب یکساں سچا دوست اور ہمہ تن سچائی کسی کو نہیں دیکھا۔ رنج و کدورت کی ان کے دل میں خدا نے جگہ ہی پیدا نہیں کی۔ . . . . الفاروق کی نسبت جو آپنے تحریر فرمایا وہ سب درست ہے، مگر اس کے ساتھ فیہ ما فیہ بھی ہے، اگر کسی کا دل ایسا مضبوط ہو کہ اس فیہ ما فیہ کو بھی صاف صاف مثل ایسے مورخ کے جو کچھ مذہب نہ رکھتا ہو لکھے تو بلاشبہ نہایت عمدہ بات ہو، مگر کیا مولوی شبلی ایسا کریں گے، اگر نہ کریں گے تو کتاب ردی ہوگی، یہی حال ہیل کا ہے، خلافت کی

نسبت بحیثیت انتظام ملکی کیا لکھا جاوے۔ اور کون کہہ سکتا ہے میں تو ان صفات کو جو ذات نبوی میں جمع تھیں دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوں، ایک سلطنت اور ایک قدوسیت، اوّل کی خلافت حضرت عمرؓ کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علیؓ و ائمہ اہل بیت کو، مگر یہ کہدینا تو آسان ہے مگر کس کو جرأت ہو کہ اس کو لکھے، حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا، حضرت ابوبکرؓ تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے پس میری رائے میں ان کی نسبت کچھ لکھنا اور صرف خانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے جو ہوا سو ہوا جو گذرا سو گذرا۔"

ان باتوں کے باوجود الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا، یہ دیکھکر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجۂ تام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے، چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں سیرۃ الفاروق کے نام سے ایک کتاب لکھکر بازار میں پیش کر دی، الفاروق کے مشتاقوں کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدنیتی پر محمول کیا، اس موقع پر سرسید نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہے جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے۔ "اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے، المامون، سیرۃ النعمان، کتبخانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں، اگر وہ خود باشندۂ رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کر کے

یہ کہیں کہ "فاتوا بسورۃ من مثلہ" تو کچھ تعجب نہ ہوگا، جزیہ کا احیا کیا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج
تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا، ان اجرہ الا علی اللہ، بایں ہمہ انہوں نے مثل علمائے متقدمین
یا خدا الذین لا ینظرون الی الدنیا وحطامها بل ینظرون الی رحمۃ اللہ ویرکا تھا اولی
حالۃ القوم وراصکاحها کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا، بلکہ بالکلیہ
مدرسۃ العلوم کو دیدیا، اور جب اُن کی حالت معاش پر نظر کی جاوے تو ان کی یہ فیاضی بھی بہت بڑا
اور اعلیٰ درجہ کی یادگار ہو جاتی ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، اور جب ایسے شخص نے
جو کیا بحیثیت علم اور کیا بلحاظ عمدگی تالیف اور کیا بنظر طریقہ ترتیب مضامین یادگار سلف ہو، الفاروق
لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور بہت کچھ اس کا سامان بھی جمع کیا تھا جس کا جمع کرنا نہ آسان کام ہے نہ ہر ایک
شخص کا کام ہے، اور ہنوز بہت کچھ جمع کرنا باقی ہے، تو ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب کو
بوجہ مناسب نہ تھا کہ اسی مضمون پر کتاب لکھ ڈالتے، بلکہ اُس رحمت کے منتظر رہتے جو خدا کو مولوی شبلی
کے ہاتھ سے ملک کو پہنچانی تھی،

ہیروز آف اسلام میں حضرت عمرؓ کی لائف کو لکھنا ایک بہت بڑا نازک کام ہے، ممکن ہو کہ انگی
لائف اس طرح پر لکھی جاوے جو انسانوں کے لئے باعث رحمت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ باعث
آفت ہو، یا اس طرح پر لکھی جاوے کہ دونوں فریق سنی و شیعہ کو بجز گالی کے اور کچھ حاصل نہ ہو،

سب سے مقدم یہ بات ہو کہ اول اس کا لکھنے والا شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کی قید سے اپنے
تئیں آزاد سمجھے، اور سچا ہسٹورین بنکر ان کی لائف لکھے یا یہ کرے کہ ان امور کو جو دونوں فریق میں متنازعہ
فیہ ہیں مطلق نہ چھیڑے، اور ان واقعات اور حالات کو اور ان کی اس خصلت اور انتظامی قوت کو اور اس برکت

کو مجھے جو ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی دنیا کو پہنچے جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

مشکل یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہو کہ اُس کے ہر ایک فعل کو دو پہلو نیک اور بد سے تعبیر نہ کیا جا سکے۔ یہ مشکل اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے، جب کہ کسی اکابر دین کی جیسے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں لائف لکھی جاوے۔ پس حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا، مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے جب کہ ان کی نسبت کوئی الزام بدنیتی کا دیا جاتا ہے۔ منشی سراج الدین احمد صاحب ایک نیک آدمی ہیں، قومی بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں، بیشک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی جو کام ان کو نہ کرنا چاہیے تھا انھوں نے کیا بلکہ وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا، بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے، مگر کسی بدنیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں، نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں، اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اسی مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا، بلکہ جب دونوں کتابیں چھپ جاویں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملے گا، اور یہ صادق آوے گا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ۔ یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بیدل ہو گئے ہیں، اب نہ وہ ہیروز آف اسلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے، اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہوں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہو گی، ان کو کیا پروا ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہو۔

مگر ہم مولوی شبلی کی اس رائے کو کہ بزرگان دین کو بھی ہیروز آف اسلام میں داخل کر کے ان کی

الفاروق لکھیں ہرگز پسند نہیں کرتے اور نہ اُن سے متفق ہیں، وہ لوگ فاروق آف اسلام ہیں نہ ہیروز آف اسلام، اور ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں ہم مولوی شبلی سے اصرار کر رہے ہیں کہ اپنا سفر نامہ ختم کرنے کے بعد الغزالی یعنی لائف امام غزالی کی لکھ دیں، جو نہایت دلچسپ اور بیحد مفید ہوگی، خدا ان کو توفیق دے کہ ہماری بات کو مانیں، اس کے بعد جو خدا کو منظور ہو وہ کریں، لیکن اگر اس کے بعد بھی انھوں نے الفاروق لکھی تو ہم اس وقت ان کو کہیں گے جو کہیں گے۔"

ان تمام حوصلہ شکن واقعات کے باوجود مولانا اپنے عزم سے باز نہ آئے، ۱۱ اپریل ۱۸۹۲ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "الفاروق انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا، لیکن وقت کی تعیین نہیں کر سکتا" (ج ۲، ۳۰)

آخر اگست ۱۸۹۳ء کو مصنف نے اس کتاب کے لکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیا، مولانا نے یہ واقعات الفاروق کے دیباچہ میں لکھے ہیں: "الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آگیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ بے اختیار پھیل گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک **الفاروق** کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رُک گیا، اور اس کے بجائے دوسرے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں، لیکن جو نگاہیں فاروق اعظمؓ کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں ان کو کسی دوسرے جلوہ سے سیری نہیں ہو سکتی تھی، سوء اتفاق یہ کہ الفاروق کی طرف بیدلی کے بعض ایسے اسباب پیدا ہو گئے تھے کہ میں نے اس تصنیف سے گویا ہاتھ

اٹھایا تھا، لیکن ملک کی طرف سے تقاضے کی صدائیں روز بروز اس قدر بلند ہوتی تھیں کہ میں مجبوراً قلم ہاتھ سے رکھ رکھ کر اٹھا لیتا تھا، بالآخر اگست ۱۸۹۴ء کو میں نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا اور مستقل اور مسلسل طریقے سے اس کام کو شروع کیا، ملازمت کے فرائض اور اتفاقی موانع وقتاً فوقتاً اب بھی سدِ راہ ہوتے رہے، یہاں تک کہ متعدد دفعہ کئی کئی مہینے کا ناغہ پیش آیا، لیکن چونکہ کام کا سلسلہ مطلقاً بند نہیں ہوا، آہستہ آہستہ کچھ نہ کچھ ہوتا گیا، یہاں تک کہ آج پورے چار برس کے بعد یہ منزل طے ہوئی اور قلم کے مسافر نے کچھ دنوں کے لئے آرام لیا،

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید　　　زورقِ اندیشہ بساحل رسید

شمس العلماء کا خطاب جنوری ۱۸۹۴ء

مولانا کی شہرت کا آفتاب اب نصف النہار کو پہنچ چکا تھا، اور لوگوں کو یہ علانیہ نظر آرہا تھا کہ ہمارے ملک کے اس نادرۂ روزگار کی قدر افزائی سلطانِ روم تو فرمائیں اور انگریزی گورنمنٹ ان کی قدرشناسی کی توفیق نہ پائے، اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں یہ بدگمانی پھیلی تھی کہ مولوی شبلی صاحب اتحادِ اسلامی کے مبلغ اور سلطانِ روم کے سفیر بنکر ہندوستان آئے ہیں اس لئے ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطانِ روم کے اس فرضی سفیر کو ممنونِ منت بنایا جائے، اس کے لئے ابتدا خود سرسید کی طرف سے ہوئی، ڈپٹی سید زین الدین صاحب (علی گڈھ) کا (جو اس وقت کالج کے اونچے درجہ کے طالب علم ہوں گے) یہ بیان ہے کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس فرض سے غافل رہے،

اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۳ء کو مولانا کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا اعلان کیا، مولانا کو شمس العلماء کا خطاب ملنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا جس کا خاص طور سے ذکر کیا جاتا، لیکن چونکہ سرسید کے کالج میں اس کے کسی پروفیسر کو سرکاری خطاب ملنے کا پہلا واقعہ تھا، اور سرسید کے رفقاء میں اس خطاب کی پہلی نظیر تھی[1]، اس لئے اس سے اپنے مقاصد کے اشتہار کا کام لیا گیا، اس وقت تک یہ خطاب بہتوں کو نہیں ملا تھا اس لئے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی اچھی خاصی وقعت بھی تھی، پھر مولانا کو جس سن و سال میں یہ خطاب ملا یعنی چھتیس سال کی عمر میں ان کے پیشرؤں اور ہمعصروں میں اتنی کم عمر میں کسی کو نہیں ملا تھا، ان مختلف اسباب نے مل کر اس کو ایک خاص اہم واقعہ بنا دیا، اور اس لئے تبریک و تہنیت کے بڑے بڑے جلسے ہوئے، جن میں ملک کے اکابر نے تقریریں کیں، معززین نے مختلف گوشوں سے مبارکباد کے تار اور خط بھیجے، اور اخباروں نے تہنیت کے مضامین لکھے،

کالج میں اخوان الصفا اور انجمن الادب دو علمی مجلسیں تھیں، اور مولانا ان دونوں کے رکن رکین تھے، اس لئے ان دونوں نے مل کر ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء کو ایک بہت بڑا جلسہ ترتیب دیا جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اکابر سرسید، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں، مسٹر بک پرنسپل، پروفیسر آرنلڈ (سکریٹری اخوان الصفا) اور (جسٹس) سید کرامت حسین جو اس وقت وہاں قانون کے پروفیسر اور مجلس اخوان الصفا کے رکن اور انجمن الادب کے صدر تھے شریک تھے حاضرین کی متفقہ خواہش سے نواب محسن الملک اس جلسہ[2] کے صدر قرار دیئے گئے، اور انہوں

[1] مولانا نذیر احمد صاحب کو یہ خطاب ۱۸۹۷ء میں اور مولانا حالی کو اس سے بھی بعد ۱۹۰۴ء میں ملا۔ [2] اس جلسہ کی یہ پوری روداد اس زمانہ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی تھی، اسی کو ہم نے نقل کیا ہے

کھڑے ہوکر حسب ذیل تقریر کی۔

"جناب سرسید و سید محمود صاحب، و حاضرین! جو خوشی اس وقت اس جلسہ میں شریک ہونے اور اس صحبت کے دیکھنے سے ہوئی، اس کا اظہار مشکل ہے۔ صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ دوستوں کا جمع ہونا، احباب کا ملنا، خود ایک ایسی دلخوش کن چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری چیز اس دنیا میں خیال نہیں کی جاتی پھر جبکہ وہ ایسے مقصود کے لئے ہو جس کے واسطے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں یعنی اپنے ایک معزز دوست کے خطاب پانے اور جو اعزاز گورنمنٹ نے اسے بخشا ہے اس پر مبارکباد دینے کے لئے تو اس خوشی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں، ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا فخر ہے، دوسرے اور احباب جن کو مولانا صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے، میں اگرچہ بظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں، مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں، اور اس لئے میں اس وقت اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھ کر اپنے اور عزیز طالبعلموں کی طرح اس خوشی میں شریک ہوا ہوں، اے میرے عزیزو! طالب علم کے لئے ضرور نہیں کہ وہ نوعمر اور نوجوان ہو، نہ اس کے لئے لازم ہے کہ وہ بغل میں کتاب دبا کر مدرسہ میں پڑھنے کے لئے حاضر ہوا ہو بلکہ طالب علم وہ ہے جسے علم کا شوق ہو، اور جو علم کا طالب ہو، پس اے میرے عزیزو! میں کسی سے علم کی طلب اور علم کے حاصل کرنے کے شوق میں کم نہیں ہوں، بلکہ جس قدر میری عمر زیادہ ہوا اسی قدر تحصیل کے شوق میں تم سے بڑھ کر ہوں، اس لئے میں تمہارے فرقہ میں داخل ہوں، مجھے امید ہے کہ تم میرے اس دعویٰ کو تسلیم کرو گے، اور اپنی جماعت میں داخل کرنے سے انکار نہ کرو گے، اے میرے

عزیزو، مولانا شبلی صاحب صرف تمھارے ہی استاد نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف و نحو کے ان سے سیکھے، یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف و تالیف اور تقریر و تحریر سے بڑے فائدے حاصل کئے ہیں، کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو، یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو، اس لئے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بحیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالبِ علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں، اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے اُن کو دیا ہے مبارکباد دیتا ہوں، اے میرے عزیزو! اور اے میرے دوستو! درحقیقت میں نے اس مبارکباد دینے میں ذرا جلدی کی، درحقیقت مجھے اوّل اپنی گورنمنٹ کو مبارکباد دینی چاہئے، جس نے ایسے مستحق شخص کو خطاب دینے سے دراصل اس خطاب کو عزت بخشی جو ہمارے مولانا کو اس نے دیا ہے، اور اپنے امتیاز کی اس قوت کو ثابت کیا جو اس انتخاب میں اس نے ظاہر کی ہے، درحقیقت مولانا مولوی شبلی صاحب کا خطاب دینا وضع الشئی فی محلہٖ ہے، اس لئے سب سے پہلے چاہئے کہ میں گورنمنٹ کو مبارکباد دوں، اس کے بعد قوم اس مبارکباد کی مستحق ہے، کہ اس میں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو درحقیقت علم کے آفتاب ہیں، اور جن کو شمس العلما ... بیشک مرد و قعی ہے، پھر مدرسۃ العلوم کو مبارکباد دینا چاہئے کہ اس میں ایسے کامل اور لائق استاد جمع ہیں، جن کو گورنمنٹ ایسے معزز خطاب کا مستحق سمجھتی ہے، اور جن کے علم کی روشنی دُور دُور پھیل رہی ہے، پس فی نفسہٖ گورنمنٹ اور قوم اور کالج مبارکباد کا مستحق ہے، اور مولانا کو مبارکباد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے، وہ فی ذاتہٖ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے، اور گورنمنٹ

ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے۔ صاحبو! جس طرح آفتاب اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی اُسے آفتاب کہے، بلکہ آفتاب کا اقرار کرنے والا خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تیرہ چشم نہیں ہے اور نہ اُس کی آنکھ بند ہے بلکہ اس میں بینائی کی قوت اور دیکھنے کی طاقت بے کسی قسم کے خلل اور عارضہ کے موجود ہے۔ اسی طرح ہمارے مولانا مولوی شبلی صاحب کو خطاب دینے سے گورنمنٹ نے ثابت کر دیا کہ وہ علم و کمال کی قدر کرنے والی اور اہلِ علم کی پہچاننے والی، اور استحقاق پر لحاظ رکھنے والی ہے۔ صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور اُن کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے، جن کو اُن سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ اُن کی ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھرے ہیں۔ اور جن کو ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور اُن کا علم کیسا وسیع۔ ان کے خیالات کیسے بلند، اُن کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پُرزور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں، جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحتِ بیان اور سلاستِ عبارت اور طرزِ تحریر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا۔ اور شاعرانہ خیالات اور خیالی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا، اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات و معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے، اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا، اور ایسے زمانہ میں جبکہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے، اور ایسے وقت میں جبکہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان

وہ تمین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی، اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے خریدا، اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا، اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا، اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالاتِ زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصود بتایا، اور ہمارے اردو لٹریچر میں بلکہ ہمارے اردو خیالات میں ایک نئی جان ڈالی، فللّٰہ درّہ وعلی اللہ اجرہ ۔

صاحبو! ہمارے دوست مولانا مولوی شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے، بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے، اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انھوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، وہ اُن چند اعتراضوں کا دور کرنا ہے جو مذہبِ اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے، اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے، اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا، اس ذی ہمت عالی دماغ محقق نے جو مدرسۃ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا، ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی، اور چند ورق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا، اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھا دیا، اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہبِ اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی، حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفرین کرتا ہے،

میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتبخانہ پر لکھے ہیں، ویسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انھوں نے نہ کیا ہوتا، اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریریں ان کی نہ ہوتی تو بھی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت، اور علم پر شاہد، اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لئے کافی، اور ان کے شمس العلماء ہونے کے شاہد تھے، صاحبو! ہماری قوم میں ہزاروں عالم گذرے، اور اب بھی خدا کی مہربانی سے سیکڑوں موجود ہیں، مگر ہم تو اس کے قائل ہیں، جو کچھ کر دکھائے اور اپنے علم و فضل سے مسلمانوں یا اسلام کو فائدہ پہنچا دے، شعر

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اے میرے عزیزو! اور اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! تم نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں، اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچی ہے، تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جبکہ تم کالج میں ہو، اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو اس وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو، تمھارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمھارے دلوں کو منور کرنے کے لئے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھ سے نہ دو، اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے، اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو، تاکہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں، بلکہ ہمارے چاروں طرف سیکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے، اور اس کا سایہ قوم پر پڑے۔

نواب محسن الملک کی اس فصیح و بلیغ تقریر کے بعد مولوی بہادر علی صاحب ایم اے نے

اپنے عربی لہجہ میں مولوی داؤد جانی صاحب ممبر لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کا عربی قصیدہ پڑھا۔

حمدًا لمن جعل النجوم دراريا	اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن
والشمس نورًا للحنادس ماحيا	اور سورج کو وہ روشنی بنایا جو اندھیروں کو مٹا دیتی ہے
اشرقت شمسًا من سماء معالم	تو شاہزادوں کے آسمان سے سورج ہو کر چمکا
تمد اقمار العلاء معاليا	تاکہ بلندی کے چاندوں کو اور بلندی میں بڑھائے
اضحى بفيضك روض علمنا ناضرًا	تیرے فیض سے علم کا چمن شاداب ہو گیا
من بعد ان قد كان دهرًا ذاويا	اس کے بعد کہ وہ ایک زمانہ تک مرجھایا تھا
لا غرو لو ادعوك روح زماننا	کوئی شبہ نہیں اگر میں تجھ کو زمانہ کی روح کہہ کر پکاروں
تحيي لعلم الدين عظمًا باليا	جو علم دین کی بوسیدہ ہڈی میں پھر زندگی پیدا کر دیتی ہے
علامة مستنبط من آية القرآن	علامہ ہے جو قرآن پاک کی آیت سے چھپا بھید
سرًّا خافيًا و معانيًا	اور معنوں کا پتہ لگاتا ہے ،
حينًا يحرر في العلوم رسائلا	کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے ،
حينًا يشيد للفنون مبانيا	اور کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہے ؛
وهو الذي شرح المهيمن صدره	یہ وہ ہے جس کے سینہ کو خدا نے کھول دیا ہے
فغدا لابناء المعارف تاليا	تو وہ اگلے اہل علم کا پیرو ہو گیا
لله درك مدرسًا تدريسه	کیا اچھا مدرس ہے کہ اس کا درس
سيل اتى وقد تغشى واديا	ایک سیلاب ہے جو وادی میں چھا جاتا ہے ؛

سحبانُ وقتٍ لا یُشَقّ غبارُہ	یہ وقت کا سحبان ہے جس کی گرد کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للفرد الوحید مجاریا	کون زود فرید کا مقابل ہو سکتا ہے؟
قسُّ الفصاحۃ لا ینال مقامُہ	فصاحت میں قس ہے جس کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
من کان للشمس المنیرۃ ثانیا	اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے؟
ان قال فی العربیّ شعرًا فاق	اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؓ سے بڑھ جائے
حسّانًا او فی العجمیّ فاق قاٰنیا	اور اگر فارسی میں کہے تو قاآنی سے آگے نکل جائے،
قد یجلب الالباب سحر بیانہ	اس کے حسن بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے
اذ ما تصدّی خاطبًا او شادیا	جب وہ خطیب ہو کر یا شاعر ہو کر نغمہ سرا ہو،
ھو خضرھم الاخبار غیر مساجل	وہ تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے،
یعطی الوری مرجانۃ لآلیا	جو لوگوں کو مرجان اور موتی دیتا ہے،

اس کے بعد نذیر احمد صاحب بی اے نے عربی زبان میں حسب ذیل تقریر کی،

یا ایّھا السادۃ الکرام یشقّ علیّ ان	معزز حضرات! میرے لئے یہ امر تکلیف دہ
اقرع اذانکم بعد اذ فرغنا من تنقل	ہو کہ کچھ بکوں جبکہ ہم لوگ خوش مزہ میووں اور
الفواکہ الشھیّۃ والالوان اللطیفۃ	عمدہ ناشتوں سے پیٹ بھر چکے ہیں، وکی
وکیف یمکن لی ان اُعدّ فضائل	صحیح خوشی کریں، اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ
مولانا المکرم واحصی محامدہٗ	ہم مولانا کے فضائل گنائیں، اور ان کے محامد شمار
مالی ان اقول انہ سحبان فی الفصاحۃ	کریں میں کیسے یہ کہوں کہ وہ فصاحت میں سحبان ہیں

وما لی ان اقول انه قسّ فی البلاغة
وما لی ان اقول انه قاآنی فی
سلاسة لسانه ولطافة
نظمه، بل انشد هذا الشعر
للمتنبی اذ قال

"خذ ما تراه ودع شیئًا سمعت به
فی طلعة الشمس ما یغنیک عن زحل"

تفخر الجمعیة الادبیة بان اعظم
ارکانها بل بانیها لُقِّب بشمس
العلماء وتهنئه الآن بهذا
الاعزاز والاکرام اختم کلامی
بتشکر السادة الذین شرفونا
بقدومهم والذین کرّمونا
باللطف والاحسان، وان الله لا یضیع اجر المحسنین۔

بلاغت میں قس اور سلاست زبان اور
لطافت نظم میں قاآنی نہیں ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بلکہ میں متنبی کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں،

جو دیکھتے ہو اس کو قبول کرو، اور جو سنتے ہو اس کو
چھوڑ دو، آفتاب نکل آنے کے بعد زحل کی ضرورت کیا ہے۔

انجمن ادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب
سے بڑے رکن بلکہ بانی کو شمس العلماء کا لقب دیا
گیا ہے، وہ ان کو اس اعزاز پر مبارکباد دیتی
ہے، ہم ان معزز حاضرین کے شکریہ پر جنھوں نے اس
جلسہ میں شرکت کی اور تشریف لائے، اپنی تقریر
کو ختم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے
والوں کی نیکی کو برباد نہیں کرتا،

اس تقریر کے بعد ولایت اللہ[1] صاحب طالب علم بی اے کلاس نے مولانا کی مدح میں ایک

[1] یہ صاحب سی پی کے تھے، طالب علمی سے فراغت کے بعد وہاں معزز عہدہ پر ممتاز تھے، پنشن پاکر اب ... کونسل کے ممبر ہیں، اسی سلسلہ میں ان کو دہلی میں ملا ہوں، ان کو شاعری کا ذوق اب تک ہے، میر اکبر حسین صاحب کے رنگ میں بھی اچھا کہتے ہیں، بہت سے اشعار انھوں نے سنائے، مولانا شبلی صاحب کی شاگردی کا ذکر کیا، اب ان کا مجموعہ کلام بھی ...

اُردو نظم پڑھی جو حسبِ ذیل ہے،

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں
در و دیوار سے آثارِ مسرت ہیں عیاں

زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف
ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغِ جناں

دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے
دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں

دیکھ کر سبزہ کی ہر سمت بہارِ دلکش
فرشِ اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لحظہ گماں

جس طرف جائیے غنچے ہیں تبسم کرتے
باغِ عالم میں جدھر دیکھیے گل ہیں خنداں

باغ ہو، دشت ہو، صحرا ہو، غرض کچھ بھی ہو
نقشۂ خلد ہی پاتا ہوں میں جاتا ہوں جہاں

دھوم صحرا میں ہے جنگل میں ہے برپا منگل
آج ویرانہ کا معدوم ہے دنیا سے نشاں

سب کے منہ سے ہیں بلند آج خوشی کے نعرے
شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں

دستِ قدرت نے گرایا جو ہوا نچا یا
ابر آیا اُدھر شہوار سے بھر کر داماں

نہ رہی شکل وہ دُنیا کی ومافیہا کی
کچھ سے کچھ کر گئی اک بارشِ ابرِ باراں

دشت و صحرا ہوئے گلزار، بہار آپہونچی
رحمتِ پاک سے سرسبز ہوا باغِ جناں

سر کے بل آگے ہی بڑھتی تھی نگاہِ پُرشوق
اک تماشہ پہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں

سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی
جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں

ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے
باعثِ غور ہے کیا، کیوں ہوئے ایسے حیراں

خیر ہے فکر یہ کیسی ہے؟ تعجب کیسا؟
مہرباں ہو خوشی میں آؤ ہو تم اس وقت کہاں

لہ اتفاق سے عین جلسہ کے دن بارش ہونے لگی تھی،

جشنِ نوروز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سُو
واں کے چلنے کا بھی کچھ تم نے کیا ہے ساماں

یہ صدا کان سے پہنچی جو اُتر کر دل میں
ہو گیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب رازِ نہاں

دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی
ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں

لے جاتا تھا مجھے شوق وہاں ہاتھوں ہاتھ
جا رہا تھا میں نہایت خوش و خرم شاداں

چشمِ مشتاق جسے ڈھونڈھ رہی تھی ہر سو
مجھ کو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں

خوشنما دلکش و دلچسپ تھی جس کی تعمیر
جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت و شاں

پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے مجسم
ہند کے جملہ اراکین و مشیر و اعیاں

عقل و دانش کو ہوئی جن سے کہ زینت حاصل
عزت و شان کی جن سے کہ بڑھی عزت و شاں

عدل سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام
جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہندوستاں

پائی یہ نشو و نما علم و ہنر نے جن سے
ہے بجا جن کو اگر کہئے کہ ہیں ہند کی جاں

ناگہاں ایک خوشی ہوئی سب پہ طاری
جبکہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں

بہرِ تعظیم کھڑے ہو گئے حضار تمام
ہو گیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں

سُن کے کچھ بھول گئے مارے خوشی کے احباب
دل سے مت پوچھئے کچھ فرطِ مسرت کا بیاں

ہوئے شمس العلما آج جناب شبلی
ہو گیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلاں

فخر کرتا ہے بہت جن پہ علیگڈھ کالج
بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پہ نازاں

مصر اور شام خجل ہیں عربی سُن کے اگر
فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملک یوناں

فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے کبھی
پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں

ختم کر شمس العلماء کا یہ مبارک ہو خطاب
جب تلک شمس رہے اوج سما پر رخشاں

بس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یارب
یہ لقب ہووے پھلے آپکے زیر داماں

سبز و شاداب یونہی کر رہے باغِ علوم
شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر پر تاباں

اس کے بعد ممتاز حسین[1] طالب العلم سکنڈ ایر کلاس اور ممبر اخوان الصفاء و بجنۃ الادب نے عربی میں ایک تقریر کی جس کی فصاحت و بلاغت کی سب نے داد دی، پھر مولوی حمید الدین[2] صاحب ممبر اخوان الصفاء و بجنۃ الادب نے اپنا یہ عربی قصیدہ پڑھا،

یا خیر من یسمو الی العلیاء
کالشمس بازغۃ بوسط سماء

اے ان سب میں بہتر جو بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں
آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہوکر

قد کنت قدماً للمعالی سامیا
ورثتہ عن شیمۃ الآباء

تو پہلے سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا
تو نے اپنے اسلاف سے یہ وراثت میں پایا

فلئن سموت الی المکارم والعلیٰ
فلقد نشأت بعزۃ قعساء

تو اگر تو عزت کے مقام اور بلندی کی طرف بڑھا تو کوئی تعجب نہیں
کیونکہ تو نے عزت میں پرورش پائی ہے

لا غرو نصل السیف ان یک صارما
او یستھل البرق بالالاء

کوئی تعجب کی بات نہیں اگر تلوار کی دھار کاٹ رکھتی ہو
یا بجلی روشنی سے کر چکے ۔ ۔

فلانت بالعزمات سیف صارم
ولانت برق لامع بذکاء

کیونکہ تو اپنے پختہ عزم میں شمشیر براں ہو
اور تو ذکاوت میں برق لامع

[1] ممتاز حسین مرحوم بیرسٹر [illegible] کے نام سے [illegible] میں ممتاز [illegible] تھے [illegible] مولانا حمید الدین صاحب فراہی مرحوم صاحب تفسیر نظام القرآن مولف کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد [illegible] اس وقت کالج میں زیر تعلیم تھے۔

لاذت بجانبك العلوم فانها | لولم تقشها اذنت بفناء
علوم نے تیری پناہ چاہی کیونکہ | اگر تو اُن کو نہ بچاتا تو وہ فنا ہو چکے تھے

قد امحلت ارض العلوم وصوّحت | عرصاتها کسما فی البیداء
علم و فن کی سرزمین خشک ہو گئی تھی | اور اس کے میدان صحرا بن گئے تھے

لعبت بها هوج الریاح تنوبها | من کل عاصفة من النکباء
اس کے چاروں طرف سے آندھیاں اس کو گھیر رہی تھیں | اور مصیبت کا طوفان اس پر آرہا تھا

فظللت تمطرها بسحّ واکف | صوب الربیع بدیمة هطلاء
تو تو ابر باراں بن کر اس میں برسا | بہار کی بارش موسلا دھار

فربت ریاض العلم منك ونورت | مهتزة بغصونها الخضراء
تو علم کی کیاریاں تجھ سے پروان چڑھیں | اُن کی سبز شاخوں میں جھوم کر شگوفے نکلے

علمتنا سبل الرشاد وانما | کنا کخابط لیلة لیلاء
تو نے ہم کو ہدایت کا راستہ بتایا | حالانکہ ہم ایسے تھے جیسے کوئی اندھیری رات میں بھٹک رہا ہو

کنا بمهلکة یخاف بها الردی | فهدیتنا لمحجة بیضاء
ہم ایسے خوفناک مقام میں تھے جہاں ہلاکت کا ڈر تھا | تو تو ہم کو کھلے صاف راستہ پر لے آیا

ولاسئلن الله طول بقائکم | فی کل بکرتنا وکل عشاء
اور ہم اللہ سے آپ کی زندگی کی | ہر صبح اور شام دعا مانگیں گے

واهنئنکم بما اعطیتم | من خیر ما وجد وامن الآلاء

اور آپ کو اس کی مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے — اپنے نزدیک سب سے بہتر لقب سے ملقب کیا

ان کان تلک الشمس شمس سمائھا — فلصرت شمس العلم والعلماء

اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے — تو تو علم اور علماء کا آفتاب ہے

اذا انت شمس والعلوم سماء کم — فالشمس شمسی والسماء سمائی

جب آپ آفتاب ہیں اور علم و فن آپ کا آسمان ہے — تو آفتاب ہمارا آفتاب ہے اور آسمان ہمارا آسمان ہے

اس کے بعد خواجہ غلام الثقلین اور محمود صاحب نے اردو میں تقریریں کیں۔ پھر ظفر علی خاں[1] صاحب ممبر اخوان الصفا نے فارسی میں یہ قصیدہ پڑھا، یہ قصیدہ گو ان کا ابتدائی کلام ہے مگر سالے کہ نکو است از بہارش پیداست،

سحرگاہاں دلم پامال غم بود و پریشانی — کدر مطلع خاطر بُد از اندوہ پنہانی

گہے بہر سر ساقی خود نالہ می کردم — گہے خواندم حدیث گردش ایام دورانی

گہے بر کردہ خود و انفعالم دست می دادی — گہے کردہ نظر بر جمعیت خوردم پشیمانی

چو صبح غم ز سر بگذشت گشتم عازم گلشن — کہ در سامان دل زادم خوشی زان سان آسانی

شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرط فرحت و بہجت — عروس دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی

گل و بلبل بہم محو ادا و عشوہ و غمزہ — چو زلف مہوشاں گیسوئے سنبل ہم پریشانی

خرام ناز کبک و رقص سرو و خندۂ گلہا — دلم بردہ و شدہ در دم نثار صنع یزدانی

دمیدہ لالۂ حمرا کنار جوئے کہ و دشت — ہمی شد از حیاش غرق خوں لعل بدخشانی

[1] مولانا ظفر علی خاں، اڈیٹر زمیندار لاہور،

وزید از گلستان باد صبا آهسته آهسته   مشام جان معطر شد ز بوی مست ریحانی

گلاب و نسترن شبو و نسرین نرگس و سوسن   به هر یک جلوهٔ خاصی جدا ز اندازه ارزانی

ز شبنم لاله در باغ خود به انداز نکو شسته   شمیم یاسمین و یاسمن و جعد پریشانی

هزاران مرغ خوش الحان نشسته بر سر اغصان   بصوت دلربا بودند محو تهنیت خوانی

مه و کشتی بهر شام از نقره پر کرده   کواکب بر فلک مصروف هر سو در زرافشانی

چوں ایں نظاره را دیدم عجب فکرے سر در جم   که بهر کیست این آرایش و تزیین لاثانی

درین اثنا مرا از هاتف غیبی ندا آمد   نمی دانی مگر تو اے غریق بحر حیرانی

که فخر قوم مولانائے شبلی را پئے علمش   خطابے شد عطا از شہ ز فیض بحر سلطانی

زمین هم آسمان هم چهره افروزند بهر او   معطر باغ دهر است از چو شبلی نعمانی

بحمد الله که وزیر در بیچ حکمت را پس از عمرے   ز عدل خسروی شد گرم بازار درخشانی

زیادے ثنائے تو قلم را نے زبانم را   قطار عالمان انجم میانش شمس تابانی

کنند اے کان معنی علم و فضل و دانش و حکمت   بیک پا ایستاده بر جناب پاسبانی

زمین شعر از فیضت پر از گلہائے بوقلمون   سخن را دادهٔ سرمایه لے بحر سخندانی

کند پیدا سے مضمون لطیف و خوش بیکدم   سمند کلک تو هرگه شود سرگرم جولانی

براے دادهٔ از فکر خود عرفی و صائب را   کجا هم پایه ات باشند خاقانی و قاآنی

بیاران تحفه باشند گلزار کمال تو   ز بحر عقل و فضلت رشحه ابیست نیسانی

خداوند کریمت لحن داودی عطا کرده   کنی تسخیر دلها چون کنی ترتیل قرآنی

نوائے نغمہ شکریں تا خیزد از گلبین	صدائے بلبل آید تا ز شاخ سرو بستانی
ز چشم زخم دوراں در سلامت باشی اے این	معین و یاور و ناصر ترا تائید ربانی

اس کے ختم ہونے کے بعد لالہ بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی شاگرد مرزا غالب مرحوم[1] نے جو مولانا حالی کے ساتھ تشریف لائے تھے، ایک ظریفانہ تقریر کی اور اپنے کو ہندو ہونے کے سبب سے آفتاب پرست ثابت کرکے شمس العلماء مولانا شبلی کا اپنے کو قدرداں ٹھہرایا تھا۔ اس کے بعد مولانا حالی نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا، جو حسب ذیل ہے، اور جس کا عنوان تھا "من الحبیب الی الحبیب" یعنی ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ۔

یا ذا حمید و من الکرام فریدا	و عزیزاً کمثل علق نفیس
اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ	اور نادر الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے
انت اولی بان تلقب شمسا	بل بان یجعلوک شمس الشموس
تو اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے	بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے
انت شمس الهدیٰ و لست بشمس	یعتریها الخنوس بعد خنوس
تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں	جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے
انت طهرت ذیل دین مبین	لوثته اللئام بالتدلیس
تو نے دین مبین کے دامن کو پاک کیا	جس کو کمینوں نے فریب دہی سے آلودہ کر دیا تھا
ثم دافعت عن امام تقی	کان بعد النبی خیر جلیس

[illegible] (حاشیہ)

[1] لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی نے [illegible] میں وفات پائی۔ (مکتوبات حالی جلد اول [illegible])

پھر تو نے اس امام پاک کی وراثت سے مدافعت کی
جو پیغمبر خدا کے بعد سب سے بڑا سردار تھا

وعن الحق قد کشفت غطاءً
بعد ما اغلقوه بالتلبیس

اور تو نے حق سے پردہ اٹھایا
بعد اس کے کہ لوگوں نے اسکو دھوکے کے پردہ میں چھپا دیا تھا

سرت فی الارض برًّا وبحرا
للمعالی ولا لامر خسیس

تو نے دنیا کے بحر و بر کی سیر کی
اعلیٰ مقاصد کے لئے نہ کسی ذلیل غرض کے لئے

قلدوك القوم مدرس قوم
فیه یرجی لهم کمال النفوس

تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی
جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے

فتقلدت والتزمت لزوما
خدمة المسلمین بالتدریس

تو تو نے اس خدمت کو قبول کیا
اور درس و تدریس سے انکی خدمت کا فرض ادا کیا

قمت بالدرس والدراسة فیهم
فارغاً عن ریاسة ورئیس

تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا
ریاست اور رئیسوں سے بے پروا ہو کر

وجعلت الکمال غایة همّ
واتخذت الکتاب خیر جلیس

اور تو نے کمال کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا
اور کتاب کو عمدہ ہمنشیں بنایا

فعلی القوم لازم لك حق
کلهم من وجوههم ورؤس

پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں
سب پر تیرا لازمی حق ہے

صانك الله عن مکاره حق
صرت کالقلب انت فی الخمیس

خدا تجھ کو مکروہات سے بچائے
بیشک تو اس طرح سرفراز ہے جس طرح فوج میں قلب

سب سے آخر میں مولانا کھڑے ہوئے اور سب کے جواب میں یہ شکریہ آمیز تقریر فرمائی،

اس تقریر پر اس حیثیت سے نظر ہو کہ باوجود مدح و توصیف کے اتنے پے در پے پیالوں کے بعد بھی ان کا دماغ برجا ہے، اور اس شاہی خطاب کی وہ وہی حقیقت سمجھتے ہیں جو اس کی حقیقت ہے۔

"آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیۂ خطاب کی تقریب میں مجھ کو ایونگ پارٹی میں مدعو کیا ہے اور جس جوش اور خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے، میں نہایت سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، حقیقت میں میرے لئے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مقدس زبان میں ہم کو اسپیچ اور لکچر دینا سکھائے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں مولوی بہادر علی صاحب ایم اے اور کیسے ایم اے، وبی ایم اے، داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب، مزمل اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے جیسے، اور اس کے آنریری ممبروں میں ہمارے مخدوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی داخل ہیں، اس خطاب کی نسبت مبارک باد دینا، ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے،

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اُس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے جو چوتھی صدی میں قائم ہوئی تھی جس کے سکریٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر آرنلڈ ہیں، اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لائق و فائق اشخاص ہیں، ایسی مجلس

کا مجھ کو مبارکباد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔

اے حضرات اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصول پر مبنی ہیں، اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے، نہایت قدر اور منزلت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جائے، گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا، اور یہ میرے لئے کچھ بیجا بات نہیں، بلکہ اُس زمانہ میں بھی جبکہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی بہ نسبت قومی خطاب کی زیادہ عزت کی، اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کئے ہوئے خطاب بالکل معدوم ہو گئے، اور قوم کے عطا کئے ہوئے خطابات یعنی "حجۃ الاسلام" امام غزالی کے لئے،" امام فخر الدین رازی کے لئے، "عَلَمُ الہدیٰ" شریف مرتضیٰ کے لئے آج بھی باقی اور قائم ہیں، پس جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں پسند کرتے ہیں، اور بجا سمجھتے ہیں، تو اس سے بڑھ کر میرے لئے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہر جنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۹ جنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے ؎

اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا

ہوں، میرا فرض ہے کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں، جو اس نے اس خطاب کے دیئے جانے کی نسبت اختیار کی ہے۔

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو تمدن کو مٹا دینا چاہتی ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّ[1] الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ لیکن انگریزی حکومت نے بخلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے، قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ کو ہے وہ مخفی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی۔

حضرات! اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے، اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں، اور ان کی ہمت بلند ہوتی ہے، ہم کو گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہو کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں، اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لئے قدردانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے،

---

[1] ترجمہ:- بے شبہ جب بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اسکو ویران اور اسکے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ (قرآن پاک میں ملکہ سبا کا قول نقل ہوا ہے) "س"

تو گورنمنٹ ہماری قدردانی اور عزت افزائی کے لئے اسی طرح موجود ہے جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت، مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مفتی میرعباس صاحب مرحوم، مولوی حامدحسین صاحب مرحوم اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو اُن کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہوسکتی تھی، جو انگریزی گورنمنٹ نے ان کو عطا کیا،

حضرت! جبکہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کررہا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی ہمارا یہ قومی کالج۔

اس جلسہ کے بعد ۷ فروری روز شنبہ کو اسٹریچی ہال میں، یورپین افسران، روسا علی گڈہ اور طلبائے کالج کا ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرکاری طور پر رسم خلعت و عطائے خطاب ادا کی گئی، اور مسٹر ہونگٹن کمشنر قسمت میرٹھ نے مولانا کو اپنے ہاتھ سے عمامہ عطا اور مفتخر کیا، سرسید نے مولانا کو الگ لیجاکر خلعت پہنایا، مولانا خلعت کو زیب تن کرکے وسط ہال میں کھڑے ہوئے، اس وقت مسٹر ہونگٹن نے ان کو مخاطب کرکے ایک تقریر کی جس میں وہ تمام خیالات یکجا ہیں جو اس عطائے خطاب کے باعث ہوئے، اور اس وقت مسٹر بک پرنسپل اور سرسید مرحوم کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لئے وہ آج بھی غور سے

لے ان صاحبوں کو شمس العلما کے خطاب ملے تھے، مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے نامور جانشین و فرزند، مفتی میرعباس صاحب لکھنؤ کے مشہور ادیب، اور مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤ کے مشہور اثنا عشری عالم و مجتہد اور مولوی ناصر حسین صاحب مجتہد لکھنؤ کے والد،

پڑھے جانے کے لائق ہے، انھوں نے کہا: "مولوی محمد شبلی نعمانی! مجھے اس امر کی نہایت خوشی ہے
کہ یہ سند اور خلعت گورنمنٹ آف انڈیا وصوبجات ہند کی طرف سے ایسے وقت میں آئے کہ مجھ کو یہ
مسرت اور خصوصیت حاصل کرنے کا موقع ملا کہ میں بذات خود اس رسم میں شریک ہوں، جو اس عظیم
خطاب کی غرض سے کی گئی ہو جس کے لئے یہ سند اور خلعت ثبوت اور علامت ہیں۔

اس خطاب کی تاریخ لارڈ ڈفرن کی اس عبارت سے معلوم ہوتی ہے جس میں انھوں نے بیان
کیا ہے کہ کیونکر یہ ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا۔ ہز ایکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے اس امر پر توجہ فرمائی تھی
کہ اب تک کوئی ایسا مناسب ذریعہ موجود نہیں جس سے ہم ان ہندو اور مسلمان اشخاص کی اعلیٰ لیاقت
کی قدر شناسی کر سکیں، جو ہز مجسٹی حضور پرنور قیصرہ ہند کی وفادار رعایا ہیں، اور تمنا ان کی یہ
تھی کہ جشن جوبلی کی یادگار قائم رکھی جائے، پس انھوں نے ایک نئے خطاب کی تجویز کی جو ان ہندو
اور مسلمان اشخاص کو عطا کئے جائیں جنھوں نے علوم مشرقی کی ترقی میں کارہائے نمایاں کئے ہوں،

ہز ایکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے ہدایت فرمائی ...... کہ یہ خطاب مسلمانوں
کے لئے شمس العلماء ہوگا، یہ خطاب شخص مخاطب کے نام کے اول میں اضافہ کیا جائے گا......
خطاب شمس العلماء کے ساتھ ایک خلعت بھی عطا کی جاوے گی جس میں ایک عمامہ اور ایک جبا
ہوگی، جن اشخاص کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوگا وہ دربار میں ان اشخاص سے متصل دوسرے
درجہ پر بیٹھینگے جن کو نواب کا خطاب ملا ہوگا۔

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی! اس رسم خلعت کے انجام دینے پر اور اس سند کے تذکرے
کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راست رو وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے،

جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصہ میں نہیں آیا ہیں (آپکے لئے) یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز
ہو، نہ صرف اس لئے کہ اس سزاوار عظمت سے لطف حاصل کیجئے بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علوم
مشرقی میں آپنے ایسے کارہائے نمایاں کئے ہیں جس سے یہ امتیاز حاصل کیا، اسی طرح اس سے بھی زیادہ
نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش قوم کے واسطے کرتے رہئے، جس کے ساتھ عروج کرنا آپکی
قوم کے لئے مقدر ہے۔ اور اپنے پُرزور اثر کو جو آپ کی ممتاز لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، اس معزز عزم
کے استحکام اور وسعت کی طرف مائل رکھئے، جس کو آپکے پرنسپل کے دلپسند الفاظ (برٹش کی وفاداری
انگلش کے ساتھ دوستی اور جوش سلف ہیلپ کے بلند اور روز افزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرسکتے ہیں
یہی تین باتیں محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج علی گڈھ میں ایسی ہیں جنکو اس کی علامت اور اثر قدیم اور
اس کی روح کہہ سکتے ہیں، اور جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا
اظہار کر رہی ہیں جس سے ایک قوی مگر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز
پر ڈال سکتی ہو جو اس کے لئے باعث عزت اور اس کے فرمانرواؤں کے لئے باعث ہمدردی واعانت
ہو سکے، اور اس کالج اور اس کے پیارے اور لائق ادب بانی کی نسبت میں دل سے یہ چاہتا ہوں
کہ یہ کالج ایسی متصل اور مستقل ترقی کے ساتھ استحکام کے مدارج حاصل کرتا جائے کہ اس کے بانی کی
زندگی کے افق پر کالج کے آئندہ حالات کے خیال سے پریشانی کا ابر نہ چھائے، اور اس کے آخری
ایام مسرت کے روشن افق پر بسر ہوں، جہاں فرحت بخش امید کا جلوہ ہو اور جہاں سے کامیابی کا
میدان سامنے نظر آتا ہو، جہاں اُس کی آنکھیں ارض موعود کو دیکھ کر جس کی جانب وہ اپنی قوم کی رہبری
کرتے ہیں، اس طرح پر روشن ہوں جیسا کہ قوم بنی اسرائیل کے اس بڑے فدائی کی چشم تیز بیں ہو رہی

تھی، جس نے اپنی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا تھا، کہ قوم کو کشورِ غلامی سے باہر نکالے:

یہ تقریر اور اس تقریب کی کارروائی اس زمانہ کے پانیر الہ آباد واسط فروری ۱۸۹۳ء میں چھپی تھی، جس میں ایک دفعہ چھپ جانا اس عہد کے ہر عزت طلب کی انتہائی آرزو تھی بقول اکبر:

ع بہر خدا ہمیں بھی ذرا چھاپ دیجئے"

اس مسرت کے علاوہ جو ارکین وطلبائے کالج نے اس خطاب کے عطا ہونے پر ظاہر کی تھی تمام ملک کی طرف سے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا، اخبارات نے مضامین لکھے، اور اکثر بزرگانِ قوم نے بذریعہ خط مولانا کو مبارکباد دی۔ ان سب کے جواب میں مولانا نے حسبِ ذیل شکریہ آمیز تحریر شائع کی، جس کا حرف حرف اپنے لکھنے والے کے حوصلۂ بلند اور ہمت عالی کی شاہد ہے، اور جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پورے سیاسی ڈرامہ میں جو سٹیجوں پر کھیلا گیا اس کی نظر حقیقت کی بلند سطح سے نیچے نہیں اُتری: "عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگانِ قوم نے مبارکباد کے جو خطوط لکھے اور میرے رتبہ اور حالت سے بدرجہا بڑھ کر جن الفاظ میں قدر دانی کا اظہار کیا، اُن کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں، با ایں قدر خود شناسی کا مقولہ بھول جاتا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف اور عزت کی باعث ہیں، اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کے حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے میری اس عزت افزائی کی نسبت اُن بزرگانِ قوم کی طرف سے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز نمائندہ ہیں اور جنہیں، اقتدار الدولہ فخر الملک صاحبزادہ محمد عبید اللہ خاں بہادر، فیروز جنگ سی، ایس، آئی، آب

ریاست ٹونک، سردار محمد حیات خاں بہادر سی، ایس، آئی، نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب، نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، مولوی سید اکبر حسین صاحب جج، حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے مبارک نام شامل ہیں، سب سے بڑی عزت ہے، جو مجھ کو عطا کی جا سکتی ہو۔

علی الخصوص لسان الملک فخر قوم اور مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہٗ کی تحریر جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے، میرے لئے مفاخر اور سند عزت ہے، بے شبہہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھ کو حاصل ہو سکتی تھی، اور جس کے حاصل ہونے پر مجھ کو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔

تماشائے عبرت
فروری ۱۸۹۴ء

مولانا شبلی مرحوم نے "قومی سٹیج" کی تمہید میں اس قومی تماشا گاہ کا ذکر ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک سالانہ نمائش ہوتی ہے جس میں ضلع کے اکثر روسا بڑے ساز و سامان سے شریک ہوتے ہیں، ان کے خیمے ڈیرے لگتے ہیں، بمبئی نے ان میں سے مسلمان رئیسوں کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک قومی تماشا گاہ کی طرح ڈالی۔ لوگوں نے اس کو سنجیدگی کے خلاف سمجھ کر اس کی مخالفت کی، مگر سرسید نے یہ کہکر قوم کے لئے سب کچھ گوارا ہے، ۹ فروری ۱۸۹۴ء کی رات کو علی گڑھ کی نمائشگاہ میں چند خیمے کھڑے کئے، اور ایک اسٹیج ترتیب دیا، اس میں سب سے پہلے نواب حاجی اسمٰعیل خاں جو عرب اور ترکی میں رہ چکے تھے، کپتان کی وردی میں باہر آئے، اُن کے ساتھ چند سپاہی تھے، ان سے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی میں باتیں کیں، پھر سرسید صاحب آئے اور کپتان سے کچھ گفتگو کر کے ایک دلچسپ لکچر دیا، اور آخر میں حافظ کی یہ پوری غزل پڑھی،

ساقیا برخیز و در دہ جام را — خاک بر سر کن غم ایام را

اسکے بعد چار انگریزی پروفیسر آئے، اور انھوں نے ساتھ ملکر ایک انگریزی گیت گایا پھر

آغا کمال الدین تجز طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ

اے پیرزن دین حنیف پیمبری — فریاد زستیزہ ایں چرخ چنبری

بڑی شان سے پڑھا اس کے بعد آغا محمد حسین نے جو مشہور سیاح تھے، اور افغانستان، کوہستان

مصر اور سوڈان میں کچھ دنوں رہے تھے، بدوی شیخ کی صورت میں عربی گیت گایا، اس کے

بعد خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل نے اُٹھ کر تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی پھر پروفیسر آرنلڈ

نے اُٹھ کر ایک انگریزی نظم پڑھی، ان سب کے بعد مولانا شبلی صاحب سبز جبّہ پہنے، اور رنگین عمامہ

باندھے اسٹیج پر آئے، اور اپنا قومی مسدس جو اسی موقع کے لئے تصنیف کیا تھا پڑھا، ان کے

دل میں خود قومی درد تھا، آواز درد انگیز تھی، مسدس کا مضمون بھی ویسا ہی قومی درد سے بھرا

تھا، سب نے مل کر لوگوں کے دلوں پر جو اثر کیا اس کو ان ہی لوگوں کا دل جانتا ہو جو اس وقت

موجود تھے، یاقوت خاں طالب علم نے مولانا شبلی کا ایک اردو قصیدہ پڑھا،

بزم احباب ہی پرجوش ہو جلسہ کیا — جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشہ کیا

یہ عبرت کا تماشا تو گذر گیا مگر مولانا کا یہ مسدس آج بھی عبرت کا تماشا دکھا رہا ہے، (تاریخ

مدرسۃ العلوم مسلمانان، مرتبہ سید افتخار عالم صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴)

لاہور کا سفر ۱۸۹۵ء | انجمن حمایت اسلام لاہور کی مشہور انجمن ہے، اکثر اس کے سالانہ جلسوں

لہ یادایام مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری،

میں شریک ہوتے رہے ہیں، مارچ ۱۹۰۵ء میں اس کے سالانہ اجلاس میں سید صاحب اور ان کے دیگر رفقاء نے شرکت کی، اسی سلسلہ میں مولانا بھی تشریف لے گئے تھے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے اس جلسہ میں کس موضوع پر تقریر کی، (مکاتیب شبلی، اضافہ طبع دوم ۳۳)

الہ آباد یونیورسٹی کا تعلق ۱۹۰۵ء

اسی سال الہ آباد یونیورسٹی نے مولانا کو اپنی فیکلٹی آف آرٹس (شعبۂ فنون) اور بورڈ آف اسٹڈیز (شعبۂ تدریس) کا ممبر بنایا، اور وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے، مولانا ۱۵ مارچ ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"رمضان کے بعد ایک مطول یادداشت کورسوں کے متعلق تیار کروں گا"

معلوم نہیں یہ یادداشت کیا تھی اور کیسی تھی، مگر مولانا کے ایک واقف کار سوانح نگار لکھتے ہیں:

"الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے وقت ایف، اے اور بی اے کے امتحانات میں فارسی کورس نہایت آسان بنایا گیا تھا، ایک مدت تک جب طلبہ آسانی کے ساتھ اس میں کامیاب ہوتے رہے تو یونیورسٹی کے ایک گروہ نے فارسی کورس کے آسان ہونے کی شکایت کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی یونیورسٹی کی تعلیم میں ایک مضمون ہونے کے ناقابل سمجھی گئی، لیکن عین وقت پر مولانا نے نہایت قابلیت سے ایک کورس تیار کیا، جس کا معیار اس قدر بلند تھا کہ فارسی کا وقار قائم رہ گیا، اور اس کا اخراج ملتوی ہو گیا" (صفحہ ۳۳ و ۳۴)

اس کورس کے نثر کے حصہ میں پہلے نظام الملک طوسی کے سیاست نامہ کے ۲۲۵ صفحے ہیں، پھر سو صفحوں میں ابو الفضل کی آئین اکبری کا ایک ٹکڑا ہے، جس میں شعرائے اکبری کا تذکرہ بھی شامل ہے، اس کے بعد خاص نظم ہے، نظم میں پہلے شاہنامۂ فردوسی کے ننانوے صفحے ہیں

اس کے بعد شعرائے متاخرین میں سے قاآنی کے قصائد کے پچاس صفحے ہیں، پھر قدما میں منوچہری کے قصائد و مسمطات و اشعار کے اکانوے صفحے ہیں،

اس کورس کی ترتیب میں چند باتوں کا خیال رکھا گیا ہے، ایک تو یہ کہ وہ خالص فارسی ہو، دوسری یہ کہ وہ روزمرہ کی باتوں کی تحریر کا سلیقہ سکھائے، اور تیسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے آئین حکومت اور تمدن کا نقشہ کھنچ جائے، اور ایک متقدم اور ایک متاخر دونوں کا نمونہ پیش نظر ہوجائے۔ نظم میں بھی صحیفۂ ایران یعنی شاہنامۂ فردوسی ہے، پھر غزنوی دور کے مشہور قصیدہ گو منوچہری دامغانی کا کلام ہے، جس میں ایک خاص قسم کی روانی اور انسجام ہے، اور متاخرین میں قاآنی کا نمونہ ہے، جو قاچاری دور کا سب سے بہتر قصیدہ گو تھا، اور جس میں لفظوں کی ایسی جادوگری ہے جو شاید ناموزوں طبع کو بھی موزوں بنا دے،

یہ کورس سالہا سال تک شاید ۱۹۰۳ء تک یا اس کے بعد بھی چلتا رہا، مولانا جب تک کالج میں رہے سو روپیے سال اس کی آمدنی سے کالج کو دیتے رہے،

قدیم کتابوں کی اشاعت کی تجویز سنہ ۱۸۹۰ء

مستشرقین کی کوششوں سے اس زمانہ میں یورپ کے مختلف ملکوں سے عربی زبان کی نہایت نادر اور قدیم کتابیں چھپ چھپ کر شائع ہو رہی تھیں، اس کو دیکھ کر مولانا کا جی بار بار چاہتا تھا کہ کاش مسلمانوں میں بھی علما کا ایک چھوٹا سا گروہ ایسا ہوتا جو اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو کتبخانوں کے گوشوں سے نکال کر منظر عام پر لاتا، اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کا نام اونچا ہوتا، اور دنیا کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترقی میں کیا کیا ہے؟

یہ خیال ان کے دماغ میں سب سے پہلی بار ترکی اور مصر و شام کے سفر میں آیا جب نہایت کثرت سے اُن کی نگاہ کے سامنے سے اسلاف کے یہ نادر کارنامے گذرے، چنانچہ سفرنامہ میں جو ۱۸۹۲ء میں لکھا گیا ہے، اپنی اس آرزو کو ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے: "میں نے کتبخانوں کے بیان میں جو تفصیل کی، وہ ایک خاص غرض سے کی، اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں، یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہنچانا اور ان کو چھاپ کر شائع کرنا ہے۔ ان ہی انجمنوں کی بدولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادر الوجود کتابیں ہم کو میسر آئی ہیں جن کے دستیاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، یہی انجمنیں ہیں جنھوں نے تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری کو کئی نسخوں سے صحیح کر کے چھاپا، اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شائع کیں، حالانکہ مصر و روم کے علماء اس نایاب تاریخی خزانہ سے بالکل ناامید ہو چکے تھے، اور شاہ عبد العزیز صاحب نے تو یقین دلا دیا تھا کہ وہ دنیا سے ناپید ہو گئی، بے شبہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہئے، بزرگانِ قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لائق مصنفین کتابوں کے انتخاب کے لئے ممبر مقرر ہوں، قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کرا کر منگائی جائیں، اور چھاپ کر شائع کی جائیں، یہ کام بظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اگر چار کروڑ مسلمانوں میں سے دس مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں، تو اس کام کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں،"

حیدرآباد میں دائرۃ المعارف الدکنیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے، اور جس کے ایک معزز

ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گذارش پر توجہ کرے گی ہم شکر گذاری کے ساتھ ان علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم کو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہے، اور ہم کو امید ہے کہ دائرۃ المعارف اور زیادہ توجہ اور اہتمام سے اس مقصد پر متوجہ ہوگی "

چند سال کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس خیالی آرزو نے اس حد تک ترقی کی، کہ اُس کو عملی شکل دینا چاہا، چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء کی منتقلی میں حسب ذیل تجویز کا اعلان کیا :-

" یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں تمام علوم و فنون کو نہایت ترقی دی تھی، اور ہر فن میں نئے خاص اجتہاد اور تحقیقات کے نتائج قلمبند کئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ علمی مذاق کو اس قدر تنزل ہو گیا کہ آج جو تالیفات و تصنیفات عام طور سے رائج ہیں، اکثر وہی ہیں جن میں بیجز جدت کی جھلک تک نہیں پائی جاتی، قدما کی تصنیفات جنہیں ہر جگہ اجتہاد اور ذاتی تحقیقات سے کام لیا گیا ہو عموماً متروک ہیں۔ خال خال کوئی قلمی نسخہ کسی بڑے کتب خانہ میں پایا بھی جاتا ہو، تو ہر شخص کو وہاں تک دسترس نہیں، اور اس لحاظ سے گویا اُن کا عدم و وجود برابر ہے،

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ مثلاً فقہ حنفی کا تمام تر دارومدار امام محمدؒ کی روایات اور تصنیفات پر ہے، جن کو اصطلاح فقہ میں ظاہر الروایۃ کہتے ہیں لیکن آج ان میں سے بجز جامع صغیر کے جو نہایت مختصر اور سب سے چھوٹی ہے، ایک کتاب بھی موجود نہیں، یہاں تک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے عظیم الشان کتب خانے بھی ان سے خالی ہیں، اسی طرح فلسفہ اور منطق میں مسلمانوں کو جن اموروں پر ناز ہو سکتا ہے، وہ یعقوب کندی، فارابی، ابن رشد ہیں لیکن ان کی تصنیفات اس قدر نایاب ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہے، قرآن مجید کے اعجاز و فصاحت و بلاغت پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے تمام متقدمین

ہیں ایک کتاب بھی موجود نہیں، تاریخ کی قدیم اور نادر تصنیفات تو گویا ہمارے ملک میں سرے سے آئیں ہی نہیں، بعض قدیم کتابیں جو یورپ میں چھپی ہیں، لیکن قطع نظر ان کے گراں قیمت ہونے کے ہر شخص کو بہم نہیں پہنچ سکتیں، ان واقعات کی بناء پر مجھ کو یہ خیال آیا کہ ایک مجلس قائم کی جائے جو اس مفید اور اہم کام کو انجام دے، اگرچہ حیدرآباد کی مجلس دائرۃ المعارف کا بھی یہی موضوع ہے لیکن جو تجربہ اس کے ابتدائی قیام سے اس وقت تک ہوا ہے اس کے لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں کہ وہ اس درد کی پوری دوا نہیں،

ملک میں عربی زبان کی جو کساد بازاری ہے اس کے لحاظ سے اگرچہ یہ تجویز فی الجملہ بے محل معلوم ہوتی ہے، لیکن دس کروڑ مسلمانوں میں سے دو چار سو ایسے شائق ضرور نکل آئیں گے جو معمولی قیمت پر کتاب کو خرید لیں، اور اگر اتنا بھی ہوا تو ہم اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہیں، بالفعل یہ تجویز ہے کہ اس مجلس میں تین قسم کے ممبر قرار دیئے جائیں،

(۱) وہ لوگ جو ع۔ سالانہ چندہ دینا منظور فرمائیں، اور یہی لوگ ارکین مجلس قرار دیئے جائیں گے، اور ان کو امور انتظامی مجلس میں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا، اور نیز جو کتاب یا کتابیں چھاپی جائیں گی گو کہ ان کی قیمت ان کے چندۂ ممبری سے زائد ہو ان کو دی جائیں گی۔

(۲) وہ اہل علم جو اس کام میں اپنی رائے اور واقفیت و تلاش سے امداد دیں اور اس قسم کی کتابیں بہم پہنچائیں، ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ مجلس ان کو تمام تجویزات اور حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع کرتی رہے گی، اور ایک یا دو نسخہ کتاب مطبوعہ کا ان کو نذر کرے گی،

(۳) وہ لوگ جو یہ منظور کریں کہ کتاب کے چھپنے پر ایک نسخہ قیمتِ معینہ پر خرید لیں گے، ان بزرگوں

کا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا جائے گا، اور جو کتاب چھپے گی اس کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں وی پی ایل بھیجا جائے گا،

یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سر دست جن کتابوں کا شائع کرنا پیشِ نظر ہے، وہ پانچ روپیہ قیمت سے زیادہ کی نہیں، اس غرض کے لئے جو کتابیں اس وقت تک ہم بہم پہنچا چکے ہیں، یا جو نہایت جلد بہم پہنچ سکتی ہیں حسبِ ذیل ہیں:-

اعجاز القرآن امام باقلانی، طبقات الشعراء لابن قتیبہ، **مناقب شافعی** للامام فخر رازی، مجموعۂ رسائل فارابی، جس میں ۱۰ رسالے شامل ہیں، تلخیص المقال ابن رشد مطبوعۂ یورپ، عمدہ لابن رشیق القیروانی، تاریخ صغیر امام بخاری،

ہم کو ملک کے تمام بزرگوں سے امید ہے کہ وہ اس تجویز کی بابت ہم سے خط و کتابت فرمائیں گے اور ہم کو مطلع فرمائیں گے کہ ان کو تین قسم کے ممبروں میں سے کس قسم کا ممبر ہونا منظور ہے، اور یہ کہ ان کے نزدیک کتبِ مذکورۂ بالا میں سے اول کس کتاب کا شائع کرنا زیادہ مناسب ہے،

گو یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، تاہم اس کا یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ ان نادر کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئی، تاریخ صغیر امام بخاری اور رسائل فارابی تو ہندوستان ہی میں چھپے، باقی طبقات الشعراء ابن قتیبہ، اعجاز القرآن باقلانی، عمدہ ابن رشیق قیروانی، تلخیص المقال ابن رشد وغیرہ مصر سے چھپ کر نکلیں،

دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن "نواب عماد الملک مرحوم، ملا عبد القیوم مرحوم، اور مولانا انوار اللہ خاں صاحب کی کوششوں سے سرکار نظام کی امداد سے تقریباً ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد دکن میں قائم

ہوا تھا، جس کا مقصد عربی کی قدیم و نادر کتابوں کی اشاعت تھی، مگر وہ ان دنوں زیادہ مذہبی کتابوں کی اشاعت میں مصروف تھا، مولانا کی بار بار کی چھیڑ چھاڑ نے اس نے ادھر توجہ کی، اور اگست ۱۹۰۳ء میں دائرہ کی طرف سے مولانا سے خواہش کی گئی کہ وہ دائرہ کے کاموں کے لئے ایک خاکہ تیار کر دیں، چنانچہ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ایک مفصل خاکہ بنا کر بھیجا، جس میں علوم قرآن کی بعض نادر کتابوں کے پتے اور خصوصیات تھے، یہ تمام خط و کتابت مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کے بدولت معارف مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں چھپ چکی ہے، بحمداللہ دائرہ آج تک برابر اپنے کاموں میں پوری طرح مصروف ہے۔

قدیم حنفی فقہ کی چند بنیادی کتابوں کی طرف مولانا نے توجہ دلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بھی اسی سرزمین دکن کے ایک مخلص قدردان عالم کو توفیق بخشی، جس نے بڑی محنت اور ایثار سے حیدرآباد میں احیاء المعارف النعمانیہ کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے، اور اس وقت تک ہند و مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے متعدد نادر کتابیں بہم پہنچا کر تحشیہ و تصحیح کے ساتھ شائع کی ہیں، جزاھم اللہ خیرا الجزاء، اس طرح جو تجویز ایک دردمند دل سے نکلی تھی، وہ دردمند دلوں کو متاثر کر گئی،

حیدرآباد کا دوسرا سفر اور وظیفہ سنہ ۱۹۰۱ء

مولانا علی گڑھ کی کشمکش سے گھبرا کر یکسوئی اختیار کرنا چاہتے تھے، مگر حالات موزوں نہ تھے، والد بزرگوار یہ بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے، اور کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی، لیکن خوش قسمتی سے حیدرآباد میں اس وقت نواب وقار الامراء بہادر کی وزارت تھی، اور مولوی سید علی بلگرامی کو جن سے مولانا کے خاص روابط تھے، نواب

صاحب کے یہاں خاص رسوخ حاصل تھا موصوف نے انکو حیدرآباد بلایا، وہ وہاں چار پانچ مہینے جا کر
رہے، نواب صاحب ممدوح کی سفارش سے اعلیٰ حضرت نظام الملک میر محبوب علی خاں نے
از راہ قدردانی سو روپئے ماہوار کا وظیفہ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۱۳ھ سے منظور فرمایا، اور یہ شرط کی
کہ آیندہ مولانا کی تمام تصنیفات سلسلۂ آصفیہ میں شامل ہوں۔ اس وظیفہ کے ساتھ جب
ذیل فرمان عنایت ہوا: "مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڈہ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر
ہیں، چار ہفتہ سے بلدہ میں مقیم ہیں، مولوی صاحب موصوف ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں
اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں، ان کی قدردانی گورنمنٹ انگریزی اور گورنمنٹ روم
سے بھی بہ عطائے خطاب وتمغہ ہوئی ہے، اب ان کی تمنا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے
کام میں صرف کریں، اور معمولی درس وتدریس کو ترک کردیں، مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے
کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے، اور اس وقت کوئی عالم ہندوستان میں
ایسا نہیں ہے جو پرانے ذخیروں سے اس طرح کام لے، چونکہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضرور ہے
لہذا سرکار نے بالفعل سو روپیہ کلدار ماہوار جاری کرنے کے لئے منظوری صادر فرمائی ہے، اور یہ بھی حکم دیا
ہے کہ ان کی تصنیفات کے دیکھنے کے بعد اضافہ کیا جاوے گا، جو کتابیں مولوی صاحب موصوف
تصنیف کریں گے وہ سرکار آصفیہ کے نام سے مشتہر ہوں گی پس حسب الحکم سرکار تاریخ حکم سے جو ۳۰
ربیع الثانی ۱۳۱۳ھ ہے سو روپیہ کلدار ماہوار شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے نام جاری کی جاوے،
ایک نقل اس کی مولوی شبلی صاحب کو دیا جاتا ہے۔"

یہ قدردانی تو سرکار کی طرف سے ہوئی، دار السلطنت کے امراء اور اکابر اور اہل علم نے

بھی قدر دانی میں کمی نہیں کی، چنانچہ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی مسعود علی صاحب بی اے محوی،
(حال مترجم دار الترجمہ) مولوی حمید الغنی صاحب وارثی بہاری مددگار محاسب سرکارِ عالی، اور مولوی
محمد جامع صاحب مددگار معتمد عدالت کی کوششوں سے ۱۱ ربیع الثانی کو کاسموپولیٹن ہوٹل میں (جس کو
اب محسن الملک کی کوٹھی کہتے ہیں) ایک کامیاب جلسہ ہوا، مولوی خدا بخش خاں مرحوم جن کی
پٹنہ میں لائبریری مشہور ہے، اور جو ان دنوں وہاں کی عدالتِ عالیہ یعنی ہائیکورٹ میں میرِ مجلس
(چیف جسٹس) تھے، جلسہ کے صدر تھے،

جلسہ میں پہلے مولوی عزیز مرزا مرحوم نے ایک سپاسنامہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا، اس
سپاسنامہ پر بعض بڑے بڑے امرا جیسے رکن الملک خان دوراں، تراب جنگ، عماد نواز جنگ،
جہانگیر یار جنگ، تفضل یار جنگ، حمید یار جنگ، حسن یار جنگ، انتظام جنگ، بعض اکابرِ علما جیسے سید
شاہ عبد الرحیم قادری، مولوی حکیم عبد الرحمن صاحب سہارنپوری خلف مولانا احمد علی صاحب محدث
سہارنپوری، مولوی وحید الدین صاحب مدرس دار العلوم، اور بعض وکلائے ہائیکورٹ جیسے محمد یار
بیرسٹرایٹ لا، سید ابو القاسم وکیل ہائی کورٹ، فدا حسین خاں وکیل ہائی کورٹ، محمد عبد الباقی صاحب
ہائیکورٹ، بعض اور معززین جیسے سید محمد مہدی خاں، میر نثار حسین، سید لطف علی، محمد زمان خاں

۱؎ یہ تفصیل حالات آئینہ دکن کے سلسلہ میں جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے معارف کے لئے
لکھ کر بھیجے تھے، اور جو معارف اکتوبر ۱۹۲۸ء میں چھپے، اسی قسم کی اطلاع منشی ظفر الملک صاحب علوی
(اڈیٹر الناظر) نے جو ان دنوں حیدرآباد میں تھے، اور نواب اکبر یار جنگ بہادر (سابق معتمد عدالت
سرکارِ عالی) نے ہم کو بھیجی تھی،

۲؎ یہ اصل سپاسنامہ اس وقت تک دار المصنفین میں موجود ہے، اور میرے پیشِ نظر ہے،

نصیر الدین، سرفراز حسین وغیرہ کے دستخط ہیں، بعض صاحبوں کے دستخط پڑھے نہیں گئے، سپاسنامہ یہ ہے:

بخدمت فیضدرجت جناب فضیلت مآب شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب متعنا اللہ بجمیدہ ودام افضالکم

عالیجناب

ہم لوگ جنہیں آپکے ہم ملت ہونے کا افتخار حاصل ہے اس موقع پر جبکہ آپ شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف فرما ہوئے ہیں، آپکے خیر مقدم کے لئے حاضر ہوئے ہیں، اور ان احسانوں کو یاد کرکے جو آپنے قوم اور ملک پر اپنی عالمگیر تصنیفات کے ذریعہ سے کئے ہیں، شکرگذاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، آپ کی پُرجوش مثنوی "صبح امید" نے سب سے پہلے ایک نئے گردوں با انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوشخبری سنائی اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوشگوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تیرگی کے زمانہ میں یہ کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتے، آپ کی مورخانہ تحقیق نے مامون الرشید کے حالات اس خوبی سے جمع کئے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت و جبروت اور دربار خلافت کی شان و شوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدان تہذیب و شائستگی میں آگے تھے، خود بخود ظاہر ہوگئے، آپنے سیرۃ النعمان میں نہ صرف ایک ایسے مجتہد مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ تھی، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت غرائے مصطفوی جس طرح نجات اُخروی کے لحاظ سے

صراط مستقیم ہے، اسی طرح دنیاوی معاملات کے لئے بھی ایک عمدہ دستور العمل ہو، اور یورپ میں معقولیت کا یہ خیال کہ وہ رومن جورس پروڈنس کی ممنونِ احسان ہو، راستی سے کس قدر بعید ہے، آپنے کتب خانہ سکندریہ کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اس دھبہ سے اسلام کے دامنِ عزت کو بالکل پاک وصاف کر دیا، جو عیسوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈ گبن جیسے نامور مورخ کی پُرجوش کوشش بھی بھی اس کو نہ مٹا سکیں، آپنے یورپین نکتہ چینوں کے مقابلہ میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی، بلکہ وہ ایک فوجی ٹیکس تھا جس کی ضرورت اس زمانہ میں بھی مسلم ہے، اور حال میں جب ارمنی سازشوں کی بدولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہرِ الٰہی سمجھنے لگے، تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پُرزور قلم تھا کہ جس نے حقوق الذمیین کی تصنیف کرکے بتا دیا کہ جیسے فیاضانہ اصول شریعت اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کئے گئے ہیں، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہو، آپنے مسلمان تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روح تازہ پھونک کر ایک ایسا کام کیا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا، اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنونِ احسان رہیگا، آپنے صرف اپنے قلم اور دماغ ہی سے امتِ مرحوم کی حمایت نہیں کی ہے، بلکہ آپ کے علمی ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور دراز سفر اختیار کیا اور وہاں سے ایک ایسا بیش بہا تحفہ ساتھ لائے جس نے ہمارے ذخیرۂ معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہمدردی کو وسیع کرکے ٹرکی سے ہمارے رابطۂ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا، اگرچہ سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہماری سرکار عالیہ نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدر دانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصل قدر دانی وہی ہے جو پبلک کی طرف سے ہو، آپ کی تصنیفات سے ہم حیدرآباد کی

بھی اسی طرح مستفیض ہوئے ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطے کے لوگ ہو سکتے ہیں، اور اس لئے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کر کے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک اسلام اور قوم کی خدمت گذاری کے لئے زندہ و برقرار اور ہمارے لئے باعث افتخار رہیں آمین ثم آمین، فقط

اس سپاسنامہ کے پڑھے جانے کے بعد مولانا کھڑے ہوئے، انھوں نے پہلے اس سپاسنامہ کے جواب میں دو بندوں کا ایک یہ فارسی ترکیب بند اپنے خاص پُراثر لہجہ میں پڑھا،

اے وطن ریکجہاں راسرو سودا باتست	اے کہ جوید صد یاس و تمنا باتست
اے کہ صد نقش زہر پردہ برانگیختۂ	اے کہ صد جلوہ گری ہائے تماشا باتست
ناہد ہستی کہ سرِ صدق و صفاہست ترا	شاہد ہستی کہ دلآویز ادا ہا باتست
سازِ نیرنگی وصد نغمۂ رنگیں داری	موج ارزنگی وصد پیکرِ زیبا باتست
یادگارِ حشم دیلم و سلجوق استی	مایۂ دولت بغداد و بخارا باتست
داستاں ہائے عزیزاں ہمہ از برداری	خبر از قافلۂ یثرب و بطحا باتست
آں پراگندہ خزادِ عرب و نسلِ عجم	یعنی آں و فترِ اسلام مجزا باتست
گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است	آں ورق ہائے پراگندہ بیکجا باتست
گرچہ زاں میکدہ کنوں اثرے نیست بجا	جرعۂ چنداز اں شیشۂ و مینا باتست
گرچہ آں تازہ چمن رفت بتاراجِ خزاں	باز ہم بوئے خوشے زاں گلِ رعنا باتست

لہ یہ ترکیب بند ہمارے پاس پورا نہ تھا اور کلیات میں بھی شامل نہ ہو سکا، مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی (حیدرآباد دکن) کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں اس کو ہمارے پاس بھیجا،

گرمیِ صحبتِ آں میکدہ سرجوشِ تو ہست

معرکۂ طوس و بغداد در آغوشِ تو ہست

اے بزرگانِ گرامی پایہ و ارکانِ دکن
اے ہمہ شمع فروزندۂ ایوانِ دکن

ہر سرِ موے من امروز زبانے شدہ است
چہ سپاس آوری منت نیانِ دکن

پاے تا سر ہمہ دربندِ کرم ہاے شماست
می تواں خواند فراز ہمہ میرانِ دکن

با غریبے چو منے ایں ہمہ لطف و کرم
چہ کنم گر نشوم ہمسرِ حسّانِ دکن

ہم ز گیرائیِ اخلاقِ دل آویز بود
کہ بود رومی و شامی ہمہ مہمانِ دکن

بوے خلق است کہ دل می برد ورنہ مرا
تواند کہ فریبد گل و ریحانِ دکن

یارب آں باد کہ ایں تخت گہِ دولت و دیں
سبز و خرم بود از فیضِ سلیمانِ دکن

میر محبوب علی خان نظامِ آصف جاہ
تاجدارِ دکن و قیصر و خاقانِ دکن

صدرِ عظیم مرتبہ نواب وقار الامراء
آنکہ صد پایہ فزود از شرفش شانِ دکن

واں دگر صدر نشینان و عزیزانِ دکن
کہ بود از دمِ شاں زینتِ ایوانِ دکن

ہمہ را بزمِ طرب با سر و ساماں باشد

شبلیِ خستہ ہم از عاطفہ پرساں باشد

یہ ترکیب بند لوگوں کو اس قدر پسند آیا کہ بہت سے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا، اور آج تک (سنہ ۱۹۲۵ء) اس کو مزے لے کر دہراتے ہیں، بعض خوش وقت شاعروں نے اس کا جواب لکھا[1]

[1] یہ بیان بھی منشی صاحب ہی کا ہے جنھوں نے شرکائے جلسہ کی زبانی سن کر لکھا ہوگا۔

کے بعد مولانا نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک دل آویز تقریر فرمائی جلسہ میں اہلِ علم کا کافی مجمع تھا، اس نے وہ بہت لطف اندوز ہوئے،

مولانا کے اس سفر سے بعض ارکان کالج کو یہ خیال ہو چکا تھا کہ وہ کالج چھوڑنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر کا حال سُن کر نواب محسن الملک نے مولانا شبلی کو ایک خط لکھا، یہ خط تو نہیں ملا، لیکن مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ مکاتیب میں داخل ہے، یہ خط معاملہ پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، غالباً نواب صاحب نے مقصد سفر کے جانچنے کے لئے یہ لکھا تھا کہ "آپ شاید اپنے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے چندہ کے لئے حیدرآباد گئے ہیں، مولانا ۱۵ ستمبر ۱۸۹۶ء کو حیدرآباد سے ان کو جواب دیتے ہیں،

جناب من!

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آگئی، آپ لوگ مجھ کو اس قدر مجبور اور سادہ دل سمجھتے ہیں، اسکول کے لئے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا، لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے، باہر نہیں جاتا، مجھ کو سر دست سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے، خرچ بڑھ جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں متبذل بے حیثیت سے رہ کر بسر کروں تو پس انداز ہو سکتا ہے، باقی وہاں کے لئے یہاں کے لوگوں سے چندہ، یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے،

مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں ہے، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دنیا داری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی

اور بغیر اس کے کامیابی معلوم،

اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا،

یہاں مجھے میری خواہش کا استفسار ہوا، میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی
چنانچہ اسی قدر ماہوار کا منصب مقرر ہو گیا، الفاروق کے بعد غالباً اضافہ ہو جائے، روبکاری میں بھی اضافہ
کا وعدہ درج کر دیا گیا ہے گو مقدار کی تعیین نہیں، بس میری تمنا زندگی کو یہ بہت ہے، تنزل کا ارادہ نہیں، زیادہ
دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے، ہندیوں قوم کا حقیقی جوش رکھتا
ہو...... یا قوم کی خدمت کرنی ہے اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کر کے دو چار کو نوکری دلا دی جائے
ان کو اس قابل بنانا چاہئے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں۔

اس خط کا تیور دیکھا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض ارکان کالج کے طرز عمل سے اُن کی
ناراضی کس حد تک تھی،

مولانا کا یہ خیال کہ الفاروق کے بعد اُن کے منصب میں ترقی ہو جائے گی درست نہیں
نکلا، آخر ۱۹۱۳ء میں نواب عماد الملک مرحوم کی سفارش سے حضور نظام میر عثمان علی خاں کے
عہد میں یہ توقع پوری ہوئی، اعلیٰحضرت نے دو سو کا اضافہ فرما کر تین سو کر دیئے، اس کے بعد مولانا
جینے ہی کتنے دن، آخر یہ رقم دار المصنفین کے کام آئی،

مولانا سے انگریزوں کی سیاسی بدگمانی

اس زمانہ میں پین اسلامزم کا ہوّا سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اور یہ سمجھا
جاتا تھا کہ سلطان عبد الحمید خاں اس کے مرکز اور دنیائے اسلام کے ہر حصہ
میں اُن کے نائب موجود ہیں، جو اس تحریک کو چلا رہے ہیں، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے

برخلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے اُن کو اسی طرح بغاوت پر آمادہ کرتا ہے جس طرح یورپ کی سلطنتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو ابھار کر بغاوت پر آمادہ کر رہی ہیں،

سفر روم سے واپسی کے بعد انگریز حکام میں مولانا کی طرف سے یہ بدگمانی پھیلی کہ وہ اسی پین اسلامزم (اتحاد اسلامی کی تحریک) کے داعی اور سلطان عبدالحمید خاں کے سفیر بن کر ہندوستان واپس آئے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک ہندوستان میں ترکوں کے متعلق جو معلومات پھیلے تھے، وہ زیادہ تر عیسائی سفرنامہ نگاروں اور یورپین اہل قلم کے پھیلائے ہوئے تھے، جن میں بڑا حصہ تعصب کی رنگ آمیزی کا تھا، اس سفرنامہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کے متعلق براہ راست معلومات کا سرمایہ بہم پہنچایا، اور ان کے اخلاق ومعاشرت اور علمی وفنی ترقیوں سے آگاہ کیا، اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کو مصنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود ترکی سے مربوط ہونے کے لئے تعلقات کی ایک نئی زنجیر پیدا کر دی، انگریز حکام نے ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا،

اتفاق دیکھئے کہ اسی زمانہ میں کالج میں کوئی جلسہ تھا جس میں مولانا نے اردو کا ایک وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا

بزم احباب ہو پُرجوش ہو جلسا کیسا — جم گیا پھر طرب عیش کا نقشا کیسا

اس میں ایک شعر تھا:-

نوجوانو! یہ حریفوں کو دکھا دینا ہو — اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا

اس شعر کو پڑھتے وقت حریفوں کے لفظ پر بے اختیار انگلی اُن انگریزوں کی طرف اُٹھ گئی،

جو جلسہ میں بیٹھے تھے، سمجھانے والوں نے ان کو سمجھایا کہ یہ اشارہ انگریزوں کی طرف تھا، اور یہ طالبعلموں کو بغاوت کا سبق تھا، ایک انگریز نے دوسرے سے کہا اور بات عام ہوگئی، مولانا فرماتے تھے کہ اسی زمانہ میں وہ علی گڑھ سے آتے ہوئے ریل کی کسی بے ترتیبی سے فیض آباد اتر گئے، اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھہر گئے، بنگلہ کے خانساماں نے مولانا کا نام سنا تو ملنے آیا، مولانا نے پوچھا کیسے آئے تو اس نے کہا کہ کچھ صاحب لوگ یہاں آئے تھے، وہ آپ کا نام لے لے کر کچھ یوں ہی کہہ رہے تھے، اسی سے دیکھنے کو جی چاہا،

کالج میں مولانا کی سیاسی رائے کئی دفعہ یونین کے جلسوں میں ظاہر ہو چکی تھی، وہ شخصی سلطنت کو مضر سمجھتے تھے، اور جمہوریت کے حامی تھے، اسی زمانہ میں کانگریس کا غلغلہ اٹھا تو وہ اس تحریک کے مداحوں میں نکلے، ابھی یہ آواز دبنے نہیں پائی تھی کہ ۱۹۰۵ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء کی آواز اٹھی اور اس زور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی، مولانا اس صدا پر لبیک کہنے والوں میں سب سے آگے تھے، ان سب باتوں نے مل ملا کر ان کے خلاف بدگمانیوں کا اچھا خاصہ مسالہ اکٹھا کر دیا، یہی واقعہ آگے چل کر دوسرے واقعات کے ساتھ مل کر مولانا کے کالج چھوڑنے کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب ہوا، سید محمود کے بعد نواب محسن الملک جب سکریٹری ہوئے تو انھوں نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر مولانا کی نسبت گورنمنٹ کو جو شکوک تھے ان کے رفع کرنے کی کوشش کی،

یہ بدگمانی اتنے دنوں تک قائم رہی کہ جولائی ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے شملہ میں جو ایک اورینٹل کانفرنس بلائی تھی، اور جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس میں غالباً مسٹر ہربن جیت

سکریٹری گورنمنٹ یوپی نے جو اردو اور فارسی اچھی خاصی جانتے تھے، اُن سے پوچھا کہ "انگریزی گورنمنٹ کے متعلق مسلمانوں کی رائے شرعی حیثیت سے کیا ہے؟" مولانا نے فرمایا "مسلمانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ہر جمعہ میں السلطان ظل اللہ فی الارض پڑھتے ہیں"۔ برن صاحب نے کہا "اس سے مراد تو سلطان ترکی ہیں؟"

یہ واقعہ مولانا نے مجھ سے ذکر فرمایا تھا، اور کہتے تھے کہ دیکھو اب بھی یہ کانٹا ان کے دل کا نہیں نکلا،

مولانا کے ساتھ ان ہی دنوں خفیہ جاسوس بھی لگائے گئے، سلطان سے جو تمغۂ مجیدی یعنی ملا تھا، وہ نشانِ عزت بھی چوری گیا، خدا جانے یہ چوری سیاسی تھی یا اخلاقی، مگر تولہ بھر چاندی کی قیمت ہی کیا تھی؟ یہی زمانہ ہے جب سرسید کے مشورہ سے مولانا نے خلافت پر ایک مسلسل مضمون لکھنا چاہا، جس میں ترکوں کی خلافت کی مذہبی حیثیت سے انکار کیا تھا، یہ مضمون علیگڈھ میگزین میں چھپا، مگر چونکہ یہ آورد تھا، آمد نہ تھا، اس لئے وہ ناتمام ہی رہا۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں رکن وفدِ خلافت کی حیثیت سے لندن گیا تھا تو پروفیسر آرنلڈ اس مضمون کو یاد دلاتے تھے، میں کہتا تھا کہ مولانا نے لکھا نہیں، لکھوایا گیا تھا، بہرحال انگریزوں کی یہ بدگمانی بڑھتی ہی رہی، یہاں تک کہ طرابلس، بلقان اور کانپور کے زمانہ میں وہ واقعہ بنکر نمودار ہوئی،

کشمکش اور اختلاف ہمارے ناظرین اس کتاب کو جس ترتیب سے پڑھتے آرہے ہیں، اس سے اُن کو پتہ لگ رہا ہوگا، کہ اب جیسے جیسے دن گذر رہا ہے، سید اور شبلی میں وہ اگلا سا ارتباط، اور وہ پہلا سا اعتراف نہیں رہا ہے، اور اب وہ موقع آرہا ہے کہ ان کو سرسید کے حلقہ سے علانیہ

باہر آ جانا چاہیے،

اس اختلافِ حال اور کشمکش کے اسباب گو حیاتِ جاوید میں جگہ نہ پا سکے، مگر وہ تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے، ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے ان اسباب پر ایک نظر ڈال لی جائے، اور گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، اگر ہم ان شعاعوں کو یکجا کر لیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پہنچ جائے گی۔

سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہمنشینوں سے آمنّا و صدّقنا کے سوا کوئی اختلافِ رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے،[1] اسی کا نتیجہ ان کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی جو ان کے دلی دوست اور معاون تھے وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے فرانس چل کر ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا، اور بات اتنی تھی کہ مولوی سمیع اللہ صاحب کالج میں مسلمان بچوں کی تربیت کا کام انگریزوں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتے تھے، اور سرسید نے تعلیم و تربیت دونوں ان ہی کے سپرد کر دی تھی، کالج میں مسٹر بیک پرنسپل کی ہمہ گیر حکومت، ٹرسٹیز بل کی منظوری اور سید محمود کی جانشینی کے مسئلوں میں ان کے بڑے بڑے دوست ان سے الگ ہو گئے، اور اس اختلاف کے صلہ میں سرسید کی زبان سے وہ کچھ سنا جس کی توقع ان سے نہیں ہو سکتی تھی،

سرسید پر مولانا نے سب سے پہلی تنقید اپنی سب سے پہلی تصنیف گذشتہ تعلیم میں کی، رسالہ کے ختم

[1] حیاتِ جاوید اول ص ۵۲ میں مولانا حالی نے دبے لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے، لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک نرالی طبیعت کے آدمی تھے، اس خصلت کو چاہو ان کے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو، اور چاہو

میں تراجم کا بیان ختم کرکے ایک ریمارک کے نیچے لکھا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ عربوں نے عربی زبان میں دنیا کے علوم کا ترجمہ کرکے اپنے زمانہ میں جو ترقی کی اُس قیاس پر آج عمل نہیں کیا جا سکتا، سینٹیفک سوسائٹی علی گڈھ کے بانیوں کو عربی کے اس واقعہ سے دھوکا ہوا، اور وہ یہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے ترجموں کے ذریعہ سے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے اپنے علوم اور قوم کو ترقی دینگے، یہ خیال غلط تھا، کیونکہ ان ترجموں کے لئے لاکھوں روپیے درکار ہیں، جو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ممکن تھا، اور اب غیر ممکن ہے، دوسرے یہ کہ اُس زمانہ میں علوم محدود تھے، اور ترقی رُک چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کرلی گئی تھیں یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کرلیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے اور نہ کتابوں کے شمار کی حد ہے، تیسری بات یہ کہ اس زمانہ میں عربی، اسلامی ملکوں میں حکمران زبان تھی، اور اردو حکمراں زبان نہیں، اور دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ قوم نے اُس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہ ہو، آخر میں تھا، مگر ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ خود سید احمد خاں صاحب نے جو سینٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے؛

معلوم ہوتا ہے یہ ہلکا سا اعتراض جس کی معذرت بھی کردی گئی تھی سرسید کو پسند نہیں آیا تھا، کیونکہ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں اس سرسری سی بات کے جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی، اور حاشیہ کا ایک پورا صفحہ اس کے لئے نذر کیا، اور بتایا کہ یہ خیال خود سرسید کی تحریروں سے ماخوذ ہے، مولانا شبلی کا آپ پیدا کیا ہوا نہیں، پھر لکھا ہے کہ انجمن رعایا اپنی طاقت سے وہ کام کررہی ہے جو کل تک صرف سلاطین ہی کرسکتے تھے، اور یہ بھی فرمایا کہ اگر تاریخ میں کوئی مثال

ایسی نہیں کہ کسی غیر حکمراں زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی گئی ہو تو فروغ نہیں کر تیند وہی تہ ہو۔
یقیناً مولانا حالی کا بیان صداقت پر مبنی ہے، اور جامعہ عثمانیہ کے وجود نے ہمارے ملک
کے ان مخلصانہ جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اتفاق دیکھئے کہ حیدرآباد میں اردو حکمراں زبان کی حیثیت
رکھتی ہے، اور اس نے خلفاے عباسیہ ہی کی طرح اردو تراجم پر روپیہ بہایا، اور اس لئے مولانا حالی
اور مولانا شبلی دونوں کے شرائط کے مطابق اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ علوم و فنون کی ترقی کا باعث
بنے، اور کیا عجیب بات ہے کہ یہ تجویز مولانا شبلی کی اس تحریر کے تیتیس برس بعد خود مولانا شبلی ہی
کی تحریک سے عالم وجود میں آئی، اور ان کے شاگرد رشید و برادر عزیز مولانا حمید الدین صاحب کے
ذریعہ سے تجویز نے عمل کا پیرایہ اختیار کیا،

مگر سرسید اور مولانا شبلی کے بیانوں میں ایک ذرا فرق ہے، سرسید نے اپنی تعلیمی شہادت
میں یہ تسلیم کیا ہے، کہ ہندوستان میں حکمران زبان انگریزی ہے، اس لئے ہندوستان میں انگریزی
ہی کے ذریعہ تعلیم ممکن ہے، اور مولانا شبلی نے یہ نہیں کہا، بلکہ یہیں تک کہہ کر رہ گئے کہ حکمران زبان
ہی کے ذریعہ قوم میں علوم و فنون کی ترقی ممکن ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم
فنون کی زبان بنانا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمران زبان بنائے، اور آج تو اس
کی روشنی میں ہماری زبان حکمران زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے، اور علوم و فنون کے خزانوں سے
بھر رہی ہے،

بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی، مقصود یہ ہے کہ سرسید پر تنقید کے لئے مولانا شبلی کی زبان کھلنے
میں آنے کے چند سال بعد ہی کھل چکی تھی،

اس کے بعد دوسرا سبب مذہبی اختلاف ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی صحبت میں مولانا میں جو بچپن ہی سے علوم عقلیہ سے دلچسپی رکھتے تھے مذہبی عقل پسندی آگئی تھی، اور عقل و نقل کی تطبیق کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، اور اشاعرہ کے بہت سے مسائل کی خامیاں یا غلطیاں ان کو نظر آنے لگی تھیں، مگر یہ قطعاً غلط ہے کہ وہ معتزلی بن گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ وہ شدید حنفی تھے، اور اسی اصول پر وہ علم کلام کی طرف جھکے تو ماتریدیت پر اگر رکے، بہر حال یہ بحث اپنے موقع پر آئیگی،

لیکن اس عقلیت پسندی کے باوجود وہ ماشاء اللہ دینیات پر عبور رکھتے تھے، اور کلام و محاورات، ادب کے پوری طرح ماہر تھے، اس لئے سید صاحب اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے اس کے لئے وہ مولانا سے جس قسم کے معلومات چاہتے تھے وہ گو ان کے لئے مہیا کر دیتے تھے، مگر وہ خود ان کی اس قسم کی تاویلات کو پسند[1] نہیں کرتے تھے، اسی لئے مولانا نے ان کو آہستہ آہستہ عقل پسندی کی آزاد شاہراہ سے ہٹا کر امام غزالی، رازی، ابن سینا اور قاضی ابن رشد کی تصنیفات تک آشنا اور معتزلہ کے خیالات سے باخبر کیا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرسید کی آزاد خیالی جس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی، آخر میں حکماء و متکلمین اسلام کے خیالات تک محدود ہو کر رہ گئی،

ایک دفعہ مولانا فرماتے تھے کہ سید صاحب جنات کی حقیقت پر ایک رسالہ لکھ رہے تھے،

---

[1] مولانا حالی اپنے مضمون "سرسید اور مذہب" مندرجہ علی گڈھ میگزین [illegible]، [illegible] میں فرماتے ہیں: "مگر ان کے ساتھ بہت کم مقامات ان کی تفسیر میں ایسے ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ایسے تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا، اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں۔"

(وہ رسالہ چھپ بھی گیا ہے) اتفاق سے اسی زمانہ میں امام باقلانی کی اعجاز القرآن آئی، ان میں جنوں کے اشعار ہیں، اور جاہلی شعراء کے ایسے اشعار ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ جنوں سے ہماری دوستی ہے وہ ہمارے پاس آتے ہیں، اور ہمارے ساتھ کھاتے ہیں وغیرہ مولانا نے سرسید سے اس کا ذکر کیا، تو بولے کہ یہ اشعار ہمارے بڑے کام کے ہیں، ہم کو دیجئے لیکن سرسید ان اشعار کو اس کام میں لائے کہ کلام عرب میں جنوں کے معنی دہقانی صحرائی یا جنگلی انسان کے ہیں، حالانکہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا، وہ جن کے مستقل وجود کے قائل تھے، ابن تیمیہ کے مضمون میں فرماتے ہیں: "جن کے وجود سے انکار نہیں، لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے"۔

سرسید کا بڑا کارنامہ خرقِ عادت کا انکار ہے اور اسی کے لئے وہ دور از کار تاویلوں پر سہارا ڈھونڈتے ہیں، مولانا اس کے متعلق الکلام میں ایک موقع پر لکھتے ہیں: "قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ (؟) ان کی عموماً تاویل کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہ اشاعرہ کی افراط پسندی کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، لیکن انکار محض بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کافی ہیں، جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرز اسلوب سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلبیس کیا کام دے سکتی ہے"[1]

اسی تصادم سے بچنے کے لئے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا، کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا، سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لئے تقاضا کرتے تو ٹال جاتے،

لہ الکلام

بست مجبور کیا تو آخر میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ مطابق جولائی ۱۸۹۵ء کے پرچہ میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۷ار شوال ۱۳۱۳ھ کے پرچہ میں "مشاہیر معتزلہ" کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا، اس مضمون میں بھی مولانا نے اپنے چھپانے کا اتنا اہتمام کیا کہ صاف صاف اپنا نام شبلی نعمانی لکھنے کے بجائے شبلی کی جگہ "الاسدی" اور نعمانی کی جگہ "الاعظمی" لکھا،[1]

اسی طرح بعض فقہی مسائل کا حال تھا، سرسید عیسائیوں کی گردن مروڑ کر ماری ہوئی مرغی کو اس بنا پر حلال سمجھتے تھے، کہ اہل کتاب کے ذبح کا یہ موجودہ طریقہ ہے، اور اہل کتاب کا ذبیحہ اسلام میں حلال ہے، سرسید نے اپنے اس مسلک کی تائید میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے، حالانکہ گو اس میں شبہ نہیں کہ اہل کتاب کا کھانا (طعام) اور ذبیحہ حلال ہے، مگر اس شرط کے ساتھ ہے کہ محرمات اسلام میں سے نہ ہو، اور دم گھٹ کر مرا ہوا یا دم گھوٹ کر مارا ہوا جانور قرآن پاک کی تصریح (والمنخنقۃ) کے مطابق اسی طرح حرام ہے جیسے سؤر جس کو سرسید بھی حرام کہتے ہیں، اور اس کا کھانا حرام جانتے ہیں۔

مولانا کو سفر روم میں جہاز پر یہ موقع پیش آیا تو لکھتے ہیں: "چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر پرند جانور ذبح نہیں کئے جاتے، اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، میں نے دو تین روز تک پرندے کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا، مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب پوچھا، میں نے کہا ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے، بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے، چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، میں خود گیا اور

[1] شبل کے معنی بچہ شیر کے ہیں، اس کا ترجمہ الاسدی، اور نعمانی امام اعظم کی طرف نسبت تھی تو اس کو اعظمی کر دیا،

اس کی تصدیق کی، ذبح کرنے والا عیسائی تھا، ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا، اگرچہ حنفیوں کے یہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں لیکن اس مسئلہ میں چند دنوں کے لئے میں شافعی بن گیا تھا، جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔ (سفرنامہ ص)

ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے، فرمایا اس لئے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے۔ آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں، مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہے، اور آپ شریک نہیں ہوتے، وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے۔ انھیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں، اور آپ دو نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوٰتین) پڑھتے ہیں،

ایک بات سے دوسری بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی، مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا، اس کے بعد مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی، جو اس زمانہ میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے، اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، مگر مولانا حمید الدین صاحب نے انکار کیا، اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے، مولانا حمید الدین کی اس صاف گوئی سے گو مولانا شبلی کا کوئی تعلق نہ تھا، مگر سرسید کی بدگمانی میں اس سے اضافہ ہوا،

سرسید دعاؤں کی قبولیت کے قائل نہ تھے، اور اس لئے قبولیت کے لئے دعا مانگنے کو

فعل عبث قرار دیتے تھے، اس مسئلہ پر تہذیب الاخلاق میں اُن کے مضامین، اور ان کے اور نواب
محسن الملک کے سوال و جواب چھپ رہے تھے، اُسی زمانہ میں علی گڈھ کے ایک ہندو بزرگ جو اچھے
پڑھے لکھے اور صوفیانہ خیال کے آدمی تھے، اعظم گڈھ میں پوسٹ ماسٹر تھے، انھوں نے سرسید کے
مضمون الدعاء والاستجابۃ کی تردید میں ایک دلنشین رسالہ شائع کیا، جس پر نواب وقار الملک
نے نہایت عمدہ ریویو لکھا، اور اس ریویو کے سلسلہ میں اس پر افسوس کیا کہ سرسید جو نہ صرف مسلمان
اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں، بلکہ خانوادۂ رسالت کے چشم و چراغ ہیں وہ تو دعا کو جو بندہ اور خدا
میں ربط کا واحد ذریعہ ہے، غیر ضروری اور فضول بتائیں، اور ایک ہندو جس کو کافر کہا جاتا ہو
اُس کی حمایت کو کھڑا ہو، اس رسالہ کی قوتِ استدلال اور انداز بیان سے بعض لوگوں کو شبہہ
ہوا کہ اس کے مصنف دراصل مولانا شبلی ہیں، اور اس شبہہ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اعظم گڈھ میں
لکھا گیا، جو مولانا کا وطن تھا، اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب مولانا کے واقف کار اور شناسا بھی تھے[1]

ان واقعات کے ساتھ الفاروق کی تصنیف میں جو اختلافِ رائے پیدا تھا، وہ بھی سننے
کے لائق ہے، ایک کے نزدیک حضرت عمر فاروقؓ صرف رسول کی حکومت و سلطنت کے نائب تھے
اور دوسرے کے نزدیک وہ ع انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کے مصداق تھے، اس سلسلہ میں
سرسید نے خلفائے راشدینؓ کی نسبت اپنے نجی کے خط اور اخباری مضمون میں جو رائے ظاہر
کی مولانا جیسے شیفتۂ اصحابِ رسولؐ کے لئے اس کا برداشت کرنا آسان نہ تھا، اسی نے انھوں نے

[1] یہ دونوں روایتیں مرحومی اقبال محمد خان سہیل ایم اے (علیگ) کی تحریر مندرجہ الاصلاح سرائے میر سے لی گئی ہیں، جو بہ زمانہ طالب علمی علیگڈھ میں رہ چکے ہیں، اور مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین دونوں کے شاگرد تھے، اور مولانا حمید الدین کے ساتھ کئی سال رہ چکے تھے،

نے اخبار وقت پوری محنت سے لکھی اور سرسید کے اعتراض و اختلاف اور ناراضی کی کوئی پروا نہ کی،

مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں[1] اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے،

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہؓ کی صف سے جا کر مل جائیں

سرسید کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستہ سے پیچھے ہٹا دینگی جس پر وہ لیجانا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے تقریباً سخت مضمون لکھا،

سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ انگریزی طور و طریق اور وضع و قطع اختیار کریں تاکہ ان میں حاکمانہ روح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں ہو سکتا، دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی قوم سے دور سے دور تر ہوتے گئے، تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور و طریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے، اور وہ تعلیم جو قوم کی

---

[1] یہ تصریح سرسید کی تحریروں میں ہے،

دولت مندی کی خاطر اُن کو دی گئی تھی وہ اس تعالی کی بدولت تنگدستی کا ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی امداد و اعانت کے قابل نہ رہے، اور نہ وہ ایثار کی کوئی خدمت انجام دے سکے ،

مولانا شبلی مرحوم سرسید کے اس خیال کے تمام تر مخالف تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی امر میں اختلاف ہوا میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے" (مسعود۔ ۳۳)

یہ مولانا کے آخیر خطوں میں سے ہے جس کے بارہ تیرہ دن کے بعد انھوں نے وفات پائی، یہی سبب ہے کہ سرسید کی وفات پر اُن کی زندگی کے کارناموں پر جب مختلف مضامین لکھوانا طے ہوا، اور اس سلسلہ میں سرسید اور مذہب کا عنوان مولانا شبلی کے لئے تجویز ہوا، تو انھوں نے اس سے انکار کیا، آخر لوگوں کے اصرار[1] سے مجبور ہو کر سرسید اور اردو لٹریچر کا دوسرا عنوان لیا اور پہلے عنوان پر مولانا حالی نے لکھا، یہ دونوں مضمون ایک ساتھ علی گڑھ میگزین کے مئی ۱۹۰۱ء کے نمبر میں شائع ہوئے ہیں، مولانا حالی کا یہ مضمون غالباً حیات جاوید کے مباحث کا خلاصہ ہے جس کو وہ اس وقت لکھ رہے تھے ،

خود سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا مسئلہ بھی ایک اختلافی مسئلہ بن گیا تھا، اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں کیونکہ وہ پاس رہتے تھے، مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے، چنانچہ اس بارہ میں جتنی بالواسطہ

---

[1] اس اصرار کی یہ تصریح مولانا نے خود اس مضمون کے ذیل میں کی ہے، حیات جاوید میں مولانا حالی نے بھی زندگی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہے، دیباچہ صفحہ ۱۰ کا نوٹ،

تحریکیں کی گئیں، ان کو مولنا بطائف الحیل ٹالتے گئے، اسی اثنا میں سرسید کے نام نواب اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی (علی گڑھ) کا ایک خط مکہ معظمہ سے آیا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ مولوی شبلی صاحب آپ کی لائف لکھ رہے ہیں، مولانا کو یہ خط دکھایا گیا، مگر اس "مقدس خواب" کی تعبیر بھی صحیح نہیں نکلی، اس کے بعد سرسید مرحوم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کو بلا کر اپنے کچھ حالات نوٹ کراتے رہے، مولانا اس کو بجنسہٖ لکھتے رہتے، جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو یہ قرعۂ فال مولنا حالی مرحوم کے نام نکلا[1]، اور انھوں نے ۱۸۹۳ء سے اسکو انجام دینا شروع کر دیا،

عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں کو اختلاف تھا، سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں ہر ایسی تعلیم کے شیوع کو جوان کو ادھر سے ہٹائے مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے، اسی لئے پنجاب میں ۱۸۸۲ء میں مشرقی تعلیم کا جو نظام بن رہا تھا انھوں نے اس کی اتنی مخالفت کی کہ اس کے پرزے اڑ گئے، اسی طرح ۱۸۹۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی امتحانات کے اجراء پر ایسی ہی مخالفت کی، چنانچہ ایک زمانہ میں دیسی زبان میں تعلیم کی تحریک کر چکنے کے بعد وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے، کہ اس سے بھی ان کے خیال میں انگریزی کی تعلیم کو نقصان پہنچتا، بہرحال ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لئے دلچسپی نہ تھی، کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے،

مولنا کا عقیدہ تھا کہ اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم نہ رہی تو پھر مسلمان مسلمان رہیں گے کہ ان جن کی ترقی کے لئے یہ جدوجہد ہو رہی ہے، سفرنامہ میں قدیم عربی تعلیم کی ابتری اور اس کی

---

[1] یہ واقعہ اقبال صاحب سہیل نے مولانا سے سُنا تھا،

ترقی و اصلاح کے سلسلہ میں مولانا ۱۸۹۴ء میں بے قابو ہو کر لکھتے ہیں: "یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں[۱] وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزاء اور شماتت ہے میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت[۲] قائم رکھنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے"

۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا، تو وہ مولانا کی عین تمنا کے مطابق تھا، اس لئے انھوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ کالج میں مولانا کی زندگی کا یہ رخ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، شاید ۱۸۹۵ء میں جب مولانا کو حیدرآباد میں وظیفہ ملا ہے، تو فطرۃً ان کو خوشی ہوئی کہ اب وہ کالج کے حلقہ سے آزاد ہو کر اپنے مذاق کا کام کریں گے، اسی جذبہ میں انھوں نے ایک فارسی قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ ادب، طلب اور ردیف است تھی، اس میں ایک مصرع یہ تھا۔

زیب مجلس ندوہ و تدریس علوم عرب است

یہ قصیدہ کالج کے حلقہ میں قابل اعتراض ٹھہرا اور مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے مولانا نے اسکو ضائع کر دیا

---

۱ سرسید کی نئی تحریک میں قومیت نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اس لئے [illegible]
۲ سرسید نے ۱۸۸۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اختلافات کے قضیہ کا آخری ہندسیاسی اختلاف ہو سرسید وہ سرسید جنھوں نے اسباب بغاوت
ہند لکھا جو آگرہ کی نمائش میں ہندوستانیوں کی عزت کے لئے انگریزوں سے لڑ گئے جنھوں نے متعدد
دفعہ گورنمنٹ کی تجویزوں کی شدید سے شدید مخالفت کی ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا وجود ہوا تو
وہ اس کے سخت مخالف بن گئے، اور ایک سال بعد اپنی تعلیمی کانگریس قائم کی جس کے دوسرے
سالانہ اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۱۸۸۷ء میں اس کی مخالفت میں نہایت پرجوش تقریر کی، اور آخر ۱۸۸۸ء
میں کانگریس کے مقابلہ کے لئے ایک پیٹریاٹک ایسوسی ایشن الگ بنائی جس میں تمام رئیسوں تعلقہ
داروں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر کانگریس کے مقابلہ کے لئے ایک محاذ جنگ قائم کیا، پھر ۱۸۹۳ء
میں مسٹر بیک کیساتھ مل کر محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔

مولانا شبلی مرحوم شاید خلافت راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر یا فطرۃً جمہوریت پسند تھے
اور سرسید شخصی حکومت کو پسند کرتے تھے، حالانکہ دوسری طرف وہ اپنے کو مذہباً مسلمان اور نسلاً
عرب ہونے کی بنا پر ریڈیکل کہتے تھے کہیں آپ اوپر پڑھ آئے ہیں کہ کالج میں طلبہ کی ایک مجلس
میں ایک دفعہ شخصی اور جمہوری طرز سلطنت پر مباحثہ تھا مولانا نے جمہوری طرز سلطنت کی تائید
کی، اور اس پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے واقعات اور اصول انتخاب سے استدلال کیا تھا،
یہ تقریر نہایت کامیاب ہوئی اور طلبہ مولانا کے زور بیان سے بہت متاثر ہوئے، حاضرین
میں سرسید مرحوم بھی تھے، انھوں نے اسکی مخالفت کی، اور اس پر طبیعت سیر نہیں ہوئی تو مولانا
کے دلائل کے رد میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۰ جون ۱۸۹۲ء
کے پرچہ میں "ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت" کے عنوان سے مولانا کے سفر ترکی کے لئے روانہ

ہو جانے کے بعد چھپا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ تقریر اپریل ۱۸۸۸ء سے پہلے اُسی کے قریب زمانہ میں کی ہوگی۔

اس واقعہ سے دونوں کی طبیعتوں کا سیاسی اختلاف مذاق معلوم ہوتا ہے، اسی لئے مولانا سرسید کی اُن کوششوں کو جو وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت میں کر رہے تھے پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں دونوں کی راہیں بالکل الگ رہیں، اور اگرچہ مولانا نے کبھی سیاست کے عملی کوچہ میں قدم نہیں رکھا، مگر اخیر تک اُن کی سیاسی رائے یہی رہی،

۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۴ھ میں، روم و یونان کی جو لڑائی ہوئی، اور اس میں ترکوں کو انگریزوں کی مرضی کے خلاف جو فتح عظیم ہوئی، اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پُر جوش بنا دیا تھا، سارے ہندوستان میں اس کی خوشی منائی گئی، اور بمبئی کے مسلمانوں نے چراغاں کیا، سرسید کو اس سے بڑی تکلیف پہنچی، اور اس جوش و مسرت کے خلاف دو نہایت سخت مضمون لکھے[1]، جو اتحاد اسلامی کے حامی مسلمانوں کو تیر کی طرح لگ گئے، اور انھوں نے سرسید کی اس انگریز دوستی پر سخت اعتراضات کئے،

سرسید کے حلقہ میں رہ کر اتنا بڑا اختلاف کوئی معمولی جرم نہ تھا، جس کو سرسید تو بخش بھی سکتے تھے، مگر اُن کے بعض حامیوں نے اس کو کبھی نہیں بخشا، چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب اڈیٹر البشیر جو اس زمانہ میں سرسید کی مخالفت سے تائب ہو کر اُن کے نہ صرف بڑے حامی بن چکے تھے،

[1] سرسید کے آخری مضامین میں "یونان اور ترک" اور "سلطان اور ہندوستان کے مسلمان" کے عنوان سے یہ مضمون پڑھیے۔

بلکہ وہ ان کو "مجتہد اعظم" ماننے لگے تھے، اور اسی لئے وہ مولانا شبلی سے ناراض رہنے لگے تھے، اور اپنے خیال
میں ان سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس "مجتہد اعظم" پر ایمان لائیں، اور اسی لئے وہ ندوہ اور عربی
تعلیم کے سخت مخالف ہو رہے تھے، اور کانگریس سے بھی ان کو اس زمانہ میں اسی لئے شدید اختلاف
تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ سرسید کی سیاسی رائے میں جو انقلاب ہوا، وہ ان کی ذاتی رائے نہ تھی، بلکہ
کالج کے پرنسپل مسٹر بک نے اپنی زبردست شاطرانہ چال سے سرسید کے دل میں یہ بٹھا دیا تھا کہ
کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں کی دوستی ہی میں دراصل کالج کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہے،
اور وہ اس کے اس سحر میں ایسے مسحور ہو گئے تھے کہ اس کے بعد ان کی اپنی رائے فنا ہو گئی تھی،
اور اب وہ جو کچھ دیکھتے تھے، مسٹر بک اور انگریز اسٹاف کی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اور جو کچھ
سنتے تھے وہ ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے، مولانا نے اپنے مشہور مضمون "پولیٹیکل کروٹ" میں اس
تفصیل کو کس قدر سادہ بیانہ معجزانہ ایجاز میں ادا کیا ہے "وہ پُرزور دست قلم جس نے اسبابِ بغاوتِ
ہند لکھا تھا، اور اس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب
یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑا دی تھیں، اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا
کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں پیدا کر سکتا، وہ جانباز جو آگرہ کے
دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں،
وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا "میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف
بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور سے فخر کر سکتے ہیں، اور یہ صرف انہی کی بدولت ہے کہ علم، آزادی اور

[1] مثال کے طور پر مقالات شبلی جلد ہشتم میں ندوہ اور پانیر کا مضمون پڑھئے۔

حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی میں صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں؛ (دیکھو تقریر پریسیڈنٹ مسلم لیگ بمقام ناگپور)

حالات اور گردوپیش کے واقعات نے اس کو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پولیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ انقلاب حالت پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے؛

اس کے بعد مولانا نے اس مضمون میں سرسید کی لکھنؤ والی اس مشہور سیاسی تقریر کی ہر دلیل کا جواب دیا ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اسی تقریر کا اثر تھا کہ مسلمان کانگریس سے باز رہے، اور جس کو ایک خاص حلقہ میں اتنا پسند کیا گیا کہ مسٹر بیک نے پوری تقریر کو تار پر ولایت بھجوایا،

سرسید نے یہ تقریر ۱۸۸۷ء میں کی تھی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا ان کی اس سیاسی پالیسی کو ابتدا ہی سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، اور ان کی رائے تھی کہ علی گڑھ کالج کو مسٹر بیک کے ہاتھوں غلط نصب العین کے قالب[1] میں ڈھالا جا رہا ہے،

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں جو ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک صاحب کو اپنے حالات و سوانح کے استفسار میں لکھا تھا، لکھتے ہیں: "میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا، اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں"؛

یہ اختلاف بھی کالج سے مولانا کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ایک نہایت ثقہ اور معتبر بزرگ

---

[1] یہ مسٹر بیک کی طرف اشارہ ہے، یہ پوری تفصیل مضمون مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ میں ملاحظہ فرمایئے جس کو مولانا نے ۱۹۱۲ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے موقع پر لکھا تھا، معارف اعظم گڈھ بابت ماہ نومبر ۱۹۱۲ء ص ۲۹۳،

(مولانا شروانی) جو مولانا کے بڑے گہرے دوست، ساتھ ہی سرسید کی تحریک کے بڑے حامی اور اس کی جلوت و خلوت کے تمام اسرار سے واقف ہیں، مولانا کے اوراق حیات کے ایک مسودہ پر جس میں مولانا کی دل برداشتگی کی تفصیلات تھیں، اپنے قلم سے یہ رقم فرمایا: "دل برداشتگی کی وجہ سیاسی آراء کا اختلاف بھی تھا، مولوی شبلی صاحب اب جدید سیاسی تحریک کے حامی ہو چکے تھے۔"

اسی سلسلہ کی ایک نئی کڑی ندوۃ العلماء کی شرکت کا سبب بن گئی، پہلی اس نے وہ شورش پیدا کی تھی کہ حکام کو خیال ہو گیا کہ اس سے مسلمانوں میں بغاوت پھیل جائیگی، بعض غرض مندوں نے اپنی ذاتی کاوشوں سے اس کو یہ رنگ دے کر لفٹنٹ گورنر تک پہنچایا، اور لفٹنٹ گورنر نے بھی مولانا کا علی گڑھ میں رہنا مناسب نہیں سمجھا،[1]

ندوۃ العلماء

یعنی

علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت

دلی کا خاندان دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی کے مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کا خاندان تھا، سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو ملا اور جو کچھ ملا اسی دروازہ سے ملا، ہندوستان میں حدیث کا دور دورہ، ترجمۂ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسمٰعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبۂ جہاد

---

[1] مکاتیب شبلی بنام مولانا شروانی (ا م)

فرقِ باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز کو وابستہ نہیں،

مولوی بزرگ علی مارہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ میں ایک گرامی مولوی بزرگ علی تھا پیدا ہوئے جوانی میں تحصیلِ علم کی، اور آخر دہلی جا کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی درسگاہوں سے بہ رہا تھا، اُس زمانہ کے علماء کے دستور کے مطابق چند روز آگرہ اور کلکتہ میں درس دینے کے بعد علی گڈہ میں جس کا پرانا نام کول تھا انگریزی حکومت کی میں بادلِ ناخواستہ منصفی کا عہدہ قبول کیا، مگر اس عہدہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور اسی سلسلہ میں وہاں کی جامع مسجد میں بانیٔ مسجد نواب ثابت خاں نے محمد شاہ کے زمانہ میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کو دوبارہ زندہ کیا، اور کچھ دنوں کے بعد منصفی کے عہدہ سے استعفا دے دیا اس زمانہ میں اُن علماء کا جو انگریزی تسلط سے پیچ و تاب میں تھے ٹونک مرکز بن رہا تھا مولانا اسمٰعیل شہید کے پراگندہ قافلہ کے مسافر بھی یہیں پناہ گزیں تھے، بہرحال نواب وزیر الدولہ مرحوم والیٔ ٹونک کے اصرار پر ریاست میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا، اور وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی،

اُس زمانہ میں ہندوستان کی غیر متوقع حکومت پا کر عیسائی حاکموں اور پادریوں کا ولولہ یہ تھا کہ وہ بالآخر ہندوستان کو عیسائی بنا لیں گے علمائے اسلام اس کے مقابلہ کے لئے اٹھے، ان میں سے کئی بزرگوں کے مبارک ناموں اور کاموں سے ہماری واقفیت ہے، اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی مولانا بزرگ علی ہیں، رد نصاریٰ میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے بشارات کا قلمی نسخہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں ہے،

مفتی عنایت احمد

مولانا بزرگ علی کے آغوش میں جو ہونہار پل کر بڑھے، ان میں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادت مند مفتی عنایت احمد صاحب تھے، مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علماء سے پڑھ کر دلی گئے، اور شاہ اسحاق صاحب سے حدیث کا درس لیا، اور وہاں سے علی گڑھ کول میں مولوی بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی، اور وہیں مدرس ہو گئے، ایک سال کے بعد وہ وہیں مفتی اور منصف مقرر ہوئے، یہاں پھکنہ ضلع علی گڑھ ایک قریہ سے ایک صاحبزادہ اگر درس میں داخل ہوئے جن کو آگے چل کر دنیا نے استاذ العلما مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا، مفتی عنایت احمد صاحب بدل کر بریلی پہنچے تھے، کہ ۱۲۷۳ھ کا ہنگامہ برپا ہو گیا، اس ہنگامہ کی پاداش میں بالزام بغاوت جن علماء اعلام کو قید جلا وطنی کی سزا دی گئی، ان میں ایک یہ بھی تھے، چنانچہ نظر بند کر کے جزیرہ انڈمان بھیج دیئے گئے، مگر کیا عجب بات ہو کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح بہتا رہا، چنانچہ وہاں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے صرف میں علم الصیغہ، اور سیرت میں تواریخ حبیب اللہ اور جغرافیہ میں ترجمۂ تقویم البلدان مشہور ہیں، آخر یہی تصنیفات رہائی کا ذریعہ بنیں، سنہ ۱۲۷۷ھ میں رہا ہو کر ہندوستان آئے، اور پھر چشمۂ فیض اسی طرح جاری تھا،

کانپور میں علم

اس زمانہ میں کانپور نیا آباد تھا، اودھ کی نوابی کے زمانہ میں گنگا کے کنارے یہ انگریزی فوج کا کیمپ تھا، کیمپ کے تعلق سے تاجر اور سوداگر آکر آباد ہوئے، کیمپ سے کمپو ہوا، اور کمپو سے کانپور، مسلمانوں کی اس تباہ حالی میں کانپور کے مسلمان سوداگروں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی جنھوں نے اپنی بابرکت اور نیک کمائیوں کو دین کی نصرت میں لگایا، مفتی عنایت احمد صاحب نے کانپور میں مستقل قیام فرمایا، اور اسی سال ۱۲۷۸ھ میں مدرسۂ فیض عام جاری کیا،

دو برس کے بعد اپنی جگہ پر دو شاگردوں کو جن میں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے، جانشین
بنا کر حج کو روانہ ہوئے، جہاز جدہ کے قریب پہنچکر ایک پہاڑ سے ٹکرایا اور ڈوب گیا، مفتی صاحب
بحالتِ نماز و احرام غرق و شہید ہوئے، شاگردوں نے مدرسہ کے کام کو سنبھالا اور مدرسہ کو بڑی
رونق دی، اسی مدرسہ کا فیض تھا جو بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں نمایاں ہوا،

مفتی لطف اللہ صاحب | مفتی لطف اللہ صاحب ۹ برس کانپور میں رہنے کے بعد علی گڈھ واپس
آئے، اور یہاں سے اس مدرسہ میں جس کو ان کے استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب نے زندہ
کیا تھا مدرس ہوئے، علی گڈھ میں درس کا فیض ۱۲۹۳ھ سے ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۵ء) تک ستائیس برس مسلسل
جاری رہا اور برصت سے علم و فن کے طلبگاروں کے قافلے علی گڈھ کا رُخ کر رہے تھے، ستائیس برس
کی مدت میں سیکڑوں عالم اس درسگاہ سے اٹھے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے، اس عہد کا
مشکل سے کوئی نامور عالم ہوگا جس کی دستارِ کمال کا طرۂ امتیاز اس باکمال کا تلمذ نہ ہو، جن اکابر
کے نام معلوم ہیں، ان میں سے چند کے نام ملاحظہ طلب ہیں، مولوی عبد الغنی صاحب (استاذ
اول مولانا شروانی) مولوی احمد حسن صاحب کانپوری، مولوی سید محمد علی (ناظم اول ندوۃ العلما)
مولوی مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی، مولوی عبد الحق صاحب حقانی مفسر تفسیر حقانی دہلی، مولوی
سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، وقار نواز جنگ مولوی وحید الزمان خاں، مولوی فضل حق
صاحب رامپوری، مولوی مفتی عبد اللطیف (استاذ جامعہ عثمانیہ) مولوی نور محمد صاحب پنجابی
مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور، مولوی ماجد علی صاحب جونپوری (مشہور مدرس) مولوی پیر مہر علی
صاحب سجادہ نشین گولڑہ ضلع راولپنڈی، قاضی سعد الدین صاحب کشمیری، مولوی سیف الرحمان

صاحب ولایتی، مولوی لطف الرحمان صاحب بردوانی، اور خاتمۃ التلامذہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں وغیرہ سیکڑوں ارباب کمال ہیں،

حضرت مفتی لطف اللہ صاحب کی دو خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی، دوسری یہ کہ کانپور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حروف شناس ہو گئے تھے کہ تار وار پڑھ لیتے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ دار العلوم ندوہ جو بننے والا تھا اس کی صورت مثالی پہلے ہی ذات گرامی میں جمع تھی،

مولانا شاہ فضل رحمان صاحب | اس سلسلہ کا رابطۂ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا جس کا نام نامی حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا گنج مراد آباد کانپور کے پاس ایک قصبہ ہے، یہ فیض بھی دہلی کے اسی خانوادہ سے آیا تھا، شاہ عبد العزیز صاحب اور شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے شرفِ تلمذ اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب مجددی سے شرفِ بیعت حاصل تھا، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہ ذاتِ گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی، سنت سنیہ، فقر و غنا، نور و معرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہو گئی تھیں، مفتی صاحب کے اکثر تلامذہ گنج مراد آباد کے فیضِ ارادت سے سرفراز تھے،

مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے **ندوۃ العلماء** کا آفتاب طلوع ہوا،

انقلابِ حوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطر تھے، مدارس اور مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان ادھر کھنچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے تھے

ان کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسالے لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نو خیالات سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے، عام علما زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھے تھے، اور خواص تقلید و عدم تقلید، قرأتِ فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گتھے تھے کہ مناظرہ، مجادلہ و مجادلہ معاملہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی بڑی مہریں ہو رہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہو رہا تھا۔

فیضِ عام کا فیض یہ صورتِ حال تھی کہ حسنِ اتفاق سے اُس خوش قسمت مدرسۂ فیضِ عام کانپور کی چٹائی پر مدرسۂ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوسِ قدسیہ اس صورتِ حال پر غور فرما رہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا، اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے اُن کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالانکہ اُن میں سے بعض کا اس وقت عنفوانِ شباب تھا،

۱۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی،

۲۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی،

۳۔ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدرس مدرسۂ جامع العلوم کانپور،

۴۔ مولانا محمد خلیل احمد صاحب مدرس دوم مدرسہ دیوبند، بعدہٗ مدرس اعلیٰ مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور،

۵۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (جو اسی سال مدرسہ سے فارغ ہوئے تھے)

۶۔ مولانا نور محمد صاحب پنجابی مدرس مدرسہ اسلامیہ فتحپور (نہایت متقی اور صاحب کمال بزرگ تھے میں نے زیارت کی تھی)

۷۔ مولانا احمد حسن کانپوری مدرس اول مدرسہ فیض عام کانپور (محشی مثنوی مولانا رومؒ)

۸۔ مولانا سید محمد علی صاحب (ناظم اول ندوۃ العلماء)

۹۔ مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند (شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ)

۱۰۔ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی۔

۱۱۔ مولانا حکیم سید محمد ظہور الاسلام صاحب فتحپوری (نہایت متقی و دیندار، ان کی زیارت سے میری آنکھیں شاد ہوئیں)

۱۲۔ مولانا عبد الغنی خاں صاحب، مرشد آبادی۔

۱۳۔ مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی۔

۱۴۔ مولانا سید شاہ حافظ تجمل حسین صاحب دیسنوی (خلیفہ حضرت شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، میرے رشتہ کے چچا تھے، ندوہ میں تعلیم کے لئے میرا آنا ان ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا)

یہ اسلامی ہندوستان کے گذشتہ دور کے وہ نامی نامی ہیں جن پر اس دور کو بجا فخر و ناز ہے۔ اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کی جائے، اور آئندہ سال مدرسہ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علما کو اس کے لئے عام دعوت دی جائے اس مجلس کا نام ندوۃ العلما قرار پایا، اور اشتہارات و اخبارات کے ذریعہ سے آئندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، اور ایک صاحب اس غرض سے مقرر کئے گئے کہ وہ تمام ہندوستان کا معائنہ کرکے اگلے جلسہ

میں اپنی رپورٹ پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب جو مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد رشید اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب کے مرید و خلیفہ، ردِ نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف اور ردِ نصاریٰ میں "تحفۂ محمدیہ" نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔[1]

ندوۃ العلماء

عام ملک میں جب ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے آئندہ اجلاس کا اعلان ہوا تو تمام مسلمانوں میں ایک نئے جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، علماء ہر طرف سے آ آکر شریک ہونے لگے، اس صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والوں میں ایک نام اس کا بھی تھا جو ہندوستان کے علاوہ روم و شام و مصر کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا اور اس کے دل میں رہ رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور ضروریاتِ زمانہ سے بے خبری کا درد اٹھتا تھا جس کے مضمونوں، تقریروں اور تصنیفوں میں اس کا یہ احساس ہر وقت نئے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا،

ندوہ کا پہلا اجلاس

ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں اسی کانپور میں اور اسی مدرسۂ فیض عام میں ہوا، پہلے دن ۱۵ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۹۴ء کو صبح کے وقت مدرسہ کے چودہ فارغ التحصیل طالبعلموں کی دستار بندی کا جلسہ ہوا، حضرت مولانا لطف اللہ صاحب اس جلسہ کے صدر ہوئے، صدارت کی تحریک مولانا عبد اللہ صاحب ناظم دینیات محمڈن کالج علی گڑھ (داماد مولانا محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند) اور تائید مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے فرمائی، مولوی بشیر الدین اڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ نے (جو ان دنوں سرسید کے مخالفوں میں تھے اور اب "البشیر" کے اڈیٹر ہیں)

[1] اس رسالہ کے اڈیٹر سید عتیق بھی تھے جو ان کے بھائی مولوی محمد حسن صاحب استاذ ریاضی تھے، مولوی سید محمد ہاشم صاحب ندوی کے والد بزرگوار، مجھے بھی ان کی زیارت ساتھ دار العلوم لاتے تھے۔

مدرسہ کی سالانہ کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے سورۂ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا۔

ندوۃ العلماء | ندوۃ العلماء کا اجلاس اسی دن ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہوا۔ شمس العلماء مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی نے مولانا لطف اللہ صاحب کی صدارت کی تحریک کی، اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے تائید کی۔ اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان ایک معتبر و ثقہ شریک مجلس کی زبان سے سنئے:۔ "شوال ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علماء شریک جلسہ تھے۔ علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علماء بالتخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسی صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی . . . . اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا اس میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولوی لطف اللہ صاحب اور مولوی احمد حسن کی بڑے شاندار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی۔" (استاذ العلماء، صفحہ ۳۵ و ۳۶ از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، یہ تقریر آج بھی اسی طرح حقائق کو لبریز اور صورتِ حال کے لحاظ سے تازہ ہے۔ بعد ازیں مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کا دستور العمل پیش کیا، مگر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تحریک سے یہ دستور العمل علماء کی ایک مجلس کے سپرد

ہوا۔ عصر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا،

دوسرے دن ۱۶ شوال کی صبح کو مولانا شبلی صاحب کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری (راقم کی آنکھیں رامپور کے اثنائے سفر میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوئیں، اُس وقت موصوف کے ہاتھ میں دیوان علی کا قلمی نسخہ تھا، اور وہ اس کو صاف کر رہے تھے) صدرنشین ہوئے، سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک پُرزور تقریر کی، پھر مولانا ابراہیم صاحب آروی نے دلپذیر وعظ فرمایا،

۱۶ شوال کی رات کو مغرب کے بعد دستور العمل پر غور کرنے کے لئے جلسۂ خاص ہوا، اس جلسہ میں تیس جید علماء شریک تھے، کچھ اور اہل الرائے معززین بھی تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب ایک ایک دفعہ پڑھ کر سناتے تھے، اور بعد غور و بحث کے وہ منظور ہوتی تھی، اس طرح تمام دستور العمل منظور ہوا جو درج روداد ہے،

تیسرا جلسہ ۱۷ شوال مطابق ۲۴ اپریل کی صبح کو ہوا، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے، شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے اٹھ کر کہا کہ آج کے جلسہ میں حسب ذیل تجویزوں کا پیش ہونا اور اُن پر غور و بحث ہونا قرار پایا ہے،

پہلی تجویز، موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے،

دوسری تجویز، اس امر کی کوشش کی جائے کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوں یا اپنے کسی مدرس یا وکیل کو بھیجیں،

تیسری تجویز اس امر میں کی گئی کہ مدارسِ اسلامیہ جو کثرت سے جابجا قائم ہیں ان کو ایک سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسے مثل مدرسۂ دیوبند، مدرسۂ فیض عام کانپور، مدرسۂ احمدیہ[1] آرہ وغیرہ بطور دار العلوم کے قرار دیئے جائیں، اور چھوٹے چھوٹے مدرسے ان کی شاخیں قرار دی جائیں، اور ان چھوٹے چھوٹے مدرسوں کی تمام کارروائی ان دار العلوموں کی نگرانی میں رہے۔

---

[1] ہندوستان میں اہل حدیث کے نام سے تحریک مولانا سید نذیر حسین صاحب بہاری دہلوی اور ان کے شاگردوں کے ذریعہ شروع ہوئی، اس تحریک کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حیثیتوں کا جمود دور ہوا، اور جب ایک حد تک تقلید و اجتہاد کے دو گروہ ہو گئے بھی تھے، مولوی نذیر حسین کے شاگردوں میں مولوی ابراہیم صاحب آروی خاص حیثیت رکھتے تھے، وہ نہایت خوش گلو اور پُر اثر واعظ تھے، وعظ کہتے تو خود روتے اور دوسروں کو رلاتے، نئی باتوں میں سے بھی اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے، چنانچہ نئے طرز پر انجمن علما اور عربی مدرسہ اور اس میں دار الاقامہ کی بنیاد کا خیال ان ہی کے دل میں آیا، اور انہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ میں قائم کیا، اور اس کے لئے جلسۂ مذاکرۂ علمیہ کے نام سے ایک مجلس بنائی جس کا سال بسال جلسہ آرہ میں ہوتا تھا، اس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی، ندوہ کے قیام کے بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں اس کا سب سے پہلا جلسہ آرہ یا دربھنگہ میں ہوا، اور وہاں بحث چھڑی کہ ندوہ کے رہتے ہوئے اس کے قیام کی ضرورت بھی باقی نہیں، بہرحال وہ قائم رہا، اور وہ تدریس خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا، ۱۹۰۰ء میں میرے والد مرحوم مجھ کو اسی مدرسہ میں بھیجنا چاہتے تھے مگر تقدیر کچھ اور تھی، یہ تجویز عمل میں نہ آئی، مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری المتوفی ۱۳۳۷ھ برسوں تک اس میں پڑھاتے رہے، مولانا عبد السلام صاحب مبارکپوری، مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری اور ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری اور بہت سے علماء یہاں کے شاگرد ہیں، حافظ صاحب کے بعد مدرسہ پر زوال آیا، اب بھی چند سال ہوتے ہیں کہ یہ مدرسہ آرہ سے دربھنگہ منتقل ہو گیا، اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ کے نام سے مشہور ہے، مولانا ابراہیم صاحب نے سفر حجاز میں ۱۳۱۹ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا شبلی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ایک دفعہ مولوی ابراہیم صاحب نے اپنا مدرسہ اور خاص طور پر اپنا بورڈنگ دکھایا، میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی علی گڑھ تشریف لے جائیے اور کالج اور اس کا بورڈنگ دیکھئے تو خیال کی بلندی اور سلیقہ کی ستھرائی معلوم

[illegible]

چوتھی تجویز۔ مدرسۂ فیضِ عام کانپور چونکہ باعتبار تعلیم نہایت اعلیٰ مرتبہ کا مدرسہ ہے اور بہ تعداد کثیر عربی پڑھنے والے طلبہ اس میں موجود ہیں، لیکن مدرسہ کا مکان نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف تعلیم میں حرج ہوتا ہے بلکہ ان کی آسائش اور آرام کا کافی انتظام نہیں ہو سکتا، لہٰذا کل ہندوستان کے مسلمانوں کو بلحاظ محبت وہمدردی ضرور ہے کہ مدرسۂ فیضِ عام کے ایسے مکان بنانے کے واسطے جس میں دوسو پردیسی طلبہ رہ سکیں حسبِ حیثیت چندہ دیں اور مستحقِ ثواب ہوں،

غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں، اور سینتالیس برس کے بعد بھی ہم آج اسی وادیِ تیہ میں حیران و سرگرداں ہیں، مدرسۂ فیضِ عام کی جگہ مدرسۂ دارالعلوم ندوہ رکھ لیجئے، صورتِ حال کیا بعینہٖ وہی نہیں،

اس کے بعد پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی نے پیش کی، موصوف نے اپنے رنگ میں اصلاحِ نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے کھڑے ہو کر اس تجویز کی تائید پر ایک عالمانہ بحث فرمائی، اور دکھایا کہ اسلام میں آغازِ تعلیم سے طریقہ تعلیم کیا رہا، نصاب کیونکر بدلتا رہا، علومِ معقولات کا رواج کیسے ہوا، درسِ نظامیہ کی بنیاد کیونکر پڑی، اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقائص ہیں، مثلاً معقولات کی کتابیں اس میں ضرورت سے زیادہ ہیں، منطق کی کتابوں میں متاخرین نے الٰہیات کے مسئلے مخلوط کر دیئے ہیں،

لہ مدرسۂ فیضِ عام سے کچھ دنوں کے بعد مولانا احمد حسن صاحب نے الگ ہو کر مدرسہ جامع العلوم قائم کیا تو مدرسہ کی حالت گر گئی، مدرسہ اب بھی کسی نہ کسی حال میں ہے، اب وہ انگریزی کا اسکول ہے اور اس میں عربی کے کچھ درجے بھی

منطق کی تعلیم کو اس سے پاک رکھنا چاہئے، کتابی منطق کی نہیں فن کی تعلیم ہونی چاہئے، ادب کی کتابیں بڑھائی جائیں، قرآن پاک اور علوم قرآن کی کتابیں داخل کی جائیں، اور طریق تعلیم میں اصلاح کی جائے،

اس تجویز کے بعد اسی سے متعلق مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا جو شاید مولانا شروانی کی پہلی تقریر ہو، مگر اس میں وہی متانت، وہی زور بیان، اور وہی جدید و قدیم معلومات کا خوبصورت میل موجود ہے، جو آج بھی اُن کی تحریر کی خصوصیات ہیں،

یہ تینوں تقریریں اس سال کی روداد میں موجود ہیں، اور پڑھنے کے قابل ہیں،

اس کے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لئے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے، اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا، جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں گھر آیا، یہ رسالے آج بھی مل سکتے ہیں،

تیسری تجویز منظور ہوجانے کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا کہ جو دستور العمل منظور ہوا ہے اس کی دفعہ ۱۰ کے مطابق اس کے جلسۂ انتظامیہ کے ارکان کا انتخاب ہونا چاہئے، چنانچہ سولہ ارکان کے نام تحریک و تائید سے پہنچ گئے، اور ندوۃ العلماء کا بدرقہ نورانی محفل میں جلوہ گر ہوگیا، اور مولوی ...ن نے ندوہ کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اور ندوہ کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا،

ندوہ کا دوسرا اجلاس | ندوہ کا دوسرا اجلاس جناب منشی اطہر علی صاحب[1] رئیس کاکوری و وکیل لکھنؤ و مشیر

---

[1] جناب منشی محمد اطہر علی صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے ارکان جن میں سب سے ممتاز منشی محمد احتشام علی

قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ کی کوششوں سے شوال ۱۳۱۶ھ مطابق اپریل ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ میں ہوا مولانا نے اس اجلاس میں بھی شرکت کی اور پہلے روز ناظم کی طرف سے ندوہ کی سالانہ روداد پڑھکر سنائی، اس کے بعد علماء کے فرائض پر ایک مبسوط تقریر فرمائی جس میں ان کے علمی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی فرائض سے ان کو آگاہ کیا ہے، یہ تقریر مضامین اربعہ کے عنوان سے ندوہ کے دوسرے مضامین کے ساتھ چھپ چکی ہے، یہ تقریر ایسی ہے کہ آج بھی علماء کی جماعت کے سامنے اس کے پیش کرنے کی ضرورت اسی طرح قائم ہے،

اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں اس تجویز پر بحث ہوئی کہ علوم زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کیا، لیکن اس کے بعد مولوی منصور علی صاحب مرادآبادی نے جب یہ تجویز پیش کی کہ نصاب درس میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جائے تو اختلاف ہوا، مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابراہیم صاحب آروی اور دوسرے اکثر علماء نے ان کے اضافہ کی تائید کی، اور مولانا فاروق صاحب اور دو اور علماء نے اس کی مخالفت کی لیکن کثرت سے یہ تجویز منظور ہوگئی، کیا یہ عجیب اختلاف تھا کہ جس میں استاد اور شاگرد دونوں دو صف میں تھے، مدتِ تعلیم بالاتفاق دس برس قرار پائی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۱۰) صاحب رئیس کاکوروی (خلف الصدق جناب منشی محمد اقبال علی صاحب وزیر سابق بھوپال) آنجناب ندوہ کے ہمیشہ سے حامی و مددگار رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان صاحبوں کو حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے نسبت ارادت تھی۔

منشی محمد اطہر علی صاحب کے بڑے صاحبزادہ منشی محمد ناظر علی صاحب وکیل (ممبر کونسل) زمانۂ موجودہ میں ندوہ کے ممبر ہیں اور جناب منشی محمد احتشام علی صاحب کی دلچسپی بھی ندوہ کے ساتھ اسی زمانہ سے شروع ہوئی جو آج تک بدستور قائم ہے۔

۲۰ رجب ۱۳۱۲ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۴ء کو کانپور میں مجلسِ نصاب کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی مدرس مدرسۂ کانپور، مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرسِ اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رامپور، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، اور مولانا شبلی نعمانی نے شرکت کی، اور کئی روز کے بحث مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا (صفحہ ۱۲ روداد بانس بریلی)

تیسرا جلسہ

اسی سال شوال ۱۳۱۲ھ مطابق اپریل ۱۸۹۵ء میں بانس بریلی میں مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کی صدارت میں ندوہ کا تیسرا عظیم الشان اجلاس ہوا، مولانا نے اس کے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کے اجراء کی تجویز منظور ہوئی،

دوسرے دن ۲۰ر شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۰ر اپریل ۱۸۹۵ء کو ندوہ کے عام اجلاس میں مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی، اور مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، مولانا شاہ سلیمان صاحب اور دوسرے علماء نے بھی اس سے متعلق تقریریں کیں، یہ بھی طے ہوا کہ مجلسِ دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس (کمیٹی) قائم کی جائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کئے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے،

چندہ کا وفد

۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں ندوہ کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا شاہ سلیمان صاحب

پھلواروی، مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا شاہ امانت اللہ
صاحب غازی پوری، مولانا ابوالخیر صاحب غازی پوری اور مولانا شبلی صاحب نعمانی تھے، پٹنہ
روانہ ہوا، اور مولانا حکیم عبدالباری صاحب کے مکان پر قیام ہوا، وفد کے ممبروں نے دو جلسوں میں
دو تقریریں کیں، پہلا جلسہ مولانا شاہ رشید الحق صاحب کی خانقاہ عمادیہ میں شہر پٹنہ میں ہوا، اس میں
مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے مفصّل اور مولانا شاہ امانت اللہ صاحب اور مولانا شبلی
مرحوم نے مختصر تقریریں کیں، دوسرا جلسہ پٹنہ گورنمنٹ کالج بانکی پور میں ہوا، جس میں تقریباً چار ہزار
مسلمان شریک تھے، اس میں دوسرے علماء کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت پر ایسی
پُراثر و مدلل تقریر فرمائی کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں میں اثر کر گئی، یہ وہ تقریر ہے جس سے
علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان اسلام کی خدمت کے لئے باہمی اتحاد و معاونت کی راہ
کھلی، اور جس کی ایک پُراثر تصویر ایک سحر نگار نقاش نے ان لفظوں میں کھینچی ہے: "علمائے ندوۃ العلماء
نے شروع سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مانوس کرنے کی جو کوشش کی اس کا ظہور اس مقام پر ہوا، جو مسلمانوں کی
روشن خیالی کا زبردست مرکز ہے، یعنی بانکی پور، گو میں خود حاضر نہ تھا، مگر میرے ایک نکتہ سنج محرم نے
اس موقع کا مرقع کھینچا تھا، جب مولوی سید شرف الدین صاحب بالقاب کے ڈرائنگ روم میں قدیم
و جدید تعلیم کے قائم مقام اول مرتبہ ملے تھے، جاڑے کی شب تھی، علماء پہلے سے رونق افروز تھے، جب
اوورکوٹوں سے ہال میں گرمی پیدا ہوئی تو چونکہ ہمارے محترموں کی نگاہ کے سامنے اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا
اس لئے کسی قدر منقبض ہوئے، مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا۔ ع

کہ آب چشمۂ حیواں درونِ تاریکی ست

سفرنامہ دورۂ ندوہ (مجلس [illegible]) ص ۵۷، شخ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

تاریک کوٹھوں کے اندر عقیدت مندی اور خلوص سے روشن دل چھپے ہوئے تھے، اسی جلسہ میں ابواب چندہ کی بنیاد پڑی، اس اجلاس نے خیالات قدیم و جدید کے دو دریا اسی طرح باہم ملتے دیکھے جس طرح گنگا اور جمنا کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے،

چوتھا اجلاس ندوہ کا چوتھا جلسہ شوال ۱۳۱۴ھ مطابق مارچ ۱۸۹۷ء میں میرٹھ میں ہوا[1] ۹ شوال مطابق ۱۰ مارچ کو مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے دارالعلوم کی ضرورت اور مقصد پر ایک نہایت مبسوط اور اعلیٰ درجہ کی تقریر کی، جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش فی الحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھا جاتا تھا، اور ہر شخص جوش اور فرطِ انبساط سے محوِ حیرت ہو گیا تھا، مگر افسوس ہے کہ فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں کی تھی، اور بعد کو خود بھی وہ تلف ہو گئی،

۱۰ شوال کے جلسہ میں مولانا شبلی مرحوم نے نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی اس کوشش کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے نینی تال دو مہینے رہ کر اور حکام سے مل کر یہ تجویز منظور کرائی ہے کہ ہفتہ میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لئے وقت دیا جائے، اس کا انتظام اور اس کی تعلیم کا نصاب مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے، اسی اجلاس میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ایک یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان سے چند مستعد اور ذہین طلبہ کو ندوہ تکمیلِ علوم کی غرض سے مصر بھیجے، مولانا شبلی مرحوم نے اس کی تائید کی، اور قوم سے اس کے لئے علیحدہ چندہ کی تحریک کی جس میں وعدہ ہوا، ایک سو چالیس سالانہ، اور ایک ہزار دو سو روپے یکمشت وصول ہوئے،

پانچواں اجلاس ندوہ کا پانچواں اجلاس ۱۴-۱۵ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۹-۱۰ مارچ ۱۸۹۸ء کو

---

[1] روداد میرٹھ صفحہ ۸،

کان پور میں ہوا، اس کے صدر مولانا مسیح الزماں خاں[1] رئیس شاہجہاں پور استاد حضور نظام سابق ہوئے،
اس کے پہلے اجلاس میں مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے یہ تحریک کی کہ ندوہ کا ایک وفد
لکھنؤ بھیجا جائے، جو وہاں جا کر دارالعلوم کے لئے کوئی مناسب زمین تجویز کر کے حاصل کرے، اور
بالفعل کام شروع کرنے کے لئے کوئی مکان پسند کرے، اس وفد کے لئے حسب ذیل حضرات کے
نام انتخاب کئے گئے، مولانا مسیح الزمان خان صاحب رئیس شاہجہان پور استاد سابق حضور
نظام میر محبوب علی خاں، مولانا سید محمد علی صاحب ناظم، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی،
مولوی حاجی یونس خاں صاحب رئیس دتاولی، مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری (خلف
مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری) مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب سابق مدرس اعلیٰ ندوۃ العلماء،
مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، اور
مولانا شبلی نعمانی،

دوسرے اجلاس میں مولانا شاہ امانت اللہ صاحب فصیحی غازیپوری کی وفات پر افسوس
ظاہر کیا گیا، اس فرض کو مولانا شبلی مرحوم نے ادا کیا، فرمایا:- "مولانا میں ایسی بہت سی خصوصیتیں

---

[1] مولانا مسیح الزماں خاں صاحب اس زمانہ کے مشہور رئیس علماء میں تھے، حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے استاد اور اتالیق تھے، مولوی محمد زماں خانصاحب شہید کے بھائی، اور سالار جنگ اول کے بڑے معتمد علیہ تھے، جس زمانہ میں نواب محسن الملک، وقار الملک وغیرہ حیدرآباد میں تھے مولانا ممدوح بھی تھے، اور اعلیحضرت پر بڑا اثر رکھتے تھے، آخر میں ریاست سے اُن کا پنشن قرار منصب مقرر ہو گیا تھا، اور وہ اپنے وطن شاہجہان پور چلے آئے تھے، میں نے اخیر زمانہ میں دیکھا تھا، بالاقد، فربہ اندام، اور چہرہ پُر رعب تھا، ان کے دیکھنے سے لوگوں پر اثر پڑتا تھا، سنہ ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ میں شاہجہاں پور میں وفات پائی،

تھیں، جن کی وجہ سے وہ تمام علماء کی جماعت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے، وہ جس عظمت وشان
خودداری اور پاس وضع، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے، اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا،
جب وہ وعظ وتبلیغ کی ضرورت سے سفر کرتے تھے، تو جس طرف اُن کا گذر ہوتا تھا ایک غلغلہ پڑ جاتا تھا، "
غیر مذہب والوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، وہ ندوۃ العلماء کے قوت بازو تھے، اکثر جلسوں میں تشریف لاتے تھے،

اس تقریر کے یہ فقرے اس لئے میں نے نقل کئے ہیں تاکہ اُس زمانہ کے باوضع علماء کی دینداری
وجاہت کی بھی ایک تصویر آپ کو نظر آجائے،

اب وہ زمانہ آگیا ہے جب ندوۃ العلماء کے آوازوں نے گورنمنٹ کے کان کھڑے کر دیئے
ہیں، اور ارکان کو یہ خیال ہونے لگا ہے کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب سے مل کر اُن کے شکوک
کو دور کیا جائے، چنانچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب وکیل ومشیر قانونی انجمن تعلقہ داران اودھ نے
آخر نومبر ۱۹۰۸ء میں الہ آباد جاکر لفٹنٹ گورنر سے ملاقات کی، اور ندوہ کی طرف سے ایک وفد کی
حاضری کی درخواست پیش کی، لارڈ موصوف نے ایڈریس دیکھنے کے بعد وفد کی پذیرائی کا خیال
ظاہر کیا، اس اجلاس میں منشی محمد اطہر علی صاحب نے اُس ایڈریس کا مسودہ پڑھ کر سنایا، اور مولانا شبلی
صاحب کی تحریک سے یہ طے ہوا کہ خان بہادر منشی محمد اطہر علی صاحب اور خان بہادر چودھری
نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ واسسٹنٹ سکریٹری انجمن تعلقہ داران اودھ اس کو لارڈ صاحب
کی خدمت میں لے جاکر پیش کریں، مولانا سید محمد علی صاحب کی تائید سے سب نے اس کو منظور کیا،

اس کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب نے یہ تحریک کی کہ مجوزہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے
ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہوجانا چاہئے، منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید

کی مولانا شبلی صاحب نے فرمایا کہ علما پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپئے سے نہیں کرتے اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجۂ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکان انتظامیہ ہو جائیں، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب صدر جلسہ نے تائید کی چنانچہ حسب ذیل علما اور بعض ارکان نے اس کے لئے چندہ منظور کیا،

علما،

۱۔ مولوی مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور، ما،
۲۔ مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس آونلہ، ما،
۳۔ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی، اعہ
۴۔ مولوی شبلی صاحب نعمانی، ما،
۵۔ مولوی سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ، صہ،
۶۔ مولوی خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری، صہ،
۷۔ مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازیپوری، صہ،
(خلف مولوی شاہ امانت اللہ صاحب)
۸۔ مولوی مشتاق علی صاحب رئیس فیض آباد، عہ
۹۔ مولوی حکیم رونق علی صاحب دونوی، عہ
۱۰۔ مولوی محمد داؤد صاحب وکیل مرزاپور، عہ
۱۱۔ مولوی مفتی رحیم بخش صاحب مدرس الموزہ، عہ

رؤسا،

۱۲۔ خان بہادر منشی اطہر علی صاحب، ماصہ
۱۳۔ مولوی سید اشرف صاحب رئیس کانپور، اعہ

یہ فہرست دو غرض سے یہاں نقل کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ اس زمانہ تک علما میں کس قدر باحیثیت اصحاب موجود تھے، جو اس قسم کی تحریک کے لئے لبیک کو تیار تھے، اور آج ذی حیثیت لوگوں میں علم دین کی کتنی کمی آگئی ہے، دوسری غرض ان بزرگوں کے ناموں کو زندہ کرنا ہے جنھوں نے دارالعلوم کی اس عظیم الشان تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سب سے پہلے سبقت فرمائی، جزاہم

اللہ تعالیٰ خیر الجزاء،

اس کے بعد پچھلے سال نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کی کوشش سے انگریزی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی جو تجویز گورنمنٹ نے منظور کی تھی، اس کے بارہ میں مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار ناظم اور مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی نے تحریک کی کہ اس کام کو ندوہ اپنے ہاتھ میں لے، منشی محمد اطہر علی صاحب نے تجویز پیش کی کہ ابھی صرف کانپور میں یہاں کے مسلمانوں کی کوشش سے اس قسم کا مقامی انتظام کیا جائے، اسی کی تائید مولوی شبلی صاحب نے فرمائی، اور کہا کہ میرا قیام اگر علی گڑھ میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور اس خدمت کو قبول کرتا،

اس کے بعد مولوی عبد اللطیف[1] صاحب مفتی دفتر ندوۃ العلماء نے فرمایا کہ آپ کسی قدر وقت

---

[1] مولوی مفتی عبد اللطیف صاحب کا وطن سنبھل ضلع مرادآباد ہے، مولانا لطف اللہ صاحب کے آخری شاگردوں میں ہیں اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے رفقائے درس میں ہیں، فراغت کے بعد ندوہ میں مفتی کے عہدہ پر مقرر ہوئے، پھر جب ایک سال کے بعد ندوہ نے اپنا دار العلوم کھولا تو اس میں شوال ۱۳۱۶ھ سے مدرس ہوگئے، خاکسار نے اکثر ابتدائی اور فقہ کی کتابیں موصوف ہی سے ندوہ میں پڑھیں، غالباً ۱۳۲۱ھ کے بعد ندوہ کی خدمت چھوڑ کر مولانا محمد علی صاحب کے پاس مونگیر چلے گئے تھے، پھر حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کئی سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مدرس رہے، واپسی کے بعد پھر مونگیر ہی میں رہے اور خانقاہ رحمانی میں تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دی، ۱۹۱۹ء میں جب مولانا شروانی حیدرآباد میں صدر الصدور اور جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے مفتی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں پروفیسر مقرر کیا، اور آخر میں مولانا شیر علی صاحب کے بعد وہ شعبۂ دینیات کے صدر ہوئے، اور اب چند سال ہوئے کہ انھوں نے پنشن پائی، امسال ۱۹۴۳ء میں مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی جگہ پر مسلم یونیورسٹی میں علوم دینیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں، موصوف کو طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تقریر پر کمال حاصل ہے، متعدد کتابیں اردو میں لکھی ہیں، جیسے دروس عربی قواعد، اور علم فقہ کے چند رسالے لکھے تھے، زمانۂ قیام میں لکھے، مونگیر میں رہ کر تاریخ القرآن اور سیرۃ امام ابوحنیفہ لکھی، حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں جامع ترمذی کی شرح لکھ رہے تھے، جو غالباً ابھی ناتمام ہے۔

تدریس میں بھی صرف کرتے ہیں، آپ اس دینی خدمت کو بالفعل قبول کریجئے، مولوی مفتی عبداللطیف صاحب نے مسرت کے ساتھ اس خدمت کو قبول کیا، اور جلسہ کی کارروائیاں اختتام کو پہنچیں،

کالج سے رخصت لینے کی تجویز سنہ ۱۹۰۶ء

کئی برس سے آب وہوا کی ناموافقت اور کثرت دماغی محنت کے سبب سے مولانا کا معدہ صحیح نہیں رہا تھا، ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں،

"میں دو ایک مہینہ سے بالکل بیکار رہتا ہوں، دماغ سے کچھ کام نہیں ہو سکتا، ابھی انشاءاللہ مکان پر نہایت مستعدی سے علاج کروں گا، میری خواہش ہو کر تمام تعطیل اعظم گڈہ میں بسر کروں، چند دن دو تین روز سے زیادہ نہ رہوں" (مہدی ۳۰)

اس سلسلۂ علالت پر مستزاد سید محمود مرحوم کا عبرتناک اخیر زمانہ کا سوء مزاج تھا، اب ان کو کالج کے جزو کل پر پورا اختیار ہو گیا تھا، وہ جدھر نکل جاتے گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھ کر گپ کرتے اور وقت ضائع کرتے، مولانا ان کی اس عادت سے زچ ہو گئے تھے کیونکہ الفاروق کی تکمیل کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ملتی نہ تھی، اسی لئے مولانا نے اُن سے ایک دو دفعہ بے رخی برتی، تو اُن کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی، اور وہ بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ انھوں نے مولانا پر عدم لیاقت کا الزام قائم کیا، اور اُن سے بعض درجے چھین لئے، اور کبھی اُن کے اس ہنر کو عیب ٹھہرایا کہ یہ دینیات کے سبق اپنے حسنِ تقریر سے اس قدر دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ لڑکے دوسرے مضامین کی طرف توجہ کم دیتے ہیں[1]،

مولانا کی پریشانی کی تیسری چیز بیک صاحب کی سیاست تھی، انھوں نے ایک مسئلہ مسلمان

[1] حسب روایت سید سجاد حیدر صاحب یلدرم،

لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی، اور پردہ کے پیچھے سے سیاست کی کٹ پتلیوں کو حرکت دیا کرتے تھے، مولانا اُن کی اس طرزِ سیاست کو جس کا مقصد کالج کو غلامی اور وفاداری کا دلچسپ دلپذیر سبق پڑھانا تھا سخت ناپسند فرماتے تھے،

اُسی زمانہ میں ایک بار دیوانِ حافظ کھول کر فال دیکھی کہ کالج کی قید سے مجھے کب رہائی نصیب ہوگی، خواجہ حافظ صاحب نے جواب دیا،

وقت آن است کہ بدرود کنی زنداں را

مولانا نے خواجہ صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا، اور ایک سال کے لئے اس قید خانہ سے رہائی کی درخواست دی یعنی دسمبر ۱۹۰۶ء[1] سے نومبر ۱۹۰۷ء تک کی رخصت لی، اور اعظم گڈھ چلے آئے، گرمیاں آکر ان کا جی نہ لگا، فروری ۱۹۰۷ء میں وہ پھر علی گڈھ گئے، لیکن پھر واپس آگئے اور جون جولائی اور اگست ۱۹۰۷ء اعظم گڈھ میں گذارے، ان ہی دنوں ۲۰ جون ۱۹۰۷ء کو ان کے منجھلے بھائی مہدی حسن بیرسٹر و منصف نے اعظم گڈھ میں وفات پائی، یہ غم مولانا کے لئے بڑا سوہانِ روح کا باعث ہوا، (سمیع ۴۰) اس حالت میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے والد ماجد کی طرح ان دونوں بیماری سے اچھے ہوئے تھے صحتیابی کی خوشی کا، اور مولانا قومی کا جلسہ کریں، (سمیع ۴۱) اور یہ خیال بھی تھا کہ مرحوم بھائی کی یادگار میں نیشنل اسکول میں کوئی عمارت بنوائیں (حمید م)[2]

---

[1] یہ تاریخ مولوی سمیع صاحب کے ایک خط میں ملی جو درج مکاتیب نہیں، ۱۵ دسمبر کو علی گڈھ سے لکھو جو ضمیمہ لکھنؤ میں چھپا ہے جیسا خط (ک د ز) یہ ہے جس میں غالباً ۱۳ یا ۱۴ دسمبر کو یہاں سے روانہ ہوتا ہوں، اگر تمہارا قصد اعظم گڈھ کا ہو تو انتظار کرو کہ میرا ساتھ ہو، اور اگر اب ممکن نہ ہو تو لکھ بھیجو میں نے سر دست سال بھر کی رخصت لی ہے، والسلام شبلی ۵ دسمبر ۱۹۰۶ء

[2] مکاتیب کے حاشیہ میں غلطی سے اس یادگار کو مولانا کی مرحومہ بیوی سے منسوب سمجھا گیا ہے (حمید م)

اس کے بعد افسردگی کے دور کرنے کے لئے کوئی سفر کریں (صبح امید) مگر وہ کہیں نہ جا سکے، اور اگست بھر یہیں رہ کر نومبر ۱۸۹۴ء میں علی گڈھ واپس چلے گئے، اور یہ کوشش شروع کی کہ ان کو کالج سے کافی طویل رخصت مل جائے،

سرسید اور مسٹر بک اس شرط سے رخصت دینا چاہتے تھے کہ مولانا سال میں چھ مہینے علیگڈھ میں آکر قیام کریں، مگر وہ خود سید محمود جو ان دنوں کالج پر حاوی تھے، اس کے مخالف ہو گئے، ۹ دسمبر ۱۸۹۵ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں: "واقعہ یہ ہے کہ بک صاحب اور سید صاحب وغیرہ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں ششماہہ قیام کروں، لیکن سید محمود خود اس کے مخالف ہو گئے، اور اسی اثنا حالت میں بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں، لیکن اس قسم کی ان سے اب کسی کو شکایت نہیں رہی، ہر روز یہاں کے رؤسا، ٹرسٹیز اور ارکان کالج اس قسم کی باتوں کے متحمل ہو گئے ہیں، میں تو اس دن سے سید صاحب کی کوٹھی پر گیا ہی نہیں، باقی ترک تعلق، اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربہ کے لئے لی تھی، میں نے دیکھا کہ اعظم گڈھ سال بھر برابر نہیں رہ سکتا، وہاں کوئی ایسی دلچسپی نہیں کہ سال بھر تک کام چل سکے، اس لئے کچھ یہاں (علی گڈھ) کچھ وہاں (اعظم گڈھ) کچھ ندوہ، اسی طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے"[1]

الفاروق کی تالیف ۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۸ء

الفاروق کی تالیف میں اب تک جو انتظار تھا وہ مولانا کی تصریح کے مطابق یورپ میں بعض تاریخی مطبوعات کی تاخیر کے سبب تھا، خصوصاً طبری جو اب تک چھپ کر تمام نہیں ہوئی تھی، (مہدی افادی ۵) ۱۸۹۳ء میں جب تاریخ مذکور کا حصہ مطلوبہ تمام ہوگیا، تو مولانا نے اس کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۳ء کو

[1] مکاتیب میں ۱۸۹۵ء غلط چھپ گیا ہے،

جیسا کہ الفاروق کے دیباچہ میں تصریح ہے پورے عزم کے ساتھ الفاروق لکھنی شروع کی بیچ بیچ میں ناغے بھی ہوتے رہے اس کے لئے جن کتابوں کی ضرورت تھی، ان میں سے ایک طبقات ابن سعد تھی جو اب چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مگر اس زمانہ میں یہ عنقا تھی، ہندوستان میں شاید مولوی ناظم حسین مجتہد لکھنؤ کے کتب خانہ میں تھی، مگر انھوں نے دینے سے انکار کیا، آخر ۱۹ جنوری ۱۸۹۰ء کو مولانا نے مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدرآبادی کو خط لکھا جن کے پاس قلمی کتابوں کا نادر ذخیرہ تھا، اور جن کی نسبت مولانا کو معلوم ہوا تھا کہ اُن کے کتبخانہ میں یہ نسخہ موجود ہے، طبقات کا نسخہ مولانا نے قسطنطنیہ میں دیکھا تھا (سفرنامہ) مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ضروری اقتباس نہ لے سکے تھے اس لئے اس کی تلاش جاری تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اُن کو نہ مل سکی کیونکہ الفاروق میں اس کا کوئی حوالہ نہیں، دوسرے یہ کہ جب ابن سعد چھپ کر آئی ہے تو مولانا ندوہ میں تھے، مجھ سے فرمایا کہ دیکھو ابن سعد میرا ہم مذاق تھا، اس نے بھی حضرت عمرؓ کا حال خوب ہی کھول کر لکھا ہے۔"

کتاب کا ایک حصہ تین سال کے بعد جون ۱۸۹۶ء میں تمام ہو کر کانپور کے مطبع نامی میں دیا گیا، (اسحاق-۶) باقی حصہ زیر تحریر تھا، چنانچہ ۳ جولائی ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں: "میں نے الفاروق مطبع نامی کانپور میں چھپنے کو دے دی، لیکن ابھی اصل کتاب میں ایک ثلث تصنیف کے لئے باقی ہے۔" (حمیدیہ)

ایک سال کے بعد ۴ فروری ۱۸۹۷ء کو رقم فرماتے ہیں: "الفاروق حصہ دوم میں نے تیار کر لیا ہے، قریباً نصف چھپ بھی گیا ہے۔" (حمیدیہ)

کالج سے الگ ہو کر جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڈھ چلے آئے اور الفاروق کا کچھ حصہ اسی اعظم گڈھ میں اسی شبلی منزل میں اسی کمرہ میں جس میں یہ تحریر اس وقت قلم سے نکل رہی ہے لکھا اور

حصہ دوم کا آخری صفحہ کشمیر میں بیٹھ کر بخار کی حالت میں ۵ جولائی ۱۹۰۵ء کو حوالۂ قلم کیا، (خاتمۂ الفاروق) مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت یہ اخیر صفحہ تمام ہوا ہے مصنف بخار سے بے حال ہو کر بستر پر دراز تھا، کتاب میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ کشمیر سے واپس آکر اسی سال شبلی منزل میں جہاں وہ کبھی بیمار رہتے تھے اور کبھی اچھے ہو جاتے تھے، اور کبھی سفر کو نکل جاتے تھے ختم کیا، اور یہیں کتاب کا مختصر مقدمہ دسمبر ۱۹۰۵ء کی کسی تاریخ میں لکھا۔

دسمبر ۱۹۰۵ء تک اس کے ۲۱۲ صفحے چھپ چکے تھے، وہ فرماتے ہیں: "الفاروق کانپور مطبع نامی میں بڑے اہتمام سے چھپ رہی ہے، ایک حصہ جس کے ۲۱۲ صفحے ہیں پورا چھپ کر تیار ہو گیا ہے، ورق طلائی اور لاجوردی چھپ رہی ہے، اس کا کاغذ اتنا نفیس پایا گیا ہے کہ ہندوستان میں آج تک ایسا کاغذ کبھی استعمال نہیں ہوا ہے، قدرداں صاحب چرمی کاغذ پر ورق چھپوانا چاہتے ہیں وہ دیکھیں گے تو اس کاغذ کو چرمی کاغذ پر ترجیح دیں گے" (مہدی افادی ۸)

مولانا نے جس حصہ کے ۲۱۲ صفحے لکھے ہیں وہ دوسرا حصہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا حصہ پہلے لکھا گیا اور چھپا، دونوں حصوں کے ہندسے الگ تھے اس لئے آگے پیچھے ہونا ممکن تھا۔

بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم فروری مارچ ۱۸۹۸ء

بھوپال میں مولانا کے دوست نواب سید علی حسن خاں صاحب کو حضور شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ۱۳۱۵ھ میں اپنی ریاست کے تعلیمات کا افسر اعلیٰ (ڈائرکٹر) بنا دیا تھا، اس وقت بھوپال کی ریاست کو اس وجہ سے کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی وفات کو ابھی چند ہی سال ہوئے تھے، عربی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی، اور عربی کے پانچ مدرسے شہر بھوپال میں قائم تھے، مگر نتیجہ کچھ نہ تھا، نہ تعلیم کا کوئی سررشتہ تھا

نہ قواعد تھے، نہ رجسٹر تھے، نہ کوئی کتب خانہ تھا، نہ امتحان تھا، نہ مدرسین کی حاضری تھی، نہ کوئی نصاب تھا، نہ درجہ بندی تھی، طلبہ پڑھتے اور علما پڑھاتے تھے، نہ کسی سال کوئی طالب علم فارغ ہوتا، اور نہ اس کی کوئی فکر تھی، مدرسین کو تنخواہیں اور طالب علموں کو ماہوار وظیفے ملتے تھے، اور اُن کے کھانے کپڑے کا انتظام تھا، اور یہی ان مدرسوں کا حاصل تھا، طالب علم روٹیوں کے لئے پڑے رہتے اور ماہوار وظیفوں کے لئے پڑھتے تھے، ولایتی اور بنگالی طالب علم ایک دور ختم کرتے تو فوراً دوسرا دور شروع کر دیتے، تاکہ تعلیم سے فرصت ہی نہ ہو جو اس جنت سے نکلنا پڑے، گویا یہ پڑھنے کی نوکری کرتے تھے، اور یہی حالت اس وقت ہندوستان کے اُن عام مدارس کی تھی جن کو اربابِ خیر نے جاری کر رکھا تھا،

نواب صاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر ۱۳۱۶ھ میں "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک تعلیمی مجلس شوریٰ قائم کی جس میں بھوپال کے علاوہ باہر کے دو ممتاز عالموں کو جو عربی مدارس کی تنظیم و اصلاح کے لئے کوشاں تھے باہر سے بلوایا، ان میں سے ایک شمس العلما مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے، جنھوں نے آرہ میں نئے پیرایہ پر ایک عربی درسگاہ، مدرسہ احمدیہ کے نام سے قائم کی تھی تعلیم کے ان ماہروں کے مشورہ سے نواب صاحب نے بھوپال کے مدارس کی اصلاح و تنظیم کا کام شروع کیا[1]،

خوش قسمتی سے نواب صاحب ممدوح کے محفوظ کاغذوں میں مولانا مرحوم کی دو یادداشتیں

---

[1] نواب صاحب مرحوم نے اس کی تفصیل اپنی خود نوشت سوانحعمری میں جو معارف ۱۹۳۶ء میں مسلسل چھپی ہے لکھی ہے، اور مارچ ۱۹۳۶ء کے نمبر میں یہ کیفیت درج ہے۔

جن میں ایک ۲۰ فروری اور ۲ مارچ کو اور دوسری ۷ اپریل ۱۹۰۸ء کو لکھ کر نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی مل گئی ہیں،

مولانا مرحوم نظارۃ المعارف کی مجلسِ شوریٰ کی شرکت سے فارغ ہو کر فروری کے آخر میں علی گڈھ پہنچے، جیسا کہ ۲۰ فروری کی یادداشت میں ذکر ہے، واپس آکر ۲۰ فروری اور ۲ مارچ کی دونوں یادداشتوں میں عام انتظامی معاملات کی ۱۳ دفعات لکھی ہیں، دوسری یادداشت جو مفصل ہے، اور جو ۷ اپریل کو مرتب کی گئی ہے، دو کاغذوں پر مشتمل ہے، ایک میں طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد ہیں، اور دوسرے میں پہلے مدرسین کی حاضری اور رخصت کا دستور العمل، اور پھر نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ ہے، اس یادداشت کو اس مقام پر اس لئے نقل کیا جاتا ہے، کہ ہندوستان کے عربی مدارس کی اصلاح کا سب سے پہلا تاریخی نقشہ نگاہوں کے سامنے آجائے،

"دستور العمل و ہدایات برائے مدرسین"

دفعہ ۱۔ تمام مدرسین کو ضرور ہوگا کہ وقت معین پر مدرسہ میں آئیں،

۲۔ ایک حاضری کی کتاب مدرسِ اوّل کے کمرہ میں موجود ہوگی، ہر مدرس مدرسہ میں آنے کے ساتھ اپنی حاضری اپنے قلم سے اس میں لکھ دیگا، اس کتاب میں تاریخ، دن، وقت، نام، اور دستخط کے خانے ہوں گے، (پنجاب میں یہ طریقہ عملاً جاری ہے)

۳۔ ہر مدرس اپنے طلبہ کی حاضری لے گا، جو طالب العلم غیر حاضر ہو اس پر جرمانہ، اور دیر میں آئے تو خفیف تنبیہ کرے گا،

۴- کسی مدرس کو جائز نہ ہوگا کہ اوقات مدرسہ میں (بجز کسی اتفاقیہ خاص ضرورت کے) مدرسہ سے باہر جائے، یا ان اوقات میں کوئی شخص اس سے ملنے آئے،

۵- مدرسین کو ایک دن کی رخصت دینے کا اختیار مدرس اعلیٰ کو ہوگا، اور اس سے زیادہ کے لئے بتوسط مدرس اعلیٰ کے سررشتۂ تعلیم کے افسر کے پاس درخواست بھیجنی ہوگی،

۶- جو مدرس کسی دن مدرسہ میں نہ آئے تو ضرور ہوگا کہ وہ رخصت کی درخواست پہلے بھیجکر منظوری حاصل کرے،

۷- تعلیم نقشۂ انضباط اوقات کے موافق دی جائے گی، اور ہر مہینے کے اخیر میں ایک کتاب میں جو اسی غرض کے لئے تیار کی جائے گی، ہر مدرس کو یہ درج کرنا ہوگا کہ اس مہینہ میں ہر صف کو کس قدر تعلیم دی گئی،

۸- ہر مہینہ کے اخیر میں ہر مدرس اپنے طلبہ کا امتحان لے گا، اور نتائج امتحان ایک کتاب میں درج کریگا،

۹- امتحانات نہایت احتیاط کے ساتھ بلا رعایت کئے جائیں گے،

نقشۂ انضباط اوقات بہ تعیین مدرسین

درجہ	۱۰ سے ۱۱ تک	۱۱-۱۲	۱-۲	۲-۳	۳-۴
اول	صرف	حساب	فارسی	صرف	املا و تحریر
دوم	فارسی	صرف	حساب	املا و تحریر	نحو
۳	نحو	منطق و ادب	تاریخ و عقائد	انشاء عربی و فارسی	حساب
۴	حساب	منطق و مناظرہ	فقہ	حدیث و فرائض	ادب
۵	فلسفہ و منطق	فقہ و اصول	عقائد و تاریخ	حساب	ادب
۶	منطق	حساب	فلسفہ	عروض و معانی	ادب

[illegible]

دفعہ دوم میں آپ نے لکھا ہے کہ طلبہ کو عربی لکھنی نہیں آتی اس کے لئے طرز تعلیم کے قواعد مقرر ہونے چاہئیں

یہ امر قاعدہ کے نیچے نہیں آسکتا بلکہ مدرسین کے ادبی مذاق پر موقوف ہے لیکن اس کی تدبیر سردست یہ

ہونی چاہئے کہ ہفتہ میں بعض اوقات میں املا و تحریر یا ادب کا ہر روز جو ایک گھنٹہ رکھا گیا ہے اس میں ہمیشہ

اردو سے عربی میں ترجمہ کرایا جائے لیکن چونکہ مدرسین خود عمدہ عربی نہیں لکھ سکتے ہوں گے اور اس لئے

ان کی اصلاح چنداں مفید نہ ہوگی اس لئے اس کا یہ طریقہ ہے کہ عربی کی ایک کتاب عمدہ عبارت کی

جس میں قصے ہوں پہلے مدرس صاحب اس کا صفحہ دو صفحہ اردو میں بامحاورہ ترجمہ کرکے وہی ترجمہ

کرادیں پھر اصلاح میں اصل عبارت کے موافق اصلاح دیں یا بالکل وہی اصل یا بتغیر یسیر ہاں اس قدر

ضرور چاہئے کہ طلبہ کی صرفی، نحوی اور محاورہ کی غلطیوں پر ان کو مطلع کردیا کریں۔

دفعہ ۳۔ کا جواب۔ مقدمہ ابن خلدون وغیرہ کے مضامین کا انتخاب میں خود کرکے کل پرسوں بھیجوں گا

دفعہ ۴۔ کا جواب۔ مختصر تاریخ ہندوستان جہانگیری و صدیقی کے لئے قصص الہند مطبوعہ لاہور؛

نہایت عمدہ اور دلچسپ کتاب ہے اس کا اسلامی حصہ خاص مولوی محمد حسین آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ اور

بہت ہی دلچسپ ہے مسائل ضروری دینیات کے لئے کیا راہ نجات کافی نہیں؟

دفعہ ۵۔ ہاں میں نے اپنے ریمارکوں میں بعض جگہ کتابوں کے نام نہیں متعین کئے تھے وہ اب

لکھتا ہوں حسب ترتیب ریمارک۔

مختصر جہانگیری و صدیقی [illegible]

درجہ دوم۔ سفرنامہ کے بجائے تاریخ اختصار تاریخ کا وہ حصہ جو پنجاب کے فارسی مڈل کلاس میں داخل

وہ کورس ہے لینا چاہئے۔ مخزن الفوائد کے بجائے جلد اول و دوم کے آسان حصے۔

درجہ چہارم۔ شرح وقایہ سے پہلے انتخاب جامع صغیر امام محمد اور ادب کی کتاب اس درجہ میں کلیلہ

ابن المقفع مطبوعہ بمبئی،

درجۂ پنجم، شرح ہدایۃ الحکمۃ مولوی عبد الحق خیرآبادی مناسب ہے، مولانا لطف اللہ صاحب مفتی حیدرآباد نے اپنے کورس میں اسی کو منتخب کیا ہے،

ملا حسن ہرگز نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اس کے بجائے شرح سلّم بحر العلوم مطبوعہ دہلی رکھنا چاہیے (یہ درجہ ارک پیچھے رہ گیا تھا)

ادب کی کتاب اس درجہ میں انتخاب دیوان ابو العتاہیہ مطبوعہ بیروت رکھنا چاہیے، ہاں یہ امر خاص قابل لحاظ ہے کہ تمام میں حساب کی کتاب پی گھوش کے بجائے چکرورتی رتھمیٹک رکھنی چاہیے اب ادھر وہی متداول ہے ہمارے کالج میں اور دوسرے کالجوں میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے اور اس کو عموماً ترجیح دی جاتی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، اور بار بار چھپ چکا ہے،

فارسی کے درجے سے مجھ کو سخت اختلاف ہے، ایک کتاب بھی کام کی نہیں، منتخبات نظم و نثر تو دیکھا نہیں کہ اس کو دیکھ کر کوئی رائے دی جا سکے،

مقامات حمیدی میں نے دیکھی، بلکہ پڑھی ہے، وہ طرز[1] بجز حمیدی کے پھر کسی نے اختیار نہیں کیا، اور نہ اس طرز میں کوئی مفید مضمون ادا ہو سکتا ہے،

تحفۃ الاحرار جامی، بالکل پست درجہ کی کتاب ہے، اس سے تو مطلع الانوار خسرو کہیں اچھی ہے، اور خود جامی اس کے معترف ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ فارسی کے تین دور ہیں، قدما، مثلاً فردوسی، عبد الواسع جبلی، منوچہری، اخیر میں انوری

---

[1] یہ فارسی میں مقامات حریری کے طرز کی کتاب ہے، عبارت مقفّیٰ مسجع، اور لفظی صنائع و بدائع سے بھری ہوئی ہے،

متوسطین مثلاً سعدی، سلمان ساوجی، کمال اسمٰعیل، متاخرین مثلاً نظیری، عرفی، ظہوری، طالب آملی، کلیم

ان تینوں طبقے کی ایک ایک دو دو کتاب پڑھانی چاہئے کہ طالب علم کو ایک عام بصیرت ہو، [illegible]

سلمان، کمال اسمٰعیل وغیرہ سب چھپ گئے ہیں،

اس درجہ میں تاریخ کی کتاب نامۂ خسرواں موزوں ہے، جغرافیہ کی فارسی تصنیف جام جم ہے، لیکن وہ بڑی کتاب ہے، اور علاوہ اس کی قیمت ہے، جغرافیہ اردو میں پڑھانا کافی ہے، تاریخ میں روضۃ الاحباب بھی اچھی ہے، گو عبارت معمولی ہے:

سال		سال	
سال دوم	مخزن الفوائد اگرچہ قاعدہ کی کتاب ہے جو فائق کی تصنیف ہے تو وہ نہایت معمولی درجہ کی تصنیف ہے، اور اس میں نہایت درجہ کے ہندی شعراء کے اشعار بھرے ہیں، ہدایۃ النحو کی مدت تعلیم کم ہو روزانہ ایک صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھانا چاہئے،	چہارم	یہ کتابیں نہایت ضروری اور معیار کمال ہیں، اس لئے مصلحتاً ان کو قائم رکھا جاسکتا ہے، اس سال تاریخ الخلفاء کے ۲۳۰ صفحے بہت ہیں، ۱۰۰ صفحے سے زیادہ نہیں ہوسکتے، رشیدیہ بے فائدہ ہے، مناظرہ کے فن کے لئے صرف اس کی اصطلاحیں اور امثلہ کافی ہیں، ایک مستقل فن بنا کر اصل مسائل سے بُعد ہوجاتا ہے، رشیدیہ کا متن کافی ہے، مراقی الفلاح کی کوئی ضرورت نہیں، شرح وقایہ سے پہلے کوئی آسان اور مختصر کتاب فقہ کی رکھنی چاہئے۔
سیوم	میں کافیہ اور شرح ملا دونوں کو ناپسند کرتا ہوں، بجائے اس کے زمخشری کی مفصل ہوتی تو اچھا تھا لیکن چونکہ مولویوں کے نزدیک		

درجہ		درجہ	
پنجم	ادب کی کوئی کتاب اس درجہ میں نہیں رہی، شرح ہدایۃ الحکمۃ سے اگر میبذی مراد ہے، تو وہ درس میں رکھنے کے قابل نہیں، الٰہیات میبذی کے ... صفحے نہیں ہیں، بلکہ ساری کتاب بھی شاید اس قدر نہ ہو، اس درجہ میں بھی ادب کی کوئی کتاب نہیں ہے	ششم	اس درجہ میں فلسفۂ قدیم کی کوئی کتاب ہونی چاہئے، مثلاً شرح حکمۃ العین کا کوئی حصہ، مختصر المعانی کے بجائے مفتاح سکاکی زیادہ مناسب ہے، بشرطیکہ طلباء نادان نہ ہوں،
ششم	جب درجہ چہارم و پنجم میں کوئی کتاب ادب کی نہیں ہے تو اس درجہ میں مقامات حریری کیونکر چل سکتی ہے،		درجہ ششم یا پنجم میں امام غزالی کے رسائل درجہ یعنی الجام العوام ومنقذ من الضلال وغیرہ رکھنا مناسب ہوگا،

۹۔ اگست سنہ ۹۹ء کو مولانا نے نواب صاحب کو امیر افغانستان کے مجوزہ مکتب ترجمہ کی اطلاع دی، اور ساتھ ہی اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے لکھا:- "جب صحرائے افغانستان میں یہ اُپج پیدا ہوئی ہے، تو بھوپال کا مرغزار تو بڑی قابلیت رکھتا ہے۔"

غرض ان تنظیمات کے بعد مدارس کی حالت درست ہوئی، اور نتیجے توقع کے مطابق نکلے، چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء میں سرکار بھوپال کی پہلی تعلیمی رپورٹ بابت سنہ ۱۹۰۰ء اردو و انگریزی میں شائع ہوئی، اس وقت مولانا حیدرآباد میں مولوی سید علی بلگرامی کے پاس مقیم تھے، روداد کو دیکھ کر مولانا نے نواب صاحب کو مبارکباد دی، اور لکھا:- "روداد و رسالہ میں نے دیکھی، اور نہایت مسرت ہوئی، خدا کرے روز افزوں ترقی ہو، میں تو چاہتا ہوں کہ واپسی میں خود مدارس کو دیکھ کر ایک یادداشت لکھوں

لیکن آپ فرمائیں تو روداد وہی پر اپنی رائے لکھ کر اخبارات کو بھیجدوں، انگریزی، اردو مولوی سید علی صاحب نے لے لی۔" (علی حسن خاں م)

سرسید کی وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء

مولانا بھوپال سے فروری کے اخیر میں علی گڈھ واپس آئے، یہ وقت علی گڈھ کی پالیٹکس کا بڑا نازک تھا، ان دنوں سرسید ایک طرف اپنے بیٹے کی بدمستی اور بدمزاجی سے نہایت قلبی کوفت اور اذیت میں تھے، اور دوسری طرف سید محمود کی جانشینی اور ٹرسٹیز بل کی منظوری کے سبب سے سرسید کے اچھے اچھے دوست بلکہ دست و بازو ان سے الگ ہو چکے تھے، نواب وقار الملک اور دوسرے اکابر ارکان کی طرف سے بااعلان مخالفت کی تحریریں اخباروں میں چھپ چکی تھیں، یہاں تک کہ نیک صفات مولانا حالی بھی موافقت نہ کر سکے، کہ دفعتاً چند روز کی علالت کے بعد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی، اور ساری مخالفانہ کارروائیاں رک دی گئیں، بایں ہمہ اس وقت سرسید کے سانحۂ وفات کا جو اثر مولانا پر تھا اس کا اندازہ اس عربی خط سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے سانحہ کے دوسرے دن نواب علی حسن خاں کو بھوپال لکھا،

نمی دانم حدیث نامہ چون است   ہمی دانم کہ عنوانش بخون است

تضعضعت ارکان الملۃ!   قومی عمارت کے ستون ہل گئے،

انتقل السید احمد خان بہادر الی جوار رحمۃ ربہ، وذالک یوم الاحد ۲۷ مارچ وتفرق شملنا، انی لا اقدر

یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے، اور یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا، اور ہماری قوم کا شیرازہ

علی گڑھ، مشغلۂ شعر و ادب جو حقائق ... بکھر گیا، میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں
القرمان۔ (شبلی نعمانی علی گڑھ) ۱۸۹۸ء کر سکتا۔

اس موقع پر یہ بات تعجب سے دیکھی جائے گی کہ جس کی مدح انھوں نے پہلے کئی دفعہ لکھی، اس کے مرثیہ میں ایک شعر بھی انھوں نے نہیں کہا، مگر واقعات کی روداد آپ کے سامنے ہے، اس کو پیش نظر رکھئے تو معلوم ہوگا کہ مدح لکھنے والے کا دل اب مرثیہ لکھنے کے زمانہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا، اور جھوٹی شاعری اس کی استادی کا شیوہ نہ تھی، البتہ سرسید کی وفات کے بعد ان کی انشا پردازی پر ایک مضمون اپریل ۱۸۹۸ء کے میگزین میں ارکان کالج کے اصرار سے لکھا، جیسا کہ مضمون کے آخر میں ہے:

رخصت اور ترک تعلق مئی ۱۸۹۸ء

اب کالج سر تا سر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آگیا، اور سید محمود کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی، ۲۲ اپریل ۱۸۹۸ء کو لکھتے ہیں:

"کالج کا حال کشمکش میں ہے، مسٹر بک صاحب نے قبضہ کر لیا ہے، سید محمود کی حالت بہت خراب ہے" (مکاتیب)

مولانا نے فروری ہی میں ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پہلی مئی سے چھ مہینے کی رخصت لیں گے، سرسید کے واقعہ کے بعد تو اور ضروری ہوگیا، چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے پہلے چھ مہینے کی رخصت لی، پھر استعفا بھیج دیا، اس طرح سولہ برس کی پر انقلاب سبق آموز اور ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڑھ کو خیرباد کہا،

اعظم گڑھ کو رجعت جون ۱۸۹۸ء

کالج سے رخصت ہو کر مولانا نے جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ کا رخ کیا، یہاں انھوں نے ۱۸۹۶ء سے پہلے (ملحق ہ) شہر سے باہر اپنے خاندانی باغ میں ایک چھوٹا سا کچا بنگلہ بنوایا تھا، اور جس کو شبلی منزل کا خطاب دیا تھا، اور جو اب شبلی کا مدفن اور دار المصنفین

کو مسکن بھی یہیں آکر قیام فرمایا۔

مولانا نے یہاں بیٹھ کر سب سے پہلے تو ندوۃ کے تمام حصص کی تکمیل کرنی چاہی، اور اسی کے ساتھ ۱۸۸۳ء میں جب شبلی اسکول کی بنیاد اعظم گڈھ میں ڈالی تھی جس نے ان کی برادری میں انگریزی تعلیم کی اشاعت میں بڑی مدد دی تھی اس کی دیکھ بھال شروع کی عزیزوں سے اس کے لئے چندے منگوائے، اس کی تعمیر کے اضافہ کا خیال کیا، ماسٹروں اور مدرسوں کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی آمد و خرچ کو برابر کرنے کی کوشش کی، ان باتوں میں کبھی کبھی ان کا دن دن بھر لگ جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء کے مکاتیب (حصہ اول) میں یہ تذکرے ہیں۔

کتب خانہ کی یکجائی مولانا نے اپنا ذاتی کتب خانہ جو ان کی خریدی اور ہدیۃً ملی ہوئی کتابوں پر مشتمل تھا، اور جس میں اچھا خاصا حصہ یورپ کے مطبوعات کا تھا علی گڈھ سے منگوایا، اور جو کتابیں یہاں تھیں ان سے ملا کر کئی ہزار کتابوں کا ذاتی کتب خانہ اب یکجا کر لیا۔ میں ۱۹۰۰ء میں جب پہلی بار مولانا کے پاؤں کے حادثہ میں اعظم گڈھ آیا تھا تو اس کتب خانہ کو دیکھا تھا۔

یہ کتب خانہ کیسا تھا اس کا حال خود مولانا ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"کتابیں میرے پاس تعداد میں بہت نہیں ہیں لیکن اکثر نایاب مطبوعات یورپ، اور بعض نایاب قلمی کتابیں ہیں۔" (۴۶)

اس کی قیمت کا تخمینہ بھی اس خط میں تین ہزار بتاتے ہیں۔

علالت اعظم گڈھ میں سال بھر رہنا مشکل تھا، اس لئے وہ ستمبر ۱۹۰۰ء میں الہ آباد گئے (مہدی افادی)، پھر وہاں سے ہو کر لکھنؤ گئے، اور گولہ گنج میں ندوہ کے مکان میں ٹھہرے، اور وہاں کے

مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب (بانیٔ مدرسہ تکمیل الطب جھوائی ٹولہ لکھنؤ) کا علاج کرایا، ۱۰ ستمبر ۱۸۹۴ء کو وہیں تھے رمضان کی افادی، کہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں ہم اُن کو پھر علی گڑھ میں پاتے ہیں، اور عربی کی بعض نئی مطبوعہ کتابوں کے حصول پر خوش ہو رہے ہیں، (حمید ۹)

اس تمام چکر میں الفاروق کا کام ساتھ ساتھ تھا، اور مزاج کا یہ حال تھا کہ کبھی اچھا اور کبھی برا، اس لئے کسی صحت گاہ کا خیال تھا،

سفر کشمیر جولائی ۱۸۹۵ء

صحت کی بحالی کے لئے کشمیر کے سفر کا خیال جیسا اوپر گذر چکا ہے مولانا کو کئی سال سے تھا، امسال جب وہ کالج کی خدمات سے سبکدوش ہو رہے تھے، اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ پورا ہو رہا تھا، چنانچہ فروری ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ ہی سے کشمیر کا قصد تھا (حمید ۹)

اب جب وہ جون ۱۸۹۵ء میں کالج کی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو اسی مہینہ کے آخر میں کشمیر کے سفر کو تنہا روانہ ہوگئے، اس وقت الفاروق جیسی زندۂ جاوید تصنیف زیر قلم تھی، جی چاہا ہوگا کہ وہ اسی بہارستان میں ختم ہو،

کشمیر میں قاضی خواجہ سعد الدین صاحب مرحوم جن کے خاندان میں کشمیر کا عہدۂ قضا موروثی تھا، وہ علی گڑھ میں مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم سے پڑھتے تھے، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان سے مولانا کے مراسم قائم ہو گئے تھے، مولانا نے کشمیر کا قصد فرمایا تو انھوں نے میزبانی کا فرض ادا کرنا چاہا، مگر مولانا ایک دیو محل میں الگ مکان لیکر رہے جو نہایت نمناک تھا، خواجہ سعد الدین صاحب نے منع بھی کیا، مگر مولانا نے اسی مقام کو پسند کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ہی ہفتہ رہنے پائے تھے کہ نہایت سخت بیمار پڑے، الفاروق جلد دوم کا خاتمہ وہیں جولائی ۱۸۹۵ء کو ختم ہوا، مولانا فرماتے تھے کہ جس وقت ہاتھ سے قلم رکھا ہوں میں بستر پر بیہوش پڑ گیا۔

کشمیر میں جتنے دن رہے، بیمار ہی رہے۔ تنہا گئے تھے، یہاں تک کہ ملازم بھی ساتھ نہ تھا، مگر کشمیر کے احباب نے اور خصوصیت کے ساتھ قاضی خواجہ سعد الدین صاحب اور مرزا احمد صاحب جو کشمیر کے ایک علم دوست رئیس تھے، بڑی خدمت کی، اور ایک طبیب کا علاج ہوا، ایک دفعہ بخار کم ہوا تو سمجھے کہ اچھے ہو گئے، مگر دوبارہ پھر بیمار ہوئے اور جب تک وہاں رہے بیمار ہی رہے۔ آخر جب ذرا طبیعت سنبھلی تو وطن کا رخ کیا، ۱۲ جولائی کو وہ گھر پہنچ چکے تھے[1]، گو اب بھی علیل تھے مگر آنے کے ساتھ ہی خلیل اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، ۱۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو مولوی [illegible] صاحب سے تعمیر کا چندہ مانگا (ضمیمہ) اور دوسروں سے تقاضے شروع کئے، مگر طبیعت کا یہ انداز تھا کہ کبھی اچھے ہیں اور کبھی بیمار۔ منجھلے بھائی مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے الٰہ آباد بلایا تو ۲۲ اگست ۱۸۹۸ء کو یہ معذرت لکھی: "میں جانتا ہوں کہ تمہارا بار بار کا تقاضا جوشِ محبت کی وجہ سے ہے، مگر کیا کروں کیفیت یہ ہے کہ طبیعت دو چار گھنٹے بھی یکساں نہیں رہتی، بلکہ دو چار مرتبہ بہت خراب حالت ہو گئی، اور خدا نخواستہ ایسی کیفیت کہیں سفر میں پیش آگئی تو جان کا خطرہ ہے، اس لئے سفر کرنا ایسی حالت میں سخت مخدوش ہے، اگر تمہیں تشخیصِ طبیعت کے لئے اس قدر اصرار ہے تو حکیم صاحب کو یہاں بھیج دو، اور بہر حال بنارس کی ریل کھلنے کا تو انتظار ہی کرنا چاہیئے۔"

بہر حال طبیعت سنبھلی تو ۹ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو الٰہ آباد میں پاتے ہیں اور ایسے خوش کہ بیماری کا کوئی تذکرہ ہی نہیں، اور فاروق کے دل خوش کن تذکرے ہیں۔ (ضمیمہ افادی ۹) دفعۃً

[1] مکاتیب میں ۲۲ مارچ ۱۸۹۸ء لکھا گیا ہے، مارچ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اس مہینہ علی گڑھ میں تھے اور اچھے تھے اور یہ تاریخ سفر کشمیر سے پہلے کی ہو، ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی ہو تو وہ علی گڑھ ہی میں تھے اس لئے یہ غلط ہے۔

اور ستمبر ۱۸۹۸ء کو ہم ان کو لکھنؤ و فرخ آباد میں دیکھتے ہیں، اور بیمار پاتے ہیں، جھوائی ٹولہ کے مشہور طبیب
حکیم عبدالعزیز صاحب کا علاج ہو رہا ہے (مہدی افادی ۸)، مگر پھر وہ اعظم گڈھ واپس آ گئے، جہاں کچھ نہ کچھ
علاج ہوتا رہا، مگر طبیعت رو بہ زوال تھی، لطف یہ ہے کہ علی گڈھ کے ان کے بعض دوستوں کو
ان کی اس شدید بیماری کا یقین نہیں آتا تھا یعنی حاجی اسمٰعیل خاں مرحوم اس کو مذاق ہی سمجھے رہے،
البتہ نواب محسن الملک نے کرم کیا، اور خود اعظم گڈھ آئے، اور کئی روز رہے۔ اسحٰق مرحوم کو لکھتے ہیں
"پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ
میں تین دن رہے۔ ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کر سکا، گرمی
کی وجہ سے بدن میں طاقت معلوم ہوتی ہے، تم آنے میں جلدی نہ کرو، میری اس قدر ضرورت نہیں ہو کہ کوئی
ماہر طبیب یا ڈاکٹر اعضائے رئیسہ کی تشخیص کر لیتا۔" (۱۰)

معلوم ہوتا ہے کہ نومبر و دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان کی حالت سنبھل گئی، چنانچہ وہ سفر کے قابل ہوگئے،
بعض حالات کی بنا پر جن کی تفصیل نہیں، ۲۰ دسمبر ۱۸۹۸ء کو وہ علی گڈھ جاتے ہیں، مولوی حمید
صاحب کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، خط میں کسی بیماری کا ذکر نہیں، بلکہ طبیعت میں یہ انبساط
ہے کہ اس زمانہ میں جو علمی کتابیں ہاتھ آئیں ان کی تفصیل حوالۂ قلم ہے۔ (۱۱)

الفاروق کی تکمیل اور اشاعت (جنوری ۱۸۹۹ء) | اسی حالت میں الفاروق کی آخری تکمیل و نظر ثانی اور طباعت
کا کام جاری رہا، دسمبر ۱۸۹۸ء میں اعظم گڈھ میں اس کا مقدمہ تحریر ہوا، ۸ جنوری ۱۸۹۹ء کو
اس کے چھپ جانے کی بشارت دی جاتی ہے (مہدی افادی ۹)، ۸ فروری ۱۸۹۹ء کو
اس کے مطبوعہ اوراق ایک مشتاق عزیز دوست (مولانا شروانی) کے پاس اس تاکید کے ساتھ بھیجے جاتے

[illegible]

ہیں کہ ابھی کوئی اس کو دیکھنے نہ پائے۔ (شروانی ۱۰) مولانا کو اس کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ تکمیل و اشاعت سے
پہلے اُن کی کتاب کا مسودہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ فرماتے تھے کہ سرسید مرحوم الفاروق کا مسودہ اور
اس کے چھپے ہوئے اجزاء دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے، اور میں مسکرا کر یہ جواب دیتا کہ مشاعرہ سے
پہلے غزل نہیں سنائی جاتی، مگر افسوس کہ سرسید اس غزل کو نہ پڑھ سکے اور نہ سن سکے کیونکہ وہ اس
سے پہلے ہی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کر چکے تھے۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "مجھ کو ایک مرتبہ الفاروق کے ایک حصہ کا مطبوعہ پروف اپنے
ہاتھ میں لے کر اس شرط سے دکھایا کہ میں صرف اس کا حسن طبع دیکھوں، پڑھوں نہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

سلسلۂ علالت کا اشتداد الفاروق جیسی اہم تصنیف سے فراغت کی مسرت اُن کو ابھی ہونے بھی نہیں
پائی تھی کہ علالت نے اشتداد اختیار کیا۔ ۱۵ فروری ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو اپنا یہ حال لکھ کر
بھیجتے ہیں: "اصل یہ ہے کہ میری تمام بیماریوں کا سبب معدہ کا فساد ہے اور اب تک نہیں گیا، غذا ٹھیک
ہضم نہیں ہوتی، کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی، کبھی نفخ رہتا ہے، کبھی قبض اور اکثر تبخیر، ان اسباب سے نہ
قوت آتی ہے، نہ ظاہر حال میں تندرستی آتی ہے۔ شب و روز پلنگ پر پڑا رہتا ہوں۔ فوری ڈاک کے لئے
ایک ملازم بمشاہرہ عشرہ رکھ لیا ہے۔" (شروانی ۲۰)

اس عالم کے علمی مشاغل علالت کے اس تکلیف دہ سلسلہ میں بھی ان کے علمی مشاغل بدستور جاری
رہتے ہیں، ۱۰ اپریل ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی سے مسٹر آرنلڈ کے لئے منوچہری کا دیوان مطبوعہ یورپ
منگواتے ہیں، اور المامون کے ریویو لکھنے والے کو الفاروق پر ریویو لکھنے کا اشارہ کرتے ہیں (شروانی ۳۳)
۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو ریویو تیار ہو جاتا ہے، اور معارف علی گڑھ مرتبہ مولوی وحیدالدین صاحب سلیم میں

اس کے کھینچنے کا شورہ ہوتا ہے، اور اسی خط میں اپنی اس زندگی سے جس میں بیماری کے تسلسل کی وجہ سے مخلص دوستوں سے ملنا نصیب نہ ہو تنگ آجانا ظاہر کرتے ہیں، (شروانی۔ ۵)

علالت کا سخت دورہ مئی سنہ ۱۸۹۹ء

اس کے ایک ہی ہفتہ کے بعد بیماری کا ایک نہایت ہی سخت دورہ پڑا جو یہاں تک کہ اپنی علالت کی شدت سے مجبور ہو کر، ۸ مئی سنہ ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔ "آپ اداے حقِ دوستی کا وقت ہے، حکیم عبد المجید[1] خاں صاحب کو میرے معالجہ کے لئے خط لکھئے، ان کا جواب آجائے تو سفر کا قصد کروں، آپ بھی دلی تک چلیں، ظنِ غالب ہے کہ نواب محسن الملک بھی چلیں گے" (۹)

ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور عارضی صحت ۱۸۹۹ء

بیماری کا حملہ اس دفعہ اتنا شدید تھا، کہ مایوس ہو کر وصیت نامہ تک لکھ دیا تھا، حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اسی اثنا میں کہ دلی کے سفر کا سامان ہو رہا تھا، ایک مسلمان ماہر ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن گونڈہ سے بدل کر اعظم گڈھ آئے، مولانا کے بھائی مولوی اسحاق صاحب سے اُن کے تعلقات تھے، اس سبب سے یہ سن کر کہ مولانا بیمار ہیں وہ دیکھنے آئے، اور بہت توجہ سے علاج شروع کیا، اور یہ تشخیص کیا کہ قلب میں نہایت کمزوری آگئی ہے، اس لئے کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی، انھوں نے محنت اور جد وجہد سے علاج کا سلسلہ جاری رکھا، اور بحمد اللہ کہ اُن کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا، اور دلّی کا سفر سر دست ملتوی ہو گیا، (شروانی ۶) ابھی طبیعت درست ہو چلی تھی کہ ندوہ اور نادر کتابوں کی یاد آئی، ۱۱ جون کو انھیں لکھتے ہیں: "خدا کا ہزار ہزار شکر کیا، ڈاکٹری علاج سے بہت

---

[1] دلی کے مشہور شریف خانی طبیب [illegible]ء میں وفات پائی [2] نواب علی حسن خاں۔ ۳۰

فائدہ ہو۔ ادب الکاتب ناقص خریدنے کی کیا ضرورت ہے، مصر میں کمل چھپ گئی ہے جو شرح اساس کے حاشیہ پر،

دار العلوم کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے ہیں، کیا قوم کو اس قدر بے پروا کر دیو بند وغیرہ

سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیے: (۸)

مولانا کی اگلی جیسی بشاشت گفتگو سے دوستوں کو خیال ہوا کہ اب وہ تندرست ہو گئے

مولانا شروانی نے یہ پوچھا تو جواب دیا: "ابھی تو میں کیا مجبور ہوں لیکن کچھ امید بندھی ہے شاید اچھا ہو جاؤں'

آپ اس بات کے لئے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحت کامل دی، تو میں اپنے خاص دوستوں کو مدعو کروں گا'

جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، انکو بھی تکلیف کرنی پڑیگی، منہ کی بیماری و علاج ہے:

مولانا شروانی نے آنے کا وعدہ کیا تو خوشی سے اوچھل پڑے، ۲۵ جون کو لکھا: "کیا آپ سچ مچ یہاں جلوہ فرما ہوں گے، اور کیا درحقیقت ع میرے ویرانہ میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی، نامۂ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ع سچ سچ بتا یہ حرف انہی کے قلم کے ہیں:

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی صحت کا اعلان کیا، اور انہی کے اصرار سے ایک جلسہ مرتب ہوا، لوگ مدعو ہوئے، شکرانہ میں سو روپیہ مولانا نے نذر کئے،

اورینٹل کانفرنس اٹلی کا ارادہ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

صحت کے بعد تبدیل آب و ہوا کی ضرورت تھی حسنِ اتفاق یہ کہ اسال یورپ کی اورینٹل کانفرنس (جو مشرقی اور اسلامی علوم و فنون کی تحقیق کرتی ہے) کا اجلاس اٹلی میں ہو رہا تھا، اور اس پر حسنِ اتفاق یہ کہ سفرِ روم کے رفیق پروفیسر آرنلڈ اسی زمانہ میں ۲۹ جولائی کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس کی شرکت کے لئے روانہ ہو رہے تھے، انھوں نے مولانا سے بھی سفر کی تحریک کی، وہ آمادہ ہو گئے، اپنے دو عزیز دوستوں نواب سید علی حسن خاں اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھا،

پہلے ۵ جولائی ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھا:- "ہاں ایک اور بات جو ابھی کانفرنس اوّلی میں ہے، آرنلڈ ۹ جولائی کو روانہ ہوں گے، مجھ کو بلاتے ہیں، ضعف کی وجہ سے رُکتا ہوں، اگر آپ کی ہمسفری کی امید ہو تو میں تو ہی ہو جاؤں گا، کیا آپ قصد کر سکتے ہیں؟ اسی سیر میں ممالکِ اسلامیہ کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے، پانچ سات سو کا خرچ ہے، آپ چاہیں تو ذرا ٹھہر کر بھی چل سکتے ہیں۔" (۱)

۱۴ جولائی ۱۸۹۹ء کو نواب سید علی حسن خاں کو بھوپال لکھا، (۱) "ایک نہایت ضروری گزارش جو آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ میں علومِ مشرقیہ کے علما کا ایک مجمع ہوا جس کو اورینٹل کانفرنس کہتے ہیں، یہ نہایت معزز کانفرنس ہوا، اور تمام یورپ و مصر و شام کے علما جمع ہوتے ہیں، اس دفعہ اس کا جلسہ اٹلی میں ہے، ریاست حیدرآباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لئے بھیجا ہے، اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے مسٹر آرنلڈ کو، میں بھی ان شاء اللہ جاؤں گا، آپ قصد کریں تو متعدد فائدے ہیں، ریاست کی ناموری، آپ کو یونیورسٹی کا فیلو بننا آسان ہوگا، آپ کے عہدۂ وزارت کی گورنمنٹ کے نزدیک نہایت وقعت بڑھ جائے گی، واپسی کے وقت مصر و قاہرہ کی سیر لطفِ صحبت الگ، خرچ بہت سے بہت ایک ہزار مع خرچ واپسی جواب سے مطلع فرمائیے۔"

بعد کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے یہ تجویز پیش کی، کہ آپ بجائے ذاتی خرچ کے قومی خرچ سے جائیں، غالباً نواب صاحب کا اشارہ اس جانب ہوگا، کہ وہ خرچ کے متحمل ہوں گے، مولانا نے جواب دیا:- "آپ کی یہ تجویز کہ میں قوم کے روپے سے جاؤں، آپ کے عالی مذاق کی دلیل ہے، لیکن اس کے دو پہلو ہیں، (۱) میری مالی اعانت، تو اس کی ضرورت نہیں، اور اگر تحقیق ہو تو اسکو حیثیتِ شخصی نے ترجیح کر دیا ہو (۲) قوم کی عملی قدر دانی کا ثبوت۔ تو اس قدر دانی کا ثبوت اور لوگوں پر بھی ہو سکتا ہے۔"

مولانا: اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو

تو یہ جو پیش نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا، اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی وغیرہ گر کے یورپ چلے گئے (۳) معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے مجبوری ظاہر کی، اور وہ خود بھی دوبارہ بیمار پڑ گئے، اور وقت نکل گیا، مگر علم کے شوق کا اندازہ کیجیے کہ اس دیرینہ علالت کے بعد بھی دماغ اُدھر ہی معروف ہے، اس کا ایک اچھا اندازہ اس زمانہ کے خطوط سے ہوگا۔

امیر کابل کی پیشکش، جولائی و اگست ۱۸۹۹ء

ان ہی دنوں امیر عبدالرحمان خاں والی کابل نے اپنے ملک کے لئے ہندوستان میں ایک محکمۂ تراجم قائم کرنا چاہا، جو ہندوستان ہی میں رہ کر ہندوستان کے فضلاء کے قلم سے فارسی میں علوم و فنون کا سرمایہ بہم پہنچاتا، اس کے لئے اپنی حکومت کے اشارہ سے کابل کے سفیر نے مولانا حالی، مولانا نذیر احمد اور مولانا شبلی سے خط و کتابت کی، ان بزرگوں نے معلوم نہیں کیا جواب دیا، غالباً معذرت کی ہوگی، مولانا شبلی اس وقت گویا علیل ہی تھے، انہوں نے چاہا کہ یہ کام مولوی حمید الدین صاحب کے سپرد ہو، اس سلسلہ میں ۲۴ جولائی ۱۸۹۹ء کو انھیں یہ خط لکھا:- "آج کل ایک بڑی ریاست بلکہ سلطنت نے ابن خلدون کے ترجمہ کا استفسار کیا تھا، وہ سہ ہزار روپیہ نقد دیتے ہیں، میں نے اپنی صحت کے لحاظ سے انکار کر دیا۔" (حصہ ۱) ۱۰ اگست ۱۸۹۹ء کو نواب علی حسن خاں کو ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں:- "اسی زمانہ میں سفیر کابل مقیم شملہ نے دس ہزار روپیہ نقد کے معاوضہ پر ابن خلدون کے ترجمہ (بحکم امیر صاحب) کے لئے مجھ کو لکھا، میں نے انکار کیا، اگرچہ مجبور کرتے ہیں، میں نے انکار لکھ دیا" (۳)

پھر شکایات کا عود اور علمی مشاغل، ستمبر ۱۸۹۹ء

مولانا کا ڈاکٹری علاج اب بھی جاری رہا، پہلے کے مقابلہ میں اب بہت اچھے تھے، اور علمی و قومی مشغولیتیں بھی ساتھ ساتھ تھیں، ایک طرف نیشنل اسکول کی مالی امداد، اس کے آمد و خرچ کے برابر کرنے کی کوشش، ماسٹروں کے مشاہرات کے لئے مہاجنوں سے قرض لینے کے سامان میں دن گذر رہے ہیں (مکاتیب ۹-۱۰-۱۱) تو دوسری طرف

علمی انہماک بھی بڑھتا جا رہا ہے، الفاروق کے بعد اب کسی تصنیف کا خاکہ بن رہا ہے، ۱۰ جولائی کو مولانا شروانی سے معاملہ طے ہو رہا ہے کہ آپ کیا لکھیں میں کیا لکھوں، یا دونوں مل کر لکھیں، چند عنوان سامنے آتے ہیں، علوم القرآن، امام غزالی کی لائف، فارسی شاعری کی تاریخ (۱۲-۱۳-۱۴-۱۹)

۱۶ اگست کو ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ ہوتا ہے، اور مولانا روانگی کا ارادہ کرتے ہیں کہ پھر شکایتیں عود کر آئیں، ڈاکٹر صاحب موصوف اسی اثنا میں بدل کر گونڈہ چلے گئے تھے، آخر مولانا ستمبر ۱۹۰۹ء میں ان سے علاج کرانے کے لئے گونڈہ روانہ ہو گئے، وہاں سے مولانا شروانی کو اپنی دوبارہ علالت کی اطلاع دیتے ہیں، اور اب سیر الصحابہ کی تجویز پیش ہو رہی ہے، ساتھ ہی ان کی اور خلیل کا فرض کا خیال اور ندوہ (شروانی ۱۶) ایک آدھ روز کے لئے لکھنؤ آتے ہیں، وہاں کے کسی کتب فروش کے پاس بعض نادر نسخے، تصاویر، قطعات دیکھتے ہیں، تو ۱۰ ستمبر کو شروانی کو کس خوشی سے لکھتے ہیں:

"اکبر، جہانگیر، اور شاہجہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے نظر یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر اس میں کتاب الآلات کا بھی ایک نسخہ ہے لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں، وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں، خدابخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا" (۱۶)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ اس تحریک کی یہ برکت ہوئی کہ بالآخر یہ خزانہ حبیب گنج کے کتب خانہ میں داخل ہو گیا، ان میں سے ایک گلکاری کی بابت حال میں امریکہ کے ایک مؤلف نے لکھا ہے کہ دنیا میں منصور زمانی کے ہاتھ کی گلکاری کا نمونہ صرف ایک ہے اور وہ حبیب گنج میں ہے، یہ تھی مولانا کی نقادی، دکھانا یہ ہے کہ مسلسل علالت کے ایام میں بھی دماغ اپنے کام سے خالی نہیں، ۲۰ ستمبر کو گونڈہ کے شفاخانہ سے لکھتے ہیں: "میں بہت بھلا چنگا ہوں، اور ساتھ ہی دار العلوم کا خیال آیا، مولوی خلیل الرحمان صاحب عیادت کو آئے تھے، اور ابھی اسی حال میں نے

سلہ مولوی خلیل الرحمان صاحب فرزند دوم مولانا ... ۱۲

عالم خیال میں وہاں جانے کی تیاریاں شروع کر دیں، (۱۹) مولانا اکتوبر تک گونڈہ کے شفاخانہ میں مقیم رہے، گونڈہ میں ایک لطیفہ پیش آیا، قاضی خادم حسین صاحب جو مولانا سید امیر علی صاحب شبیہ کی بہن کے نواسے ہیں، اور جن کے نانا ہی گونڈہ میں وکیل تھے، وہ اس زمانہ میں وہاں طالب العلم تھے اور نوجوان تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کا بیحد مشتاق تھا، مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی، مولانا کے گونڈہ آنے کا حال سُنا تو عقیدتمندانہ حاضر ہوا، اور شوقِ ملاقات عرض کیا: "فرمانے لگے: اب مجھ معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادہ کی کرامت تھی، اور اس طرح مجھے کھینچ کر گونڈہ بلایا گیا، یہ مقصد پورا ہوگیا، اب میں جلد اچھا ہو جاؤں گا" توقعی وہ چند روز کے بعد اچھے ہوگئے، اور گونڈہ سے چلے آئے، بظاہر طبیریا نے مولنا کے جسم سے مفارقت کی، مگر حقیقت یہ کہ اخیر اخیر تک اُن پر اس کے حملے ہوتے رہے، یہاں تک کہ وفات سے ایک سال پہلے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنے ایک عزیز شاگرد کو جو کشمیر میں تھے لکھتے ہیں: "جموں سے ایک انجمن کا سخت تقاضا آیا ہے، اخیر مارچ میں کوئی جلسہ ہے، کشمیر کا ارادہ تو کرتا ہوں، اور کشش کے اسباب بھی ہیں، خصوصاً یہ کہ حکومت کے بڑے بڑے ارکان میرے دوست اور شاگرد ہیں، لیکن ملیریا کہ امسال بھی تربہ ایک دفعہ اس قدر صدمہ اٹھا چکا ہوں کہ اب تک نہیں سنبھلا" (مجدالباری ص ۳)

تصنیف کشمیر | مولانا کا یہ سفر کشمیر، علالت کا یہ سلسلہ، مرض کا اشتداد، پھر علاج کا ایک اتفاقی سامان اور صحت مزاج مولانا کی زندگی کے بڑے اہم واقعے ہیں، گویا وہ مر کر پھر جی اُٹھے، صحت کے

لہ جناب منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کے داماد،

بعد مولانا نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا، اور اس کا نام قصیدۂ کشمیریہ رکھا، اس کے شروع میں کشمیر کے باغ و بہار کی آرائش ہو، اُس کے بعد اپنی بیماری کا حال ہے،

بخت بنگر کہ از آں بزم گرستی ناز ... بہرہ ام ہر چہ بود درد و غم و رنج و عناست

بعد یک ہفتہ کہ آسودہ تن از رنجِ سفر ... تپ بہ من تاختن آورد و بکینم برخاست

چہ تپے بود کہ فرخنے نتوانستم کرد ... کایں مگر آتشِ سوزندہ بود یا حمّی ست

دردِ آں مایہ بیفشرد سر و پاے مرا ... کہ تواں گفت کہ یک بہرہ ز اندام کاست

اس کے بعد احباب کشمیر کی خدمت اور تیمارداری کا بیان ہے،

گرچہ با من نہ رفیقے بُد و نے خادمکے ... اینہم یک تا ہی زدہ و خوار بخواست

بعزیزانِ دیار آگہی آمد کہ فلاں ... آمد از ہند و ز رنجوری تپ شکوہ سراست

ہر یک از مہر و وفا آمد و از غم خواری ... پرسش و جوی بسر آورد و پئے چارہ بخاست

رسم بیگانہ نوازی بود آئینِ عرب ... می تواں گفت کہ کشمیر عرب را ماناست

خاصہ آں پیشرو جادۂ حسنیٰ یعنی ... سعدِ دیں آنکہ پسیں قافیہ بیتِ قضاست

خاصہ مخدوم من و یار من و یار دیرین ... میرزا اسعد کہ در شہر امیر الاُمراست

آنچہ با من ز سر خستہ نوازی کردہ است ... ہر بنِ موے ہنوزم بسپاس گویاست

اس زمانہ کے ایک خط میں جس وصیت کا ذکر ہے، اُس کی تفصیل قصیدہ میں ہے۔

چوں یقیں شد کہ مرا نوبت رفتن برسید ... بہ وصیت ورق و خامہ نمودم درخواست

---

[۱] قاضی کے گھرانے کے تھے،

شکرِ ایزد کہ دراں حالتِ آسیمہ سری | از زیاں ہر چہ بر آمد ہمہ آں بہ کہ سر است
ہر چہ از سیم و درم بود ز املاکِ قدیم | واں کتب خانہ کہ انواعِ کتب را جا است
زاں ہمہ بیشترے وقف نمودم کہ ورا | صرفِ آں کار تواں کرد کہ در شرع رواست
خاصہ بر مسجدِ پارینہ کہ در خانقہ است | کہ ز پیری باختہ و بے برگ و نواست
خاصہ آں مدرسہ کز پئے ابنائے وطن | طرحش افگندم و امروز بہ آئین و بہاست

اس کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب کی اتفاقی آمد اور اُن کے پُر شفقت علاج کا تذکرہ ہے:

آخر کار ز لطف و کرم بارِ خدا | مردے از غیب بروں آمد و کارم شدہ راست
مصطفیٰ خاں کہ بسے سنتِ رسولِ عربی ہست | از رہِ لطف بہ اعظم گڈہ آمد خواست
داشت چوں سابقۂ معرفتے با اسحاق | کہ اخِ اصغرِ من ہست و بہر پایہ سزاست
از پئے دیدنِ من آمد و بر رسمِ فرنگ | دید اعضائے دروں را کہ مرض را مبداست
دو سہ بن کرد و بہ فرمود کہ از غایتِ ضعف | کارِ خود می نہ کند دل کہ رئیس الاعضاست
لیک با ایں ہمہ از کار نہ رفتہ است ہنوز | می کنم چارہ و از ایزدم امیدِ شفاست
از سرِ مہر بہ تدبیر و علاجم پرداخت | ہم بداں شیوہ کہ طرزِ روشِ اہلِ صفاست
تا دو مہ رسم چنیں بود کہ ہر روز مرا | امتحاں کردے و جستے خبر از ہر کم و کاست
بارے از فضلِ خدا و مددِ جاں بعد سہ ماہ | بہ شدم گرچہ ہنوزم اثرِ ضعف بجاست

اس کے بعد اپنے دوستوں کو اپنی صحت کی خود مبارکباد دی ہے۔

۱؎ مولانا کے وطن بندول کے پاس [illegible] اب شبلی ہائی سکول ہے۔

فردِ صحبتِ من یاں بر ساختہ کنند ... | ہر کسے را کہ بمن دعویٔ اخلاص و وفاست
ای تو آں گفتہ بہ مہدیؒ بہ حالی و عزیز | کہ بشد آں بندہ کہ از حلقہ بگوشانِ شماست
شبلی امروز بود بلبلِ بستانِ سخن | کہ ازو گلکدۂ ہند پُر از صوت و نواست
بعد یک عمر کہ از بندِ غم آزاد شدہ است | ہم چناں باز بہ آہنگِ کہن نغمہ سراست

مولانا حالی کا قطعۂ تہنیت

مولانا نے یہ قصیدہ چھپوا کر دوستوں کو تقسیم کیا، معلوم نہیں کہ مہدی و عزیز نے کیا جواب دیا، مگر مولانا حالی نے اس قصیدہ پر مختصر سا مبارکباد کا قطعہ لکھ کر بھیجا، جس کو میں نے ان کے قلم سے لکھا ہوا بھی دیکھا تھا، اور جو ان کے ضمیمہ کلیاتِ فارسی میں بھی چھپ گیا ہے،

شد بحمد اللہ پس از ناخوشی و رنجِ دراز | شبلی ما بہ مراد از سرِ بالیں برخاست
آنکہ نامش بہ کمالاتِ سخن در گیتی است | آنکہ مشہور در آفاق بہ شمس العلماست
آنکہ گر سر کند افسانۂ (داستاں) فضل و ہنرش | خامہ مشکل کہ بپایاں بردش بے کم و کاست
آنکہ خوانند گرش فخرِ زمانِ خود و بس | کردہ باشند ہمہ اہلِ سخن از رہ راست
بود در علتِ او علتِ قومی مضمر | لاجرم صحتِ او بہر ہمہ قوم شفاست
بسکہ او روح دمیدہ است بتاریخِ سلف | ہر قدر فخر بہ ذاتش بکند قوم رواست
زندہ نادیدہ ہمانا کہ بقدرِ کسے | بعد از رحلتِ تحقیق نمی آید راست

ندوہ کی یاد
از ستمبر و دسمبر ۱۹۰۹ء

اس دیرینہ بیماری سے صحیح ہوئے تو ندوہ کی یاد نے ستایا، گو ندوہ ہی سے ۲۰ ستمبر ۱۹۰۹ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھ چکے تھے، کہ اگر آپ یا

۱؎ مہدی سے مراد نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں، اور عزیز سے مقصود خواجہ عزیز الدین لکھنوی ہیں،

اور ارکان ندوہ مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں، تو بتائیں کہ میں کیا کام کروں، میری جو تجویزیں ہیں، وہاں چلنے نہ پائیں گی، البتہ یہ ہوگا کہ گروہ بندیاں اور نزاعیں قائم ہوں، پھر تو نے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ سوچ سمجھ کر جواب لکھئے، اور مولوی محمد علی صاحب (ناظم ندوہ) سے مشورہ کیجئے" (۱۹)

پھر ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۹ء کو لکھا:- "اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ندوہ کی خدمت کر سکوں تو دس پندرہ روز کے لئے لکھنؤ میں آکر قیام کیجئے میں کام، دائمی اور طرز عمل کا نقشہ پیش کروں گا، اس پر رائے دیجئے، اور ارکان بھی پورے غور و فکر کے ساتھ بحثیں کریں، پھر جو امر منقح قرار پائے اس پر عمل کیا جائے، اور اس کا فائدہ اٹھایا جائے اس وقت جس طرح کام ہو رہا ہے اس میں شریک ہونا میں قومی گناہ سمجھتا ہوں، اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی طرز خیال ہے، پھر میری کھپت یہاں کیونکر ہو سکتی ہے، تاہم صحبت کیلئے لکھنؤ جانے والا ہوں (۲۰)

گزشتہ جلسۂ انتظامیہ میں جو ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا، مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا تو کفر نہیں رہا تھا، مگر علماء کا انگریزی سیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا، مولانا اس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے، انھوں نے تحریک کی اور مولوی یونس خاں صاحب (رئیس دناولی علیگڈھ) نے تائید کی مگر اس وقت علماء کی جمعیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہو سکی، تب مولانا نے یہ فرمایا کہ "اچھا تو یہ تحریک درج روداد کر لی جائے، اب جو روداد چھپ کر آئی تو اس تحریک کا ذکر تک نہ تھا، (شروانی ۲۱) ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا میں اور مولانا شروانی میں اس مسئلہ پر تحریری گفتگو کی نوبت پہنچی، اور لکھا کہ مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے۔" (شروانی ۲۲)

تفصیل آگے آئے گی،

سفر ایران کا قصد دسمبر ۱۸۹۹ء صحت کے بعد تفریح خاطر کے لئے کسی بیرونی ملک کی سیر و سیاحت

خیال پھر آیا، حج کا موقع نکل چکا تھا، ایران کا خیال آیا، ان دنوں مولوی حمید الدین صاحب
کراچی میں تھے، ۱۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو انہیں لکھا کہ "بوشہر اور بصرہ جانے والے جہازات کس دن
جایا کرتے ہیں، سکنڈ کلاس کا کرایہ بندر عباس تک کیا ہے، تو قسطنطنیہ کہاں ہوتا ہے" (حمید ۱۱)
جواب کیا آیا معلوم نہیں، مگر سفر نہ ہو سکا اور ہندوستان سے باہر نہ جا سکے، بلکہ خود وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے،

شبلی منزل میں ۱۹۱۰ء

یہ سال انہوں نے زیادہ تر اپنے وطن اعظم گڈھ، اور اپنے بنگلہ شبلی منزل
میں بسر کیا، بعض خانگی ضرورتوں نے بھی ان کو اس قیام پر مجبور کیا، پانچ برس ہوئے کہ پہلی بیوی
کا انتقال ہو چکا تھا، اب تک دوسرا نکاح نہیں کیا تھا، اور نہ ارادہ تھا، مگر ان کے معالج ڈاکٹر مصطفیٰ
خاں نے دوسرے نکاح کا مشورہ دیا، اور یہ مشورہ قبول ہوا، اور مولوی محمد سمیعؒ صاحب کی بہو
بہن سے نسبت ٹھہری، عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے صاحبزادہ حامد حسن صاحب کو
ناگوار گذرا، اور وہ چپکے سے لاپتہ ہوگئے، اور دور جگہ پہنچ کر باپ کو خط لکھ دیا کہ اب آپ ہم سے
مایوس ہو جائیے"۔ باپ کو اپنے اس یوسف کے گم جانے کا بڑا صدمہ ہوا، دو روز تک کھانا پینا
چھوڑ دیا، اور روتے رہے، یہاں تک کہ نکاح کی تاریخ گذر گئی، بیٹی والوں نے اس کو بُرا مانا،
مگر مولانا نے اس کی پروا نہ کی، ایک صاحب[1] کے نام ایک خط مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۰ء
میں جو درج مکاتیب نہیں، یہ پوری کیفیت خود اپنے قلم سے لکھی ہے، "حامد کے مفرور ہونے کا قصہ
تم نے پہلے سنا ہوگا، ۷ اپریل کو میرے پاس ان کا خط آیا کہ مجھ کو اب بھول جائیے"، اس خط سے اس قدر
پریشانی ہوئی کہ میں بالکل بدحواس ہوگیا، چار وقت تک کھانا نہ کھایا گیا، اور ہر وقت رویا کرتا تھا،
اسی اثنا میں شادی کی تاریخ آگئی، لوگوں کو اصرار تھا، کہ تاریخ نہیں ٹالنی چاہئے، لیکن مجھ کو دل پر قابو

---

[1] یہ وہی ہیں جن کے نام کے اکثر خطوط آپ پڑھتے آئے ہیں،

نہ تھا، نہ جا سکا، اور ہرجان وغیرہ آچکے تھے، اور اس وجہ سے ان لوگوں کی بہت سبکی ہوئی، وہاں سے
بھیج آنے کر علی گڑھ ہی میں نکاح ہو جائے، یہ اس پر بھی راضی نہ ہوا، البتہ زبیدہ اور کبریٰ بیگم یا کہ بعد طبیعت
ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

میاں حامد چند روز دربھنگہ میں رہ کر وہاں سے بھی کہیں چلدیئے، اور بالکل پتہ نہیں، اور غالباً مہینوں تک

بہرحال حامد صاحب دربھنگہ سے قصبہ بہار شریف پہنچے، وہاں حضرت مخدوم شیخ
شرف الدین یحییٰ منیری کا جن کی مکتوبات مشہور ہے، مزار اور خانقاہ ہے، اس خانقاہ کے اس
وقت سجادہ نشین شاہ امین احمد صاحب ایک مشہور بزرگ تھے، علاوہ فقر و تصوف کے
وہ فارسی زبان کے بہت اچھے ادیب اور شاعر تھے، حامد صاحب اُن کے جا کر مرید ہوئے
اور گیروا کپڑے پہن کر ترکِ دنیا کیا، ایک آدھ مہینہ تک تو فقر و فاقہ سے زندگی بسر کی، پھر تنگ
ما نا تو شاہ صاحب سے والد ماجد کا نام لیا، وہ سن کر بہت مہربان ہوئے، اور مولانا کو خط لکھ کر مطلع
کیا، اور ساتھ ہی اپنی بعض فارسی مثنویاں مولانا کی خدمت میں بھیجیں، جن میں سے ایک مثنوی کا ذکر
مولانا مجھ سے فرماتے تھے جو بہاء الدین عاملی کی مثنوی نان و حلوا کے جواب میں لکھی تھی شاید اُس کا نام شہد و شیر تھا
بیٹے کی اطلاع پا کر مولانا نے ایک دو معتبر آدمیوں کو بھیجا، اور شاہ صاحب نے حامد صاحب
کو سمجھا بجھا کر اُن کے ساتھ کر دیا، وہ اس وقت جس حلیہ میں آئے اس کا ذکر مولانا نے ایک
خط میں کیا ہے، جو ۵ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کے نام لکھا ہے۔ "شفیع اسٹر اس کو جا کر
لے آئے، لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا، وہ گیروا کرتہ اور گیروا تہمد تھا، اس نے فقر اختیار کیا، اور صرف
اس وجہ سے یہاں آنے پر راضی ہوا کہ اس کے پیر نے اطاعت والدین پر اس کو مجبور کیا، وہ پھر جانے
کے لئے مضطرب ہے، اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا۔

خرمہرہ چیز ہے، لیکن وہ ہوگیا نہ تو اب میں جانا چاہتا ہے، اور اس میں کوئی ریاکاری نہیں صرف دماغ کی خرابی کا قصور ہے، اور اصل چیز میری قسمت ہے!

بہرحال حامد صاحب پھر واپس نہیں گئے یہیں رہے، مولانا نے جون ۱۹۰۰ء میں نکاح بھی کرلیا، شبلی منزل والے بنگلہ میں ایک زنانہ حصہ بھی اٹھایا، تاکہ رخصتی کے بعد وہ یہاں رہ سکیں،

تدریس

ان دنوں اعظم گڈھ میں رہ کر بعض شائق عزیزوں کو ادب کی بعض کتابوں کے سبق شروع کرائے، ہمارے دوست مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل نے جو بعد کو علی گڈھ سے ایم اے، ایل ایل بی ہوئے، اور اب ماشاء اللہ ہمارے صوبہ کے ایم ایل اے ہیں، اور فارسی و اردو کے ممتاز شاعر اور کامیاب وکیل ہیں، یہیں اسی زمانہ میں ان سے حماسہ وغیرہ کے اسباق پڑھے، اور ان کی صحبت میں رہ کر فارسی شاعری کا مذاق پیدا کیا،

الغزالی کا خاکہ

مولانا اب تاریخ کے دیکھے بھالے کوچہ سے ہٹ کر فن کلام کی طرف متوجہ تھے، اور غالباً انھوں نے اسی زمانہ میں یہیں بیٹھ کر علم کلام کا ایک خاکہ تیار کیا، جس کا ہیولیٰ جولائی ۱۸۹۹ء سے ان کے ذہن میں تیار ہو رہا تھا، (شروانی ۱۳ و ۱۴) اور علم کلام کے سلسلہ میں بھی غالباً امام غزالی کی الغزالی پیش نظر تھی، جس کی تحریک ۱۸۹۹ء میں سرسید نے کی تھی، اب بارگاہ فاروقی کے جلووں سے فرصت پاکر امام غزالی کا دربار سجانے کی فکر لاحق ہوئی، ۱۰- جون ۱۹۰۰ء کو اپنے بھائی اسحاق کو لکھتے ہیں:- "لوئی کی ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہو کہ اگر احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ میں ہو چکا ہوتا تو ضرور یہ گمان کیا جاتا کہ دیکارٹ کا فلسفۂ اخلاق غزالی سے ماخوذ ہے، اور دوسری کسی کتاب میں یہ مسئلہ ذکر نہیں کیا تھا ہو کہ کتاب مذکور کا ترجمہ فرنچ میں ہو گیا تھا، ان دونوں ہمارے قول کا ترجمہ لفظ بلفظ بھیجئے بہت ضرورت ہے"

ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں عدم شرکت

ندوہ کا چھٹا اجلاس ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء میں

شاہ جہان پور میں اور ساتواں اجلاس رجب سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق سنہ ۱۹۱۸ء میں پٹنہ میں ہوا، ان دونوں جلسوں میں وہ نا شریک نہ تھے، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، یہ اُن کی زندگی کے نہایت سخت سال گذرے، سنہ ۱۹۱۸ء میں وہ اکثر بیمار، اور سنہ ۱۹۱۹ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشان رہے،

پھر افغان دارالترجمہ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

امیر کابل فارسی کتابوں کے لئے جو دارالترجمہ ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، کہ سفیر صاحب کابل نے جنتری قرار معاہدہ یہ بعض کتابوں کے ترجمہ کے لئے مولانا کو لکھا، اور مولانا نے انکار کیا، اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے بعض اعزہ و احباب نے یہ دیکھ کر کہ اس بیکاری سے بہتر یہ ہے کہ اس بیگاری کو قبول کر لیا جائے، اور مولوی حمید الدین کو جو عربی اور انگریزی دونوں کے ماہر تھے اس کام میں لگایا جائے، اس بنا پر مولانا نے سفیر صاحب کو پھر اپنی رضامندی لکھ بھیجی، سفیر صاحب نے یہ معلوم کر کے کل ترجمہ اور اس کا سارا اہتمام مولانا کے سپرد کر دیا، اور اس کے لئے سردست دس ہزار کی رقم منظور کی،

اسی کے ساتھ امیر کابل نے یہ چاہا کہ کلکتہ میں وہ انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا محکمہ قائم کریں، جس میں چار انگریزی اور سولہ ہندوستانی ملازم ہوں، اور اس محکمہ کے سکریٹری مولانا ہوں، مگر انھوں نے اس سے انکار کیا، اور معاملہ انجام نہ پایا، (حمید ۱۳)

نیشنل اسکول

ان دونوں نیشنل اسکول کے اہتمام و انتظام کے لئے فکر و پریشانی کا سلسلہ جاری ہے،

علی گڈھ کی مجلس دینیات اور ندوہ

علی گڈھ کالج میں دینیات کی ایک کمیٹی بنی تھی جس کے ناظم مولانا شروانی قرار دیئے گئے تھے، اس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے، ۲۰ محرم سنہ ۱۳۲۰ھ کو اس کی یادداشت پر رائے ظاہر فرمائی، اور مولانا شروانی کو لکھا کہ اس کے نصاب میں حدیث کا انتخاب قطعاً شامل ہونا چاہئے (شروانی ۱۰۱ و ۱۰۲) جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ درپیش ہونے پر اس کی نسبت شروانی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی (شروانی ۴۴)

ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی بدگمانی کا زمانہ سنہ [illegible] و سنہ [illegible]

مولانا اعظم گڈھ میں ان دنوں اپنے خانگی حالات میں ایسے مصروف رہے کہ اُن کے مخلص دوستوں کو بھی اُن کی اطلاع نہیں رہی یہ وہ زمانہ تھا کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر ہیوٹ صاحب تھے، ان کی نظر مسلمانوں کی طرف کچھ یوں ہی تیز تھی، اس پر یہ ندوہ کی تحریک کے اوج کا زمانہ تھا، ہماری بدقسمتی اکثر ذاتیات سے شروع ہوتی ہے، لکھنؤ میں ندوہ کے بڑے حامی منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کاکوروی تھے، جو وہاں کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ داران اودھ کے مشیر قانونی تھے، اور اُن کے حریف چودھری نصرت علی صاحب سندیلہ تھے، چودھری صاحب نے منشی صاحب کو شکست دینے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور جیسا کہ سنا جاتا ہے انھوں نے لفٹنٹ گورنر تک ندوہ کی تحریک کی سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہنچائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ ہندوستان کو چھوڑ دیا، منشی اطہر علی صاحب مرحوم بھی حیدرآباد چلے گئے، ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی سنہ ۱۹۱۰ء مطابق سنہ ۱۳۲۸ھ میں حجاز تشریف لے گئے، اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام

ناظم ہوئے۔ مگر انھوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا، پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے۔

مولانا شبلی مرحوم کی حالت سے بیتیزی کے سبب سے اُن کے دوستوں کو اُن کے متعلق بھی تشویش تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۹ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو خط لکھا: "مدت سے شمس العلماء مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں، ندوۃ العلماء کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سُنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعہ سے کوئی بات آجتک نہیں سُنی گئی، نواب لفٹنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے؟"

مولانا کا معاملہ گو اس بدگمانی سے بہت آگے نکل چکا تھا، تاہم وہ اس وقت وطن میں یا علیل تھے یا خانگی افکار میں مبتلا،

والد کی علالت اور خانگی پریشانی ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۱۳ء

صحت کے بعد اب وقت آیا تھا کہ مولانا آرام کریں، یا سیر و تفریح کے لئے کہیں باہر تشریف لیجائیں، مگر قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا، اسی اثنا میں اُن کے والد ماجد ایک سخت علالت میں مبتلا ہوئے، جو آخر کو مرض الموت ہی ثابت ہوا، نومبر میں اُن کی حالت بہت خراب ہوئی، ۱۰ر نومبر سنہ ۱۹۱۳ء کو اپنے بھائی مولوی اسحاق کو لکھتے ہیں: "استقلال و متانت کی حد ہوگئی، والد کی حالت بیم و امید کی ہو چکی تھی بلکہ بیم کا پہلو غالب ہی تمام اطراف کے آدمی روزانہ ان کو دیکھنے کو آتے ہیں، مستورات سب آئیں، خود والد ہر وقت تم کو پوچھا کرتے ہیں۔" (۱۶)

مولانا برابر ان کی تیمارداری اور دوا و علاج میں مصروف رہے، مگر فلک تقدیر کا فیصلہ نافذ تھا، ۱۲ر نومبر سنہ ۱۹۱۳ء کو انھوں نے وفات پائی، خاندان بلکہ تمام شہر میں کہرام مچ گیا، احکام

تک متاثر ہوئے، عدالتیں بند ہو گئیں، پورے ضلع نے ان کے وجود سے محرومی کا غم کیا، یہ صرف ایک کامیاب وکیل کی موت نہ تھی، بلکہ ایک فیاض، ہمدرد عزیز، اور قوم کے ایک ممتاز و محبوب زبردست فرد فرید کی موت تھی، بیٹے پر اس حادثہ کا جو اثر پڑا وہ مرثیہ سے ظاہر ہے،

ہاں اے پدر نہ گریت ایں ورزداں مکن — زنہار عزم رہروی آں جہاں مکن

دستاں سرائے بزم طرب بودہ ام بسے — مارا بہ نوحہ زمزمہ سنج فغاں مکن

کوہ غم فراق تو آنم کہ برکشم — با چوں منے شکستہ و زار ایں گماں مکن

پیرانہ روئے روشنِ تو آفتاب بود — ایں آفتاب از نظرِ ما نہاں مکن

رفتی و حالِ قوم ندانی کہ چوں شدہ است — دلہا تمام از غم و از غصہ خوں شدہ است

ایوانِ قوم کز تو سرش چرخ سود بود — در جنبش است و کنگرہ اش نگوں شدہ است

آں قوم کز تو پایۂ جاہش بلند بود — زار و نژند و خستہ و خوار و زبوں شدہ است

آں صفحہائے دفترِ اقبال پارہ گشت — آں کاسہائے خوانِ نعم واژگوں شدہ است

در شہر کیست کز غمِ تو دیدہ تر نہ کرد — یک دل نبودہ است کہ صد نالہ سر نہ کرد

دانستہ پاسِ خاطرِ ایشاں نہ داشتی — یا کس ترا ز حالِ عزیزاں خبر نہ کرد

آخری بند میں موت کے وقت کا عجیب دلدوز و پُر اثر نقشہ کھینچا ہے،

آہ آں زماں کہ درد تنش را نزار کرد — آثارِ مرگ بر رخ و نبض آشکار کرد

عمِ بزرگوار کہ آسیمہ سر دوید — حالش بدید و گریۂ بے اختیار کرد

شبلی رسید و نالہ زد و بسمل اوفتاد — اسحاق آمد و مژہ را اشکبار کرد

مستور خانہ آمد و از سینہ بر کشید   آں تیرِ آہ کز دلِ گردوں گذار کرد

عزدہ بیٹے نے مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم مددگار ناظم ندوہ کو اس زمانہ میں اپنے والد کی وفات کی خبر ایک کارڈ پر لکھ کر دی تھی، اتفاق سے ندوہ کے دفتر کے بے کار کاغذات میں وہ کارڈ مجھے مل گیا تھا، ایک ہی سطر تھی:" - دریغا کہ یتیم گشتم:"

اس اختصار کی بلاغت پر طولِ بیان کی ہزاروں سطریں قربان!

خانگی مصائب
دسمبر ۱۹۱۴ء

شیخ صاحب کی موت ایک تنہا مصیبت نہ تھی، بلکہ بہت سی مصیبتوں کا مجموعہ تھی، وہ ایک ہرے بھرے، سرسبز و شاداب خاندان کے سرپرست تھے، اُن کی سرپرستی کی محرومی سے سارے خاندان پر زوال آیا، شیخ صاحب نے پہلی بیوی (مولانا اور اُن کے بھائیوں کی والدہ) کے علاوہ غیر کفو میں جو شادی کی تھی اپنی زندگی ہی میں ۱۸۹۲ء میں اپنی جائداد کا ایک حصہ اُس بیوی کے نام ہبہ کر دیا تھا جس سے مولانا اور اُن کے بھائیوں کو سخت اختلاف تھا، اس کی تفصیل مکاتیب کے ایک خط (اسحاق ۳) میں مذکور ہے، شیخ صاحب نے اپنی چھ سات ہزار کی آمدنی کی جائداد کے ساتھ تینتیس ہزار[1] کا قرض چھوڑا، قرض کے سوا شیخ صاحب کا بڑا کارخانہ پھیلا تھا جس کو قائم رکھنے کے لئے ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی، سوتیلی ماں اور ان کے طرفداروں سے الگ جھگڑے کی صورت تھی،

باپ کی زندگی بھر مولانا اپنی سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی اُن کے نام سے بیزار تھے، اُن کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے، مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی میں

[1] شروانی، ص ۳۰، حیات، ص ۳۰ میں غلطی سے تیئیس ہزار چھپا ہے، تینتیس ہزار چاہئے۔ [2] اعظم گڈھ میں زمینداری کے

جہاں وہ رہتی تھیں تشریف لے گئے، ماں کے قدموں پر گرے، عمر بھر کی معافی مانگی، اور ایسی سعادتمندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں، یہ بھی مولانا کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے،

بہرحال مولانا چونکہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اس لئے تمام مشکلات کا بار انہی کے سر پڑا، قرضخواہوں اور حاجتوں نے ہر طرف سے آکر اُن کو گھیرا، مقدمات شروع ہوئے، اور مقدمات کی پیروی چھڑی، ایسی حالت میں مولانا نے فرمایا "کاش والد ایک حبہ نہ چھوڑتے مگر یہ قرض تو نہ چھوڑ جاتے"؛ بہرحال یہ وہ صورت حال تھی جو ان کے مذاق کے بالکل برخلاف تھی اور ان کی پریشان دلی اور پراگندہ خاطری کے لئے بالکل کافی تھی، مگر اس ذمہ داری کو بھی جس سے عمر بھر اُن کو لگاؤ نہیں رہا، پوری طرح اٹھایا، ۵ دسمبر ۱۹۰۸ء کو بھائی کو الٰہ آباد جہاں وہ کام کر رہے تھے لکھا: "۱۹۰۹ء میں اگر تقسیم کا انتظار کروگے تو اس سال کی تحصیل بھی غارت جائے گی، میری دانست میں مناسب ہو کہ ابھی سے اپنا خاص کارندہ مقرر کر دو، جو اس سال کے اپنے حصہ کی تحصیل کرے، اور اسامی بٹ کے طور پر کاغذات بھی درست کرتا ہے، باقی علاقہ جات گاؤں پٹی، جگدیش پور، ذریکی، بلریا وغیرہ ٹھیکہ دے دینا چاہئے، مصارف تعمیر، مشاہرہ ملازماں، خرچ مقدمات، خرچ ڈیوڑھی بندوں کا ایک موازنہ بجٹ بنا کر مجھے بھیج دو، تاکہ ماہ بماہ اس کے مہیا کرنے کا بندوبست کر سکوں (اسحاق)

اس کے بعد ۲ دسمبر کے خط (۱۰) میں اسحاق مرحوم کو زمینداری کے کاغذات، مقدمات، مصارف اور تمام دشواریوں کو ذکر کرکے بلایا ہے، اور آخر میں لکھتے ہیں: "افکار کا ایک گھنگھور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۵) محلہ کے مکان کو جسکو ہمارے یہاں عرف زمینداری کچہری کہتے ہیں چھاؤنی کہتے ہیں، [illegible] میں شیخ صاحب کا ایک بڑا مکان تھا جس کو اسی لئے چھاؤنی کہتے تھے کہ شیخ صاحب کی دوسری بیوی اسی مکان میں رہتی تھیں، اسی لئے وہ چھاؤنی والی کہلاتی تھیں، مکاتیب (اسحاق ۱۰) وغیرہ میں ان کو، اب چھاؤنی کے نام سے یاد کیا گیا ہے،

[1] گھر کے گزارے کے مواضعات کا ایک سلسلہ جو کہ جو وقت طور کیا جائے،

بادل چھایا ہے، دیکھئے کیونکر چھٹتا ہے"۔

لیکن یہ گھنگھور بادل مولانا کے حسنِ نیت کی برکت سے چھٹ گیا، مولانا نے مظفر کو جو محروم و مجوب تھا اپنی جائداد میں شریک کر لیا، اور اُس کا نام بھی ورثہ کی رضامندی سے حصہ داروں میں داخل کرا دیا، بچہ کی دادی یعنی مولانا کی سوتیلی ماں نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر یہ کیا کہ جو جائداد شیخ صاحب اُن کو ہبہ کر گئے تھے واپس کر دی، یہ واپس شدہ جائداد قرضخواہوں کو دیدی گئی، اور قرض کے بڑے حصہ کے بوجھ سے وہ ہلکے ہو گئے۔ باقی قرض کی ادائیگی کی فکر بھی اُن کو دامنگیر ہوئی، ان ہی دنوں مسٹر آرنلڈ نے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، اُن کو لاہور میں ایک خدمت پر بلوایا، جو غالباً اورنیٹل کالج لاہور میں عربی یا فارسی کی پروفیسری ہوگی، مگر انھوں نے وہاں جانے سے انکار کیا، اور اعظم گڈھ ہی میں رہے مگر قرضخواہوں اور مقدمات کے پیروؤں کی آمد و رفت سے پریشان خاطر تھے، آخر فروری سنہ ۱۹۰۱ء کی کسی تاریخ کو ایک دن جیسا کہ مولانا خود فرماتے تھے، شہر سے نکل گئے، پہلے تو یوں ہی غازی پور کا رُخ کیا، وہاں سے دفعۃً علی گڈھ چل کھڑے ہوئے، علی گڈھ میں نواب محسن الملک نے حیدرآباد کا مشورہ دیا، اور وہ حیدرآباد روانہ ہو گئے، ممکن ہو کہ اس سفر کی عجلت اور حیدرآباد کے انتخاب کے مشورہ میں بعض سیاسی اسباب بھی جن کا اشارہ اوپر گذر چکا ہے، علائقِ ہند سے دور ہو جانے کی مصلحت بھی شامل ہو۔

حیدرآباد میں قیام فروری سنہ ۱۹۰۱ء - فروری سنہ ۱۹۰۵ء

مولانا نے فروری سنہ ۱۹۰۱ء کے آخر میں حیدرآباد کا رُخ کیا، راستہ میں بمبئی پڑا، اُن کا جی چاہا کہ نواب سید علی حسن خاں کی ملاقات کے لئے وہاں اُترے

له مکتوباتِ حالی جلد اوّل صفحہ ۱۴۱۔

دن ٹھہر جائیں، مگر چونکہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال بیمار تھیں اس لئے وہ بھوپال نہیں ٹھہرے اور سیدھے حیدرآباد چلے آئے۔[1]

مولانا حیدرآباد پہنچکر مولوی عزیز مرزا مرحوم کے جو اس وقت ہوم سکریٹری تھے مہمان ہوئے، دوسرے روز جب مولوی سید علی بلگرامی کو اس کی اطلاع ملی تو وہ جا کر خود اُن کو اپنے گھر لے آئے۔[2] لوگوں کو خبر ہوئی تو ہر طرف سے اُن کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مارچ میں مولانا کی تقریر کے لئے ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع تھا، وزیر عدالت جلسہ کے صدر تھے،[3] مولانا نے علم کلام پر ایک مبسوط و محققانہ تقریر فرمائی، یہ تقریر گو زبانی تھی، مگر مولانا کی تقریر بھی معاد کی شان رکھتی تھی، ایک صاحب اس تقریر کو قلمبند کرتے گئے، اور جتنا حصہ قلمبند ہو گیا اسکی اشاعت کا خیال ہے[4]

امور مذہبی کی نیابت

نواب مدار المہام بہادر یعنی وزیر اعظم نے نہایت احترام سے مولانا کو شرف نیاز بخشا، اور اُن کو حیدرآباد کے قیام کی ترغیب دی، حیدرآباد میں امور مذہبی کا محکمہ حکومت کا بہت بڑا صیغہ ہے جس کا بجٹ کئی لاکھ کا ہوتا ہے، اور جس کے ماتحت ریاست کے تمام مذہبی ادارے مساجد، مقابر، آتشکدے، گرجے، گردوارے وغیرہ اکثر مذہبی اور اوقاف ہیں، نواب مدار المہام نے اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں اس صیغہ کی خدمت مولانا کو سپرد کرنی چاہی، لیکن مولانا نے اسکو منظور نہیں فرمایا۔[5]

مولانا نے اپنے خطوط میں اس بات کی تصریح نہیں کی ہو کہ امور مذہبی کا کون سا عہدہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا تھا، لیکن مولانا حالی نے اپنے ایک خط میں دمورخہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے حوالے سے جو اُن دنوں حیدرآباد میں تھے، مولوی عبدالحق صاحب دموجودہ

۱؎ علی حسن خاں ص ۸۰ ۲؎ سیرالمصنفین صفحہ ۲۰۴ ۳؎ ایضاً ۴؎ علی حسن خاں ص ۸۰ ۵؎ علی حسن خاں ص ۸۲ ۶؎ ص ۴۰

سکریٹری انجمن ترقی (اردو) کو حیدرآباد یہ لکھا ہے:- "شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر، عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا خوشی ہوئی، اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجئے کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا مگر بہر حال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملیگا، اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے"[1]

مگر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مولانا نے اس عہدہ کو قبول نہیں فرمایا، شاید اس کی ایک وجہ تنخواہ کی کمی ہو، اس عہدہ کی تنخواہ چار سو روپیہ مولانا کو دی جانے والی تھی، ۷۔ اپریل سنہ ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحٰق کو لکھتے ہیں:- "بھائی کو جو کچھ (جو عہدہ) دیتے ہیں اس میں اس وقت مجھ کو ۴۰۰ روپیہ ملیں گے لیکن میں نے اس سے انکار کیا، چونکہ نواب مدارالمہام اس سے زیادہ کے مجاز نہیں ہیں اس لئے حضور میں بڑے زور کے ساتھ تحریری سفارش بھیجی ہے، اس کا جواب نہیں آیا، اور بہت کم توقع ہے کہ آئے، حضور اور مدارالمہام کی ناچاقی بڑھتی جاتی ہے"[2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:- "بڑی کامیابی ہوتی لیکن بد قسمتی سے وزیر اعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں، اور وزیر اعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے گھٹا دیئے ہیں، اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے، یہ صرف چند روز سے ہوا ہے"[3]

بات یہ ہے کہ حیدرآباد کے سیاسی حالات اس وقت سخت نازک تھے حضور نظام میر محبوب علی خاں اور مدارالمہام سر وقار الامراء کے درمیان سخت چپقلش تھی، مولوی عزیز مرزا مرحوم

---

[1] مکتوبات حالی ص۲ [2] اسحاق ۱۹ [3] ایضاً ۲۰

اور مولوی سیّد علی بلگرامی مرحوم دونوں کے وہی مربی اور سرپرست تھے، اور انہی دونوں کے ذریعہ سے مولانا حیدرآباد میں توسل کے خواستگار تھے، اسی زمانہ میں سیّد علی حسن (نواب محسن الملک کے بھائی) کو جو نواب مدارالمہام بہادر کے سب سے بڑے رکن تھے، حضور نے دفعۃً موقوف کر دیا، ان کیساتھ ایک انگریز کو بھی، مولانا لکھتے ہیں :- "حیدرآباد میں اس وقت زلزلہ آگیا ہے، تمام لوگ کانپ اٹھے ہیں، خصوصاً ہندوستانی خاص طور پر مورد عتاب ہیں" (اسحاق ۱۱)

دماغی کشمکش ان حالات میں مولانا ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے، کبھی یہ چاہتے تھے کہ یہاں کی نوکری قبول کرلیں، اور کبھی نوکری کی قید و بند کو سوچتے تو قناعت کی زندگی کا خیال آتا، اسی حال میں ۷۔ اپریل ۱۹۰۱ء کو اپنے بھائی اسحاق مرحوم کو اپنا ارادہ بتاتے ہیں :- "اب میرا ارادہ مصمم ہے، میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، تنخواہ و وثیقہ ہے ہی، چھاؤنی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچیگا اس سے غریبانہ زندگی خاص طرح بسر ہو سکتی ہے، لکھنؤ یا علی گڈھ میں بسر ہوگا، اور ندوہ یا کالج کا شغل، تنہائی اور بے تعلقی میں انشاءاللہ قوم کی خدمت اچھی طرح بن آئے گی، کالج تو میری مدد کا محتاج نہیں، لیکن ندوہ کام کرنے کی جگہ ہے، اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے"

پھر ۱۲۔ اپریل ۱۹۰۱ء کو سمیع مرحوم کو لکھتے ہیں :- "بہرحال دیکھئے کیا ہوتا ہے، اب خیبہ اگر جاؤں تو ہمت کر سکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع

۱؎ حیدرآباد و اولاد وظیفہ سے ۲؎ چھاؤنی سے مقصود سوتیلی ماں ہیں، اور عالیہ مہدی مرحوم کی بیوہ کا نام ہے، اور ۳؎ اسکول نیشنل اسکول مقصود ہے، مولانا ان سب کو کچھ ماہوار دیا کرتے تھے، یہ اسی کا حساب بتا رہے ہیں،

عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لئے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔"

۱۶ جون ۱۹۱۳ء کو ان ہی کو پھر لکھتے ہیں: "میں یہاں آکر پیا پھنس گیا کہ ع: جا آ کہ جائے ہو بجوے نہ نفور جائے ہو بجوے، بہت کشتی چوج کے آل آتیں، فشانہ اٹھانا خوش ہست، سلطنت قدر دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔"

سلسلۂ آصفیہ اور صرفۂ علوم و فنون

الفاروق کے پڑھنے والوں کو سلسلۂ آصفیہ کی تھوڑی سی تاریخ معلوم ہو۔ مولانا شبلی مرحوم الفاروق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ہمارے معزز اور محترم دوست شمس العلماء سید علی بلگرامی جن کو تمام ہندوستان جانتا ہے، وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زباندان ہیں، اسی طرح بہت بڑے علم دوست، اور اشاعتِ علم و فن کے بہت بڑے مربی اور سرپرست ہیں۔ اس دوسرے وصف نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انھوں نے جناب نواب محمد فضل الدین خاں سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک سر وقار الامراء بہادر مدار المہام دولت آصفیہ خلد اللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ حضور پرنور مظفر الممالک فتح جنگ ہز ہائنس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کے سایۂ عاطفت میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے، جو سلسلۂ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو، اور وابستگانِ دولتِ آصفیہ کی جو تصنیفات خلعتِ قبول پائیں وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔ جناب نواب صاحب ممدوح کو علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کی طرف ابتداء سے جو اعتنا

و ترجمہ ہو رہی ہے اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں اُس کے لحاظ سے جناب ممدوح نے
اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے، اور ہمارے
شمس العلماء کی کتاب "تمدن عرب" جس کی شہرت عالمگیر ہو چکی ہے، اس سلسلہ کا ایک بیش بہا گوہر ہوا تھا کہ سال
گزشتہ ۱۹۱۳ء میں جناب ممدوح کی پیشگاہ سے عطیہ ماہوار کی جو سند عطا ہوئی اس میں بھی یہ درج تھا کہ شمس العلماء
کی تمام آئندہ تصنیفات اس سلسلہ میں داخل کی جائیں۔

مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید علی بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں:- "مرحوم مولوی سید علی
بلگرامی نے نواب سرور الامراء بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدر دان امیر تھے، ایک سررشتہ علوم و فنون
قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا
جائے (سید علی مرحوم اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے، اور اُن کی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین
پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں، لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لئے کوئی لائق شخص اور نہیں نہ
ملا تھا، لہٰذا انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا، اور اُن کا تقرر خدمت ناظم سررشتہ علوم و فنون
پر بہ مشاہرہ چار سو ہوا، اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا، مولانا کی چند کتابیں بھی اسی
سلسلہ میں شائع ہوئیں۔" (چند ہم عصر از مولوی عبدالحق صاحب ص [illegible])

اس متن کی شرح نواب جیون یار جنگ بہادر کے اُس مقدمہ میں ہے جو انھوں نے تمدن
عرب کے دوسرے اڈیشن پر ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے:- "سرور الامراء بہادر کے عہد وزارت میں ڈاکٹر سید
علی کی سعی و کوشش سے حکومت نے سررشتہ علوم و فنون کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا، مقصد اس کا
یہ تھا کہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ، اردو میں علمی کتابیں مہیا کی جائیں، اور اُن کو خاص اہتمام کے ساتھ چھپوا کر

شائع کیا جائے، اس سررشتہ کے نگران کار ڈاکٹر سید علی مقرر ہوئے، نظامت کے لئے مولانا محمد مرتضیٰ فلسفی کا انتخاب ہوا، چار سال کے بعد سنہ ۱۹۰۱ء میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کو یہ خدمت ملی، یہ سررشتہ سنہ ۱۸۹۷ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک تقریباً دس سال[1] قائم رہا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی سید علی بلگرامی کی تحریک سے سنہ ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں سررشتہ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا، اور اس کے سب سے پہلے ناظم مولانا محمد مرتضیٰ صاحب مقرر ہوئے تھے، جو اپنے کو فلسفی کہتے تھے، اور معقولات کا بڑا دعویٰ رکھتے تھے، ان کا اصل وطن نونہرہ ضلع غازی پور تھا[2]، مولانا کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد وہ اس عہدہ سے ہٹا کر مال کے صیغہ میں بھیج دیئے گئے، اور یہ جگہ خالی ہوگئی،

سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت

بہر حال جب مولانا نے امور مذہبی کی خدمت سے انکار کیا تو ۲۰ صفر سنہ ۱۳۱۹ھ (۷ مئی سنہ ۱۹۰۱ء) کو سررشتۂ علوم و فنون کی اسی خالی شدہ نظامت کے عہدہ پر اُن کا تقرر ہوا،

۱؎ اس عرصہ میں حسب ذیل کتابیں اس کی طرف سے شائع ہوئیں، ان میں پہلی پانچ کتابوں کی ڈاکٹر سید علی نے نگرانی کی،

۱۔ سیاحت نامہ موسیو تیورنیر	مطبوعہ آگرہ	سنہ ۱۸۹۸ء	۶۔ الغزالی	شبلی	کانپور	سنہ ۱۹۰۱ء
۲۔ سیاحت نامہ موسیو تھیونو	،،	،،	سنہ ۱۸۹۹ء	۷۔ علم الکلام	شبلی	علی گڑھ	سنہ ۱۹۰۲ء
۳۔ تاریخ دکن جلد اول	،،	،،	سنہ ۱۸۹۹ء	۸۔ تاریخ دکن جلد سوم		آگرہ	سنہ ۱۹۰۳ء
۴۔ تاریخ دکن جلد دوم	،،	،،	سنہ ۱۹۰۰ء	۹۔ الکلام	شبلی	کانپور	سنہ ۱۹۰۳ء
۵۔ نظام اکبری حیدرآباد	،،	،،	سنہ ۱۹۰۰ء	۱۰۔ موازنۂ دبیر و انیس	شبلی	آگرہ	سنہ ۱۹۰۷ء

۲؎ مولانا محمد مرتضیٰ صاحب نونہروی ایک وسیع النظر شیعی عالم تھے، علم الکلام میں موازنۂ معقول و منقول نام عربی میں ایک بسیط تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یہ کتاب سنہ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے شائع کی، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے اپنے الہلال میں اس پر تنقید

پہلے ۳۔ صفر والے فرمان میں ان کی قائم مقامی کی نصف تنخواہ دو سو روپے مقرر ہوئی، اس کے بعد ۱۰۔ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ (۲۰ جولائی ۱۸۹۷ء) کی اس عہدہ کی پوری تنخواہ چار سو روپے ماہوار کا فرمان ہوا، بعد کو مولوی عزیز مرزا مرحوم وغیرہ کی کوشش سے پانچ سو روپے ماہوار ہوگئے، لیکن سو روپیہ ماہوار کا گذشتہ وظیفہ جو سرکارِ آصفیہ سے ان کو ملا کرتا تھا بند ہوگیا، اور چونکہ یہ صیغہ مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تھا، اور وہ محکمۂ تعمیرات وصدنیات وریلوے کے معتمد تھے، اس لئے سررشتۂ علوم وفنون کا یہ صیغہ بھی اسی محکمۂ تعمیرات وصدنیات کے ماتحت تھا، اور یہی سبب ہے کہ الکلام کے شروع میں مولوی کاظم علی صاحب قائم مقام معتمد محکمۂ تعمیرات کا مقدمہ شامل ہے،

اس عہدہ کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ مولانا نے علم کلام پر متعدد تصنیفوں کا خاکہ تیار کرلیا، ان کی زندگی کے جو پچھلے حالات آپ نے پڑھے ہیں، ان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ تاریخ سے نکل کر علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھ رہے ہیں، اور سرسید نے ان سے "الغزالی" لکھنے کی جو فرمائش کی تھی، وہ اس کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دور نکل گئے، اور علم کلام کا ایک وسیع نقشہ ان کے ذہن میں آگیا، چنانچہ الغزالی کے شروع میں وہ رقمطراز ہیں، "علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک معتبر بالشان علم اور ان کا سرمایۂ ناز ہے، میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں، اور اس کے چار حصے قرار دیئے ہیں،

۱۔ علم کلام کی ابتدا، اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں،

۲۔ علم کلام نے اثباتِ عقائد اور ابطالِ فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

۳۔ ائمۂ کلام کی سوانحعمریاں،

۴- جدید علم کلام:

پہلا حصہ بقدر حصہ یہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رک گیا، اور تیسرا حصہ شروع ہو گیا، اس حصہ میں امام غزالی کی سوانحعمری شروع ہو گئی تو بڑھتے بڑھتے ایک مستقل کتاب بن گئی چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ درکار تھا مناسب معلوم ہوا کہ بہ انتخاب باقی حصہ الگ شائع کر دیا جائے۔"

پہلے حصے یعنی الکلام کے شروع میں علم کلام کی تاریخ لکھنے کی وجہ لکھی ہے، اور بتایا ہے کہ اس کے لکھنے میں وہ اپنی تاریخ کی حد سے باہر نہیں نکل رہے ہیں، فرماتے ہیں:- "تاریخ کے فن میں اہل مغرب نے جو نئے نئے برگ و بار پیدا کئے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے، کہ اشخاص اور اقوام کی تاریخ سے گذر کر علوم و فنون کی تاریخ لکھتے ہیں، مثلاً فلاں علم کب پیدا ہوا، کن اسباب سے پیدا ہوا، کس طرح عہد بعہد بڑھتا گیا، کیا ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئیں، اور کن وجوہ سے ہوئیں، اس قسم کی کوئی تصنیف اردو بلکہ عربی و فارسی میں بھی موجود نہ تھی، میں نے ابتدائے زمانۂ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا، چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں، اور شائع ہوئیں وہ تاریخ ہی تھیں، اس بنا پر علم کلام میرے دائرہ سے خارج تھا، علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے، دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تصنیف ہو تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہے، اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔"

اس میں شک نہیں کہ مولانا نے تاریخ ہی کی تقریب سے علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھا، مگر یہ کوچہ ان کو ایسا پسند آیا کہ وہ پھر عمر بھر اس سے نہیں نکلے، وہ کہتے تو ہیں کہ ان کے علم کلام کی کتابیں تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہیں، مگر اہل نظر کو معلوم ہے کہ ان کی تاریخی کتابیں بھی علم کلام ہی کے دائرہ

ہیں ہیں، اس لئے وہ علم کلام لکھنے سے اپنی حد سے تجاوز کرنے کے گنہگار نہ ہوتے تھے اور نہ اب ہونے
اس خدمت کے قبول کرنے کے بعد ہی حیدرآباد کی اندرونی سیاسیات میں ایک عظیم الشان
تغیر رونما ہوا شخصی سلطنت میں کسی اعلیٰ مرکزی شخصیت کے ہٹنے سے اس نظام شمسی کے سارے ستاروں
پر کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے،

مولوی سید علی بلگرامی کی حیدرآباد سے علیحدگی اور سررشتۂ علوم و فنون کا تذبذب

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں
کچھ کمزوریاں بھی تھیں یعنی انھوں نے طبیعت سپاہی پائی تھی، اس لئے
اُن کے ہاں ہمیشہ جوڑ توڑ لگا رہتا تھا کبھی وہ اس میں دوسروں کو پھنساتے تھے اور کبھی وہ اس
میں خود پھنس جاتے تھے، اسی قسم کا ایک موقع سنہ ۱۹۰۱ء کے آخر میں پیش آیا، نواب وقار الامراء
مدارالمہامی سے مستعفی ہوئے، اور ان کی جگہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کو وزارت کا قلمدان عطا
ہوا، اس کے نتیجہ میں مولوی سید علی بلگرامی بھی ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں بائیس سال کی کارگزاری کے بعد
ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے، مولوی صاحب کا اپنی جگہ سے ہٹنا کوئی معمولی بات نہ
تھی، بیسوں اشخاص کا تعلق صرف اُن کی ذات سے تھا، اس لئے ریاست کی اس اچھی بھلی سیاست
کے سبب سے اُن کا متاثر ہونا ضرور تھا، ۲۶ اگست سنہ ۱۹۰۱ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں :-

"حیدرآباد کی پولیٹکل زمین میں سخت بھونچال آیا، وزارت کا قبلہ مشرق سے مغرب کو بدل گیا . . .

. . . . ہاں میں نے نظامت علوم و فنون قبول تو کر لی ہے، لیکن اس انقلاب
میں دیکھئے یہ خدمت بھی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں"

پھر ۲۰ ستمبر کو لکھتے ہیں :- "انقلاب حال نے تمام امیدیں خاک میں ملا دیں، اب ایام گذاری کی

وہ بھی دیکھئے کب تک، کتاب الاوقات کا چھپنا اب رہا، اسی ریاول کے بھروسہ پر یہ کام بھی اٹھایا گیا تھا[1]

ایک مہینہ کے بعد ۲۔ اکتوبر کو لکھتے ہیں:۔ "یہاں ہر روز ایک نیا شگوفہ کھلتا ہے، سید علی محل چلے، اور لوگ نکلے جاتے ہیں، میرا بھی نمبر بار ہیں ہو[2]"

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اپنے مخلص عزیز سمیع صاحب کو لکھتے ہیں:۔ "یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے، مختصر یہ کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو گئی، مولوی سید علی صاحب وغیرہ نکلے، اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں، میں بھی دو چار روز کا مہمان ہوں[3]"

بہر حال یہ دو چار روز دو چار برس ہو گئے، سررشتۂ علوم وفنون کی ضرورت یا عدم ضرورت کے فیصلے کے لئے ایک کمیشن بٹھایا گیا[4]، اور اس کے فیصلہ تک یہ منصب بحال رہا،

ایک نظم اسی زمانہ میں مولانا نے حیدر آباد کو خطاب کرکے ایک نظم لکھنی شروع کی جس میں اس کے موجودہ خلفشار اور انقلاب کے اشارے بھی تھے، یہ نظم غالباً ضائع ہو گئی، لیکن اس کے چند شعر مکاتیب میں مولانا شروانی کے ایک خط میں ہیں[5]، مطلع تھا:

اے دکن! اے کہ بہار چمن جاں از تست

اس کے بعد کے شعر ہیں:۔

چوں تو اندکہ زہر پردہ برآرد صد نقش	گرد نیرنگیٔ ایں گنبد گرداں از تست
ہندیاں نیز چو از حلقہ بگوشان تواند	ہرچہ زیشاں بود آں نیز کنوں ہاں از تست
ہاں تو دعوی کن و ما نیز مسلم داریم	شبلیٔ سحر فن و داغ غزل خواں از تست

[1] شروانی ۹۰ [2] شروانی ۲۰ [3] سمیع ۹۰ [4] سمیع ۔ ۵ [5] شروانی ۳۱ ۔

سررشتہ کا نیا انتظام عام حالات کے لحاظ سے مولانا کا اضطراب بجا تھا، مگر مہاراجہ کشن پرشاد جیسے نیک سرشت اور علم دوست مدار المہام[1] سے اس سررشتہ کی ضرورت چھپی نہ تھی، ورنہ مولانا کے جوہر ایسے قدرشناس سے چھپے رہ سکتے تھے، چنانچہ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے بھی اس سررشتہ کے کاموں سے دلچسپی لی، اور اس کا انتظام پختہ اصول پر کرنے کی طرف مائل ہوے، جناب نواب شہاب جنگ مختار الدولہ افتخار الملک بہادر معین المہام سرکارِ عالی اس کے افسرِ اعلیٰ اور سرپرست اور مولوی سید علی بلگرامی کی جگہ پر قائم مقام معتمد تعمیرات میر کاظم علی صاحب نگراں کار مقرر ہوے۔ (مقدمہ الکلام) اور تصنیف و تالیف کا کام بدستور جاری رہا،

قیام حیدرآباد کی تصنیفات مولانا شبلی مرحوم حیدرآباد میں کل چار برس رہے، یعنی فروری سنہ ۱۹۰۱ء سے فروری سنہ ۱۹۰۵ء تک، اس میں بھی سنہ ۱۹۰۱ء کے چند مہینے امید و اریوں میں گذر گئے، غالباً جولائی یا اگست سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر بحال ہوے، اور فروری سنہ ۱۹۰۵ء میں اس سے الگ ہوگئے، اس بنا پر ان کی نظامت سررشتہ مذکور کی مدت ساڑھے تین برس سے زیادہ نہیں، اور یہ شب و روز بھی اکثر روزانہ کے انقلابات اور سیاسی مدوجزر کے نذر ہوتے رہے، اور اطمینانِ خاطر بہت کم نصیب ہوا، اس پر یہ دیکھ کر سخت تعجب آتا ہے کہ بے اطمینانی کے ان ساڑھے تین برسوں میں انھوں نے ایسی پانچ کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں ہر کتاب مستقل پانچ برس کی محنت، مطالعہ اور مراجعت کی محتاج ہوسکتی ہے، مگر تعجب اس لئے نہیں کہ جو لوگ حقیقی صاحبِ فکر مصنف ہوتے ہیں وہ کاغذ کے صفحوں پر اپنے خیالات جب بھی

---

[1] افسوس کہ مہاراجہ نے اسی سال سنہ ۱۹۴۰ء میں وفات پائی،

قلمبند کریں۔ مگر وہ خیالات اُن کے دماغوں میں سالہا سال کے مطالعہ، مراجعہ اور محنت کے بعد مخزون ہوتے رہتے ہیں، اور موقع ہاتھ آنے کے بعد وہ کاغذ کے صفحوں پر آسانی سے منتقل ہو جاتے ہیں۔

الغزالی | سررشتہ میں مولانا کی سب سے پہلی کتاب الغزالی تصنیف ہوئی جو ۲۲ فروری سنہ ۱۹۰۲ء تک ختم ہو کر طبع ہو چکی تھی جس کے معنی یہ ہوے کہ وہ چند مہینوں میں ترتیب پائی۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہو کہ اس کتاب کا خیال اُن کے دماغ میں کتنے دنوں سے پک رہا تھا۔ گذر چکا ہو کہ سنہ ۱۸۹۳ء میں جب وہ الفاروق کی تصنیف کے لئے تیار ہو رہے تھے، تو سر سید نے الفاروق کے بجائے الغزالی لکھنے کی فرمایش اُن سے کی۔ الفاروق سے فرصت پانے کے بعد اُن کا خیال امام غزالی کے سوانح اور فلسفہ و کلام کی طرف کلیۃً منتقل ہوا۔ اُن کی کتابیں دیکھتے، اُن کا فلسفہ سمجھتے، اور ان کے خیالات کو ترتیب دیتے رہے۔ یہی سبب ہو کہ حیدرآباد میں اُن کی تقریر سننے کے لئے جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں انھوں نے علم کلام ہی پر تقریر فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت یہی خیالات و معلومات اُن کے دل و دماغ پر چھائے تھے، اس لئے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی،

۱۰۔ جولائی سنہ ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوعوں سے ایک موضوع امام غزالی کی لائف بتاتے ہیں، لکھتے ہیں: "امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہو، کیونکہ موجد علم کلام کے موجد وہی ہیں۔" (شروانی ۱۱)

پھر ۶۔ جولائی کو انھیں لکھتے ہیں: "امام غزالی کی لائف کا پہلا حصہ گو قصص طلب ہو لیکن آپ اس کو بخوبی انجام دیں گے، میں تمام ماخذ عرض کروں گا، لیکن اصل چیز ان کی کتاب تہافت الفلاسفہ کا ریویو ہے، جس پر ابن رشد نے رد لکھا ہو، میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا، اور مدتوں اس کا

منہمک رہا (علی گڈھ آنے سے پہلے) باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا، وہ بھی گزر گئے۔ میں نے چند دفعہ غزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیئے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ، اس کے علاوہ پورے علم کلام کی تاریخ اور اس پر ریویو لکھنا پڑے گا، اس کے سامان کے لئے میں مصر سے کتابیں نقل کرانا چاہتا ہوں، اس کا بھی ابھی سامان نہیں فارسی کے لئے میں ابھی سے تیار ہوں۔"

اس کے بعد ۳۰ جولائی ۱۸۹۹ء کو دوبارہ اُن ہی کو لکھتے ہیں:- "امام غزالی کی علمی حالت سنیئے فقہ شافعیہ کی علمی تدوین و ترتیب کی بنیاد امام الحرمین نے ڈالی، پھر امام غزالی نے تین کتابیں وسیط، بسیط، وجیز لکھیں، ان کے بعد ان کتابوں کی بے انتہا شرحیں لکھی گئیں، اور بعد کی تمام تصنیفات ان ہی سے ماخوذ ہیں، اور اُن ہی کی تغیر شدہ شکلیں ہیں، اصولِ فقہ میں نئے طریقہ کی سب سے پہلی کتاب امام صاحب نے لکھی جس کا نام منخول ہے، اور جو مدتوں میرے مطالعہ میں رہی ہے، یہ نہایت زور کی کتاب ہے، اور بخلاف امام کی اور تصانیف کے عبارت اس کی دقیق ہے، اصول میں اور بھی ان کی کتابیں ہیں، مرنے سے ایک برس پہلے اسی فن میں ایک کتاب مستصفیٰ لکھی جو میری نظر سے گذر چکی ہے، تصوف میں بے شمار کتابیں ہیں جن کا استقصاء بھی مشکل ہے، علم کلام کے وہ بجائے خود موجد ہیں، اور اس میں ان کی بہت سی تصنیفیں ہیں، ان کے بعد شیخ الاشراق نے فلسفۂ اشراق کے نام سے کتابیں لکھیں، ان میں حکمۃ الاشراق سب سے عمدہ ہے، جو میرے مطالعہ میں بہت رہی ہے، اور ان کے بعد امام رازی نے مطالب عالیہ، نہایۃ العقول، اربعین، مباحث مشرقیہ لکھیں، یہ سب کتابیں ضخیم ہیں، اور بجز دو کے سب میری نظر سے گذری ہیں، امام غزالی نے فلسفہ و منطق کو بھی صاف کر کے لکھا، اس میں ان کی یہ کتابیں ہیں، محک النظر، مقاصد الفلاسفہ، [illegible]

عیسائیوں کے رد اور انجیل کی تحریف میں بھی ایک کتاب لکھی ہو جس کو میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ تو ہیں

جب تک میسر نہ ہوں اور جب تک ان پر بلکہ اصل علوم پر ریویو نہ کیا جائے، ان کی لائف لکھنی بیکار

ہے، ریویو کے لئے اصل فن پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، اگرچہ کم جاتا ہے مگر وہ بہت وسعت نظر اور غوص و

فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک بات یہ ہے کہ فلسفۂ شرعیہ کے بہت سے مسائل کی نسبت اُن کا عام خیال یہ

ہے کہ وہ مسائل ان کی ایجاد ہیں، حالانکہ متعدد تحقیقات کو میں نے بوعلی سینا کی کتاب میں پایا، اس

لئے ان کے لکھنے پر اکتفا نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر جگہ سے پتہ لگانا پڑے گا، ان مشکلات کو خیال کر کے قلم

اٹھائیے، میں بہت کچھ اس کے لئے تیار ہو چکا ہوں، تاہم ہمت نہیں پڑتی، بیسیوں صفحے لکھ کر چھوڑ دیے

ہیں، امام صاحب کی جن تصنیفات کا میں نے نام لکھا ہے گو اکثر میری نظر سے گذری ہیں لیکن نہایت

نایاب ہیں، اور مشکل سے بہم پہنچیں گی، مستعار منگانا بھی مشکل ہے۔

خطوط کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ ان دنوں ان کے غور و فکر کا سب سے بڑا موضوع

یہی تھا، حیدرآباد پہنچ کر اس سلسلہ میں ان کو بعض نئی کتابیں ملیں، جن میں ایک فرنچ، اور دوسری

جرمن مصنف کی تھی، جن کا حوالہ انھوں نے الغزالی کے دیباچہ میں دیا ہے، اور جو غالباً مولوی سید

علی بلگرامی کے کتب خانہ میں دیکھی ہوں گی، بہرحال یہ کتاب ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء کو منشی محمد رحمت اللہ

صاحب رعد کے مطبع نامی کانپور میں چھپنے کو جا چکی تھی (صفحہ ۹۰)، اور اگست ۱۹۰۲ء میں یہ

چھپ کر شائع ہوئی، اس کا یہ پہلا اڈیشن بہت آب و تاب سے چھپا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا

اور پڑھا گیا،

علم الکلام الغزالی کے بعد علم الکلام کا نمبر آیا، علم کلام کی تاریخ کا ابتدائی خاکہ بھی علی گڈھ کے قیام

ہی کے زمانہ میں اس وقت اُن کے سامنے آیا تھا جب ۱۸۹۸ء میں تہذیب الاخلاق میں "المعتزلہ والاعتزال" کے نام سے مضمون لکھا تھا، اس کے بعد بھی وہ اس پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے؛ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۰۲ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "میں نے علم کلام پر لکھنا شروع کر دیا ہے، اس فن کی کتابیں دور دور سے آ رہی ہیں۔"

۱۸ مارچ ۱۹۰۲ء کو وہ ختم ہو رہی تھی (مہدی ۱۰) اور اس وقت خیال یہ تھا کہ علم الکلام اور الکلام دونوں حصے ایک ساتھ چھپیں گے، اور اسی لپیٹ میں دونوں حصے ایک ساتھ زیر تالیف تھے، اور کس بے اطمینانی میں، اس کا اندازہ حسب ذیل فقروں سے کیجیے، جو ۲۰ مارچ ۱۹۰۲ء کو لکھے گئے ہیں: "میں الغزالی لکھ چکا، اور مطبع میں جا چکی، علم الکلام کی تاریخ بھی ختم ہو چکی، اب جدید علم کلام پر لکھ رہا ہوں، یہ دونوں حصے ساتھ چھپیں گے، اگر یہاں اطمینان سے رہنا ہوتا تو بڑے بڑے کام انجام پاتے، لیکن ہر وقت رکاب میں پاؤں ہے، جو گھڑی مل جاتی ہے، اسی پر حیرت ہے، مولوی سید علی پرسوں میرے پاس تشریف لائے تھے، ۲۲ مارچ کو ولایت جاتے ہیں۔ ع

دوستاں رفتند و من ہم میروم (مہدی ۱۰)

مولانا علم الکلام کی تکمیل کے وقت بیمار ہو گئے تھے، بخار اور نزلہ میں مبتلا تھے، ضعف خاصہ ہو گیا تھا، فرماتے تھے کہ فرش پر پڑا پڑا تکیہ کے سہارے ذرا سا سر اٹھا کر لکھا کرتا تھا۔ اسی حال میں علم الکلام کو فروری ۱۹۰۳ء میں جس طرح بنا تمام کیا، (حمید ۱۹) اور اسی لئے اس کتاب میں بہت

؎ مکاتیب جلد میں اس خط کی تاریخ ۱۹۰۱ء غلط چھپی ہے، مولانا کی علالت اس وقت اور اس کے بعد بھی جاری رہی، دیکھئے شروانی ۳۰ صفحہ ۷۹، ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء اور مہدی ۱۳ صفحہ ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء اور مکاتیب میں اس کی تاریخ ۱۹۰۵ء غلط چھپی ہے)

سی یکساں رو گئیں، مثلاً فرماتے تھے کہ اس میں ماتریدیہ یعنی حنفی علم کلام کا حصہ بہت ہی مختصر ہو، اس کو جی کھول کر بڑھا نہ سکے، کیونکہ ماتریدیہ کی تصنیفات بہت کم ہیں، اس لئے اس پر تفصیل سے لکھنا بڑی محنت کا کام تھا، غالباً ان کے ایک مکتوب کا یہ فقرہ اسی تفصیل کا اجمال ہو: "میں نے علم کلام نہایت ناتمام کتاب لکھی، اور وہ درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے" (حمید ۹)

بہرحال وہ کتاب ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کو صوفی محمد علی کے پریس مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی، چنانچہ اسی تاریخ کو نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں: "الغزالی کان پور میں چھپ رہی ہے، افسوس ہے کہ منشی رحمت اللہ رعد دو دن کا کام برسوں میں کرتے ہیں، چھ مہینے ہو چکے، ابھی تک ۹۰ صفحے چھپے گئے ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنی ایک تازہ تصنیف یعنی علم کلام کی تاریخ آگرہ چھپنے کے لئے آج روانہ کی ہے، ان شاء اللہ جلد چھپ جائے گی، جدید علم کلام زیر تصنیف ہے" (مکاتیب اول بنام وقار الملک)

۱۱ مئی سنہ ۱۹۰۲ء[له] کو مہدی مرحوم کے نام لکھتے ہیں: "تاریخ علم کلام آگرہ چھپنے کے لئے جا چکی، رعد تو اللہ ہی سے عہدہ برآ نہ ہو سکے، اسی لئے دوسری طرف رخ کرنا پڑا" (مہدی ۱۳)

مارچ سنہ ۱۹۰۳ء سے کچھ پہلے یہ چھپ کر شائع ہوئی، (حمید ۱۰)

الکلام

علم کلام کی تاریخ کے بعد الکلام یعنی جدید علم کلام کی باری آئی، وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں اس کتاب کے کچھ ابواب لکھ رہے تھے، اور اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ دونوں حصے علم الکلام اور الکلام ساتھ چھپیں گے (مہدی ۱۰) لیکن علم الکلام کے علحدہ مستقل چھاپے جانے کے فیصلہ کے بعد پہلے علم الکلام پوری کر دی اور اس کے بعد الکلام کو پورا کرنا شروع کیا، جدید علم کلام پر لکھنے کے لئے ان کو

له مکاتیب شبلی میں سنہ ۱۹۰۱ء لکھ گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے سنہ ۱۹۰۲ء ہونا چاہئے،

انگریزی کتابوں کے فلسفیانہ معلومات کی ضرورت پیش آئی، مگر یہ مدد ان کو حسب توقع نہ مل سکی،
انہوں نے اپنے عزیز شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی اے کو جو فلسفۂ جدید میں پروفیسر آرنلڈ کے
ممتاز شاگرد تھے ۲۲۔ فروری سنہ ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں: "الغزالی ختم ہو کر مطبع میں جا چکی، شاید سیرۃ النعمان
کے لگ بھگ ہو جائے، علم الکلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں، وہ بھی قریب ختم ہے، اب کلام جدید کا مرحلہ ہے،
اس میں انگریزی داں [illegible] ہوتا تو بڑا کام نکلتا، جو حکماے یورپ روح و واجب الوجود کے قائل ہیں، ان کے
دلائل سے کتاب کی بہت رونق ہوتی، تم سے زیادہ کون اس خدمت کا تھا، انگریزی داں تھے، عربی داں
تھے، عزیز تھے، لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچہ
تیار کر دو تو بہت بصیرت ہو، تم کو کس کی پروا ہے، حالانکہ جو حصہ لکھ رہا ہوں اس میں مدد دینا ایک مذہبی
فرض بھی ہو سکتا ہے۔" (حمید ۱۶)

اسی حالت میں مصر کے ایک نو تعلیم یافتہ فرید وجدی کے رسائل الاسلام فی عصر العلم مصنفہ
سے بہت کام آئے، اور انہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، جدید کلام کا مرحلہ دشوار گذار تھا، اس لئے
ان کا خیال تھا کہ کسی سنجیدہ بزرگ سے بھی اس میں مشورہ مناسب تھا، چنانچہ اس کام کے لئے ان کی
نظر انتخاب [illegible] پر پڑی، چنانچہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۰۲ء کو انہوں نے ان کو لکھا: "ہاں ایک بڑا
ضروری امر یہ ہے کہ علم کلام کا خاص حصہ لکھ رہا ہوں، آپ کے پاس بھیجوں گا اور اس شاگردی کی نسبت
میں نے آج تک کسی کے ساتھ گوارا نہیں کی، آپ دیکھ کر بتائیے گا کہ کون سا حصہ لکھنے کے قابل ہے،
کون نہیں، لیکن اس وقت دریافت طلب امر یہ ہے کہ عقائد کے مسائل ہیں کیا؟ توحید لکھ چکا ہوں،
نبوت لکھ رہا ہوں، اس کے بعد صرف معاد رہ جاتا ہے، باقی کیا لکھوں، کتب کلام میں جو عقائد لکھے ہیں

"در حقیقت عقائد میں داخل نہیں، مثلاً حدوث عالم، صفاتِ باری کا عین یا غیر ہونا وغیرہ وغیرہ، اس لئے درخواست ہو کہ آپکے نزدیک جو مسائل عقائد ضروری البحث ہوں، اُن کے عنوان لکھ بھیجئے"۔ (شروانی)

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شروانی نے اُن کو جواب میں کیا لکھا، مگر الکلام میں **بقیہ عقائد** کا عنوان قائم کر کے اُن عقائد کو گنا دیا ہے جن کو مناظرانہ علم کلام نے پیدا کیا ہے، اور جن کی اصل کتاب و سنت میں نہیں، اور اس کے بعد **روحانیات یا غیر محسوسات** کا عنوان قائم کر کے اُن بقیہ عقائد کو لکھا ہے، جن کی تصریح کتاب و سنت میں موجود ہے، مگر مصنف کے خیال میں اُن کی کیفیت قرآن پاک میں مذکور نہیں، اس لئے ان کی تشریح مختلف اسلامی فرقوں نے مختلف طریقوں سے کی ہے، اور اس سلسلہ میں اجمالاً ملائکہ، وحی اور واقعاتِ قیامت پر امام غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ کے اقتباسات درج کئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ باب بیحد مختصر مبہم اور ناتمام ہے،

اپریل ۱۹۰۲ء میں یہ کتاب زیر تصنیف تھی (وقار الملک) بلکہ ایک سال بعد کے بعد ۹ - مارچ ۱۹۰۳ء میں بھی وہ ناتمام تھی، البتہ اس کا بہت حصہ لکھا جا چکا تھا، اور جو لکھا جا چکا تھا اس سے مولانا خوش تھے (حمیدیہ) بہرحال اسی سال کتاب تمام ہوئی، اور ۱۹۰۳ء میں منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی سے چھپ کر شائع ہوئی،

سوانح مولانائے روم | مولانا کی طبیعت کو تصوف سے کبھی لگاؤ نہ تھا، اس لئے بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ وہ مولانائے روم کے گرویدہ کس طرح ہوئے، مولانا کے ایک محرمِ اسرار نے جنھوں نے انکی سوانح مولانائے روم پر تبصرہ لکھا ہے اس راز سے اس طرح پردہ اٹھایا ہے:- "علامہ کی حقیقت پسند طبیعت نے

ابتداءً وہ میدانِ انتخاب کیا جو حقائق و واقعات کا غالباً دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے یعنی مسلمانوں کی تاریخ، اس انتخاب کے نتائج وہ گوہر شاہوار ہیں جو الفاروق، سیرۃ النعمان، المامون وغیرہ کے نام سے آویزۂ گوشِ روزگار ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علم کلام کی طرف توجہ کی۔ الغزالی، الکلام، علم الکلام اس کاوش کے جوہر ہیں، اس وقت تک ان کی تصانیف میں ظاہری پہلو غالب تھا، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ الفاروق میں حضرت عمرؓ کی دینی زندگانی اس اہتمام سے نہیں لکھی گئی جس کے وہ مستحق تھے، سلسلہ میں سلسلہ پیدا ہوتا ہے۔ امام غزالی کی زندگی کا آغاز ظاہری طریق یعنی مناظرہ اور مباحثہ سے معمور تھا، انجام باطنی عظمت و تجلی پر جو یعنی معرفت اور تصوف پر یہی واقعہ ان کے سوانح نگار کو پیش آیا، علامہ شبلی نے جب الغزالی کی تالیف شروع کی تو وہ تصوف سے اس قدر بیگانہ تھے کہ امام غزالی کی زندگی کا یہ عظیم الشان پہلو بالکل ان کے نظر سے مخفی تھا، ایک دوست کی توجہ دلانے سے انھوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کر کے ایک باب الغزالی میں اضافہ کیا، مبارک تھا وہ وقت جب انکی توجہ تصوف کی طرف مائل ہوئی، کیونکہ اسی توجہ کا پیش بہا نتیجہ وہ تصنیف ہے جس پر ہم یہ تبصرہ لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر نتائج پیدا ہوں گے۔

مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے، لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے یہ دقیقہ بھی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی، کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے مولانا شروانی کی یہ عبارت ان کی تقریظ بر سوانح مولانا روم سے لگئی ہے، جو الندوہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء میں چھپی ہے، اس سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبصرہ نگار نے اس حسن تلاش کو مصنف نے

بھی تسلیم کر لیا تھا، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقلیات کی تلاش نے مولانا کو امام غزالی کی درسگاہ تک پہنچایا، امام غزالی کی تلاش ان کو مولانا روم کے آستانہ تک لائی، خود الغزالی میں بھی اس دریافت کا ایک حوالہ موجود ہے یعنی تصوف کی حقیقت کے اظہار میں امام غزالی کے بعد مثنوی کے چند اشعار کا حوالہ آتا ہے۔

میرے خیال میں ان کے اس موضوع کے انتخاب میں حیدرآباد کے مقامی ذوق کو بھی دخل ہو، حیدرآباد کی رگ رگ میں تصوف اور وحدۃ الوجود کے مسائل سرایت کئے ہوئے ہیں۔

بہرحال ۱۹۰۵ء میں انھوں نے مثنوی پر تقریظ لکھنی شروع کی، ۱۸۔ فروری ۱۹۰۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔ "تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولانا روم غور سے پڑھی، اور ان کے اصول اور پرنسپل متعین کئے، اگر خیال میں ہوں تو لکھ بھیجو (ترجمہ)"

۱۰۔ اپریل ۱۹۰۶ء کو نواب سید علی حسن خاں کو لکھتے ہیں:۔ (۵) "میں آج کل مثنوی مولوی روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں، مع سوانح عمری مولانا روم"

۷۔ مئی ۱۹۰۶ء کے خط بنام مہدی حسن میں ہے (۱۴) "میں مثنوی روم پر تقریظ لکھ رہا ہوں، ایک نئی کتاب ہوگی"

الکلام کے شروع میں معتمد سررشتہ کی طرف سے جو دیباچہ ہے، اس میں اعلان ہے کہ الکلام اس سلسلۂ تصنیف کی نویں جلد ہے، اور دسویں موازنۂ دبیر و انیس، اور گیارھویں سوانح عمری مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ" مگر اشاعت کی ترتیب الٹ گئی یعنی سوانح عمری مولانا روم پہلے اور موازنہ

۱؎ خطوط شبلی مع مکاتیب میں ۱۹۰۸ء چھپا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں انجمن ترقی اردو کا ذکر ہے جو ۱۹۰۳ء میں اردو شعبۂ کانفرنس

بعد کو چھپی،

سوانح مولوی روم اسی سال یعنی ۱۹۰۴ء میں ختم ہو کر منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع میں چھپنے کو بھیجی گئی۔۔۔۔ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں:- "تقریباً مثنوی کی جنت رعد کے قبضۂ غصب میں ہے۔" دو برس پیچھے جو دفعۃً تھی

ابھی یہ کتاب مطبع ہی میں تھی کہ مولانا ۱۹۰۵ء کے شروع میں حیدرآباد چھوڑ کر ندوہ کی خدمت کے لئے لکھنؤ آگئے، چنانچہ یہیں کے قیام کے زمانہ میں اگست ۱۹۰۶ء میں وہ چھپ کر آئی، (حیدر ۳۴۴)

چار قسم کے کاغذوں پر چھپی تھی، قیمت درجۂ خاص مجلد ۳ روپے، درجۂ اول ۲ روپے، درجۂ دوم ۱۲ آنے، درجۂ سوم ۱۰ آنے

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، یہ اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہے کہ ہر روز اس کی طلب کے بیسیوں خطوط آتے اور کتاب اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی،

حیدرآباد کی ادبی دلچسپیاں مصنف کا قلم لگاتار تین چار برس فلسفہ و کلام کی پیچ در پیچ کوچہ گردیوں سے گھبرا کر خالص ادبیات کے سرسبز و شاداب میدان کا طالب ہوا، اور مثنوی مولانائے روم کی شاعری سے کسی دوسرے شاعرانہ موضوع کی طرف نکل آنے سے تصنیفی ارتقاء کا حلقۂ اتصال بھی قائم رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس حلقۂ اتصال کے پانے میں حیدرآباد کی سرزمین کو بھی ایک گہرا تعلق ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت داغ کے وجود سے ع حیدرآباد آج کل گلزار ہے، ملک میں داغ اور امیر کی متقابلانہ شاعری، اہلِ نظر کی گفتگو اور بحث کا مستقل موضوع بنی ہوئی تھی، مولانا مرحوم داغ کے طرفدار اور مداح تھے، داغ کے سیکڑوں اچھے شعر ان کی زبان پر تھے، داغ سے ملتے بھی رہتے تھے، اور ان کے بعض تذکرے بھی فرماتے تھے، حیدرآباد میں ۱۹۰۱ء میں دکن کو خطاب کر کے جو فارسی نظم لکھی تھی، اس میں بھی داغ کو پوری عزت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی ہے،

ہاں تو دعویٰ کن ہ مانیز مستم و دار یم   شبلیِ سحر فن و داغِ غزل خواں از تست

حیدرآباد میں ان کا حلقۂ احباب | اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے ایک خوش مذاق عزیز (سمیع مرحوم) کو حیدرآباد کی دعوت دیتے ہیں، ان کی ترغیب کے لئے لکھتے ہیں:۔ "داغ، شرر، سید علی بلگرامی، سید حسین یار جو ان زمانہ کو دیکھنا ہو گے تو سب ہی موجود ہیں۔" (سمیع ۹۹م)

ان چند ممتاز اصحاب کے علاوہ حیدرآباد میں مولانا کا ایک خاص حلقۂ احباب تھا جن میں سے بعضوں کے نام معلوم ہیں، جیسے مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم جنھوں نے بہت سے ادبی و تاریخی مضامین اور سیرۃ محمود گاواں اور وکرم اروسی لکھی ہے، مولوی سید عبد الغنی صاحب وارثی راستی ؔ وکیل بہاری، جو عربی و انگریزی دونوں کے عالم تھے، اور جو تو اسحٰ وغیرہ طبقاتِ شعرانی اور تاریخ خمیس وغیرہ کے ترجمے کئے، نواب ضیا یار جنگ بہادر مفتی عدالت عالیہ، موصوف درسیات کے فاضل، اور فارسی میں شاعری کا مذاق رکھتے ہیں، اور اب تک مشقِ سخن جاری ہے، ان کے علاوہ ان کے بعض خوش مذاق شاگرد جیسے مولوی مسعود علی صاحب محوی، مولوی ظفر علی خاں، مولوی سید محفوظ علی بدایونی، مولوی عبد الحق صاحب وغیرہ،

یہ لوگ اکثر جمع ہوتے، ادبی دلچسپیاں رہتیں، شعر و شاعری کے تذکرے رہتے، اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے، اور سُنے جاتے، مولوی عبد الحق صاحب، مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کے حال میں لکھتے ہیں:۔ "چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں (سید علی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے، بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے اشعار سناتے رہے جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے" (چند ہمعصر ۲۵)

نواب ضیا یار جنگ بہادر خود مجھ سے مولانا شبلی کی ادبی اور شاعرانہ صحبتوں کا ذکر فرماتے تھے، مولوی شیخ غلام قادر گرامی مرحوم جنھوں نے ۱۳۴۵ھ میں وفات پائی، فارسی کے مشہور شاعر تھے، وطن جالندھر تھا، مگر حیدرآباد میں رہتے تھے، آخر عمر میں جب وہ وطن چلے آئے تھے، مجھ سے مولانا مرحوم کی صحبتوں کا تذکرہ فرماتے تھے،

یہ صحبتیں کبھی رنگین بھی ہو جاتی تھیں، اسی قسم کی ایک رنگین صحبت میں مولانا نے وہ اردو غزل کہی تھی جس کا مقطع ہے ع کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا،

انیس و دبیر ان ادبی محفلوں میں جس طرح داغ و امیر کے مقابلے ہوتے رہتے تھے، میرانیس اور مرزا دبیر کے باہمی مقابلہ کی گفتگوئیں بھی ہوا کرتی تھیں، مولانا میرانیس کے مداح اور ان کے محاسن کلام کے دلدادہ تھے، اور یوں بھی اقلیم سخن کے ان دونوں تاجداروں کے مقبوضات اور مفتوحات کی وسعت اور جہانگیری کی داستان سے ملک کی ساری ادبی محفلوں میں ہنگامہ برپا تھا، مولانا نے موازنہ کے مقدمہ میں اس تصنیف کی تقریب ان لفظوں میں کی ہے: "مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے، اس غرض کے لئے میرانیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں، اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے، شکر ہے کہ آج اس ارادہ کے پورے ہونے کی نوبت آئی، اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیشکش ہے، اس کتاب میں میرانیس کا موازنہ بھی میرزا دبیر سے کیا گیا ہے، اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے:"

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں دو مقابل شعرا کے درمیان اس قسم کا موازنہ مشہور و معروف ہے۔ اس قسم کی ایک مشہور کتاب حسن بن یحییٰ آمدی المتوفی ۳۷۰ھ کی کتاب "الموازنہ بین ابی تمام والبحتری" ہے، جس میں آمدی نے ان دونوں ممتاز شاعروں کے کلاموں کا موازنہ کیا ہے، اور دونوں کے کلاموں کے عیب و ہنر کو ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۷ھ میں مطبع الجوائب قسطنطنیہ میں سب سے پہلی دفعہ چھپی تھی۔

مولانا کے خطوط میں ان کی تصنیفات کے موضوع، تصنیف سے سالہا سال پہلے بیان اور تذکروں میں آتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد جا کر وہ کتاب تالیف پاتی ہے۔ مگر موازنہ کی نسبت اس قسم کا کوئی سابق تذکرہ ان کے خطوں میں نہیں ملتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھنے کا خیال خواہ پرانا ہو، مگر میر انیس و دبیر کے موازنہ کا خیال بہت پرانا نہ تھا۔ اس موضوع کا ذکر سب سے پہلے نومبر ۱۹۰۳ء کے ایک خط میں آتا ہے: "میں نے میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے، جو ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔" (سمیع ۵۰)

۲۰ مئی ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں: "میر انیس پر رسالہ مدت ہوئی تیار ہے، لیکن یہاں کچھ ایسی الجھنوں میں پڑ کر اب تک مطبع میں نہیں گیا، شاید عنقریب نوبت آئے۔ قریباً ۲۰۰ صفحے ہو گئے ہیں۔" (مہدی ۱۰۷)

اسی خط میں آگے چل کر "مثنوی مولوی روم پر تقریظ" لکھے جانے کی بھی اطلاع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موازنہ، سوانح مولانا روم سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی، مگر اس کے چھپنے کی نوبت پیچھے آئی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۰۶ء کو مولوی سید ابو الکمال صاحب دسنوی کے جواب میں لکھتے ہیں: "موازنہ ابھی مطبع میں نہیں گئی۔" (ابو الکمال ۱۰)

اس کے بعد مولانا ۱۹۰۶ء کے شروع میں حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے، اور اور کام چھوڑ گئے

شعر العجم میں بھی ہاتھ لگ گیا، اگر موازنہ کا مسودہ معتمد تعمیرات کے قبضہ میں دبا رہا، نہ وہ چھپواتے تھے اور نہ دیتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۶ء میں مولانا نے دوبارہ اس کو مرتب کرنا شروع کیا، مارچ سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں: "تقریباً مثنوی چھپ گئی ہے، البتہ موازنہ مدتوں کے لئے رک گیا، مسودات پھر سے مرتب کرنا ہو اور صحت اس قدر فرصت نہیں، بعینہ حیدرآباد میں ہے اور وہاں سے ملنے کی امید نہیں" (مہدی ۱۹)

بالآخر ستمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں اس کے کچھ اجزا درست ہو کر صوفی محمد علی کے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپنے کے لئے دیدیئے گئے، ۱۵۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو ایک دوست کو اطلاع دیتے ہیں: "موازنہ انیس بہت عمدہ چھپ رہا ہے، مسودات کی ترتیب نے شعر العجم میں ہرج ڈال دیا ہے، چار مہینے سے کچھ نہیں لکھا گیا" (مہدی ۳۴)

ان چار مہینوں کی تحدید سے معلوم ہوا کہ جون یا جولائی سنہ ۱۹۰۶ء سے موازنہ کی دوبارہ ترتیب شروع ہوئی اور اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ جاکر تمام ہوئی، ۵ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کو وہ شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "موازنہ سے بہر وجوہ نجات ملی، اب جس قدر وقت ملے گا شعر العجم پر صرف ہوگا" (شروانی ۵۶)

اسی زمانہ میں مولانا نے مولانا حالی کو سوانح مولانا روم کا ایک نسخہ ہدیہ بھیجا تھا اور خط میں موازنہ کے چھپنے کی اطلاع دی تھی، مولانا حالی مرحوم نے ۵۔ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کو اپنے گرامی نامہ میں موازنہ کے اس مسودہ کے متعلق جو حیدرآباد میں پڑا تھا یہ ارقام فرمایا:[1] "موازنہ انیس و دبیر کا مسودہ میں نے میر ظہور علی صاحب معتمد تعمیرات سرکار عالی سے بڑے تقاضوں کے ساتھ حیدرآباد میں منگوا کر دیکھا تھا، اور جس رنج کے ساتھ ان کے دفتر میں اس کو واپس بھیجا تھا اس میں ان کو بہت غیرت دلائی تھی کہ اب تک اس کے شائع کرنے کا یہاں کسی کو خیال نہیں آیا، یا تو سرکار کی طرف سے آپ اس کو چھپوا دیں یا بعض اشخاص جو اس کے چھاپنے

---

[1] مولانا حالی کا خط بنام مولانا شبلی بمعارف دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں چھپا ہے۔

پرآمادہ ہیں اُن کو اجازت دیدیں، اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اس مسودہ کو خود مولانا کے پاس بھجوادیں، کیونکہ اس میں جا بجا کورے اوراق چھوڑ دیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس میں کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہو، میرکاظم علی صاحب نے بہت دن کے بعد اس کا یہ جواب دیا کہ سرکار سے اس کے چھاپنے کی منظوری لے لی گئی ہو لیکن باوجود اس کے کہ میں اس کے بعد کئی مہینہ تک وہاں ٹھہرا رہا میرے سامنے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، بہرحال وہاں چھپا بھی تو بالکل مسخ ہوگا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں چھپنے کو دیا جب مولانا بالکل چھپ جائے تو ازراہ عنایت اس کی بھی ایک جلد سکریٹری وکٹوریہ میموریل لائبریری کے نام ضرور بصیغہ ویلو پی ایبل بھجوا دیجئے گا۔

سررشتہ کی دوسری کتابیں مولانا کے عہد نظامت میں سررشتہ کی طرف سے بعض دوسری کتابوں کے لکھوانے اور چھپوانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

کتاب الآلات سررشتہ میں قدم رکھنے کے ساتھ مولانا کو کتاب الآلات کے چھپوانے کا خیال آیا، لکھنؤ کے ایک کتب فروش کی دکان سے کتاب الآلات کا جو نسخہ ستمبر ۱۸۹۹ء کو ہاتھ آیا تھا، اور جس کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے خرید فرمایا تھا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے یہ کتاب عربی میکانکس پر تھی، مولانا نے جب سررشتہ علوم و فنون کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو مولوی سید علی بلگرامی کے مشورہ سے اس کتاب کو سررشتہ کی طرف سے چھپوانا چاہا، شروانی صاحب کو لکھا:- "کتاب الآلات سررشتہ علوم و فنون کی طرف سے چھپوانا مقصود ہے، آپ وہ نسخہ بھیج دیجئے اور اگر اپنے نسخہ منقولہ میں تصویریں بنوائی ہوں تو وہ بھی یہاں بہت اچھی بن سکتی ہیں"(۲۵)

پھر ۲۰ مئی ۱۹۰۱ء کو لکھا:- "کتاب الآلات کی تصاویر کے نئے رشتہ کو لکھئے وہ انتظام کردیں گے

شروانی ۱۰، [illegible]

گر اس کے چند ہی مہینوں کے بعد حیدرآباد کے سیاسی انقلاب کے بعد اس کتاب کے چھپنے کا خیال نہ تھا

دکن کی تاریخیں اس سررشتہ سے مولانا نے پہلے فرنچ سیاح موسیو بوریئر کے سفرنامۂ دکن کے دو حصے سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں اور تاریخ دکن کے دو حصے سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئے تھے جن کا ذکر مکاتیب (ربیع ۵۰) میں بھی ہے، مولانا کے زمانۂ تعلقات میں نظام گبری سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد میں، اور تاریخ دکن کی تیسری جلد آگرہ میں سنہ ۱۹۰۳ء میں چھپی،

حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی دل برداشتگی سنہ ۱۹۰۱ء - سنہ ۱۹۰۵ء

حیات شبلی کے جو پچھلے صفحے آپ کی نظر سے گذرے ہیں، اُن میں یہ چیز آپ کو واضح ہو گئی ہوگی کہ مولانا نے ہندوستان سے دکن کا رخ کس اضطراب اور گھبراہٹ کے عالم میں کیا تھا، یعنی اپنے والد کی وفات کے بعد جن مشکلات سے ان کو دوچار ہونا پڑا، اور قرض کا جو بوجھ ان کے سر پر آکر پڑا، اس نے ان کو پریشان کر دیا، اور اسی پریشانی کے عالم میں حیدرآباد چلے آئے، قدرشناسوں نے قدر کی، اور اُن کے اطمینان کے لئے ایک معقول جگہ کا انتظام کیا گیا، لیکن ابھی انتظام پوری طرح ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ سیاست کا مرکز بدل گیا، اور بے اطمینانی کے اسباب پیدا ہو گئے، اس زمانہ میں انھوں نے چاہا کہ قرض کے بوجھ سے اب بھی کسی طرح سبکدوشی ہو جائے تو ملازمت کی زنجیر کو پاؤں سے نکال دیں، ۵۔ فروری سنہ ۱۹۰۲ء کو اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں، ... میں بیچارہ ہوں کہ پریشان ہوں، یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا ہے، میرے سررشتہ اور تعلیمات پر ایک کمیشن بیٹھی ہے، اس کی رپورٹ پر فیصلہ ہوگا، لیکن میں پہلے ہی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا گیا ہوں..............

اگر حیات تک قرض ادا ہو جاتا تو میں دو ہزار پر بھی یہاں کی بلکہ کہیں کی ملازمت نہ کرتا، میں نے

ندوہ میں رہنے کا عزم جازم کر لیا ہے، دیکھئے یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے، مولوی سید علی بلگرامی ۸ مارچ کو وہ[illegible] روانہ ہوں گے۔" (مسیح ۵۰)

دسمبر ۱۹۰۵ء میں اُن کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے ذاتی کتب خانہ کو جو اعظم گڈھ میں ہے فروخت کر کے قرض کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائیں، اس کتب خانہ کا قدرداں اُن کے خیال میں اُن کے دوستوں میں ایک ہی شخص تھا، اس کو خط لکھا: "ایک راز کی بات کہتا ہوں اپنے ہی تک رکھئے گا آپ کو معلوم ہے والد قبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا، اس میں سے اب چھ ہزار اور رہ گئے ہیں، اس کے مارے میں غربت کی خاک چھانتا پھرتا ہوں، اور کس کمبخت کو نوکری کی غرض ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنا کتب خانہ کل فروخت کر ڈالوں...... باقی تین ہزار کا اور کچھ سامان کروں گا، اگر یہاں (حیدرآباد میں) استقلال ہو جاتا تو میں کل سامان کر لیتا، لیکن ہر نفس نفسِ واپسیں ہے۔" (شروانی ۹۰)

نواب محسن الملک کی علی گڈھ کے لئے کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی ۱۹۰۵ء

اس کشمکش میں نواب محسن الملک نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ کالج میں دوبارہ آجائیں، اس راہ میں سب سے بڑی مشکل مولانا سے گورنمنٹ کی ناراضی تھی، نواب صاحب ممدوح نے لفٹنٹ گورنر سے مل کر اس کی صفائی کر لی، اور اس کی اطلاع مولانا شبلی کو بھی دی، مولانا لکھتے ہیں: "اس ہفتہ میں نواب محسن الملک کا خط آیا ہے کہ وہ نواب لفٹنٹ گورنر سے ملے اور معلوم ہوا کہ لفٹنٹ صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے، رفع کر دیئے، اور یہ بھی کہا کہ اب اُن کو علی گڈھ کالج اگر بلانا چاہے تو بلا سکتا ہے، محسن الملک نے مجھ کو اس اطلاع کے بعد لکھا کہ کالج میں آجاؤ، وظیفۂ حیدرآباد بھی جاری ہو جائے گا، اور سو روپے کالج سے بھی ملیں گے، لیکن میں نے منظور نہیں کیا، اور کوشش میں تھا اور ہوں کہ وظیفہ جاری ہو جائے

تو ندوہ میں آجاؤں"۔ (شروانی - ۱۰۴)

قرض سے نجات اور نوکری سے سبکدوشی کی کوشش

معلوم ہو چکا ہو کہ دسمبر ۱۹۰۸ء تک اُن پر چھ ہزار قرض کا بوجھ تھا، مگر چند مہینوں کے بعد پانچ ہزار کسی طرح ادا ہو گئے، اور صرف ایک ہزار رہ گیا، یکم جون ۱۹۰۹ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں:- "خدا کا شکر ہے کہ قرض ادا ہے کثیر میں سے اب صرف ایک ہزار اور رہ گیا ہے جس کو میں ماہوار ادا کر رہا ہوں، باقی سب ادا ہو گئے، مجموعی قرض (والد مرحوم کی) تعداد تیس[1] ہزار تھی"۔ (حمید - ۲۰)

اس سے ایک گونہ اُن کو اپنی پابندی کی زنجیریں ڈھیلی نظر آئیں، اور اس خیال میں کہ اُن کا سو، ڈیڑھ سو والا گذشتہ وظیفہ بحال ہو جائے تو وہ خود استعفا دیدیں، اور ندیادہ پختگی آگئی،

ندوہ کی یاد

۱۹۰۸ء میں مولانا ایک نئی ملازمت کی قید میں گرفتار ہو چکے تھے، اس لئے وہ اس سال بھی ندوہ کے سالانہ جلسہ میں جو ۲۳-۲۴-۲۵-۲۶ شعبان ۱۳۲۶ھ مطابق ۵-۶-۷-۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کلکتہ میں ہوا تھا شریک نہیں ہوئے لیکن انھوں نے ایک خط کے ذریعہ سے جلسہ میں یہ اعلان کرا دیا کہ وہ عنقریب سب چھوڑ چھاڑ ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھیں گے، یہ خط جیسا کہ کلکتہ کی روداد صفحہ ۱۰ میں چھپا ہے حسب ذیل ہے:- "رخصت ملنے کی توقع نہیں، اس لئے شاید کلکتہ نہ پہنچ سکوں لیکن ابکی مرتبہ ندوہ میں اعلان کر دیجئے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ سب چھوڑ چھاڑ کر ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھوں، اور اپنی تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کروں"۔

مولانا اپنے بیچ کے خطوں میں تو بارہا اپنی اس خواہش کا ذکر فرما چکے تھے، مگر یہ پہلا موقع

---

[1] یہاں خط میں تیئیس ہزار غلط چھپا ہے، تیس ہزار ہونا چاہئے۔

ہے کہ انھوں نے پبلک میں اس کا برسرِ عام اعلان کیا۔

شوال ۱۳۱۹ھ مطابق فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوہ نے ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی اُس کے ابتدائی تین درجوں کے بعد چوتھا درجہ متوسط سالِ اوّل کے نام سے کھلا اور شوال ۱۳۲۰ھ مطابق جنوری ۱۹۰۳ء میں متوسط کے دوسرے درجہ کا اور شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء میں متوسط کے تیسرے درجہ کا افتتاح ہوا، دارالعلوم کے درجے پر درجے سال بہ سال کھلتے جاتے تھے اور مولانا کی دلچسپی برابر اضافہ ہوتا جاتا تھا لیکن نصاب درس کی ترتیب و ترمیم کے واسطے اب تک کوئی خاص مجلس نہ تھی، بلکہ جلسۂ انتظامیہ اس خدمت کو خود ہی اُن حضرات کے مشورہ سے جن کو تعلیم کا پورا تجربہ حاصل ہو، انجام دیتا تھا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں اس کام کے لئے ایک خاص مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی، اور مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی جیسے تجربہ کار حضرات مقرر کئے گئے تھے، اور اس مجلس کے معتمد مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی منتخب ہوئے تھے، اس میں خاص لحاظ کے قابل بات یہ ہے کہ اس میں مولوی شبلی صاحب کا نام نہیں، اسی زمانہ میں ندوہ کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا خیال ہوا، مگر اس میں بھی مولانا سے مشورہ نہیں لیا گیا، یہ گو اتفاقی بات ہوگی، مگر مولانا کو اس سے یہ شبہہ ہوا کہ ندوہ کے کارکن میری شرکت نہیں چاہتے، اس بنا پر ۲۴ راگست ۱۹۰۲ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو انھوں نے لکھا، "ندوہ کی نسبت ہمیشہ میرا یہی خیال رہا اور سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا گو واقعاتِ اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا۔

۱؎ روداد ندوہ بابت ماہ ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ و روداد اجلاس ۱۹۰۳ء ص ۳۵ ۲؎ روداد ندوہ مکاتیب[illegible]

یہ تو میری حالت ہے اب آپ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جس کام پر میں نے برسوں غور کیا ہو، اس کے سامان بہم پہنچائے ہیں، اس کو اچھی طرح کر سکتا ہوں، اس میں بھی آپ ہاتھ لگانے نہیں دیتے، رسالہ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپنے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لئے علی گڈھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے، لیکن آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب گئے اور طرز تعلیم کو الٹ دیا، بہرحال مجھ کو کسی کے فن اور خیال پر اعتراض نہیں لیکن جب یہ کیفیت ہو تو بے فائدہ دخل در معقولات سے کیا حاصل ہو، مجھ کو اب ندوہ سے معاف کر دیجئے مجھ سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہو تو اور بھی بہت لوگ ہیں، افسوس ہے ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہو، اگلی جلسہ کے لئے میں نے سامان کر لیا تھا لیکن ایسے مجمع میں شرکت سے کیا فائدہ جہاں سب لوگ مجھ سے بدظن ہوں۔"

اس خط کے جواب میں جناب مولانا شروانی نے غالباً یہ لکھا کہ "اگر آپ ندوہ سے الگ ہوتے ہیں، تو میں بھی ہوتا ہوں"، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ آپ کی اس علحدگی سے ندوہ کو جو نقصان پہنچے گا اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ چند ماہ کے بعد امرتسر میں ندوہ کا اجلاس ہوگا، اس میں دارالعلوم کے نصاب کے مسئلہ کو طے کر لیجئے، اور یہ بھی لکھا کہ آپ حیدرآباد چھوڑ کر آئیں تو ساری مشکلیں حل ہوں، اس کے جواب میں ۱۰ ستمبر ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں:- "میں نے یہ کب کہا کہ آپ بھی ندوہ سے علحدہ ہوں، آپ پر ندوہ کو پورا اعتبار ہے، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور آپ کو کرنا چاہئے، میرے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ میں حیدرآباد چھوڑ دوں، اور یہ شرط خود آپکے اس عنایت نامہ میں بھی درج ہے، نصاب کا کام

لاہور سے انجام ہو سکتا ہے اور حیدرآباد سے نہیں ہو سکتا۔

میں ندوہ کا دشمن نہیں ہوں کہ اپنی علٰحدگی سے اس کے نقصان رسانی میں مدد دوں، میں امرتسر[1] کانگریس میں بھی شریک نہیں ہو سکا، اس لئے اگر زبانی منظور ہو تو حاضر ہوں ورنہ معاف۔

ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں، ان میں خود میرے ہم وطن اور عزیز بھی ہیں اور جس وجہ سے خلاف ہیں اس سے بھی میں واقف ہوں لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے کیا حاصل، البتہ آپ تعجب کریں کہ ہر قسم کے کام کے لئے ترکِ معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں۔

اس کے ایک مہینہ کے بعد ۹-۱۰-۱۱ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۹-۱۰-۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ امرتسر میں ہوا، ندوہ کا یہ سب سے پہلا جلسہ تھا جس میں مولانا نے اپنے خیالات کو ایک نادر موزوں کی شکل میں پیش کیا جو سراپا درد ہے، یہ فارسی ترکیب بند تھا جو پہلے ہی نہایت اہتمام سے منشی رحمت اللہ رعد کے مطبع نامی میں چھپوا لیا گیا تھا، پہلے ہی اجلاس میں روداد کے بعد مولانا اپنا یہ ترکیب بند سنانے کو کھڑے ہوئے اس کا مطلع تھا۔

انچہ بازیچ نیرزد بجہاں آں داریم | ایکہ پرسی چہ کسانیم وچہ ساماں داریم

اس ترکیب بند میں سات بند ہیں، پہلے دو بندوں میں علماء کی قناعت و فضیلت کا بیان ہے، تیسرے اور چوتھے میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر ہے، پانچویں اور چھٹے میں نئی تعلیم کے نقائص کا بیان ہے، اور ساتویں میں ندوہ کے مقاصد کی تشریح ہے، یہ ترکیب بند جس وقت جلسہ میں پڑھا گیا ہے حاضرین کی کیفیت کیا ہوئی، اس کا مختصر بیان اس جلسہ کی روداد میں مذکور ہے

[1] یہ اشارہ مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی رکن مجلس نصاب کی طرف ہے جو لاہور میں رہتے تھے۔

شیخ عبد القادر صاحب بی اے (موجودہ سر شیخ عبد القادر) جس وقت اپنی تقریر تمام کر چکے معزز حاضرین نے بے چینی
سے شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی کی طرف نگاہیں دوڑائیں، وفور شوق اور شدت انتظار کے جوش
میں مولوی صاحب ممدوح اسٹیج پر تشریف لائے، اور اپنا ترکیب بند ایسے موثر اور درد انگیز لہجہ میں پڑھا
جس کو سنتے وقت سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے، خصوصاً دو بند اول کے کچھ ایسے پڑھے
گئے جنھوں نے علما پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دی، اور جہاں تک دریافت ہوا ہے اس کا مزہ اب تک
ان رگ نہیں ہوئے، اس ترکیب بند پڑھنے سے پہلے مولوی صاحب نے ایک مختصر تقریر بھی کی تھی، اور درمیان
میں بھی بجا بجا حالت اور موقع کے مناسب تقریر کرتے جاتے تھے، جس سے سامعین کو زیادہ لطف آتا
تھا، اس ترکیب بند کو مولوی صاحب نے کانپور میں چھپوایا تھا جس کی سو کاپیاں اس وقت موجود تھیں
ان کو حاضرین نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا، (ص ۳۳)

زیارت کا پہلا موقع | یہ ۱۳۱۶ھ پہلا موقع ہو کہ میرے (راقم الحروف)[1] ہوش و حواس کے کانوں نے
مولانا شبلی کا آوازہ سنا، امرتسر سے جب مولانا واپس ہوئے تو لکھنؤ کر ٹھہرے، اور میں نے سب سے
پہلی دفعہ ان کی زیارت کی، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی اس وقت دارالعلوم میں مدرس ادب
عربی تھے، وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے، وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا شبلی) کے اس ترکیب
بند کے ان چند شعروں سے بہت خفا تھے، جن میں فلسفۂ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے
بے خبری پر تعریض تھی،

تا چہ سوءت دہد آں فلسفۂ عہد قدیم   تا چہ سوءت دہد آں ہیئت پارینۂ ما

---

[1] راقم الحروف شوال ۱۳۱۶ھ مطابق فروری ۱۸۹۹ء میں دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوا تھا۔

ز عناصر سہ وحشت آمدہ یک بشمار   تو چہار در گرو عشق و آبستی و باد

ہم لوگ اس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ ومنطق کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے، اکثر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۴ عناصر کے نظریہ کی تردید فرماتے تھے اور سمجھاتے تھے، اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے،

پنجاب میں اس زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں کی وجہ سے ختم نبوت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، شاید اسی سبب سے مولانا نے اپنی تقریر کا موضوع "ختم نبوت" قرار دیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ اس موضوع پر تقریر کریں حسب دستور ندوۃ العلماء کی ضرورت پر ایک مدلل تقریر فرمائی جو روداد میں مذکور ہے، اس تقریر میں جدید اور قدیم دونوں گروہوں کو مخاطب کرکے ندوہ کی ضرورت ثابت کی ہے، اور بتایا ہے کہ اب ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت ہے جو نیا علم کلام پیدا کرے، اور حال کے نئے علوم وفنون کی تعلیم دے،

اس تقریر میں وقت اتنا گذر گیا کہ مولانا نے چاہا کہ وہ ختم نبوت والی تقریر کو چھوڑ دیں، مگر حاضرین کے بیحد اصرار سے ختم نبوت پر تقریر شروع فرمائی، روداد میں ہے:- "شمس العلماء مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی چاہتے تھے کہ صرف اسی تقریر پر اکتفا کریں، مگر حاضرین جلسہ کے بیحد اصرار سے "ختم نبوت" پر تقریر شروع فرمائی جس پرواز پر تقریر فرما رہے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تقریر ناتمام رہی، باوجودیکہ ایک گھنٹہ صرف اسی عنوان پر تقریر فرماتے رہے، مگر تقریر کے بعض بعض حصے چھوٹ گئے، بعض مجمل طریقے پر بیان ہوئے، تاہم جس قدر بیان ہوئے وہ ایسا فاضلانہ مضمون تھا جس کے سننے کے لئے سامعین ہمہ تن گوش ہو رہے تھے، در اس عالم خاموشی میں بھی حسن بیان کا یہ اثر تھا کہ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کی صداؤں سے تمام ہال گونج

جاتا تھا، افسوس ہے کہ اردو میں اب تک آواز نویسی کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا، اس وجہ سے ایسی دلآویز تقریریں اسی وقت تک کے لئے ہوتی ہیں جب تک ان کی آواز کانوں میں گونجتی رہی، یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلمبند کی جاتی، مگر باوجود کوشش کے نہیں ہو سکی جس قدر حصے قلمبند ہوئے وہ ایسے نامربوط ہیں، جنہیں زیادہ لطف نہیں آسکتا، مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس تقریر کو مستقل رسالہ کی صورت میں قلمبند کر دیں گے۔ (صفحہ ۱)

افسوس ہے کہ مولانا کا یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا، اور حقائق و معارف کے ایک بحرِ زخار کی موجیں پیدا ہو کر فنا ہو گئیں، اسی زمانہ میں وکیلؔ امرتسر میں اس کے ناتمام خلاصے جلسہ کی روداد کے ضمن میں چھپے تھے، مگر اس وقت وہ ناتمام خلاصے بھی سامنے نہیں،

تبدیلِ نصاب کی کوششیں ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء

امرتسر میں علماء کی مجلسِ خاص میں نصاب کے مسئلہ پر نہایت طول طویل بحثیں ہوئیں، اور بالآخر مولانا کی جیت ہوئی، اور کثرتِ رائے سے درسِ نظامی میں ترمیم منظور ہوئی، اور اصولی طور سے بعض اصول طے ہوئے، جن کا ذکر مکاتیبِ شبلی میں ہے مگر اس پر بھی ندوہ میں وہی پرانا نصاب عملاً جاری رہا، جب پر ۲۲ جون ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ناظم مجلسِ نصاب مولانا شروانی کو لکھا:- "آج ایک نقشہ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ کا آیا اس میں یہ کتابیں ہیں، ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، کافیہ، میبذی، شافیہ (مع) کرمی، ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے، آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اس لئے ہوا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں اختلاف تھا، لیکن جنہیں اتفاق تھا وہ کہاں ہیں، مدرسوں کو کہئے کہ یہ کیا کر رہے ہیں، افسوس، افسوس"۔

پھر ان ہی کو جولائی ۱۹۰۵ء میں لکھتے ہیں:- "میں نے مدرسہ عالیہ دارالعلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے، اور تسریح جو طے ہوا وہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا؟ وہاں سے جواب آیا کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا، ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں، آپ نے مدرسہ میں غالباً نقل نہیں بھیجا، جس کی وجہ یہ ہوگی کہ نصاب میں کچھ اختلافات تھے، لیکن بہرحال کچھ کتابیں متفق علیہ عام تھیں ان کی اطلاع تو آپ کو دینی چاہئے تھی، یہ نہایت تعجب کی بات ہو کہ آپ کمیٹی نصاب کے ناظم اور آج تک وہی اندھیر ہے؟

خدا کے لئے فوراً دارالعلوم کو نصاب مقررہ سے مطلع کیجئے اور تاکید کیجئے کہ اس کو درس میں رکھیں جو کتابیں مختلف فیہ ہوں، ان کو رہنے دیجئے" (۵۰)

پھر اسی زمانہ میں ان کو دوبارہ لکھتے ہیں:- "جلسۂ انتظامیہ میں یہ تو ہو طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے، اس سے شرح مسلّم وغیرہ خود خارج ہو تی ہیں، اس کے علاوہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ مثلاً کتب ذیل کی نسبت تمام ممبروں سے پوچھئے کہ درس میں رکھی جائیں یا نہیں، شافیہ، فصول اکبری، شرح ملا، ملا حسن، میرزاہد، ملا جلال وغیرہ،

تمید میں یہ وجہ لکھئے کہ زمانۂ درس کا اختصار ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہر فن کی ایسی کتابیں جو تمام مسائل کو حاوی ہوں، اور اس میں دوسرے علوم کی بحثیں بیچ میں نہ آئیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جارہا ہے؟"

مولانا شروانی کے اس جواب پر کہ نصاب مجوزہ پر ابھی تک ارکان کا پورا اتفاق نہیں ہوا، ۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو رقم فرماتے ہیں:- "مسلمان سو روپے تحفتاً دیتے ہیں، لیکن لیتے نہیں، حرام

دونوں ہیں، لیکن پہلی صورت میں چونکہ نقصان ہے اس لئے اس کے مرتکب، اور دوسری صورت میں چونکہ فائدہ ہے اس لئے اس سے مجتنب ہیں، بعینہٖ یہی حالت ندوہ کی ہے، اور ایک خاص حصّہ کے متعلق یہ حالت آپ کی وجہ سے ہے،

ندوہ میں سیکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے رہتے ہیں، اس کی تو کچھ پرس وجو نہیں، لیکن نصاب کی نسبت آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہے کہ ایک ایک حرف پر سب کا اتفاق جب تک نہ ہو لے کچھ کیا نہیں جا سکتا۔

کرمی، اس طرح کام نہیں چلتا، سیّد صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا، امرتسر میں اصولی امر طے ہو چکے تھے، مثلاً یہ کہ فلاں فلاں کتابیں خارج کر دی جائیں گی، اس کے مطابق آپ ملا حسن، میر زاہد، حمداللہ، قاضی کو فوراً خارج کر سکتے ہیں، شرح ملا وغیرہ بہ تصریح خارج ہو چکی ہیں، ہیں مدرسین کو لکھتا ہوں تو وہ لکھتے ہیں کہ بغیر معتمد کے حکم کے ہم کیونکر تبدیلی کریں، آپ فوراً لکھ بھیجئے کہ فلاں فلاں کتابیں موقوف اور ان کے بجائے فلاں فلاں کتابیں، اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہ ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجئے'' (۵۲)

۱۴۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پھر انہیں ایک مفصل خط لکھا، جس میں فرماتے ہیں:-''آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزالی کونی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوا، لیکن اسی خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا جو ندوہ میں جاری ہے،

میرے محبوب! کیا آپ کا یہ کام تھا کہ سال بھر سے وہ کتابیں جو قطعاً امرتسر میں خارج کر دی گئی تھیں، جاری رہیں، اور آپ کل نصاب کے متفق علیہ ہونے کا انتظار کرتے رہیں، خیر اب سنیئے

درجۂ متوسط سال سوم میں سے ملا حسن، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، قاضی مبارک، صدرا، سب خارج کر دینا چاہیے، ان کے بجائے شرح مطالع کے بعض حصے، حمد اللہ، شرح ہدایۃ الحکمت خیرآبادی، رسائل ابن رشد مطبوعہ مصر، حماسہ، اعجاز القرآن باقلانی، اور ہدایہ معاملات (بشرط گنجائش) ہونا چاہیے،

درجۂ متوسط سال دوم میں سے میبذی (یہ سب سے زیادہ نالائق کتاب ہے) شرح عقائد نسفی، تصریح الافلاک خارج ہونی چاہیے، موطائے امام محمد، سبعہ معلقہ، جلالین قائم رہنا چاہیے، اور رسائل ادبیہ امام غزالی، الفوز الاصغر ابن مسکویہ مطبوعہ بیروت جو لکھنؤ میں بھی مطبع یوسفی میں مل سکتی ہے پڑھانا چاہیے،

درجۂ متوسط سال اول میں مشکوٰۃ کی ضرورت نہیں، مختصر معانی قطعاً خارج کر دینا چاہیے، اور حسن التوسل فی صناعۃ الترسل مطبوعہ مصر اس کے بجائے رکھنا چاہیے، منتقی الابحر کی بھی ضرورت نہیں، دیوان ابو العتاہیہ اس میں اضافہ کرنا چاہیے،

درجۂ ابتدائی سال سوم میں تلخیص اور دیوان علی (جو محض موضوع ہے) بالکل خارج، مشکوٰۃ کی بھی ضرورت نہیں، حدیث کا فن مستقل اخیر میں رکھا جائے گا۔

درجۂ ابتدائی سال دوم اور سال سوم سے شافیہ، کافیہ، شرح جامی قطعاً خارج، ان کی جگہ اس درجہ میں ہدایۃ النحو لانا چاہیے، اور مفصل زمخشری اضافہ کرنا چاہیے، نیز کلیلہ دمنہ ابن المقفع مطبوعہ بمبئی،

لیکن ندوہ کے لئے پھر پنچایت پر معاملہ نہ چھوڑ رکھئے گا، کوئی کتاب نئی تو کی جائے خواہ نہ کی جائے لیکن کافیہ، شافیہ، شرح جامی، میر زاہد، ملا حسن، ملا جلال، قاضی یہ تو قطعاً نکلوا دیجئے، خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے؟"

اس ساری خط و کتابت اور سوال و جواب کے باوجود ندوہ کی اصلاح نصاب کی بحث خود

کو مولانا مرحوم نے کن مشکلوں سے طے کیا، اور عربی تعلیم کے لئے ایک نئی درسگاہ کی تجویز منوانے میں ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں،

ندوہ کا انتشار

اس زمانہ میں ناظم ندوہ اعلیٰ مولانا سید محمد علی صاحب ندوہ کی نظامت کی خدمت کے بارے سبکدوش ہونا چاہتے تھے کئی سال سفر حجاز میں، چنانچہ ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں مولانا مسیح الزمان خاں صاحب شاہجہاں پوری ان کے قائم مقام ہوئے، اور ندوہ کا دفتر شاہجہاں پور کو منتقل ہوا، اور اسی سال ۱۷ شعبان ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں دارالعلوم کی معتمدی اور نگرانی جناب منشی محمد اطہر علی صاحب رئیس کاکوری کو سپرد ہوئی[1]، یہ زمانہ ندوہ کے سخت انتشار کا تھا، اور مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں جھلا جھلا کر ندوہ کے دوستوں کو سخت خط لکھتے رہے،

ندوہ کا سالانہ اجلاس مدراس میں شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۴ء

خوش قسمتی سے آیندہ سال ۱۳-۱۴-۱۵-۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۲-۳-۴-۵ جنوری ۱۹۰۴ء میں ندوہ کا سب سے پہلا اجلاس مدراس میں ہوا، جس میں دوسرے علماء کے علاوہ مولانا شبلی بھی شریک ہوئے، بلکہ اس کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۵ جنوری ۱۹۰۴ء کی صدارت[2] بھی کی، پروگرام میں مسٹر شیخ عبدالقادر مرحوم کی تقریر کے بعد خود مولانا کی تقریر کا وقت تھا، اور موضوع وہی تھا، جو ان کے دل سے لگا تھا یعنی دار العلوم

---

[1] روداد مدراس ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۰ منشی صاحب موصوف کچھ دنوں تک دارالعلوم کی نگرانی کا فرض اس طرح ادا کرتے رہے کہ باوجود رئیس ہونے کے خود دارالعلوم کے صحن میں رات کو آرام فرماتے تھے، ۲۰ رمضان ۱۳۲۳ھ مطابق [illegible] ۱۹۰۵ء کو وہ حج بلکہ ہجرت کے ارادہ سے حجاز کو روانہ ہوئے اور وہیں مدینہ منورہ میں ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ مطابق [illegible] ۱۹۰۷ء کو وفات پائی، اور جوار رحمت میں جگہ پائی، ان کی وفات پر میرا ایک عربی مرثیہ عربی دیوان میں ہے،

[2] روداد مدراس ۱۹۰۴ء صفحہ ۵۳،

کی ضرورت، روداد کے الفاظ یہ ہیں:- "اس درمیان شیخ عبد القادر کی تقریر ختم ہونے سے پہلے سے کچھ زیادہ شوق اور بیچینی کے آثار جلسہ میں پیدا ہوگئے، ہر شخص کے ہاتھ میں جلسہ کا نظام تھا، اور صدر نشین کی طرف نگاہیں تھیں کیونکہ یہ وقت جلسہ کے صدر نشین مولانا شبلی نعمانی کی تقریر کا تھا، اور آپ دار العلوم کی ضرورت پر بیان فرمانے والے تھے، مولانا ممدوح کھڑے ہوئے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس میں چند عنوانات لکھے ہوئے تھے، جب ذات ممدوح نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں فرمائی تھی[1]،

اسی سلسلہ میں مولانا شبلی نے یہ تحریک فرمائی کہ دار العلوم کی تعمیر میں ایک کمرہ صرف علماء کے چندہ سے بنے، جناب ملا عبد القیوم[2] صاحب حیدرآبادی نے اس کی تائید کی، چنانچہ مولانا عبد الحق صاحب حقانی، مولانا شبلی، مولانا مسیح الزماں خاں، مولوی ضیاء الدین صاحب، ملا عبد القیوم صاحب، مولوی عبد القادر صاحب صوبہ دار بنگلور، مولوی احمد محی الدین صاحب مدراس نے سو سو روپئے، مولوی عبد الرب صاحب خواہرزادۂ ملا عبد القیوم نے ڈھائی سو، اور باقی علماء نے دس بیس پچیس چندے لکھوائے[3]،

مدراس کے جلسہ سے یہ فائدہ ہوا کہ مولانا کو ناظم صاحب ندوۃ العلماء، مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار ناظم اور دوسرے ارکان سے دو بدو گفتگو کرنے کا موقع ملا، اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں، نصاب کا مرحلہ طے ہوا کہ ملا عبد القیوم، مولوی سید عبد الحی صاحب، اور مولانا شبلی باہم

---

[1] روداد مدراس سنہ ۱۳۱۹ھ ص ۵۳ [2] جناب ملا عبد القیوم صاحب حیدرآبادی اعلیٰ دینی تھے اور سرکار نظام میں متعدد اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے، جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہجہانپوری استاد حضور نظام کے برادر نسبتی یعنی سالے تھے، نہایت روشن خیال تھے، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی تاسیس میں ان کا ہاتھ بھی شامل تھا، اس زمانہ میں کانگریس کے بڑے حامیوں میں تھے [3] روداد مدراس سنہ ۱۹۰۳ء ص ۹۶،

پل کرنا ہیں، اسنہ ادو کی تجویز بھی مکمل ہوئی، اور مولانا کا نام اڈیٹروں میں شامل ہوا، اور یہ معلوم ہو
کہ لکھنؤ سے دفتر ہٹانے کی وجہ کیا تھی؟ مولانا شروانی کو ۱۲ر جنوری ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں: "مدرسہ کی
میں جو کچھ ہوا وہ میں کے لئے ہوا، دارالعلوم یا ندوہ کو دو چار سو بھی ہاتھ نہیں آئے، میں نے اس دفعہ مولوی
مسیح الزماں صاحب وغیرہ کو الگ جلسہ میں بلا کر مختصر گفتگو کی یعنی اگر چلانا ہو تو ٹھیک طرح سے چلائیے
ورنہ کم سے کم میں الگ ہو جاتا ہوں، مولوی مسیح الزماں صاحب نے صاف کہا اور مولوی عبدالحی صاحب وغیرہ
نے بھی موافقت کی کہ دارالعلوم جب تک شہر لکھنؤ میں منشی اطہر علی کے زیر اثر ہے کچھ نہیں ہو سکتا، اس لئے
ہم نے دارالعلوم ان کے سر مارا، باقی اشاعت اسلام کا کام شاہجہاں پور میں انجام دوں گا، مولوی عبدالحی
صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ مولوی حبیب الرحمان صاحب سے بار بار خضاب مانگا گیا، لیکن وہ نہیں بھیجتے
تمام لوگوں کو آپ سے سخت شکایت تھی، لوگ کہتے تھے کہ دیباچہ کا مسودہ بھیجدیا تھا،

میری بھی یہ رائے ہے کہ جس کام کو آپ فرصت یا اور کسی وجہ سے نہ کر سکتے ہوں اس سے استعفا
دینا بہتر ہے، ورنہ محض انتساب کے فخر سے کیا حاصل،

رسالہ کے لئے اب تک مولوی مسیح الزماں صاحب درخواست دینے میں پس و پیش کرتے ہیں"

پھر ۲۰ر جنوری ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں: "خانہ طرح دریں است و کشتی در فرنگ"

میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، وہ دفتر میں پڑا رہا، ناظم نے مدرسہ میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں
ہوئی، آپ کا خضاب بھی یوں ہی کہیں پڑا ٹھوکریں کھاتا ہوگا، منشی صاحب[1] مہتمم ہیں، خضاب ان کے پاس
کیا ہوگا، وہ کیا کر سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوگا،

ایکی بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے،

[1] [illegible] جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم۔

مولوی عبدالحی صاحب کے وہ محلہ قیام کی وجہ سے خط لکھنؤ کے پتہ سے پہنچا ہے نہ شاہجہاں پور کے پتہ سے، آپ اتنا کیجئے کہ فوراً ناظم صاحب کو خط لکھ کر ہدایت کیجئے کہ نصاب منگوا کر جاری کر دیں یا فیصلۂ نہ کیجئے میرے پاس بھیجدیں، کیونکہ جلسۂ انتظامیہ مدراس میں بھی طے پایا تھا کہ فیصلۂ اخیر کے لئے نصاب میرے پاس بھیجدیا جائے تاکہ ارکان ندوہ موجودۂ حیدرآباد سے اس کا فیصلہ کرالیا جائے، جلدی فرمایئے، دیر کی حد ہو چکی، ورنہ یہ سال بھی آپ کے نذر ہوگا۔ (شروانی)

مولانا نے اس سال یہ عزم کر لیا کہ دارالعلوم میں نیا نصاب جاری کر دیا جائے، اور کچھ دن لکھنؤ رہ کر دیکھیں کہ دارالعلوم میں کیا کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کی اصلاح کی صورت کیا ہو؟ چنانچہ ۵ ستمبر ۱۹۰۵ء[1] کو مولانا شروانی کو لکھا :- "ندوہ کا اب نقشہ دلچسپ نظر آتا ہے، اس بنا پر بطور حرکت مذبوحی کے یہ ارادہ ہوتا ہے کہ دو مہینہ کی رخصت لیکر لکھنؤ آؤں، اور کم از کم دو چیزوں کو درست اور جاری کرادوں، نصاب اور رسالہ ماہانہ، اس کے سوا اور تدابیر بھی سوچی جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کم از کم ایک مہینہ لکھنؤ میں آکر رہیں، میں بغیر آپ کے کچھ کام نہیں کرنا چاہتا، اور نہ کر سکتا،

اگر آپ اپنے کام کا ذاتی ہرج کر کے آسکیں تو فوراً لکھئے، ورنہ ندوہ کو الوداع کہئے، میرا اس وقت آنے میں سخت نقصان ہے، تنخواہ کی محرومی الگ، میری ملازمت کے استقلال کا مسئلہ اس وقت پیش ہے، اس کو چھوڑنا الگ نقصان رساں ہے، زمانہ کا الگ بکھیڑا ہے، لیکن غالباً ان سب کو میں برداشت کر سکوں گا، آپ فوراً جواب دیجئے،

میں مدت قیام لکھنؤ میں ہر روز کسی فن پر طلبہ کے سامنے لکچر بھی دونگا، قدما کے طریقہ پر" (شروانی)

---

[1] مکاتیب میں ۱۹۰۲ء غلط چھپا ہے،

اسی خیال سے اواخر ستمبر ۱۹۰۲ء میں وہ حیدرآباد سے لکھنؤ آئے، اور دو تین ہفتے دارالعلوم کی پرانی عمارت میں جو گولہ گنج میں واقع ہے اور اب "خاتون منزل" کے نام سے مشہور ہے، اُس کمرہ میں جو اب ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی فرودگاہ ہے قیام فرمایا، اور ۲۰ ستمبر ۱۹۰۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا: "میں ندوہ میں آگیا ہوں، میری عیادت، اور مہماتِ امور کے طے کرنے کے لئے فوراً تشریف لائیے، اور ہفتہ دو ہفتہ یہاں قیام کیجئے۔"

مولانا شروانی اس وقت نہ آسکے، اور تنہا مولانا مقیم رہے، یہ پہلا موقع تھا کہ خاکسار، اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، مولانا کے حلقہ میں بیٹھے، اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب خلف مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی بھی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ان دنوں ندوہ میں ٹھہرے تھے وہ بھی حاضر رہتے تھے، اور اُن ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کیا، نومبر کے آخر میں جب وہ حیدرآباد واپس گئے تو میرے ایک عزیز نے میری صلاحیت کی نسبت اُن سے دریافت کیا تو جواب میں، ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو وہ فقرہ لکھا جو میرے لئے ہمیشہ طغرائے فخر رہے گا "ملازمت نے مجھ کو حیدرآباد آنے پر مجبور کیا، مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں" (عبدالحکیم)

اب مولانا نے دارالعلوم کو دیکھ بھال کر حیدرآباد سے قطع تعلق کرکے قیامِ ندوہ کی تجویز پر عمل کرنے کا عزم فرمایا، مگر ابھی تصفیۂ حالات کے لئے انتظار کے چند مہینے باقی تھے،

انجمن ترقی اردو کی نظامت جنوری ۱۹۰۳ء

کوئی غیر قوم جب کسی دوسرے ملک پر حکومت کرتی ہے تو اس کی سلطنت کا سب سے کامیاب اصول یہ ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کے افراد اور طبقوں

میں اختلافات پیدا کر دے۔ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو صدیوں کی جنگ و جدل، اور لڑائی بھڑائی کے بعد وحدتِ ملی کی ایک سطح پر آگئے تھے، جن کا باس قریب ایک تھا، تمدن یکساں ہوگیا تھا، زبان ایک ہوگئی تھی، مگر انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا کام یہ کیا کہ فارسی کو سرکاری دفتروں سے خارج کر کے اردو کو اس کی جگہ دی، اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں بیٹھ کر اردو کے ساتھ ایک نئی زبان کا کالبد تیار کیا، اور اس کا نام ہندی رکھا، پہلی مسلمانوں کی، اور دوسری ہندوؤں کی زبان قرار دی، اختلاف کا یہ اثر آگے کو پھیلا، اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا گیا،

سنہ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے ذریعہ ملک میں دیسی زبان کی ایک یونیورسٹی کی تحریک کی، اس وقت اردو سرکاری زبان تھی، اس لئے ظاہر تھا کہ دیسی یونیورسٹی کے معنی اردو یونیورسٹی کے تھے، یہ سمجھ کر بعض ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کیا کہ اگر اردو کی کوئی یونیورسٹی بنے تو ہندوؤں کے لئے ہندی کا انتظام کیا جائے، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی یونیورسٹی کی تجویز ناکام رہی،

اس کے بعد صوبہ بہار، اور صوبہ متحدہ کے ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش شروع ہوئی کہ سرکاری دفتروں میں ہندی رائج کی جائے، بہار میں ان کی یہ تجویز کامیاب ہوئی، یہ دیکھ کر صوبہ متحدہ کے ہندوؤں نے ایک محضر تیار کر کے اس پر ہندوؤں کے دستخط کرانے شروع کئے، سرسید نے اردو کی حمایت کے لئے ۹ ستمبر [illegible] کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی، اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز کی، اس کے جواب میں [illegible] میں علی گڈھ میں بھاشا سمردھن سبھا بنائی گئی، جس کا

مقصد یہ تھا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی زبان اور ناگری حروف کا رواج ہو،

ہندی پسند ہندوؤں کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں، یہاں تک کہ سر انٹونی مکڈونل جو صوبہ بہار میں سویلین رہ چکے تھے، اس صوبہ کے لفٹننٹ گورنر ہو کر آئے، وہ ہندی کی محبت صوبۂ بہار سے لے کر یہاں آئے تھے، انھوں نے ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء کو ایک سرکاری فرمان جاری کیا جس کے رو سے عدالتوں میں ناگری حروف کی اجازت دے دی گئی، اس اجازت سے اردو کے حامیوں میں عام بےچینی پھیل گئی، ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں اردو ڈیفنس سنٹرل کمیٹی بنی، اور ۱۲ مئی سنہ ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خاں بہادر رئیس چھتاری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا، اور نواب محسن الملک نے جو اب سرسید کے بعد ان کے قائم مقام تھے ایک مؤثر تقریر کی، اور طے پایا کہ حکومت میں ایک یادداشت بھیجی جائے،

اس کے بعد لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی صدارت میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے اہتمام سے ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ء کو پرانے ورما لائبریری ہال میں ایک بڑا شاندار جلسہ ہوا جس میں مختلف مقامات سے بکثرت نمائندے آکر شریک ہوئے، اور بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو اور عیسائی بھی شریک تھے، ان اختلافی جلسوں اور تجویزوں سے لفٹنٹ گورنر صاحب کے مزاج گرامی کو بڑی برہمی ہوئی، اور اردو کے بہت سے حامی معتوب بارگاہ ٹھہرائے اور آخر اس عتاب کی تاب نہ لاکر اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کو زندہ دفن کر دیا،

آخر دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء اور اوائل جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں شاہی دربار کے موقع پر دہلی میں مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس کا اجلاس ہوا اس میں کانفرنس کے متعدد شعبے قائم ہوئے جن میں سے ایک اردو کا شعبہ بھی تھا جس کا نام انجمن ترقی اردو پڑا اس شعبہ کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے،

صدر :- مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور،

نائب صدر :- شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب،

" " شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب،

" " شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالیؔ،

سکریٹری :- شمس العلماء شبلی نعمانی،

مولانا نے اجلاس کے بعد فوراً ہی حیدرآباد دکن میں بیٹھ کر ترقی اردو کا کام شروع کر دیا، احباب کو خطوط لکھے، دوستوں سے رکنیت کی فرمائشیں کیں، عربی، فارسی و انگریزی سے لائق ترجمہ کتابوں کا انتخاب کیا، مترجموں کو مقرر کیا، اخباروں کے اڈیٹروں کو انجمن کا رکن اشاعت بنایا، متعدد مصنفوں نے اپنی کتابیں انجمن کو بھیجیں اور بعض نے تکمیل کے بعد بھیجنے کا وعدہ کیا، اس زمانہ میں انجمن کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں چھپتی تھی اور ملک میں اردو کے متعلق اس قدر جوش پیدا ہو گیا تھا کہ اخبار ہندوستانی لکھنؤ نے جس کے اڈیٹر گنگا پرشاد ورما تھے یہ شکایت چھاپی کہ انجمن نے اردو کے کام میں ہندو جماعت کو علیحدہ رکھا، اس پر سکریٹری (مولانا شبلی مرحوم) نے اخباروں میں یہ تحریر شائع کی "یہ واقعہ کے خلاف ہے انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا وہ ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا، اور ایک ایسی کتاب

پردیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی کتاب "پیغمبرانِ ہند"[1] جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں:

اس تحریک کا اثر یہ ہوا کہ بعض ہندو بزرگوں نے بھی انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی، اور اس کی ممبری قبول کی۔

اس زمانہ میں فلسفہ اور سائنس کی کتابیں اردو زبان میں بہت کم تھیں، اس لئے ان علوم کی ابتدائی اور سہل کتابیں ترجمہ کے لئے انتخاب کی گئیں، مگر افسوس ہو کہ لائق مترجم نہ مل سکے، چنانچہ ۳۰ اگست ۱۹۰۳ء کو مولانا شبلی نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں: "یہ مہینہ مشتہرہ کتابوں کے ترجمہ کے امتحان کا مہینہ تھا جو کچھ ظاہر ہیں، آیا اس سے قومی مسائل کے متعلق معتد بہ نتیجے حاصل ہوئے ہیں، جس وقت انجمن کی تجاویز ملک میں شائع ہوئی تھیں تو اطراف ہند سے اس قدر درخواستیں آئی تھیں کہ گمان ہوتا تھا کہ ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے، لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو ہر طرف سناٹا تھا، کتاب النباتات و طبقات الارض کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، کتاب الروح کا صرف ایک ترجمہ اور مورل سسٹم کے تین ترجمے آئے، آپ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ مترجمین انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بجز ایک کے تمام ترجمے ناقص اور ابتر ہیں، کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڈھ سائنس اور اردو زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا.......؟"

انجمن کا پہلا سال بہت کامیاب رہا، کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی تھیں کہ ان کے خریداروں کی تعداد سو سے زیادہ ہو گئی، اور دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو اس شعبہ کی رپورٹ علحدہ چھاپی اور شائع کی گئی، مولانا کی یہ رپورٹ بڑی دلچسپ اور

---

[1] یہ کتاب انجمن کی طرف سے رہنمایانِ ہند کے نام سے شائع ہوئی ہے، ملاحظہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۳ء

پڑھنے کے لائق ہو۔ انجمن کا دوسرا سال بھی کامیاب رہا، اس کے ارکان میں معتد بہ اضافہ ہوا، انجمن مصنفین و مؤلفین کو معاوضہ ادا کرنے کے لئے کچھ رقم چندہ کے طور پر جمع ہوئی، نصاب تعلیم اردو کی طرف بھی انجمن نے توجہ کی، اس وقت حسب ذیل ترجمے یا تالیفات زیر قلم تھے،

۱۔ ترجمۂ ایجوکیشن ہربرٹ اسپنسر،
۲۔ ترجمۂ کان فلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس از ڈریپر،
۳۔ ترجمہ ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل،
۴۔ ترجمہ میکس مولر لکچرز،
۵۔ کتاب النبات،
۶۔ نامۂ دانشوراں،
۷۔ معارف ابن قتیبہ،
۸۔ رہنمایان ہند،
۹۔ القمر،
۱۰۔ تاریخ تمدن انگریزی بکلز ہسٹری آف سویلزیشن،
۱۱۔ سوانحعمری امیر خسرو دہلوی،
۱۲۔ قدیم فارسی،
۱۳۔ سوانحعمری میر انیس،
۱۴۔ طریقۂ حکومت انگریزی،

مولانا گو افکار میں مبتلا تھے اس پر بھی انجمن کا کام نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہا، ۱۱ اپریل ۱۹۰۳ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو جو اس زمانہ میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے وہ لکھتے ہیں: "اردو سکشن کو ۔۔۔ از ہر شروع کرتا ہوں" (۱۰)

پھر ۱۱ مئی ۱۹۰۳ء کو لکھتے ہیں: "انجمن ترقی اردو کی کاپی بھیجتا ہوں، اور کتابیں ۔۔۔ خریداروں کے نام بھیجنا چاہئیں" (۹)

مولانا حمید الدین صاحب نے کراچی سے انجمن کے ممبروں کے نام لکھکر بھیجے، (حمیدہ ۲) پھر ۱،

جون ۱۹۰۳ء کو انھیں لکھا: "اردو نے اب تک جو کام کیا وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ چھپے گا، اس میں دیکھنا، تم بتاؤ کہ عربی زبان سے کونسی کتابیں ترجمہ کے قابل ہیں۔" (حمید ۱)

۱۱ مئی ۱۹۰۳ء کو مشہور انشا پرداز مہدی صاحب افادی کو جو یوپی میں نائب تحصیلدار تھے، یہ لکھ کر بھیجا: "اردو ادب کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے اب اس کے اظہار کا موقع ہے، دستور العمل ارسال ہے جو کچھ ہو سکے کیجئے۔" (مہدی ۱۱)

۲۲ جون ۱۹۰۳ء کو صوبہ بہار میں اردو کے لائق ادیب و شاعر مولوی ریاض حسن خاں صاحب خیال کو لکھا کہ انجمن کے لئے ارکان اعانت بنائیں، اور ساتھ ہی فارسی تذکرۂ علما کی ایک مشہور جدید کتاب "نامۂ دانشوران" کے ترجمہ کے لئے اُن کا انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں انکو لکھا گیا: "آپ کا نام ارکانِ اعانت کی فہرست میں درج کیا گیا، اور مستقل خریداروں کے رجسٹر میں بھی درج کیا گیا۔ آپ کے خط کے آنے سے پہلے دو جگہ سے اطلاع آئی، ایک اور صاحب نے نامۂ دانشوران کا ترجمہ شروع کر دیا ہے، لیکن ابھی دفتر میں نمونہ نہیں آیا، اطلاعاً عرض ہے، نامۂ دانشوران کے ترجمہ میں بعض بعض جگہ ابہام و تفصیل کے لئے اور کتابوں کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا، غالباً آپ نے خود اس کا اندازہ کیا ہوگا، کتاب مذکور مدت تک میرے استعمال میں رہی، لیکن اس وقت پیش نظر نہیں، اس لئے صفحات کی تعداد محض تخمینی لکھ دی گئی، اس کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہو گئی ہے۔" (۲)

اسی صوبہ بہار میں مولوی ابوالکمال دسنوی کو ۲ نومبر ۱۹۰۳ء کو اطلاع دیتے ہیں:- "کتب مشتہرہ میں سے ہربرٹ سپنسر کی کتاب چھپ گئی، اور عنقریب شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں۔"(۱)

یوپی میں اپنے عزیز مولوی محمد سمیع صاحب کو جو جونپور میں محافظ دفتر تھے لکھا، انھوں نے

انجمن کے ممبر اور مستقل خریدار بنائے ۱۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو حیدر آباد سے انھیں مطلع کیا: "قواعد انجمن ترقی اردو میں اب اس قدر ترمیم ہوئی ہے کہ خریداران مستقل ارکانِ اعانت قرار دیئے گئے تم اپنے خریداروں کو بھی مطلع کر دو۔ انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں" (سمیع ۵۰)

جدید علوم کے ترجمہ میں اصطلاحات کی دقت تھی اس کے لئے بالفعل یہ کیا گیا کہ اصطلاحات کو الگ چھپوا کر مترجمین کی خدمت میں بھیجا گیا، ۲۰ جنوری ۱۹۰۴ء کو مولوی ریاض حسن خاں خیال کو لکھتے ہیں: "کیمسٹری کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں بلکہ صرف اصلی الفاظ چھپوا لئے گئے ہیں کہ مترجمین کے پاس الگ الگ جلدیں بھیجی جائیں" (۷۰)

انجمن میں شعرائے اردو کے تذکروں کی اشاعت کی تجویز بھی تھی اپنے دوستوں میں سے نواب سید علی حسن خاں کو لکھا: "انجمن کی طرف سے مصحفی اور میر تقی وغیرہ کے مصنفہ تذکرۃ الشعرا چھپوانا چاہتا ہوں کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے" (علی حسن خاں ۵) یہ تجویز مولوی عبدالحق صاحب کے زمانہ میں زیر عمل آئی۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک اور کام یہ کرنا چاہا کہ اس وقت تک اردو زبان میں کتابوں کا سرمایہ جتنا فراہم ہو چکا ہے اس کی ایک مبسوط فہرست تیار کر لی جائے، اس کام کے لئے پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کا انتخاب کیا جو اس زمانہ میں حیدر آباد ہی میں تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا، مگر وہ ختم ۱۹۲۲ء میں ہوا، اور "فہرست کتب" کے نام سے شائع ہوئی، پروفیسر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں: "۱۹۰۳ء[1] میں جب انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو ایک

[1] اصل کتاب میں ۱۹۱۳ء غلط چھپ گیا ہے۔

تجویز یہ بھی ہوئی تھی کہ ایک فہرست اُن کتابوں کی مرتب کی جائے جو اس وقت تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں تاکہ آئندہ ان سے بہتر کتابیں تصنیف کرائی جائیں، اور اردو کا قدم علم کے میدان میں آگے بڑھایا جائے۔

مولوی شبلی صاحب مرحوم کے ایما سے راقم نے اس کام کو شروع کیا، اور اسی سال اس کا ایک حصہ تیار بھی کر لیا تھا جس کا ذکر مولانا ممدوح نے رپورٹ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۰۴ء میں کیا تھا، تھوڑے دن کے بعد مولوی شبلی صاحب حیدرآباد سے چلے گئے، اور انجمن نے اس کام کی طرف توجہ نہ کی۔

انجمن کا کام شروع تو بڑے جوش و خروش سے کیا گیا، انتہا یہ ہے کہ دفتر میں کوئی دوسرا مددگار بھی نہ تھا، پھر بھی سارا کام مع خط و کتابت کے خود ہی انجام دیتے تھے، ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۰۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- "میں اردو کے قصہ میں بہت عدیم الفرصت ہو گیا ہوں، جو وقت بچتا ہے بالکل خط و کتابت میں صرف ہو جاتا ہے" (حصہ ۲ ص ۲۰) لیکن ایک ہی دو سال کے بعد سنہ ۱۹۰۵ء کے شروع میں مولانا پر دار العلوم ندوہ کی خدمت کا قدیم ذوق اتنا غالب آگیا کہ آخر انجمن کو دوسروں کے حوالہ کر کے خود ندوہ کے آستانہ پر آکر بیٹھ گئے،

حیدرآباد سے استعفا | اوپر کے صفحوں میں یہ بیان آچکا ہے کہ وہ ندوہ کی مستقل خدمت کے لئے کس طرح تیار ہو رہے تھے، اور اب دار العلوم دیکھ کر اور طلبہ سے مل جل کر اپنے عزم کو عمل میں لانے کی سعی کر رہے تھے، اور چاہتے تھے کہ سابقہ منصب بحال ہو کر سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت سے استعفا منظور ہو جائے، چنانچہ سنہ ۱۹۰۴ء کے آخر یا سنہ ۱۹۰۵ء کے شروع ہی میں استعفا پیش کر دیا، مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی کو ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں :- "عزیزی! خط پہنچا، میں نے

چونکہ استعفا دیدیا، اور مدار المہام کے ہاں سے منظور بھی ہوگیا، صرف اعلیٰ حضرت کی منظوری باقی ہے، اس لئے جلد یہاں سے روانگی کا قصد ہے لیکن ابھی تعیین نہیں کہ کہاں جاؤں گا۔ میری صحت کے لئے ضروری ہے کہ چار پانچ مہینے تک صرف سیر و تفریح کروں، میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا، میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا، اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھئے خدا کب جمع کرتا ہے۔

شروع فروری ۱۹۰۵ء میں وہ حیدرآباد سے مستعفی ہوکر وطن چلے آئے۔ ۵ فروری کو اعظم گڈھ سے مولوی سمیع صاحب کو لکھا: "میں مستعفی ہوکر وطن آگیا، اگرچہ مدار المہام کو میرے قیام پر اصرار تھا، لیکن میں نے ملازمت کے تجربے کو اتنا ہی مناسب سمجھا"۔ (سمیع ۵۰)

ملازمت سے علیحدگی کے بعد سو روپئے ماہوار کا اگلا منصب بحال ہوگیا۔

بھوپال کی تحریک

مولانا کے استعفے کی خبر جب بھوپال پہنچی تو ہز ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال نے نواب محسن الملک کے ذریعہ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مولانا بھوپال آجائیں، نواب صاحب نے حسب ذیل خط مولانا کے نام لکھ کر بھیجا: "مولانا! ہز ہائینس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی شبلی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں؟ اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے۔ فرمائیے کیا جواب دیا جائے۔

آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ الندوہ کب نکلے گا، آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضرات علماء کا کیا حال ہے، مدد دیں گے یا فرنٹ ہوجائیں گے؟" (مہدی)

لیکن مولانا اپنے عزم پر قائم رہے۔

طلبۂ دارالعلوم کی خوشی

مولانا کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بیحد خوشی ہوئی، اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا، جلسے کئے گئے، تقریریں کی گئیں، نظمیں لکھی گئیں، خا

نے بھی طلبہ کی ایک انجمن میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا جو زندگی میں فارسی کا پہلا کلام ہے اور آخری بھی، بطور یادگار ذیل میں اسکو جگہ دے کر اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کرنا چاہتا ہوں،

شبلی نعمانی



بدہ ساقی مئے کو بشکند جلباب ظلمانی	خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی
مئے کز جرعہ اش رونق فزاید لفظ و معنی را	دہد تیغ زباں را جوہر تیغ صفاہانی
مپرس افسانہ دارا و اسکندر کہ می بافند	مپرس از دفتر پارین حکمت ہائے یونانی
خرد گم کردہ راہست اندریں رہ کو کری وہم	فلاطونی دریں کشور نباشد جز بنادانی
فسوں سازی چشم نرگسین دل را نمی بازد	کہ مسحورم بہ سحر کلک جادوئے سخندانی
ندارم گوش بر ایں نغمہ سنجیہاے داودی	کہ گوشم ہست با آواز مرغ باغ یزدانی
فدائے آں حدیث رنج و درد باد ہر جانے	کہ جان را زندہ دارد مردہ دل چون آب حیوانی
خدیو کشور معنی کہ فرمانش برد دلہا	چہ دلہا، سکہ بر جاں زد چہ بر قاضی چہ بر دانی
بیا اے قصہ خوان جاہ افریدون و کیخسرو	بہ بیں اینجا کہ درویشے کند در فقر سلطانی
نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیے نہ اورنگے	نمی دارد بجیبش ہیچ اسباب جہانبانی
زمانش سجدہ گاہ قصر و ایوان شہنشاہی	بساطش بوسہ گاہ دانش آموزان یونانی

کمینِ دستارِ او بالاتر از اکلیلِ سلطانی
حصیرِ کلبه‌اش بهتر ز اورنگِ سلیمانی

عصای موسوی کلکش ید بیضاست قرطاسش
سطورِ صفحه‌اش چون جعد بر رخسارِ نورانی

صریرِ خامه‌اش نغمه سرای گلشنِ حکمت
مدادش از پیِ چشمِ ورق کحلِ صفاهانی

سخن گر دیدیش یا گوهرِ شهوار می‌بارد
چنین گوهر نه زنهار آفریده است ابرِ نیسانی

گران‌تر چند اوراقش بود از گنجِ قارونی
نمی ارزد به یک حرفش همه سامانِ ساسانی

سنانِ خامه‌اش کشورکشای معنی و دانش
زبانگِ طبلِ صیتش پُر فضای کونِ امکانی

دلش آرامگاهِ موجِ دریای معانی را
هویدا فکرِ حلِ معضلات از خطِ پیشانی

ضمیرش چون کند غواصیِ جیحونِ مشکل‌ها
برآرد دستِ فکرش صد دُرِ ناسفتهٔ نورانی

کفش با شد تهی از درهم و دینار و اما نش
پُر از دُرِّ معانی و پُر از لعلِ بدخشانی

خجل از حسنِ نثرش عتبانِ مجلهٔ گردون
عرق از دیدِ نظمش بر جبینِ ابرِ نیسانی

دلش نتوان کشیدن منتِ اربابِ نعمت را
که نشتر می‌خورد از همتش اقبالِ سلطانی

بیانش ابرِ باران است می‌بخشد چو می‌بارد
بجوشد شور سرسبزی و سبزه را فراوانی

مسیحا دم باعجازِ قلم جان دگر بخشد
بحکمِ قم باذنِ الله آن تن را که شد فانی

بخواهم از خداوندی که نامش حی و قیوم است
بماند زنده جاوید این شبلیِ نعمانی

نوشتم چون مدیحِ حضرة الاستاد در بر خواندم
ندا آمد مرا از پردهٔ ناموسِ ربانی

دریں فصلِ ممدوحت زمدحِ تو هویدا شد
به پیشِ مور سر زد نی که همنامِ سلیمانی

دار العلوم کی معتمدی

۱۹۰۵ء - ۱۹۱۳ء

مولانا کا نام دار العلوم کے معتمد کی حیثیت سے سب سے پہلی دفعہ ۱۰ ذیحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۶

۱۹۰۳ء کو بمقام شاہجہانپور مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری نے جلسۂ انتظامیہ مین پیش

کیا، اور ارکان نے بالاتفاق منظور کیا اور طے ہوا کہ مولانا شبلی سے درخواست کی جائے کہ

لکھنؤ آکر قیام کرین، مگر وہ ان دنون نہ آسکے تو ۷ رشعبان ۱۳۲۲ھ کو منشی محمد احمد علی صاحب گو...

کا عارضی معتمد و نگران مقرر کیا گیا، اب جب مولانا تشریف لے آئے تو ۱۰ صفر ۱۳۲۳ھ (اپریل

کو باقاعدہ معتمد تعلیم منتخب ہوے، یہ قانونی کارروائی تھی، ورنہ مولانا اس سے چند ماہ پہلے ۱۹۰۵ء کے شروع

مین دار العلوم مین تشریف لے آئے تھے، اور گولہ گنج مین پرانے دار العلوم کی اس عمارت مین جو

جیسا کہ پہلے بتایا گیا، خاتون منزل کے نام سے موسوم ہے اس کی سب سے بالائی منزل پر جو مدرسہ

ایک کمرہ تھا، اور جو پہلے طلبہ کا دار المطالعات تھا قیام فرمایا تھا،

جدید نصاب کا اجراء | دار العلوم کے قائم کرنے کا اصلی مقصد عربی طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم مین ...

کرنا تھا، قدیم نصاب تعلیم مین جو خرابیان تھین مولانا نے اُن پر الندوہ مین بارہا مضامین لکھے

ندوہ کی تقریرون مین اُن کو برملا ظاہر کیا، لیکن ان خرابیون کو اختصار کے ساتھ انھون نے رو...

دار العلوم بابت ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء و ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء و ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء مین لکھا ہے، مولانا کے خیال کے مطابق قدیم

نصاب مین حسب ذیل خرابیان تھین،

(۱) جو علوم مقصود اصلی ہیں اُن کی بہت کم کتابیں درس میں ہیں، اور جو علوم بالواسطہ مقصودُ
ن میں کثرت سے کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً نحو و صرف کی غرض علم ادب اور عربیت کی
ہو لیکن جس قدر وقت نحو و صرف پر صرف کیا جاتا ہو خود علم ادب پر نہیں کیا جاتا، اسی طرح
ن کا حال ہے،

(۲) منطق و فلسفہ کی کتابیں اس ۔ ۔ کثرت سے درس میں ہیں کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ
، تمام علوم کی مجموعی کتابیں بھی مل کر تعداد میں ان کے برابر نہیں ہو سکتیں،

(۳) اکثر کتابیں اس قسم کی ۔۔ ہیں خلط مبحث ہو مثلاً حمد اللہ، میر زاہد، ملا حسن، قاضی وغیرہ
سکے فن میں ہیں لیکن اس میں ۔ ۔ کے مسائل نہایت کثرت سے بھر دیے ہیں جس کا نتیجہ
ہ طالب العلم اصل فن سے محروم رہتا ہو، ان کتابوں کو پڑھ کر فلسفہ آجائے تو آجائے، لیکن
منطق نہیں آسکتی،

(۴) فن تفسیر اس قدر عظیم الشان اور مہتم بالشان فن ہے لیکن اس کی صرف دو کتابیں
ئی جاتی ہیں **جلالین** اور **بیضاوی**، جلالین کے اختصار کا یہ حال ہو کہ اس کے الفاظ
داد قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہے، اور بیضاوی کے ۳۰ پاروں میں سے صرف ڈھائی
ے درس میں ہیں،

(۵) علم عقائد سب سے زیادہ مہتم بالشان علم ہو لیکن اس میں صرف شرح عقائد نسفی پڑھائی
ہے، جو بالکل معمولی درجہ کی کتاب ہو، شرح مواقف میں صرف امور عامہ کی بحث داخلِ
ہو جس کو عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہو،

(۶) اکثر کتابین جو درس مین ہین ان مین مسائل کو اس طرح صاف اور منقح نہین لکھا ہو کہ اصلی مسائل ذہن نشین ہوجائین، ردّ وقدح، اعتراض وجواب، احتمالات اور تعلیلات سے مسائل کو مغلق اور پراگندہ کردیا ہے جس سے طالب علم گویا ایک جال مین پھنس کر رہ جاتا ہو!

(۷) علوم جدیدہ کی کوئی کتاب درس مین داخل نہین،

(۸) انگریزی زبان درس مین داخل نہین،

ان وجوہ کی بنا پر ندوہ نے ابتدا ہی سے اصلاحِ نصاب پر توجہ کی، اور تمام علماے ہندوستان سے مشورہ اور استصواب کیا گیا چنانچہ ا مختلف نصاب پیش ہوے جو چھاپ کر شائع کئے گئے، لیکن یہ تمام نصاب باہم نہایت مختلف تھو، رجب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء مین بمقام امرتسر ایک جلسہ ہوا جس مین اکابر علما شریک تھو اس جلسہ مین چند اصول مرتب کئو ہوے، پھر شوال ۱۳۲۱ھ مطابق جنوری ۱۹۰۴ء بمقام مدراس ایک جلسہ ہوا جس مین یہ طے ہوا کہ اصولِ طے شدہ کے موافق ملا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی، مولوی سید عبدالحی صاحب اور علامہ شبلی نعمانی باہم مل کر ایک نصاب بنائین، چنانچہ وہ نصاب بنایا گیا جس مین جزءِ غالب مولانا کی ترمیمات کا تھا، اس نصاب مین حسبِ ذیل خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا تھا،

(۱) ادب اور فن بلاغت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا، مختصر المعانی کے علاوہ دلائل الاعجاز اعجاز القرآن باقلانی اور نقد الشعر درس مین داخل کی گئین،

(۲) تفسیر بیضاوی کے ۱۵ پارے درس میں داخل کئے گئے، مصر مین اس زمانہ مین ایک نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی جس کا نام الصراط المستقیم ہو اس مین قرآن مجید کی صرف و

انھین جمع کرکے اُن کی مختصر تفسیر لکھی ہو جو فقہ، کلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہین، اس سے خاص قرآن مجید کی منصوص فقہ، کلام اور اخلاق کے مسائل معلوم ہوجاتے ہین، یہ کتاب بھی درس مین داخل کرلی گئی،

(۳) عقائد مین پہلے ابن رشد کی کشف الادلہ اور اقتصاد امام غزالی داخل کی گئی تھین لیکن اب اس کے بجائے امام رازی کی معالم فی اصول الدین رکھی گئی،

(۴) فلسفہ مین ہدیۂ سعیدیہ، شرح حکمۃ العین اور شرح حکمۃ الاشراق داخل کی گئین، اس اخیر کتاب مین اشراقیون کا فلسفہ ہو جس کے متعلق درسِ قدیم مین کوئی کتاب داخل نہ تھی،

(۵) اسرار شریعت مین حجۃ اللہ البالغہ نصاب مین رکھی گئی،

(۶) فلسفۂ جدیدہ مین دروس الاولیہ رکھی گئی، اس مین سائنس کے جدید مسائل ہین، یہ بیروت مین چھپی ہے،

(۷) انگریزی زبان ضروری قرار دی گئی،

نصابِ قدیم مین کسی تغیر اور اصلاح کا گوارا کرنا لوگون کو اس قدر شاق تھا کہ گو یہ نصاب سنہ ۱۹۰۸ء مین منظور ہو چکا تھا، لیکن اس پر عمل نہین ہوتا تھا، مدرسین وہی قدیم کتابین پڑھاتے تھے یہان تک کہ مولانا نے حیدرآباد سے آکر ندوہ مین قیام کیا، اور جبریہ حکم دیا جب جاکر اسکی تعمیل جاری ہوئی، اس پر بھی بعض مدرسین خارج شدہ کتابین پڑھایا کرتے تھے جن کو بڑی سختی سے روکا گیا،

تعلیم انگریزی ایسے علماء جو موجودہ زمانہ مین اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکین، غیر ملکون مین بلکہ خود اپنے ملک مین بھی اسلام کی تبلیغ کے فرض کو ادا کرسکین، معترضینِ اسلام کے جوابات دے سکین، اور نئے تعلیم یافتون کی تشفی کرسکین، بغیر اس کے ممکن نہین کہ وہ انگریزی زبان

سے تھوڑی واقفیت رکھیں، اس خیال کی بنا پر مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی کے
داخل کیے جانے پر بہت زور دیا تھا، اس بدعت کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتے تھے،
انتہا یہ ہے کہ ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ میں مولانا نے جب یہ تحریک پیش کی تو مولانا شروانی کے
روشن ضمیر روشن خیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ڈر سے اس بحث سے اعراض فرمایا، آج
یہ باتیں عجیب معلوم ہوں گی، مگر ۱۸۹۹ء کا حال سنیے، ۱۰ ردسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں
"جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک بحیح
تحریر کی جائے، البتہ اس پر بحث نہیں ہو سکی لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے
مولوی عبدالحی صاحب آپ کی اجازت کے طلبگار ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ آپ اجازت نہ دیں" (شروانی)
اس کے جواب میں مولانا شروانی نے شاید یہ لکھا کہ یہ واقعہ مجھے یاد نہیں آتا، اس پر لکھتے ہیں:
"بات تو کچھ نہیں یعنی مولوی عبدالحی صاحب کی بات جو ہوئی اور آپ کے خارق العادت بھولنے پر تعجب آتا ہے،
یہ امر معمولی حیثیت سے نہیں بلکہ ندوہ کے ساتھ قلم میں آیا تھا جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو
نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی کے ساتھ کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص محرک نہیں،
میں نے کہا کہ میں ہوں اور میرا نام لکھا جائے، مولوی محمد ونیس خاں نے کہا میں تائید کرتا ہوں،
البتہ آپ کی خاطر سے میں نے پھر اس پر بحث نہیں کی، اب بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ میں نے
نائب ناظم سے کہا یا نہیں کہ میرے نام سے یہ تحریک لکھی جائے، اگر میں نے کہا تو انھوں نے لکھی یا نہیں، جو نہیں
لکھی تو کیوں؟ اور لکھی تو اس کے درج کارروائی کرنے سے کیوں انکار ہے، صدر انجمن کو یہ حق البتہ ہے کہ کسی
تحریک کو پیش کیے جانے سے روک دے، یہ حق نہیں کہ یہ بھی کارروائی میں درج نہ ہونے دے، کہ فلاں شخص

نے اس کو پیش کرنا چاہا تھا، پیش کیا،

جلسے کے بعد میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے گرتے ہیں، آپ نے کہا ہماری بدنامی کے ڈر سے، باوجود ان تمام باتوں کے اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیری کا یہ مصرع سمجھ میں آگیا

ع انگ نسیاں آورد خاصیت یادمن است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہوا" (شروانی ۲۲)

شوال ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز دوبارہ پیش ہو کر منظور ہوئی، یہ تجویز اگرچہ بہت سے ارکان کی موجودگی میں منظور ہوئی تھی، لیکن بعض معزز ارکان نے سخت مخالفت کی کہ اگر مدرسہ میں انگریزی پڑھائی گئی تو ہم اس مدرسہ کو توڑ دیں گے، بلکہ ایک صاحب نے جو ندوہ پر ایک جائداد وقف کرنے والے تھے اس کی وجہ سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا[1]، یہ ردوکد ۱۹۰۱ء تک جاری رہی، ۱۵؍ مئی ۱۹۰۱ء کو مولانا شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں، ان کا یہ حال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکل سے مولانا کے پھیلانے کو تجویز پر راضی ہوئے تو علی وزارتین حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں" (شروانی)

بہرحال مولانا اور دوسرے ارکان جو ایمانداری سے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اپنے ارادہ پر قائم رہے، آخر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ایک انگریزی کا ماسٹر مقرر ہو گیا، اور کچھ طالب علموں نے "اے بی سی ڈی" پڑھنی شروع کی، مگر

[1] رودادِ دارالعلوم بابتہ ۱۳۲۵ھ و ۱۳۲۶ھ و ۱۳۲۷ھ مرتبہ مولانا شبلی مرحوم ص ۔

تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی، سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمر سے آگے نہیں بڑھا، سنہ ۱۹۰۵ء
میں جب مولانا معتمد ہوئے تو ان کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء کے ایک جلسہ میں ہر لڑکے کے لئے
انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اور اس کی نگرانی کے لئے مولوی سید ظہور احمد صاحب[1] وکیل
لکھنؤ مجلس دار العلوم کے رکن منتخب ہوئے، لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ
تھا، اس لئے تعلیم کا نقص جاری رہا، سنہ ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ... ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد
کی دنیاوی تعلیم کے لئے منظور کی تو انگریزی اسٹاف ضرورت کے مطابق مقرر ہوا، اور انگریزی
تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی،

انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہو جائے، اس کا
یہ اثر ہوا کہ دار العلوم کے کئی لڑکوں نے انگریزی پڑھ کر مفید علمی اور مذہبی خدمت انجام دی؛
کے اجلاس دہلی میں سید محمد اور عبد المجید نامی دو طالب علموں نے جب ایک مذہبی موضوع
انگریزی میں تقریریں کیں تو ایک عالم کی زبان سے انگریزی تقریر سن کر لوگوں کو اچنبھا ہو گیا، اور
سر شیخ عبد القادر نے جو جلسہ میں موجود تھے ان کی تعریف کی، اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام
مولوی ضیاء الحسن علوی کا لینا چاہئے، جنہوں نے یہاں سے نکل کر میٹرک کیا، اور پھر علی گڈھ
جا کر ایم اے کیا، اور اسی کے بدولت سنہ ۱۹۱۶ء میں ہمارے صوبہ میں دو عربی مدرسوں کے پہلے
انسپکٹر مقرر ہوئے، اور جنہوں نے عربی مدرسوں کی اصلاح و ترقی کے متعلق بہت سی اچھی خدمتیں انجام دیں

[1] مولوی [illegible] صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں حرکت قلب بند ہو جانے سے دفعۃً انتقال کیا، دہلی ان کا وطن
تھا، اقامت لکھنؤ میں تھی، کامیاب وکیل تھے، ایک زمانہ تک میونسپلٹی کے سکریٹری رہے تھے، مرنجان مرنج، خاموش اور نیک
طینت بزرگ تھے، لکھنؤ کے اکثر قومی کاموں میں شریک ہوتے تھے، دار العلوم ندوہ کے رکن کی حیثیت سے وہ بڑے خلوص سے
اس کی خدمت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے،

میری معمولی انگریزی تعلیم ندوہ ہی کی رہین منت ہو، اسی کا فیض ہو کہ مین سنہ ۱۹۱۰ء مین انگریزی اسکولون کی ریڈرون سے صیغۂ اغلاط تاریخی کی رپورٹ پیش کرسکا، ارض القرآن لکھ سکا، اور یورپین مواد سے اپنی تصنیفات مین فائدہ اٹھاسکا، اور سنہ ۱۹۲۰ء مین یورپ مین جاکر کچھ کام کرسکا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے اسی کی بناء پر جدید فلسفہ کی متعدد کتابین ترجمہ کین، اور عقل و نقل پر سورت کی ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈہ کے اجلاس مین وہ رسالہ لکھ کر پیش کیا جو اہل عقل و نقل کے لئے یکسان مرکز توجہ ہو، پھر معجزات کے امکان اور وقوع پر وہ مبسوط رسالہ لکھا جو سیرۃ النبی کے حصۂ سوم کا ایک جزء ہو، اور یورپ کے مشہور فلسفیون ہیوم اور برکلے کی تصنیفات کو اردو مین منتقل کیا، اور دارالترجمۂ حیدرآباد کے لئے جدید نفسیات و اخلاقیات کی ضخیم کتابین اردو مین ترجمہ کین، اور جامعۂ عثمانیہ مین فلسفۂ جدیدہ کے پروفیسر ہوسکے،

مولوی زین العابدین ندوی نے اتنی ہی انگریزی پر یہ ہمت کی کہ وہ امریکہ تک پہنچے، اور سات آٹھ برس وہان رہ کر تبلیغ اسلام کا کام کیا، اور مولوی احمد اللہ صاحب ندوی نے اتنی ہی انگریزی کے سہارے سنہ ۱۹۲۰ء مین لندن تک گئے، اور وہان لوگون کو اردو پڑھا کر چند ماہ گذارے،

پروفیسر مظفر الدین ندوی نے یہان سے نکل کر ایم اے تک تعلیم حاصل کی، اور اس وقت سے انگریزی مین علمی اور مذہبی مضامین لکھ رہے ہین، اور بعض تصنیفات انگریزی مین لکھ کر شائع کین، اور نطشے کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی،

مولوی حاجی معین الدین ندوی ہین جن کی انگریزی تعلیم اس مدرسہ سے آگے نہین بڑھی،

---

[1] افسوس کہ صاحب موصوف نے ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۳۳ء مین پٹنہ مین جہان وہ مدرسہ شمس الہدیٰ مین صدر المدرسین تھے وفات پائی،

پھر بھی انھوں نے انگریزی میں اورینٹل لائبریری پٹنہ کی فہرست کی کئی جلدیں ترتیب دیں، اور اب اسی کام کو مولوی مسعود عالم ندوی کر رہے ہیں جنکی انگریزی تعلیم مدرسہ سے نکلنے کے بعد میٹرک تک ہی ندوہ کے اکثر عالم بقدر ضرورت انگریزی جاننے کی وجہ سے انگریزی اخبار، تار، اور دوسرے معمولی کاروبار میں دوسروں کے محتاج نہیں رہتے،

مولانا کا خیال تھا جس کو انھوں نے اپنی ۱۹۰۶؁ء و ۱۹۱۰؁ء کی روداد میں خود ظاہر کیا ہے کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خالص انگریزی تعلیم کے لئے انگریزی کلاس ایک درجہ تکمیل کھولا جائے، چنانچہ فرماتے ہیں :- "اور جب وہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں تو زباندانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکیں گے، اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے" مگر یہ درجہ اب تک قائم نہ ہو سکا، اور نہ یہ امید پوری ہوئی، ورنہ اس سے اور بھی فوائد ہوتے،

بہر حال مولانا کی جس تحریک کی اتنی پُر زور مخالفت ہوئی وہ بھی بے اثر نہ رہی، آخر بڑے بڑے عربی مدرسوں کو اس کے آگے جھکنا پڑا، اور دیکھا دیکھی ان کے مدرسوں اور طالب علموں کو مجبوراً اس زبان کی تحصیل کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اور آج اسکی مثالیں اکثر عربی مدرسوں میں موجود ہیں، اور یہ بدعت عام ہو چکی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی اس سے اُن کا منشا محض کسی غیر اسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا، بلکہ وہ اُن اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ نادانستہ طور پر عربی کے طالبعلموں میں سرایت کریں گے، اور سچ یہ ہے کہ اُنکا

یہ خطرہ پیدا بھی نہ تھا، اور جو لوگ علماء کے لئے اس زمانہ میں اس کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے ان کے سامنے وہ بیسیون اسلامی مصلحتیں تھیں جو عربی خوان طلبہ کے انگریزی سیکھ لینے سے اُن کو پوری ہوتی نظر آتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ

زبان گر بہر حق جوئی چہ عبرانی چہ سریانی

مگر سوال یہی ہے کہ "بہر حق" ہو،

ہندی اور سنسکرت کی تعلیم مولانا نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں ۱۹۱۰ء میں ایک تیسرا کام یہ کیا کہ دار العلوم میں ہندی اور سنسکرت کا ایک درجہ قائم کیا تاکہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ ان زبانوں کو سیکھ کر آریوں کا مقابلہ کر سکیں، جن کا اس زمانہ میں بڑا زور تھا، اور ہر جگہ وہ اسلام پر بیجا اعتراض کرتے رہتے تھے، مولانا نے اس کے لئے پہلے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو لکھ کر چند وظیفوں کا سامان کیا، اور پھر ایک پنڈت کو نوکر رکھ کر چند طالب علموں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دلائی، اس درجہ میں محمد حسین ساکن اعظم گڈھ اور سید امداد حسین ہوشیارپوری دو طالب علم اچھے تیار ہو گئے تھے، مگر مولانا کے بعد ہی یہ شعبہ ٹوٹ گیا، اور اس سے کچھ کام نہیں لیا جا سکا، حالانکہ ہندوستان میں ہمارے علماء کو اگر کچھ تبلیغی کام کرنا ہے تو اس تجویز کی تعمیل سے چارہ نہیں،

نئی عربی آجکل تمام اسلامی ملکوں میں جو عربی بولی جاتی ہے وہ ہماری قدیم عربی سے بالکل الگ ہے، اس کے علاوہ جو قدیم ادبی زبان لکھی جاتی ہے اس میں زمانہ کی ضرورت سے ہزاروں نئی چیزوں کے لئے نئے عربی الفاظ بن گئے ہیں، جن کے جانے بغیر کوئی شخص عربی اخبار، رسالے اور نئی عربی کتابیں نہیں سمجھ سکتا، مولانا جب مصر و شام کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے

ان الفاظ کا ایک نہایت ہی مختصر فرہنگ لکھا جو ان کے سفرنامہ کے آخر میں لگا ہوا ہے، خاکسار کو چونکہ بچپن سے ادب کا شوق تھا اس لئے دارالعلوم میں اس زمانہ کے جو عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آتے تھے ان کو پڑھا اور ان کے معنی حل کیا کرتا تھا، اسی وجہ سے میں نے طالب علمی میں ایک بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی جس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں جب مولانا شاہ سلیمان صاحب دارالعلوم میں مقیم تھے، نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم دیکھنے کو آئے، میں نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ پڑھا جس کو سنکر انھوں نے فرمایا میں دارالعلوم کی عربی دانی کا قائل اس وقت تک نہیں ہوں گا جب تک یہ نہ جان لوں کہ یہاں کے طالب علم عربی اخبار سمجھ سکتے ہیں؟ چنانچہ المؤید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوایا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے کو کہا گیا، میں نے جب اس کو صحیح پڑھ کر اس کا صحیح مطلب بتا دیا تو نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اس کو دارالعلوم کا خاص امتیاز سمجھا،

اس کامیابی نے مجھے جدید عربی کے سمجھنے اور اس کے مشکلات کے حل کرنے کی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ کر دیا، پھر جب مولانا ۱۹۰۵ء میں ندوہ میں آ کر مقیم ہوئے تو ان کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبار اور رسالے آیا کرتے تھے جن کو میں بالالتزام پڑھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہو گئی،

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۰۸ء میں جب گورنمنٹ نے ندوہ کی امداد منظور کی تو ایک جگہ اس میں جدید عربی کی تعلیم کے لئے بھی مقرر کی گئی اور اس کے لئے میرا انتخاب کیا، اس کے بعد انھوں نے اس کی تکمیل کے لئے مجھے مصر بھی بھیجنا چاہا، مگر اس زمانہ کے مصری سیاسیات کے

کے سبب سے گورنمنٹ نے اجازت نہیں دی، بہرحال جدید عربی زبان کی ایک خاص کرسی ہو جانے کے سبب سے دارالعلوم ہمارے ملک میں سب سے پہلی عربی درسگاہ تھی جس نے اس کو اپنی تعلیم میں ایک مناسب جگہ دی، اور دارالعلوم کے طلبہ نے جدید عربی زبان کے بولنے اور سمجھنے میں بڑی شہرت حاصل کی جو بحمد اللہ کہ آج تک قائم ہے،

جدید عربی الفاظ و اصطلاحات کو عام کرنے کے لئے مولانا کی تجویز کے مطابق میں نے دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو دارالعلوم اور بہت سے دوسرے مدرسوں میں بہت دنوں تک پڑھائے گئے، اور اب بھی کہیں کہیں پڑھائے جاتے ہیں، پھر ۱۹۱۱ء میں ندوہ کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، اور یہ کام خاکسار کے سپرد کیا گیا جس کو میں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری اڈیٹر المنار تھے پیش کیا اور **لغاتِ جدیدہ** کے نام سے وہ چھپ کر شائع ہوا، اور جس نے عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دقتوں کے حل کرنے میں بڑی مدد دی،

یہ سب مولانا کا فیض تھا،

ہونہار طلبہ کی تربیت مولانا نے دارالعلوم میں قدم رکھنے کے ساتھ چند ہونہار طالب علموں کو اپنے گرد جمع کر لیا، ان میں سب سے پہلا نام ہمارے مخلص دوست مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی کاکوروی (رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) کا ہے، مولانا کے پاس مصر و شام کے عربی رسائل، اور جدید تالیفات آتی رہتی تھیں، وہ انھوں نے ہم لوگوں کے حوالہ کیں، اور ان میں کم

بعض مضامین کی تلخیص اور ترجمہ کی ہدایت کی چنانچہ مولوی ضیاء الحسن کو مصر کا مشہور رسالہ "المقتطف" دیا جس میں سے انھوں نے عمر اور صحت کی تدابیر کے مضمون کا ترجمہ کیا جو دسمبر ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں چھپا، مجھے جرجی زیدان کی کتاب "اللغۃ العربیۃ" حوالہ کی اور اسکی تلخیص کی ہدایت فرمائی جس کی تعمیل ہوئی، یہ مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں نکلا، اور پسند خاطر ہوا،

ہماری جماعت کے ایک اور رکن مولوی جواد علی خاں عالی تھے، ان کا مذاق طبع خالص ادبیانہ تھا اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ چل سکے، اور بعد کو خاں عالی کے نام سے نظم میں مضمون لکھتے رہے،

۱۹۰۶ء میں اس جماعت میں ایک اور رکن کا اضافہ ہوا، یہ مولوی عبد السلام صاحب ندوی تھے جن کو تحریر و انشا کا فطری مذاق تھا، ان کے پہلے ہی مضمون تاریخ کو مولانا نے بیحد پسند کیا، اور پانچ روپے انعام دیا اور اصلاح کے بغیر مختصر تمہید کے ساتھ مئی ۱۹۰۶ء کے ندوہ میں شائع کیا،

تقریر کی مشق | علمی مضامین پر طلبہ کی تقریر کی مشق کی طرف بھی مولانا نے خاص طور سے توجہ کی، اونچے درجہ کے اکثر مستعد طلبہ کو باری باری سے اپنے پاس بلواتے تھے، اُن کے لئے ایک ہفتہ پہلے موضوع مقرر کر کے اس پر مطالعہ کے لئے کتابیں بتاتے تھے، طالب علم اس تیاری کے بعد مولانا کے کمرہ میں جا کر مقررہ موضوع پر تقریر کرتے تھے، مولانا موقع بموقع اس میں اصلاح دیتے تھے، طرز تقریر بتاتے تھے، طریقۂ تعبیر سمجھاتے تھے، اور مضمون کو عام فہم بنانے کی طرف خاص طور سے تاکید کرتے تھے، اس درس میں جن طلبہ نے خاص طور سے وقتاً فوقتاً حصہ لیا اُن کے کچھ نام

یاد آگئے ہیں،

۱۔ مولوی عبدالباری بہاری مرحوم،

۲۔ مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم اے)

۳۔ سید سلیمان،

۴۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی،

۵۔ مولوی عبدالسلام صاحب ثانی (ایم اے، ال ال بی اعظم گڈھ)

۶۔ مولوی محمد حسن صاحب، اعظم گڈھ،

۷۔ مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب دسنوی بہاری،

۸۔ خواجہ عبدالواجد صاحب کانپوری (ایم اے)

ان میں سے مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے اپریل ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسۂ ندوہ میں جب کامیاب تقریر کی، تو مولانا نے خوش ہو کر اپنی عبا اُن کو اوڑھا دی تھی،

لائق مدرسین کی فراہمی اچھی تعلیم کے لئے اچھے مدرسین کا مہیا کرنا ضروری ہے، مولانا کے پیش نظر جس قسم کی تعلیم تھی، اس کیلئے معیار کے مطابق اساتذہ مشکل سے ہاتھ آسکتے تھے، تاہم انھوں نے کوشش جاری رکھی اور جہاں کہیں گئے اپنے معیار کے مطابق اشخاص کو تلاش کرتے رہے، انگریزی کے لئے قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے (گورکھپور) کو مقرر کیا، جو اب سالہا سال سے جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کام کر رہے ہیں، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے ڈھاکہ چلے جانے کے بعد فلسفہ اور عقلیات کے لئے مولانا شیر علی صاحب کو لائے جو مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رامپوری

کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان سے مولانا کی ملاقات بمبئی یا حیدرآباد میں ہوئی، اور ایک ہی دو ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے، مولانا شیر علی صاحب مدرسہ میں کئی سال رہے، علما میں ایسے فیاض، شریف اخلاق اور باوقار کم لوگ دیکھنے میں آئے، اُن کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی، مولانا ہی کے زمانہ میں حیدرآباد چلے گئے جو اُن کا وطن ہو چکا تھا، مولانا نے مجوزہ جامعہ علوم شرقیہ حیدرآباد دکن میں اُن کی سفارش کی تھی، جامعہ کھلنے کے بعد وہ وہاں کے شعبۂ دینیات کے صدر ہو گئے، اب چند سال ہوتا ہے کہ انھوں نے وفات پائی، ان کے مدرسہ میں آنے پر مولانا نے شروانی صاحب کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں "دارالعلوم کا رنگ بدلا یا بدل رہا تعلیم کا تھا...... (مولانا شیر علی صاحب) میں کو جیسے زبردستی حیدرآباد سے بلایا ہے عجیب شخص ہیں کہ دو ہی چار دن میں طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سمجھے کہ تعلیم اور فن دانی اسکو کہتے ہیں" (۴۴)

اُن کے چلے جانے کے بعد ۱۹۱۱ء میں شمس العلما مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی کو جو اورینٹل کالج لاہور سے پنشن پا کر علحدہ ہو چکے تھے مدرسہ میں لائے، مفتی صاحب مولانا کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس لئے اُن کی ذہانت اور طباعی کے قائل تھے، مفتی صاحب کئی سال دارالعلوم میں مدرس اعلیٰ رہے، مولانا کی علحدگی بلکہ وفات کے بعد وہ بھی علحدہ ہو گئے،

ادب کی تعلیم کے لئے سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کو دوبارہ دارالعلوم میں آنے کی زحمت دی، وہ تشریف بھی لائے مگر اتفاق دیکھئے کہ وہ یہاں سے اپنا ضروری سامان لانے کے لئے غازی پور گئے جہاں ان کا قیام تھا، وہیں بیمار پڑے اور وفات پا گئے،

اس جگہ کے لئے اب مولانا کی نظر شیخ محمد طیب صاحب عرب کی پڑی جو مولانا فضل حق

خیرآبادی کے شاگرد تھے، اور مدرسۂ عالیہ رامپور میں عمر بھر رہے تھے، مگر ان دنون نواب صاحب رامپور نے اُن کو مدرسہ سے الگ کر دیا تھا، تو موقع پا کر مولانا اُن کو دار العلوم میں لے آئے، وہ معقولات اور ادبیات مین بڑے ماہر تھے اور حافظہ ایسا قوی پایا تھا کہ جو کچھ دیکھا یا پڑھا تھا وہ نوکِ زبان تھا" لیکن وہ مدرسہ مین بہت کم ٹھہرے، نواب صاحب کی ناخوشی دور ہو گئی، تو وہ رامپور واپس چلے گئے،

شیخ حسین صاحب عرب محدث یمنی جو نواب صدیق حسن خان مرحوم کے اور اس عہد کے بہت سے علماء کے شیخ الحدیث تھے، اُن کے صاحبزادہ شیخ محمد صاحب عرب ادب میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اور نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے تھے، ان کو بھوپال سے بلوایا، وہ ایک زمانہ تک یہاں درس دیتے رہے، بعد کو بھوپال گئے اور وہیں وفات پائی،

مولانا محمد شبلی صاحب جیراجپوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب کے شاگرد تھے، اور چشمۂ رحمت غازی پور مین پڑھاتے تھے، مولانا ایک دفعہ غازی پور گئے اور اُن کو پڑھاتے دیکھا تو پسند فرمایا اور ان کو اپنے ساتھ دار العلوم لے آئے، اور یہاں فقہ کی تعلیم اُن کے سپرد فرمائی جس کو وہ اب تک پڑھا رہے ہین، اور اب تک مدرسہ اُن سے فیض اُٹھا رہا ہے؛

درجۂ اعلیٰ اور درجۂ تکمیل

مولانا کی تشریف آوری تک ندوہ مین چھ سال تک تعلیم پہنچ چکی تھی؛ یعنی تین سال ابتدائی کے اور تین سال متوسط کے، اب دو سال درجۂ اعلیٰ کے کھلے یعنی معمولی عربی تعلیم ۸ سال مین پوری ہو گئی، ان آٹھ سالون کی تعلیم کے بعد مولانا نے ارکان کی منظوری سے ۱۹۰۹ء مین تکمیل کا درجہ کھولا، اور حقیقت یہ ہے کہ دار العلوم مین مولانا کے

ز، ز مستعدی کا یہ اہم کارنامہ ہے، اس درجہ سے مقصد یہ تھا کہ طلبہ کسی ایک فن کو دیگر دو برس تک خاص اُس فن کی تعلیم حاصل کر سکیں اور اُس میں کمال پیدا کریں، اس وقت تک تمام ہندوستان میں طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ایک نصاب معین جس میں تمام علوم و فنون اوسط درجہ تک پڑھائے جاتے ہیں سب پڑھتے ہیں، اور مولوی کی سند حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اس کے بعد کوئی شخص کسی ایک خاص فن کو لے کر اس کی تحصیل اس طرح نہیں کرتا کہ اس فن کا کامل بن جائے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک شخص بھی کسی ایک فن کا کامل نہیں پیدا ہوتا، اتفاق سے مدت کے درس و تدریس اور ممارست کے بعد کوئی شخص کسی فن میں ممتاز ہو جائے تو یہ ایک شاذ واقعہ ہے، اس بنا پر دار العلوم ندوہ کی تجویز میں ابتدا ہی سے تکمیل کا درجہ رکھا گیا تھا، لیکن آمدنی کی کمی سے اس کا انتظام نہیں ہو سکا تھا،

جلسۂ انتظامیہ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۶ء میں یہ طے پایا کہ سردست علم کلام اور علم ادب کا درجۂ تکمیل کھول دیا جائے، اور ایک کمیٹی منتخب ہو جو اس درجہ کا نصاب تعلیم مقرر کرے، چنانچہ کمیٹی مذکور نے نصاب تجویز کر کے تمام ہندوستان کے علماء کے پاس بھیجا، اکثر علماء نے رائیں بھیجیں مجلس دار العلوم منعقدہ ۳۰ جون ۱۹۰۶ء میں ان تمام آراء کے اشتمال اور اقتباس سے حسب ذیل نصاب مقرر کیا گیا،

علم کلام

شرح مقاصد علامہ تفتازانی،   تہافۃ امام غزالی و ابن رشد،

کتاب الصفات امام بیہقی، برائے مطالعہ   رسائل اربعہ امام غزالی، برائے مطالعہ

علم کلام

بحث عصمت انبیاء از ملل ونحل علامہ ابن حزم،	برائے مطالعہ	کتب آریہ مثلاً ستیارتھ پرکاش
تلخیص المقال وکشف الادلہ ابن رشد،		وا ظہار الحق، برائے مطالعہ
حدیقۂ فکریہ،	برائے مطالعہ	کتاب الروح ابن القیم "

علم ادب

دیوان امرؤ القیس ونابغہ ذبیانی وعلقمہ فحل	موازنۂ ابی تمام وبحتری،
وعروۃ بن الورد وفرزدق،	عقد الفرید ابن عبد ربہ، برائے مطالعہ
کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری،	مشق نظم ونثر،
واسرار البلاغہ عبد القاہر جرجانی،	

اس کے بعد دوسرے علوم کی تکمیل کے نصاب بھی مقرر کرکے شائع کئے گئے، اور بعض بعض میں طلبہ داخل کئے گئے، تکمیل ادب میں خواجہ عبد الواحد صاحب کانپوری، مفتی محمد یوسف صاحب بیتیاوی مرحوم مدرس دار العلوم مولوی عبد السلام صاحب مصنف دار المصنفین، مولوی قمر الدین صاحب مرحوم اعظم گڈھ، علم کلام میں مولوی شبلی صاحب اعظم گڈھ حال صدر المدرسین مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور تفسیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی حال مہتمم دار المصنفین اعظم گڈھ داخل ہوئے،

تکمیل ادب میں جو طلبہ داخل کئے گئے اُن کو عربی ادب کی نظم ونثر کے علاوہ عربی میں برجستہ تقریر وتحریر کی مشق بھی کرائی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ندوہ کے طلبہ نے عربی تعلیم کے اس

نہ سے نقص کو کہ عربی طالب العلم لکھ پڑھ نہیں سکتے اور نہ بول سکتے ہیں دور کر دیا، اور سارے ہندوستان
مین بلکہ ممالکِ اسلامیہ میں بھی ان کی ادبیت و عربیت کا سکہ بیٹھ گیا جسکی بادشہادتین مل چکی ہیں

علم کلام کا درجہ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں جب کھولا جانے لگا تو مولانا نے شوال ۱۳۲۶ھ مطابق
نومبر ۱۹۰۸ء کے الندوہ مین اپنی تجویز کو ان الفاظ میں ظاہر کیا :- دس برس کے بعد اب وقت آیا کہ
ندوہ کی تعلیم کا جو اصلی مقصد تھا یعنی خاص فنون مین کامل الفن اشخاص پیدا کرنا، اس کی طرف توجہ کی جائے
یہ حیرت کی بات ہو کہ ایک عام نصاب تعلیم جو دو سو برس ہوے قائم کیا گیا اس کے ساتھ یہ کسی کو خیال نہ
آیا کہ خاص خاص فن کے یا خاص علوم ہونے کا بھی نصاب بنایا جائے اور ان کی جداگانہ تعلیم دی جائے
جیسا کہ انگریزی میں ایم اے، اور ایل ایل ڈی کی تعلیم ہو، حالانکہ علوم کی ترقی کی اصلی تدبیر یہی ہے، اس بنا پر
دار العلوم ندوہ مین اس سال یہ شاخ کھول دی گئی اور ابتدا علم کلام سے کی گئی کیونکہ ہر حیثیت سے یہی
علم آج سب سے زیادہ ضروری اور مقدم ہے، علم کلام مین قدما کی تمام کتابین اور جدید تصنیفات، اور
فلسفۂ حال کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے، البتہ یہ افسوس ہو کہ عربی زبان میں ابھی تک فلسفۂ حال کی
معمولی کتابین ترجمہ ہوئی ہیں :

سنہ ۱۹۱۲ء مین تفسیر کا درجہ تکمیل کھولا گیا جس مین تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، کشاف، کتاب
الناسخ والمنسوخ للنحاس، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، اعجاز القرآن باقلانی، تفسیرات
احمدیہ ملا جیون وغیرہ کتابین داخلِ درس کی گئیں، اسی طرح فقہ واصولِ فقہ کا ایک درجہ
قائم ہوا جس مین تحریر ابن ہمام، مسلم الثبوت ملا محب اللہ، معانی الآثار امام طحاوی، بدایۃ المجتہد
قاضی ابن رشد وغیرہ کتابین پڑھائی جانے لگیں،

ندوہ کے درجۂ تکمیل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے ایسے بڑے بڑے مدارس میں جہاں
سرمایہ ممکن ہو اس کی تقلید کی گئی اور اختصاصی کامل الفن علماء کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور
ان میں کتابیں بھی زیادہ وہی رکھی گئیں جو ندوہ میں رکھی گئی تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جامعۂ
نظامیہ حیدرآباد دکن، جامعہ عباسیہ بہاولپور، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے نام ہم کو یاد آگئے، اب
بھی بعض پرانے طرز کے عربی مدارس میں بھی یہ تجویز دوسری شکل میں پیش ہوتی رہتی ہے، چنانچہ
دارالعلوم دیوبند میں بھی اس تجویز پر عمل ہوا اور تفسیر کا درجہ اب کھولا گیا ہے، غرض من سن سنۃ
حسنۃ کی بنا پڑ اُٹھی، اسلامیہ اور علوم عربیہ کو اگر اس سے فائدے پہنچے یا آئندہ پہنچیں تو امید ہے کہ
مجوزِ اول بھی اس کے ثواب سے انشاء اللہ تعالیٰ بہرہ مند ہوگا،

علوم جدیدہ کی تعلیم دارالعلوم کی ایک اور بڑی غرض یہ بھی تھی کہ قدیم منطق و فلسفہ کا بیکار حصہ نکال کر
اس کی جگہ سائنس اور فلسفہ و ریاضیات کے نئے علوم داخل کئے جائیں، اس میں اصلی دقت یہ
تھی کہ ہمارے قدیم علماء ان علوم کو نہیں جانتے تھے اور نئے تعلیم یافتہ ان کو عربی یا اردو
اصطلاحوں میں نہ سمجھا سکتے تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے، اس پر بھی جدید طبیعیات میں بیروت
کی ایک عربی کتاب الدروس الاولیہ فی العلوم الطبیعیہ اور جدید ہیئت میں قسطنطنیہ کی چھپی
ہوئی ہیئت جدیدہ کے ایک فارسی رسالہ کو نصاب میں داخل کیا، اور کوشش کی کہ ندوہ
میں جو ایک دو علماء انگریزی پڑھے ہوئے ہیں ان سے کام لیں، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب
بی اے کو بہ اصرار ان کی تعطیلوں میں بلوا کر ندوہ میں رکھا، اور چند طلبہ کو ان سے الدروس
الاولیہ کے کچھ اسباق پڑھوائے، مگر اس دور میں کتاب پوری نہ ہو سکی، پروفیسر مرزا

۱؎ مکاتیب شبلی، جلد ۲۰-۲۸، ۳۱-۳۲، ۳۴-۳۹

ہادی صاحب رسوا بی اے (پروفیسر عربی، ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ) سے (جو عربی میں عالم ہونے کے ساتھ جدید فلسفہ و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، اور بعد کو جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ میں فلسفہ کے مترجم ہو گئے تھے) درخواست کی کہ وہ مدرسہ کے بعض طلبہ کو جدید ہیئت کا یہ رسالہ پڑھا دیں، چنانچہ انھوں نے اگرچہ چند سبق پڑھائے، مگر یہ ہمارے کا کام چند دنوں سے زیادہ چل نہ سکا،

بہرحال اتنی ہی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ خاکسار سنہ ۱۹۰۶ء کے جلسۂ دستاربندی میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کرسکا، اور الندوہ میں تکوینِ ارض اور مسلمان اور علم ہیئت پر چند نمبر لکھے، اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی نے خواصِ خمسۂ بالخنّس پر الندوہ میں ایک مضمون لکھا،

۱۹۰۶ء میں جب مولانا حمید الدین صاحب مدرسۃ العلوم کراچی سے علی گڑھ کالج میں عربی لکچرر ہوکر آگئے تو مولانا نے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز منظور کرائی کہ ایک طالب العلم کو ندوہ کے خرچ پر علی گڑھ کالج دروس الاولیہ اور ہیئتِ جدیدہ پڑھنے کے لئے بھیجا جائے جہاں وہ آلات کا مشاہدہ بھی کرسکے گا، مولانا حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں:- "مجلس انتظامیہ ندوہ نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ ایک طالب العلم کو وظیفہ دے کر مولوی حمید الدین کے پاس بھیجا جائے کہ وہ اسکو دروس الاولیہ اور ہیئتِ جدیدہ پڑھائیں، اور ممکن ہو تو وہاں آلات سے اس کو تجربہ بھی سکھلایا جائے، اس لئے ایک طالب العلم تمھارے پاس بھیجا جائے گا، تم اس کی صورتِ قیام اور تعلیم و تجربہ سے مطلع کرو، اگر تم اپنے مکان میں جگہ دو تو وظیفہ اس میں محسوب کرسکتے ہو" (حمید ۳۴)

اس تجویز پر عمل بھی ہوا، مگر مولوی حمید الدین صاحب فوراً ہی علی گڑھ سے الہ آباد یونیورسٹی

میں چلے آئے، اس لئے تجویز کامیاب نہ ہو سکی،

قرآن پاک کا درس مولانا کی یہ کوشش اُن کی متعدد تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ نصاب میں قرآن پاک اور علوم القرآن کو درس میں مستقل طور سے داخل کرنا چاہتے تھے، اسی لئے امام باقلانی کی اعجاز القرآن جب مصر سے چھپ کر آئی تو اس کو فوراً درس میں داخل کر دیا، اور قرآن پاک کا درس بھی سبقاً سبقاً داخلِ نصاب کیا، اور ۱۹۰۶ء میں قرآن پاک کے عالمانہ درس کے لئے خود وقت نکالا اور درس شروع کیا، اس میں مدرسہ کے اکثر طلبہ اور بعض مدرسین بھی شریک ہوتے تھے، اس میں ہر مسئلہ پر پوری پوری بحث ہوتی تھی، ۹ اپریل ۱۹۰۶ء میں مجھے بنارس سے لکھتے ہیں: "میں آکر تفسیر کا مستقل درس دوں گا" (سلیمان - ۳۰) یہ اُسی درس کی طرف اشارہ ہے، چند ماہ کے بعد برسات میں حسب دستور مولانا جب بمبئی گئے تو یہ کام دار العلوم کے مدرسِ اعلیٰ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے سپرد کر گئے، میرے استفسار کے جواب میں ۷ راگست ۱۹۰۶ء کو لکھتے ہیں:-

"قرآن کا درس ہو لیکن تحقیق کے ساتھ ہو سرسری بیکار ہے" یہ سلسلہ اس طرح آگے نہ چل سکا، آخر اپنے بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب مصنفِ نظام القرآن کو لکھا کہ وہ اپنی تعطیل میں آکر مدرسے کے لڑکوں کو قرآن پڑھا دیں، چنانچہ وہ دو سال تک اپنی تعطیل میں آکر قرآن پاک کا درس دیتے رہے،

رفیقی مولوی ضیاء الحسن علوی اور مجھے خاص طور سے مولانا نے قرآن پاک کے اصولِ بلاغت پر اسباق بھی پڑھائے رہے، اور املا بھی کراتے رہے، مولوی ضیاء الحسن صاحب نے اس درس کے ان ہی معلومات کو ایک سلسلۂ مضمون میں لکھا جو الندوہ میں چھپا، اور لوگوں نے انکی تعریف کی،

[1] مکاتیب ص ۲۹، ۳۰

اور دستار بندی کے جلسہ میں سنہ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے قرآنِ پاک کی بلاغت پر بھرے جلسہ میں تقریر کی۔

بہرحال دارالعلوم کی خصوصیات میں یہ چیز اب تک باقی ہے، اور قرآنِ پاک کا درس وہاں الحمد للہ کہ اب بھی جاری ہو، اور اس کی تقلید بھی ہوتی جا رہی ہو،

انقلابِ زمانہ: زمانہ کے اتنے پے در پے انقلابات کے بعد آخر ان علماے کرام کو بھی جنکو شروع میں قدیم نصابِ عربی کی اصلاح کی تجویزوں سے اختلاف تھا مولانا کا ہم نوا ہونا پڑا، جمعیۃ العلماء کی اجلاسِ لاہور منعقدہ ۲-۳-۴ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۱ھ میں جناب مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی تائید سے یہ تجویز ہمارے سامنے ہو،

"جمعیۃ العلماء کا یہ اجلاس مدارسِ عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دورِ حاضر کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہو اور مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہو کہ وہ ماہرینِ تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی مشورہ اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو، اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علماے ہند اربابِ علم سے رائے لیکر اپنی صوابدید کے مطابق حتی الوسع جلد کوئی مؤثر عملی اقدام کرے۔"

لیجئے وہی چیز جو کبھی موردِ اعتراض تھی، اتنے دنوں میں جا کر مدح و تحسین بنی، و للہ الحمد۔

ندوہ کا کتب خانہ: تعلیمی مرکزوں کے لئے کتب خانوں کے وجود سے چارہ نہیں، اس لئے دارالعلوم کے ساتھ ساتھ ایک کتب خانہ کا خیال بھی پہلے سے قائم تھا، اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ ندوہ جب کانپور میں تھا اسی وقت سے ایک دارالافتاء کی شاخ بھی قائم تھی، اور اس کے لئے فقہ

کی کچھ کتابیں دفتر میں یکجا تھیں، اس کے بعد دارالعلوم کے قیام کے بعد ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۹ء) میں ندوہ کا سالانہ اجلاس جب شاہجہاں پور میں ہوا تو وہاں کے ایک صاحب علم رئیس ڈپٹی مولوی عبدالرافع خاں صاحب نے اپنا موروثی کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں ندوہ کو عنایت فرمایا، اس کے بعد ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں مولوی عبدالغنی وارثی بہاری (مددگار صدر محاسبی سرکار نظام) نے اپنی کتابیں جو زیادہ تر تاریخ اور محاضرات پر مشتمل تھیں ندوہ کے نذر کردیں، اس زمانہ میں کچھ اور صاحبوں نے اپنے بزرگوں کے علمی سرمایوں کو جو ان کے قابل نہیں رہے تھے یا وہ اب ان کے قابل نہیں رہے تھے، ندوہ کے حوالہ کردیا،

مولانا شبلی مرحوم کی آمد سے پہلے ندوہ کے کتب خانہ کا سرمایہ اسی قدر تھا، مولانا کو کتابوں سے جو شغف تھا وہ بیان کا محتاج نہیں، وہ ۱۹۰۵ء میں جب ندوہ آکر بیٹھے تو دوسرے صیغوں کے علاوہ اس صیغہ کی طرف بھی توجہ فرمائی، سب سے پہلے اپنے کتبخانہ کو جو اعظم گڈھ میں پڑا تھا اور جس کو کبھی تین ہزار روپے میں بضرورت علیحدہ کرنا چاہتے تھے لکھنؤ میں منتقل کرایا، اور ۱۹۰۶ء میں اس کو ندوہ پر وقف کیا، اس کتب خانہ میں تاریخ و ادب کا بڑا سرمایہ تھا، اور مصر و شام و قسطنطنیہ کے مطبوعات کے علاوہ یورپ کے بعض نادر مطبوعات بھی تھے،

مولانا کی تحریک سے مولانا کے بعض دوستوں نے بھی توجہ فرمائی، جون ۱۹۰۶ء میں نواب سکندر نواز جنگ حافظ احمد رضا خان صاحب سکندر (شرل پٹنہ (سابق جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن) نے اپنی کتابیں نذر کیں، ان کتابوں کو پٹنہ سے لانے کا کام خاکسار کے سپرد ہوا جس کو بخوشی انجام دیا، اسی سال شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر حیدرآباد دکن، اور حکیم علی احمد صاحب

نے اپنی کتابیں ندوہ کو دیں، مارچ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ سے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ نے بھی اپنی کتابیں بھیجیں[1]، نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نواسہ سید مرتضیٰ صاحب نے اسی سال اپنے حصہ کی کتابیں ندوہ کے حوالہ کر دیں، نواب عماد جنگ بہادر (حیدرآباد) کا کتبخانہ جس میں مطبوعات یورپ کا اچھا ذخیرہ تھا اسی زمانہ میں ندوہ میں آیا، ۱۹۱۰ء میں اچھی سے مولوی یوسف علی صاحب مرحوم کا کتب خانہ جس میں متعدد نایاب قلمی کتابیں تھیں ندوہ میں شامل ہوا (الندوہ جولائی ۱۹۱۰ء) اسی سال نواب علی حسن خاں صاحب خلف الصدق نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتابیں ندوہ کے نذر کیں، اُن کی ہمشیرہ مرحومہ صفیہ بیگم کے حصہ کی کتابیں اس سے دو ایک سال پہلے ندوہ کے کتب خانہ میں داخل ہو چکی تھیں؛ دلی سے نواب احمد سعید خاں بہادر خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر مرحوم کی کتابیں آئیں، یہ وہی کتب خانہ تھا جس کی مدد سے ایلیٹ نے تاریخ ہند لکھی تھی، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اپنا کتب خانہ جس میں انگریزی اور عربی کتابوں کا بڑا سرمایہ تھا، مارچ ۱۹۱۱ء میں ندوہ کے حوالہ کیا، مولانا نے اُن کو لانے کے لئے مجھے حیدرآباد بھیجا، یہ میرا حیدرآباد کا پہلا سفر اور نواب عماد الملک سے میری ملاقات کا پہلا ذریعہ تھا، میں ایک مہینہ کے قریب مولوی عبد الغنی صاحب وارثی (مددگار صدر محاسب سرکار عالی) کے یہاں مقیم رہا اور روزانہ نواب صاحب کے یہاں جا کر نواب صاحب کے ساتھ مل کر کتابیں الگ کرتا رہا، نواب صاحب مرحوم اپنے ہاتھ سے کتابیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کرتے جاتے تھے اور میں رکھتا جاتا تھا[2]

[1] مکتوبات بنام شروانی (۳۰)، [2] مکتوبات بنام ابو الکلام آزاد (۲۹)

اگر نواب صاحب مرحوم اپنی زندگی میں یہ ذکر جاتے تو عجب نہیں کہ ان کے بعد ان کی کتابوں کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان کے بھائی مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی کتابوں کا ہوا،

عطیات کے علاوہ نئی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، مختلف مدوں سے وہ کتب خانہ کے لئے روپیہ الگ رکھتے تھے، جب کوئی نئی کتاب چھپتی، اور اس کا نام مصری رسالوں اور فہرستوں میں پڑھتے تو مجھے ان کے منگوانے کی ہدایت فرماتے، اور وہ منگوائی جاتی، اس طرح ۱۹۰۹ء تک کتبخانہ میں جو سرمایہ فراہم ہوا تھا اس کی تعداد ۲۰۰۲ تھی، اور ۱۹۱۳ء میں جب وہ ندوہ سے الگ ہوئے ہیں یہ تعداد دونی ہوگئی تھی یعنی ۴۱۰۵، اور اب یہ تعداد بہت بڑھ گئی ہے،

الندوہ

۱۹۰۴ء - ۱۹۱۲ء
۱۳۲۲ھ - ۱۳۳۱ھ

الندوہ کا ذکر اس سے پہلے آجانا چاہئے تھا، کیونکہ اس کا آغاز ۱۹۰۴ء میں ہو چکا تھا، لیکن چونکہ اس کی اشاعت سے ایک بڑی غرض طلبائے دار العلوم کی ذہنی تربیت تھی، اس لئے اسی سلسلہ میں اس کا ذکر اس موقع پر کیا جاتا ہے،

مولانا کو الندوہ یعنی ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک علمی رسالہ کی اشاعت کا خیال ۱۹۰۲ء میں آیا، اس قسم کے علمی رسالوں کا تجربہ ارکان میں مولانا سے زیادہ کسی اور کو

حیاتِ سلیمان ص ۹۰ سے رودادِ دار العلوم مرتبہ مولانا شبلی بابتہ ۱۹۰۹ء ص ۵ سے رودادِ ندوۃ العلماء مرتبہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب ناظم، ربیع الثانی ۱۳۳۰ء ۱۹۱۲ء کے جلسہ عام میں پیش ہوئی ص ۶۶، حسب تصریح مولانا شروانی،

نہ تھا لیکن جب ندوہ کی طرف سے یہ رسالہ نکلنا طے ہوا تو ارکان نے صرف مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو اس کا اڈیٹر بنایا، مولانا کو ارکان کی اس فروگذاشت پر تعجب ہوا، ۲۰ اگست ۱۹۰۲ء کو مولانا شروانی کو شکایت لکھی ہے: "رسالۂ ندوہ اور نصاب تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص ذوق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپنے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لئے علی گڈھ سے بہتر میدان نہیں، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پا جائے" (شروانی ۳۴) یہی شکایت ۲۰ ستمبر ۱۹۰۲ء کے ایک خط میں دوبارہ ہرائی گئی ہے۔

مولانا شروانی اس کوشش میں تھے کہ اپنی ذمہ داری میں وہ مولانا شبلی کو بھی شریک کر لیں، اور اس کے لئے وہ ارکان سے خط و کتابت کر رہے تھے، اس کی نسبت ۸ نومبر ۱۹۰۲ء کو مولانا شبلی نے انھیں لکھا، "رسالہ کے اڈیٹروں میں مولوی محمد علی صاحب (ناظم) غالباً میرا نام پسند نہ کریں، پھر آپ ہمارا بافضول بچہ کاوش کیوں کرتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ میں رسالہ کے لئے موجودہ حالت میں تیار بھی نہیں، ندوہ نے اپنی تجویزوں کے جو نمونے دکھائے یعنی دارالعلوم و دارالافتاء وغیرہ وغیرہ، کیا رسالہ بھی ایسے ہی نمونہ پر نکالنا مقصود ہے، مجھ کو تو ایسے ہی سامان نظر آتے ہیں، علما میں کون صاحب لکھنے کے قابل ہیں؟ اور نہیں تو کیا ندوہ کا رسالہ بھی نیچریوں کی مدد سے نکلیگا، اور وحید الدین[1] و مولوی حبیب علی مرتضیٰ سے دریوزہ گری کیجئے گا، ایک آپ کیا کیا کریں گے؟" (شروانی ۳۵)

اس کمی کو دوسرے ارکان نے بھی محسوس کیا چنانچہ ۱۶ شعبان ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) کے

---

[1] مولوی وحید الدین سلیم معارف علی گڈھ سے نکالتے تھے، اور مولوی حبیب علی صاحب اور مولوی مرتضیٰ صاحب جو اس زمانہ کے مولوی فاضل تھے اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

جلسۂ انتظامیہ میں مولوی عبدالحی صاحب وکیل چندوسی کی تحریک اور منشی محمد اطہر علی صاحب کی تائید سے مولانا ندوہ کے اڈیٹر قرار دیئے گئے۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے آخر میں مولانا نے رسالہ کا ایک خاکہ (مسودہ) بناکر دفتر میں لکھنؤ بھیجا، مگر وہ دفتر ہی میں پڑا رہا، شاہجہاں پور میں ناظم صاحب کے پاس بھیجا نہیں گیا۔ ۳۔۴۔۵ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کو ندوہ کا اجلاس جب مدراس میں ہوا تو ناظم صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس مسودہ کی خبر بھی نہیں ہوئی، تاہم مدراس ہی میں ۱۵ شوال سنہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۴ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازیپوری کی تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے یہ طے ہوا کہ ایک مہینہ کے اندر رسالہ کی درخواست ناظم صاحب کی طرف سے گنہ جائے اور رسالہ کی نگرانی تقسیم وغیرہ دفتر نظامت سے کی جائے۔ اس پر بھی دو ہفتے گذر گئے تو ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء کو شروانی صاحب کو لکھا "میں نے رسالہ کا مسودہ بھیجا، دفتر میں پڑا رہا، ناظم صاحب نے مدراس میں کہا کہ مجھ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی، پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: "ناظم حال رسالہ ندوہ کی درخواست دیتے ہوئے بہت ہچکتے ہیں، ڈر ہے کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں، مشکل یہ ہے کہ ناظم کے سوا اور کوئی شخص درخواست نہیں دے سکتا، اور نہ میں سوا خود درخواست دے چکا ہوں۔"[1]

بہرحال یہ مشکل یوں حل ہوئی کہ مددگار ناظم مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنے نام سے درخواست دی اور وہ منظور ہوئی۔

اس وقت ندوہ کا دفتر سخت انتشار کی حالت میں تھا، ندوہ کے قائم مقام ناظم مولانا

---

[1] مکاتیب، اول۔ شروانی ۳۵۔

مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور تھے، اس لئے مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم ندوہ کا آدھا دفتر لے کر شاہجہاں پور چلے گئے تھے اور آدھا دفتر لکھنؤ میں تھا، بہرحال اسی انتشار کی حالت میں ۱۹۰۴ء کے اواخر میں الندوہ کی اشاعت کے سامان اس طرح مکمل ہوئے کہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم کے قیام شاہجہانپور کے سبب شاہجہاں پور اس کا مقام اشاعت ہوا، رسالہ کے دو اڈیٹر مقرر ہوئے، ایک مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی جو علی گڈھ میں تھے، اور دوسرے مولانا شبلی جن کا قیام ان دنوں حیدرآباد میں تھا، اس کی چھپائی کا انتظام آگرہ میں صوفی محمد علی خاں کے مطبع مفید عام میں ہوا، اور اس کا مقصد جیسا کہ اس کی لوح پر لکھا ہوا تھا علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ قرار پایا، ضخامت ۴ جز یعنی ۳۲ صفحے ٹھہری، اور اس شان سے اگست ۱۹۰۴ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ میں اس کا پہلا نمبر منظر عام پر آیا۔

ہر پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضمون شائع ہوئے جو زیادہ تر مولانا شبلی مرحوم ہی کے قلم سے نکلے تھے، اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی تھی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، منطق و فلسفہ کی بعض درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا، حاشیے لکھنا، تعلیقات لکھنا، غیر مفید مناظرانہ رسائل تالیف کرنا علماء

کے مشاغل تھے، حالانکہ زمانہ کا رُخ ادھر سے اُدھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، "الندوہ" کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور اُن کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور اُن کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ پڑ گئے ہوں لیکن انھوں نے اس کو پڑھا، اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے اُن کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے، اور جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق لکھنے کی کوشش کرنے لگے،

"الندوہ" کا اثر خصوصیت کے ساتھ نوجوان علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر بہت بڑا ہوا، نام نہیں لوں گا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے جانشینوں نے اس کے طرزِ نگارش، اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری، اور اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا،

خود دارالعلوم کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت کے مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستاں میں ہوئی، اور اس طرح اہل علم کی بھری محفل میں اُن کو زباں کشائی کی جرأت ہوئی، چند ہی نمبروں کے بعد اہل نظر کی نگاہیں "الندوہ" کی اس افادی حیثیت پر پڑیں، "الندوہ" میں علم حدیث پر دارالعلوم کے ایک طالب العلم (سید سلیمان بہاری) کا جو مضمون چھپا تھا اُس کو پڑھ کر مولانا حالی نے مولانا کو لکھا: "سب سے زیادہ

اس بات کی خوشی ہو کہ ندوۃ العلماء نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہو، فبارک اللہ فیھا و فی حسنتھا و فی تعلیمھا مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہو کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی۔[1]

اس سلسلہ میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی ایم اے (انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) مولوی عبد السلام صاحب ندوی رفیق دار المصنفین، مولوی خواجہ عبد الواحد صاحب ندوی ایم اے کے علاوہ اور دوسرے طلبہ قابلِ ذکر ہیں، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی، مولوی عبد الرحمٰن نگرامی مرحوم، مولوی قمر الدین ندوی مرحوم وغیرہ بھی اس کے دوسرے دور کی یادگار ہیں،

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے ان میں سے قابلِ ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے:۔ علوم القرآن، فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا: علم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی ترویج کن میں، مسائلِ فقہیہ پر ضروریاتِ زمانہ کا اثر، سوید ابن ابی مجوس، ذو النون مصری، فارسی شاعری اور عرفی شیرازی، مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبد العزیز پر ریویو، جمہرۃ البلاغہ، سوانح امام بخاری اور اُن کی تصنیفات، المرأۃ المسلمہ پر ریویو۔

ان میں گیارہواں مضمون مولانا شروانی کا، پندرہواں دراصل مولانا حمید الدین فراہی کا، سولہواں سید سلیمان بہاری کا اور سترہواں مولانا ابو الکلام کا ہے، باقی سب اپنے وجود میں مولانا کے قلم کے رہینِ منت ہیں،

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

ان کے علاوہ جو مضامین نکلے ان میں، اعجاز القرآن، مسئلہ ارتقا، اور علما سے اسلام، عربی زبان کی خصوصیات، مسئلہ تناسخ، شیخ الاشراق سہروردی، مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ، جرجی زیدان کے تمدن اسلام پر ریویو، الاحتساب فی الاسلام، اشتراکیت اور اسلام، قضا و قدر وغیرہ بیسیوں مضامین ہیں، جو آج بھی ہماری زبان میں معلومات کا سرمایہ اور تحقیقات کا خزانہ ہیں،

الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبد مینا پُرشور ہے، ان میں سب پہلا نام مولانا عبد اللہ العمادی کا ہے، جو جونپور کے ایک گاؤں کے رہنے والے اور ادب میں مولانا عبد الحی آسی مدراسی لکھنوی کے شاگرد ہیں، اور اس زمانہ میں عربی رسالہ البیان لکھنؤ کے اڈیٹر تھے، وہ فارسی و عربی ادبیات و تاریخ سے فطری مناسبت رکھتے تھے، اور مولانا سے لکھنؤ میں اکثر ملتے رہتے تھے، مولانا نے جب ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ آکر قیام کیا اور الندوہ کا دفتر شاہجہاں پور سے لکھنؤ آیا، تو رسالہ مولوی عبد الحی صاحب آسی مدراسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں چھپنے لگا، جہاں سے البیان نکلتا تھا، جون ۱۹۰۵ء سے مولانا عمادی کو الندوہ کی ادارت سپرد ہوئی، اس سلسلہ میں ان کے مضامین، اعجاز القرآن، اور علم مناظرہ وغیرہ نکلے، موصوف یہاں سے نکل کر وکیل امرتسر، زمیندار لاہور، اور الہلال کلکتہ میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اور اب دس بارہ سال سے دار الترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں عربی کے مترجم اور وہاں کے علمی حلقوں کے رکن رکین ہیں،

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر

رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۲ء میں وہ مولانا شبلی
سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا،
مولانا شبلی مرحوم اُن کو اپنے ساتھ ندوہ لائے، اور ایک زمانہ تک اُن کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا،
وہ اُن کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے، اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت
ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انھوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر
کئے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا، اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام
میں بھی سرایت کر گیا، اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا،

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" لکھا جو اکتوبر
۱۹۰۳ء میں چھپا، اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے
مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی
نمبروں میں چھپا ہے، یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں
مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا، اور ہر طرف مولانا شبلی سے اُن کی نسبت استفسار ہونے لگے،
اسی قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں: "آزاد کو تو نے مخزن[1] وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا
قلم وہی ہے معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔" (مہدی ۱۹)

الندوہ میں اُن کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا، اور اخباروں اور رسالوں میں

---

[1] رسالہ مخزن لاہور سے سر شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے نکالتے تھے، مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون
اسی میں نکلتے تھے، خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے،

سے اُن کی جنگ شروع ہوگئی، آخرکار وہ سنہ ۱۹۰۶ء میں "وکیل" امرتسر میں چلے گئے، اور قریباً دو سال
وہاں رہے ہوں گے اسی اثنا میں اُن کے بڑے بھائی مولوی ابو النصر غلام یٰسین صاحب آہ
کا عراق میں جہاں وہ سیر و سیاحت کے لئے گئے ہوئے تھے انتقال ہوا اور اس کے بعد ہی
ان کے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزار ہا مرید تھے وفات پائی،
رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابو الکلام کو بلا کر اپنا جانشین بنایا، اب انھوں نے امرتسر
چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا، اور ہدایت و ارشاد خلق میں مصروف ہوئے، آخر
سنہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے "الہلال" نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات
پر جو اثر ڈالا، اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست
میں کانگریس کی ہمسری جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے،

سنہ ۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابو الکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا
نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھدیا جس کو میں نے مارچ سنہ ۱۹۰۷ء تک انجام دیا،
اس کے بعد اپریل سنہ ۱۹۰۷ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا (سلیمان ۴۴) اور جون و جولائی سنہ ۱۹۰۷ء
کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کردیا گیا، اگست سنہ ۱۹۰۷ء سے فروری سنہ ۱۹۱۰ء
تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا،

اس کے بعد یہ خدمت ہمارے دوست مولوی عبد السلام صاحب ندوی کو حاصل ہوئی
انھوں نے اپنا پہلا مضمون تناسخ پر سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا جس کو دیکھ کر مولانا بیحد خوش ہوئے اور
اس کو الندوہ مئی سنہ ۱۹۰۶ء میں اپنی پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ بہت شوق سے چھاپا، اور یہ تحریر تنقیدی

اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کو اپنے ایک خط میں مہدی افادی کو جو ادب اردو کے دلدادہ تھے ان لفظوں میں پہنچائی: "ہمارے یہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہو جو عنقریب خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا" (مہدی ۲۷)

پھر ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو انہیں لکھا: "عبدالسلام نہایت ہونہار ہو، وہ پورا مصنف ہو سکتا ہو اور ہوگا، انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے، ندوہ اسی قسم کے جوہر کو چمکانے والا ہے" (مہدی ۲۹)

بالآخر زمانہ نے اس پیشین گوئی کو حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا،

مولوی عبدالسلام صاحب نے اس اثنا میں شیخ الاشراق سہروردی اور امام مسلم وغیرہ پر مضامین لکھے اور آخر سنہ ۱۹۰۹ء میں جب وہ پڑھ کر فارغ ہوئے تو الندوہ کی ادارت ان کے حوالہ کر دی گئی جس کو انہوں نے مارچ سنہ ۱۹۱۰ء سے جولائی سنہ ۱۹۱۱ء تک بخوبی انجام دیا، اس کے بعد یہ خدمت اگست سنہ ۱۹۱۱ء سے پھر تیسری دفعہ میرے سپرد ہوئی جس کو میں نے مئی سنہ ۱۹۱۲ء تک پورا کیا، اور اسی پر اس الندوہ کا خاتمہ ہوا جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی تھے، ندوہ کے اختلافات نے اس کا خاتمہ کیا تھا، ندوہ کے دوسرے فریق نے یہ امانت دارالعلوم ندوہ کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کے سپرد کی، جو دارالعلوم کے چند منتہی لڑکوں کی مدد سے اس کو چند مہینے چلاتے رہے، بعد ازیں مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی نے اس کی ادارت کا بوجھ اٹھایا، اور آخر سنہ ۱۹۱۶ء میں وہ بظاہر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا، مگر اب ۲۲ سال کے بعد میں نے بعض ندوی عزیزوں کو اس کی ادارت دے کر جنوری سنہ ۱۹۴۰ء سے دوبارہ نکالنے کا اہتمام کیا ہے، والامر بید اللہ تعالیٰ،

الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کردیا،

۲۔ جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا،

۳۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا،

۴۔ عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا،

۵۔ اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا،

۶۔ قوم میں ندوہ کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اپنے مضمون میں الندوہ کی اہمیت ان لفظوں میں بیان کی ہے: "مولانا کا اہم کام الندوہ مقامیں سے مسلمانوں کے لئے بہت سا مفید تاریخی سامان فراہم کرنا اور اس کے سلسلہ میں مولانا نے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا"۱؎

بھوپال کی امداد

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کی ان خدمات کا تذکرہ تھا جو انھوں نے دارالعلوم کی علمی و تعلیمی ترقیوں کے لئے کیں لیکن ابھی ان کی ان خدمتوں کا تذکرہ باقی ہے جو دارالعلوم کی مالی ترقی اور اس کی تعمیر کے سلسلہ میں انھوں نے فرمائیں، اب تک دارالعلوم کی مستقل آمدنی نہ تھی، سالانہ جلسوں اور سفراء کے دوروں سے جو چندہ وصول ہوتا تھا وہ مدرسہ پر خرچ ہوتا تھا، ریاست حیدرآباد نے نواب وقارالامراء کے عہد وزارت میں نواب وقار نواز جنگ مولوی وحیدالزماں خاں صاحب کی کوشش سے غالباً ۱۳۱۱ھ میں پچاس روپیہ ماہوار مقرر

۱؎ مکاتیب سلیمان ۵

ندوۃ العلماء کے لئے اور پچاس مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ کے لئے مقرر کیا تھا جس کو انھوں نے بکمال ایثار ندوہ کو منتقل کر دیا تھا، یہ سو روپے ماہوار کلیۃً ندوۃ العلماء کے ماہانہ مصارف میں کام آتے تھے،

البتہ ۱۹۰۲ء میں جب ندوہ کا اجلاس پہلی دفعہ امرتسر میں ہوا تو نواب محمد بہاول خاں عباسی فرمانروائے بہاولپور کے سمع مبارک تک ندوہ کی آواز پہنچی، اور انھوں نے اس کی امداد کی طرف توجہ فرمائی، پھر ۱۹۰۳ء میں تین سو سالانہ مدرسہ کے غریب طالب علموں کے وظیفہ کے لئے مقرر فرمائے، دارالعلوم کے لئے یہ پہلی مستقل امداد تھی،

اوائل ۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کے انتظامات کی باگ مولانا نے اپنے ہاتھ میں لی تو ادھر بھی توجہ فرمائی، اور یہ طے ہوا کہ مختلف مقامات میں وفود روانہ کئے جائیں، اور قوم کے رئیسوں کو ندوہ کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولوی غلام محمد صاحب شملوی کو بھوپال و احمد آباد کی طرف روانہ کیا گیا، بھوپال پہنچکر ندوہ کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس کام کے لئے خود مولانا کو تکلیف دی جائے، چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں مولانا خود بھوپال تشریف لے گئے، سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال نے مولانا کو ملاقات کا موقع بخشا، مولانا اس ملاقات سے بیحد متاثر ہوئے، اور اپنے یہ تاثرات ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو قلمبند کر کے الندوہ (اکتوبر ۱۹۰۵ء) میں چھپوائے، اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار عالیہ نے نومبر ۱۹۰۵ء میں مولانا کی موجودگی ہی میں پچاس روپے ماہوار کی امداد جاری فرمائی، مولانا نے تار کے ذریعہ سے جب یہ خبر دارالعلوم میں بھیجی تو ہر طرف عید کی سی خوشی چھا گئی،

[1] الندوہ فروری ۱۹۰۶ء ص ۱۳

[2] الندوہ مارچ ۱۹۰۶ء ص ۱

اجلاس بنارس ۱۹۰۶ء اور پہلی علمی نمائش

مولانا کی معتمدی سے پہلے ندوہ کے بڑے بڑے دس شاندار جلسے بڑے بڑے شہروں میں بلا انقطاع ہو چکے تھے، پچھلا دسواں جلسہ شروع جنوری ۱۹۰۵ء میں مدراس میں ہوا تھا، اس کے بعد باقی ۱۹۰۵ء اور پورا ۱۹۰۶ء جلسوں سے خالی گیا، مولانا دھوم دھام کے جلسوں کے قائل نہ تھے بلکہ اس کے ذریعہ سے کچھ کام چاہتے تھے، سرکار عالیہ کی فیاضی سے جب ندوہ کی پہلی شعاع نظر آچکی تو جلسۂ سالانہ کی فکر ہوئی، اس کے لئے اضلاع مشرقی کے دو شہر گورکھپور اور بنارس نے پیشقدمی کی، مگر کامیابی بنارس کو ہوئی، اور مارچ ۱۹۰۶ء میں بنارس میں ندوہ کے گیارھویں اجلاس کا اعلان ہوا، اس اجلاس میں دو باتیں خاص ذکر کے قابل ہیں، ایک علمی نمائش کا انتظام جس میں شاہی فرامین، قطعات، نادر قلمی نسخے، تصاویر، آلات ہیئت وغیرہ اسلامی علمی یادگاروں کی نمائش کی گئی تھی، اور اس غرض سے دور دور سے قلمی کتابیں اور نادر یادگاریں منگوا کر فراہم کی گئی تھیں، دوسری چیز فارسی شاعری اور بعض دوسرے علوم وفنون کے دواوین اور تصانیف اس طور سے ترتیب کے ساتھ رکھی گئی تھیں کہ بیک نظر اس فن کی ترقی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا، اس نمائش پر تبصرہ کے عنوان سے مولانا نے ایک نہایت عالمانہ اور محققانہ تقریر فرمائی جس میں ان یادگاروں کی اہمیت اور ان علوم کی تاریخی ترقی پر روشنی پڑتی تھی،

علمی حیثیت سے یہ جلسہ بہت کامیاب ہوا، اس علمی نمائش کی روداد خود مولانا کے قلم سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، جس میں اس کی خصوصیات پوری تفصیل سے مذکور ہیں،

اسی جلسہ میں مولانا نے پہلی دفعہ طلبہ سے مجمع عام میں تقریریں کرائیں اور ان کو پیش کرکے آخر

۱؎ اس نمائش کی تفصیل کے لئے دیکھئے الندوہ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۰۶ء ۲؎ مقالات شبلی جلد ہفتم،

میں یہ شعر پڑھا

تحفے برد از دلِ گذر دہ ہر کہ زپیشم — من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

اس جلسہ میں خاکسار نے اور مولوی عبدالباری بہاری مرحوم نے تقریریں کیں، مولوی صاحب مرحوم کی تقریر سب کو بے انتہا پسند آئی، مولانا کا قاعدہ تھا کہ جلسوں میں لڑکوں کو پیش کر کے خود اٹھ جاتے تھے کہ لڑکے مرعوب نہ ہوں، مولوی عبدالباری صاحب کی کامیاب تقریر کی خبر سنی تو خوشی میں خود آئے اور اپنی عبا اُن کو پہنائی، افسوس کہ انھوں نے عین شباب میں انتقال کیا،

بنارس میں بنگلہ کا قیام اور شعر العجم

بنارس کے اجلاس اور علمی نمائش میں فارسی ادب کا پورا سٹ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے کتب خانہ سے منگوایا تھا، یہ ذوق اس وقت اس کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ فارسی شاعری کی تاریخ یعنی شعر العجم کی تالیف میں مصروف ہیں جلسہ کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے ایک دو مہینہ بنارس ہی میں قیام کیا، شہر کے کنارہ پر ایک بنگلہ لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، اور شعراء عجم کی باتوں سے جی بہلاتے تھے: نمائش کی روداد بھی وہیں سے لکھ کر بھیجی، اور اس کے متعلق ہدایات مجھے بنارس سے بھیجتے رہے، جن کا ذکر مکاتیب میں میرے نام کے ابتدائی خطوط میں ہے، ۱۹ اپریل ۱۹۰۶ء کو مجھے ارقام فرمایا: "مجھ کو آنے میں ذرا دیر ہوگی، اب انگریزی پر زیادہ توجہ کرو، میں آکر تفسیر کا مستقل درس دوں گا،" (سلیمان ۳۰)

میں نے جلد واپسی کی تمنا ظاہر کی تو ۲۰ اپریل ۱۹۰۶ء کو ارشاد ہوا "بھائی ابھی دو مہینہ

توشت نے وہ ابھی وہاں نہ ہو تو یہاں بھی میں سب سے الگ رہتا ہوں، ایک جگہ کرایہ پر لے لیا ہو وہیں جا

ہوں لیکن لوگوں کو پتہ نہیں دیتا کہ یہاں بھی رات دن کی بک بک نہ ہو" (سلیمان۔)

اسی زمانہ میں مجھے سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لکھنے کی ہدایت فرمائی اور احادیث

ومسانید کی طرف توجہ دلائی، (سلیمان۔)

واپسی اور قرآن پاک کا درس

کچھ دنوں کے بعد واپس آکر حسب وعدہ قرآنِ پاک کا درس شروع فرمایا، جس میں اوّل تمام طلبہ نے شرکت کی، اور سب نے بقدر استعداد فیض پایا لیکن

آخر میں صرف دو طالب علم رہ گئے، خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب، مولانا گرمی اور لو تو

برداشت کر لیتے تھے مگر برسات کا حبس اور پسینہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اس زمانہ

میں بمبئی میں سمندر کی آب وہوا ان کو پسند تھی، چنانچہ قرآنِ پاک کا درس مولانا حفیظ اللہ صاحب

مدرس اوّل دار العلوم کے سپرد کر کے بمبئی کا سفر کیا،

بمبئی اور دستۂ گل پیش منظر

میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا، اور یہی دستۂ گل کی عطر بیزی اور شام پروری کا زمانہ تھا، دستۂ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم

بہار کے پھول ہیں، "شاہ بمبئی کی ہر ساعت کند دیوانہ" مولانا کو تیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد

آیا تھا، ۱۸ ستمبر ۱۹۰۸ء کو بمبئی سے مہدی افادی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔ "۳۰ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق

ہوا، یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، اپالو بندر عجیب سیر گاہ ہے، اور جو اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے "کنارِ آب چوپاٹی و گلگشت اپالو" اس غزل کا پہلا شعر

ہر سو از ہجوم دلبرانِ شوخ بے پروا — گذشتن از سر رہ مشکل افتادست ریزا

(مہدی ۳۶)

یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ مولانا حالی نے اُن کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا، اور قیاس کیا
فرمایا کہ اس میں چشمِ ساقی کی مستی بھی آمیز ہے، خود شاعر نے بھی اپنے اعترافات کا مغالطہ آمیز موقع

رندے کہ نیز بکامِ دلِ خود ہمی باشم	روزگارے چو دم از دانش و عرفاں زدہ ام
چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوے	سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام
جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود	شیشۂ تقویِ سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
آں شدائے دوست کہ آراستہ پیکرِ فن	نقشِ زیبا صنمے بر ورقِ جاں زدہ ام
آں شدائے دوست کہ در ندوہ ہمی بینی ام	کردم از صحبتِ آں دشمنِ ایماں زدہ ام

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہو وہ غلطی سے اس دشمنِ ایماں کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا، یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے،

یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں، اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں، معاصر شعراء نے جوابی غزلیں لکھیں، جو خوش گمان تھے وہ ان کو تصوف کے رموز و اسرار سمجھے، اور مولانا سے دست بیعت ہونے اور اُن کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں، جو بدگمان تھے وہ اس وصفِ عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے، حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ، بلکہ صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسنِ منظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا، خطوطِ شبلی کے اوراق میں یہ سامان نہیں، اُن کی تاریخ دو برس کے بعد سنہ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوئی ہے، غزل کے منتخب اشعار ہم ذوق دوستوں اور عزیزوں کو لکھ کر بھیجے تھے، ۵ نومبر سنہ ۱۹۰۷ء کو مولانا شروانی کو یہ غزل بھیجی،

گرچہ من رد و ہوسناکی و رندی نیستم	ایں چنیں جرم گناہم اتفاق افتادہ بود

۸ نومبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ سے بمبئی کی ایک غزل کے دو شعر لکھ کر بھیجے، دوسرا شعر ہے:

من فدائے بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال   بہ من آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را

مولانا اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے تو ایک خیالی بات لکھ دی، لکھنؤ کے ایک صاحب کے سامنے جو یہ شعر پڑھا تو کہنے لگے "اس کالج کے پروفیسر یہیں مل سکتے ہیں": (شروانی، ۵۰) یہ میرے سامنے کی بات ہے، لکھنؤ کے جن صاحب کا اشارہ اس میں ہے، ان کا نام تو یاد نہیں رہا، اتنا یاد رہ گیا ہے کہ وہ "زہرِ عشق" کے مصنف مرزا شوق کے نواسے تھے،

فروری ۱۹۰۷ء میں جب مدہوش اور دوش والی پہلی غزل کہی ہے،

ساقیِ مست چو سوئے منِ مدہوش آید   ساغر از کف بنہد میکدہ بر دوش آید

ایں غزل تازہ تر از فیضِ اثرِ بمبئی است   باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید

باش تا شبلیِ آزادہ بہ زیبا صنمے   از درِ صومعہ تا میکدہ ہم دوش آید

تو مولانا شروانی کی فرمائش سے ان کو بھی آخر میں لکھا۔ افسوس یہ ہے کہ ہم صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔" (شروانی ۶۹)

بمبئی میں ندوہ کی تحریک | بمبئی کے اس قیام کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ یہاں کے دولتمند سیٹھوں کو ندوہ کی امداد کی طرف مائل کیا جائے، مگر وہاں بدعات کا جوڑ زور تھا، اور علمائے واعظین نے اس کی مٹی جس طرح خراب کی تھی، اس سے ان کو جرأت نہیں پڑتی تھی، ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں: "بمبئی میں اس دفعہ صرف تنقیح پر اکتفا کیا گیا، وہاں شدت سے یہ خیال پھیلا ہے کہ ندوہ کفر ہے": (حمید ۳۹)

افسوس کہ یہ کفر اب تک نہیں ٹوٹا، مولانا نے جب منبع کی طرف اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ انجمن اسلام ہال میں ندوہ کے اغراض مقاصد پر ایک تقریر کی۔

بڑودہ کا سفر اور مضامین عالمگیر بمبئی کے اس سفر میں، ایک عظیم الشان کام کی بنیاد پڑی، محمد علی مرحوم ([illegible]) جو مولانا کے علی گڈھ کے شاگرد بھی تھے، اس زمانہ میں بڑودہ میں نوکر تھے، ان کے اصرار پر وہ بڑودہ گئے، اور ان ہی کے مکان پر قیام کیا، اسی زمانۂ قیام میں انھوں نے مولانا سے یہ تحریک کی کہ وہ عالمگیر کے الزامات کی تحقیق و جواب میں مفصل مضمون لکھیں، مولانا نے اس کو منظور کیا، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر واپسی کے بعد ۵ دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا، اور اسی مہینہ کے الندوہ میں شائع ہوا، سوا برس کے بعد ۹ نمبروں میں مارچ ۱۹۰۸ء میں یہ سلسلہ ختم ہوا، اور نہایت مقبول ہوا، محمد علی مرحوم اس سلسلۂ مضمون کا انگریزی میں[1] ترجمہ کرنا چاہتے تھے، بلکہ جون ۱۹۰۷ء سے کام بھی شروع کر دینا چاہتے تھے، (عبدالقادر ۳) مگر اپنے ضروری مشاغل کی وجہ سے اخیر تک نہ کر سکے، آخر یہ سعادت ہمارے دوست ڈاکٹر سید محمود کے حصہ میں آئی جنھوں نے مولانا کی اجازت سے ۱۹۰۸ء میں لندن میں جب وہ ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے کام کر رہے تھے، اس کا خلاصہ ترجمہ یا اقتباس شائع کیا، (ابو الکلام ۱۲)

اس سفر کی ایک بڑی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ محمد علی مرحوم نے یہیں اُن سے سیرۃ نبویؐ کی تالیف اور پروفیسر مارگولیوتھ کے جواب لکھنے پر آمادہ کیا، (خطوط محمد علی ص۹)

ڈھاکہ کا سفر دسمبر کے آخر میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں تھا، مولانا بھی تشریف لیگئے،

---

[1] محمد علی مرحوم نے یہ واقعہ خود مجھے لکھ کر بھیجا تھا، خطوط محمد علی شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ کے ص۹ میں خط کا یہ فقرہ ملے گا۔

۲۰ دسمبر کو مرزا شجاعت علی بیگ سفیر ایران کی صدارت میں تاریخ اور اسلام پر لکچر دیا، مولانا جلد واپس آنا چاہتے تھے، مگر خواجہ سلیم اللہ صاحب نواب ڈھاکہ نے روکا کہ ندوہ کے متعلق گفتگو کرنی ہے[1]، چنانچہ جنوری ۱۹۰۸ء کی شروع تاریخوں میں احسن منزل میں جو نواب صاحب کی کوٹھی ہے ایک جلسہ ترتیب پایا جس میں مولانا نے اور جناب شاہ سلیمان صاحب نے ندوہ کے مقاصد پر تقریریں کیں، جناب نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ مارچ ۱۹۰۸ء میں خود لکھنؤ تشریف لائیں گے اور دارالعلوم کا ملاحظہ کریں گے، مگر افسوس کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوا[2]،

مظفر پور کا سفر

مظفر پور میں خان بہادر دیوان مولا بخش مرحوم سی ایس آئی کا ایک پرانا خاندان ہے، جس کا سلسلۂ نسب حضرت امام محمد ملقب بہ تاج فقیہ (فاتح منیر صوبہ بہار) تک منتہی ہوتا ہے، دیوان مولا بخش غدر کے گرد و پیش زمانہ میں کانپور میں سررشتہ دار تھے، شیخ ناسخ، مولوی غلام امام شہید اور قاضی صادق خاں اختر وغیرہ معاصر شعراء سے اُن کا دوستانہ تھا، ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی،

اس خاندان[3] میں علم و دولت کی توام نعمتیں موجود ہیں، اس خاندان کے جانشین مولانا کے زمانہ میں مولوی اعجاز حسن خاں اور مولوی ریاض حسن خاں خیال تھے، اعجاز حسن خاں صاحب کا چار برس ہوئے کہ ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوگیا، اور مولوی ریاض حسن خاں بحمد اللہ آج تک ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ دونوں صاحب مولانا کے خاص دوستوں میں تھے، ڈھاکہ جاتے ہوئے دونوں صاحبوں کا اصرار تھا کہ مولانا مظفر پور تشریف لائیں، یہ وعدہ ڈھاکہ سے واپسی میں

۱؎ مکاتیب ریاض حسن و ۲؎ الندوہ فروری ۱۹۰۸ء ۳؎ اس خاندان کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے معارف ستمبر ۱۹۲۰ء

پورا ہوا، اس سفر کا حال مولانا نے الندوہ میں خود اپنے قلم سے لکھا ہے:- "مولوی ریاض حسن رئیس مظفر پور جو ہمارے قدیم مخلص عنایت فرما اور قومی ضرورتوں کے نبض شناس ہیں، جنوری سنہ ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے ہم کو مظفر پور ٹھہرنے کا موقع ملا، مسٹر محبوب حسن صاحب بیرسٹر ایٹ لا جو مولوی ریاض حسن صاحب کے چچا ہیں، ان کے دولت خانہ پر قیام ہوا، بیرسٹر صاحب باوجود تعلیم جدید اور سفر ولایت کے عقائد مذہبی اور شعائر اسلام میں اس قدر سخت ہیں کہ ہم کو اُن پر ملا سے متعصب ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا، یہاں اور جن تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی سب اسی رنگ میں نظر آئے، چونکہ اس سفر میں مجھ کو ندوہ کی تقریب بھی پیش نظر تھی، اس لئے مولوی ریاض حسن صاحب اور ان کے بھائی اعجاز حسن صاحب نے جلسہ کا اہتمام کیا، کثرت سے لوگ شریک ہوئے، میں نے اسلام کی حقیقت اور اس کے ضمن میں ندوہ کی ضرورت پر ایک مفصل تقریر کی، تقریر کے بعد چندہ ہوا، اور پانچ سو سے زیادہ نقد جمع ہو گیا، مسٹر محبوب حسن صاحب، مولوی ریاض حسن صاحب نے سو سو کی رقمیں عنایت کیں، ایک وکیل نے کوئی تعیین نہیں کی، لیکن ان کی عام قدیمی عادت کی بنا پر لوگوں نے قیاس بلکہ یقین کیا کہ وہ بھی ایک معتد بہ رقم عنایت فرمائیں گے، چندہ کی پوری تفصیل علحدہ شائع ہوگی، یہ تمام رقم سرمایۂ محفوظہ کی مد میں جمع ہوئی۔"

اس سفر سے واپسی کے بعد دار العلوم کے جلسۂ عطائے سند کی تیاریاں شروع ہو گئیں،

مارچ سنہ ۱۹۰۸ء
جلسۂ عطائے سند

دار العلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گذر چکے تھے مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے نہیں ہوا تھا، اسی غرض سے مارچ سنہ ۱۹۰۸ء مطابق محرم سنہ ۱۳۲۶ھ میں رفاہ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسۂ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب

فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی،

مولانا نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں مجھی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (دائم آ رجسٹرار و انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر، اور راقم نے علوم جدید و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور سامعین کو آئینۂ حیرت بنا دیا، یعنی راقم کی تقریر کے اثناء میں کسی نے یہ کہا کہ اگر یہ تقریر بلی میں کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کر سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے، اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا، تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں

---

[1] مرحوم نور محل ضلع جالندھر کے باشندہ تھے، ندوہ کے قدیم ہمدردوں اور کارکنوں میں سے تھے [2] یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے بے اختیار نوک قلم پر آ گیا، اگر ناظرین کو اس میں خودستائی کی بو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں،

تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے،

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، اور جلسہ میں موجود تھے، انھوں نے موضوع یہ مقرر کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے، ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے طرۂ افتخار بن گیا،

مولانا نے خود اس واقعہ کی اطلاع اپنے دوست مولانا شروانی کو ان لفظوں میں دی: "آپ کے نہ آنے کا سخت صدمہ ہوا، آپ ارکان اصلی ندوہ میں ہیں، آپ کی عدم شرکت کا دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے، اور لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں، بہر حال مقصد میں یہی تھا، اگرچہ شاہ سلیمان صاحب وغیرہ نہیں آئے لیکن جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی زبان میں تقریر کروں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محو حیرت تھا، اور آخر لوگوں نے نعرہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی۔" (شروانی ص ۵۰)

یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا،

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے روداد جلسۂ دستار بندی سنہ ۱۹۰۶ء ص ۹۶،

اس جلسہ میں مولانا نے دارالعلوم کے مقاصد پر ایک مدلل تقریر فرمائی، اور ساتھ ہی اپنے امرت سمر والے فارسی قصیدہ ع ماندہ ایم کہ اورنگ سلیمان داریم کو اس دردناک ترنم سے پڑھا کہ دل ہل گئے، اسی سماں میں مولانا نے لکھنؤ کے تعلیم یافتہ گروہ کی طرف خطاب کرکے، ان کو ندوہ کی امداد پر آمادہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم، مولوی نسیم صاحب ایڈووکیٹ مولوی ظہور احمد صاحب وکیل وغیرہم نے ندوہ کی امداد کا وعدہ کیا، اور یہ لوگ ندوہ کے ارکان میں داخل ہوئے، ان کی ذات سے ندوہ کو بہت فائدہ پہنچا، آخرالذکر دونوں صاحب آج تک ہمدردِ ارکانِ انتظامیہ ہیں، سرگرمِ خدمت ہیں، مولانا شروانی کے نام اسی خط میں مولانا لکھتے ہیں

"مجمع نہایت کثرت سے ہوا، اور بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ بیرسٹر اور تمام ایجوکیٹڈ نے کہا کہ ہم لوگوں کو اب علانیہ ندوہ میں شرکت کرنی چاہئے، لہذا آئندہ اتوار کو ایک خاص جلسہ رفاہِ عام میں ہو جس میں ہم ایجوکیٹیڈ لوگ درباب ندوہ جمع ہوں، اور مشورہ و غور کیا جائے کہ ندوہ کو کیونکر ترقی دینی چاہئے، اور کس طرح اس کو ہم لوگ اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں"

اسی جلسہ میں ایک رات کو مولانا نے "اسلام اور بے تعصبی" پر ایسی دلآویز تقریر فرمائی کہ در و دیوار رقص میں تھے، علمائے معاصرین بہت کم ایک دوسرے کو داد دیتے ہیں، لیکن اس جلسہ کے بعد مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرسِ اعلیٰ دارالعلوم جو خود ایک عالم متبحر تھے، فرماتے تھے۔ "اس تقریر کو سن کر جی چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پھوڑ لوں کیونکہ جو مولوی شبلی نے پڑھا وہی میں نے بھی پڑھا پھر وہ کیوں ایسی تقریر کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتا۔"

پاؤں کا حادثہ

۱۷ مئی سنہ ۱۹۰۷ء

ان دنوں مختلف جلسوں کی شرکت اور آمد و رفت کی وجہ سے شعرالعجم کی تصنیف میں بہت کچھ خلل آگیا تھا، اس لئے مولانا نے چاہا کہ وطن (اعظم گڈھ) جاکر چند مہینے بہ اطمینان رہیں اور اس کمی کو پورا کریں، چنانچہ اعظم گڈھ پہنچنے کے چند روز بعد ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۰۷ء کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع نواب علی حسن خان کو دی، (۵) اسی زمانہ میں اعظم گڈھ میں ایک اسلامی انجمن کا بھی جلسہ تھا، اس میں بھی شرکت مقصود تھی، بہرحال مارچ کے آخر میں اعظم گڈھ آئے اور حسب معمول شبلی منزل میں قیام فرمایا،

اس زمانہ میں شعرالعجم جلد اوّل کے اوراق زیر تصنیف تھے، سترہ مئی سنہ ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہالؔ میں تشریف لے گئے، جو ان دنوں زنانخانہ میں شامل تھا، یہاں تخت بچھے تھے، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے، اس بنگلہ میں باغ بھی تھا جس میں پھلیاں لگی تھیں، اور کوّے آکر ان کو نقصان پہنچاتے تھے، مولانا کے اکلوتے صاحبزادہ حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لئے بندوق میں چھرّوں کے کارتوس بھر کر رکھے تھے اور اس کو ہال ہی میں چھوڑ گئے تھے مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی

لہ اس ہال میں اب دارالمصنفین کا کتب خانہ ہے،

متعلق ہیں، ان کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں، اُن کو یہ کہہ کر دی کہ یہ عورتوں کو توڑنی نہیں سکتی؛ اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہو گئی، جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا، گھر میں کہرام برپا ہو گیا، لیکن مولانا کو کچھ احساس نہیں ہوا، اتنا معلوم ہوا کہ پاؤں میں جھٹکا لگا، وہ دوسروں سے پوچھتے تھے، کیا ہوا خیر ہے؟

اب حادثہ کی تفصیل خود مولانا کی زبان سے سنیئے ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیان

حادثہ کی تفصیل مولانا کی زبانی — ایک اتفاقی تقریب میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں آیا تھا، اور ارادہ تھا کہ مہینے دو مہینے یہاں قیام کروں گا، شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے، اور شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا، شروع مئی سنہ ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ گھر میں گیا، اندر تخت بچھے ہوئے تھے، میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا، تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی میں نے ہاتھ میں اٹھائی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دیدی، اتفاق سے گھوڑا گر گیا، بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی، بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا، کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا اس نے ٹخنہ کی ہڈی بالکل چور چور ہو گئی، اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اسی وقت میں نے گھبرا کر کہا کہ یہ کیا ہوا؟ فوراً شور سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے، اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، اور پاؤں جوتے میں تھے، ایک شخص نے آکر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں نے جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی، میں نے پاؤں اوپر اٹھایا، اور نوکروں سے کہا اس پر پانی ڈالو، پانی جب ڈالا جا

تھا تو پاؤں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا، قریباً پاؤ گھنٹہ تک میں پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا، جب تھک گیا
دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب تکیہ لاکر میرا پاؤں اس پر رکھ دو، آدمی نے رو کر کہا کہ کیا چیز اب
جو رکھی جائے گی، مجھ کو اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ میری ایڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی
وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتداء میں ایک فوری نظر کے سوا متعلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی، اور جو کچھ میں نے
پاؤں کے متعلق حالات بیان کئے ہیں وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں،

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا، نوکر اور ماما وغیرہ تھیں، یہ لوگ سخت زار و قطار
روتے تھے، اور میں ان کو منع کرتا تھا، قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا، اور زخم کو دیکھتے
ہی چیخ اٹھا، اور بہت بیقراری کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری
ہو گئی، میں نے نوکروں سے کہا اس کے منہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکاؤ، اس سے اس کو ہوش آگیا

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی جنید، سول سرجن اور اسسٹنٹ سول سرجن کو ساتھ
لے کر آئے، بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا
اور خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں جس سے
خون رک جاتا، بہر حال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دیئے، جس سے خون
رک گیا، اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پاؤں جڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال
ڈالئے، ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں، غرض بیہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل جراحی
شروع کیا گیا، چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں اس لئے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی، اور ہرزہ
گردی کی سزا دی گئی، عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا، اور خون

کے ٹانکے اور رگوں کی کچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی، آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے، تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟ ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہو کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی، بہت چلا پھرا دوڑا، دھوپا، ملا، جلا آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا ع

گر نستانی بستم می رسد

خدائے بے نیاز کا شکر گذار احباب واعزہ کا منت پذیر ہوں، بچ گیا تو پھر کسی نہ کسی طرح دوستوں کو دیکھ لوں گا، ورنہ ان شاء اللہ تعالیٰ اب دوسرے عالم میں ملاقات ہوگی، والسلام

دسویں دن ٹانکے کھولے گئے، ایک ٹانکے میں مواد آگیا، اس وجہ سے سوزش اور ٹیک کی سخت تکلیف ہے، ۱۰ مئی ۱۹۰۷ء تک یہ حالت ہے۔

احباب و معتقدین کا اضطراب

جس وقت یہ خبر ندوہ پہنچی ہے، طلبہ میں سراسیمگی پھیل گئی، تار سے خیریت منگوائی، اخبارات کی مختصر اطلاع نے احباب اور معتقدین میں عجیب پریشانی پیدا کی، خصوصاً احباب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، مولانا سید عبدالحی صاحب، نواب سید علی حسن خاں، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور مولوی اعجاز حسن خاں صاحب اور دوسرے احباب فوراً عیادت کو آئے، طلبہ میں سب سے پہلے خاکسار اور ہم درس مولوی جواد علی خاں ۳۰ مئی کو اعظم گڈھ پہنچے، ہم دونوں دو روز یہاں ٹھہرے، یہیں بیٹھ کر خاکسار نے اخبارات کو حادثہ کی مفصل

اطلاع بھیجی، دریافتِ حال کے لئے احباب اور معتقدین کے خطوط اور تار برابر آ رہے تھے، ۵ مئی کو مولانا نے خاکسار کو بٹھا کر حادثہ کی پوری تفصیلات لکھوائیں، یعنی وہ بولتے جاتے تھے اور خاکسار لکھتا جاتا تھا، اور یہی خط چھپوا کر دوستوں کی خدمت میں بھیج دیا، اور یہ وہی خط ہے جو ابھی اوپر نقل ہوا،

گو اس خط میں حادثہ کی پوری تفصیل موجود ہے، مگر راقم نے مولانا کی زبان سے جو بعض ایسے واقعے سنے جو اس خط میں نہیں اور جن کو یہاں سے واپس جا کر ندوہ میں لکھا وہ اس موقع پر لکھنے کے قابل ہے،

مولانا اس دن شعر العجم میں فردوسی کے شاہنامہ پر تبصرہ لکھ رہے تھے، اور اس کو اتفاق کہئے یا فالِ بد کہ اس تبصرہ کو اس شعر پر ختم کیا تھا۔

بریدو دریدو شکست و بہ بست
یلاں راسرو سینہ و پا و دست

اور اس کے بعد ہی زنانخانہ میں تشریف لے گئے، اور یہ حادثہ پیش آیا، مولانا کو اس وقت پورا احساس نہیں تھا کہ کیا ہوا، جب وقت سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن آئے ہیں، تو مسکرا کر فرمایا کہ اگر پاؤں بگڑ جائے تو خیر ورنہ سر سے الگ کر دیا جائے،

ڈاکٹر نے جب عملِ جراحی کے لئے بیہوشی کی دوا پلائی ہے تو اس وقت ایک نادر واقعہ پیش آیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز دماغوں کی قوت اور حواس کی جمعیت بھی ممتاز ہوتی ہے،

لہ اپریل ۱۹۰۷ء دیہ خبر تفصیل کے ساتھ شائع ہوا تھا، اسی نے مئی کا واقعہ اپریل کے پرچے میں لکھا ہوا [illegible] تہ شعر العجم جلد اول، صفحہ ۲۲۲ میں زیر مثال صنائع و بدائع یہ شعر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اس حادثہ کے وقت یہی صفحہ زیر قلم تھا، مولانا نے اس واقعہ کو شعر العجم جلد اول کے مقدمہ میں صفحہ ۳ پر خود بھی ذکر فرمایا ہے،

قاعدہ ہے کہ بیہوشی کی دوا پلا کر مریض کو گنتے کو کہا جاتا ہے، عموماً لوگ پچاس سے ساٹھ تک گنتے گنتے بیہوش ہو جاتے ہیں، مگر مولانا نے اس ضعف اور ناقابلِ برداشت صدمہ پر بھی ستاونٹے تک گنا، اور اس کے بعد بیہوش ہوئے،

ٹانکے دیتے وقت دو ٹانکوں کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی کہ اگر گرمی کی وجہ سے کچھ مادہ فاسد جمع ہو جائے گا تو اس راہ سے نکال دیا جائے گا، مگر الحمد للہ کہ زخم رو بہ صحت تھا، اور مادۂ فاسد نہیں جمع ہوا، صرف ان ہی دو ٹانکوں کی جگہ میں کچھ مواد آگیا تھا،

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دو ہفتہ میں زخم خشک ہو جائے گا، مگر افسوس کہ تیسرے ہفتہ تک زخم مندمل نہیں ہوا، مواد آتا رہا، اور زخم میں درد، ٹیک اور ٹیس ایسی تھی جس سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور بےچینی تھی[1]، ۸ جون کو ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔ "زخم کی حالت دس بارہ دن تک اچھی تھی، لیکن بعد کو ریم آنے لگی، اور اب تک آتی ہے، اسسٹنٹ سرجن روزانہ آتا ہے، اور دن میں دو بار زخم دھویا جاتا ہے، لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں، تکلیف گو سخت ہو لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا رونا، فَصَبْرٌ جَمِيلٌ" (۹۳)

مولانا تین مہینے اپنے وطن میں بستر علالت پر پڑے رہے، اسی سبب سے مضمون عالمگیر کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، وہ چند ماہ رکا رہا، لیکن شعر العجم کی تصنیف باوجود درد اور تکلیف کے تین چار ہفتوں کے بعد شروع ہو گئی[2]،

راقم نے جولائی میں لکھنؤ تشریف لانے کی خواہش کی، تو ۲۲ جولائی کو اپنے قلم سے جواب لکھا،

---

[1] الندوہ اپریل ۱۹۰۷ء [2] مقدمہ شعر العجم حصہ اول صفحہ ۲،

کہ وہاں حسبِ دستورِ سابق کوٹھے پر میں رہوں تو پھر اترنا چڑھنا مشکل ہوگا۔ (سلیمان ۵۱)

ان ہی دنوں (۳۰ جولائی ۱۹۱۰ء) کی اطلاع ہے: کہ نواب محسن الملک نے علی گڈھ سے لکھا کہ وہ یہاں آجائیں یہاں کے ڈاکٹر مفت علاج کریں گے، مگر وہ وہاں نہیں گئے، اور بمبئی کا قصد کیا، (سلیمان ۵۰) اس سخت تکلیف کی حالت میں بھی مولانا شروانی سے علمی نسخوں پر خط وکتابت ہو رہی ہے، (شروانی ۹۳)

اگست کے شروع میں مولانا لکھنؤ آئے، ڈاکٹر عبد الرحیم صاحب نے جو مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی کے داماد تھے، اور لکھنؤ میں شاہی اسپتال میں ڈاکٹر تھے ایک مرہم بنا کر دیا، مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، اسی زمانہ میں مولانا نے مولوی حمید الدین صاحب کو جس خط میں اپنے یہ حالات لکھے ہیں، ان کو ندوہ آکر طلبہ کو قرآن پاک کا درس، اور سائنس میں دروس الاولیہ پڑھانے کی خواہش کی، (حمید ۲۹) جس کو مولوی صاحب نے منظور کیا،

مولانا نے اس کے بعد بمبئی کا سفر کیا، اور وہاں لکڑی کا ایک مصنوعی پاؤں بنوا کر استعمال کیا، یہ پاؤں اچھا نہیں بنا جبنی بھاری تھا، بمبئی سے حیدرآباد کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے جو اُن دنوں سپہ سالارِ عساکر آصفی تھے، سرکاری کارخانہ سے اپنے زیر اہتمام ایک دوسرا پاؤں بنوا کر پیش کیا جو زیادہ آرام دہ اور ہلکا تھا،

حادثہ کی شاعرانہ تعلیل حادثہ جو ہونا تھا ہو گیا، مگر بقول مولانا شروانی علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے: اس حادثہ نے علم ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کر دیا، مولانا حالی مرحوم، نواب محسن علی خاں مرحوم، خواجہ عزیز الدین مرحوم اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، مولوی

عبدالسلام صاحب اور خاکسار نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں مولانا نے یہ تمام رباعیاں راقم کو عنایت فرمائیں، اور راقم نے مناسب سمجھا کہ دوسرے عزیزوں کو بھی حسنِ تعلیل کے اس تسلی نامہ میں شریک کرے، اس لئے اُن کو ستمبر اور اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا گیا،

(مولانا حالی)

شبلی کہ گزند پاش بر دل شکن است | با خستگیش خجستگی مقترن است
چندانکہ بکاہد فزاید نہ عجب | "کار حسنِ چمن زبیر استن است"[1]

(نواب سید علی حسن خاں مرحوم)

شبلی ترے قوم پر بہت احساں ہیں | باتیں تری، درد قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر | اس ایک قدم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

(خواجہ عزیز الدین مرحوم)

اے پایۂ تو بلند تر از افلاک | پایت چو بریدہ شد چہ حیثی غمناک
زیرا قدمت بلندی و پستی ہست | پائے بفلک داری و پائے بر خاک

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے اس حادثہ پر متعدد رباعیاں لکھیں، اور خوب خوب توجیہیں کیں،

[1] مولانا حالی کا یہ چوتھا مصرع عنصری کی رباعی کا ٹکڑا ہے، واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمود نے مستی میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں، جب سلطان کو ہوش آیا تو اس کی خوبصورت زلفوں کے کٹ جانے سے نہایت غمگین ہوا، اس پر دربار کے شاعروں نے شاعرانہ حسنِ تعلیل سے سلطان کا دل بہلانا چاہا، اسی سلسلہ میں عنصری نے یہ رباعی کہی، کہتے ہیں کہ اس کے سنتے ہی سلطان خوش ہو گیا، اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا،

اے ذاتِ تو در علم و عمل گشتہ علم
والا متعزز ز وجودِ پاکت عالم

یک پائے تو چوں شد بعدم دانستم
داری دو جہاں ہمہ در پا زیرِ قدم

اے آنکہ تو اہلِ قوم را الجائی
حق داد ترا بہ ملکِ فن دارائی

چوں نیست کسے ہمسرِ تو در پایہ
بس پائے ترا ہمی سزد یکتائی

صد حیف ہوا شکستہ پائے شبلی
اب سلسلۂ سفر بھی مفقود ہوا

مشتاقِ زیارت جو ہو خود آئے یہاں
رہبر جو تھا اب کعبۂ مقصود ہوا!

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا
ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا

باقی تھا فقط فخرِ شہادت ملنا
اک پاؤں کو اس سے بھی سرفراز کیا

اُن کی ایک رباعی الندوہ میں نہیں، خاکسار کے نام خط ۱۲ میں ہے۔ لکھتے ہیں:- ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا، کہتے ہیں:-

کیا اس سے بھی ہوگی کوئی ساعت منحوس
زخمی ہوا جبکہ پائے شبلی افسوس

اک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا آگے
تھا اہلِ فنا کو اشتیاقِ پابوس

خود مولانا نے بھی اس حادثہ پر کئی قطعے کہیں،

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہے دشوار
اس پر بھی خدا کا شکر ہے احساں ہے

یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جب منزل تک
یاں سے سفرِ عدم بس اب آساں ہے

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے
آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے

ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی
گو پاؤں کٹے قدم برجا تھے

مقبول نہیں ہو بے نوائی میری	تو وہ نخوت بے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی	ناقص ہو ابھی بے سروپائی میری

—— • ——

حالت از گردشِ ایام اگر گشت بتر	صبر فرما کہ ازیں نیز بتر می بایست
شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش	پا بریدند و صد خاست کہ سر می بایست

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل نے ان قطعوں کے جواب میں عرض کیا،

کیجئے نہ غمِ شکستِ پا مولانا !	اس میں بھی تھی حکمتِ خدائے دانا
تھی اہلِ عدم کو آرزوئے پابوس	اک پاؤں وہاں بھی جا بجز تھا جانا

اور مولانا کے پہلے قطعہ کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا،

شکستہ پائی تو تھی سرنوشت میں حضرتؒ	نہ ہاتھ آئیگا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہو منزل جا سکینگے حضورؒ	چلے گا قوم کا کام آپکے نہ چلنے سے

ہمارے دوست مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے بھی جن کی سخن سنجی مسلّم ہے ایک رباعی لکھکر پیش کی تھی جس کا اخیر مصرع یاد ہے،

"ہمت کا قدم زمیں میں اب گاڑ چکے"

خاکسار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا جس کو اوب یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا، اسی مہینہ میں موازنۂ انیس و دبیر شائع ہوئی تھی، اسی کو پیشِ نظر رکھ کر کہا تھا،

تنقیدِ مراثی کے صلہ میں اُستاد	دربارِ حسینیؓ نے سعادت بخشی
بہ سر سے ابھی کام تھا لینا باقی	اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

اعظم گڈھ سے چلتے وقت معذرت کے چند عربی شعر لکھکر چپکے سے مولانا کے سرھانے رکھکر
اُلٹے پاؤں واپس پھرا، مولانا ہر چند پکارتے رہے مگر میں شرم سے سامنے نہ جا سکا، اس
نظم میں دیر سے پہنچنے پر عفوِ تقصیر کی درخواست تھی، مطلع تھا،

دع اعترفْ منك بحرَ الفضل والحكما   واقتبسْ منك شمسَ العلمِ والعلما
مجھے فضل و حکمت کے سمندر چلو بھر بھر کے پانی پینے دو   اور اے علم اور علماء کے آفتاب مجھے تجھ سے روشنی حاصل کرنے دے

دوسرا عربی قصیدہ صحت کی خوشی میں کہا، مگر اس کو بھی پیش نہیں کیا، بلکہ اس کے چند اشعار
الندوہ دسمبر ۱۹۰۹ء کے ایک مضمون میں جسکا عنوان علمائے سلف اور کتب بینی ہے،
چھاپ دیئے کہ وہ نظرِ اشرف سے گذر جائیں، ع گفتہ آید در حدیث دیگراں،

عاد الربیعُ لروضی بعد مَا ذهبا   وعمّر الله ربعی بعد ما خربا
میرے چمن میں بہار جا کر پھر آگئی   اور خدا نے میری گھر کو ویرانی کے بعد پھر آباد کر دیا
وازینت الارض خضراً بعد ما يبست   والبرق عاد سناه بعد ما احتجبا
زمین خشک ہو کر پھر سرسبز ہو گئی   اور بجلی کی چمک چھپ کر پھر نکلی
وفجّر العلم عيناً بعد ما نضبا   واشرق الفضل شمساً بعد مَا غربا
اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا   اور علم و فضل کا آفتاب ڈوب کے پھر نکل آیا
یا من سماحتُه عمّت بصائرنا   اعطیت ما فاق ابهى اللآلی والذهبا
اے وہ جسکی بخشش ہماری بصیرتوں کو چھا گئی   تو نے جو دیا وہ زر و جواہر سے بھی بڑھ کر ہے
اذا مرضتَ فكلّ الناسِ قد مرضوا   والعلم والفضلُ نالا مثلهم نصبا

جب تو بیمار ہوا تو سب لوگ بیمار ہو گئے　　اور علم و فضل نے بھی اُن ہی کی طرح تکلیف اٹھائی

واذ برئت فکلّ الناس قد برئوا　　والعلم والفضل ماسا مثلهم طربا

اور جب تو اچھا ہوا تو سب لوگ اچھے ہوگئے　　اور علم و فضل بھی خوشی سے جھومنے لگے

ما رجلك انفصلت الا لهمّتها　　عن ارضنا بعدت تستصغر الرُّبا

تیرا پاؤں جدا نہیں ہوا، بلکہ اپنی ہمت کی بلندی سے ٹیلوں کو چھوٹا سمجھ کر ہماری زمین سے دور ہو گیا

رجلٌ بها جُزتَ کم من سبسبٍ قرِقٍ　　فی الفضل مرتغباً للعلم مُطّلبا

وہ پاؤں جس سے تو نے کتنے صحرا اور بیابان طے کیے　　فضل کی خواہش اور علم کی تلاش میں

بها وطاءت بلادَ الترک مغترباً　　واجتزت مصر وبیت القدس والعربا

وہ پاؤں جس سے تو نے ترکوں کے ملک کا سفر کیا　　اور مصر و بیت المقدس اور عرب کو قطع کیا

لها تخرّ جباهُ العلم ساجدةً　　اذ کعبها کعبةٌ للعلم لا کذبا

وہ پاؤں جس کے سامنے علم کی پیشانیاں جھکتی ہیں　　کیونکہ اس کا کعب (ٹخنہ) بے شبہ علم کا کعبہ ہے

نلتَ العلٰی وسبقتَ القومَ قاطبةً　　وان همُ شارکوك سیّدی نسبا

تو نے بلندی کا درجہ پایا اور سب سے آگے بڑھ گیا　　اگرچہ وہ سب نسب شمس العلماء میں تیرے برابر ہیں

کلُّ النجوم وان قیلت لها شهب　　لکنّما الشمس فاقت هذه الشُّهبا

سارے ستاروں کو اگرچہ روشن کہتے ہیں　　لیکن آفتاب ان تمام روشن اجرام میں سب سے بڑھ کر ہے

اذا اسبکرّ علیك اللیلُ حالکُه　　مضی وانت تراعی الصُّحفَ والکُتُبا

جب تجھ پر تاریک رات دراز ہونے لگتی ہے　　تو تو کتابوں اور صحیفوں کو دیکھتے ہوئے گزار دیتا ہے

جادت یمینک بالاسعاد من قلمٍ — بہ غدنی دُرّۃٌ ما کان مختلبا

تیرے ہاتھ نے تصنیفات کی سخاوت ایک قلم کی — جس سے کوڑی بھی رتبہ پاکر موتی بن گئے

ان تمام نظموں میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی کی فارسی مثنوی ہے، جس میں مولانا نے بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ ۴۰ برس کے بعد ان کے خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ مثنوی بھی اُن کے صاحبزادہ مولوی محمد یمین صاحب کیفی سے ہاتھ آئی، اور اس وقت یہ تبرک دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، مثنوی اسی زمانہ میں الندوہ میں بھی چھپ چکی ہے، فرماتے ہیں:

اے دل افروز شمع علم و ہنر — نور چشم جان و جانِ پدر

پدرِ انتساب علم و کمال — از نسب نامہ عز و جلال

بر تو از آسماں گزند مباد — چو رہ ہر ستم پسند مباد

چشم زخم زمانہ دور از تو — باد ہر بزم پُر ز نور از تو

من شنیدم کہ اندریں پرکار — گشتی از دست روزگار زنگار

آفت ناگہاں رسید بہ پائے — پائے آں رہرو جہاں پیمائے

بہ خدائے کہ دست صبر و بلا — کہ نیارم شنیدنش اصلا

بودہ ام در تعب ز روزے چند — من در اینجا بہ حاجتے پابند

کہ بہ من گفت رہرو عاجل — کاے ز اخبار این و آں غافل

تیرے از چرخ خود پسند رسید — شبلی ات را بہ پا گزند رسید

این خبر چوں بگوشِ من برسید ۔۔۔ تابِ شنفتنش ز من برمید

آدرخ آں پائے راہ پیمائے ۔۔۔ بسوئے طیبہ گام فرسائے

ہم بہ مصر و شام و روم برید ۔۔۔ حیف از ساقِ خود جدا گردید

دل بجوش آمدم بہ نوحہ گری ۔۔۔ یاد چوں آید از نوردِ سپری

رہ نوردی برائے کسبِ ہنر ۔۔۔ نے پئے از فخار بدرۂ زر

گرچہ پائے تو دید بیش گزند ۔۔۔ صبرِ تو نیز پایہ داشت بلند

گرچہ شد خوں از و رواں بزمیں ۔۔۔ یک چنیت گشتہ گرد جبیں

گرچہ پایت ز ساق گشتہ جدا ۔۔۔ یک صبرت چو کوہ پا برجا

اے خداوند واہبِ اعمار ۔۔۔ دائمش بہرہ و سعادت دار

حکایات و لطائف اس حادثہ کے بعد مولانا اپنے مصنوعی پاؤں پر عجیب عجیب دل خوش کن فقرے کہکر دل بہلاتے تھے، مارچ سنہ ۱۹۱۵ء میں جب مشرقی یونیورسٹی کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد گئے تو نواب افسر الملک بہادر نے ان کے لئے لکڑی کا ہلکا سا جو پاؤں بنوایا تھا، کارخانہ سے اس کو لینے کے لئے مولانا اور نواب افسر الملک بہادر خود گئے، نواب صاحب پاؤں ہاتھ میں لئے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا،

"پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے"

حسنِ اتفاق سے اسی روز نواب صاحب کو "سر" کا خطاب ملا تھا، مولانا نے کہا کہ "آپ نے مجھ کو پاؤں دیا، تو خدا نے آپ کو سر دیا۔"

۱۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو ایک خط میں اپنے پاؤں بننے کی خبر دیتے ہیں تو لکھتے ہیں: "پاؤں بن گیا، آمد تو نہیں آورد ہے، رفتہ رفتہ شاید ترقی ہو" (۱۵)

میر اکبر حسین صاحب (رج) سے اُن کے تعلقات علی گڑھ کے ابتدائی زمانہ سے تھے، میر صاحب قانون کے استاد تھے۔ الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا نے کہا کہ میر صاحب! میں آپ کی تلاش قافیہ کا جب قائل ہوں جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں، میر صاحب نے ہنس کر فرمایا: "دیکھئے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں" بات ہنسی میں ختم ہوگئی، ایک دو روز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ نومبر ۱۹۱۰ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ اُن کے پاس بھیجا، جس میں لکھا تھا:-

آتا نہیں مجھ کو قبلا قبلی ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

مل جائے یہاں جو دال دلیا سمجھو تم اُسے پلاؤ قلیا

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا،

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور رہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ زرا پھرتا تھا اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ ورنہ شبلی جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

ایک دن فرمایا کہ بھائی میں، استدلالی، متکلم، تھا، مولانا روم چھ سو برس پہلے کہہ گئے تھے کہ میرا پاؤں کٹے گا، اور لکڑی کا پاؤں بنے گا،

پاسے استد لالیاں چوبیں بود   پاسے چوبیں سخت بے تمکیں بود

ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں ساتھ تھا، فرمانے لگے: "میاں، پہلے گفتار وکردار نقلی تھا، اب رفتار بھی نقلی ہے۔"

ایک دفعہ کا لطیفہ میں بھول نہیں سکتا ہوں، اور مولانا ۱۹۱۳ء میں بمبئی میں تھے، مولانا مجھے ساتھ لے کر کھانے کے لیے ایک ریسٹوران میں گئے، کھانے کے اثنا میں خانساماں سے فرمایا کہ "پون لاؤ" مجھے تعجب ہوا کہ پاؤں تو مولانا لگائے ہیں، یہ پھر پاؤں کیسا مانگتے ہیں، مڑ کر دیکھا تو خانساماں پاؤ روٹی کے ٹکڑے لا رہا ہے، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کو پون کہتے ہیں۔ (پاؤ روٹی کی اصل یہی ہے، پون پرتگالی میں روٹی کو کہتے ہیں)

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "ایک بار علی گڈھ کالج میں لکچر دینے، وقت مقررہ کے بعد تشریف لائے، تو عذر تاخیر بیان فرما کر کہا: "یہ عذر عذر لنگ نہ خیال فرمایا جائے"۔

اس طرح اس حادثہ نے ادب میں خاصہ لطیف اضافہ کر دیا تھا،

مسجد کانپور کے واقعہ کے سلسلہ میں مولانا نے ایک قطعہ میں اس کو مینڈکی کو زکام کا مضمون بنادیا ہے، مسلمان قیدیوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں،

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہو دشوار   ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں

پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ   یعنی افسوس ہیں زنجیر کے قابل ہی نہیں

صحت کے بعد بمبئی و حیدرآباد کا سفر

اوپر یہ گذر چکا ہے کہ جولائی ۱۹۱۰ء کے آخر تک وہ علی گڈھ رہے، اگست کے شروع میں وہ لکھنؤ آئے، لکھنؤ سے بمبئی گئے، اور بمبئی سے حیدرآباد پہنچے،

جہاں مشرقی یونیورسٹی کی کیفیت تھی جس کی تفصیل آگے آئے گی، وہ ان سفروں میں اب بھی اور جاتے مگر اس وقت ندوہ سے سرکاری تعلقات کی بات چیت چھڑی ہوئی تھی، اس لئے وہ لکھنؤ واپس آگئے۔

ندوہ کے سرکاری تعلقات کا آغاز

سنہ ۱۹۰۸ء ندوہ کی تاریخ اور مولانا کی معتمدی کے زمانہ کا نہایت اہم سال ہے، اسی سال ندوۃ العلماء کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو سیاسی بدگمانیاں تھیں وہ دور ہوئیں، اگرچہ جناب منشی محمد اطہر علی صاحب لکھنؤ، نواب محسن الملک بہادر اور جسٹس سید شرف الدین صاحب پٹنہ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کے لئے پوری کوشش کی، مگر اس میں کامیابی کا وقت مولانا شبلی مرحوم کی معتمدی کے زمانہ میں آیا، اور اس کی صورت بھی نئی پیدا ہوئی، ریاست پٹیالہ گو پنجاب میں ہے، مگر سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ریاست مذکور نے جو فوجی خدمتیں انجام دیں ان کے صلہ میں ریاست مذکور کو اودھ میں بھی ایک اچھا خاصا علاقہ ملا ہے، اس زمانہ میں ریاست مذکور کے فارن منسٹر کرنل عبدالمجید خاں ایک باثر با رسوخ اور حکومت انگریزی کے مستند وفادار تھے، اور ریاست کے تعلقات کی بناء پر حکام اودھ سے بھی کافی راہ ورسم رکھتے تھے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی کوششوں سے کرنل صاحب موصوف کو ندوہ سے دلچسپی پیدا ہوئی، اور مولانا سے ملاقات کا اتفاق ہوا، اس ملاقات نے خلوص کا درجہ حاصل کیا، کرنل صاحب جب لکھنؤ آئے تو حکام سے مل کر ندوہ کے باب میں ان کے خیالات کے پلٹنے میں کامیاب ہوئے۔ (مکاتیب شروانی ۔۔)

سرکاری امداد

اسی اثنا میں منشی شبیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹر ایٹ لاء میں گدیہ دوبارہ بنگی

اودھ) جن کو ندوہ سے شروع ہی سے دلچسپی تھی۔ جنوری ۱۹۱۰ء کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف (لکھنؤ) میں حکومت کو دارالعلوم ندوہ کی امداد کی طرف توجہ دلائی، اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد ۱۸ جنوری ۱۹۱۰ء کو کیلانوس صاحب ڈائرکٹر کی طرف سے منشی صاحب موصوف کے پاس ایک مراسلہ آیا کہ کیا ندوہ باقاعدہ گورنمنٹ سے کسی قسم کی امداد کی درخواست بھیج سکتا ہے، اس وقت مولانا لکھنؤ میں نہ تھے، میں نے اس مراسلہ کی اطلاع دی، مجھے لکھا "پروفیسر آرنلڈ کے جواب میں ندوہ کی طرف سے یہ کیوں نہ لکھا جائے کہ ہم دونوں طرح کی مدد چاہتے ہیں، مالی بھی اور علمی بھی، خیر اس کے متعلق قدوائی صاحب کو لکھوں گا" (سلیمان ۱۰)

اس سلسلہ میں طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۰ء کو گورنمنٹ نے باضابطہ پانچسو روپے ماہوار کی امداد منظور کرنے کی اطلاع دی اور یہ وعدہ کیا کہ سرکاری محکمہ مدرسے کے

لہ منشی مشیر حسین قدوائی مرحوم بیرسٹر ایٹ لا، یہ ضلع بارہ بنکی اودھ کے مسلمان تعلقہ داروں میں تھے، ان کو ندوہ اور قومی کاموں سے شروع ہی سے دلچسپی تھی، وہ ۱۹۰۶ء کے قریب زمانہ میں تھوڑی سی انگریزی تعلیم کے بعد لندن چلے گئے تھے، اور وہاں بیرسٹری حاصل کی، اور ساتھ انگریزی تحریر و تصنیف کی مشق بہم پہنچائی، اور انجمن و اسلام کی عالمگیر تحریک میں شامل ہو گئے، ۱۹۱۰ء کے قریب وہ ہندوستان سے واپس آئے اور یہ حیثیت ندوہ اور دوسرے قومی کاموں میں دلچسپی لی، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران میں وہ لندن ہی میں تھے، اور تقریباً ۱۹۲۰ء تک رہے، ۱۹۲۰ء کے شروع میں واپس آئے، ترکوں سے اور تحریک خلافت سے ان کو بڑی عقیدت تھی، وہ ایک طرف مولانا محمد علی صاحب جوہر مرحوم کے ذریعہ سے قوم کو اور دوسری طرف ہز ہائینس آغا خاں کے ذریعہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کے معاملات کو سدھارنے اور خصوصاً ترکوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے، زندگی اور بہت ہوشیار تھے، ان کے تعلقات تھے، وہ کانگریس کی جمعیت میں بھی اسی زمانہ میں چند سال رہے ہو تھے، اور اسلام کے متعلق بہت سے مضامین اور کتابیں لکھیں، ان کی آخری کتاب "اسلام اور بالشوزم" ہے، وہ قلب کے مریض تھے، آخری بیماری میں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۷ء میں وفات پائی، سلہ اس خط کے شائع جنوری ۱۹۱۰ء کا ہے، مولانا کے لکھنؤ آنے کی ہو ۱۹۱۰ء داخل کیا گیا، ابتداء سنہ میں کثرت علمی ناواقفیت ہو جاتی ہے، مدرسہ کی یہ امداد ۱۹۱۰ء کے

نصاب اور اصول میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کریگی، اور اس امداد کا روپیہ ادب عربی اور انگریزی
وریاضی وغیرہ مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم میں خرچ ہوگا،

غیر مذہبی علوم کے لئے اس نئی امداد حاصل ہونے پر انگریزی اور ریاضی کا اسٹاف بڑھایا گیا
اور عربی علم ادب میں جدید عربی کی تعلیم کے لئے خاکسار جدید عربی کا معلم، اور ان دونوں ایک پروفیسر
مقرر کیا گیا، اور بعض اضافے اور ترقیاں ہوئیں،

نئی امدادیں اب مدرسہ کے مذہبی علوم کی تعلیم کی ترقی و توسیع کے لئے مزید کوشش کی ضرورت
محسوس ہوئی، چنانچہ اس غرض سے مولانا نے پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بہار کے بعض شہروں کا
دورہ کیا اور متعدد امدادیں حاصل کیں، صوبہ سرحد کے دورہ میں مولانا کے ساتھ جناب شاہ سلیمان
صاحب پھلواری بھی شریک تھے،

وظائف سنسکرت اور ہندی پڑھنے کے لئے جو طلبہ تیار ہوتے تھے، ان کے لئے وظیفوں کا الگ
انتظام کیا، اور ہمیشہ اپنے دوستوں سے وظائف کی مد میں اعانت کی درخواست کرتے رہتے تھے

سرمایہ محفوظ ابھی تک ندوہ میں کوئی مستقل محفوظ سرمایہ نہ تھا، بلکہ یہ قاعدہ تھا کہ جو آتا تھا وہ خرچ
کردیا جاتا تھا، مولانا نے ۱۹۰۵ء ۱۳۲۳ھ میں یہ تحریک کی کہ بنک میں ریزرو فنڈ کے نام سے ندوہ کی
الگ حساب کھولا جائے، پھر ۱۹۰۶ء میں بنارس کے جلسہ میں یہ تحریک پیش ہوکر منظور ہوئی
اور اس کے لئے بارہ ہزار کے چندہ کا اعلان ہوا، مگر اس میں سے وصول کم ہوا، ۱۹۰۶ء کی روداد
میں اس مد کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، خیال آتا ہے کہ مولانا کے آخر زمانہ میں اس مد میں
پندرہ ہزار کے قریب جمع ہوگیا تھا،

[illegible]

تعمیر کی فکر مدرسہ اب تک گولہ گنج کی ایک گلی میں ایک پرانے قسم کے مکان میں تھا، جو پہلے ایک ہندو رئیس کا تھا اور ندوہ نے نو ہزار روپیہ میں اس کو خرید تھا، اسی میں ایک ہال ناظم شیخ بہاؤ الدین صاحب وزیر جوناگڈھ کی ایک ہزار روپیے کی فیاضی سے بن گیا تھا، کچھ ادھر ادھر کمرے حسب ضرورت بنوائے گئے تھے، مولانا کی نظر میں قسطنطنیہ کے دار العلوم اور علی گڈھ کا مدرسۃ العلوم تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ یہ مذہبی درسگاہ ہماری دنیاوی درسگاہوں سے ظاہری حیثیت میں بھی کسی طرح کم نہ ہو سنہ ۱۹۰۸ء میں مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں: "ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو ابھرنے نہیں دیتی، اس لئے ہر طرف سے ہٹ کر اب ادھر توجہ کرنی پڑی، اسی بنا پر کلکتہ کا سفر بھی ہے، ایک معقول شاہی عمارت بہت ارزاں لکھنؤ میں مل رہی ہے، خیال ہے اسی کو لے لیا جائے" (۸)

لیکن یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اسی دھن میں سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک اپیل لکھوا کر چھپوائی جس میں مدرسہ کی عمارت کا تخمینہ پچاس ہزار کیا تھا، اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایسے پچاس بزرگ جو ایک ایک ہزار دیکر ہمت کریں، یہ اپیل مولوی غلام محمد صاحب شملوی مرحوم ریاست بہاولپور میں لے کر گئے، تو حاتم دوران جد ماجد اعلیحضرت نواب صاحب بہاولپور نے فرمایا: پچاس شخصوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، یہ پوری رقم میرے گنج کے خزانہ سے دے دی جائے،

یہ خبر تار کے ذریعہ سے جب مولانا کو پہنچی ہے تو ان کی خوشی کا عجیب عالم تھا، اس دن تمام مدرسہ میں طلبہ و اساتذہ خوشی و مسرت سے بغلگیر ہو رہے تھے، اور اسی خوشی میں انھوں نے

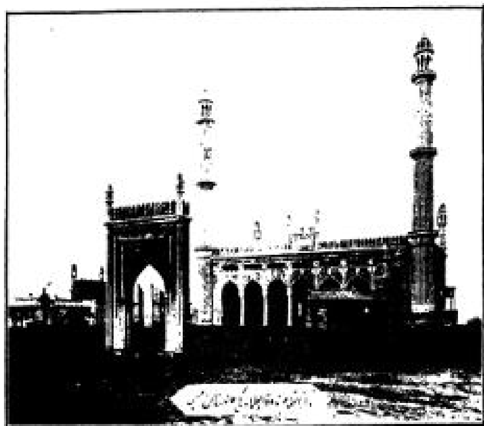
یہ کیا کہ، ایچھے دن کے کھانے کا جو دسترخوان بچھا تھا وہ سارا کھانا فقراء کو تقسیم کر دیا، مولانا شروانی صاحب رقم فرماتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کی طرف سے مزید رقم کا وعدہ بھی تھا، مگر بعض معاصرین نے بیگم صاحبہ کو یہ خبر پہنچا کر پریشان کر دیا کہ ندوۃ العلماء کے دارالعلوم میں (نعوذ باللہ) الحاد و لامذہبی کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں روپیہ دینا معصیت ہے،[1] اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحبہ نے مولوی سر رحیم بخش صاحب مرحوم پریسیڈنٹ کونسل ریاست رجین کی تحریک سے، رقم بالائی تھی بلا کر کہا، تاہم بھی روپیہ کسی کو دو اوفیا، ایک مولوی صاحب نے رفع الزام کی کوشش کی، تاہم شوق امداد مسدود ہوگئی، مزید رقم نہ مل سکی،[2] اور عمارت آج تک ناتمام ہے،

مدرسہ کے لئے عطائے زمین سنہ ۱۹۰۰ء

سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو زمین کی تلاش ہوئی، لکھنؤ میں سب سے بہتر اور سب سے موزوں تر وہ قطعۂ آراضی ہے جو دریائے گومتی کے پار [illegible] پل کے دائیں جانب واقع ہے، زمین کا منظر یہ ہے کہ ایک طرف نہایت قریب دریا ہے، اور پہلو میں اس وقت کیننگ کالج کا اور اب لکھنؤ یونیورسٹی کا بورڈنگ، اور صنعتی اسکول کی پرشان عمارتیں ہیں، شمال کی طرف دور تک کھلا ہوا میدان ہے، یہ قطعہ تخمیناً ۲۴ بیگہ ہے چنانچہ اس زمین کیلئے گورنمنٹ میں درخواست کی گئی، اگرچہ اس علاقہ کی زمین میونسپلٹی کے قاعدہ کے رو سے سات روپیہ بیگہ سالانہ پڑتی ہے، اور اسی لئے زمین مطلوبہ کا سالانہ لگان ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا، لیکن مسٹر جارلنگ صاحب ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ کی اور کرنل عبدالمجید خاں مرحوم وزیر پٹیالہ کی پرزور زبانی تحریک سے

[1] مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ خود مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم نے ان سے بمقام بہاولپور بیان کیا تھا

[2] نے مارچ سنہ ۱۹۰۸ء میں بہاولپور ایک جلسہ میں جا کر ارکان ریاست سے اس عمارت کی تکمیل کی تحریک کی، چنانچہ ہز ہائینس نے پندرہ ہزار کی رقم منظور فرمائی، مگر موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ رقم اب تک نہ مل سکی،





P. P. C Aosaaloia.

جناب کمشنر صاحب نے اس کے دیئے جانے کی سفارش کی، اور ہنرآنر ہیوٹ صاحب لفٹننٹ گورنر نے اس کو منظور کیا، اور صرف ۵۰ سالانہ لگان مقرر کیا،

جلسۂ سنگ بنیاد ۱۹۰۸ء | ان تیاریوں کے بعد نومبر ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم کے سنگ بنیاد اور ندوہ کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں مقرر ہوئیں، ندوہ اودھ کے دارالسلطنت میں واقع ہے، اسکے چاروں طرف مسلمان رؤسا اور تعلقہ دار ہیں، جن کی معمولی نگاہِ التفات بھی ندوہ کو مالا مال کرسکتی تھی، مگر ان لوگوں کو یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ ندوہ سے بدگمان ہے، اب جب کرنل عبد المجید خاں مرحوم کی کوششوں سے ان بدگمانیوں کا پردہ چاک ہوا اور گورنمنٹ نے بیش از بیش نظرِ توجہ کی تو اس زمانہ کے حالات کے مطابق یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا سنگِ بنیاد یوپی کے گورنر سر جان پرسکاٹ ہیوٹ رکھیں، تاکہ اودھ کے تعلقہ داروں کی بدگمانی دور ہو، مولانا مرحوم نے اس جلسہ کا حال خود اپنے قلمِ مسرت رقم سے لکھا ہے، اس لئے ہم اس کو یہاں اُن ہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:۔

"بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس	خوابِ خوشی دیدم و دیگر مپرس
تند مئی بود و خرابم ہنوز	دیدہ من باز و بخوابم ھنوز

ہماری آنکھوں نے حیرت خیز تماشاگاہوں کی دلفریبیاں بار بار دیکھی ہیں، جاہ و جلال کا منظر بھی اکثر نظروں سے گذرا ہے، کانفرنسوں اور انجمنوں کا جوش و خروش بھی ہم دیکھ چکے ہیں، وعظ و پند کے پُر اثر جلسے بھی ہم کو متاثر کرچکے ہیں، لیکن اس موقع پر جو کچھ آنکھوں نے دیکھا، وہ ان سب سے بالاتر، ان سب سے عجیب تر، ان سب سے حیرت انگیز تھا،

یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقتدر علما عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکرگذاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی درسگاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کو سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جارہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش، اور کجکلاہ سب جمع تھے ع

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

ہز آنر لفٹنٹ گورنر بہادر ممالکِ متحدہ نے منظور فرمایا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھیں گے، یہ تقریب ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو عمل میں آئی، چونکہ ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی ان ہی تاریخوں میں ہونے والا تھا، اس لئے دو طرفہ کشش کی وجہ سے گویا تمام ہندوستان اُمنڈ آیا، افسوس یہ ہے کہ یہ کوئی تعطیل کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید منتظمین جلسہ انتظامِ مہمانداری میں ہمت ہار جاتے، معزز شرکائے جلسہ میں علما میں سے مولوی مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی، مولوی شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری، مولانا ذاکر حسین صاحب، مولوی ابن حسن صاحب مجتہد العصر، مولوی شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولوی نظام الدین صاحب جھجری، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب استاد حضور نظام، (مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی) اور اربابِ وجاہت میں آنریبل راجہ صاحب محمود آباد، جناب سر راجہ صاحب جہانگیر آباد، نواب وقار الملک، کرنل عبدالمجید خاں صاحب فارن منسٹر پٹیالہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، شیخ عبدالقادر بیرسٹر، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب

رئیسِ علی گڈھ، خان بہادر رشید جعفر حسین صاحب مولوی محمد حسین صاحب منقبہ رئیسِ بمبئی، بابو نظام الدین
رئیسِ امرتسر، حاجی شمس الدین صاحب سکریٹری حمایتِ اسلام لاہور، مرزا ظفر اللہ خاں صاحب رئیس
جالندھر، شیخ سلطان احمد رئیس ہوشیارپور، خان بہادر شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر،
راجہ نوشاد علی خاں صاحب جعفی الدولہ نواب علی حسن خاں لکھنؤ، حافظ نذر الرحمان صاحب رئیس
عظیم آباد جلسہ میں شریک تھے،

تین بجے سے ذرا پہلے تمام لوگ باسلوب بیٹھ گئے، اور ارکانِ انتظامیہ ندوہ ہز آنر کے استقبال
کے لئے لبِ فرش دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوئے، کمشنر صاحب لکھنؤ نے سکریٹری دار العلوم
(شبلی نعمانی) کو لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر سے ملایا، اور پھر سکریٹری موصوف نے تمام ارکانِ انتظامیہ کا
ایک ایک کرکے لفٹنٹ گورنر سے تعارف کرایا، اوّل دار العلوم کے قاری نے قرآن مجید کی چند
آیتیں تلاوت کیں، پھر شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے ہز آنر سے ایڈریس پڑھنے کی اجازت طلب
کی، مولوی شیر حسین صاحب قدوائی نے ایڈریس پڑھا، ہز آنر نے نہایت خوش لہجگی اور صفائی سے ایڈریس
کا جواب دیا، مولوی خلیل الرحمن صاحب نے عربی ایڈریس جو ساٹن پر چھپا ہوا تھا، زریں کارچوبی خریطہ میں
رکھکر پیش کیا، ہز آنر نے خود اپنے ہاتھ میں سے کراڈیکانگ کے حوالہ کیا، پھر سنگِ بنیاد نصب کرنے کے لئے
تشریف لے گئے، اور مولوی شاہ ابو الخیر صاحب، کرنل عبد المجید خاں صاحب، آنریبل راجہ صاحب
محمود آباد، نواب وقار الملک، حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس کانپور، نواب علی حسن خاں صاحب
رئیس بھوپال، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، منشی اطہر علی صاحب بی اے وکیل لکھنؤ،
حکیم عبد العزیز صاحب، حکیم عبد الولی صاحب، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل، اور نواب شروانی ان کے ساتھ گئے

سنگِ بنیاد کے نصب کرنے کے وقت دوبارہ قاری صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت کی، واپسی کے وقت ارکانِ انتظامیہ نے موٹر کا رنگ شاہیت کی، اور یہ دلفریب تماشہ ختم ہوگیا :

عجیب حسنِ اتفاق ہے، ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم لکھنؤ کا فرنگی محل تھا، جو درسِ نظامیہ کا بانی ہے، اور جس کے دامنِ فیض سے مولانا بحرالعلوم، ملا حمداللہ، ملا حسن وغیرہ تعلیم پاکر نکلے یہ فرنگی محل اس لئے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی، اور اس لئے محل اس کی طرف منسوب ہوگیا تھا، شاہ عالمگیر کی سند میں یہ نام درج ہے، اس جدید دارالعلوم کی بنیاد ہزآنر لفٹنٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہلِ فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب نے اس موقع پر اس حسنِ اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں :-

رکھی بنائے ندوہ ہزآنر نے آکے خود   سچ پوچھئے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

لکھنؤ کی سرزمین میں مدرسہ کے نام سے یہ سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی تھی، اس واقعہ کو سامنے رکھ کر مولانا نے قرآن پاک کی ایک آیت سے جس میں خانۂ کعبہ کو سب سے پہلا گھر فرمایا گیا ہے، یہ قطعۂ تاریخ موزون فرمایا،

گفت ایں مدرسۂ تازہ چو بنیاد نہاد   کہ درو خلق زہر جا پئے مجتمع است

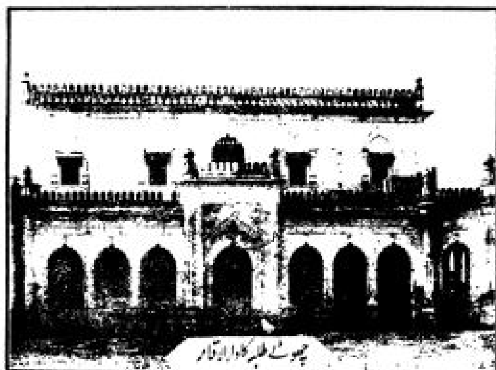
قدسیاں از سرِ الہام بہ شبلی گفتند   سال و تاریخ بنا اوّلُ بَیتٍ وُضِعَ است

۱۳۲۰ھ

سنگِ بنیاد کی رسم بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی، تمام معززین و حکام ضلع اور علماء و فضلا شریکِ جلسہ تھے، اس موقع پر ارکانِ ندوہ کی طرف سے جناب ہزآنر کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، وہ گو پڑھا انگریزی زبان میں گیا، جس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی



شبلی ہوسٹل، بڑے طلبہ کا دارالاقامہ



چھوٹے طلبہ کا دارالاقامہ

شامل تھا، مگر اصل سپاسنامہ عربی زبان میں تھا،

لطیفہ:۔ اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، لفٹنٹ گورنر کے انتظار میں ندوہ کے ارکان دو رویہ کھڑے تھے، پروگرام یہ تھا کہ ڈپٹی کمشنر مولانا کا تعارف گورنر صاحب سے اور مولانا ارکان کا تعارف گورنر صاحب سے کرینگے، ابھی وہ نہیں آچکے تھے، اور ارکان انتظار میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، مولانا شروانی نے مولانا سے فرمایا کہ جس ترتیب سے ہم لوگ کھڑے ہیں، اسی ترتیب سے ہمارے نام لکھ کر سامنے رکھ لیجئے، علی گڈھ میں ایک ایسا موقع آیا تو نواب وقار الملک نام بھول گئے، مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ اب آپ لوگوں کے نام میں بھول جاؤں گا، اتفاق دیکھئے کہ جب گورنر آئے اور مولانا نے ایک ایک کے سامنے جاکر تعارف شروع کیا تو شاہ سلیمان صاحب کے پاس آکر اُن کا نام بھول گئے، شاہ صاحب نے خود اپنا نام بتایا، اس پر بعد کو بڑی ہنسی ہوئی،

ندوہ کا جلسۂ سالانہ سنہ ۱۹۰۸ء

جلسۂ سنگِ بنیاد کے دوسرے دن ۲۹ و ۳۰ نومبر ۱۹۰۸ء کو ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا، پہلے جلسہ کے صدر جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ہوئے، اُن کی تقریر صدارت کے بعد مولانا نے اپنا وہ نو تصنیف فارسی قصیدہ جو اسی جلسہ کے لئے لکھا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کا مطلع ہے:۔

اے کہ بر نگب سراپردۂ عالم دیدی ۔۔۔ جاہ کیخسرو و فرِ حشم جم دیدی

قصیدہ کیا تھا تاثیر کا ایک اُمنڈتا ہوا سیلاب تھا، جو دلوں کے ساحل سے جاکر ٹکراتا تھا، آخر بڑی داد و تحسین کے نعروں کے درمیان وہ ختم ہوا، اس کے بعد گورنر کے عطائے زمین

اور رئیسہ عالیہ بھاولپور کے شاہانہ عطیہ کے شکریہ کی تجویزیں منظور ہوئیں، اور پہلا اجلاس ختم ہوا۔ ظہر کے بعد دوسرا اجلاس ہوا، جس میں حاضرین کے اصرار سے مولانا نے اپنا قصیدہ دوبارہ پڑھا۔ قصیدہ کی کاپیاں جو ندوہ کی طرف سے چھپوائی گئی تھیں لوگوں نے ایک ایک روپیہ میں ہاتھوں ہاتھ لیں، اور جناب نواب سید محمد علی حسن خاں بہادر نے تیس روپیہ میں ایک کاپی خرید فرمائی، اس کے بعد جناب سیٹھ محمد حسن متقیہ رئیس بمبئی نے جو خود بھی عربی جانتے تھے، طلبہ کا امتحان لیا، اور اردو کی ایک ایسی عبارت ترجمہ کے لئے دی جو جدید قانونی اور تمدنی الفاظ سے بھری ہوئی تھی، چار طالب علموں نے اسی وقت نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ترجمہ کر دیا، اس کے بعد ایک طالب علم نے عربی میں نہایت شستہ رفتہ تقریر کی، جس پر تمام حاضرین نے تحسین و آفرین کی، مولانا نے وقت کی موزونیت کو سمجھ کر دارالعلوم کی خصوصیات پر ایسی موثر تقریر فرمائی کہ لوگوں نے تعلیم اور تعمیر کے لئے چندے لکھوانے شروع کر دیئے،

اس جلسہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ علی گڈھ پارٹی کے ارکان آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور کالج اور کانفرنس کے دوسرے ارکان جو ابھی تک ندوہ کے کسی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے شریک اجلاس ہوئے، رات کو ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے بطلیموسی، اور فیثا غورثی نظام فلکی پر مبسوط لکچر دیا، اور تمام علمی تجربات دکھائے، اور اس کے بعد پروفیسر فیروز الدین مراد نے طبیعیات و برقیات کے بعض مسائل پر میجک لینٹرن کے ذریعہ سے تقریر کی جس سے علماء کو جدید سائنس کی بعض تحقیقات کا علم ہوا،

دوسرے دن ندوہ کا تیسرا اجلاس ہوا، اس کے صدر شمس العلماء مولانا ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوری ہوئے، اس جلسہ میں سب سے پہلے مولوی عبدالودود صاحب ندوی نے جو انجمن تقویۃ الایمان ٹونک (راجپوتانہ) کی طرف سے آئے تھے، آریہ، مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی جو کوشش وہاں کر رہے تھے اس کی تفصیلات بیان کیں، اس کے بعد مولانا نے دارالاقامہ کے لئے ہندوستان کے ہر شہر سے ایک ایک کمرہ بنانے کی تجویز پیش کی، اور اس تجویز کو پیش کرتے وقت دین و دنیا کے تعلقات پر ایک جامع تقریر فرمائی، اصل تجویز کی تائید مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولوی غلام محمد صاحب شملوی نے کی، اور اسی وقت چند کمروں کے لئے لوگوں نے چندے لکھوائے، اس کے بعد منتظمین کے شکریہ پر جلسہ ختم ہوا، اور لوگ یہ کہہ کر رخصت ہوئے،

"خواب خوشی دیدہ ام و دیگر بپرس"

وقف علی الاولاد کی کارروائی کا آغاز بھی ندوہ کے اسی اجلاس سے ہوا، اور مولانا کی تحریک پر طے ہوا کہ علماء سے اس بارہ میں فتوے طلب کئے جائیں،

دارالاقامہ کا خیال | دارالعلوم کی عمارت جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی، مولانا اس کے ساتھ ایک دارالاقامہ کی تعمیر کی تحریک کو جس کی تجویز جلسہ میں منظور ہو چکی تھی آگے بڑھا رہے تھے، ایک ایک کمرہ کا تخمینہ سات سات سو روپیہ قرار دے کر احباب سے اور دوسرے دردمندوں سے ایک ایک کمرہ کا چندہ وصول کرنا شروع کر دیا، دلی اور لکھنؤ کے اجلاسوں میں بہت سے

؁ منقول از رودادِ دوازدہم اجلاس دہلی ۱۹۱۰ء ص ۵۶،

اہلِ خیر نے ایک ایک کمرہ کی تعمیر کا وعدہ کیا، اور بہت سے لوگوں نے اپنے وعدے پورے بھی کئے، ان میں پہلا نام تو خود مولانا کا ہے، دوسرا حکیم عبدالولی صاحب مرحوم جھوائی ٹولہ لکھنؤ کا ہے، ان کے علاوہ شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور نواب رستم علی خاں صاحب رئیس کرنال کے نام ہیں، نواب مزمل اللہ خاں نے لکھا کہ وہ مولانا کی تصنیفات کی یادگار میں ایک کمرہ بنوائیں گے، لیکن مولانا نے اُن کے اس چندہ کو دارالمصنفین کی تعمیر کے لئے مخصوص کرنے کی تجویز اُن کے سامنے پیش کی۔[۱]

بیگم صاحبہ جنجیرہ (بمبئی) نے جن کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات قسطنطنیہ کے زمانہ سے تھے، جولائی ۱۹۱۴ء میں ایک کمرہ کے لئے ایک ہزار روپیہ بھیجا، اُس کے شکریہ میں مولانا نے یہ قطعہ اُن کو لکھ کر بھیجا۔

مشغولِ کار بر مدرسہ بودم کہ ناگہاں
دیدم کہ نامہ باز پئے تکریم رسیدہ است

زاں جملہ ہست نامۂ بے نقش و بے سو
کز بارگاہِ حضرتِ بیگم رسیدہ است

از جائے جستم و بگرفتم بدستِ شوق
گویا کہ خستہ ایست بمرہم رسیدہ است

برسر نہادم و بادب بوسہ دادمش
مانند تشنۂ کہ بہ زمزم رسیدہ است

ہم از سرش گرفتم و از جا در آمدم
چوں دیدم ایں کہ کاغذ زہم رسیدہ است

نازم کہ ایں[۲] عطیۂ فیضِ امیرہ ایست
کآوازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ است

---

۱ بحوالۂ الندوہ ۲ اس شعر میں نازلی بیگم، عطیہ بیگم اور امیرہ بیگم کی طرف اشارہ ہے جو اس خاندان کی محترم خواتین ہیں،

بھوپال کی امداد میں اضافہ سنہ ۱۹۰۹ء

سرکاری امداد سے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے موازنہ میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا تھا، اُس کے دور کرنے کے لئے مولانا پوری کوشش میں مصروف تھے، کبھی دورہ کرتے تھے، کبھی حیدرآباد کا خیال کرتے تھے۔ (سلیمان ۴۴)

منشی محمد امین صاحب بھوپال کو ۷ فروری سنہ ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں:- "آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دو سو ہے، گورنمنٹ نے پانچ سو دیئے، اس لئے اب خاص مذہبی علوم کا حصہ اس کے مقابلہ میں بہت کم نظر آتا ہے، ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو، ریاست حیدرآباد سے پانچسو کا وعدہ ہو چکا تھا لیکن اس حالت میں کہ ریاست پر کئی کروڑ کا بار پڑ گیا ہو کئی سال تک وہاں تو زبان نہیں کھل سکتی" (۲) آخر کامیابی کی بجلی بھی اُسی اُفق سے چمکی جدھر سے امید کی پہلی شعاع نظر آئی تھی، یہ وہی نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کا دستِ کرم تھا، سرکارِ عالیہ نے اس ضرورت کو سننے کے ساتھ اپنے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد کو پچھتر کر دیا یعنی از خود دو سو روپئے ماہوار کا اضافہ کر کے ڈھائی سو کر دیا، یہ وہ احسانِ عظیم تھا جس نے مولانا جیسے خوددار شاعر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی سپاس گذاری کو ایک قصیدہ کی صورت میں ظاہر فرمائیں چنانچہ عمر میں پہلی دفعہ اپنی خوشی سے وہ مدحیہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

انچہ با دشت و چمن ابر بہاراں کردہ است   خسرو کشور بھوپال بہ ماں کردہ است

ناشکر گذاری ہوگی اگر اس سلسلہ میں منشی محمد امین صاحب زبیری لٹریری سکریٹری سرکار عالیہ و مہتمم صیغۂ تاریخ بھوپال کا نام نہ لیا جائے۔ جن کی سعی خیر سے یہ کام انجام پایا تھا، مولانا نے منشی صاحب کے ایک خط میں خود اس کا اقرار کیا ہے، لکھتے ہیں:- "واقعہ یہ ہے کہ آپ ہی کی بدولت ندوہ کو ریاست سے

[1] ندوہ ستمبر ۱۹۰۹ء

جو فوائد پہنچ رہے ہیں اُن کے شگفتہ و آب ہیں۔" (امین-۱۰)

ریاست رامپور کی امداد ۱۹۱۰ء

دوسرے سال ایک اور اسلامی ریاست نے امداد کا ہاتھ بڑھایا، ہز ہائینس نواب حامد علی خاں صاحب فرمانروائے رام پور سے مولانا کے روابط بہت پہلے سے تھے، مگر ان کی تجدید غالباً جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے توسط سے اب ہوئی، اور شاید اُن ہی کی سفارش سے ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب ممدوح نے پانچسو روپیہ سالانہ کی امداد منظور فرمائی جو مولانا کی معتمدی تک برابر ملتی رہی،

دارالعلوم کی تعمیر کا کام

سنگ بنیاد کے بعد دارالعلوم کی مجوزہ عمارت کا نقشہ خان بہادر میر جعفر حسین صاحب انجینیر (لکھنؤ) نے جو ہی گذشتہ تحریک کے علمبرداروں میں تھے نہایت محنت سے تیار کیا، اور ۹ مئی ۱۹۰۹ء کو جلسۂ انتظامیہ نے شکریہ کے ساتھ اس کو منظور کیا، یہ نقشہ اس قدر خوبصورت، موزوں اور جامع حیثیات تھا کہ سب نے بے ساختہ داد دی، بیچ کا کمرہ اتنا وسیع کہ ایک ہزار کرسیوں کی گنجائش ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ ۱۴ کمرے، ارکان کی طرف سے تعمیر کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کے سکریٹری منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری مقرر ہوئے، منشی صاحب موصوف کی نگرانی میں سید ہادی صاحب اوورسیر (لکھنؤ) نے اُنہی کے بعد عمارت بنوائی شروع کی، اور ۱۹۱۲ء تک تعمیر کا سلسلہ جاری رہا،

تعمیر کے کمروں کی بنیاد

مدرسہ کی زمین کا یہ منظر مولانا کی بہترین امیدوں کا گہوارہ تھا، وہ اس گہوارہ کو دیکھنے اکثر تشریف لے جاتے تھے، ۱۵ جون ۱۹۰۹ء کو مولوی ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"دارالعلوم کی تعمیر شروع ہو گئی، عجب مست اور فرحت انگیز موقع ہے، ذرا دیکھنے کو جی چاہتا ہو تو آیئے"

الندوہ، اپریل ۱۹۰۹ء

کے لحاظ سے مدرسۃ العلوم کو اس سے کوئی نسبت نہیں"۔ (م)

۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھتے ہیں:۔ "عمارت اب اس حالت تک پہنچ گئی ہے کہ نہایت تفریح ہوتی ہے، اور جی چاہتا ہے کہ دیں رہا کیجیے۔ حالانکہ صرف کمر کمر تک دیواریں اٹھی ہیں، تم دیکھ کر لطف اٹھاؤ گے"۔ (حمید، م)

سنہ ۱۹۱۰ء

جب دیواریں تھوڑی تھوڑی اور بلند ہوئیں اور کمروں کے نشان ظاہر ہوئے تو فروری میں فرط جوش میں ایک دن تمام طلبہ اور اساتذہ کو لے کر اس زمین پر گئے اور فرمایا: "مدرسہ کی ظاہری بنیاد تو ایک حاکم وقت نے رکھی، اب آؤ مدرسہ کی حقیقی بنیاد ہم رکھیں، اس پُراثر منظر کی تصویر خود مولانا کے قلم نے کھینچی ہے، مناسب ہوگا کہ وہ اس موقع پر آپ کی نظر سے بھی گذر جائے:۔ "اہل دولت کو تو ندوۃ العلماء کی عظمت و شان کا تماشا اس وقت نظر آیا ہوگا جب ہز آنر نے دارالعلوم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا، لیکن جو لوگ مذہبی خلوص کے دلدادہ ہیں، ان کے دل اس رسم کی ادائگی کی خبر سنکر اچھل جائیں گے، جو اسلامی سال نو کے آغاز اور مقدس دن (جمعہ) کو ادا ہوئی، یکم محرم سنہ ۱۳۲۸ھ روز جمعہ کو تمام طلباے دارالعلوم اس مقام پر جہاں دارالعلوم کی جدید عمارت تعمیر ہو رہی ہے اس قدیم مذہبی خدمت کو انجام دینے کے لئے جمع ہوئے جو اُن کا آبائی شعار ہے، دارالعلوم کی تمام عمارت اگرچہ بجائے خود ایک علمی و مذہبی عمارت ہے، لیکن اسلامی علوم میں علم تفسیر تمام علوم دینیہ کا سرتاج ہے، اس لئے جو کمرہ خاص فن تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا ہے طلباے دارالعلوم ندوہ نے اس کے پاس جاکر تمام مزدوروں کو ہٹا دیا، اور خود اپنے ہاتھ سے چونہ گارا، اینٹیں لا کر ڈھیر کرنی شروع کیں، معمار کام بناتے جاتے اور لڑکے ان کو مدد دیتے جاتے تھے، وہ حالت خاص اثر رکھتی تھی جب معمار گھٹتا تھا، اور علم بحیثیت معمار

سے رزخاندانی بزرگوں کو تحکم کے لہجہ میں ڈانٹتے تھے، کہ معاملہ پیدا نہیں پہنچتا، جلسہ عام کرو، خاکسار شبلی بھی اس
رسم میں شریک تھا، اور اینٹ اٹھا اٹھا کر معماروں کو دیتا تھا جب یہ رسم ادا ہو چکی تو میں نے دار العلوم
کے مقاصد و اغراض کے متعلق ایک تقریر کی، جس کی ابتدا دعا سے ہوئی اور دعا پر ختم ہوئی، تقریر کا ماحصل
یہ تھا کہ اے خدا! یہ چند ناتواں، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری
قبول کر، مغربی خیالات کا سخت سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جاتا ہے جس کے ساتھ ان کی
مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر سب اس طوفان کی زد میں ہیں، اے خدا! ان چند ناتوانوں کو
کا دعوی ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے، یہ بہت بڑا دعوی ہے جو کسی طرح ان کے چہرے
پر نہیں کھلتا، تو ہی ہے جو ان کی آبرو رہ جائے،

یہ ایک نہایت شاندار رسم تھی، یہ ایک ایسا موثر منظر تھا جہاں دار العلوم کے تمام مقاصد و اغراض مجسم
صورت میں نظر آتے تھے، طلبہ کو نظر آتا تھا کہ ان کی زندگی کا آخری مقصد کیا ہے، وہ جس شاہ راہ پر جارہے
ہیں، اس کی انتہائی منزل کہاں ہے، ان کو معلوم ہوتا تھا کہ مذہب کا روحانی اثر کس قدر قوی ہے، ان کو
محسوس ہوتا تھا کہ کون سا پُرزور ہاتھ ان کو دھکیل رہا ہے!!

دار التفسیر کی یہ بنیاد تعمیر اور اس موقع پر ان کی یہ ولولہ انگیز تقریر ان کے اصلی جذبات کا پتہ دیتی
ہے کہ وہ کن امیدوں کے ساتھ ندوہ اور دار العلوم کی خدمت میں لگے ہوئے تھے، اس عمارت
کی ہر اینٹ ان کی امید و آرزو کی ایک لوح تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بھری بھری امیدوں کے
ساتھ کبھی تنہا جاتے، کبھی دوسروں کو لے جاتے،

اسی نامکمل عمارت میں سنہ ۱۹۱۲ء میں ہز ہائینس سر آغا خاں کی آمد پر ایک نہایت شاندار

خطبہ بر موقع سنگ بنیاد دار العلوم

جلسہ کیا اور ۱۹۱۲ء میں جب اُس کا ہال پورا ہوچکا تھا سید رشید رضا کی آمد پر ندوہ کا عظیم الشان سالانہ جلسہ پھر اُسی میں منعقد کیا، تاکہ عام مسلمان امید کے اس نخلستان کو دیکھ لیں،

یہ افسوس کی بات ہے کہ سلسلۂ تعمیر میں مولانا اور منشی صاحب میں ایک اختلاف پیدا ہوا جو بڑھتا ہی گیا، مولانا یہ چاہتے تھے کہ جتنا سرمایہ ہمارے پاس ہو اسی کی حیثیت سے تعمیر کو مکمل کردیا جائے، اور منشی صاحب موصوف جو بڑی مستعدی اور محنت سے عمارت کے بنوانے میں مصروف تھے ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مدرسہ نے نقشہ کے مطابق ہر حیثیت سے مکمل بنے، کام تین چار برس تک جاری رہا، بالآخر وہ پچاس ہزار ختم ہوگئے، مدرسہ کا پہلا مکان شاید نو دس ہزار میں بکا، وہ بھی خرچ ہوا، مستقل فنڈ بھی تمام ہوگیا، ندوہ کے قبضہ میں ایک آدھ کرایہ کا سکونتی مکان تھا، وہ بھی بک گیا، مگر تعمیر تکمیل کو نہیں پہنچی، ۲۷ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "مکان بک گیا اب بھی دیکھئے عمارت پوری ہوتی ہے یا نہیں، نواب غلام احمد[1] مدراس سے آئے تھے، ان کو عمارت دکھائی ان کے اندازۂ تخیل سے باہر تھی بہت خوش ہوئے۔"

افسوس کہ مولانا کی زندگی میں ان کے خواب تمنا کی تعبیر نہیں نکلی، آخر اسی ناتمام عمارت میں مولانا کی علحدگی کے بعد اور وفات سے پہلے ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم اٹھ کر چلا آیا،

مدرسہ میں سر آغا خاں کی آمد اور ۵۰۰ ماہانہ کی امداد ۱۹۱۰ء	اس زمانہ میں مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی کے کاموں کے سبب ہز ہائینس سر آغا خاں ہندوستانی مسلمانوں کے مسلم لیڈر تھے، اخیر جنوری ۱۹۱۰ء

[1] نواب غلام احمد خاں کلامی مدراس کے ایک پرانے قومی خادم ہیں، اب بوڑھے ہوچکے ہیں، پھر بھی ریاست میسور کی اسمبلی میں غیر برہمنوں کے لیڈر ہیں، ندوہ کے قدیم بھی خواہ اور معین و مددگار ہیں،

میں دہلی میں مسلم لیگ کے ایک جلسہ میں جس میں مولانا وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کرنے کی غرض سے گئے تھے، مولانا کی ملاقات سر آغا خاں سے ہوئی، موصوف نے ندوہ کے متعلق کچھ مشورے کئے، اس تقریب سے مولانا نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ندوہ کو دیکھتے جائیں، جس کو انھوں نے منظور کیا، چنانچہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو وہ لکھنؤ آئے اور ۱۳ فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو دار العلوم کی جدید عمارت کے زیر تعمیر ہال میں ایک نہایت شاندار جلسہ ہوا، ہال کو دار العلوم کے ایک ممتاز طالب علم نے جن کے حسن اہتمام و انتظام کو اب ایک دنیا مانتی ہے، مگر اس وقت تک صرف ندوہ ہی مانتے تھے یعنی مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے نہایت خوبی سے سجایا تھا، تقریباً پانچ سو چیدہ اصحاب کا مجمع تھا جن میں آنریبل راجہ علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد، آنریبل راجہ تصدق رسول خاں تعلقدار جہانگیر آباد، راجہ شبان علی خاں، مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے،

ہز ہائینس ٹھیک ۱۲ بجے تشریف لائے، طلبہ نے جن کی دو رویہ قطاریں سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھیں، ہز ہائینس آغا خاں صاحب کا زندہ باد نعرہ بلند کیا، ہز ہائینس ہال میں تشریف لا کر صدر میں بیٹھے، پہلے دار العلوم کے ایک طالب علم نے قرآن مجید کی چند آیتیں تلاوت کیں، پھر مولانا نے فارسی میں اڈریس پڑھا جو الندوہ میں اور مقالات شبلی کے سلسلہ میں چھپا ہوا ہے، چونکہ ہز ہائینس کا اصل مقصد طلبہ کے خیالات و معلومات کا اندازہ کرنا تھا، اس لئے جناب ممدوح نے طلبہ کو بلا کر ان کو تقریر کا موقع دیا، اور بعض طلبہ کے لئے خود تقریر کا موضوع متعین کر دیا، طلبہ نے نہایت شستہ اور فصیح عربی میں تقریریں کیں، خاکسار کی تقریر کا موضوع تھا "علماء کو جدید فلسفہ

سیکھنا کیوں ضروری ہے؟ یہ عربی تقریر لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں چھپی ہے، آخر میں ہز ہائینس
نے کھڑے ہو کر نہایت فصیح فارسی میں برجستہ تقریر کی جس میں دار العلوم کے مقاصد اور تعلیم کی تعریف
کی، اور فرمایا کہ ندوہ کی تعلیم کے سلسلے تمام ہندوستان میں پھیلنے چاہئیں، تاکہ مذہبی گروہ میں یہ روشن خیالی
پیدا ہو جائے، یہ بھی فرمایا کہ طلبہ کو جدید تعلیم کی تکمیل کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا چاہئے۔
اور جس طرح یہودی اور عیسائی پیشوایانِ مذہب علومِ جدیدہ کو مذہب کی حمایت کے لئے سیکھتے ہیں
علمائے اسلام کو بھی اسی طرح سیکھنا چاہئے، تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اپنا مذہبی اثر ڈال سکیں، اور اُن کی
رہبری کر سکیں، آخر میں فرمایا کہ میں ہمیشہ ندوہ کا معین و مؤید رہوں گا، اور پانچ سو سالانہ کی امداد منظور کی

آخر میں مولانا عبد الباری صاحب مرحوم نے ہز ہائینس کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور
فرمایا کہ ہم کو ہز ہائینس جیسے لوگ درکار ہیں، جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا سکیں، اسی پر
جلسہ کا خاتمہ[1] ہوا،

اجلاسِ دہلی ۱۹۱۰ء ندوہ کے سالانہ اجلاس گو امرتسر سے لیکر کلکتہ اور مدراس تک بڑے بڑے شہروں
میں ہو چکے تھے، مگر ہنوز ہندوستان کا پایہ تخت اس شرف سے محروم تھا، مولانا نے وقف علی الاولاد
کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے اجلاسِ دہلی میں شرکت کے لئے جو سفر کیا اسی سفر میں جنوری ۱۹۱۱ء
میں دہلی میں جناب حکیم اجمل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی اور وہیں یہ طے پایا کہ ندوہ کا آئندہ
سالانہ جلسہ دہلی میں ہو اور اس کے لئے ۱۴-۱۵-۱۶ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۶-۲۷-۲۸
مارچ ۱۹۱۱ء کی تاریخیں مقرر کی گئیں، اور تیاریاں شروع ہوئیں،

---

[1] الندوہ مارچ ۱۹۱۱ء مطابق ربیع الاول ۱۳۲۹ھ۔

اس جلسہ میں مخالفین نے ایک ہنگامہ یہ برپا کیا کہ مولانا نے اس جلسہ کے سلسلہ میں الندوۃ کے ایک شذرہ میں لکھ دیا تھا کہ "اس جلسہ میں شاید مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد صاحب بھی علما کے پہلو بہ پہلو شریک ہوں، اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ جدید تعلیم کے امیر العسکر قدیم جماعت کے علماء کی صف میں دوش بدوش نظر آئیں" (الندوہ ماہ فروری سنہ ۱۹۱۰ء) اُن دنوں مولوی نذیر احمد صاحب نے اُمہات الامۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کی زبان نہایت سوقیانہ تھی، جس کو پڑھ کر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوئی، اور اس لئے ان کے خلاف دہلی میں خاصی شورش برپا تھی، ندوہ میں اُن کی شرکت کی خبر نے خود ندوہ کے اجلاس کو مورد اعتراض بنا دیا، ارکان ندوہ نے بلکہ درحقیقت حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مولوی نذیر احمد صاحب اور مخالفین کے درمیان اس بات پر مصالحت کرائی کہ کتاب کے نسخے ان لوگوں کے سپرد کردیئے جائیں، اور آئندہ اس کی اشاعت بند کردی جائے، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ نسخے فریق مخالف کے پاس بھیجدیئے لیکن مولانا نذیر احمد صاحب نے خود اس بات پر اصرار کیا کہ یہ کتابیں فریق مخالف کے قبضہ میں بھی نہ رہیں، بلکہ جلا کر ناپید کردی جائیں، شاید مولوی صاحب کو اس کا خطرہ ہو کہ ایسا نہ ہو کہ اُن کی کتاب سے کوئی دوسرا نفع اٹھائے، بہرحال اُن کی اس پُر اصرار خواہش کے مطابق کتاب کے موجودہ نسخوں کو ایک مجمع میں جس میں ندوہ کے ارکان بھی تھے نذر آتش کردیا گیا، اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمۂ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بواسطہ یا بلا واسطہ "بے وجہ اور بلا تحقیق منسوب کرکے ایک تاریخی جرم کیا ہے، حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے، مولانا شروانی صاحب نے

جو شریکِ جلسہ تھے، مقدمۂ مقدمات عبدالحق (رشد) میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھدی ہے
جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی عبدالحق صاحب مولانا شبلی مرحوم کی طرف بے بنیاد واقعات کی
نسبت میں کتنی بے احتیاطی برتتے ہیں،

بہرحال یہ جلسہ جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے زیر اثر اور ان ہی کی صدارت میں
بہت دھوم دھام سے عربک کالج کے میدان میں ہوا، دور دور سے مہمان آئے تھے، حسب
دستور طلبہ امتحان کے لئے پیش ہوئے، مولوی عبدالسلام صاحب ندوی اور مولوی قمرالدین مرحوم
سے حاضرین نے یہ خواہش کی کہ اربابِ دہلی نے ندوہ کا یہ اجلاس جس خوش اسلوبی اور فیاضی
سے کیا ہے اُس کا حال عربی میں لکھ کر پیش کریں، ان دونوں نے چند منٹ کے اندر بہترین
فصیح عربی میں اس واقعہ کو قلمبند کرکے پیش کردیا، اس کے بعد ندوہ کے درجۂ تکمیلِ ادب کے
طالب علم مولوی خواجہ عبدالواحد صاحب ندوی (جو بعد کو الہلال کلکتہ میں شریکِ ادارت
ہوئے اور اب ایم اے ہوکر لکھنؤ میں پروفیسر کالج ہیں) نے عربی میں دارالعلوم کی ضرورت پر
ایک ایسی برجستہ تقریر کی کہ علماء جو اس قسم کی تقریروں کے خاص مخاطب تھے اُن کی یہ حالت تھی
کہ وجد میں آکر جھومتے تھے، اور اُن کی زبان سے بیساختہ تحسین آمیز کلمات بلند ہوتے تھے، شیخ
عبدالحق صاحب حقی بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڈھ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک
اہلِ زبان اور معلمِ ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں، انھوں نے عربی کی ایک فصیح
و بلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبہ کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ طلبہ کی عربی
تحریر و تقریر نے جاہلیتِ عرب کے سوقِ عکاظ کا سماں پیدا کردیا جسکو میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا

مولانا نے اس زمانہ میں تبلیغ اور رد آریہ کے خیال سے بھاشا کی تعلیم کا ایک درجہ ندوہ میں کھولا
تھا، سید امداد حسین صاحب ہوشیارپوری طالب علم ندوہ نے اعیانِ جاول پور کی خواہش پر ہندی
بھاشا میں ایسی عمدہ تقریر کی کہ لوگوں کو شبہ ہوگیا کہ یہ کوئی نومسلم ہندو ہے، لڑکا نہایت گورا چٹا اور
بلند قامت تھا، بدگمانی کرنے والوں نے سمجھا کہ یہ کوئی کشمیری برہمن ہے، چنانچہ اس خیال کے
ازالہ کے لئے اس سے قرآنِ پاک پڑھنے کی فرمائش کی گئی، اتفاق یہ کہ اس کی آواز بھی اچھی تھی،
اُس نے ایک خاص پُردرد لہجہ میں سورۂ رحمان کی تلاوت شروع کی تو سماں بندھ گیا، اور اُس پر
انعامات کی بارش شروع ہوگئی،

چند طالب علم انگریزی میں تقریر کرنے کے لئے بھی تیار تھے، مگر مولانا کو خیال ہوا کہ شاید
عربی خواں طلبہ کی زبان سے لوگ انگریزی تقریر پسند نہیں کریں گے، اس لئے انھوں نے اس
بارہ میں حاضرین کی رائے دریافت کی، لوگوں نے شوق کے ساتھ اجازت دی، اس پر سید محمد صاحب
جو اب بی اے ہو چکے ہیں، اور عبدالمجید نے جو دارالعلوم کے منتہی طالب علم تھے محاسنِ اسلام پر انگریزی
میں تقریریں کیں، ان تقریروں میں اگرچہ صحتِ مخارج اور انشاء پردازی کے لحاظ سے بہت کچھ
خامیاں تھیں جن کو ریمارک کرتے وقت شیخ (سر) عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے ظاہر کردیا، تاہم
جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ یہ صرف ایک سال کی باقاعدہ تعلیم کا نتیجہ ہے تو انھوں نے اس تعلیم
کے مستقبل کی نسبت اپنا اطمینان ظاہر فرمایا،

طلبہ کی ان تقریروں اور تحریروں کا یہ اثر ہوا کہ ہر طرف سے چندہ کی بارش ہونے لگی، اور
اس جلسہ کے متعلق یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ یہاں جو کچھ کامیابی ہوئی وہ تمام تر طلبہ کی لیاقت کا نتیجہ

مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پُر زور تقریر کی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے،

اس اجلاس کی سب سے اہم تجویز مجلس اشاعتِ اسلام کا قیام تھا، اور جس کے لئے یہ زمانہ نہایت موزوں تھا، اس کی تفصیل آگے آئے گی، اسی اجلاس میں دوسرے دن میں نے ایک کتبخانۂ اعظم کی تجویز پر تقریر کی، اور دار المصنفین کا خاکہ پہلی دفعہ پیش کیا گیا، دوسری تجویز قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کے متعلق پیش ہو کر منظور ہوئی، اور تیسری تجویز انگریزی کورس کی اُن غلطیوں کی اصلاح کے متعلق منظور ہوئی جن سے اسلام اور تاریخِ اسلام کے متعلق بدگمانی پھیلتی ہے، اس صیغہ کا نام صیغۂ تصحیح تاریخِ اسلام رکھا گیا، اور خاکسار اُس کا سکریٹری منتخب کیا گیا، ایک اور تجویز جدید عربی کے لغت کی ترتیب کی منظور ہوئی، اور یہ کام بھی خاکسار کے سپرد ہوا،

حکیم صاحب مرحوم کی دلپذیر تقریر پر اس تاریخی اجلاس کا خاتمہ ہوا،

ندوہ کا اجلاس لکھنؤ سنہ ۱۹۱۲ء سید رشید رضا مصری کی صدارت

سنہ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ندوہ کا وہ عظیم الشان اجلاس ہوا جس کو معنوی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا سب سے کامیاب اجلاس کہا جا سکتا ہے،

ان دنوں مولانا جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کا جواب عربی میں لکھ رہے تھے اور اس کے کچھ اجزا سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس مصر بھیجے، جس سے مابین خط و کتابت کی نوبت تقریب پیدا ہو گئی، سید موصوف اس زمانہ میں مصر میں دار الدعوۃ والارشاد کے نام سے جدید طرز کا ایک مذہبی مدرسہ قائم کر رہے تھے، اس سلسلہ میں بھی دونوں میں خط و کتابت ہو رہی تھی اور ادھر ندوہ کے مجوزہ اجلاس کی تیاری ہو رہی تھی جس میں تبلیغ کے مسئلہ پر پوری بحث ہونے والی تھی، ان گوناگوں مناسبتوں سے مولانا نے سید موصوف سے تحریک کی کہ وہ ہندوستان آکر ندوہ کے

اس اجلاس کی صدارت کریں، موصوف نے اس کو قبول کیا، یہ دو اسلامی ملکوں کی مذہبی تعلیمی وتبلیغی کوششوں کا سب سے پہلا اتحاد تھا جس کی خبر ہندوستان میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا اس وقت لارڈ کرومر مصر میں برطانی سفیر تھے، سید موصوف نے اُن سے خاص طور سے اجازت لے کر ہندوستان کا سفر کیا جس کے معنی یہ تھے کہ برٹش گورنمنٹ کو ان کی آمد پر کوئی اعتراض نہ تھا،

سید موصوف نے ۲۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا، بمبئی کے اکابر اور عرب تجار نے خیر مقدم کیا، بمبئی سے وہ دلّی، دلّی سے لاہور، اور لاہور سے لکھنؤ آئے، مولوی عبد الحق صاحب حقی بغدادی پروفیسر عربی علیگڈھ کالج سفر میں اُن کے ہمرکاب تھے، لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علماء، طلبہ اور رؤسا، غرض ہر طبقہ کے اصحاب تھے، استقبال کے لئے کھڑا تھا، نو بجے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسٹیشن اہلاً وسہلاً مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا، راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی اُن کی سواری کے لئے بھیجی تھی، اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے، لیکن مسلمانوں کا جوش تھمتا نہ جاتا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیئے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے سید ممتاز حسین صاحب بیرسٹر مرحوم کی کوٹھی پر لائے، جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا،

۲۰ اپریل ندوہ کے اجلاس کی تاریخ تھی، قرآن پاک کی تلاوت اور استقبالیہ کے خطبۂ صدارت کے بعد مولانا نے سید رشید رضا کی صدارت کی تحریک کی، اور اُن کی مذہبی وتعلیمی وتبلیغی کوششوں کو بتفصیل بیان کیا، سب نے بیک آواز تائید کی، سید صاحب نے صدارت کی کرسی کو زینت بخشی،

اردو عربی زبان میں ایک نہایت دل آویز و فصیح تقریر ارشاد فرمائی جو اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی تعلیمی و مذہبی ضرورتوں پر نہایت مدلل اور موثر تبصرہ تھا، سید صاحب کا انداز بیان ایسا دلچسپ اور موثر تھا کہ سماں بندھ گیا تھا جو لوگ عربی نہیں بھی جانتے تھے وہ بھی اُن کی ڈھائی گھنٹہ کی عربی تقریر کو نہایت سکون سے سنتے رہے،

اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے، وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی کو دلوں میں تلاطم برپا کردیتے تھے،

تہنیت و تعزیت کی رسمی تجویزوں کے بعد مولانا نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت ہند سے درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کو نماز جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی تعطیل دی جائے جس کے نہ ہونے سے بہت سے مسلمان ایک بہت بڑے مذہبی فرض سے محروم رہ جاتے ہیں" اس کی تائید مرزا سمیع اللہ بیگ وکیل لکھنؤ (حال نواب مرزا یار جنگ سابق وزیر عدالت حیدرآباد دکن) اور مرزا محمود صاحب قادیانی (موجودہ مرزا بشیر الدین محمود امام قادیان) نے کی، اس کی منظوری کے بعد دلی کی تجویز کے مطابق قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کی کارروائی کی رپورٹ سنائی جس میں یہ مژدہ سنایا کہ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جن سے زیادہ بڑا انگریزی کا کوئی مسلمان ادیب موجود نہیں، قرآن پاک کے ترجمہ میں ہمہ تن مصروف ہیں،

تیسرے جلسہ میں خاکسار نے صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی کی رپورٹ سنائی، اور انگریزی کورس

کی اُن غلطیوں کے اقتباسات پیش کئے جن میں اسلام، پیغمبر اسلام علیہ السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، قرآن پاک اور مسلمان بادشاہوں پر الزامات لگائے گئے تھے، مسلمان ان غلط بیانیوں کو سن کر تڑپ اُٹھے، پھر یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسروں اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے اس باب میں جو مراسلتیں ہوئی تھیں وہ پیش کیں، اور آئندہ طریقِ کار کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا،

اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم دارالعلوم کی ضرورت پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اور آغاز اس شعر سے کیا

ندانم ایں کہ سررشتہ از کجا بند است　　　　کرا و من بکشیدن نمی شود آخر

پھر فرمایا: "حضرات! میں اس موضوع پر تقریر کے لئے صرف آج نہیں کھڑا ہوں، بلکہ کئی بار کہہ چکا ہوں، لیکن یا تو لوگوں کے پہلو میں دل نہیں، یا میری زبان میں اثر نہیں، اس لئے مجھے غالب کا شعر پڑھنا پڑتا ہے،

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　　دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور"

اس کے بعد موصوف نے وہ زہرہ گداز تقریر فرمائی جو اُس طرز سے اس موضوع پر کبھی کسی نے کبھی نہیں کی اور بتایا کہ مسلمان صرف مذہب ہے، اس لئے جو کچھ کرنا ہے اسی راستہ سے کرنا ہے، اور جو آواز بھی اُن کی اصلاح کے لئے اٹھائی جائے وہ اسی راستہ سے اٹھائی جائے، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے، مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے، کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قوم کے نام سے نہیں اسلام کے نام سے جاگتی ہے، اس نام سے اس کو پکارو، پھر دیکھو کہ اس کی بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے؟

اسی تقریر کے دوران میں صیغۂ تعلیم اغلاط کی مذکورۂ بالا رپوٹ کی طرف اشارہ کرکے خاکسار کی حقیر

ذات کی نسبت ایک ایسا فقرہ فرمایا جو اس کے لئے ہمیشہ سرمایۂ سعادت رہیگا،

اس تقریر کے بعد تعمیر کے چندہ کی تحریک ہوئی مولانا نے خود اپنی طرف سے پانچ سو کا اور سید رشید رضا کی آمد کی مسرت میں سو روپیہ کا اعلان کیا، ساتھ ہی جناب منشی محمد احتشام علی صاحب صفی الدولہ نواب علی حسن خاں صاحب، رضی الدولہ نواب سید نور الحسن خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور خان بہادر میر جعفر حسین صاحب وغیرہ نے پانچ پانچ سو کے وعدے کئے، خود صدر مجلس علامہ سید رشید رضا نے بھی سو روپئے پیش کئے،

اس کارروائی کے بعد مولانا پھر کھڑے ہوئے اور وقف علی الاولاد کی جو کارروائی اب تک ہو چکی تھی اس کی تفصیل، روداد بزبان عربی سنائی چوتھے اجلاس میں خاکسار نے ندوہ کی تجویز کی تعمیل میں جدید عربی الفاظ کا ایک لغت پیش کیا، جلسہ نے میری اس محنت وکاوش کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد مولانا ابو الکلام صاحب نے خطیبوں اور اماموں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت پر ایک موثر تقریر فرمائی تاجپوشی کی خوشی میں ملک معظم نے ہندوستان کو تعلیم کے لئے جو پچاس لاکھ روپئے عنایت فرمائے تھے، پانچویں اجلاس میں مولانا شروانی نے تجویز پیش کی کہ اس رقم سے عربی مدارس کو بھی مناسب حصہ ملنا چاہئے، اس کے بعد مولانا شبلی مرحوم اشاعت وحفاظت اسلام کے موضوع پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اور ایسی دل ہلا دینے والی تقریر کی کہ خود بھی رو رہے تھے اور دوسروں کو بھی رُلا رہے تھے، یہ تقریر آج بھی پڑھی جاسکتی ہے اور اس کی تاثیر کا امتحان کیا جاسکتا ہے، مولانا نے اس میں تفصیل سے آریوں کے حملوں، مسلمانوں کی غفلت، اور خاندانی نومسلموں کے ارتداد کے واقعات کے ضمن میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلٰوۃ والسلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ واقعات

بیان کئے جن سے ایمان تازہ ہوتا تھا،

مولانا کی تقریریں ندوہ میں بارہا ہوئی تھیں، مگر اُن تقریروں کا محل ورد ہمیشہ دماغ رہا، مگر اس دفعہ موصوف نے ندوہ کے اجلاس میں تین دفعہ تقریریں کیں، تینوں دفعہ ہر تقریر دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی، اور دل ہی کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی جاتی تھی، اس انقلاب کا راز اُن دنوں سیرۃ نبوی اور احادیث شریف کا مطالعہ و انہماک تھا، جس نے ایک ہی دو سال میں علی گڈھ کے مولوی شبلی کو ایک نیا مولوی شبلی بنا کر کھڑا کردیا تھا جو ہمہ تن دل اور مجسم محبت بن گئے تھے،

مولانا کی تقریر کے بعد خواجہ کمال الدین صاحب لاہور اور مولوی ابو الکمال عبد الودود صاحب بریلوی مرحوم نے تائیدی تقریریں کیں، اور رات کو ان ڈھائی سو مسلمانوں نے اپنے نام لکھوائے جو اسلام کی حفاظت و اشاعت کے لئے سر بکف نکلیں گے،

چھٹے اجلاس پر اس سالانہ جلسہ کا خاتمہ ہوا، اس آخری جلسہ میں حسبِ دستور ندوہ کے دو چھوٹے کمسن بچوں، عبد الرحمن نگرامی اور معین الدین (بارہ بنکی) نے اسلام کے فضائل کی اثبات پر تقریریں کیں جن کو سن کر لوگ دنگ رہ گئے، بعض طلبہ نے عربی میں تقریریں کیں، خیال تھا کہ اس دفعہ جبکہ صدر اجلاس ایک صاحب زبان ادیب اور قادر الکلام خطیب ہیں، طلبہ مرعوب ہوجائیں گے، مگر انھوں نے اس برجستگی اور بے خوفی سے تقریریں کیں کہ خود صاحب صدر نے اُن کی ہمت کی داد دی، آخر میں مولانا شروانی نے منتظمین جلسہ کا اور سید ممتاز حسین بیرسٹر سکریٹری مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، پھر سید رشید رضا صاحب صدر انجمن اجلاس کھڑے ہوئے، اور اس جوش کے ساتھ اپنی اختتامی تقریر کی کہ زبان کی ناآشنائی کے

باوجود تمام جلسہ سراپا اثر تھا، آخر میں مولانا شبلی مرحوم نے اردو میں صدر اجلاس کا شکریہ ادا کیا جس کا عربی ترجمہ مولانا کے ارشاد کے مطابق خاکسار نے کرکے سنایا جس وقت میری زبان نے آنحضرت کے شدائد سفر کا ذکر کیا اور تحیت کے آخری الفاظ ادا کئے وہ بے تاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے جوش نے ان کی آواز میں رقت پیدا کردی تھی اپنے شدائد سفر کے مقابلہ میں حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدائد اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکالیف کا ذکر زبان پر لائے، اس اثر سے سارا جلسہ ماتم کدہ بن گیا تھا، اور دیر تک وہ حالت رہی جس کے دیکھنے کے لئے میں دوسروں کی آنکھیں ترستی رہیں گی،

اسی پر اس سال کے جلسہ کا خاتمہ ہوا، اور مولانا شبلی کے زیر اہتمام ندوہ کے جلسوں کا بھی اسی جلسہ پر خاتمہ ہوا، اور ندوہ کے متعلق یہ پیشین گوئی جو ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء کو انھوں نے کی تھی حرف بحرف پوری ہوئی: "ندوہ کی بساط پر یہ آخری بازی ہو جس پر اس کی موت و حیات کا مدار تھا" (شذرات)

بعض دوسرے تعلیمی خدمات

ریاست حیدرآباد کی تعلیمی خدمات
سنہ ۱۹۰۸ء تا سنہ ۱۹۱۳ء

ریاست حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام نے ملک میں ایک عظیم تعلیمی انقلاب کا وجود پیدا کیا، اس کی تدریجی تاریخ نہایت دلچسپ ہے، یہاں مشرقی تعلیم کے لئے ایک دار العلوم قائم تھا جس کے تعلیم یافتہ بہت سے سرکاری عہدوں پر وقتاً فوقتاً ممتاز ہوتے رہے، لیکن اس دار العلوم کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی تعلیم کے امتحانات کا جو نصاب مقرر کیا تھا، اس دار العلوم میں بھی اسی کی

تقلید کی جاتی تھی، اور اسی کے مطابق اس دارالعلوم کے طلبہ بھی وہاں مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے امتحانات دیتے تھے، غالباً ۱۹۰۱ء میں پنجاب یونیورسٹی نے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ دوسرے ممالک کی درسگاہوں کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شرکت کی اجازت نہیں دے سکتی، اس وقت اس دارالعلوم میں سات سو طالب علم زیر تعلیم تھے، جن کے لئے مجبوراً ریاست کو ایک خاص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لئے ایک نئے مستقل نظام کی ضرورت پیش آئی، اس وقت نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی وہاں تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائرکٹر تھے، انھوں نے سرکار عالی میں یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے لئے ایک مناسب نصاب تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آئے جس کے لئے مولانا شبلی اور بعض دیگر ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں، سرکار کی منظوری کے بعد نواب صاحب موصوف نے مولانا کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا، جس کا خلاصہ یہ تھا:- "چونکہ دارالعلوم کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہوگیا ہے، اس کے عربی و فارسی نصابِ تعلیم کے مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ایک رکن آپ ہیں، نصابِ تعلیم زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا جائے تاکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پاکر امتحان میں کامیابی حاصل کریں وہ سرکاری خدمات کے ادا کرنے کے قابل ہوں،

ترمیم نصاب میں چند امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے،

(۱) ضروریاتِ زمانہ اور حکومت کی خدمات کی ضروریات کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے موجودہ نصاب میں اصلاح،

(۲) تکمیلِ تحصیلِ علومِ مشرقیہ،

مدِ دوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورنٹیل تعلیم ناقص ہو بہت سے علوم جن سے
فضیلت کی تکمیل ہوتی ہے اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت
مولوی فاضل سے بالاتر اول مرتبہ دو جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے، اگرچہ سلسلۂ نصابیہ
کی پابندی ضرور نہیں، مگر تحصیل تکمیل کے لئے بہت کچھ اضافۂ کتبِ درسیہ کی ضرورت ہے:

یہ مراسلہ مئی یا جون ۱۹۰۸ء میں مولانا کی خدمت میں اُس وقت پہنچا جب وہ پاؤں
کے حادثہ کے سبب سے صاحبِ فراش تھے، اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم
ہوم سکریٹری حیدرآباد نے ۳ ماہ الٰہی ۱۳۱۷ف ت کو نشان (۱۲۲۳) کے مراسلہ کے ذریعہ سے مولنا
کو پھر حیدرآباد آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ جون ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد گئے، اور وہاں چند
روز قیام کرکے ایک نصاب تیار کیا، اور اس کو ایک یادداشت کے ساتھ پیش کیا، جس میں
یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ نصاب میں ترمیم و اصلاح کن اصولوں پر کی گئی ہے؟ اور ترمیم و اصلاح کے
مہماتِ امور کیا ہیں؟

مولانا جس جامع الحیثیات تعلیم گاہ کا خواب ہمیشہ سے دیکھا کرتے تھے، اور جس کی تعبیر کے
لئے ندوہ کی در و دیوار سے ٹکرایا کرتے تھے اُن کے خیال میں اس کے لئے یہ بہترین موقع
ہاتھ آیا، حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی جس کا خزانہ معمور تھا
اور جس کو تعلیم کے اس وسیع پروگرام کا بوجھ اٹھانے میں جو مولانا کے متخیلہ میں تھا کسی قسم کا
تأمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے انھوں نے جی کھول کر اپنے پورے حوصلہ کے مطابق کچھ
تعلیمی پروگرام کو پھیلا کر ایک یادداشت تیار کی، اس یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ

بقول مولانا حسب ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نصاب میں ترمیم و اصلاح کی گئی،

(۱) دار العلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا اُس کا مقصد صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، لیکن اب جبکہ دار العلوم خود مختار اور آزاد ہو گیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں، بلکہ شرعی خدمات بھی انجام دے سکیں، علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں کمال رکھتے ہوں، اُن کو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت حاصل ہو، وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں، اور علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی واقف ہوں، تاکہ جدید تعلیمیافتہ گروہ پر بھی اُن کا اثر پڑ سکے،

(۲) اس وقت جو جدید تعلیم ہندوستان میں جاری ہے، اس میں ہماری مذہبی ضروریات اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے، نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہو سکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائل اخلاق کا علم ہو سکتا ہے، اس لئے بی اے یا ایم اے ہونے کے بعد بھی ان چیزوں کے متعلق ایک شخص کی حیثیت ایک عامی آدمی سے زیادہ نہیں ہو سکتی یا یں ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا، کیونکہ یونیورسٹی کا موجودہ نصاب اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آئے،

لیکن چونکہ ریاست حیدرآباد ایک وسیع ریاست ہے اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لئے یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لئے

وہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا سلسلۂ تعلیم بھی قائم کرسکتی ہے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو، اور جس کے تعلیمیافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں،

ان دونوں مقاصد کو پیش نظر رکھکر مولانا نے ایک اصلاحی نصاب تعلیم تیار کیا، جس کے اصول یہ تھے :-

(۱) تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جنمیں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقہ سے بیان کئے گئے ہوں، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما و چیستاں کے طور پر نہایت مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں، نصابِ درس سے خارج کردی گئیں،

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جنمیں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کردیئے گئے تھے اور اس خلطِ مبحث کی وجہ سے طالب العلم اصل فن کے مسائل سے دور پڑجاتا تھا، اس لئے یہ تمام کتابیں خارج کردی گئیں، اور اصلاحی نصاب میں اس قسم کی کتابیں رکھی گئیں جنمیں کسی فن کے خاص مسائل بالاستیعاب مذکور ہوں،

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ بہت کم تھا، اس لئے اصلاحی نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا،

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ بہت کم تھا، اس لئے ادب کا حصہ بہت بڑھا دیا گیا،

(۵) اس نصاب میں انشا پردازی کی مشق کے لئے خاص گھنٹے مقرر کئے گئے اور مضمون نویسی

عربی خوانوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ صحیح عربی کی چند سطریں بھی نہیں لکھ سکتے،

(۶) قدیم نصاب میں عقائد و کلام کی صرف ایک معمولی درجہ کی کتاب داخل تھی، حالانکہ یہ نہایت اہم فن ہے، اس لئے اس نصاب میں اس فن کی متعدد بلند پایہ کتابیں داخل کی گئیں،

(۷) قدیم نصاب میں تاریخ اسلام اور تاریخ عام کی ایک کتاب بھی داخل نہ تھی، اس کے موجودہ نصاب میں فن تاریخ کی کتابیں بھی داخل کی گئیں،

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابیں بھی جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں نصاب میں شامل کی گئیں؛

(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لنگویج کے لازمی قرار دی گئی،

(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدت تعلیم ۹ برس تھی لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لئے گھٹا کر کل مدت ۶ برس قرار دی گئی،

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی، اور یہ فرض کیا گیا ہو کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دارالعلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائیگا، اور اس مدت میں اردو، ابتدائی فارسی، حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی،

اس درجہ کے بعد منشی اور عالم کی دو الگ شاخیں شروع ہوں گی، اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے، منشی کے ۲ سال، اور منشی عالم کے دو سال، اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا، منشی فاضل تک طالب علم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سوادخوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائے گی،

عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے،

عالم: اس کی مدتِ تعلیم آٹھ برس رکھی گئی، یہ درجہ بی۔ اے کے برابر ہے، اس میں تمام علومِ متداولۂ عربی، بعض علومِ جدیدہ، اور انگریزی زبان دانی انٹرنس کے درجہ تک آجائیگی،

فاضل: اس کی مدتِ تعلیم دو برس ہے، اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی، اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا، اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ، عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خاص انگریزی زبان سکھائی جائے، تاکہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ پیدا ہو، اور ایسے علما پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم میں اضافہ کرسکیں، اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں اُن ہی کی زبان و خیالات میں اسلامی عقائد و مسائل پر تقریر کرسکیں،

دار العلوم کے نصابِ تعلیم کی یہ اصلاح درحقیقت وہ پہلا قدم تھا جو جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے لئے اٹھایا گیا، اور مولانا کی یادداشت وہ پہلی اینٹ تھی جس سے بعد کو عظیم الشان جامعۂ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا نے حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ حیدرآباد میں ایک آزاد اور مستقل یونیورسٹی کا تمہیدی خیال پیش کیا، اور طعنہ دیا کہ جو لوگ غلام ہندوستان میں ایک مسلم یونیورسٹی بنانے کا خواب دیکھتے ہیں وہ اس آزاد حیدرآباد میں خود ایک آزاد یونیورسٹی کی بنیاد کیوں نہیں رکھتے، چنانچہ یادداشت[1] مذکور کے شروع میں فرماتے ہیں:-

"معلوم نہیں مسلمانوں میں کونسی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ زمانہ کے سیکڑوں ہزاروں

[1] یہ یادداشت الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں اور مقالاتِ شبلی حصہ سوم (تعلیمی) ص ۱۵۲ میں چھپی ہے،

انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ
جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہو اور در حقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیے تھا،
بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے ایک عام راستہ پر پڑ گیا ہے اور کچھ تفکر نہیں آتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں،
جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا اس قدر شور و غل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجوں کی نوکریاں اور ڈگریاں، وہ ڈگریاں
ہیچ اسناد کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں، اور اسی لئے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے
ہیں، کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ
بہم نہیں پہنچا کہ یونیورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونیورسٹی بن سکتی ہو وہاں کیا ہو رہا ہے؟
حیدرآباد میں عنانِ تعلیم ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے، جو ہندوستان میں یونیورسٹی بنانے
کے محرک ... ہو رہے ہیں، یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ روپیہ مانگا جا رہا ہے، حیدرآباد میں ایک
منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے،
حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہو سکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی
گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیونکہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ
دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں، لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم
کی اصلاحات و ترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لئے وہاں ایک دار العلوم ہے، پنجاب
یونیورسٹی نے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل
اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کئے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک
اسی کی پیروی کی گئی، اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا، جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قدم*

نہیں بتایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے۔

دو سہ بار با تو گفتم گلہ ہای ہیچ بستاں   نہ شد اتفاق شاید کہ بہ ہیں بہا گرانم

مولانا کی اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ (ستمبر ۱۹۰۸ء) میں قرار پایا، لیکن چونکہ عین اُسی زمانہ میں ندوہ کی ایک خاص ضرورت سے مولانا کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لئے وہ اجلاس ملتوی ہو گیا، اس کے بعد مولانا ۲۲ جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدر آباد گئے، اور ایک کمیٹی میں اُن کا مرتبہ نصاب پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت و تعلیمات، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، مولانا انوار اللہ خاں صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبد الحلیم صاحب شرر، مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، اس اجلاس میں کچھ امور باقی رہ گئے تھے، اس لئے ۱۶ فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے، اور جس میں نواب عماد الملک بہادر (سابق ناظم تعلیمات) اور ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات حال بھی شریک تھے، اور غور و فکر کے بعد کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ مرتبہ نصاب منظور کیا گیا،

مولانا نے یہ پوری تفصیل "حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی" کے عنوان سے الندوہ مارچ ۱۹۰۹ء میں لکھی ہے، اس کے آخر میں فرماتے ہیں: "یہ ہم نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہے،

درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

مولانا کا خیال تھا کہ ایک سال میں جدید نظام کے مطابق اس درسگاہ کا کام شروع ہو جائیگا[1] (سلیمان ۲۳) لیکن ایک سال کیا اس میں پانچ چھ سال لگ گئے، جب ۱۹۱۳ء میں جب مولانا دوبارہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے، تو ابھی تک اس کے سوا اس کی داغ بیل بھی نہیں پڑی تھی کہ سرکاری امتحانات کا انتظام ہو گیا تھا،

بعض صاحب شروع سے یہ چاہتے تھے، کہ مولانا حیدرآباد میں رہ کر اپنی اس اسکیم کو خود ہی چلائیں، مگر انھوں نے اس سے معذرت چاہی، ۳ر جولائی ۱۹۱۰ء کو مہدی صاحب کو لکھتے ہیں:

"سرکار نظامِ علومِ شرقیہ کی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے، اس کے نصاب وغیرہ کے لئے مجھے بلایا ہے، چند روز یہاں قیام رہیگا، یونیورسٹی کی نظامت مجھے دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے، لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں"؟ (مہدی ۷۸)

۹ر اگست ۱۹۱۰ء کو پھر لکھتے ہیں:۔ "یہاں (حیدرآباد میں) مجھ کو بہت دیر ہوتی جاتی ہے اور میں گھبراتا جاتا ہوں، ایک دن کا کام یہاں مہینوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کے لئے سب سامان مہیا ہیں، لیکن آدمی نہیں، اور آدمی ہو تو سازشوں کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا، میں ملازمت تو کسی طرح نہ کرونگا، البتہ اگر سامان اچھے ہوئے تو برس دو برس رہ کر کام چلا دوں گا، کہ آئندہ چلتا رہے"؟ (مہدی ۷۸)

---

[1] حضرۃ الاستاذ نے اسی زمانہ میں اس کے جدید شعبات میں میرا نام بھی داخل کر دیا تھا (سلیمان ۲۳) چنانچہ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں امام الطیفی صاحب نے مجھے انٹرویو کے لئے بلایا، میں پونہ سے جا کر ان سے ملا، انھوں نے انٹرویو کے بعد میری تقرری کی ابتدائی کارروائی کے لئے کچھ کاغذات بھی میرے پاس بھیجے، مگر میں نے دار المصنفین کے خیال سے اس کارروائی کو آگے نہیں بڑھایا،

۱۹۱۷ء میں جب کام کا آغاز ہو رہا تھا مولانا کی جگہ پر نواب عماد الملک اور دوسرے قدر دانوں کے اصرار سے جون ۱۹۱۸ء میں (سلیمان ۷) مولانا کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمید الدین صاحب بی اے کا انتخاب اس دار العلوم کی صدارت (پرنسپل) کے لئے عمل میں آیا، حالانکہ خود مولانا اُن کی آزاد مذہبی وعلمی خدمت کے خواہاں تھے، مگر مجوزہ درسگاہ کی کامیابی کے خیال سے دو نیم راضی سے ہو گئے، (حمیدہ ۶، ۶۶، ۶۷) اس وقت ڈاکٹر لطیفی حیدر آباد میں تعلیمات کے ناظم تھے، اور اکبر حیدری صاحب صیغہ مال کے اعلیٰ عہدہ دار،

مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درسگاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا، یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درسگاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں، یہ بالکل نیا خیال تھا، اس لئے انھوں نے بڑی ہی مشکل سے ارکانِ حکومت کو اس کے لئے راضی کیا، اب لطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب ناظمِ تعلیمات ہوئے، اُن کے زمانہ میں زمانہ نے نئی کروٹ لی یعنی ایک مشرقی یونیورسٹی کے بجائے اس نے اردو کی ایک ایسی مغربی یونیورسٹی کا جامہ پہن لیا جب میں دینیات کی حیثیت ثانوی ہو گئی، اور علومِ مشرقیہ اس کا ایک صیغہ ہو کر رہ گئے، بعض وجوہ سے مولانا حمید الدین صاحب دل برداشتہ ہو کر ۱۹۱۹ء میں استعفا دے کر چلے آئے، اور عثمانیہ یونیورسٹی موجودہ صورت میں بنکر نمودار ہوئی، جو گو وہ نہ تھی جس کے بنانے کا خیال کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی اس نے وجود میں آکر ہندوستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا، اور اس کے دینیات اور علومِ مشرقیہ کا صیغہ اپنی تعلیم، طرزِ تعلیم، اساتذہ اور انگریزی وعلومِ جدیدہ کی آمیزش سے مولانا شبلی کے مرتبہ نقشہ کا اچھا خاصہ خاکہ ہے،

مشرقی بنگال و آسام میں اصلاح مدارس کی تجویز ۱۹۱۰ء

سنہ ۱۹۱۰ء میں بنگال گورنمنٹ نے مشرقی بنگال اور آسام کے عربی مدرسوں کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے ایک ممبر مولانا بھی منتخب ہوئے تھے، اس کا پہلا جلسہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو، اور دوسرا ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کو ہونے والا تھا، مولانا کے کاغذوں میں اس کے متعلق سرکاری مراسلہ تو ملتا ہے، لیکن اس کے لئے سفر اور وہاں کیا مولانا کے کاموں کی نوعیت کا حال مجھے نہیں معلوم ہو سکا،

مراسلہ مذکور ۲۳ فروری سنہ ۱۹۱۰ء کو ڈھاکہ سے بھیجا گیا ہے،

مشرقی کمیٹی شملہ سنہ ۱۹۱۱ء

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے علوم مشرقیہ کی ترقی و اصلاح کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، جس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے، اس کمیٹی کا اجلاس اسی مہینہ میں شملہ میں ہوا، ہندوستانی ممبروں کے علاوہ علی گڑھ کالج کے جرمن عالم ڈاکٹر یوسف ہارووِز اور مسٹر برن چیف سکریٹری صوبہ متحدہ جو فارسی اور اردو کے عالم تھے، اور بعض دوسرے انگریز ممبر بھی تھے، جلسہ سے واپس آکر مولانا نے اگست سنہ ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں "ہوا کا رخ دوسری طرف" اور "مشرقی کانفرنس" کی دو سرخیوں کے نیچے اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد اور نتائج کی تفصیل کی ہو،

شروع میں سرسید اور ان کے دوستوں کو مشرقی تعلیم کی ترقی سے جن وجوہ سے اختلاف تھا، ان کا جواب دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ اب ہوا کا رخ پلٹ رہا ہے، یعنی گورنمنٹ اب مشرقی تعلیم کی سرپرستی کے لئے آمادہ ہو رہی ہے، اس کے بعد اس کمیٹی کے حسب ذیل اغراض لکھے ہیں:-

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا،

(۲) علم الآثار (آرکیالوجی) کی تعلیم دینا، اور جدید طریقۂ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا،

(۳) اعلیٰ طریق پر قدیم قلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کیٹیلوگنگ) کی تعلیم دینا،

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لئے بیش قرار وظائف مقرر کرنا،

(۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا، اور اُن کے لئے امتحانات مقرر کرنا،

(۶) اعلیٰ مشرقی تعلیم یافتوں کے لئے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ، اور قدیم کتب خانوں میں ترتیبِ فہرست کے لئے عہدے قائم کرنا،

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا،

(۸) (انگریز) افسروں کی زباندانی کا امتحان لینا،

(۹) کلکتہ میں اغراضِ بالا کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا،

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا اس کے متعلق مولانا نے اپنے مضمون میں حسبِ ذیل نتائج کی توقع کی:

۱۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی پسند کریں گے،

۲۔ جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی اُن کو کچھ ماہوار امداد دے گی،

۳۔ کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درسگاہ قائم ہوگی، مدارسِ عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درسگاہ میں تعلیم حاصل کریں گے،

(۴) اس درسگاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیئے جائیں گے،

(۵) اس درسگاہ سے سند لینے کے بعد اُن کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی،

(۷) مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی، اور جن کے تعلیمیافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے اُن کو کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکیگی،

مولانا نے اس کمیٹی کی سفارشوں سے جن نتائج کی توقع دلائی تھی وہ سب کی سب تو پوری نہیں ہوئیں، مگر اُن سے حسب ذیل نتیجے ضرور برآمد ہوئے،

۱- سرکاری خرچ پر مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی اور انگریزی پڑھے ہوئے، طلبہ کا بھیجا جانا، اگرچہ اس کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا نے سنہ ۱۹۰۸ء میں اعلان بھی کر دیا تھا، اور پیش قرار وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا، اور اس کے مطابق سب سے پہلے بہار سے ڈاکٹر عظیم الدین سنہ ۱۹۰۹ء میں یورپ بھیجے گئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر منصور علیگڈھ سے گئے،[1] اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سنہ ۱۹۱۲ء میں بھیجے گئے اور پنجاب سے مولوی محمد شفیع صاحب (موجودہ پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) گئے، اور اب بھی طلبا جاتے ہیں،

۲- اُن لوگوں کو اُن کی کامیاب واپسی پر کالجوں میں مشرقی علوم کی پروفیسری پیش قرار

[1] افسوس ہے کہ ڈاکٹر منصور نے ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا، شاہجہانپور وطن اور سنہ ۱۸۸۸ء سال ولادت ہے، علیگڈھ کالج میں ڈاکٹر ہورویز کے خاص شاگرد تھے، سنہ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کے وظیفہ سے یورپ گئے اور برلن میں ڈاکٹر سخاؤ کی نگرانی میں عربی جغرافیہ نویسوں پر اپنا مقالہ تیار کیا اور سنہ ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی، اسی اثنا میں یورپ کی بڑی جنگ شروع ہوگئی، اور چار سال تک ممالک یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے رہے، سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک وہ زیادہ تر برلن میں رہے، اور اسی زمانہ میں حدیث کی فہرست بنانے کا جو کام وہاں ہو رہا تھا، مستشرق ونسنک کے ساتھ مل کر اس کو انجام دیا، سنہ ۱۹۲۳ء میں وہ ہندوستان واپس آئے، قرآن پاک کا وہ جرمن ترجمہ جو مولوی صدر الدین صاحب احمدی کے نام سے چھپا ہے، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ان ہی کا کیا ہوا ہے، سنہ ۱۹۳۵ء میں وہ علی گڈھ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر ہوئے اور یہیں وفات پائی،

تنخواہوں پر دی گئی، اور اب تک دی جاری ہے،

۳۔ یوپی، بہار اور بنگال میں ایک ایک عربی دان گریجویٹ کو مدارس عربیہ کی انسپکٹری یا علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) کی سپرنٹنڈنٹی کا عہدہ دیا گیا، اور عربی مدرسوں کی نگرانی کا کام اُنکے سپرد ہوا، چنانچہ یوپی میں ۱۹۱۴ء میں مولانا کے شاگرد خاص مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو ندوہ کے فاضل اور علی گڈھ کے ایم اے تھے انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے،

۴۔ بعض بعض صوبوں میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی طرح سرکاری امداد سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہوا، جیسے بہار میں مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ،

۵۔ مختلف عربی مدرسوں کے لئے حسبِ مرتبہ یا حسبِ ضرورت ماہانہ امدادیں ایڈ کے طور پر منظور ہوئیں،

۶۔ کلکتہ امپیریل لائبریری میں فن کتب خانہ کی تعلیم کے لئے ایک درجہ کھولا گیا،

۷۔ کلکتہ کے بجائے ڈھاکہ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کی ایک بڑی درسگاہ کھولی گئی،

۸۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے لئے بعض ماہرین علوم مشرقیہ کا تقرر ہوا جن میں سے ہمارے صوبہ میں پہلا نام ظفر حسن صاحب کا ہے، جو علی گڈھ کے ایم اے اور ہارونیز صاحب کی نگرانی میں آثار کے پڑھنے کی تعلیم پائے ہوئے تھے،

مولانا نے اس کمیٹی میں ندوہ کو بھی روشناس کیا، اور اُس کے بعض مقاصد کی تشریح کی، شروانی صاحب کو، ۲۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں: "مشرقی کانفرنس سے اچھے نتائج کی امید ہے، میں نے ندوہ کو وہاں زیادہ روشناس کیا اور بعض کارروائیوں میں وہ شامل کر لیا گیا" (شروانی - ۹۲)

مولانا زبانی فرماتے تھے کہ انھوں نے اس میں شمس العلماء کے خطاب کی بے قدری کا ماتم بھی بیان کیا، اور اس کا سبب یہ بتایا کہ اس کے عطا کرنے میں استحقاق اور قابلیت پر نہیں، بلکہ سرکاری سفارشوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

مولانا کے اس سفر شملہ کے بعض ادبی پہلو بھی ہیں۔ اثنائے قیام میں شملہ کے علم دوست وادب نواز دوستوں نے اپنے حلقہ میں لیا، جنھیں سے افگر مرادآبادی اور مولوی محمد عمر صاحب نعمانی کے نام معلوم ہیں، مولوی صاحب نے بھی الندوہ (سلسلۂ جدید) کے دوسرے پرچہ مورخہ فروری ۱۹۱۳ء میں اس ملاقات کے بعض ادبی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اس سفر میں کرنل عبدالمجید خاں پٹیالہ کے مہمان تھے، اور اس کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے جو اب شیخ ریاض الدین صاحب خلف شیخ شہاب الدین مرحوم کی ملکیت ہے، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی وجہ سے شملہ ندوہ سے ہمیشہ سے روشناس تھا، مگر مولانا کے اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کو وہاں مزید مقبولیت حاصل ہوئی،

ڈھاکہ یونیورسٹی
جولائی ۱۹۱۲ء

لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال کی تقسیم نے جس طرح ہندو بنگالیوں میں گورنمنٹ کی طرف سے غم و غصہ کا طوفان برپا کر دیا تھا، اسی طرح ۱۹۱۱ء میں جشن کے موقع پر اس کی تنسیخ نے مسلمانوں میں ہیجان برپا کر دیا، یہاں تک کہ نواب وقارالملک جیسے ٹھنڈی طبیعت کے آدمی نے ایک سخت مضمون لکھ کر گورنمنٹ کے اس فعل کو ناعاقبت اندیشی ٹھہرایا، گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لئے جو مرہم تجویز کیا، اس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے، اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار

کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے، چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اُس سب کمیٹی میں داخل ہوئے جو اسلامک اسٹڈیز کے لئے بنی تھی،

ڈھاکہ یونیورسٹی حقیقت میں اُس خواب کی تعبیر ہے جو شملہ مشرقی کانفرنس میں دیکھا گیا تھا، چونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور مدرسۂ عالیہ کے اصول پر سرکاری عربی مدرسوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم ہے، اس لئے ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک ایسا نظام قرار دیا جانا تجویز ہوا جس میں عربی علوم اور اسلامی دینیات کے ساتھ جدید علوم اور اعلیٰ انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے،

۵ اگست ۱۹۱۲ء کو اُس کی کمیٹی کی تاریخ تھی، اور اسی زمانہ میں بنگلور میں مدراس کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا، اور دونوں جگہوں سے طلبی تھی، مولانا اس زمانہ میں بمبئی میں تھے، راقم بھی ہمرکاب تھا، تو بنگلور کانفرنس کی شرکت کے لئے ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو مجھے روانہ فرمایا، اور خود دوسرے دن ۲۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ کی راہ سے ڈھاکہ تشریف لے گئے، (عبدالقادر ۲۵)

ڈھاکہ کی ترجیح کی دو وجہیں تھیں، ایک تو یہ کہ مولانا کو ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں سیرت کے لئے بعض کتابیں دیکھنی تھیں، دوسری یہ کہ بنگال کے احباب نے اُن کو لکھا کہ اگر وہ آجائیں تو مدرسۂ عالیہ وغیرہ کی اصلاح کا کام بھی انجام پاجائے، ۱۰ جولائی ۱۹۱۲ء کو ڈ

---

۱ مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے ۱۹۰۸ء میں بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ میں سرجان وڈ لفٹنٹ گورنر وقت نے بھی مولانا سے خواہش کی تھی کہ مدرسۂ عالیہ کی اصلاح میں مدد دیں، اس اجلاس میں میں بھی موجود تھا۔

شروانی صاحب کو خود لکھتے ہیں: "مدراس میں خود جاتا لیکن عین اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی کمیٹی میں گورنمنٹ بنگال نے مجھ کو ممبر کیا ہے، اور وہاں کے لوگوں نے مجھے لکھا ہے کہ اگر تم آجاؤ تو مدرسہ عالیہ وغیرہ کی ابتری کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہو سکتی ہے، اس لئے بایں شکستہ پائی و پیری کا وہاں جا رہا ہوں، سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں" (شروانی ۱۰۲)

ورنیکولر اسکیم الہ آباد ۱۹۱۲ء
اردو کو ناگری ہونے سے بچایا

۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو و ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جاسکے، نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے، پنڈت سندر لال وغیرہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ صوبجات متحدہ نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی تھی جس کے دفعہ ۳ و ۴ میں اس تجویز کی تائید میں حسب ذیل دلیل قائم کی تھی، "اردو زبان اور ہندی زبان دراصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ ان کی گرامر متحد ہے، اور جن زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے وہ زبانیں دراصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر ورنیکولر کورس ایسی مشترک زبان میں بنانا چاہئے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونوں بنجائے۔

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہے، اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی مہارت اور واقفیت کے لئے رامائن تلسی داس کورس میں داخل ہونی چاہئے، ہندوؤں کے لئے وہ لازمی کردی جائے، اور مسلمانوں کے لئے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا"

مولانا مرحوم بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، اور اس موقع پر اردو زبان کے تحفظ و بقا کیلئے

انھوں نے ایک مدلل یادداشت مرتب کی تھی، جو معارف اکتوبر ۱۹۱۶ء میں چھپ چکی ہے، اور مقالاتِ شبلی کے سلسلہ میں بھی شامل ہے، اس یادداشت کے اخیر میں مولانا نے یہ رائے دی تھی "اخیر میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونوں سے قریباً آزاد ہو اختیار کی جاسکتی ہے لیکن بالا (اونچے) کلاسوں کے لئے، اردو اور ہندی کو بالکل الگ الگ قائم کرنا چاہئے، اور اسی صورت میں دونوں اعلیٰ درجہ تک ترقی کرسکتی ہیں"

۴ر مارچ ۱۹۱۲ء کو مولانا نے مجھے مطلع کیا کہ "یہ یادداشت اس قدر مؤثر اور کامیاب رہی کہ خود انگریز اور ہندو ممبروں نے اس سے حرف بحرف اتفاق کیا، (سلیمان ۳۰)

۱۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا کہ تیسرے جلسہ میں مجھ کو کامل فتح نصیب ہوئی اور مسٹر برن نے جو تجویزیں پیش کی تھیں سب کی سب اڑ گئیں (شروانی ۹۶)

۱۵ر مارچ ۱۹۱۲ء کو کمیٹی کا پھر جلسہ ہوا، اور مولانا کی رائے کے مطابق وہی طے ہوا جس کا خلاصہ اوپر لکھا جا چکا،

مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت – اسی سال یوپی گورنمنٹ نے سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کے اجرا کی ایک کمیٹی مقرر کی اس کے ایک ممبر مولانا بھی تھے۔ ۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو اس کے اجلاس کی تاریخ تھی (شروانی ۹۷) مولانا کے خطوط میں پھر اس کمیٹی کا کچھ حال نہیں ملتا، اور زبانی بھی مجھے یاد نہیں کہ کیا پیش آیا،

صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی ۱۹۱۱ء–۱۹۱۲ء – اس زمانہ میں تاریخ صرف کسی قوم کے گذشتہ واقعات کا مجموعہ نہیں رہی ہے، بلکہ اس کے احاطہ میں دین و مذہب، اخلاق و عادات، معاشرت و تمدن

اسلافِ کرام اور پوری قوم کی ہزار سالہ عملی زندگی کی مکمل تصویر آجاتی ہے، اس لئے اس کی اہمیت گذشتہ زمانہ سے آج بہت زیادہ ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں آکر اس سے ایک اور کام لیا یعنی یہ کہ چونکہ انھوں نے ہندوستان کا تخت مسلمانوں سے چھینا تھا، اس لئے انھوں نے زیر درس اسلامی تاریخ کو ایسے رنگ میں لکھ کر پیش کیا کہ اس سے دو نتیجے نکلیں، ایک یہ کہ مسلمان طلبہ ان کے بیانات کو سچ سمجھ کر اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کارناموں سے خود شرمانے لگیں، اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مختلف قوموں کے طالب علموں میں تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو جائیں، چنانچہ ان کو یہ دونوں نتیجے حاصل ہوئے اور وہ سب کے سامنے ہیں، اگرچہ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنس اور اخبارات یہ شکایت کیا کرتے تھے، لیکن اب تک اس کام کے لئے کوئی باقاعدہ صیغہ قائم نہیں ہوا تھا، دہلی کے ندوی جلسہ میں جو مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوا، مولانا نے اس صیغہ کے قائم کرنے کے لئے ایک رزولیوشن پیش کیا جو منظور کیا گیا، اور خاکسار کو اس صیغہ کا سکریٹری مقرر کیا، خاکسار نے اس کام کو شروع کیا، مختلف صوبے کے مسلمان پروفیسروں سے خط و کتابت کی، اور ان سے اس بارہ میں مشورہ پوچھا، اور ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء کو عام اطلاع کے لئے اخباروں میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں واقف کار لوگوں سے اس قسم کی قابلِ اعتراض کتابوں کے نام دریافت کئے گئے تھے، اس کے جواب میں متعدد لوگوں نے مختلف کتابوں کے نام لکھ کر بھیجے، سب سے زیادہ قابلِ اعتراض کتاب سابق ڈائرکٹر تعلیم مارسڈن صاحب کی تاریخِ ہندوستان تھی جو نہ صرف الٰہ آباد بلکہ کلکتہ وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کے بھی جونیر کلاسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

دوسری کتاب ڈیلافوس صاحب کی تاریخ ہند تھی، ان دونوں کتابوں کو پڑھ کر ان کی قابل اعتراض
عبارتوں کو نقل کرکے جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں اسلامی اخبارات سے خواہش کی گئی کہ وہ ان کتابوں
کے نکالنے کی تحریک کی پوری تائید کریں، چنانچہ نہ صرف اردو بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے بھی
اس طرف توجہ کی، ساتھ ہی ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء کو مولانا کی طرف سے رجسٹرار صاحب یونیورسٹی
الٰہ آباد کی خدمت میں ایک یادداشت بھیجی گئی، جس میں یہ درخواست کی گئی کہ مارسڈن صاحب
کی اس کتاب کو مڈل کے کورس سے خارج کرکے اس کے بجائے موجودہ ڈائرکٹر تعلیم ڈیلافوس صاحب
کی تاریخ ہندوستان چند ترمیمات کے بعد داخل کی جائے، رجسٹرار صاحب نے ۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۰ء
سنڈیکیٹ کمیٹی کے حسب ہدایت اس تحریک کو ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کے نام بھیجدیا، اور
اس کی نقل مولانا کے پاس بھیجی،

یونیورسٹی نے اس یادداشت کی اطلاع مارسڈن صاحب کو جو اتفاق سے اس وقت
ہندوستان ہی میں تھے بھیجدی، اس کو پڑھ کر مارسڈن صاحب نے مولانا سے خط وکتابت شروع
کی، اور خود لکھنؤ آکر مولانا کے مکان پر ملاقات کی، ساتھ ہی فقہ کی ایک بڑی قلمی کتاب ہدیۃً
پیش کی، جو اب ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، اس ملاقات میں مارسڈن صاحب نے یہ وعدہ
کیا کہ وہ آئندہ اشاعت میں ان غلطیوں کی اصلاح کردیں گے، اس کے بعد یکم اپریل سنہ ۱۹۱۱ء
کو کلکتہ سے انھوں نے یہ خط لکھا کہ میں اب اپنی اس کتاب کے طبع ثانی کا انتظام کرنا چاہتا
ہوں اس لئے آپ کی حسب ذیل عنایتوں کا خواستگار رہوں،

(۱) ایک یہ کہ ڈیلافوس صاحب کو آپ یہ خط لکھدیں کہ چونکہ مارسڈن صاحب نے اپنی

کتاب کی طبع ثانی میں قابلِ اعتراض سطور کو نکال دینا منظور کر لیا ہے۔ اس لئے اب اس کتاب پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اب میں اپنی تحریک کو واپس لیتا ہوں۔

۲۔ آپ میری کتاب کے انگریزی اور اردو دونوں نسخوں کے حاشیوں پر اُن اصلاحات کو لکھ دیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے جواب میں شعبہ نے ۲۰ اپریل ۱۹۱۱ء کو حسبِ ذیل خط لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجا، جس میں ظاہر کیا کہ مارسڈن صاحب کی پوری کتاب جس لب و لہجہ میں لکھی گئی ہو اُس کے لحاظ سے وہ صرف چند عبارتوں کے بدل جانے سے پاک و صاف نہیں ہو سکتی بلکہ پوری کتاب کا ڈھانچہ بدلنے کے لائق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ۔ جولائی ۱۹۱۱ء کو اس کا جواب

شعبہ نے اس کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں کی تصحیح کی طرف توجہ کی، اور اُن کے قابلِ اعتراض مقامات کی نشان دہی کی، اور بعض دوسرے صوبوں کی تاریخی کتابوں کا بھی جائزہ لیا، اور ۰ اپریل ۱۹۱۲ء کے اجلاسِ لکھنؤ میں اس شعبہ کی پوری رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں قابلِ اعتراض عبارتوں کے جو اقتباسات پیش کئے گئے تھے اُن کو سن کر پورے جلسہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، اس لئے جب مولانا کھڑے ہوئے تو حاضرین سے پوچھا: "حضرات! کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کے ہزاروں لاکھوں بچے اُن الفاظ کو مدرسوں میں پڑھتے ہیں جن کو آج آپ نے سنا، اور جن کے سننے سے آپ کے دل لرز لرز گئے ہیں، اور جن پر آپ نے نفرت کے نعرے بلند کئے ہیں، کبھی اس سے پہلے آپ نے نعرے کئے تھے؟ سوال یہ ہے کہ جب آپ کا لڑکا پڑھ کر گھر میں آتا تھا تو کیا کبھی اس نے شکایت کی کہ یا ایسے

ناگوار اور غلط الفاظ ہم کو اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں، آپ کا احساسِ مذہبی زائل ہو رہا ہے، آپ کو اس پر رونا چاہئے کہ آپ کی فیلنگ آپکے احساسِ مذہبی باطل فنا ہوتے جاتے ہیں۔ (روداد لکھنؤ سنہ ۱۹۱۰ء)

اس صیغۂ تاریخ کی تاریخ یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہماری ان تحریروں اور تحریکوں سے چونک کر صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام نہ یہاں ہوا نہ وہاں ہوا، میں نے صیغہ کے سکریٹری کی حیثیت سے دو سال پہلے ہی ۱۵ اگست ۱۹۱۰ء کو ان کو یہ خط لکھا تھا: "جناب کرم، دام لطفکم، السلام علیکم، ندوۃ العلماء کے اعلان شعبۂ تعلیم کے بعد البشیر میں یہ خبر نہایت مسرت کیساتھ پڑھی کہ جناب نے بھی اس امر کی طرف توجہ فرمائی ہے، دوسری بار بعض اغلاط تاریخی کی اشاعت کے بعد پھر البشیر میں پڑھا کہ جناب نے معلمین و افاضل مدرسۃ العلوم کی ایک کمیٹی بغرض تصحیح اغلاط مرتب فرمائی ہے، چونکہ ایک قومی کام دو منتشر مقاموں میں انجام پانا خلافِ مصلحت ہے، اس لئے چند امور عرض ہیں، (۱) اس کام کو متحد قوت سے کیونکر عمل میں لایا جائے؟ (۲) آپنے اس کام کو عملی صورت میں لانے کی کیا تدابیر اختیار کی ہیں؟ (۳) انگریزی کورس کی جو تاریخ ازسرتاپا غلط ہو اس کو خارج از کورس کرنے کی کیا تدبیر ہے؟

امید ہے کہ قومی کاموں میں یکجہتی کو پیش نظر رکھ کر جواب سے مستفیض فرمائیں گے۔

مگر جواب حسب مراد نہیں آیا۔

عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک ۱۹۱۲ء

۱۹۱۲ء میں دہلی کے اجلاسِ ندوہ کے زمانہ میں مولانا کو یہ خیال ہوا کہ موجودہ عربی مدرسوں کا انتشار ان کو کسی ایک سلسلہ میں منسلک ہونے سے مانع ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں جو طوائف الملوکی ہے وہ جس طرح اس کے ہر شعبۂ حیات

کو محیط ہے، عربی مدرسے بھی اُس کے احاطہ سے باہر نہیں، اور اس کے سبب عربی مدرسوں کی بہت سی خرابیاں اور بدانتظامیاں دور نہیں ہو سکتیں، اس خیال کا آنا تھا کہ مولانا نے سب سے پہلے حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس اوّل دارالعلوم دیوبند کو اس بارہ میں خط لکھا، موصوف نے اس کا جو جواب دیا وہ حسبِ ذیل ہے: "مکرم والا درجت زید فضلکم تسلیم مع التکریم،

بوجہ تشریف آوری حجاج بندہ کو دہلی، میرٹھ، سہارنپور جانا ہوا، اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

آپ نے جو خیال وثوق مدرس کی نسبت ظاہر فرمایا نہایت ضروری اور قابلِ اہتمام ہے، اس کا بندوبست ہونا چاہئے،

جیسا آپ نے تصاویر کا انسداد فرمایا، اسی طرح دیگر جزئیات کی طرف وقتاً فوقتاً آپ کی توجہ نہایت مفید اور مؤثر ہوگی،

ایک مختصر مجمع میں جس میں چند حضرات بیرونی بھی شریک تھے، حالاتِ موجودہ پر کچھ بحث ہوئی دو باتیں قابلِ اہتمام سمجھی گئیں، اوّل یہ کہ مرکز بنایا جائے یا نہیں، اور بنایا جائے تو کس کو؟ دوسری یہ کہ اس کی صورت کیا ہو، امرِ اوّل کو موجودین نے منظور کیا اور بالاتفاق مسئلۂ مرکز کو مستحسن کہا، تعیینِ مرکز کی نسبت جو رائے ہوئی تو بعد گفتگو یہی قرار پایا کہ مدارسِ اسلامیہ بجز دیوبند اور کسی کی ماتحتی نہ پسند کر سکتے ہیں، اور نہ یہ امر مناسب ہے،

بقیہ حضرات سے استفسار کے بعد جو امر طے ہوگا اطلاع دونگا، اور دوم یعنی اس سلسلہ کی صورت اور شرائط و قیود کیا ہوں گی، یہ ایسی بحث ہے جو جملہ اراکین وغیرہ کے بدوں اس کا تصفیہ قابلِ اعتبار نا ممکن ہے، بعد مشاورت اگر کوئی امر قابلِ عملدرآمد طے ہوگیا تو جناب کو اطلاع دی جائے گی، آپ کسی

تجویز مفید سے اطلاع فرمائیں، تو غالباً اس وقت میں مفید ہو گی،

مجھ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو اور ہم کو یونیورسٹی سے کیا تعلق، رکھنا مناسب ہو، غالباً آپ نے کوئی امر ضرور مقرر فرمایا ہوگا" والسلام بندہ۔ محمود حسن۔ دیوبند ۱۰ ربیع الاول ۲۹ھ

اس جواب کی بنا پر مدرسوں کی تنظیم کے خیال کو چھوڑ کر صرف مذہبی ضروریات کے لئے ندوۃ العلما کی مرکزیت کی تجویز پیش ہو کر منظور ہوئی،

مدینہ یونیورسٹی کی تجویز ۱۹۱۳ء

۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ اور بلقان میں عیسائی بلقانی ریاستوں کی بغاوت نے دنیائے اسلام میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی، اس کی تاریخ اس زمانہ کے اخبارات کے صفحوں میں ہے، اس وقت دولتِ عثمانیہ کی امداد و تحفظ کے لئے ساری دنیا کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم، مولوی ظفر علی خاں اور بہت سے ہندوستانی اہلِ فکر مسلمانوں نے ترکی کا سفر کیا، اور وہاں کے اہل الرائے اکابر سے ملاقاتیں کیں، اسی سلسلہ میں یہ قرار پایا کہ مدینۂ پاک میں ایک مدینہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں سارے اسلامی ملکوں کے طالب العلم یکجا ہوں، اور اسلامی دنیا کے بڑے بڑے ماہرین علوم اس میں درس و تدریس کے لئے اپنے اوقاتِ عزیز کو وقف کریں، ہندوستان کی طرف سے اس میں مولانا شبلی اور ان کے عزیز و شاگرد مولانا حمید الدین صاحب کے نام لئے گئے، اس سلسلہ میں اس زمانہ کے "زمیندار" اور "الہلال" میں بہت سی تجویزیں زیرِ بحث آئی تھیں، مکاتیبِ شبلی میں بھی ۹ رمئی ۱۹۱۳ء کے خط میں اس کا ذکر آگیا ہے، (ابو الکلام جلد دوم ۲) ۱۰ جون ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی عبد الباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں:- "مدینہ یونیورسٹی کی تجویز

میں قسطنطنیہ کو لکھنؤ سے توارد ہوا، خیر لیکن بہت ضروری چیز ہے، افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کر سکوں، پہلی سی بات ہوتی تو یہ جانا کیا مشکل تھا: (۵)

لیکن افسوس ہے کہ بلقان کے معرکہ میں ترکی کی ناکامی سے ان تجویزوں پر اوس سی پڑ گئی،

مسلم یونیورسٹی ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء

علی گڑھ تحریک میں مسلم یونیورسٹی کا تخیل تمام تر سید محمود مرحوم کا ساختہ و پرداختہ ہے، سب سے پہلے انہی نے ۱۸۷۳ء میں ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا جو کیمبرج و آکسفورڈ کی طرح حکومتِ وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، اس کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے سرسید کی وفات کے بعد اس خیال کو آگے بڑھایا، اور اس کو سرسید کی یادگار ٹھہرا کر ایجوکیشنل کانفرنس کے مقصد میں اس کو داخل کر دیا، اس وقت سے ۱۹۱۱ء تک جبکہ مسلم یونیورسٹی نے خواب کے بجائے تعبیر کی صورت اختیار کی کانفرنس کے ہر اجلاس کے صدر نے اس خوش آیند خواب کو دہرانا اپنے خطبہ کا ضروری حصہ قرار دے لیا تھا،

مولانا شبلی مرحوم کالج کے تعلق سے اس تحریک کی اندرونی تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ خواب کبھی ممنونِ تعبیر نہ ہوگا، چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں، کہ "ندوہ میں چند لڑکوں کو انگریزی پڑھنے کی اجازت دینا، اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے جس قدر نواب محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی" (۳۶)

لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دس بارہ برس کے بعد یہ فرضی یونیورسٹی جن لوگوں کے ہاتھوں تعمیر بنجائے گی، ان میں خود مولانا کا ہاتھ بھی شامل ہوگا،

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بید

جوش وخروش تھا، اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بیحد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی، اور ان کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھ ہوتی تھی، حکام کے سامنے ان ناخوشگوار حالات کا تدارک ازبس ضروری تھا، اس کے لئے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر اسلامی تحریک شروع کردی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو ادھر سے اُدھر پھیر دے، یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لیکر ہز ہائینس سر آغا خاں جو اس وقت کے مسلم قومی رہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے، علی گڈھ پارٹی کے ہاتھوں سے مسلمانوں کی رہنمائی کی باگ نکل رہی تھی، اس کو دوبارہ ہاتھ میں لینے کے لئے بھی یہ تدبیر کارگر ہو سکتی تھی، بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا، خود ہز ہائینس سر آغا خاں نے صوبوں کا دورہ کیا، اور بڑے بڑے امراء کے دروازوں پر خود جا جا کر دستک دی اور چندہ کی بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں، اور یوں بھی عام طور سے ملک کے مختلف حصوں میں چندوں کی وصولی کی کارروائی شروع ہوگئی اور تھوڑے دنوں کے بعد اکتیس لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری ہوگئی، مولانا نے اس کی تائید میں جنوری ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں حسبِ ذیل نوٹ لکھا، "حکومتِ انگریزی کی ابتدائی تاریخ سے آج تک مسلمانوں نے کبھی ایسی بلند ہمتی کا اظہار نہیں کیا، جو آج ایک یگانۂ قوم ہز ہائینس سر آغا خاں کی ذات سے وجود میں آئی، محمڈن یونیورسٹی ایک خواب تھا، جو گو نہایت خوشگوار و شیریں تھا، لیکن پھر بھی خواب تھا، ہز ہائینس موصوف نے اس کی تعبیر بتائی، اور بتائی نہیں بلکہ کر کے دکھا دیا، چھ کروڑ مسلمان اس کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے جو ایک ذاتِ واحد نے انجام دیا، خدا کرے وہ دن آئے کہ علی گڈھ میں مسلمان فیلو نظر آئیں، مسلمان تعلیمی اسکیم بنائیں، مسلمان نصاب تعلیم تجویز کریں، فیلو شپ کی امیدواریاں ہوں، مسابقت ہو،

دونوں کی کشمکش ہو، اور فرق اور رنج دونوں نہیں ہوں: ؎

از ما بہ ما سلام و ہم از ما بہ ما پیام
رنجے دلے مباد سلام و پیام ما

اس کے بعد ہی لکھنؤ میں اس کا وفد آیا، تو بڑی خوشی سے اس کی کوششوں میں شریک ہوئے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک فیاض مسلمان نے ندوہ کی طرف سے دس ہزار روپیہ اس فنڈ میں داخل کئے، اس پر خوش ہو کر فروری سنہ ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں دوسرا نوٹ لکھا: "ہز ہائینس سر آغا خاں بہادر کی سرپرستی میں محمڈن یونیورسٹی کا جو وفد لکھنؤ میں آیا، اس کا جس جوش، جس شان، جس خلوص کے ساتھ استقبال کیا گیا، وہ مدت تک اہل لکھنؤ کو یاد رہیگا، امیر و غریب، وکلاء، تاجر، بیرسٹر، عام، خاص، غرض ہر قسم کے لوگ اسٹیشن پر ہز ہائینس موصوف کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے، یونیورسٹی کے لئے چندہ کی جو فہرست کھولی گئی، اس میں بھی ہر قسم کے لوگوں نے اپنے نام لکھوائے، ندوۃ العلماء اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اگرچہ ابھی تک خود قومی فیاضیوں کا محتاج ہے، لیکن محمڈن یونیورسٹی کی تکمیل میں اس نے بھی نمایاں حصہ لیا، اور اپنی طرف سے دس ہزار کی رقم پیش کی ممکن ہے، لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ندوہ کو جب خود اپنی تکمیل بلکہ اپنی بقاء کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے تو وہ دوسروں کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے، ممکن ہے کسی کو یہ بھی خیال ہو کہ ندوہ کو یہ کیا حق ہے کہ وہ ندوہ کے سرمایہ کو دوسرے کام میں لگائے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ رقم ندوہ کے سرمایہ سے نہیں دی گئی، بلکہ ندوہ کے ایک بہی خواہ نے اپنے پاس سے دی، باقی یہ کہ ندوہ خود محتاج ہے، تو اسلام میں اس ایثار نفس کی مثالیں موجود ہیں کہ محتاجوں نے محتاجوں کی شرکت کی ہے۔"

لاہور میں ہز ہائینس سر آغا خاں کی سرکردگی میں جو وفد گیا، اس کے ایک ممبر خود مولانا بھی تھے،

چنانچہ وہیں اپنی یہ مشہور نظم پڑھی،

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی ما باشد — کہ ایں سر رشتۂ تعلیم را در دست ما باشد

علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم — الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد

بساطے تازۂ تعلیم و طرحے نو در اندازیم — کہ در بزم نوی پیشینیاں را نیز جا باشد

کنوں دہ سال شد کیں خواب نوشیں می نمودیم — کہ خوابے ایں چنیں خوش و جاں از و جاں افزا باشد

ولے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے — گماں بردیم کیں اندیشۂ از روے خطا باشد

گہے با خویش می گفتیم کہ آساں گردد ایں مشکل — ولے وابستۂ صد محنت و رنج و عنا باشد

بود آساں کہ چوں طفلاں ز نقش کشتی و لنگر — بگوئی کیں و بام است ایں قصر سرا باشد

نہ آساں باشد درسگاہے را بنا کردن — کہ خود ہر گونہ گوں مجبوری ما را شفا باشد

دریں بودیم ما کز پردۂ گاہ غیب سر بر زد — ہمایوں طلعتے کیں عقدہ را مشکل کشا باشد

سر آغا خاں کہ خود خواب آں تعبیر نوشیں را — چہ خوش باشد کہ خوابے را تعبیر از خدا باشد

بکوشش ہائے شیوا ہمتی سر آغا خاں خدا بنمود — و لیکن کشتی اسلامیاں را نا خدا باشد

کنوں بینی کہ زود آں گلشن رنگیں بپا گردد
کہ شبلی ہم درو یک بلبل رنگیں نوا باشد

"مجلس تاسیس جامعۂ اسلامیہ (مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی) کے نام سے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط بنانے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی مولانا اس کے بھی ممبر تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ یونیورسٹی کیا ہوگی، ۵ مارچ ۱۹۱۱ء کو مولانا ابو الکلام کو لکھتے ہیں:- "یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا،

قطعی ہو، باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خود جانتے ہیں، لیکن بہرحال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے" (۲۹)

اسی لئے وہ یونیورسٹی کمیٹی کے سارے کاموں میں شریک رہے، وزیر تعلیم سے گفتگو کرنے کے لئے جو وفد شملہ گیا تھا وہ اس کے بھی ممبر تھے، راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں لکھنؤ میں یونیورسٹی کے اجلاس بار بار ہوتے تھے۔ ۲۰ اگست ۱۹۱۱ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کو لکھتے ہیں: "یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں، بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے، میں بھی ممبر ہوں، اس لئے شریک ہوتا ہوں، اس کے بعد شملہ ڈیپوٹیشن میں جانا ہے" (۳۱)

یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان بعض شرائط کے تصفیہ کا تھا، ان میں تین باتیں سخت متنازعہ فیہ تھیں،

(۱) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہو، اور گورنمنٹ علیگڈھ یونیورسٹی کہتی تھی

(۲) مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں ان کے الحاق کا اختیار ہو، گورنمنٹ اس کو تسلیم نہیں کرتی تھی، اور اب تک تسلیم نہیں کیا،

(۳) گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے متعلق امور کے آخری فیصلہ کا اختیار (ویٹو) اپنے حکام اعلیٰ کو دینے پر مصر تھی، اور یہ مسلمان اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے،

ارباب علی گڈھ متردد تھے کہ اہم مسائل میں عام مسلمانوں کو دخل اندازی کی حاجت ہی نہیں، بہرحال اس بحث کو طے کرنے کے لئے لکھنؤ کے قیصر باغ میں یونیورسٹی کا اساسی جلسہ (فونڈیشن کمیٹی) ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہوا جس میں ملک کے تمام اکابر اور رہنمایان وقت شریک تھے جس میں مولانا بھی تھے، ارباب علی گڈھ، راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک طرف تھے

اور احرار کی جماعت، مسٹر محمد علی (اب مولانا) اور مولانا ابو الکلام کی سیادت میں دوسری طرف تھی، پہلے روز کے اجلاس میں محمد علی صاحب نے جلسہ میں نہایت جوش پیدا کیا، اور احرار کی سربراہی کی، لیکن دوسرے دن دفعتہً معاملہ بدل گیا، واقعاتِ شنیعہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہیں، بہرحال جلسہ میں یہ نظر آیا کہ محمد علی صاحب ارباب علی گڈھ کی حمایت میں ہیں، اور تنہا مولانا ابو الکلام ادھر ہیں، کہتے ہیں کہ جا بجا کالج کے طلبہ جن کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا وہ نہایت اہتمام سے جلسہ کے اطراف میں باقاعدہ بٹھائے گئے، اور انھوں نے اس قدر جلسہ پر استیلا حاصل کر لیا کہ موافقین کا پیر زور سے دل بڑھایا، اور مخالفین کو شی شی کی آواز سے مبہوت کر دیا، مخالفین نے ہر چند بولنے کی کوشش کی ناکامی ہوئی، یہ واقعات اس زمانہ میں نہایت اہم تھے،

اسی جلسہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ معاملات کے تصفیہ کے لئے وائسرائے کی خدمت میں ارکان کا ایک وفد بھیجا جائے تو خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی، مگر جب ان کا نام بھی داخلِ وفد کر دیا گیا تو وہ چپ ہو گئے،

ان میں سے ہر واقعہ پر مولانا کی متعدد نظمیں ہیں جو ان کے اردو کلیات میں جمع کر دی گئی ہیں، جن صاحبوں کو شوق ہو وہ ان نظموں کو واقعات سے ملا کر دیکھ لیں، ان نظموں نے عام لوگوں میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں نہایت گہری دلچسپی پیدا کر دی تھی،

لطیفہ:۔ مولانا کے فارسی قطعہ کے دوسرے مصرع ع کہ "ایں سررشتۂ تعلیم در دستِ ما باشد" کے جواب میں خوب فرمایا تھا ع "بشرطے آنکہ ایں دستِ شما دستِ شما باشد"

---

[1] خاکسار مؤلف اس جلسہ میں خود شریک تھا،

مذہبی اور قومی کام

وقف علی الاولاد
۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۲ء

اسلام میں اپنی اولاد اور عزیزوں پر بلکہ خود اپنے آپ پر وقف کرنا بھی جائز ہے۔ ہندوستان پر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو چونکہ یہ مسئلہ ان کے قانون کے مطابق نہ تھا اس لئے انگریزی عدالتوں نے اس قسم کے مقدمات میں اپنے فیصلوں میں اس اسلامی قانون کو رد کر دیا، حالانکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر نہ صرف مسلمانوں کی جائداد کا تحفظ و بقا موقوف تھا بلکہ اس کے ذریعہ سے ان نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح بھی ہو سکتی تھی جو اپنے آباؤ اجداد کی جائداد کو نہایت بیدردی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اپنی ہوائے نفسانی پر قربان کر رہے تھے۔

سرسید نے اسی خیال سے اپنی لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں وقف خاندانی کے نام سے ایک مسودۂ قانون کے پیش کرنے کی تیاری کی تھی، جس میں گورنمنٹ سے یہ چاہا تھا کہ ایسی وقف جائداد کی تولیت کا مسئلہ ہمیشہ حکام کی مرضی سے طے ہو اور نیز یہ جائداد کسی سرکاری مطالبہ مالگذاری میں ضبط نہ ہو، مگر ایک طرف بعض علماء نے اس سے اختلاف کیا اور دوسری طرف سرسید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے ان کو بتایا کہ گورنمنٹ اس قانون کو اس لئے منظور نہیں کرسکتی کہ ولایت کے مقننوں کی یہ قطعی رائے قرار پا چکی ہے کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لئے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔[1]

[1] حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۳۰۹۔

جسٹس مولوی سید امیر علی صاحب جس زمانہ میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج تھے، وقف کے ایک مقدمہ میں (میر محمد اسماعیل بنام منشی چرن گھوش) اس مسئلہ کے جواز کے تمام دلائل لکھے لیکن حکام پریوی کونسل نے ۱۸۹۴ء میں (بہ مقدمہ ابوالفتح بنام رسمایا دھر چودھری مندرجہ جلد ۲۲ ترجمہ انڈین لارپورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء) ان دلائل کو ناکافی خیال کیا، اور وقف علی الاولاد کو ناجائز قرار دیا، اس وقت سے مسلمانوں کو برابر یہ خیال رہا کہ اس غلط فیصلہ کی تصحیح کی جائے،

چنانچہ خود مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی کے مشہور رسالہ نائینٹینتھ سنچری میں اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلل مضمون لکھا، لیکن وہ بھی بے اثر رہا، بعد ازاں کلکتہ کے ممتاز وکیل مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے ایک نہایت مدلل ومفصل رسالہ لکھ کر بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک عرضداشت کے ساتھ بھیجا، نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے جب وہ انڈیا کونسل کے ممبر تھے اس وقت کے وزیر ہند سے کہکر اس غلطی کی اصلاح کی کوشش کی لیکن یہ تمام پرزور کوششیں اور یہ باثر شخصیتیں اس لئے ناکامیاب رہیں کہ اس منزل کے طے کرنے کا جو راستہ تھا سب اس سے الگ جاتے تھے،

سب سے مقدم بات یہ تھی کہ گورنمنٹ کے کانوں تک جو صدا پہنچائی تھی، وہ عام صدا ہونی چاہئے تھی، لیکن اب تک جو کچھ کیا گیا تھا، وہ انفرادی حیثیت سے کیا گیا تھا، مولوی سید امیر علی صاحب مرحوم کے مضمون کی خوبی میں کیا کلام ہوسکتا تھا، لیکن پھر بھی وہ ایک شخص خاص کا خیال تھا، مولوی محمد یوسف صاحب مرحوم نے بے شبہ اس کے آگے ایک قدم بڑھایا تھا، اور بنگال ایسوسی ایشن کی طرف سے درخواست بھیجی تھی، لیکن یہ ایسوسی ایشن کل ہندستان

کیا کل بنگال کی زبان بھی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ ملک کو اس درخواست کی خبر بھی نہیں ہوئی، اور گورنمنٹ نے مارچ ۱۹۱۰ء میں صاف جواب دیدیا کہ پریوی کونسل کے فیصلہ میں کوئی مداخلت نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے پریوی کونسل کا فیصلہ جو اس کے خلاف ہو منسوخ ہونا چاہئے، لیکن جو لوگ یہ صدا بلند کرتے تھے، وہ مسلمانوں کے مذہبی لیڈر یا پیشوا نہ تھے، اس لئے اُن کی آواز مذہبی آواز نہیں ہوسکتی تھی، لیکن مولانا نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا جو راستہ اختیار کیا اس میں اس قسم کے نشیب و فراز نہ تھے،

مولانا کا خیال اس مسئلہ کی طرف ۱۹۱۰ء کے شروع میں رجوع ہوا، اس وقت اُن کے سامنے چند امور قابلِ غور تھے،

۱- آیا یہ مسئلہ حقیقت میں مسلمانوں کا مسلّمہ مذہبی مسئلہ ہے یا نہیں؟

۲- اگر ہے تو گورنمنٹ کو کیونکر اس کا یقین دلایا جاسکتا ہے،

۳- گورنمنٹ پریوی کونسل کے فیصلہ میں مداخلت کرسکتی ہے یا نہیں؟

چونکہ دفعہ اول میں اُن کو کوئی شبہ نہ تھا اس لئے دفعہ دوم اور سوم کے متعلق انھوں نے قوم کے اکثر ماہرین قانون اور سربرآوردہ اصحاب مثلاً سید علی امام بیرسٹر پٹنہ پریسیڈنٹ مسلم لیگ، مولوی مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ، مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور، نواب سید امیر حسن خاں کلکتہ، مولوی حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ، نواب وقار الملک بہادر علی گڈھ، سید ظہور احمد صاحب بیرسٹر لندن، مولوی محمد شریف آنریری سکریٹری وقف کمیٹی لندن، مولوی محمد یوسف صاحب وکیل ہائیکورٹ کلکتہ، مولوی مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر ایٹ لا لکھنؤ، نواب نصیر حسین خاں خیال کلکتہ، نواب عماد الملک مولوی

سید حسین بلگرامی وغیرہ سے خط کتابت کی، فروری اور مارچ ۱۹۰۰ء میں ان میں سے اکثر حضرات نے خطوط کے جواب دیئے جن کا خلاصہ انجمن وقف اولاد کی کاروائی میں درج ہو، سب نے متفقاً کامیابی کی امید ظاہر کی اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا، اور خواہش کی کہ صحیح طریقہ سے اس تحریک کو جاری کیا جائے،

ان تمام بزرگوں کے نزدیک سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ اس سلسلہ کے متعلق گورنمنٹ کو یقین دلایا جائے کہ یہ مسلمانوں کا مسئلۂ مذہبی مسئلہ ہے، اس لئے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ پہلے اس کو علماء کے سامنے پیش کیا جائے، ندوۃ العلماء کا جلسۂ عام دارالعلوم کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں نومبر ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ میں ہو رہا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے اس مسئلہ کو ایک تجویز کی صورت میں پہلے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا، مولوی خلیل الرحمان صاحب کے سوا باقی سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا، اور طے پایا کہ تمام ہندوستان کے علماء سے پہلے فتوے حاصل کئے جائیں، اس کے بعد آگے کارروائی کیجائے، یہی تجویز ندوہ کے اس کھلے اجلاس عام میں پیش ہو کر منظور ہوئی، اس منظوری کے بعد کام شروع کر دیا، عام اعلان کے لئے ۴ دسمبر ۱۹۰۰ء کو الندوہ میں ایک کھلا خط شائع کیا جس میں کام کے حسب ذیل مراتب مقرر فرمائے،

(۱) ایک رسالہ اردو زبان میں نہایت تفصیل اور تحقیق کے ساتھ فقہ کی مستند کتابوں سے تیار کیا جائے، جس میں ثابت کیا جائے کہ وقف اولاد فقہ اسلامی کا ایک مسلّم اور قطعی مسئلہ ہے،

(۲) اس رسالہ پر تمام علمائے ہندوستان سے دستخط کرائے جائیں،

(۳) اس رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرایا جائے،

(۴) ہندوستان کے ہائیکورٹوں اور پریوی کونسل نے جس بنا پر وقفِ اولاد کو ناجائز قرار دیا ہو ان دلائل سے تعرض کیا جائے، اور اُن کی غلطی دکھائی جائے،

(۵) ایک محضر اس مضمون کا تیار کیا جائے کہ چونکہ وقفِ اولاد کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اس لئے پریوی کونسل نے اس کے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی ہے اس کی اصلاح قانون کے ذریعہ سے کرائی جائے

(۶) اس محضر پر تمام اسلامی انجمنوں اور عام مسلمانوں کے دستخط کرا کے گورنمنٹ کے پاس بھیجا جائے

ان تمام امور کے انجام دینے کے لئے ایک رقم کی ضرورت ہے، جس کی تعداد تخمیناً دو تین ہزار ہوگی جس سے رسالہ کی تیاری، انگریزی ترجمہ اور خط و کتابت کے مصارف ادا ہو سکیں، اس بنا پر ہم تمام مسلمانانِ ہندوستان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر وہ اس تدبیر کو ضروری سمجھتے ہیں تو خاکسار کو مطلع فرمائیں اور یہ بھی ظاہر کریں کہ وہ وجوہ مفصلۂ ذیل میں سے کس قسم کی شرکت کر سکتے ہیں۔

(۱) مشورہ اور رائے میں شرکت،

(۲) چندہ میں شرکت،

(۳) رسالہ کی ترتیب اور تیاری، قانونی مشورہ، اور انگریزی ترجمہ کرنے میں شرکت،

لوگوں نے بڑی خوشی سے ان تینوں کاموں میں شرکت کا وعدہ کیا،

اس کے بعد ندوۃ العلماء کی تجویز کے مطابق مولانا نے تمام علماء سے استفتا کیا، سب سے پہلا فتویٰ مولانا فضلِ حق[1] صاحب رامپوری مدرس اعلیٰ مدرسہ عالیہ رامپور نے لکھا، اور اس کے بعد عام علماء نے

---

[1] شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب و مولانا عبدالحق خیرآبادی و رکن ندوۃ العلماء، افسوس کہ جو لائی ۱۹۴۰ء / ۱۳۵۹ھ میں تقریباً اسّی برس کی عمر میں وفات پائی، بڑے پایہ کے مدرس تھے، اخیر عمر تک درس و تدریس میں مصروف رہے

علما نے اس پر دستخط ثبت فرمائے، بعضوں نے کچھ اور عبارتیں اور حواشی بھی بڑھائے، عموماً دونوں مذہب (شیعہ وسنی) کے علماء نے متفقاً فتوے لکھا کہ یہ مسئلہ شریعت اسلام کا مسلّم مسئلہ ہے، اور پشاور سے بنگال تک کے علما نے اس فتوی پر دستخط کئے، اور جب اکثر جگہ سے فتاوے آگئے تو مولانا نے خود اس مسئلہ پر ایک نہایت مدلل رسالہ لکھا، جس میں پریوی کونسل کے تمام دلائل کے جواب دیئے، اور مسئلہ کی شرعی علتیں ظاہر فرمائیں، اور ندوۃ العلماء کے جلسہ انتظامیہ مورخہ ۳ مئی ۱۹۰۹ء میں اس کو پیش کیا، جلسہ نے اس کے متعلق حسب ذیل رزولیوشن منظور کئے،

۱- رسالہ وقف علی الاولاد جو اس مسئلہ پر لکھا گیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا جائے، مع ان فتووں کے جو علما نے لکھے ہیں، نیز علمائے حرمین سے بھی فتوے حاصل کئے جائیں، اور مقدمات میں اس کے متعلق جو فیصلے عدالتوں میں ہو چکے ہوں وہ بہم پہنچائے جائیں،

(۲) ایک مجلس وقف زیر حمایت ندوہ قائم کی جائے، اور ہندوستان کے تمام مقتدر مجالس سے اس میں مدد لیجائے،

(۳) ایک عرضداشت اس کے متعلق تیار ہو جس میں گورنمنٹ سے خواہش کی جائے کہ وہ شریعت اسلام کے موافق قانون تیار کر دے،

(۴) اس عرضداشت پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے دستخط کرائے جائیں اور دستخط کے بعد وہ ایک معزز اور مقتدر ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے وائسرائے کی خدمت میں پیش کیجائے،

ان ضروری مراتب کے طے ہو جانے پر مئی ۱۹۰۹ء سے مولانا نے عملی کارروائیاں شروع کیں، بزرگان قوم سے مجلس وقف کی ممبری قبول فرمانے کی درخواست کی، عرضداشت

دستخط کرانے کے لئے فارم تیار کرا کے نہایت کثرت سے شائع کئے، اور متعدد آدمیوں کو مقرر کیا جنھوں نے دورہ کر کے ہر طبقہ کے لوگوں سے اس پر دستخط کرائے، ان دستخطوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی،

تمام کارروائیوں کے لئے ایک معتدبہ رقم کی ضرورت تھی، اس لئے چندے کی تحریک کی، اہلِ خیر نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا، چنانچہ لاہور، بہار، مدراس، سورت اور بعض دوسرے شہروں میں اس کی اعانت وہمدردی کے لئے نہایت شاندار جلسے ہوئے اور لوگوں نے بخوشی چندے دیئے،

سنہ ۱۹۱۰ء میں شیعہ کانفرنس نے بھی اس کی تائید میں ایک خاص رزولیوشن پاس کیا، اُسی سال جنوری میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں بھی ایک خاص رزولیوشن منظور ہوا جس کی تحریک مولوی عزیز مرزا مرحوم نے کی جو اس وقت لیگ کے سکریٹری تھے، مولانا نے بھی صدر انجمن مسلم لیگ کے ایما سے اس مسئلہ پر تقریر کی، اور یہ طے ہوا کہ ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے الگ الگ ہیوریل گورنمنٹ کی خدمت میں جائیں اور حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن بھیجنا قرار پائے تو ندوہ اور مسلم لیگ دونوں کے ممبر بہ تعداد مساوی شریک ہوں اور مشترکہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، کیونکہ یہ مسئلہ پولٹیکل اور مذہبی دونوں حیثیتیں رکھتا ہے، اس لئے دونوں حیثیتوں سے گورنمنٹ کی خدمت میں سفارت جانی چاہئے،

مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کا جو جلسہ دہلی میں ہوا، اس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا، اور مولانا نے اس کی اصلیت اور صورتِ شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی، اور اسی وقت تک اس کے متعلق

جو کچھ کارروائی ہو چکی تھی اُس کو پیش کیا، مولانا کے بعد شیخ عبد القادر بیرسٹر ایٹ لا، چودھری سلطان
محمد خاں بیرسٹر ایٹ لا، مولانا سید عبد الحئی صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس
امرتسر اور چند دیگر اشخاص نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی، اور آخر میں شیخ عبد الرحیم
صاحب تاجر چرم کی طرف سے وقف علی الاولاد فنڈ کے لئے پانچ سو روپے کے چندے کا اعلان ہوا۔

اسی سال میموریل کا مسودہ جس کو مئی ۱۹۱۰ء میں غالباً سر تیج بہادر سپرو (الٰہ آباد) نے تیار
کیا تھا (شروانی ۱۰) شائع ہوا، اور ملک کے مقننین اور اہل الرائے کی خدمت میں ترمیم و اصلاح
کے لئے روانہ کیا گیا، انگریزی اور اردو اخبارات میں بھی اس کی ایک ایک کاپی بھیجی گئی لیکن
غالباً یہ میموریل قابلِ اعتماد ثابت نہیں ہوا، اس لئے مولانا نے اس کے لکھوانے کے لئے قابل
اشخاص کی جستجو کی، اکتوبر ۱۹۱۰ء میں نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے اس کے لکھنے
پر آمادگی ظاہر کی، مگر یہ شرط کی کہ مولانا خود حیدرآباد آئیں مگر ندوہ کی ضرورتوں کی وجہ سے وہ نہ
جا سکے (شروانی ۱۰)، جب ہندوستان میں کوئی شخص اس قابل نہ ملا تو جنوری ۱۹۱۱ء میں
تمام کاغذات لندن میں ایک ایسے بزرگ (غالباً مولوی امیر علی) کے پاس روانہ کئے جن سے
بڑھ کر کسی کو اس مسئلہ پر لکھنے کا حق حاصل نہ تھا۔

اسی زمانہ میں کونسل کی اصلاح و ترقی (ریفارم) کی وہ اسکیم ہندوستان میں جاری ہو گئی
جس کو منٹو مارلے ریفارم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس اسکیم کے نفاذ نے وقف علی الاولاد
کی کوششوں کا راستہ آسان کر دیا یعنی اب کونسل کو وضع قوانین کا تھوڑا بہت اختیار حاصل
ہوا، اس لئے مولانا نے اس تجویز کو وائسرائے کی کونسل کے مسلمان ممبروں کے اندر ہر ممکن طریقہ

منٹو مارلے ریفارم
جاری ۱۹۰۹ء

سے کامیاب بنانا شروع کر دیا، اس کے لئے بار بار کلکتہ جا کر مسلمان ممبروں سے گفتگو کی، اور انھوں نے اس کی تائید پر پوری آمادگی ظاہر کی، ان میں سب سے پیش پیش مولوی مظہر الحق مرحوم بیرسٹر پٹنہ تھے، انھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے اثر سے ہندو ممبروں کو بھی اس کی تائید کے لئے آمادہ کیا۔

ان مختلف کوششوں کا یہ اثر ہوا کہ سارے ملک میں اس مسئلہ کے متعلق ایسی پُر زور آواز پیدا ہوئی کہ گورنمنٹ بھی اس کے سننے سے انکار نہ کر سکی، چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس میں جب مسٹر محمد علی جناح نے کونسل میں سوال کیا کہ گورنمنٹ اس تحریک سے جو اس مسئلہ کے متعلق مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے واقف ہے یا نہیں؟ اور اس کے لئے وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ تو گورنمنٹ نے صاف اعتراف کیا کہ یہ صدائیں اس کے کانوں میں آچکی ہیں، لیکن وہ خود قانون بنانا نہیں چاہتی، بلکہ جو صورت اس کے متعلق مسلمان پیش کریں گے اس پر غور کرنے کے لئے وہ آمادہ ہے، اس جواب سے لوگوں کو ہمت بندھی، اور آخر مولوی مظہر الحق، مسٹر جناح اور دوسرے قانون داں ممبروں کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ آئندہ اس مسئلہ کو ایک بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا جائے، چنانچہ اس تجویز کے مطابق ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء کو مسٹر جناح نے اس مسئلہ کو وقف بل کی صورت میں کونسل میں پیش کیا، اور اس پر ایک مفصل تقریر کی جس میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک، ندوۃ العلماء کی تجویز اور مسلمانوں کے احتجاجی جلسوں اور تجویزوں کا ذکر کیا، اور مولانا موصوف نے جو رسالہ پریوی کونسل کے دلائل کے جواب اور مسئلہ کی فقہی حیثیت کی تشریح میں لکھا تھا، اس کا خلاصہ پڑھ کر سنایا، اور بتایا کہ مسلمانوں میں مولانا کا کیا

کتنا اونچا، اور مسلمانوں میں اُن کی وقعت کس درجہ ہے، اور اس بنا پر اُن کی رائے کا وزن کتنا ہو سکتا ہے، اور یہ کہہ کر اس کے اقتباسات جگہ جگہ سے پڑھ کر سنائے، اور بتایا کہ مولانا کی زیرِ نگرانی علمائے ہند کی مشہور مجلس ندوۃ العلماء کی طرف سے گورنمنٹ کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا جا رہا ہے، جو یا تو گورنمنٹ میں پہنچ چکا ہوگا، یا پہنچ رہا ہوگا، اور جس پر ہزاروں مسلمانوں کے دستخط ثبت ہیں،

آخر میں انھوں نے وقف اولاد کا بل پیش کیا، اور اس کے دفعات کی تشریح کی،

اس کے بعد سب سے پہلے مہاراجہ بردوان نے مختصراً اور آنریبل مسٹر سچدانند سنہا (بیرسٹر پٹنہ) نے پوری تفصیل سے اس کی تائید کی، ان کے بعد نواب عبدالمجید صاحب بیرسٹر الٰہ آباد نے مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلماء کی کوششوں کا شکریہ ادا کیا، اور رسالۂ مذکور کے بعض دوسرے ضروری اقتباسات کا اضافہ کیا، بعد ازیں راجہ دیگھا پتیا، مولوی شمس الہدیٰ صاحب وکیل کلکتہ، نواب سید محمد بہادر مدراس، مسٹر سوبہ راؤ، بابو بھوپندر ناتھ باسو، مسٹر گوکھلے، اور سب سے آخر میں مولوی مظہر الحق مرحوم نے تقریر کی، اور ہندو ممبروں کی اس پُرجوش تائید کا شکریہ ادا کیا، آخر میں مسٹر جناح نے اس بل کو بزبان انگریزی گورنمنٹ گزٹ میں، اور صوبہ کی حکومتوں میں مختلف زبانوں میں شائع کرنے کی تجویز پیش کی،

گورنمنٹ ممبر نے جواب میں کہا کہ گورنمنٹ مسودہ کو عام طور پر شائع کر کے مسلمانوں کی عام رائے کا انتظار کرے گی، چنانچہ گورنمنٹ نے ملک کے تمام حصوں سے رائیں طلب کیں، اور ہر جگہ سے متفقہ رائیں آئیں،

مسٹر جناح نے جو بل پیش کیا تھا اس کے بعض دفعات سے مولانا کو اختلاف تھا، اس لئے بمبئی جا کر وہ خود مسٹر جناح سے ملے [1]، اور ان کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اس کے مطابق

[1] مکاتیب جلد اول ۱۰

اپنے بل میں اصلاح منظور کرلی، بہرحال جولائی ۱۹۱۱ء تک یہ کام باقی رہ گیا کہ میموریل بل کے تمام وشرعی اصلاحات کے ساتھ چھپوا کر اور اعیان و اکابر سے دستخط کرا کر وائسرائے کی خدمت میں بھیجا جائے، اس غرض سے مولانا نے ہوم ممبر سے جن سے تمام قوانین کا تعلق تھا خط و کتابت کی، اور لکھا کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن کی پذیرائی قبول کریں جو اُن کو تمام کاغذات سمجھائے، چنانچہ انھوں نے نہایت خوشی سے اس کو منظور کیا، اور ڈیپوٹیشن کے لئے ایک تاریخ مقرر کی لیکن یہ تاریخ قطعی و یقینی نہ تھی اس لئے ٹل گئی، ستمبر ۱۹۱۲ء کے اوائل میں مولانا خود کلکتہ تشریف لے گئے، اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کرکے تمام مراتب طے کئے، اور یہ توقع قائم ہوگئی کہ اسی مہینہ میں بل حسبِ مراد پاس ہو جائیگا، اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی، چنانچہ یہ توقع پوری ہوئی، اور گورنمنٹ نے اصولاً وقف علی الاولاد کو تسلیم کرلیا، اور اس کے جزئیات ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں طے ہوگئے،[۱] مولانا کی چار سال کی جد و جہد تگ و دو اور سعی و محنت کا نتیجہ حسبِ مراد نکل آیا، اور مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی، جس سے ہزاروں گھرانے تباہی سے بچ گئے،

تعطیلِ جمعہ ۱۹۱۲ء

سرکاری دفاتر اور انگریزی مدارس کے اوقات چونکہ عموماً ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک رکھے گئے ہیں، اس لئے مسلمان عہدہ داروں، اور مسلمان ٹیچروں اور طالب علموں کو جمعہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، اگرچہ یہ افسوسناک بات ہے کہ جدید تعلیم کے اثر سے خود مسلمانوں میں فرائضِ مذہبی کی پابندی کا بہت کم احساس باقی رہ گیا ہے، تاہم بہرحال یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے، اور کوئی مسلمان اپنے اس حق سے دست بردار ہونا نہیں پسند کریگا، مولانا کو وقف علی الاولاد کے معاملہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی

۱؎ مکتوب بنام شروانی ۹۲، ۹۳ و ۹۴، ۹۶،

اس نے اُن کے حوصلہ کو بہت کچھ بڑھا دیا، اور انھوں نے اسی سلسلہ میں تعطیلِ جمعہ کی طرف بھی توجہ کی اور اس کو گورنمنٹ کی خدمت میں اسی طرح پیش کرنا چاہا جس طرح وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو پیش کیا تھا، چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ میں جو لکھنؤ میں ہوا تھا، اس مسئلہ کے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا، جو منظور کیا گیا، اس کے بعد انھوں نے اس کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی جس میں بہ ترتیب حسبِ ذیل متعدد دلیلوں کی بنا پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیا،

۱۔ انگلش گورنمنٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایا کے تمام مختلف مذاہب کو یہ آزادی دیتی ہے کہ وہ بہ اطمینانِ تمام اپنے اپنے فرائضِ مذہبی کو بجا لاسکیں،

۲۔ جمعہ کی نماز ہر مسلمان پر جو معذور و مجبور نہ ہو فرضِ قطعی ہے،

۳۔ چنانچہ جمعہ کی فرضیت کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے،

۴۔ اس نماز کی اہمیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی سلطنتوں اور ریاستوں میں اس دن تعطیل ہوتی ہے،

۵۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی اکثر ہندو ریاستوں میں بھی باوجودیکہ وہاں مسلمان ملازموں کی تعداد نسبتۂ کم ہے اس دن تعطیل ہوتی ہے،

۶۔ انگریزی عملداری کے شروع میں چونکہ مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت ایک غیر حکومت ہے، وہ ہمارے مذہبی فرائض کا لحاظ کیوں کرنے لگی، اس لئے انھوں نے اس درخواست کی جستجو نہیں کی، لیکن بعد کو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی انصاف پسندی کا جیسے جیسے تجربہ

ہوتا جاتا ہے، اُن کی یہ خواہش بڑھتی جاتی ہے کہ وہ اس ضروری فرض کے ترک کی طرف گورنمنٹ کو متوجہ کریں،

۷۔ آیندہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی، مسلمان سرکاری ملازموں کی تعداد بھی بڑھتی جائیگی اور اسی مناسبت سے نمازِ جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ روز بروز اہم ہوتا جائے گا،[1]

مولانا کے اسی مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر انگریزی میموریل تیار ہوا، اور تمام مسلمانوں سے اس پر دستخط کرانا چاہا، چنانچہ ۵ راکتوبر ۱۹۱۲ء کو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "تعطیلِ جمعہ کی نسبت جا بجا جو کچھ کاروائیاں ہورہی ہیں، آپ اخباروں میں پڑھتے ہونگے لیکن جب تک وقفِ اولاد کی طرح متحدہ، پُرزور اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائیگی کامیابی نہ ہوگی، میں نے انگریزی میں میموریل لکھوا لیا ہے، اور اس کو چھپوا کر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی کارروائی شروع کرنی چاہتا ہوں، لیکن اس معاملہ کے آخر تک پہنچانے کے لئے کم از کم چار پانچسو روپیہ کی رقم درکار ہوگی، آپ اس سرمایہ میں جو کچھ عنایت فرما سکیں مطلع فرمائیں:" (۱۰۵)[2]

ان اغراض کے لئے مولانا نے جس رقم کی درخواست کی تھی وہ نہایت آسانی سے جمع ہوگئی، اور اب اس کام میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، کام شروع تھا کہ مارچ ۱۹۱۳ء میں مسٹر غزنوی (بنگال کے ممبر) نے بنگال کونسل میں اس کے متعلق گورنمنٹ سے سوال کیا، سرکاری ممبر نے اس کا جواب تشفی بخش دیا، اور گورنمنٹ بنگال نے نمازِ جمعہ کے لئے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کرلی، اس پر مسٹر شفیع بیرسٹر لاہور نے مولانا کو لکھا کہ اب اس تحریک کو آگے چلانے کی ضرورت نہیں،

---

[1] مولانا کا یہ پورا مضمون مقالاتِ شبلی حصہ ہشتم ص ۲۰۴ میں ہے۔ [2] مکاتیب حصہ دوم سلیمان، م،

(ریاض حسن ۱۰۰ و شروانی ۱۰۰) خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا خیال تھا کہ کامیابی ناممکن ہے (شروانی ۱۰۰)
لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات نے اس سے موافقت نہیں کی چنانچہ مولانا نے ایک اور
میموریل تیار کرایا جس میں بنگال گورنمنٹ کے فیاضانہ حکم کا حوالہ دے کر گورنمنٹ سے خواہش
کی کہ جمعہ کو دو گھنٹوں کی تعطیل کے بجائے ایک بجے سے آدھے دن کی عام تعطیل دی جائے
اس مطالبہ کا حق بجانب ہونا حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا: "گورنمنٹ بنگال تمام مسلمانوں کے
شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے نہایت فراخدلی سے مسلمانوں کی اپیل نہایت توجہ سے سنی، اور مسلمان سرکاری
ملازموں کو جمعہ کے دن دو گھنٹہ کی رخصت عطا کی، اس میں شبہ نہیں کہ یہ رعایت ادائے مذہبی فرائض
کو دیکھتے ہوئے کافی ہے، لیکن اس طرفدارانہ انتظام میں ایک خطرہ ہے جو تمام اہل اسلام کے خوف کا
موجب ہو سکتا ہے، خاصکر اس خطرہ کا اثر سبارڈنیٹ سروس (ماتحت اسامیاں) پر پڑتا ہے، خطرہ
یہ ہے کہ بہت سے افسر ایسے بھی ہوں گے جو ایسے مسلمانوں کو اپنی ماتحتی میں لینا ناپسند کریں گے جو ہر جمعہ
کو دو گھنٹہ کے لئے کام چھوڑ کر چلے جایا کریں گے، اور چونکہ ایسی اسامیاں جیسے تجویز نویس، اور نقل نویس
وغیرہ وغیرہ ایسے ہی افسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، اس لئے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ ایسی اسامیوں پر پہلے
کے مقابلہ میں جو دو گھنٹہ کے لئے چلے جایا کریں گے، غیر مسلمان ملازموں کو ترجیح دی جائے گی، جو ہر
روز اور ہر وقت اُن کے ساتھ کام کیا کریں گے، اگر اس خطرہ کی کوئی اصلیت ہو سکتی ہے تو ایسے
طرفدارانہ انتظام سے مسلمان سرکاری ملازموں کی آئندہ امیدوں اور ترقیوں پر سخت اثر پڑیگا،
لہٰذا حضور والا کے ملتمسین یہ تجویز کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن نصف دن کی تعطیل
ایک بجے سے اس ضرورت کے لئے کافی ہوگی، بلاشبہ اس رعایت سے ایک حد تک کام پر اثر

پڑے گا، لیکن حضور والا کے خدام بصد ادب ملتجی ہیں کہ اس نقصان کی تلافی بھی آسانی سے کی جا سکتی ہے، بہت سی عدالتوں اور دفتروں میں سنیچر کے روز نصف دن کی تعطیل بالکل فضول ہوتی ہے، بجائے سنیچر کے جمعہ کے دن آسانی کے ساتھ ایسی تعطیل کی جا سکتی ہے؛

یہ کارروائی ابھی جاری تھی کہ مولانا نے انتقال فرمایا، اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین کو نماز جمعہ میں جانے کی اجازت مل گئی یعنی اگر وہ چاہیں تو آدھ گھنٹہ کی چھٹی لیکر جا سکتے ہیں، اور اسکولوں میں یہ سفارش کی گئی کہ یا تو اسکول صبح ایک بجے تک ختم کر دیا جائے یا ایک بجے جو لڑکے اور مدرس نماز کو جانا چاہیں، ان کو آدھ گھنٹہ کی چھٹی دے دیجائے،

افسوسناک لطیفہ جن دنوں مولانا نماز جمعہ کی تعطیل کی کوشش کر رہے تھے اکثر فرماتے تھے کہ تعطیل کی کوشش تو ہو رہی ہے مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ کہیں تعطیل ہو جائے اور مسلمان نماز پڑھنے نہ جائیں تو ان کی کیسی جگ ہنسائی ہوگی،

اوقافِ اسلامی کا تحفظ ہندوستان میں اسلامی اوقاف کی جو گفتہ بہ حالت ہے اس سے کون واقف نہیں، مولانا کا دل بھی اسلامی اوقاف کی تباہی و بربادی سے کڑھ رہا تھا خصوصیت کے ساتھ وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں ان کو اسلامی اوقاف کی جو کیفیت معلوم ہوتی رہی اس سے ان کے دل کا زخم اور بڑھتا رہا، اور خصوصیت کے ساتھ اس لئے کہ اوقاف کی کثیر رقم بیکار پڑی رہنے کے باوجود قومی اور مذہبی ضرورتوں کے واسطے جس مشکل سے ایک ایک جیب سے ایک ایک دانہ جمع کرکے انبار لگانا پڑتا ہے، اس سے خوب واقف تھے، غرض ان مختلف اسباب سے مولانا نے وقف علی الاولاد کی کامیابی کے بعد عام اسلامی اوقاف کے حسن انتظام و اہتمام کی طرف

توجہ فرمائی،

مولانا سے پہلے بھی قوم کے کارکن اور ذی احساس افراد نے ادھر توجہ کی تھی، اور اُن کے مداخل و مصارف کا باقاعدہ انتظام کرنا چاہا تھا، چنانچہ مسلم لیگ اور دیگر اسلامی انجمنوں نے بارہا یہ رزولیوشن پاس کیا کہ گورنمنٹ ان اوقاف کی نگرانی کی طرف متوجہ ہو، لیکن گورنمنٹ نے یہ جواب دیا کہ دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ یہ خواہش تمام قوم کی طرف سے ہے، دوسرے یہ کہ ان اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں نہیں صرف کی جاتی، اس کے بعد مسلم لیگ یا اور کسی انجمن نے کچھ کارروائی نہیں کی، اور ایسا ضروری معاملہ جوں کا توں رہ گیا،

مولانا نے وقفِ اولاد کے بعد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، اور جنوری ۱۹۱۲ء میں ایک عام خط[1] شائع کیا جس میں حسبِ ذیل تجویزیں پیش کیں،

۱۔ ایک مختصر سی کمیٹی قائم ہو جو اس کی تدبیروں پر غور کرے، اور کوئی صحیح اور متعین اور قابلِ عمل طریقہ تجویز کرکے ایک اسکیم بنائے جو قوم کے سامنے پیش کی جائے، اور فیصلہ کے بعد اس پر عمل کیا جائے،

۲۔ ایک میموریل تیار کیا جائے جس میں انتظامِ اوقاف کی خواہش گورنمنٹ سے کی جائے، اور اس میموریل پر اس کثرت سے مسلمانوں کے ہر طبقہ سے دستخط کرائے جائیں کہ یہ میموریل تمام قوم کی طرف سے سمجھا جائے،

۳۔ گورنمنٹ سے جس قسم کی نگرانی کی خواہش کی جائے اس طریقہ کی ہو کہ مذہبی دست اندازی

[1] یہ خط مقالات شبلی جلد ہشتم ص۲۰ میں موجود ہے،

کو کسی طرح احتمال نہ پیدا ہونے پائے، مثلاً اس کا یہ طریقہ ہو کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کے ارکان تمام صوبوں سے نیابتانہ طریقہ پر انتخاب کئے جائیں اور انتخاب کی تمامتر کارروائی صرف اسلامی جماعت کی طرف سے انجام پائے، پھر گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کمیٹی کو باقاعدہ تسلیم کرے، اور اس کو باضابطہ اختیارات تحقیقات وغیرہ کے لئے دیئے جائیں، پھر اس کی مرتب کردہ رپورٹ ملک میں شائع کی جائے، اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

۴۔ تیموری سلطنت میں تمام اوقاف کے انتظام کے لئے ایک خاص عہدہ دار مقرر تھا جسکو صدرُ الصدور کہتے تھے۔ کیا گورنمنٹ سے یہ درخواست نہیں کی جاسکتی کہ یہ عہدہ دوبارہ پھر قائم کیا جائے، لیکن صدر الصدور کا تقرر بھی نیابتانہ اصول پر اسلامی جماعت کی طرف سے ہو، تاکہ گورنمنٹ کے متعلق کسی قسم کی دست اندازی کا احتمال نہ پیدا ہوسکے۔

مولانا نے جنوری ۱۹۱۳ء میں یہ تحریک کی تھی، اور فروری ۱۹۱۳ء ہی میں گورنمنٹ نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شائع کی اور اسی مہینہ میں اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے ایک کانفرنس بٹھانا چاہا (سلیمان ۲۲) خوشی میں مولانا شروانی صاحب کو ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء کو ان لفظوں میں اس کی خبردی:۔ "ع آنچہ خستہ دل گفت ہاں ہمی گویم"

آپنے دیکھا، ادھر اوقافِ اسلامی کی تحریک شروع ہوئی، اور ادھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی، اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے، خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑا دینا ہے۔

ع آگے نصیب ہو جسے پروردگار دے۔

لیکن افسوس کہ اسی سال مولانا کا انتقال ہو گیا، تاہم اوقاف کی نگرانی اور انتظام کے متعلق جو تحریک چل چکی تھی وہ مردہ نہیں ہوئی، خود گورنمنٹ نے اور صوبہ کی اسمبلیوں اور کونسلوں نے اس کو جاری رکھا، اور بالآخر مختلف صوبوں میں اس کے لئے پہلے تحقیقاتی کمیٹیاں قائم ہوئیں اور ان کی سفارش سے نگرانی اور حسابات کی پڑتال کی ایک صورت قائم ہو گئی گو مولانا کی خواہش اور مسلمانوں کے مطالبہ سے وہ بہت کم ہے، اسی طرح ہندوستان میں صدر الصدوری یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی اسی تجویز کی صدائے بازگشت ہیں،

اشاعت اسلام ۱۹۱۳ء ۔ ۱۹۱۳ء

ہندوستان میں ۱۹۱۳ء کا زمانہ اسلام کے لئے عجیب کشمکش کا زمانہ تھا، ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں سینکڑوں ہزاروں راجپوت، جاٹ، میواتی اور دوسرے ہندو خاندان مسلمان ہو گئے تھے، ان میواتیوں کی تعداد بہت کافی ہے، یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے اور کس نے ان کو مسلمان کیا کہ اس وقت سے لیکر آج تک نہ پورے مسلمان ہوئے نہ ہندو ہی رہے، وہ اپنے کو نام کا مسلمان تو ضرور کہتے تھے، مگر ان میں بہت سے رسوم ہندوؤں کے بھی جاری تھے، بلکہ بعض کے تو نام تک ہندوانہ تھے، ان کی تعداد لاکھوں کے قریب ہے، اور حدود راجپوتانہ سے لے کر دہلی و آگرہ تک پھیلے ہیں، آریہ مبلغ معلوم نہیں کب سے اس شکار کی تاک میں تھے، اور ان کو دوبارہ ہندو بنانے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے ۱۹۱۳ء میں یک بیک یہ راز طشت از بام ہوا، تو تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف اس کی مدافعت اور بچاؤ کی کوششیں شروع ہو گئیں، مولانا بھی ضعف اور بیماری کے باوجود اس فتنہ کے انسداد کے لئے فوراً کمربستہ ہو گئے، مارچ ۱۹۱۳ء میں کرنل

عبد المجید خاں وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ نے جو خود مسلمان راجپوت تھے پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس قائم کی، اور شاید اس لئے کہ مولانا بھی راجپوت نسل سے تھے ان کو اس جلسہ میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ سخت مصروفیتوں کے باوجود وہ جا کر اس میں شریک ہوئے،

۱۲ اپریل ۱۹۴۰ء کو "نومسلم راجپوت اور حفاظتِ اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ ان نومسلموں کے ارتداد کا اصلی سبب مذہبی جہالت ہے، اس سلسلہ میں ایک عجیب حقیقت کا اظہار فرمایا جو آج آنکھوں کے سامنے ہے، فرمایا: "ان نومسلموں کی مذہبی جہالت تو سب کو معلوم ہے، لیکن جس جدید تعلیم کے پھیلانے پر اتنا وقت اور سرمایہ صرف کیا جا رہا ہے اس کے مذہبی تعلیم سے سراسر خالی ہونے کی بنا پر اس سے بھی اسی قسم کے نتیجہ کا خوف ہے" ان کے الفاظ یہ ہیں: "سب سے پہلے ہم کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ ان نومسلموں کے مرتد ہو جانے کا سبب کیا ہوا، اس کا جواب صرف ایک ہے وہ یہ کہ لوگ اسلامی عقائد، اسلامی احکام اور اسلامی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے، ان کا اسلام صرف نام کو اسلام تھا، اس لئے ذرا سی فریب کاری اور دھوکہ سے یہ عارضی رنگ اڑ گیا، یہ جواب بلاشبہ صحیح اور سراپا صحیح ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیوی تعلیم سے کیا اس پیشین گوئی کی صحیح آواز نہیں آ رہی ہے؟

کیا ہماری دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) میں عقائدِ اسلام کے استحکام کا کوئی بندوبست ہے؟ کیا اس میں تاریخِ اسلام کا کوئی حصہ بہ حصہ شامل ہے؟ کیا وہ مذہبی زندگی کی ذمہ دار ہے؟

بے شبہ ابھی تک موجودہ نسلوں میں اسلام کے آثارات نظر آتے ہیں، لیکن یہ پچھلی اور موجودہ سوسائٹی کے بقیہ یادگار ہیں"

نئی تعلیم یافتہ
مسلمانوں کی

کچھ زیادہ دن نہیں گذرے کہ اخباروں میں یہ مضامین مسلمان لیڈروں کی طرف سے شائع ہوئے تھے کہ اسلام کا قانونِ وراثت بدلنے کے قابل ہے، ایک مسلمان صاحب نے علانیہ لکھا تھا کہ قرآن کی وہ سورتیں جو مدینہ میں اتریں بادشاہانہ حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں بے شبہ ابھی اس قسم کی مثالیں کم ہیں لیکن ابھی دنیوی تعلیم کو پھیلتے ہوئے کے دن ہوئے ہیں؟ نومسلم راجپوت، دو سو برس کے بعد اس حالت کو پہنچے ہیں، جدید تعلیم کی جو رفتار ہے دو سو برس کے بعد اس سے کس قسم کے نتیجہ کی امید کی جا سکتی ہے؟

اس تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی تعلیم کو روکا جائے، ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم کو اس قدر پھیلانا چاہئے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن ساتھ ہی ہم کو مذہب کی حفاظت پر بھی اپنی تمام قوت صرف کر دینی چاہئے، اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی تعلیم کی ایک وسیع الشان درسگاہ موجود ہو، جس میں تمام مذہبی علوم نہایت تکمیل اور اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں، طلبہ کو عمدہ تربیت دی جائے، وہ دریوزہ گری کے طریقہ سے بچائے جائیں، ان کو ایثارِ نفس اور سچی قناعت و خودداری کی تعلیم دلائی جائے۔"

اس کے بعد انھوں نے مذہبی تعلیم کی ایک جامع حیثیات درسگاہ کی ضرورت پر زور دیا اور مسلمانوں کو متحد ہو کر کسی ایک تبلیغی مرکز کی کوشش پر آمادہ فرمایا،

ندوۃ العلما نے اگرچہ ابتدا ہی سے اشاعتِ اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا، اور ارکان میں سے پہلے مولوی خلیل الرحمان صاحب اور پھر مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس کے مستعد قرار پائے تھے، تاہم اب تک اس نے عملی طور پر اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی،

[illegible]

لیکن اب وہ حالت پیش آگئی کہ خاموش رہنا مشکل تھا، مولانا نے ہندوستان کے افق پر نظر ڈالی تو اُن کو نظر آیا کہ مسلمانوں میں مذہبی جوش کا طوفان تو ضرور برپا ہوگیا ہے، لیکن اس کی موجیں بے راہ روی اختیار کررہی ہیں، اس مذہبی بے چینی اور جوش کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ تمام انجمنیں اپنے اپنے سفیر اور اپنے اپنے واعظ مقرر کرکے مختلف مقامات میں بھیج رہی ہیں، لیکن ان انجمنوں میں باہم کسی قسم کا ربط و اتحاد نہیں ہے، اس بنا پر ان کی یہ رائے قرار پائی کہ الگ الگ کام کرنے کے بجائے انجمن ہدایت الاسلام" دہلی کو جسے مولانا عبدالحق صاحب حقانی مرحوم نے قائم کیا تھا وسعت دے کر اشاعتِ اسلام کی ایک مجلسِ عمومی بنادی جائے، اور تمام متفرق و پراگندہ قوتیں جو علیحدہ علیحدہ کام کررہی ہیں اسی میں مدغم ہوجائیں، اور ندوہ بھی اپنی بساط کے مطابق اس کی پوری مدد کرے،

شروع میں مولانا کا اصلی خیال یہی تھا، اور انھوں نے اس خیال کو اس مضمون[1] میں جس کو ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء میں لکھا تھا، نہایت بلند آہنگی کے ساتھ ظاہر بھی کردیا تھا، لیکن مسلمانوں میں یہ اتفاقِ عام پیدا نہ ہوسکا، مجبوراً انھوں نے پہلے ندوہ کے اندر رہ کر اشاعت و حفاظتِ اسلام کے مختلف کام کئے، لیکن اس میں بھی ایک دقت حائل تھی، ندوہ کی مجلسِ اشاعتِ اسلام کے معتمد جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے، اور مولانا کے خیال میں وہ کام نہیں کررہے تھے، اس لئے مولانا دو برس تک عجیب کشمکش و پیچ میں رہے، کبھی خود کام کرنے لگتے اور کبھی شاہ صاحب کا خیال کرکے چپ ہوجاتے، اسی حال میں دو برس گذر گئے، اس اثنا

---

[1] یہ مضمون مقالاتِ شبلی جلد ہشتم ص۳ پر چھپا ہے،

میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اُن کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ ساری مصلحتوں کو بالائے
طاق رکھ کر اس آگ میں کود پڑے، انھیں اطلاع ملی کہ شاہجہاں پور کے قریب ایک مسلمان
زمیندار راجپوت مرتد ہوا چاہتا ہے، یہ سننا تھا کہ بے قرار ہوگئے، پہلے سیدھے دارالعلوم میں
تشریف لائے اور طلبہ کے مجمع میں تقریر شروع کی، تقریر کے شروع میں سورۂ نصر کو تعوذ اور
بسم اللہ کے بغیر یوں پڑھا، اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ "يَخْرُجُوْنَ" مِنْ
دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ پھر فرمایا، عزیزو! تم نے خیال کیا ہوگا کہ میں نے آیت غلط پڑھی، ایک
دن تھا کہ جب لوگ جوق جوق اسلام میں داخل ہوتے تھے، لیکن آج وہ دن ہے کہ لوگ
جوق جوق اسلام سے نکلے جاتے ہیں، پھر مسلمانوں کی بے پروائی سے اس فتنہ کے جو نتائج
نکلیں گے اُن کا ہولناک منظر کھینچا، اور طلبہ کو تبلیغ کے سپاہی بننے کی ترغیب دی،

مولانا نے اس واقعہ کا ذکر ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں خود کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"حضرات! میرے اوپر ابتدا اس اثر کی یوں ہے کہ دو سال ہوئے کہ شاہجہاں پور سے ایک خط
میرے پاس سعید خاں سوداگر کا آیا، کہ شاہجہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہو جال پور وہاں
کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں، آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں، اُن کو ہندو کرنا
چاہتے ہیں، آپ جلد آئیے اور مدد دیجئے، انھوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے
مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا، وہ وہاں سے تشریف لائے تھے، اور میں ندوہ سے گیا، جس وقت میں
یہاں سے چلا ہوں، میری جو حالت تھی یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے
کہ میں نے اس وقت کوئی کھانا نہیں کھایا تھا، جو میں نے ان ندوہ والوں کو سنائی ہوگی، کہ

اے بھیا! اور اے کرم بخشو! ذرا سب مرد یہ واقعات پیش آئے ہیں، ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو بھی پھونک دو: یہی الفاظ میں نے اس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں، اس وقت نہایت افسوس میں میں پہنچ گیا تھا، وہاں جا کر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے، لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ گاؤں کے نومسلم راجپوتوں کو ہندو بنانا چاہتے ہیں، مسلمان علما کو بلایا ہے، یہاں پر سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے، تین سو روپیہ کھانے میں صرف ہوئے ہیں، چندہ وغیرہ کیا گیا ہے، وہ نومسلم بیچارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں، پڑھے لکھے نہیں، آپ ہمارے اس گاؤں میں آئیے اور یہاں آکر ہم کو سمجھائیے جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی ہم آپ سے کہیں گے آپ ان کا جواب دیجئے پھر جو کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں، اس کے شاہد سید وزیر حسن صاحب وکیل شاہجہاں پور ہیں، وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں، اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا، کہ گاؤں میں جائے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدانخواستہ فوجداری کریں گے یا ماریں گے، کیونکہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن و امان قائم رہے،

میں نے بالآخر یہ کہا کہ بھائیو مجھے تو پالکی میں ڈال کر وہاں لے چلو، میں چلتا ہوں، لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا، غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا، بالآخر ان لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں کیا یہ واقعات آپ کے کانوں میں پڑتے ہیں، اگر نہیں پڑتے تو آپ کی بے خبری کی داد دینی چاہئے اور اگر پڑتے ہیں تو آپ کا دل جل نہیں جاتا؟ کلیجہ پھٹ نہیں جاتا؟ کڑھ نہیں جاتا، اس سے زیادہ کیا بے حسی ہو گی؟ کیا یہ باتیں ایسی ہیں کہ جن سے چشم پوشی کی جائے؟

مولانا ہنگامی دورہ، مناظرہ اور تقریر وغیرہ کی ان عارضی تدبیروں کو جو اس وقت کی اسلامی

انجمنیں اختیار کر رہی تھیں حفاظت اسلام کی مستقل تدبیر نہیں خیال فرماتے تھے، اُن کے نزدیک
صحیح صورت یہ تھی کہ ان آریوں کے مقابلہ کے لئے ایسے جفاکش، ایثار پسند اور مخلص علماء کا گروہ
پیدا کیا جائے جو بھاشا میں بات کر سکے اور سنسکرت کی تھوڑی واقفیت رکھے، یہ لوگ دیہاتوں
میں جا کر پھیل جائیں اور ان اطراف میں اپنے مستقل تعلیمی مرکز قائم کر لیں، آریوں کے گروکل کے مقابلہ
کیلئے اپنے یہاں بھی اسی قسم کی ایک تربیت گاہ کو ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے اجلاس
دہلی کی تقریر میں انھوں نے خود اس خیال کی تفصیل کی ہے: "ندوہ کا ایک دوسرا فرض اشاعت اسلام ہے،
یہ مقصد اگرچہ مدت سے ندوہ کے مقاصد میں شامل کیا گیا تھا، اور اس کا ابتدائی دستور العمل مرتب ہو گیا
تھا، لیکن ندوہ نے قصداً اس کام کو نہیں شروع کیا، اور مجھ کو تفصیل سے بتانا چاہئے کہ اس کے اسباب کیا تھے۔
اشاعت اسلام کی ضرورت آجکل درحقیقت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ آریوں نے تمام ملک میں بے شمار
سفیر اور واعظ پھیلا دیئے ہیں، اور انھوں نے جاہل، اور نو مسلم مسلمانوں پر مختلف تدبیروں سے اپنا اثر
پھیلانا شروع کر دیا ہے، یہ حالت نہایت اندیشہ ناک ہے، اور خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ
اس خطرہ کا احساس ہو گیا ہے، اور جا بجا اس کی مدافعت کے لئے انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئی ہیں اور
ہوتی جاتی ہیں، لیکن ہم کو نہایت غور و فکر سے دیکھنا چاہئے کہ جو کوششیں کی جا رہی ہیں یہ کافی ہیں یا نہیں،
آریوں نے جن اسباب سے اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی ہے اور کرتے جاتے ہیں وہ دو چیزیں ہیں:
(۱) ایثار نفس یعنی اُن کے واعظ نہایت ایثار نفسی، نہایت جان نثاری، نہایت جفاکشی کے ساتھ
اس کام میں مصروف ہیں، اُن کا واعظ جو اچھے سے اچھا تعلیم یافتہ ہوتا ہے نہایت فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے
ایک ایک گاؤں میں پھرتا ہے، چنے چبا کر بسر کر لیتا ہے، راتوں کو درخت کے نیچے سو رہتا ہے، لوگوں کی

پٹ میں سفر کرنا ہے،

(۲) دیہات اور قصبات میں پیہم اور لگاتار کوشش جاری رکھنا،

اس کے مقابلہ میں ہمارے علما صرف شہروں پر اکتفا کرتے ہیں، اور دیہات میں جاتے بھی ہیں تو ایک آدھ دن سے زیادہ قیام نہیں کرسکتے، اس لئے وہ کوئی پائدار اثر قائم نہیں کرسکتے،

(۳) آریہ واعظ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ، اور جدید علوم و فنون سے واقف ہوتے ہیں اور ہمارے واعظ اکثر ان علوم سے واقف نہیں ہوتے،

(۴) آریوں نے اپنے مذہب کا مدار صرف وید پر رکھا ہے، اور کہتے ہیں کہ وید کے معنی جو عام پنڈت بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں، بلکہ وہ صحیح ہیں جو سوامی دیانند نے بیان کئے ہیں اور چونکہ مسلمان (ایک آدھ کے سوا) سنسکرت سے واقف نہیں، اس لئے وید کی صحت و غلطی کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے،

اسباب مذکورۂ بالا کے لحاظ سے آریوں کے مقابلہ کے لئے اسباب ذیل کی ضرورت ہے:

(۱) ایسے لوگ پیدا کئے جائیں جن میں ایثار نفسی، سادگی، جفاکشی اور جان نثاری کے اوصاف ہوں

(۲) اشاعت اسلام کا مستقل صیغہ قائم کیا جائے، تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں، مستقل واعظ مقرر کئے جائیں، جو نومسلم دیہات میں جاکر ایک ایک دو دو مہینے رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں،

(۳) عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دی جائے،

اسی بنا پر ندوہ نے دارالعلوم میں انگریزی اور سنسکرت کی شاخیں کھولیں اور اشاعت اسلام کے مستقل صیغہ کے قائم کرنے کا انتظام کیا جس کی عملی صورت چند دنوں کے بعد نمایاں ہوگی،

ندوہ کا کام یہ ہے کہ دارالعلوم میں خاص مذہبی خدمات انجام دینے والوں کی ایک جماعت موسوم کرے، اُن کو مذہبی وظائف دے، ان کو وقتاً فوقتاً ان اوصاف کے پیدا کرنے کی ترغیب دلائے، تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد ان کو ان کاموں میں لگائے، یہ تدبیریں ندوہ نے پیشِ نظر رکھی ہیں اور ان کو عمل میں لانا شروع کر دیا ہے، خدا اس کی کوششوں میں کامیابی دے۔

مولانا نے اپنے اسی خیال کے مطابق دارالعلوم میں جماعت کی تعلیم کا ایک درجہ کھولا، **خدام الدین** کے نام سے دارالعلوم کے طلبہ کا ایک گروہ الگ کیا، ۲۷ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں دلّی کے اجلاس میں جب ندوہ ہی کو مرکزی مذہبی مجلس کی تجویز اور اشاعتِ اسلام کی تحریک منظور ہو گئی تو پھر پوری طاقت سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، ملک کے اکابر کو اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تدابیر کی طرف مائل کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، نومسلموں کے حالات کی تفتیش و تحقیق کے لئے ایک انسپکٹر متعین کیا، وقفِ اولاد کے کام کرنے والے سفیروں کو حکم دیا کہ وہ اشاعت و حفاظت کے کام کو بھی اپنی نظر میں رکھیں، عام مجلس اشاعتِ اسلام کے قیام کی تجویز پیش کی، اور ضروری مقامات پر خود اپنے دورہ کا ایک پروگرام بنایا، یہ زمانہ مئی جون کی سخت گرمیوں کا تھا، اور مولانا ایک مہینے سے پیچش میں مبتلا تھے، اس کے باوجود شاہجہان پور اور رائے بریلی وغیرہ مقامات پر گئے، ۵ مئی سنہ ۱۹۱۰ء کو شروانی صاحب کے نام لکھتے ہیں:- "اشاعتِ اسلام کے لئے مجھ کو ایک بار دورہ کرنا ہے، ایک مہینہ سے پیچش میں مبتلا ہوں...... اسی حالت میں رائے بریلی گیا اور وہاں جلسہ کر کے اس کی بنیاد ڈالی، چھینٹا پڑنے پر عام دورہ شروع ہو جائے گا...... بڑی دقت یہ ہے کہ دیہات میں جا کر تبلیغِ اسلام کرنے والے واعظ نہیں ملتے، اس کا کیا علاج ہو گا، اشاعتِ اسلام کی کارروائی تمام

اس پر موقوف ہے۔" (شروانی - ۸۱)

۱۲ رجون ۱۹۱۱ء کو پھر انھیں لکھا: "اشاعت اسلام کی بنیاد دو کاموں پر ہے، تقریر وعاظ، ثانی مشاہرۂ وعاظ، واعظ حسب خواہش وضرورت نہیں ملتے، اور ملیں تو کئی سو ماہوار کی آمدنی چاہئے، ان دونوں باتوں کے متعلق میں نے یادداشت کے لئے لکھا تھا، اس پر مکرر غور فرمایئے اور اپنی رائے قلمبند کرکے دیجئے کہ کیونکر اور کس طریقہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوں گی۔" (شروانی - ۸۴)

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا شروانی صاحب نے اس کا جواب کیا دیا، مگر مولانا نے اس تجویز کا جو حل سوچا وہ یہ تھا کہ ائمہ اور مؤذنین کی تعلیم کے لئے اردو کا برس دو برس کا کوئی کورس بنایا جائے اور اردو خواں جوانوں کو قرآن پاک کے ساتھ اردو میں مسائل وعقائد کی سادہ تعلیم دے کر دیہاتوں میں مسجدوں میں پھیلا دیا جائے کہ یہ مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کے لئے اپنے مکتب کھول لیں اور لوگوں کو اسلام کی تلقین کریں۔ مگر سرمایہ کے نہ ہونے سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی،

حالات نازک سے نازک تر ہوتے چلے جاتے تھے، ۲۷ رفروری ۱۹۱۲ء کو مولانا شروانی کو لکھا: "نومسلموں کے متعلق نہایت کثرت سے خطوط آئے کہ اکثر جگہ مسجدوں کو گوبر سے لیپتے ہیں، نماز کا ذکر نہیں، میں نے انسپکٹر روانہ کردیا ہے۔" (۹۷) ادھر مولانا نے مختلف کام شروع کردیئے تھے، وقف اولاد کی تحریک پورے شباب پر تھی، اس کے کام کا سارا بوجھ اکیلے مولانا کے کندھوں پر تھا، تصحیح اغلاط کے کام کی نگرانی، سیرت نبوی کی تصنیف کا خیال جس کو خود اشاعت اسلام نے پیدا کیا تھا، خدام الدین کی تربیت، اشاعت اسلام کے لئے دورے، جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کی تردید، "اردو ورنیکلر اسکیم" کی مخالفت، سید رشید رضا مصری کی آمد کی تیاری، اور لکھنؤ

میں ندوہ کے آیندہ جلسہ کی تدبیر لیکن اس زمانہ میں ان سب میں اشاعتِ اسلام ہی کا خیال تھا
جو ہر طرح سے اُن پر چھایا ہوا تھا، اور اسی کیلئے یہ سب کچھ تھا، ندوہ کے اجلاسِ دہلی نے ندوہ میں
اشاعت وحفاظت کا کام تو منظور کر دیا مگر یہ طے نہ کیا کہ کام کون کرے، ندوہ کی مجلسِ اشاعت
کے سکرٹیری مولانا شاہ سلیمان صاحب تھے، مولانا اُن کے اختیارات میں دخل دینا نہیں چاہتے
تھے اور دخل دیئے بغیر کام نہیں چلتا تھا، یہ اور عقدہ الگ تھا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو اپنے محرم
اسرار مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "سیرۃ نبوی کا کام واقعی بڑے پھیلاؤ کا ہے، ادھر اشاعتِ اسلام
کی یہ حالت ہو کہ بیسیوں خطوط اور رپورٹیں آرہی ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں نومسلم ارتداد کے خطرہ
میں ہیں، آریوں کی مقامی کمیٹیاں جابجا دیہات میں قائم ہوتی جاتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے
کہاں کہاں واعظ مقرر کئے جائیں، کہاں کہاں مکتب قائم ہوں، یہ تو سلطنت کا کام ہے۔

آج ایک اپیل بھیجتا ہوں، کہ فلاں جلسہ (مجوزہ اجلاس لکھنؤ) میں پیش کروں گا، کلکتہ میں
ایک انجمن سے کام لیا، اور نواب ڈھاکہ کو راضی کیا، کہ وہ انجمنِ اشاعتِ اسلام کے پریسیڈنٹ ہوں،
لطف یہ ہے کہ ادھر شاہ سلیمان صاحب نہ کچھ کرتے ہیں نہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں، کہ میں باقاعدہ
کام کروں، مجبور ہو کر ندوہ کے دائرہ سے نکل کر کام کرنا پڑے گا" (شروانی - ۹۷)

مولانا نے اس تجویز پر ۱۹۱۲ء کے آغازِ سال ہی میں عمل شروع کر دیا تھا، یعنی ندوہ کے دائرہ سے
الگ ہو کر ایک عام مجلسِ اشاعت وحفاظت کی بنیاد ڈالی، اور خاکسار کو اس مجلس کا شریک
ناظم بنا کر ہر قسم کی دفتری کارروائیوں کی ذمہ داری عنایت فرمائی، سفر و حضر دونوں میں برابر کام کے
متعلق ہدایات کرتے رہتے، جنوری ۱۹۱۲ء میں نومسلموں کی مردم شماری اور اُن کی موجودہ کیفیت

کی ایک رپورٹ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس بنا پر نو مسلموں کی مردم شماری یعنی اُن کی کہاں کہاں آبادیاں ہیں؟ اور جہاں اُن کی آبادی ہے اس کی تعداد کیا ہے؟ اور اُن کی موجودہ حالت کیا ہے؟ ان تمام معلومات کو حاصل کرنے کے لئے اخبارات میں ایک اطلاع بھیجی گئی، ۱۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو مجھے لکھتے ہیں:- "نوٹس مردم شماری نو مسلمان" زمیندار میں ضرور بھیجنا، اور اخباروں میں تو میں نے دیکھا" (مسلمان ۔ ۳۵ ۔ ۰)

۱۲ر فروری ۱۹۱۳ء کو ایک رجسٹر اپنے ہاتھ سے حسب ذیل نقشہ بنایا جس کی خانہ پُری مطلوب تھی،

نمبر	نام مقام مع پرگنہ و تحصیل و ضلع	نام قوم و مردم شماری و پیشہ	وضع و لباس و رسم	کس بنا پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں؟	کوئی مسجد یا مدرسہ ہے؟ کیا مسجد یا مدرسہ کی تعمیر ہو سکتی ہیں؟	کیا گوشت کھاتے ہیں؟ ذبح کرتے ہیں؟ اور کیونکر؟	قرآن شریف وہاں موجود ہیں یا نہیں؟ قرآن کے متعلق ان کی تعظیم و تکریم کیسی ہے؟	کونسی بات اسلام کی ان میں پائی جاتی ہے اور کیونکر اسلام کے احکام کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے؟

اس نقشہ کو لے کر سفرا نے بدایوں، بریلی، اجمیر، بے پور، جودھپور، کشن گڑھ، الور، باندی کوئی اور ریواڑی وغیرہ کے قصبات اور دیہات میں دورہ کیا، اور مطلوبہ مواد فراہم کیا، جو اس وقت تک دفتر دارالمصنفین میں موجود ہے، حسن شاہ صاحب جو ایک سادہ مزاج، متدین اور متقی بزرگ تھے، وہ مقرر کئے گئے کہ دیہاتوں میں جاکر نو مسلموں میں احکام اسلام کی تلقین کریں، ان کو ایک رجسٹر بنا کر دیا جس میں اپنے قلم سے حسب ذیل مدیں لکھیں،

تاریخ و وقت روانگی	مدت سفر و ذریعہ سفر	جائے قیام	مقام تحقیقات	تعداد مردم شماری قوم و پیشہ	مختصر تحقیقات و کیفیت

ایک علمی اشتہار اور خطوط کے مسودے لکھے اور مجھے حکم دیا کہ ان کو چھپوا کر ملک کے اہل الرائے کی خدمت میں بھیجوں، اور ان سے اعانت اور ہمدردی کی خواہش کروں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور اعلانات و اشتہارات اور خطوط روانہ کئے گئے۔ یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو وہ الٰہ آباد چھوڑ کر وقف اولاد کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہے تھے، اس لئے میرے لئے حسب ذیل ہدایات لکھیں: "میں نے نومسلموں کی ایک مسل بنوائی ہے، کاتب سے ان لوگوں کے نام اور پتے رجسٹر میں لکھوا لو، جن لوگوں نے نومسلموں کے متعلق خطوط بھیجے ہیں، نومسلموں کے متعلق ایک اپیل بھی خط میں عبدالغنی صاحب کے یہاں چھپوایا ہے لیکن ابھی ان ہی کے یہاں ہے، وہ منگوا کر ان اشخاص کے نام ایک ایک دو دو پرچے بھیجو، ایک خط کا مسودہ کاتب کو دے آیا ہوں، ہر اپیل کے ساتھ وہ خط بھی بھیجو۔ ......

(۲) اپیل مذکورۂ بالا کی سو کاپیاں میرے پاس اس پتہ سے بھیجو، شبلی منزل ڈوڈا سٹریٹ نمبر ۱۵ کلکتہ

اوپر کی سطروں میں جس اپیل کا ذکر ہے اس کا عنوان ہے: "نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہو جانے سے بچانے کے لئے تمام برادرانِ اسلام کی خدمت میں فریاد"۔ یہ اپیل اخبارات میں چھپا اور اب سلسلۂ مقالات جلد ششم میں شامل ہے) اس میں مولانا نے حسب ذیل تدابیر کا ذکر کیا تھا:

(۱) اس قسم کے واعظ مقرر کئے جائیں جو دو دو چار چار مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلام کے احکام سکھائیں، اس قسم کے واعظوں کے تیار کرنے کا خاص انتظام ہونا چاہئے،

(۲) دو دو چار چار گاؤں کے بیچ میں ابتدائی مدرسے قائم کئے جائیں جن میں قرآن شریف اور اردو کی تعلیم دی جائے،

(۳) صوفی وضع لوگ بھیجے جائیں جن کا اثر عوام پر خود بخود پڑتا ہے،

۲۔ مسلمانوں کے دیہات میں جو سرکاری ابتدائی مدرسے ہیں، کوشش کی جائے کہ ان کے مدرسین مسلمان
مقرر ہوں، اب تک اکثر ہندو مدرس مقرر ہوتے ہیں، اور اس لئے بچوں کو اسلام کی طرف رغبت نہیں پیدا
ہوسکتی، غرض یہ ایک نہایت اہم مذہبی اور قومی مسئلہ ہے اس کو نہایت غور وفکر اور جدّ وجہد سے حل
کرنا چاہئے، اگر مسلمان ایسے خطرہ کی پروا نہیں کرتے تو ان کو اسلام کا نام نہیں لینا چاہئے"
حفاظت واشاعت اسلام کے عنوان سے ایک مجلس کی بنیاد کی تجویز پیش کی اور اس کا
ایک مختصر خاکہ تیار کیا، جو مقالات میں شامل ہے،
۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ پہنچکر لکھا کہ یہاں دو تین روز رہ کر اشاعت کا کام شروع کرا دیتا
ہوں (سلیمان ۳۰) یہاں ایک انجمن کو یہ کام سپرد کیا، اور جناب نواب خواجہ سلیم اللہ صاحب
نواب ڈھاکہ کو جو ان دنوں بنگال کے مسلم لیڈر تھے اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجوزہ مجلس اشاعت
اسلام کی صدارت قبول کریں، (شروانی ۹۰) اجلاس لکھنؤ کے بعد جو شروع اپریل میں ہو رہا تھا
وہ ملک میں دورہ پر آمادہ ہو رہے تھے، ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا: "ہاں!
کام بہت ہیں، لیکن میں اشاعت کے کام کو سب پر مقدم رکھوں گا قطعی طور سے معلوم ہوا کہ راجپوت
خاندان مرتد ہوتے جاتے ہیں، آریوں کی مقامی انجمنیں چپکے چپکے کام کر رہی ہیں، دِقت یہ ہے کہ جلسہ
کے بعد ہی میرا دورہ شروع ہونا چاہئے، لیکن موسم ناقابل برداشت شروع ہو جائے گا، اس لئے دو مہینہ
کا وقفہ ہو جائے گا، جو مضر ہوگا، (شروانی ۹۹)
جو خطوط اور اپیل لوگوں کو بھیجے گئے تھے، ان کے حوصلہ افزا جوابات آئے، ۲۴ مارچ ۱۹۱۲ء
کو مولانا شروانی صاحب کو لکھا: "جلسہ اشاعت نہ صرف بارونق بلکہ جماعت ندوہ کے اجزا کا پیش خیمہ ہوگا"

لیکن شرط یہ ہے کہ آپ تین روز پہلے آجائیں، اشاعتِ اسلام کا بہت اچھا اثر ملک میں پھیل رہا ہے، لوگ خط و کتابت کر رہے ہیں، صرف اتنی بات ہے کہ شاہ صاحب وغیرہ اس کام کو کرنے دیں۔ یہ اُس وقت ہوگا کہ آپ آجائیں۔ آپ کا تو سا صاحب مشکلات کو حل کردیگا:"

چنانچہ مولانا شروانی تشریف لائے اور مولانا کی دعوت پر بہت سے اہلِ الرائے حضرات ۶-۷-۸-۹ اپریل ۱۹۱۲ء / ۱۶-۱۷-۱۸-۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ کے اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئے اجلاس کی آخری تاریخ میں یعنی ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ مطابق ۹ اپریل ۱۹۱۲ء کی صبح کو جب دارالعلوم کا ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، مولانا ایک خاص کیفیت میں اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تدابیر پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اور تقریر کا آغاز اس تمہید سے فرمایا:-

"حضرات! میں نے اسلام کی تاریخ جہاں تک مجھ سے ہو سکا، نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھی ہے، میں تیرہ سو برس کی وسیع مدت کا ایک حد تک واقف کار ہوں کہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالتیں مختلف زمانوں میں، مختلف سلطنتوں میں، مختلف دوروں میں کیا رہی ہے، مگر آپ کے سامنے میں صحیح شہادت دیتا ہوں کہ مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں پر کوئی وقت اور کوئی زمانہ آج سے زیادہ مشکل، زیادہ شاق اور زیادہ تباہ کنندہ گذرا ہو"

پھر مسلمانوں کی اُس تباہی کا ذکر کر کے جو تاتاریوں کے ہاتھوں چھٹی صدی ہجری میں ہوئی فرمایا کہ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کی تباہی کا سب سے بڑا واقعہ ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں پر ہر طرف سے جو تباہی آرہی ہے اس سے اُس کو کوئی جوڑ ہی نہیں، وہ تباہی یک طرفہ تھی یعنی صرف جان و مال کا نقصان ہوا، مگر آج جو تباہی ہے وہ ہمارے مذہب پر بھی، اخلاق پر بھی، تمدن پر بھی

اس سلسلہ میں فرمایا:- "لیکن حضرات، جیسا آج کل کئی مہینوں کی خط وکتابت سے معلوم ہوا، اشتہارات دینے کے بعد جو تحریرات جا بجا سے آئی ہیں اور جو کیفیتیں محقق طور سے معلوم ہوئیں، جو بحث اور سفیروں کو بھیج کر دریافت کی گئیں، خاص ایک شخص حسن شاہ مقرر کرکے بھیجے گئے، اُنھوں نے بہت سے مقامات میں جاکر خود دیکھا تو ایسی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی ہیں، جن کی بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ اگر تمام مسلمان قوتِ متفقہ کے ساتھ متحد نہ ہوں گے تو کیا ہونا ہے"

پھر تفصیل کے ساتھ آریوں کی مخفی کوششوں، گروکل کی کیفیت اور مسلمانوں کی بے پروائی کی داستان بیان فرمائی، پھر صحابہ کرام، ائمہ عظام اور صوفیہ اور خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی مخلصانہ خدمات کا تذکرہ کرکے فرمایا کہ ہم میں پھر اخلاص وایثار کا وہی جذبہ پیدا ہو کہ ہم کفنی پہنکر صحرا بہ صحرا اسلام کا پیغام لے کر پھیلیں، اور لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائیں، ایسے علما پیدا کریں جو انگریزی، بھاکا اور علوم جدیدہ سے واقف ہوں، جو اس زمانہ کی دہریت اور الحاد کا توڑ کریں، آخر میں فرمایا "سردست دو تدبیریں نظر آتی ہیں، ایک یہ کہ دیہات میں نو مسلموں کے لئے چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کئے جائیں، پانچ، چھ، سات گاؤں کا ایک حلقہ قرار دے کر ایک صدر مقام جہاں سے آدھ آدھ کوس کے فاصلہ پر دیہات ہوں وہاں ایک بڑا مکتب ہو جس میں نہ آپ کا یہ فلسفۂ یونانی ہو اور نہ انگریزی کا ایک نقطہ ہو، بلکہ صرف قرآن شریف کا متن اور اردو واتنی کہ جس سے بعض مسائلِ عبادت نماز و روزہ اور وہ بھی نہایت آسان آسان اُن کو پڑھائے جائیں، اور زور دے کر فرمایا کہ اردو میں نہیں بلکہ یہ رسائل ناگری ہی میں چھپوائے جائیں، تاکہ آسانی سے وہ اس کو سیکھ کر پڑھ سکیں،

دوسری تدبیر یہ بیان کی کہ ایسے معمولی خواندہ مسلمانوں کو جو اردو پڑھ لیتے ہوں اُن کے لئے

ایک ٹریننگ کلاس ندوہ یا الہیات کان پور میں کھول دیا جائے، اور ان کو وظیفہ دے کر ایک سال وہاں پڑھایا جائے، اس کے بعد مکران دیہاتوں میں تعلیم و تلقین کے لئے پھیلا دیا جائے، کہ دو دو تین تین مہینے ایک ایک گاؤں میں رہ کر مسلمانوں کو مسلمان بنائیں" آخر میں فرمایا "میں وقتی جوش کا قائل نہیں، آپ گھروں پر جاکر غور کریں، اور سوچیں، اور اس کے بعد اپنے دل میں اثر پائیں تو اسلام کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائیں "

مولانا کی یہ تقریر بڑی پُر اثر تھی، ندوہ کی روداد کے یہ الفاظ ہیں:

مولانا ممدوح کی یہ تقریر جس کا لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا، حاضرین کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، اور اُن کی اندرونی تاثیر کو امداد کی صورت میں ظاہر کر رہی تھی،

دن کو یہ تقریر ہوئی اور ساتھ خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور مولوی ابوالکمال عبدالودود صاحب بریلوی کی تائیدی تقریریں بھی ہوئیں، اس کے بعد رات کے جلسہ میں جب ان تقریروں کی تاثیر کی جستجو کی گئی تو ڈیڑھ سو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اپنے نام لکھائے جو اس کام میں ہر طرح کی امداد کے لئے آمادہ تھے،

مولانا یہ چاہتے تھے کہ اشاعت کے کام تمام فرقے مل کر کریں، اسی لئے مرزا بشیر الدین محمود صاحب خلیفہ قادیان نیز اور خواجہ کمال الدین صاحب تک کی شرکت سے انکار نہیں کیا گیا، اس پر اسی جلسہ کے دوران میں مولانا پر یہ الزام رکھا گیا کہ انھوں نے قادیانیوں کو جلسہ میں کیوں شریک کیا اور ان کو تقریر کی اجازت کیوں دی، مگر مولانا شروانی کی ناشی سے یہ جلا ٹل، جلسہ کے بعد ہی اضلاع کے دورہ کا خیال تھا، اس کا آغاز کان پور سے کیا، ۲ مارچ ۱۹۱۳ء

کو وہ کانپور روانہ ہوئے۔ منشی محمد امین کو لکھتے ہیں:۔ "میں آج کانپور روانہ ہوتا ہوں، نومسلموں
پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دورہ کر کے
انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا"

مئی سنہ ۱۹۱۲ء میں گرمیوں کے ڈر اور سیرت کے خیال سے یکسوئی اور تنہائی کی تلاش میں بمبئی
روانہ ہوگئے، اور مجھے سیرت کے کام کے سلسلہ میں رفاقت کا شرف بخشا۔ (امین۔ ۹۔ ۱۰)
تین چار مہینے وہاں رہے اور سیرت کی پہلی جلد تعمیر کعبہ تک ختم کی، مجھے یہ ہدایت ہوئی کہ ابن اسحاق،
ابن سعد اور طبری کے رجال چھانٹ کر الگ کروں چونکہ عام طور سے ان کے رجال نہیں ملتے اس لئے
بڑی دقت کی، میں نے رجال ابن اسحاق، رجال ابن سعد اور رجال طبری پر الگ الگ سارے پیش کئے اور
برسات کے بعد بمبئی سے واپسی ہوئی، مجھے ارشاد ہوا کہ میں بمبئی سے بی بی سی آئی ریلوے
سے گجرات اور بڑودہ وغیرہ کا دورہ کر کے مسلمانوں کی عام مذہبی کیفیت کا اندازہ کروں، چنانچہ اس
پروگرام کے مطابق گجرات، بڑودہ، اور اجمیر تک کا سفر کیا اور وہاں کے اکابر سے مل کر اشاعت و حفاظت
کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا، اور آخر آگرہ ہو کر لکھنؤ پہنچا، واپسی کے بعد مولانا نے یہ طے کیا کہ وہ اشاعت
کا کام ندوہ سے بالکل الگ ہو کر کریں، مجھ سے فرمایا کہ جن لوگوں نے جلسۂ سالانہ میں امداد کا وعدہ
کیا تھا اور دوسرے ہمدرد حضرات کے نام ایک مطبوعہ خط بھیجوں، اور ان سے مجلس اشاعت و
حفاظت اسلام کی رکنیت کی خواہش کروں، اور ہر رکن سے دو روپے سال کے چندہ کا وعدہ
لوں، اس تجویز کے مطابق میں نے پانچ سو اصحاب کے نام یہ خطوط بھیجے، اور ان کے جوابات آنے
۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء کو مجھے الہ آباد سے لکھتے ہیں:۔ "اشاعت کے جوابات آرہے ہیں، میری دانست

میں خلافت اور اس کے ساتھ اور مطبوعہ کاغذات کے پمفلٹ بھیجے چند لوگوں نے استحسان اور ممبری قبول کی ہے، جواز دیا اور رقم ممبری:

لکھنؤ کے پچھلے اجلاس میں اردو خواں حلقوں کی جو تجویز پیش کی تھی اس سلسلہ میں فرمایا:۔ دینا روپے اجرار پر مسلم گزٹ میں ایسے ابتدائی حلقوں کے لئے اشتہار دیئے جو دیہات میں جاکر اردو کی ابتدائی کتاب اور قرآن مجید پڑھا سکیں:۔

میں نے چاہا کہ صیغۂ اشاعتِ اسلام الگ قائم کر کے اس کی طرف سے اعلان ہو، مولانا نے اس کو ابھی پسند نہیں کیا، فرمایا:۔ صیغۂ اشاعتِ اسلام کے نام کی ابھی ضرورت نہیں، آریہ سمجھ گئے صرف میرا نام لکھ دو:۔ (سلیمان ۳۹)

میں نے پھر اپنے خیالات لکھ بھیجے اور عرض کی کہ اشاعت وحفاظت کے کام کو بڑے پیمانہ پر شروع کرنا چاہئے، اور اسی کے مطابق ایک یادداشت لکھ کر الٰہ آباد بھیجی، ۳۰ جنوری ۱۹۱۳ء کو جواب آیا:۔ خاکسار آپ کے پروگرام کے ابتدائی حصے سے میں سردست متفق نہیں، اسی نے پہلے پروگرام کو آپ کی رایوں کے انضمام کے ساتھ بھیجا ہوں، بڑے بڑے امرا ابھی شریک نہیں ہوں گے، بلکہ ایسے بڑے پروگرام بھڑک سکیں گے، ان سے استفسار کرنا، اور ناکامیاب ہونا دل شکستہ کر دے گا، اس نے ابھی بہت اونچا نہ دیکھئے اگر آج میں اس کا کہیں اجلاس ہوتا تو دستہ مختلف، غلام حسین عارف کو خاص طرح پر لکھنا چاہئے، شاید کچھ انتظام ہو سکے:۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اشاعت وحفاظت کا کام اگر آپ کے بجائے دوسرے ممبروں کے نام سے چلایا جائے تو شاید دوسرے ارکان کے رشک وحسد کی آگ نہ بھڑکے، اور کام چل نکلے، اس پر اسی خط

میں لکھا: "تم لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام کی تکرار سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس کے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے دیکھتا ہوں، اور زبان سے ہر وقت ہائے ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق "الہلال" میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے، اس کے ساتھ ہوں اور پیرو بن سکتا ہوں۔" (سلیمان ۴۰)

اشاعت فنڈ میں روپیہ نہ تھا، میں نے اجازت دی کہ جمعیۃ فنڈ سے قرض لے کر کام شروع کروں، پھر لکھا: "کلکتہ، پٹنہ، رامپور میں اشاعت کے کاغذات کیا کم گئے؟ پرنس اور کاٹ کو انگریزی خط لکھو، کہ اس کے ساتھ کاغذات بھیجو، غلام محمد خاں کو خاص طور پر لکھو، خود اپنے دستخط سے بھیجو، اور جنٹ سکریٹری اشاعت اپنا نام لکھو . . . . اشاعت اسلام کو جمعیت و اصلاح کے بعد بھیجتا ہوں، دو ہزار یا زیادہ چھپوا لو، اور بڑا خط بھی۔"

پانچ سو کے اندازے میں یہ کاغذات ملک کے اکابر کے نام بھیجے گئے، مگر ۲۰ فروری سنہ ۱۹۱۳ء تک صرف بیس تیس اصحاب کے جواب آئے، یہ صورت دیکھ کر مولانا نے مجھے لکھا: "برادرم! دیکھا، پانچ سو میں سے صرف اور کل بیس تیس جواب، ان ہی باتوں کو میں دیکھ رہا تھا، خیر اب تو پیچھے ہٹنا نہیں ہے، زنہار اس رسید ہی سے کام نہ لو، (وہ کیا پرانی چھپی ہوئی رسیدوں سے) ورنہ شاہ سلیمان اور مولوی خلیل الرحمان صاحب فوراً اگر ہاتھ کھینچ لیں گے، اور کچھ کرنے نہ دیں گے، ندوہ سے بالکل آزاد رہنا چاہئے، ایک مؤتمر دینی علوم کا مسودہ لکھ کر چھپنے کو دیا جائے، وہ اصل اسکیم ہے جس پر چلنا چاہئے، آجائے تو بھیجو نیز آج جن لوگوں کے جواب قبول ممبری کے آئے ہیں حسب ذیل ہیں۔"

اس تجویز پر عمل ہونے نہ پایا تھا کہ مولوی عبد الکریم صاحب کی معطلی کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا

خاکسار دل برداشتہ ہو کر وطن چلا آیا، اور وہاں سے "الہلال" کلکتہ کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اور مولانا بیمار اور پراگندہ خاطر ہو کر مولوی عبد السلام صاحب اور سیرت نوٹس کو لیکر بمبئی روانہ ہو گئے اور دو چار ماہ کے غور و فکر کے بعد جولائی ۱۹۱۳ء کو ندوہ سے مستعفی ہو کر سبکدوش ہو گئے، اور کام کی ساری تجویزیں درہم برہم ہو کر رہ گئیں، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

خدام الدین ۱۹۱۳ء

مولانا نے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا تو ان کو نظر آیا کہ جب تک مبلغینِ اسلام کی ایک ایسی جماعت نہ تیار کی جائے جو مذہبی تعلیم کے ساتھ سادہ مذہبی زندگی بسر کرے، اس میں ایثار، قناعت اور جفاکشی کا مادہ ہو، اس وقت تک آریوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اس وقت آریہ مبلغوں کا سب سے بڑا مرکز گروکل تھا، گروکل کے حالات اخباروں میں پڑھ کر، وہاں جانے والوں سے زبانی سُنکر وہ بہت بیتاب تھے کہ اس کے مقابلہ کے لئے ایک جماعت مسلمانوں میں بھی ہو،

اعظم گڈھ کے ضلع میں ایک قصبہ سرائے میر ہے، مولانا کی برادری کے لوگوں نے عربی کا ایک مدرسہ نیا نیا قائم کیا تھا جس میں زیادہ تر اسی ضلع کے دیہاتی لڑکے عربی تعلیم حاصل کر رہے تھے، چونکہ یہ مدرسہ بالکل مولانا کے زیر اثر تھا، اور اُن دیہاتی بچوں میں نہایت آسانی کے ساتھ یہ تمام اوصاف پیدا کئے جا سکتے تھے، یعنی یہ کہ وہ سادہ زندگی بسر کریں، اور مسلمانوں کے دیہاتوں میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سفر کریں، اور تبلیغ کا کام انجام دیں، اس لئے مولانا نے اس مقصد کے لئے اس مدرسہ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا، چنانچہ ۹ اپریل ۱۹۱۳ء کو مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟

میں بھی شاید آؤں، اور اس کا نظم ونسق درست کردیا جائے،

اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔" (حمید ص ۵)

مدرسہ سرائے میر کی نسبت تو یہی خیال ہی تھا کہ مولانا نے خود دارالعلوم میں ایک جماعت کی بنیاد ڈالدی، اور اس کا نام خدام الدین رکھا جو طلبہ اس کام کے لئے تیار ہوے تھے اُن کے والدین کو لکھ کر اُن کی رضامندی منگوائی، پھر طلبہ کو اس میں داخل کیا اُن کے لئے سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکامِ اسلام کی پوری پابندی اور تقوی اور قناعت اُن کی زندگی کا اصول بنایا گیا، اس زمانہ میں خود مولانا پر بھی یہی اثر تھا، اور یہ اخیر زندگی تک رہا،

مولوی حمیدالدین صاحب کو ۵ر فروری سنہ ۱۹۱۲ء کو یہ خوشخبری سناتے ہیں: "میں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کردی، الگ مکان لے دیا ہے اور الگ تربیت ہے، قریباً ایک ماہ ہوا، ابتک امید افزا آثار ہیں، احکامِ اسلام کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے، ابھی تک سات لڑکے عہدو پیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں، یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی دیں گے، اور جو کام اُن کو بتایا جائے گا۔" (حمید ص ۵)

ان سات طالبعلموں میں سے ایک طالب علم مولوی عبدالرحمان نگرامی مرحوم تھے، انھوں نے واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں مولانا کے ہاتھ پر جو عہد کیا تھا اس کو اخیر تک نباہا، افسوس ہے کہ جوانی ہی میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے، اگر وہ زندہ ہوتے تو مولانا کے حسنِ انتخاب کا زندہ پیکر ہوتے،

جنوری سنہ ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد جب مولانا نے اعظم گڈھ کو اپنا دارالعمل

قرار دیا، اور نیشنل اسکول اور مدرسہ سرائے میر میں سے پہلے کو تمام قوم کی دنیوی اور دوسرے کو دینی تعلیم کا مرکز بنانا اور اسی میں خدام دین کی جماعت کا انتظام کرنا چاہا، چنانچہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھا: "مدرسہ اپنی آمدنی سے چل رہا ہے، بحث یہ ہے کہ جو قوی قوت مدرسۂ سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڈھ پر دونوں کے برداشت کے قابل قوم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہئے، اور ان کا باہمی تعلق،

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم یہیں رہے لکھنؤ، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہئے، ہم سب کو یہیں بود و باش رکھنی چاہئے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہئے، اگر تم یہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں" (حمید ۷۶)

بہرحال ابھی یہ تجویز خواب و خیال میں تھی کہ مولانا نے اس کے ایک سال کے بعد آنکھیں بند کر لیں، مولانا کی یہ تجویز حقیقت میں بڑی اہمیت کی چیز تھی اور ان کی نکتہ رس نظر بہت دور پہنچی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حقیقی کامیابی کے لئے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو عملی تبدیلی چاہئے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لئے وقت درکار تھا، اس کے لئے گروکل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگان دین اور ائمۂ ہدیٰ کی نظیریں سامنے رہنی چاہئے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں ان کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی، اگر مولانا کچھ دن اور زندہ رہتے تو ان کے دل میں اخیر میں جو تخم پیدا ہو چکا تھا وہ یقیناً ایک دن بار آور ہوتا،

جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کا رد
اگست و ستمبر ۱۹۱۱ء

مصر میں شام کا ایک عیسائی مورخ و ادیب جرجی زیدان نام تھا جس کا رسالہ الہلال ان دنوں بہت مشہور تھا، یہ عربوں کے علوم و فنون اور اسلامی تاریخ پر مضامین اور کتابیں لکھا کرتا تھا، اس کے کئی تاریخی ناول ہیں جن میں کسی نہ کسی اسلامی عہد کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے، اس کی سب سے مشہور کتاب تمدن اسلامی کی تاریخ ہے جو اس نے عربی میں پانچ جلدوں میں لکھی ہے، یہ تاریخ تمدن اسلامی مستشرقوں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ پروفیسر مارگولیتھ (اوکسفورڈ یونیورسٹی) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا (اور بعض صاحبوں نے اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا ہے)

مصنف چونکہ عیسائی تھا اس لئے اس نے اپنے قلم سے اس میں اسلامی تمدن کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، مگر ایسے اسلوب سے اس کو دکھایا ہے کہ بظاہر وہ حسن نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی نہ کوئی عیب چینی ہوتی ہے،

جرجی زیدان سے مولانا کے پرانے تعلقات تھے، خط و کتابت تھی، الہلال میں ان کے مضمون نکلتے تھے، مگر اس کے باوجود مولانا نے اس کی اس کتاب کی حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کے لئے وقت کے منتظر تھے، اس اثنا میں برلن سے ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمود لبیب کا خط ۱۹۰۸ء میں مولانا کے نام آیا جس میں مولانا سے اسلامی آلات پر ایک رسالہ کی نسبت سوال تھا، مولانا نے بہت دن ہوئے وہ رسالہ (ذخیرہ الہلال کے پاس مصر بھیج دیا تھا، مولانا نے ان کو جرجی زیدان کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اس رسالہ کو وہ ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کر دیں اسی تقریب سے مولانا نے اس خط میں جرجی زیدان کی ابلہ فریبیوں اور دسیسہ کاریوں پر بھی کچھ سطریں

لکھی تھیں ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں برلن سے ۱۱ اگست ۱۹۱۰ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں مولانا کی تائید کی تھی، اور اس کی تصنیفات کا راز فاش کیا تھا، یہ خط مزید تحریک کا باعث ہوا، لیکن اس وقت مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لئے مجھے اشارہ ہوا، اور میں نے ایک مختصر مضمون جرجی زیدان کی تصنیفات کی غرض وغایت اور قدر وقیمت پر لکھا جو اکتوبر ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں شائع ہوا، پھر اگست ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں اس کی تمدنِ اسلامی کے اس باب کا جو کتبخانۂ اسکندریہ پر ہے اور جس میں اس نے مولانا کے کتب خانۂ اسکندریہ کے دلائل کا رد کیا ہے جواب لکھا، لیکن ۱۹۱۱ء میں چند واقعے ایسے پیش آئے کہ مولانا کو باوجود قلتِ فرصت اس کی کتاب پر مستقل طور سے ایک نہایت سخت اور مبسوط تنقید بلکہ تردید لکھنی پڑی۔

پہلا واقعہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر یوسف ہارویز کی تجویز سے اس عربی کتاب کا کچھ حصہ ہمارے صوبہ کے مولوی فاضل کے امتحان[1] میں رکھا جانے لگا، دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ مارگولیوس نے اس کتاب کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو اسی زمانہ میں ٹائمس نے ایک مضمون لکھا کہ حضرت عمرؓ کا کتب خانۂ اسکندریہ کو جلانا ثابت ہے، جیسا کہ جرجی زیدان نے اس کو تمدنِ اسلام میں جدید دلائل سے ثابت[2] کر دیا ہے، اس پر

---

[1] ۹ و ۱۰ اگست ۱۹۱۱ء کو ابو الکلام صاحب کو لکھتے ہیں: "تمدن اسلام کا قصہ بہت متعدی ہوا، یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارو فیسر(؟) پروفیسر علی گڈھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی کہ امتحانات فاضل عالم میں وہ داخل درس کیا جائے، مجھ پر سخت اثر ہوا، اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بافیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت تک ۴۰ صفحے ہو چکے ہیں، عربی میں لکھ رہا ہوں، اور مصری اخبارات میں چھپوا دوں گا" (ابو الکلام ۳۲) [2] مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں: "جرجی زیدان کے صرف ایک حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہوا، مارگولیوس نے کیا جو اسلام کا سخت دشمن ہے، اور درحقیقت اسی انگریزی ترجمہ نے مجھ کو رد لکھنے پر آمادہ کیا" (ریاض ۱۰)

اس مضمون کی تمہید الندوہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں پڑھیے جس میں اس واقعہ کا حوالہ ہے۔

خود یہ ہوا کہ مصر کی یونیورسٹی کو جس کا نام جامعہ مصریہ تھا اسلامی تاریخ پر لکچر دینے کے لئے ایک پروفیسر کی ضرورت ہوئی تو بعض آزاد خیالوں نے جرجی زیدان کا نام پیش کیا، یہ نام منظور ہونا ہی چاہتا تھا کہ مصر میں اس تقرر کے خلاف ایک شورش سی برپا ہو گئی، آخر اس کے بجائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے جن کے تاریخی لکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامۃ کے نام سے روشناس ہیں۔

ان واقعات نے مولانا کو مجبور کیا کہ ۱۹۱۱ء کے آخر میں اس کتاب پر ایک سخت تنقید لکھیں جس سے اس کی بے اعتباری نمایاں ہو جائے، غالباً اگست ۱۹۱۲ء سے مولانا پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہوئے جو کئی مہینے تک جاری رہا، بیسیوں تصنیفات کے ہزارہا صفحات جن کے حوالے اصل کتاب میں تھے ان کو ملا کر دیکھنا، اور مختلف اڈیشنوں کو تلاش کرنا ان میں مصنف کے دیئے ہوئے حوالوں کو ڈھونڈھنا آسان کام نہ تھا، یہ رمضان کا مہینہ اور بجائے (ستمبر) کی اس دھوپ میں، مولانا روزہ رکھ کر اسی طرح کتابیں دیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کی محنت اٹھاتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور اس کی بینائی گرتی جاتی رہی، اس پر بھی کام جاری رہا اور اس کو تمام کر کے چھوڑا۔

۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو مولانا اس واقعہ کو کس حسرت سے مولوی ابو الکلام کو لکھتے ہیں:- "تنقید کے دنوں میں ابتداءً ایک ہفتہ میں اس قدر انہماک رہا کہ ایک آنکھ میں پانی اترنا محسوس ہوا، اور اب اس سے مطلق نظر نہیں آتا، ایک آنکھ جو کچھ ہے اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے، اب لکھنا پڑھنا اصل کام ہو گیا، ہوش کے ساتھ منغص ہو کر رہ گئے، اور اسی پر کتاب ختم کر دی، وصیت بجنسہ المسودہ رہتی ہے، سپاہی کا ہتھیار چھین گئے تو پھر وہ کس کام کا ہو؟" (ابو الکلام ۳۳)

[illegible]

اسی تنقید و تردید کا اردو خلاصہ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں چھپا، اور اصل عربی مضمون کو جو عربی ادب کا نمونہ ہے الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے پہلے خود مولانا نے جنوری ۱۹۱۲ء میں ہندوستان میں لکھنؤ کے ایک مطبع میں چھپوایا، اور ساتھ ہی اس کے اجزاء مصر میں فروری ۱۹۱۲ء میں سید رشید رضا اڈیٹر المنار کے پاس بھیجے، سید موصوف نے بڑی تعریف کی، اور اس اہم کام کے انجام پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور لکھا کہ وہ مصر کے کئی علماء کو ادھر متوجہ کر چکے تھے، مگر کسی نے ہمت نہیں کی، بحمد اللہ کہ یہ فرض کفایہ ہندوستان کے ایک عالم سے ادا ہو سکا (ریاض حسن وحیدہ)

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "سید رشید رضا نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں خود بھی تردید کرنی چاہتا تھا مگر جرجی زیدان کے ناول اس قدر پھیلے ہوئے تھے کہ ان کی بحث کرنا، اور ان کی تردید کرنا تاب میں نہ تھا، آپ نے اس بوجھ کو اٹھایا اور تردید کردی۔"

سید موصوف اس کے بعد مولانا کی خواہش پر ۱۹۱۲ء کے شروع میں ہندوستان آئے اور یہاں سے واپس جا کر اس کو المنار میں، اور بعد کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا،

اس رسالہ کی عربی تحریر بڑی انشاپردازانہ ہے، مولانا عربی تحریر میں جاحظ کے طرز کے پیرو تھے، جس زمانہ میں وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے جاحظ کی بیان و تبیین اور کتاب الحیوان اکثر مطالعہ میں رہتی، راقم کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس کتاب میں بنوامیہ کی علمی سرپرستی کا باب جو طبع ہند کے صفحہ ۱۴۸ سے صفحہ ۱۵۶ تک ہے حضرۃ الاستاذ کے اشارہ سے اس شکستہ رقم کے قلم سے نکلا ہے، وللہ الحمد،

اس کتاب کے چھپوانے کا مرحلہ درپیش تھا کہ حکیم نور الدین صاحب نے قادیان سے اس کے لئے پچاس روپے بھیج دیئے، باقی کے لئے انھوں نے اپنے دوستوں میں سے مولانا شروانی، نواب

عزل اللہ خاں، اور عزیزوں میں سے مولانا حمید الدین کو لکھا، اور خود مولانا نے بھی اپنا حصہ دیا، اور کتاب چھپکر شائع ہوئی (شروانی ۹۵)

اس کتاب کی اشاعت نے ہندوستان اور مصر اور دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں جہاں تک تمدن اسلامی کا زہر پھیلا تھا تریاق کا کام دیا، اور ایک بڑے فتنے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا، والحمد للہ علی ذالک،

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۹۱۰ء

اس وقت تک قرآن پاک کے جتنے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوتے تھے وہ کل عیسائیوں کے قلم سے نکلے تھے، انگریزی میں سب سے پہلا اور مشہور ترجمہ سیل کا تھا، اُنکی صدی بارگیا، اور سنہ ۱۸۶۱ء میں راڈویل کا ترجمہ شائع ہوا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے نزدیک کسی استناد کے لائق نہیں ہو سکتے تھے، ہندوستان میں انگریزی زبان کی اشاعت کے سبب جن نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے کی طرف توجہ ہوئی، وہ ان ہی ترجموں کی طرف توجہ کرتے تھے، غیر مسلم لوگ بھی جب اسلام کی دعوت کا صحیح مطلب سمجھنا چاہتے تھے تو ان ہی ترجموں میں سے کسی ایک کو پڑھتے تھے،

اس زمانہ میں آریوں کے سبب سے جب مولانا کو تبلیغ و حفاظتِ اسلام کی طرف توجہ ہوئی تو قرآن پاک کے ایک مستند انگریزی ترجمہ کی ضرورت بھی معلوم ہوئی چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب دلی میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا تو مولانا نے اس جلسہ میں یہ تجویز پیش کی، اور تمام لوگوں نے اس کی تائید میں صدائیں بلند کیں، مصارف کا مرحلہ اسی جلسہ میں نہایت آسانی کے ساتھ طے ہوگیا، یعنی سردار اسمٰعیل خاں سفیرِ افغانستان نے اعلان کیا کہ وہ سردست اس مقصد

کے لئے پانچ ہزار روپیہ دیتے ہیں، اور اس کے علاوہ جو مصارف پڑیں گے وہ ان کو بھی برداشت کریں گے، اب جو کچھ دقت تھی وہ صرف یہ تھی کہ کون شخص اس کام کو انجام دے، مولانا کے نزدیک اس کے لئے ایک ایسا جامع الحیثیتین شخص درکار تھا جو عربی اور انگریزی دونوں کا ماہر ہو، اور اس کے ساتھ قرآن مجید پر کافی غور کر چکا ہو، اس لحاظ سے اُن کی نگاہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اور نواب عماد الملک مرحوم پر پڑی، اُسی زمانہ میں مولانا نے مولوی محمد صالح صاحب پروفیسر بہاولپور کالج کی بھی تعریف سنی، اور ان سے خط و کتابت کی لیکن نواب عماد الملک جو انگریزی کے ایک اہل ادیب تھے، اور عربی زبان سے بھی واقف تھے، اس کام کے لئے سب سے زیادہ مستعد نظر آئے حالانکہ اُن کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی، اس پر بھی مستعدی ظاہر کی، اور دو گھنٹہ روزانہ کام کرنا شروع کیا، چنانچہ انھوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ مسودہ مولانا کے پاس بھیج دیں گے، جو چھپ کر مولانا حمید الدین اور مولوی محمد صالح اور دوسرے قابل حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا، پھر جو رائیں اُن کی نسبت موصول ہوں گی وہ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی جائیں گی، اور متفقہ رائے سے فیصلہ ہوگا اس کے ساتھ مولانا نے یہ رائے بھی قائم کی کہ انگریزی کا اردو ترجمہ علماء کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش ہوگا، تاکہ وہ اس کی صحت و غلطی کا فیصلہ کر سکیں،

نواب صاحب کا یہ ترجمہ پندرہ پاروں تک مکمل ہو چکا تھا ۱۹۱۴ء میں جب مولانا کی کوششوں اور نواب عماد الملک کے اصرار سے مولوی حمید الدین صاحب دار العلوم حیدرآباد کے صدر پرنسپل، مقرر ہو کر حیدرآباد پہنچے تو نواب صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور روزانہ مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اپنے انگریزی ترجمہ پر نظر ثانی شروع کی، یہ کام تمام بھی نہیں ہوا تھا کہ خود مولانا

کی تو تمام ہوگئی، مولوی حمید الدین صاحب اور نواب صاحب کا کام اس پر بھی جاری رہا، اور اس متفقہ کوشش سے جو اصلاح ہوئی تھی وہ غالباً چار پاروں تک پہنچی تھی، اسی اثنا میں ۱۹۰۸ء میں مولوی حمید الدین صاحب حیدرآباد سے چلے آئے اور نواب صاحب ضعف بصارت اور علالت کے سبب سے تنہا کام کرنے سے معذور ہوگئے، اور ۱۹۱۲ء میں اُن کا انتقال ہوگیا اور کام سولہ پاروں سے آگے نہ بڑھ سکا، نواب صاحب نے جن ۱۰ پاروں کا ترجمہ کیا تھا اس کا چھپا ہوا مسودہ تو موجود ہے، مگر افسوس ہے کہ چار پاروں کے اصلاح شدہ مسودہ کا تلاش کے باوجود پتہ نہیں چلا،

مولانا کی یہ تجویز گو اُن کی وفات سے ناتمام رہی، مگر بحمد اللہ کہ ناکام نہیں رہی یعنی گو اُن کے ہاتھوں سے یہ انجام نہ پا سکی، مگر اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اُن کی اسی تحریک کا فیض تھا کہ اس کے بعد قادیانیوں نے مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے مسٹر محمد پکتھال (حیدرآباد) نے اور بعض دوسرے مخلص مسلمانوں نے اس کام کو انجام تک پہنچایا، اس لئے الدال علی الخیر کفاعلہ کے اصول پر انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی اس ثواب سے حصہ ملیگا،

مجلس علوم کی تجویز ۱۹۱۲ء

اسلام کی مستقل حفاظت و اشاعت کی غرض سے جو تجویزیں اس زمانہ میں مولانا کے ذہن میں آ رہی تھیں اُن میں سے ایک مجلس علم کلام کی تجویز تھی، جس کے ذریعہ سے یورپ کے فاسد خیالات و اعتراضات کا استیصال مقصود تھا، اُن کے خیال میں اس مشکل کا اصل حل قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج تھا جس کے لئے وہ ہر طرف کوشش کر رہے تھے، لیکن جب تک اس امتزاج کا سامان نہ ہو، اور اس کا نتیجہ پیدا نہ ہو اُن مشکلات سے اعراض نہیں برتا جا سکتا جو جدید تعلیم کے بدولت مسلمانوں کو پیش آ رہی تھیں، اس بنا پر اُن کو یہ خیال ہوا کہ

ملک میں اس وقت نئے تعلیم یافتوں میں سے ایسے لوگوں کو جو فلسفہ کا ذوق اور اسلام کا درد رکھتے ہوں ایک طرف سے لیا جائے، اور دوسری طرف سے ایسے علماء کو لیا جائے جو قدیم فلسفہ کے ماہر، جدید تعلیم سے مانوس اور فلسفۂ جدیدہ کے نئے اعتراضات کی تردید و تنقید کی قوت رکھتے ہوں، اور ان دونوں کو ملا کر ایک مجلس علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے، جس میں یہ غور کیا جائے کہ فلسفۂ جدیدہ کے کون کون سے مسائل مذہب کے مخالف ہیں، اور یہ مسائل کہاں تک یقینی ہیں، اور ان کی بناء پر مذہب پر جو اعتراضات پڑ سکتے ہیں ان کا جواب کیا ہے؟ اس مجلس کے لئے علماء میں سے انھوں نے مولوی مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی، مولانا شیر علی صاحب حیدرآباد، سید رشید رضا مصری کو لیا، اور نئے تعلیم یافتوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال لاہور، مولوی حمید الدین صاحب پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد اور مولوی عبدالقادر صاحب بی اے بھاگلپوری کو لیا، اور ۱۴ مارچ ۱۹۱۲ء کے مسلم گزٹ میں ایک مضمون[1] کی صورت میں اس تجویز کو شائع کیا، اور دلّی کے اجلاس ندوہ میں اس پر غور و فکر کی دعوت دی، اس مضمون میں مولانا نے پہلے عباسیوں کے زمانہ میں علم کلام کی بنیاد پڑنے کی کیفیت لکھی ہے اور اسی پرواز پر موجودہ زمانہ میں کام کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے،

اس تجویز پر عمل کا آغاز اس سے کیا کہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ کو اس تجویز کے مطابق خطوط لکھے، اور ان کے جوابات بھی آئے، مگر مجلس کا کام شروع نہ ہو سکا اور یہ تجویز تجویز کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی،

کلکتہ کا سفر ۱۹۱۲ء کلکتہ اس زمانہ میں حکومت کا پایۂ تخت تھا، وقف اولاد کونسل کے اکثر مسلمان ممبروں سے ملنے کے لئے مولانا کو کئی دفعہ کلکتہ کا سفر کرنا پڑا، وہاں کبھی جسٹس شرف الدین کے ہاں

---

[1] یہ مضمون مقالات شبلی جلد ہشتم ص [illegible] میں ہے،

ٹھہرے، اور کبھی مولانا ابو الکلام صاحب کے پاس ۱۹۱۲ء کے شروع میں انھوں نے پھر کلکتہ کا سفر کیا، اور وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کرکے تمام مراتب طے کئے، اور واپسی میں پٹنہ میں قیام کیا،

پٹنہ کا سفر ۱۹۱۲ء مولانا نے پٹنہ کا متعدد بار سفر کیا، شروع میں ۱۹۰۶ء میں ندوہ کے لئے گئے، اور غالباً مولوی عبد الغنی[1] صاحب مرحوم وکیل کے دولتکدہ پر قیام فرمایا، پھر خدا بخش خاں کے کتب خانہ کی سیر کو کئی دفعہ گئے، ۱۹۱۰ء میں بھی گئے تھے، اور مولوی شرف الدین صاحب بیرسٹر کے یہاں ٹھہرے تھے، ڈھاکہ سے واپسی میں بھی پٹنہ میں ٹھہرے، اور خدا بخش خاں کے یہاں اترے، ایک دفعہ شمس العلماء مولوی حافظ محب الحق صاحب (مصنف دعوۃ الحق) کے یہاں مہمان ہوئے تھے،

اس دفعہ ۱۳ فروری ۱۹۱۲ء کی صبح کو وہ پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے معتقدین کا نہایت کثرت سے مجمع تھا، شہر کے عمائد اور کالج کے تمام طلبہ موجود تھے، آدھی راہ کے بعد طلبہ کے اصرار سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے، اور خود طلبہ ذوق و شوق کے عالم میں اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچکر فرودگاہ تک لائے، مولانا اس واقعہ کو لکھ کر فرماتے ہیں: "یہ تو نہیں کہتا کہ عزت پرست نفس کو خبر بھی نہیں ہوئی ہوگی لیکن واقعہ یہ تھی کہ عجیب خوش اعتقاد، بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں" (ابو الکلام ص ۳۵)

مولانا کا ایسا سمجھنا ان کے حسن تواضع کی دلیل ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کے کمال

---

[1] مولوی عبد الغنی صاحب مرحوم ایک لائق خاندان کے لائق فرد تھے، پٹنہ کا مشہور مردم خیز گاؤں نیورا ان کا وطن تھا، علم دوست، اور علماء کے قدرشناس تھے، پٹنہ کے مشہور وکلاء میں تھے،

ں اور خصوصاً نوجوانوں میں اتنا ہی ہر دلعزیز بنا دیا تھا،

نا ایک جلسہ ہوا جس میں لوگ کثرت سے شریک ہوئے اور مولانا نے اس میں وقت

ن کے سلسلہ میں ندوہ کا مناسب ذکر کیا۔ (ابوالکلام ۳۵)

اسی سال اکتوبر کے آخر میں انھوں نے پٹنہ کا ایک اور سفر کیا، اور غالباً اس سفر کی غرض تعطیل جمعہ کے موریل کی تیاری کے سلسلہ میں تھی، اور غالباً کتب خانہ میں قیام فرمایا، ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر محمود کو جواب پٹنہ میں بیرسٹری کر رہے تھے حسب ذیل خط[1] لکھا:- "بانکی پور (پٹنہ) میں تو غالباً کتب خانہ ہی میں ٹھہروں، مدت سے وہاں آمد و رفت ہے اور وہیں ٹھہرتا ہوں"

سیاسیات

مولانا کی سیاست واقعات کا جو سلسلہ چلا آتا ہے اُس سے ہمارے ناظرین پر یہ بات بخوبی واضح ہو چکی ہوگی کہ گو سیاسیات کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا، تاہم وہ سیاسیات کے ہمیشہ دلدادہ رہے، لیکن اُن کے سیاسیات کا یہ رقبہ بھی حقیقت میں اُن کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جزو تھا، یعنی ان کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضا یہ ہونا چاہیے کہ اُن کو اسلام کی حکومت عزیز ہو، اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے ہیں اُس کو وہ بچشم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو بھی گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا، اُن کی طرف سے اُن کو پورا انحراف ہو، یہی اُن کی سیاست تھی

[1] اس خط کا عکس ندیم گیا اگست ۱۹۴۰ء میں چھپا ہے،

ایک طرف وہ یورپ کی علمی سرپرستی کے لئے سراپا سپاس تھے، دوسری طرف یورپ کی دست برد سے بہت تنفر، اسی جذبہ نے ہندوستانی سیاست کی ایک دوسری شکل اُن کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ یہ ملک ہندو مسلمانوں کا متحدہ وطن ہے لیکن اسلامی سیاسیات میں وہ پورے بین اسلامی تھے،

بین الاسلامی سیاست ترکوں سے محبت

اس وقت ساری دنیا میں صرف ترکی ہی کی وہ سلطنت تھی جس کے پیکر میں ان کو اسلام کے شان و شکوہ کا جلوہ نظر آتا تھا، اس لئے اُن کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، اُن کی جوانی تھی کہ سنہ ۱۸۷۷ء میں روس و روم کی جنگ شروع ہوئی، اس لڑائی میں سارا ہندوستان، بلکہ ساری اسلامی دنیا ترکوں کے ساتھ تھی، ہندوستان بھر میں مسلمانوں نے ترکوں کی اعانت کیلئے چندے جمع کئے، بلکہ حضرات علماء نے بھی اس میں پوری طرح حصّہ لیا اور چندے جمع کرکے ترکی بھیجے، مولانا نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس سلسلہ میں کام کیا، اور اپنے شہر کی طرف سے کئی ہزار روپے سفیر ترکی مقیم بمبئی کی معرفت قسطنطنیہ بھیجا، یہی وہ راستہ ہے جس سے ترکوں کی محبت نے اُن کے دل میں گھر کیا، اور اسی محبت میں ترکی کا سفر کیا، اور وہ عشق جو اب صرف گفتار کے ذریعہ تھا، دیدار سے دو اور دو چند بڑھ گیا، اُن کو ترکوں کے کوکبۂ جلال میں بدر و حنین کے جلوے نظر آتے تھے،

تازگی بدر و حنین از تو ہست	زیب وطراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہ انجم سپاہ	آنکہ بود شرع نبی را پناہ
قرۂ دین نبوی از تو ہست	بازوے اسلام قوی از تو ہست

اس زمانہ میں ترکوں کا نام لینا برٹش گورنمنٹ کی سیاسیات کی نگاہ میں بڑا جرم تھا، مولانا نے اس جرم کا ارتکاب کیا، اور ہرچند کہ ٹرکی کے سفرنامہ کی ترتیب میں صرف اس کا علمی و تعلیمی ہی پہلو پیش نظر رہا، سیاسیات کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا، مگر یہ خفیف جرم بھی عفو و درگذر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، ان کو سلطانی ایلچی ہونے کا ملزم ٹھہرایا گیا، اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس لگائی گئی، انتہا یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری[1] مصنف البرامکہ نے اس سفرنامہ پر ریویو لکھا تو کانپور کے کلکٹر نے ان کو بلوا کر ڈانٹا کہ تم برطانی رعایا ہو کر "سلطان روم" کی تعریف کرتے ہو، اور مولوی صاحب کو معذرت کرنی پڑی،

۱۸۹۵-۹۶ء میں جب آرمینیا کا مسئلہ اٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کرکے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا، اور ہندوستان کے اخباروں میں اس کی نقلیں چھپ رہی تھیں، تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا، انھوں نے اوائل فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا جب وہ علی گڈھ کالج کی ملازمت میں تھے،

۱۸۹۷ء میں روم و یونان کی جنگ جب پیش آئی، تو وہ علی گڈھ میں تھے، اور سرسید کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے، گو مولانا نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا، لیکن ان کو علیگڈھ کی فضا میں زبردست گھٹن ہونے لگی، اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی کشمکش کا علٰحدگی تھا،

ان کی بہت کم مجلس ترکوں کے فضائل و مناقب اور دلچسپ قصوں کے بیان سے

---

[1] یہ بزرگ وہی مولوی عبدالرزاق صاحب ہیں جو مولانا کے اسی زمانہ کے ملنے والے اور دوست ہیں، اپنے مضمون یاد ایام شائع کئے ہیں۔

خالی ہوتی تھی، اور جب وہ بیان کرنے پر آتے تھے، بلبل ہزار داستان بنجاتے تھے،

سنہ ۱۹۰۸ء میں جب انور بے وغیرہ کے زیر علم ترکی نے دستوریت کا اعلان کیا تو وہ خوشی میں آپے سے باہر تھے، ایک ایک نامور نوجوان ترک، اور انجمن اتحاد و ترقی کے ایک ایک جانباز رکن کی تعریفیں کرتے تھے، سلطان عبد الحمید خاں کی اس معاملہ فہمی کی مدح کرتے تھے کہ محمد علی شاہ قچار والی ایران کی طرح اپنے ملک کو خانہ جنگی میں نہیں برباد کردیا، بلکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ملک میں اتنا بڑا انقلاب ہونے دیا، انھوں نے اس انقلاب سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر رکھی تھیں، اس زمانہ میں شیخ عبد العزیز شاویش ترکی سے "العرب" نام ایک عربی اخبار نکالتے تھے، مخدوم کے پاس آتا تھا، اس کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے، اور جو پڑھتے تھے اپنی مجلس میں اس کو دو ہفتہ تک بیان کرتے رہتے تھے،

۲۸ راگست سنہ ۱۹۰۸ء کو ایک خط میں مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں: "ترکی کی جدید زندگی نے اس کے ہوا خواہوں کو مخمور کردیا ہے، کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آجکل کیا نشہ ہوتا ہے، سو سو دفعہ پڑھتا ہوں، اور سیری نہیں ہوتا، آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے اُن میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک گھنٹہ تک ایک عجیب کیفیت تھی۔ . . . . ایران اور ترکی کی پارلیمنٹ کا اثر نہیں، مگر تو را دے ہے، امن و شوریٰ کا سبق مسلمانوں کو اب یاد آیا، اور چونکہ گھر کی چیز تھی کسی کی تکبیر تک نہ ہوئی، خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال، دنیا کی تاریخ دکھائے گی تو اسلام ہی کے آئینہ میں دکھائے گی، خیال فرمائیے، آٹھ لاکھ آدمیوں کا دربار قسطنطنیہ میں کروفرسے رہا تھا، اور ایک تنکے کا بال بیکا نہ ہوا، سعادتؓ کی غلطی کا کفارہ عبد الحمید نے ادا کیا" (مہدی ۹۰م)

شعر حضرت پر سعادت [illegible] کی اس [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] متعلق ہوئی۔ س

یہ خط اپنے لکھنے والے کے وفورِ جوش کا مرقع ہے، بار بار پڑھئے محسوس ہوگا کہ مسرت اور خوشی کا ایک امنڈتا ہوا سمندر ہے، جو موجیں لے رہا ہے، اور یہ راز بھی یہیں سے کھلے گا کہ اُن کی سیاست کا سرچشمہ اسلام کی تعلیم ہے، یورپ کی آزادی نہیں،

اسی زمانہ میں عطیہ بیگم (بمبئی) ترکی کے سفر سے واپس آئی تھیں، اُن سے حالات سُنے، اور جب انھوں نے یہ کہا کہ "ترکی ایک یورپین طاقت کا بازیچہ ہے، اور یہ پتلیاں صرف بیرونی تاروں پر حرکت کرتی ہیں، جدید قرض نے رہا سہا ساتی کا کام انجام دیا ہے اور دیا جاتا ہے۔" تو انھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا (مہدی، ۳۰۵) انہی کو سلطان عبد الحمید خاں کی نسبت کس قدر بلیغ فقرہ لکھ کر بھیجا ہے؛ "عبد الحمید جس نے ۳۵ برس تک یورپ کی پالیٹکس کے اوراق کا تاش کھیلا ہے" (۵۹) ۲۲ نومبر ۱۹۱۱ء کو پھر انھیں لکھتے ہیں: "ترکوں نے دکھا دیا کہ

نالوں سے عندلیب کو ہم نے دبا دیا   بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر

(ہزار بلبل کو بھی کہتے ہیں) عربی اخبارات آجکل پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں" (۶۴)

پھر دفعۃً جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا، تو اُن کے دل میں بجلی سی لگی اُس زمانہ میں اُن کا، وہ درد و کرب و اضطراب، اور باتوں باتوں میں شعلہ فشانی مجھکو اچھی طرح یاد ہے، ہر ہفتہ جب مصر کے عربی اخبارات آتے تھے تو ماسوا سے بےخبر ہو جاتے تھے، اور ترک بہادروں کی جانبازی اور شجاعت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتے، انور بے، عزیز بے مصری اور دوسرے نوجوان ترک افسر جو اٹلی کی ناکہ بندیوں کے باوجود اپنی جان کو ہتھیلیوں پر رکھ کر چھپ چھپ کے طرابلس پہنچ رہے تھے، اُن کی اس جوانمردی کے قصوں کے دہراتے میں اس بڑھاپے میں بھی اُن

میں جوانی کی اکڑ پیدا ہو جاتی تھی،

طرابلس کی اس لڑائی کے زمانہ میں ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی، ہندوستان کا بر اعظم اس زمانہ میں اسلامی جوش و خروش کا طوفان خیز سمندر بن گیا تھا یاد ہوگا کہ ترکی نے اٹلی سے اس بات پر صلح کر لی تھی کہ ترک طرابلس کو خود مختار بنا دیں گے، اور وہ جس طرح چاہے اٹلی سے نبٹ لے چنانچہ باب عالی نے اس کے مطابق طرابلس کو خود مختاری بخش دی تھی، اور شیخ سنوسی وغیرہ نے اس کی آزادی کا جھنڈا اٹھایا تھا، اسی زمانہ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ یاد ہے، رات کو تقریباً آٹھ نو بجے بے وقت مولانا کا رقعہ آیا جس میں مجھے اور اونچے درجہ کے دو تین طالب علموں کو یاد فرمایا تھا، ہم سمجھے کوئی ضروری بات پیش آئی ہوگی جو اس وقت طلب فرمایا گیا، ہم لوگ بہ تمام عجلت پہنچے تو دیکھا کہ خود چٹائی پر لیٹے ہیں، سامنے لیمپ ہے، اور چاروں طرف عربی اخبار پھیلے ہیں، ارشاد ہوا، تم نے سنا، بڑا مزہ ہوا، عربی اخبار آئے ہیں، ان میں انور بے وغیرہ کا اعلان ہے کہ وہ ترکی کی ملازمت سے استعفا دے کر طرابلس میں اپنی نئی حکومت بنائیں گے اور آخیر وقت تک اٹلی کا مقابلہ کریں گے، اس خبر سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بے اختیار ناچنے کو جی چاہتا تھا مگر اکیلے ناچتے نہیں بنتا تھا، اس لئے تم لوگوں کو بلوایا ہے۔ یہ کہہ کر صندوقچے سے روپے نکالے اور اسی وقت بازار سے مٹھائی منگائی، خوشی و مسرت کا یہ جلسہ دیر تک قائم رہا، حالانکہ مولانا عموماً نو بجے سو جانے کے ہمیشہ سے عادی تھے،

ؔ دنیا کے انقلاب کا حیرت انگیز منظر ہے، اس وقت جو جنوری ۱۹۴۳ء کو اٹلی کی یہ سلطنت طرابلس ختم ہو گئی اور انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور اسی کے ساتھ اٹلی کی افریقہ کی فتوحات ہی کی زمین کا ایک ایک چپہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا، اور انگریزوں کے زیر علم آگیا، تلک الایام نداولها بین الناس،

ابھی طرابلس الغرب کی یہ مصیبت ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا، اسلامی جذبات کا وہ سمندر جو ابھی ٹھہرنے بھی نہیں پایا تھا پھر جوش میں آیا اور مسلمانوں کے دلوں میں علانیہ آزادی اور حریت کی تحریک لہریں لینے لگی، اس زمانہ میں اس تحریک کی رہنمائی جن لوگوں نے کی ان میں ایک نام ہمارے ہیرو کا بھی ہے، مشہور "شہر آشوب اسلام" کے نام سے غم و حسرت سے بھری ایک ایسی نظم لکھی جس نے اس حادثہ پر مسلمانوں کے دامن کو آنسوؤں سے تر کر دیا اور آج بھی جو کوئی اس کو سنے گا، اس کی آنکھوں سے اشکِ غم کے چند قطرے بے اختیار نکل آئیں گے۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک ۔۔۔ چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے ۔۔۔ فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے ۔۔۔ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے ۔۔۔ اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے ۔۔۔ یہ سیر اُن کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے ۔۔۔ یہ راگ اُن کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو ۔۔۔ یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تا کے ۔۔۔ یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ۔۔۔ ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی ۔۔۔ تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو — دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے — سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا — ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں — ہمارے ذرۂ آہ خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں — مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے — عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں — نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے — تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی — چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

یہ نظم شاعرانہ معنوں میں بسر اسر الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کی متعدد پیشین گوئیاں حرف حرف پوری ہوئی ہیں،

یہ نظم مولانا نے لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں جو ترکی کی فراہمی چندہ کے لئے ہوا تھا پڑھی تھی تو

مکاتیب جلد دوم بنام مولوی ظفر علی خاں،

بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہے۔ خواجہ کمال الدین صاحب (لاہور) اُس زمانہ میں اشاعتِ اسلام کی غرض سے لندن (بشپ گیٹ نمبر ۲۰) میں مقیم تھے، اس نظم نے ہزاروں میل دور سے اُن کے دل پر جو اثر کیا، اس کا ذکر اُن کے اس خط میں ہے، جو انھوں نے لندن سے مولانا کے نام لکھا تھا:۔ کرمی مولانا! السلام علیکم

اگرچہ ہزار کوس دور بیٹھے ہوئے کسی بات نے مجھے بچوں کی طرح رلایا تو آپ کے طبع زاد جدید کے اس مصرع

ع چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک" کی حقیقت اور صداقت ہے، اور کیسا یاس انگیز منظر سامنے آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرے . . . .

مسلمانوں نے بار بار حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساس کا لحاظ کرے، اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے، مگر اُس کا جواب ہمیشہ یاس انگیز ملا، اس پر شاعر نے جل کر یہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے توڑے،

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا | مگر اس کا اثر جو کچھ ہے وہ ہندوستان تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیر ہے ملت | عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ میں ٹرکی کا ہمدرد ہوں" | یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے
ہمارا جوشِ اسلامی انھیں باور نہیں آتا | یہ اندازِ تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک ہے
پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرائے یثرب میں | کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں تا آسماں تک ہے
کوئی جا کر یہ کہہ دے ہم گنہگاروں کی جانب سے | کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

اسی زمانہ میں جب تمام ہندوستان میں وزرائے برطانیہ کے اس طرزِ سیاست کے

خلافت جوش و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی بمبئی میں ایک گمنام وفادار اسلامی انجمن بمبئی کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اس کی تجویزیں شائع ہوئی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی،

ایک دن تھا کہ وفاداریٔ مسلم کی متاع ۔۔۔ ہر جگہ عام تھی، اور نرخ میں ارزانی بھی

دفعۃً ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم ۔۔۔ قوم کو سخت مصیبت تھی، پریشانی بھی

ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا ۔۔۔ ڈھونڈنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی

ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن! ۔۔۔ کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی

تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا ۔۔۔ جس کا شائق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی

یہ الگ بات ہے ڈھونڈھوں کو وہ آئے نہ نظر ۔۔۔ گو اسی زمرہ میں ہے "یوسف[1] قربانی" بھی

اُسی زمانہ میں ہز ہائینس سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ وہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غم و غصہ پیدا ہوا، کیونکہ اس سے اُن کے عالمگیر سیاسی وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا، مولانا نے آغا خاں کو اپنی دو نظموں میں طنزیہ جواب دیا، جو کلیات میں موجود ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں اس لڑائی میں ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں ترکی کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا تھا، اس کے ممبر شعیب قریشی (موجودہ وزیر ریاست بھوپال) چودھری خلیق الزماں وکیل لکھنؤ، عبد الرحمان صاحب صدیقی (موجودہ ممبر اسمبلی بنگال)؛

---

[1] سیٹھ یوسف قربانی مرحوم عمر قربانی کے والد بمبئی کے مشہور تاجر تھے اور تعلیم کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتے تھے وہی اس جماعت کے سرگروہ تھے۔

عبدالعزیز انصاری وغیرہ تھے، یہ سب اُس زمانہ میں علی گڈھ کالج میں زیر تعلیم تھے، مگر جوش کا یہ عالم
تھا کہ تعلیم چھوڑ کر زخمی مسلمانوں کی مرہم پٹی کیلئے چل کھڑے ہوئے، ڈاکٹر سید عبدالرحمان صاحب مرحوم
ڈنگل تھیسر بھوپال جو اُس وقت انگلینڈ میں اپنی طبی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے وہیں سے سیدھے
چل کر قسطنطنیہ پہنچے، ڈاکٹر نعیم انصاری بھی وفد کے ہمراہ تھے، اور وہ بھی انگلینڈ ہی سے آکر ملے تھے،
اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کئے، اور تاریخ
میں یہ ترک بھائیوں کی خدمت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا پہلا کارنامہ تھا، ڈاکٹر
انصاری مرحوم جو برسوں لندن کے شفاخانوں میں کام کر چکے تھے، اس وقت ہندوستان میں موجود
تھے، موصوف کا وطن غازی پور میں یوسف پور کا قصبہ ہے جو اعظم گڈھ سے جو مولانا کا وطن تھا نہایت
قریب ہے، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے بڑے بھائی حکیم عبدالوہاب مشہور حکیم نابینا صاحب مولانا
کے ہم درس تھے، انھوں نے بھی اعظم گڈھ میں مولانا فاروق صاحب سے پڑھا تھا، مولانا اور ڈاکٹر صاحب
کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا، ڈاکٹر صاحب اُس وقت بالکل جوان تھے، اور مولانا بوڑھے، اس پر بھی
یہ منظر آنکھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہو کر روانگی کے لئے دلی جا رہے ہیں، لکھنؤ کے
اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں، گاڑی روانہ ہونے کو ہے، مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے
ہیں، ڈاکٹر صاحب ڈبہ کے دروازے پر کھڑے دور ہی سے سلام کر رہے ہیں، کہ دفعتہً اس ہمہ تن [illegible] کی
علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جباروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، دفعتہً ڈاکٹر انصاری
کے بوٹ پر جھک گیا، آنسوؤں نے اس کے گرد و غبار کو دھویا، اور لبوں نے اس کے بوسے لئے،
گاڑی اسلامی غیرت و حمیت کے ان [illegible] کو لے کر آگے بڑھ گئی،

چند مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا طبی وفد لے کر ہندوستان واپس آئے ہیں تو مولانا اتفاق سے بمبئی میں تھے جب وہ جہاز سے اترے تو مولانا نے اُن کے پاؤں بار بار چومنے چاہے، ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی تو فرمایا کہ یہ تمھارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسمۂ اخوت کے پاؤں ہیں؟ اُن کے یہی جذبات موزون نالہ کی صورت بن کر بمبئی کے اُس جلسہ میں ظاہر ہوئے جو اس وفدِ طبی کے استقبال و خیر مقدم کے لئے بمبئی میں ہوا تھا بڑی پُر درد نظم ہے۔

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری ۔۔۔ کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی ۔۔۔ یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غمخواری
فراقِ ملک و ترکِ خانماں و دوریِ منزل ۔۔۔ خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری
تمھارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے ۔۔۔ صدائے نالہ ہائے درد و جوشِ گریہ و زاری
نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں باری ۔۔۔ فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی نشتر باری
مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں ۔۔۔ کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں باایں گرانباری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی ۔۔۔ کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری
کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی ۔۔۔ مریضوں کے لئے وہ آپ کی شب ہائے بیداری
جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمھیں دعوائے آقائی ۔۔۔ کہ تم نے کی ہے زخمیانِ مجاہد کی پرستاری
تمھارا ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہو ۔۔۔ کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری
تمھارے سامنے موتی کی لڑیاں پست سے کم ہیں ۔۔۔ کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی شہیدوں کی گہرباری
تمھیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے ۔۔۔ کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری

نہیں ہے سوزِ اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

مسلمانوں کے تم نے طالعِ واژوں بھی دیکھے ہیں
تم نے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سینے میں ناوکہائے جاں گزا تم نے
زنانِ بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امیدِ گلیڈسٹن بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ تم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں

تمنا آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کو کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ نیرِ غرق ہو کر پھر نکل آئے
کہ تم نے انقلابِ چرخِ گرداں بھی دیکھے ہیں

دعائے کمتر مسلماں ہو اگر مقبولِ یزدانی
تو اب دستِ دعا ہو اور یہ شبلی نعمانی

ایک فتویٰ اسی قربانی کے زمانہ میں بقرعید کا زمانہ آگیا تھا مولانا کو خیال ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس سال قربانی کے روپے ٹرکی کے فنڈ میں داخل کردیں تو اچھا ہے کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کے

ہاتھوں میں چلا جائے گا جو اس وقت یعنی حقیقی قربانی کر رہے ہیں، فقہ کی رو سے انھوں نے اس پر غور
کیا تو ان کو کوئی مانع نظر نہیں آیا، مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی بھی یہیں تھے، اُن سے رجوع کیا، مولانا
عبدالباری صاحب فرنگی محلی کو لکھا، اور اس باب میں جو فتویٰ مرتب کیا تھا وہ دکھایا تو سب نے تائید کی
ادھر سے تسلی ہوگئی تو اس تحریک کو اخباروں میں پیش کیا، اور وہ چل پڑی، اس طرح ہزاروں روپے
اس فنڈ میں جمع ہوگئے، بعض علما نے اُن کے اس فتویٰ سے اختلاف بھی کیا، چنانچہ مولوی ظفر علی خاں
نے مولانا کو اپنا شبہہ لکھ بھیجا، تو ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو اس کے جواب میں لکھا: "عزیزی مولوی ظفر علی خان صاحب
السلام علیکم! میں نے جو فتویٰ لکھا، اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں، اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط
بھی شائع ہوچکا ہے، ہدایہ میں اس کا جزئیہ موجود ہے، البتہ ہدایہ میں صرف جواز ہے، اور میں نے افضلیت کا فتویٰ
دیا ہے، اس قدر میرا اجتہاد ہے،

بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرض ہے، اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں
کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے، فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے
پر عمل ہوا، اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسمٰعیل پر مقصود تھی، کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے؟

پھر ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو عام اخباروں میں اپنا یہ خط چھپوایا،

---

[1] مولانا نے اپنی تائید میں ہدایہ کی یہ عبارت پیش کی تھی، والتضحیۃ فیہا افضل من التصدق بثمن الاضحیۃ
یعنی عید اضحیٰ کی قربانی کے دنوں میں قربانی کی قیمت کے صدقہ کرنے سے قربانی کرنا بہتر ہے، (ہدایہ کتاب الاضحیۃ)
اس عبارت کا مقصود یہ ہے کہ اگر قربانی کے جانور کی قیمت نقد خیرات کردی جائے تو گو اس صدقہ کا بھی
ثواب ہوگا، مگر قربانی کی سنت کے ثواب سے محروم رہے گا جیسا کہ اس کے آگے کی عبارت میں تفصیل ہے،
"لانہا تقع واجبۃ او سنۃ والتصدق تطوع محض فتفضل علیہ، " س "

جناب من: بعض صاحبوں کو خیال ہے کہ ترکوں کی ہمدردی میں اگر قربانی کے بجائے قیمت دی گئی

تو اس سے احتمال ہوگا کہ قربانی خود غیر ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں شریعت میں فرائض کے درجات میں بھی ترتیب ہے اور وقتی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا

ہے، غزوۂ خندق میں جہاد میں مصروف ہونے کی وجہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نماز قضا ہوئی، تو کیا یہ حجت

ہو سکتی ہے کہ نماز کا قضا کرنا جائز ہے؟

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اس لئے اس خاص موقع اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض

مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لئے کیا حجت ہو سکتی ہے؟

قربانی شعار اسلام ہے مسلمان اس کو نہیں چھوڑ سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس

کے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی پروا کر سکتے ہیں۔

امید کہ میرا خط اور صاحبانِ اخبار بھی اپنے پرچوں میں نقل کریں۔"

ترک اس جنگ میں اڈریانوپل (ادرنہ) تک پیچھے ہٹ آئے تھے، اور اڈریانوپل بھی ہاتھ

سے جا چکا تھا، مگر آخر آخر ایسی صورت ہوئی کہ انھوں نے اس شہر کو جو یورپ میں ان کا پہلا پایۂ تخت

تھا دوبارہ لے لیا، مسلمانوں کو اس فتح سے بڑی خوشی ہوئی۔ شاعر نے ۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کو اس پر مبارکباد

کے یہ چند شعر کہے۔

اے ترک اے مجسمۂ کبریائے حق	اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملتِ ختم الامم ہے تو	تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہو تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود	مغرب ترا ہی عرصہ گہِ ترک تاز ہے

تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جاں ستاں | اب بھی تمام ہستیٔ دشمن کا راز ہے
بجلی جو ہے مرقعِ عالم کا برق | شمشیر تیری خانۂ رنگیں طراز ہے

طرابلس اور بلقان کے ساتھ ساتھ سیاسیاتِ اسلامی کا تیسرا اہم حادثہ خود ہندوستان میں مسجد کانپور کی صورت میں پیش آیا،

مسجد کانپور کا ہنگامہ
اگست ۱۹۱۳ء
رمضان ۱۳۳۱ھ

بلقان کا شورِ محشر ابھی برپا ہی تھا کہ مسجد کانپور کا ایک نیا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و قومی جوش و خروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونیں منظر ہے، یہ عین اس وقت رونما ہوا جب جنگِ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور بھڑک رہی تھی[1] اور مسلمانوں کے دل برطانی وزارتِ خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے، دلوں کا یہ بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور اُن کے ماتحت حکام کانپور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہنچا دیا، کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی، وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا، اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اُس کو منہدم کر دیا گیا، حالانکہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں اک آگ سی لگا دی، ۳ / اگست ۱۹۱۳ء کو جب رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی مسلمانانِ کانپور نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسۂ الٰہیات کانپور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا، جلسہ

[1] ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء کو ترکوں نے اڈریانوپل لے لیا تھا، اس کے بعد گو لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر صلح ابھی تک نہیں ہوئی تھی، صلح کی کانفرنس ستمبر ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی تھی۔ (س)

کے بعد پُرجوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے مسجد کا رُخ کیا، اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چُن چُن کر رکھنے لگے، مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کانپور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا، فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے اُن پر نہایت بے رحمی سے دور سے گولیاں برسائیں، اور قریب سے برچھے مارے، شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے ننھے بچے بھی شامل تھے، شہیدان کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہوا، سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا، اس خونی سانحہ نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا، آتش بیان مقرروں، شعلہ افشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی، یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جد وجہد اور آزادی پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے۔ مولانا مرحوم پر اس واقعہ نے بے حد اثر کیا، اور یہ اثرات نالہائے موزوں بنکر اُن کی زبان و قلم سے ابھرے، اور اُن کی ان نظموں نے حقیقت یہ ہے کہ ملک کے سیاسی انقلاب میں مسلم قوم سے بہت بڑا حصہ لیا، اس واقعہ کے کئی برس کے بعد تک یہ نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اور اب بھی ہیں،

اس واقعہ کے وقت مولانا بمبئی میں تھے، اور راقم الحروف کلکتہ میں الہلال کے ادارہ میں شامل تھا، اس واقعہ کو واقعہ بنانے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمانانِ کانپور کی پُرجوش حمایت میں کھڑا کر دینے، اور مقتول شہیدوں کے عزیزوں کی دلدہی و دستگیری، زخمیوں کی غمخواری و تیمارداری اور قیدیوں کی قانونی چارہ جوئی کا غیر محدود جذبہ جس کی زبان و قلم کا سب سے زیادہ مرہون ہے، وہ مولانا ابوالکلام کی ذات ہے، اس زمانہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر مظہر الحق[1] بیرسٹر پٹنہ کو کانپور بھیجا، اور

[1] شیخ زادہ، وقتی میں تھے، چھپرا (بہار) کا ایک گاؤں فرید پور ان کا وطن تھا، انٹرنس کے بعد انگلستان گئے اور

اُن کے ساتھ ہر صوبہ کے ممتاز وکیلوں اور بیرسٹروں کا کانپور پہنچ جانا، ان ہی کی تحریک کا فیض تھا،
مقامی حیثیت سے سید فضل الرحمان صاحب مرحوم وکیل کانپور کی محنتیں بھی بھولنے کے قابل نہیں۔
اسی واقعہ نے مولانا عبدالباری اور آزاد سبحانی کو سب سے پہلے ملک میں روشناس کیا، ملک کے سارے
طول و عرض میں ان مظلوموں کی حمایت کے لئے مسلمانوں نے بے خطر جلسے کئے، آتشین تقریریں
کیں، آزادی کا پیام سنایا، اور مظلوموں کی امداد و مقدمہ کے مصارف کے لئے تھوڑی سی کوشش میں
انھوں نے ایک لاکھ کی رقم ایسی حالت میں جمع کر دی جبکہ ابھی مسلم یونیورسٹی کے لئے تیس لاکھ اور
بلقان و طرابلس میں ترکی کی امداد کے لئے ہزاروں روپیہ وہ دے چکے تھے اور دے رہے تھے،

غرض ہندوستان میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ واقعہ متعدد حیثیتوں سے
ذکر کے قابل ہے، مولانا نے اس واقعہ پر جو پُرجوش نظمیں کہیں، وہ اس قدر پُر اثر تھیں کہ جس ہفتہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۲) بیرسٹر ہوئے، یہ اور گاندھی جی ایک ساتھ ایک جہاز میں بیرسٹر ہو کر ہندوستان واپس آئے تھے، پٹنہ
میں پریکٹس کرتے تھے، کانگریس کے حامی تھے، اور مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوا کئے تھے، نہایت پرجوش اور بیباک لیڈر تھے، کونسل اور اسمبلی کے ممبر
دیکھا تو وقف ہوگئے، جلسوں میں تقریریں کرنا اور شورش انگیزی ان کا وظیفہ تھا، کانگریس کے اجلاس میں بھی حصہ لیتے تھے، ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک میں
شامل تھے، ترک موالات کے سلسلہ میں پریکٹس چھوڑ دی تھی، پٹنہ میں صداقت آشرم کے نام سے ایک سیاسی خانقاہ
بنا کر اس میں گوشہ نشین فقیر بن کر بیٹھ گئے، یا تو زندگی سر تا سر انگریزی تھی اور یا یہ حال تھا کہ ایسی بدلی کہ گلاس میں پانی تک
نہ پیتے تھے کہ یہ انگریزی چیز ہے، مٹی کے کوزے میں پانی پیتے تھے، تہبند باندھتے اور انگرکھا پہننے لگے تھے،
سپید داڑھی سینے تک لمبی ہو گئی تھی، زمین پر بیٹھتے تھے، اور اسی پر سوتے تھے، اور اسی سلسلہ میں روحانیات
یعنی اسپریچولزم کا شوق پیدا ہو گیا تھا، مباند گورا رنگ، بلند آواز، اسی فقیری اور گوشہ گیری کی حالت میں
جنوری ۱۹۳۰ء میں وفات پائی، ستر برس کے قریب عمر ہوئی ہوگی،

الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک اسلامی جوش و خروش کے رجز کا کام دیتی تھیں، اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی نظم لکھی اس میں اب بھی جوش و خروش کا وہی طوفان ہے،

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے — دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر — بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر — نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب — ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ — مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار — از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جگر — لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا — جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا — ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں!

انھیں اس کا غم تھا کہ وہ اس وقت بمبئی میں کیوں تھے؟

مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے — خدا کا آپ نے شکر و فرمایا عنایت ہے
عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہرہ سے یہ صدا آئے — "مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہے"
پہنائی جا رہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں — یہ زیور سید سجاد و عالی کی وراثت ہے
ابھی دس بیس گر ہیں کشتگان خنجر اندازی — تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے | عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جائیں دیں | یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں | کہ شبلیؔ بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

ان کے دلی تاثر کا اندازہ ان دو قطعوں سے کیجئے۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی | اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں | کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم | کیوں گھٹ رہی ہے آج مذلت میں خود ہی
سن لو وہ گنج ہائے گرانمایہ دفن ہیں | کچھ بلقاں کی خاک میں کچھ کانپور میں

مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کانپور کو سزا دی جائے، مسجد اپنی جگہ پر پھر بنوا دی جائے، قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے، اور مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے، مگر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر یوپی اڑے تھے کہ مسٹر ٹیلر جو فیصلہ کر چکے اس میں ترمیم نہیں ہو سکتی،

ابھی دو برس پہلے دہلی کی تاجپوشی کے موقع پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا تماشا ہو چکا تھا کہ لارڈ کرزن کی تقدیر مبرم کو خود شہنشاہ برطانیہ نے آکر بدل دیا تھا جس کے متعلق وائسرائے اور وزرائے برطانیہ بار بار کہہ چکے تھے کہ "یہ طے شدہ اور ناقابلِ تغییر مسئلہ ہے" مولانا نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرکے تعریض و تلمیح کے رنگ میں یہ دو فارسی قطعے ارشاد فرمائے۔

حضرت لاٹ بفرمود کہ فرمانفرما | "نیست ممکن کہ دگرگوں شود از گفتۂ خود"
صدر اعظم بسوئے قسمت بنگالہ [illegible] | گفتہ کردہ بفرمود کہ "من کردم و شد"

مولانا نے فرمایا کہ اس اصول کی استواری کا حال تقسیمِ بنگالہ کے مسئلہ میں معلوم ہو چکا، اب جب وہ بنگالیوں کے ایجیٹیشن سے بدل چکا، تو اب مسلمان بھی اس فیصلہ کو بدلوائے بغیر دم نہیں لیں گے، "گربہ کشتن روزِ اوّل باید"

جنابِ لاٹ از فرمودۂ خود بر نمی گردد | کہ تمکینِ حکومت را سیاست بیشتر باید
وے در قسمتِ بنگالہ ایں اندیشہ بایست | کہ "گربہ کشتن اوّل روز می باید اگر باید"

سرسید علی امام مرحوم اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل میں ممبر تھے، انھوں نے مولانا محمد علی مرحوم کو اور اُن کے ذریعہ سے مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم کو مصالحت کا پیام دیا، اور صلح کی گفت و شنید کا آغاز ہوا، اور بات یوں شروع ہوئی کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائیگا، ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا اور مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی لیکن مسجد کا جو حصہ توڑ دیا گیا ہے وہ اب اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور مسلمان اس کو دوبارہ بنوانے پر اصرار نہ کریں، یہ سُنکر مولانا نے یہ قطعہ لکھ کر چھپوایا،

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح | یہ اگر سچ ہے تو جز خوبیِ تقدیر نہیں
لیکن انعامِ گرانقدر و وظائف کی طرح | یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے | دیتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
داد خواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا | ورنہ اُن کو گلۂ سختیِ تعزیر نہیں
ہم سے خود ذوقِ اسیری نے یہ کہلا بھیجا | کہ خمِ طرۂ محبوب ہے، زنجیر نہیں
جزوِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر | آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی | یہ بجا، مسئلۂ فقہ کی تعبیر نہیں

آپ اس بحث کی تحقیق فرمائیں کہ آپ
حاملِ فتنہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں

بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زباں
یہ بھی کچھ مانعِ آزادیِ تحریر نہیں

اور بھی برہمیِ طبع کا ساماں ہے یہ
فتنۂ عام کے دبنے کی یہ تدبیر نہیں

فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیمِ قلوب
تیر ترکش میں نہیں، ہاتھ میں شمشیر نہیں

اور ہی کچھ ہے گرفتاریِ دل کی تدبیر
سختیِ طوقِ گراں باریِ زنجیر نہیں

جبر سے ہو بھی عوام کا رکنا ہو محال
یعنی اس خوابِ پریشاں کی یہ تعبیر نہیں

داد خواہوں سے حضور نے جو ارشاد کیا
کہ یہ حکمِ ازلی قابلِ تغییر نہیں

حسنِ ظن کے جو گرفتار تھے یہ بول اٹھے
اس مرقع میں بھی اسلام کی تصویر نہیں

ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک
پھر نہ کہئے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں

بالآخر مصالحت کی تدبیر کامیاب ہوئی، لارڈ ہارڈنگ ویسرائے خود کانپور آئے اور سر علی امام نے حکومت کی طرف سے، اور مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی نے مسلمانوں کی نیابت کر کے معاملہ کو اس طرح طے فرمایا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، مقدمے واپس لے لئے جائیں، اور مسجد جو حصہ پر تھی اس کے ٹوٹے ہوئے حصہ کو اس طرح بنایا جائے کہ اوپر چھت دے کر وضو خانہ پھر قائم کر دیا جائے، اور چھت کے نیچے سے سڑک کی آمد و رفت کا راستہ رہے، اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا، اور ویسرائے نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا، اس اعلان پر مسلمانوں کے احرار اور وفادار دونوں طبقوں نے شکر گذاری کا اظہار کیا، مولانا نے ویسرائے کو خطاب کر کے حسبِ ذیل قطعہ میں اپنی شکر گذاری کا فرض ادا کیا،

اے ہمایوں گہر و افسر اورنگ شہی — وہ کیا تو نے جو آئین جہانبانی ہے

تو نے ظاہر یہ رعایا کو جو کھائی تھی شکست — یہ حقیقت میں ظفرمندی سلطانی ہے

تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ انبوہ و جوش — گرچہ زائد نہ سہی فطرت انسانی ہے

تیرے لطف و کرم عام نے دیدی یہ سند — کوئی مجرم ہے نہ قیدی ہے نہ زندانی ہے

تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا — بازوؤں میں یہ ترے زور جہاں باقی ہے

بات رکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی — گرچہ لازم نہیں اظہار پشیمانی ہے

گرچہ مدح امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی — شکر احسان مگر فطرت انسانی ہے

تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراق سیاہ — اُن میں یہ پیشکش شبلی نعمانی ہے

اور مولانا ابوالکلام کو جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے سب سے مقبول رہنما اور اس تحریک کی جان تھے لکھا:- "برادرم! کانپور کا معاملہ جس طرح ہوا فیصل ہوگیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔" (ابوالکلام۔ ۳۰)

چنانچہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا، مظہر الحق صاحب کے پاس جو ہزاروں روپے جمع ہوگئے تھے، اس سے برسوں تک پہلے کانپور کے مظلوموں اور بیواؤں کی امدادیں ہوتی رہیں، پھر وہ سلسلہ بند ہو گیا۔

سیاسیات ہند ملکی معاملات میں وہ ہمیشہ سے آزاد تھے، اور آزاد رہے، حالانکہ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جس نے اُس زمانہ کے دستور کے مطابق حکومت وقت سے وفاداری اور حکام شہر کی تابعداری میں نیک نامی حاصل کی تھی، اُن کے والد ماجد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے اپنی ساری عمر حکام ضلع کی خوشنودی کی دولت جمع کرنے میں صرف کی تھی، وہ گھر کے

سے نکل کر علی گڈھ گئے تو وہاں کی فضا بھی یہی تھی، وہاں کے آنے جانے والے بھی وہی تھے، بلکہ آپ موضوع نے وہاں قومی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس سے انکار ارتداد سے کم نہ تھا، اس لئے ان مواقع کے ساتھ مولانا کی سیاسی آزادی اُن کی فطری صلاحیت کے سوا کسی اور سبب کی ممنون نہیں ہو سکتی،

مولانا اپنے ایک خط میں جو معارف میں چھپ چکا ہے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں: "مذہب میں ہمیشہ آزاد رہا، سرسید کے ساتھ ۱۰ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا، اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔ (معارف نومبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۹۳)

خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو سرسید اور مولانا شبلی کے زمانہ کے علی گڈھ کالج میں پڑھے ہوئے تھے اور دونوں سے اچھی طرح واقف تھے، مولانا کے سانحۂ وفات پر اپنے "عصر جدید" (مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۴ء میں) لکھتے ہیں:- "سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے، لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنسرویٹو واقع ہوئے تھے، اس لئے کالج کی پروفیسری کے زمانہ ہی سے مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے سخت کراہت تھی:

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل راوی ہیں کہ سرسید نے لکھنؤ میں کانگریس کے خلاف جو مشہور تقریر کی تھی مولانا نے اپنا نام چھپا کر علی گڈھ گزٹ میں اُس کا جواب لکھا تھا،

۱۸۹۰ء میں یونین کے ایک جلسہ میں شخصی اور جمہوری حکومت پر جو مباحثہ ہوا تھا، اور مولانا نے جمہوریت کی تائید پر جو تقریر کی تھی اور سرسید نے اس کے جواب میں اپنے گزٹ میں جو مضمون لکھا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے،

بایں ہمہ مولانا کی سیاست ابھی تک مجلسی بحث سے آگے نہیں بڑھی تھی، وہ اپنی مجلس میں بیٹھ کر
کانگریس کے مطالبوں پر رجز خوانی، اور مسلمانوں کی سیاسی گمرہی کا ماتم کیا کرتے تھے اور بس، اُردو
اخباروں میں "ہندوستانی" لکھنؤ کو جسے لکھنؤ کے کانگریسی لیڈر گنگا پرشاد ورما نکالتے تھے، بہت شوق
سے پڑھتے تھے، اور اُس سے اثر لیتے تھے، لیکن دسمبر ۱۹۱۱ء میں "تقسیم بنگال" کی تنسیخ نے دونوں کی
مرکو توڑ دیا، نواب وقار الملک کے مضمون کے بعد جو دوسرا پہلا مضمون اس انقلاب کی بشارت لے کر
نکلا وہ مولانا شبلی ہی کا تھا، جس کی سُرخی "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" ہے، مسلمانوں میں مستقل سیاسی
انقلاب برپا کرنے کے لئے آزاد اخبارات کا وجود بہت ضروری تھا، اس وقت لاہور سے زمیندار
دلی سے ہمدرد، اور کلکتہ سے الہلال جیسے آزاد اخبارات نکل رہے تھے، اور یوپی جو اصل میں مسلمانوں
کا تمدنی و سیاسی مرکز تھا، اس قسم کے اخباروں کے وجود سے خالی تھا، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنا چاہا

مسلم گزٹ ۱۹۱۲ء اس زمانہ میں لکھنؤ میں ایک عالی ہمت نوجوان سید میر جان صاحب تھے
انھوں نے اُن دنوں لکھنؤ کی سرگرمیوں میں بہت اچھا خاصہ حصہ لیا تھا، ایک ریڈنگ روم
قائم کیا تھا، مولانا نے اُن دنوں امین آباد پارک کی شمالی قطار میں ایک بالاخانہ کرایہ پر لیا تھا، آپ
میں رہتے تھے، اسی کے پاس یہ ریڈنگ روم تھا، سید میر جان صاحب اکثر مولانا کی خدمت میں
آیا جایا کرتے تھے، مولانا نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ ایک آزاد مسلمان اخبار جاری کریں، جس سے
تبادلہ میں اخبارات آئیں گے بھی، اور صحیح خیالات کی ترویج بھی ہوگی، انھوں نے اس شرط پر
آمادگی ظاہر کی کہ اس کے مضامین کی نگرانی مولانا اپنے ذمہ لیں، انھوں نے اس کو قبول کیا، اور
اسی طرح مسلم گزٹ کے نام سے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے اخبار نکلا،

اخبار کی اڈیٹری کے لئے مولانا نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم کو پسند کیا، جو اس سے پہلے
علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور معارف (علی گڈھ) کے اڈیٹر تھے، اُن کا کمال یہ تھا کہ وہ پورا اخبار تنہا
تیار کر لیتے تھے، بڑے لکھنے والے تھے، اور جو لکھتے تھے وہ ٹھوس لکھتے تھے، اس میں نری لفاظی اور بھرتی
نہیں ہوتی تھی، لیکن دقت یہ تھی کہ علی گڈھ کے زمانہ میں اُن کے اور مولانا کے درمیان بعض معاملات
میں اختلافات پیدا ہو گیا تھا جس کی بنا پر مولوی وحید الدین صاحب سلیم کا دل مولانا کی طرف سے
صاف نہ تھا، الفاروق نکلی تو سنہ ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی نے اس پر ریویو لکھا، اور اس کو مولوی
وحید الدین صاحب کے رسالہ معارف علی گڈھ میں چھپوانا چاہا تو مولانا نے شروانی صاحب کو لکھا:
بہتر ہے معارف میں بھیج دیجئے مگر پہلے اُن سے پوچھ لیجئے کہ چھاپیں گے یا نہیں، اڈیٹر صاحب مجھ سے خفا
ہیں: (شروانی - ۵) مگر بہرحال وہ ریویو اس میں چھپا، اس کے دو ہی برس کے بعد سنہ ۱۹۰۱ء میں
جب حیات جاوید نکلی تو اُس اختلاف کی بنا پر جو مولانا کو سرسید کے بعض خیالات یا پالیسی
سے تھا اور جن کا ذکر حیات جاوید میں نہیں یا بہت ہلکا ہے، مولانا نے اس کتاب کو مدلل مداحی
یا کتاب المناقب کہا، جس سے مولانا حالی کی تنقیص مقصود نہ تھی، بلکہ یہ مقصود تھا کہ اس کتاب
میں صاحب سوانح کی زندگی کے دونوں رُخ نہیں، مولانا حالی کو اس کمی کا احساس خود بھی تھا،
چنانچہ انھوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرز عمل کی توجیہ کی ہے،

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "میں نے جو ریویو حیات جاوید پر لکھا تھا اس میں یہ پہلو بسط سے دکھایا
تھا، مولانا نے اس کو پڑھ کر لکھا کہ اگر اور ریویو بھی ایسے لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے"

بہرحال مولانا کی اس تنقید سے مولانا حالی کے بعض خاص عقیدتمندوں کو بڑی تکلیف پہنچی،

اور اس وقت سے ان صاحبوں کے قلم سے جب کوئی ایسا مضمون نکلا جس میں مولانا شبلی کا ذکر کسی طرح آسکتا ہو تو اس کو قصداً لایا گیا، اور اُن پر چند نا ملائم حرف کہنا صداقت کا منشا سمجھا گیا، حالانکہ سچ یہ ہے خود ان دونوں بزرگوں کے دل باہم صاف تھے، اور دونوں ایک دوسرے کے پورے جوہر شناس تھے،

غرض یہ کہ اس اختلاف کے باوجود مولانا نے اُن کو اڈیٹری کے لئے منتخب کیا، اور وہ خود کسی تقریب سے علی گڈھ گئے تو مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے اور اُن سے مولانا حمید الدین صاحب کے قیام گاہ پر ملاقات ہوئی، اور طرفین کے گلہ و شکایت کے بعد جس میں سرسید کی الف لکھنے کے پرانے واقعہ سے حیات جاوید تک کے معاملات پر گفتگو ہوئی، اور آخر کار پرانی شکایتوں کی بساط لپیٹی گئی، اور باہم لطف و محبت کا نیا عہد نامہ مرتب ہوا، اور مولوی صاحب مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے لئے لکھنؤ تشریف لے آئے، اور مولانا کے قریب ہی ایک دوسرے بالاخانہ میں قیام کیا، اور مسلم گزٹ ایک آزاد اخبار کی حیثیت سے بہت کامیابی سے نکلا، اور دو سال تک نکلتا رہا، اور مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء تک اس کے اڈیٹر رہے،

شروع شروع میں مولوی صاحب اور مولانا میں بڑا اتحاد رہا، اکثر ساتھ نشستیں ہوتیں، صحبتیں ہوتیں اور معاملات پر گفتگو اور اخبار کی سیاست کی تجویزوں پر بحثیں ہوتیں، مولانا اس اخبار میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی بے نام کے مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ خاص مولانا کا اخبار ہے، اس لئے اس اخبار کی پسندیدگی کا سارا کریڈٹ مولانا کے حصہ میں آتا رہا، مولانا کا خیال تھا کہ مولوی وحید الدین صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا، اور وہ اس کی فکر میں رہے

---

[1] بروایت مولوی اقبال احمد صاحب سہیل جو اُس وقت وہیں موجود تھے،

کہ کوئی ایسا موقع آئے جس میں خود مولانا کے مقابلہ میں وہ اپنی آزادی کا ثبوت دیں، چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کے سلسلہ میں اُن کو یہ موقع ہاتھ آیا، اور انھوں نے نہایت ناموزوں طریقہ سے مولانا کے خلاف سخت و درشت مضمون لکھنے اور چھاپنے شروع کئے، پھر ۱۹۱۳ء میں طلبائے ندوہ کی اسٹرائک کی تقریب سے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا، تاکہ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ اخبار سارا مولانا کا ساختہ و پرداختہ ہے دور ہو جائے، اسی درمیان میں مولوی وحید الدین صاحب اگست ۱۹۱۳ء میں پولیٹیکل وجوہ سے گورنمنٹ کے حکم سے لکھنؤ سے باہر کر دیئے گئے، اور یہ سلسلہ ختم ہوا۔[1]

مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ

بہرحال مسلم گزٹ جس سیاسی مقصد کو لے کر پیدا ہوا، اور چلا اور بڑھا، وہ تمامتر مولانا کی تجویز و ہدایت کے مطابق تھا، اس وقت تقسیم بنگال کی تنسیخ، بلقان کی جنگ، مسلم یونیورسٹی کے مطالبات، کانپور کی مسجد، اور مسلم لیگ کی اصلاح اور مسلمانوں میں صحیح پالیٹکس کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش وغیرہ مسائل خاص اہمیت رکھتے تھے، اور ان ہی مسئلوں پر مولانا کے مضامین اور نظمیں نکل رہی تھیں، مسلم گزٹ میں ان کے جو سیاسی مضمون نکلے ان میں سب سے اہم سلسلۂ مضمون وہ ہے جو مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ کے عنوان سے چار نمبروں میں شائع ہوا، حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ اُس نے مسلمانوں کی سیاست کا رُخ دفعۃً دوسرے قبلہ کی طرف پھیر دیا،

مضمون کا پہلا نمبر جو ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو نکلا اس کا آغاز یہ ہے: "اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کی کے خاتمے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر گیا، تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نثار کر دیا جائے لیکن مرکز پالیٹکس اور اس کے حوالی سے جو صدائیں آتی ہیں وہ دوتا ہونے

۱؎ مکاتیب سلیمان ص ۵ نیز دیکھئے جلد اول ص ۵۔

کے ساتھ خود ان کو لہجہ بھی غلط ہے؛

پانیر کا مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے کہ چونکہ اب نظر آتا ہے کہ ترکی، اور ایران کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہمارا وقار اور رتبہ قائم نہیں رہیگا، اس لئے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا چاہئے"۔ ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے، لیکن یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی، اور ہمیشہ اچھی بات رہیگی لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے وہ اسلام کا ننگ ہے کیا ہم کو ہمسایوں کے دامن میں اسی لئے پناہ لینی چاہئے کہ اب ہمارا کوئی سہارا نہیں رہا ہے؟ کیا اگر ترکی اور ایران پُر زور ہوتے تو ہمارے ہمسایہ کے مقابلہ میں مدد کر سکتے ہے؟ کیا شملہ ڈیپوٹیشن کی اس خماری پر انگریزوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ہمارا پولیٹیکل وزن اپنے ہمسایوں سے زیادہ ہے؟

اس کے بعد نواب وقار الملک بہادر کے اُس بہادرانہ مضمون کا ذکر ہے جو تقسیم بنگال کے بعد اُن کے قلم سے نکلا لیکن اُن کی اس رائے سے کہ مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو اُن کی ہستی فنا ہو جائے گی؛ "اتفاق نہیں کیا لکھا ہے۔ نواب وقار الملک کا سنجیدہ لیکن بہادرانہ مضمون ایک بچے دلیر مسلمان کی آواز ہو سکتا تھا، اگر اس میں یہ غلط منطق شامل نہ ہو جاتی کہ ہم قومیں کانگریس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائے گی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں، اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۲۰ کروڑ، اور مسلمانوں کے ۶ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے، اگر دادا بھائی نوروزجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا، ینگ ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۶ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئے،

غرض دلائل اگرچہ غلط ہیں لیکن بات بالکل صحیح ہے کہ پولیٹیکل خواب سے بیدار ہونے کا وقت آگیا ہے۔

اُس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی غفلت پر ماتم کیا ہے: ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی، ہماری پالیٹکس کا سب درس شکایت تھا، ہماری پالیٹکس بھی تو ایک تجارت کی طرح ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی "ابھی وقت نہیں آیا ہے" ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہئے، ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے، ہماری تعداد کم ہے، اس لئے نیابتی اصولِ سلطنت ہمارے موافق نہیں؛ یہ الفاظ اس قدر دُہرائے گئے کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کر گئے، ہر مسلمان بچہ اُن خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام مراحل میں ساتھ رکھتا ہے، مسلمانوں کی عام جماعت میں جب پالیٹکس کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دُہراتا ہے؛

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جد و جہد، سعی و کوشش، حوصلہ مندی، قوتِ عمل، سرگرمی، جوش، اور ایثارِ نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا، ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے، وہ باوجود دولت مندی کے زمین پر سوتے اور کمل اوڑھتے ہیں، ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے، جہاں اس وقت ۲ بی اے پالیٹکس کی تعلیم پا رہے ہیں، جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے، اور اُن کی کل زندگی کی قیمت صرف ۳۰ روپیہ ماہوار ہوگی، ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج میں ۱۰ پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں، صرف ۵۰ روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں؛ لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک

ذرہ جنبش نہیں پیدا کر سکتے، ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک ایثارِ نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی؛ ہمارا قومی تربیت یافتہ گروہ جب قومی کام میں نرخ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت نہیں کم کرتا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہمارا پولیٹیکل احساس بالکل مر گیا ہے۔

دنیا میں صرف آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پُر زور جذبات پیدا ہو سکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لئے زحمتیں برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کر سکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرشِ خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن اور بزدلی پھیل گئی، ہمارے پولیٹیکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا ہے، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظامِ حکومت پر نکتہ چینیاں کرتا ہے، اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کی کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں، اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ میں رسالہ چھاپنا پڑتا ہے کہ "تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں"؛ ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لئے یہ شرط پیش کی کہ صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے۔

جب ہم اس اختلافِ حالت کا سبب پوچھتے ہیں تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق ہم کو سمجھاتے ہیں کہ "ہندو مچھر ہیں، اس لئے گورنمنٹ کو ان کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں، لیکن مسلمان شیرِ نیستاں ہیں جن کے ہمہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے" خیر یہ فریب کاری ختم ہو چکی، غفلت کا دور گذر چکا، قوم میں ایک احساس

پیدا ہو چلا ہے، اور صرف یہ متعین کرنا رہ گیا ہے، کہ نئی زندگی کا طریق عمل کیا ہوگا؟

مضمون نے دوسرے نمبر میں حسب ذیل اُمور پر بحث کی ہے:۔

(۱) پالیٹکس کی صحیح اسکیم،

(۲) ہمارے موجودہ طریقہ کی غلطیاں،

(۳) ہندو مسلمانوں کا اتحاد،

پھر لکھا ہے کہ مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں، ایک یہ کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں (موجودہ زمانہ میں اس کو یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہندوستانی ہیں) اور دوسری یہ کہ وہ مسلمان ہیں، مسلمانوں کی پالیٹکس کا ہیولیٰ ان ہی دو جزوں سے بنکر تیار ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا نے پہلے شخصی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت کی تائید کرکے اس غلطی کو دور کیا ہے کہ سرسید مرحوم نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ اُن کی ذاتی رائے تھی، بلکہ اُن کے پس پشت کوئی اور قوت تھی جو (کالج کے فائدے دکھا کر اور مسلمانوں کی تعلیمی کمزوری سے ڈرا کر) گویا زبردستی اُن کے منہ سے یہ کہلوا رہی تھی، چنانچہ سرسید کی سیاسی آزادی کے چند واقعے نہایت بلیغ انداز میں گنوا کر فرماتے ہیں:۔" ایسے بہادر کو حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اس پر مجبور کیا کہ اُس نے تمام اسلامی ملک کو پالیٹکس سے روک دیا، یہ کیوں ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے یہ اختلاف حالت پیدا کردیا؟ ان سوالات کا آج جواب دینا غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔"

اس کے بعد سرسید کی لکھنؤ والی تقریر کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر واقعات سے اس کا مدلل اور مُسکت جواب دیا ہے، آخر میں کہتے ہیں:۔" بہرحال سید نے اگر مسلمانوں کو کانگریس سے روکا تو، چھاپے کو بھی

میں شریک ہونا پھر بھی تقلید تھی، جو ہمارا عار ہے، ہم کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، ہم کو اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہئے، ہماری ضروریات ہندوؤں کے ساتھ مشترک بھی ہیں اور جدا گانہ بھی، اس لئے ہم کو ایک اتفاق پولیٹکل ایجی ٹیشن کی ضرورت ہے، اس موقع پر پہنچکر دفعۃً ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے، تسلیم کیا: یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں، یعنی کانگریس ہے؟ نہیں، کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں سوانگ تو اسی قسم کا ہے"

مضمون کے ان دو نمبروں کا شائع ہونا تھا کہ سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی، فیض آباد اور راولپنڈی میں ان کے خلاف تحریک کھڑی کی گئی، اور ساتھ ہی اسی جرم میں نواب وقار الملک کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی، اس پر مولانا نے اپنے مضمون کا تیسرا نمبر لکھا جس کا آغاز ان فقروں سے ہے "ہمارے پچھلے دو آرٹیکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہے، ہمارا جرم مفرد جرم نہیں، بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہے، ہم نے مسلمانوں کی ستی سادہ پالیٹکس کی ہے، حقرای کی، ہم نے مسلمانوں کی پولیٹکل پالیسی سے بغاوت کی، ہم نے اتفاق عام کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا چاہا، ہماری گستاخیوں سے ڈر ہے کہ لیڈروں کی عظمت وشان میں فرق آجائے، ہمارا جرم سخت ہے، ہم لیگ جیسے پرزور ایجی ٹیشن کی عظمت کے منکر ہیں، ہم مصنف کے درجہ پر قانع نہ ہو کر پولیٹکل لیڈر بننا چاہتے ہیں، ہم کونسل کی ممبری کے امیدوار ہیں"

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ کی غلط پالیسی پر پورا تبصرہ کر کے صحیح پالیٹکس کا ایک نظام پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں یہ فقرہ کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے: "اگرچہ ہم آگے چل کر صحیح پالیٹکس بتائیں گے لیکن سچ یہ ہے کہ صرف یہ سمجھ لینا کہ موجودہ پالیٹکس غلط ہے، یہی صحیح پالیٹکس ہے"

پھر مسلم لیگ کی کیا حقیقت ہے، اور وہ کیونکر عالم وجود میں آئی، اس پر چند فقرے ہیں :-

"اس بنا پر پالیٹکس کی بحث میں سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج، بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی۔ مسلم لیگ کیونکر قائم ہوئی؟ کب قائم ہوئی؟ کس نے قائم کی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وحی (بقول سرسید مرحوم) خود دل سے اتری تھی یا کوئی فرشتہ اوپر سے لایا تھا؟

یہ سوالات اگرچہ اصل مسئلہ پر کسی قدر اثر رکھتے ہیں، اور اگرچہ ان کے جواب دینے کا حق ہم کو ابھی قطعاً حاصل ہے، جس قدر خود بانیٔ لیگ کو (کیونکہ جب یہ تماشا ہو رہا تھا تو ہم کو پردہ کی طرف جھانکنے کی اجازت تھی) تاہم اس سے ضروری تر دو تین امر اور ہیں، اور ہم کو پہلے ان کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

امور تنقیح طلب حسب ذیل ہیں :-

۱۔ کیا لیگ کا کونسٹیٹیوشن پالیٹکس سے مطابقت رکھتا ہے؟

۲۔ کیا اس میں پالیٹکس کی علامات پائی جاتی ہیں؟

۳۔ کیا مسلم لیگ، مسلم لیگ رہ کر کسی کام کے قابل ہو سکتی ہے؟

لیگ کا منشأ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا، اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی۔ ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا، اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے (اپنی سی سالہ جد و جہد سے) حاصل کئے ہیں، اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔"

اس کے بعد مولانا نے مسلم لیگ اور کانگریس کی روداد دوں سے ان دونوں کے مطالبات کی قدر و قیمت کا موازنہ کیا ہے، اور دونوں کے تخیل و طریق عمل کے فرق کو دکھایا ہے، پھر آخر میں مسلم لیگ کے نظام ترکیبی پر بحث کی ہے، اور پوچھا ہے :- "سب سے آخری بحث یہ ہے کہ مسلم لیگ

کا نظام ترکیبی کیا ہے؟ اور کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہو، اور اس کو اپنے دینی مجلس کے لئے نیابت صدر کے لئے، سکریٹری شپ کے لئے، ارکان کے لئے، اضلاع کے عہدہ داروں کے لئے وہ لوگ مطلوب ہیں جن پر طلائی رنگ ہو؟ لیکن پولیٹکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے؟ کیا ایک معزز زمیں، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولتمند اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے؟ ہندؤں کے پاس زمینداری، دولت اور خطاب کی کمی نہیں لیکن کیا انھوں نے تیس برس کی وسیع مدت میں کسی بڑے زمیندار یا تعلقہ دار کو پریسیڈنٹی کا کرسی نشین کیا؟ کیا اس کے پریسیڈنٹوں میں کسی کا سر خطاب کے تاج سے آراستہ ہو؟"

مولانا نے اس کے بعد اضلاع میں مسلم لیگ کی شاخوں کی ضرورت پر اس لئے بحث کی کہ سارے اضلاع میں چونکہ ایسے مسلمان نہیں مل سکتے جو بہادری سے صحیح پالیٹکس پر چل سکیں اس لئے حالت یہ ہوئی ہے کہ جاہ پسند دولتمندوں کی تلاش ہوتی ہے اور چار و ناچار اُن کے سر پر یہ تاج رکھ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد صحیح پالیٹکس کا نظام پیش کیا ہو اور اس کی پہلی دفعہ یہ لکھی ہو:-

۱۔ سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرہ کو وسعت دے، چھوٹی چھوٹی باتیں جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں، اُن کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہو، مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ ہے جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا، یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا مدار ہے، ہر شخص اپنی

آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ کاشتکار روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں، ہر بندوبست مال گذاری کی مقدار میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہے کہ جو زمینیں مویشی کا حق تھیں اُن کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے، چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے، چراگاہیں مزروعہ بنتی جاتی ہیں، ایک فصل بھی اگر کم ہو جائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے، ہزاروں کاشتکار گھر چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں، مالگذاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بے دردمہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں، باینہمہ ہر تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے، اور زمیندار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے،

فرض کرو، اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہو جائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا، یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں؟

۲- سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انتظامی کاموں میں یہ کوشش کی جائے کہ ہندوستانیوں کی شرکت ہو، گوکھلے نے یہ بل پیش کیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک کونسل چند آدمیوں کی قائم ہو، اور کلکٹر ضلع اُن کے مشورہ سے انتظامی امور عمل میں لائے، کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اپنا حال ہم دوسروں سے زیادہ جان سکتے ہیں، کس کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اپنی تکلیف کا جس قدر احساس ہم کو ہو سکتا ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ سب سے عمدہ تدبیر تھی جو ملک کی بہبودی کے لئے پیش کی جا سکتی تھی، لیکن یہ بل نامنظور کر دیا گیا، مختصر یہ کہ بجز کسی خاص ریزولیوشن کے باقی تمام اُن تجاویز کو جو کانگریس میں پیش کی جاتی ہیں، مسلم لیگ کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہئے جس طرح ہندوؤں کا ماڈریٹ فرقہ کرتا ہے،

۳- مولوی امیر علی صاحب نے حال میں جو صورت تجویز کی ہے یعنی یہ کہ مشترکہ مسائل میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ اسٹیج قائم ہو، اور جب حضور وائسرائے کی خدمت میں ڈیپوٹیشن جائے تو دونوں

گروہ کے ممبر بآسانی شریک ہوں، یہ نہایت صحیح تجویز ہے، اور اس کو فوراً اختیار کرنا چاہئے،

۴۔ مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمینداروں اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کرلی جائے صرف وہ لوگ شریک کئے جائیں جو آزادی اور جنگجوئی کے ساتھ اظہار رائے کر سکیں،

۵۔ سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قومی پالیٹکس کا ذوق پیدا ہو جائے، پالیٹکس ایک وسیع علم ہے، اس کے مسائل اور معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے، اُن کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے، اہمات مسائل پر رسالے اور پمفلٹ شائع کئے جائیں، کچھ لوگ مقرر کئے جائیں جو ملک میں دورہ کریں، اور پولیٹکل مسائل پر عالمانہ لکچر دیں، جو دلائل، معلومات اور اعداد پر مبنی ہوں،

۶۔ چند لوگ آنریری یا تنخواہ دار مقرر کئے جائیں جو کسی کسی خاص مسئلہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں مثلاً کسی ایک ضلع کے صدر مقام میں قیام کرکے ان امور کی تحقیقات کریں کہ تیس برس پہلے ضلع کی کیا حالت تھی، کتنے بڑے بڑے زمیندار تھے، کن لوگوں کے پاس زمینداریاں تھیں، اب کیا حالت ہے؟ کتنی زمینداریاں نیلام ہوگئیں، کس قسم کے قرضوں میں نیلام ہوئیں، بندوبست کا کیا اثر پڑا، کاشتکاروں کی کیا حالت ہو، کتنے آدمی دوسرے ممالک میں چلے گئے، اس قسم کے اعداد اور واقعات سے پُرنتائج یادداشتیں تیار ہو سکیں گی، اور گورنمنٹ ان سے فائدہ اٹھا سکے گی؛

آپ نے دیکھا کہ صحیح پالیٹکس کے متعلق اُن کا نظریہ کیا تھا، مضمون کے آخر میں انھوں نے ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ پر بحث کی تھی، اور بتایا تھا کہ مغلوں کی حکومت کے دور میں یہ مصالحانہ اتحاد، باہمی محبت اور رواداری کیونکر پیدا ہوئی، اور اب بھی وہ ممکن ہو،

مسلم لیگ کی اصلاح | ان مضامین نے مسلمانوں کے خیالات میں عجیب انقلاب برپا کیا، یہانتک کہ

مسلم لیگ کے ارباب بست وکشاد نے بھی اپنے اندر ترقی اور اصلاح کی ضرورت محسوس کی، اور قوم کے بعض ممتاز لیڈروں نے مولانا کو یقین دلایا کہ اگلے سالانہ اجلاس (۱۹۱۳ء) میں لیگ کا نظام بدل جائیگا، مولانا اپنے مضمون کے چوتھے نمبر کے شروع میں لکھتے ہیں: "پچھلے آرٹیکل میں ہم نے مسلم لیگ کی موجودہ حالت اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق بحث کی تھی ہم کو مسرت ہے کہ مضمون کے پچھلے حصّہ سے اکثر بزرگوں کو اتفاق ہے اور قوم کے بعض نہایت ممتاز لیڈروں نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ اگلے سالانہ اجلاس میں لیگ کا نظام قریباً بدل دیا جائے گا اور جو تجویزیں ہم نے لیگ کی اصلاح کی پیش کی ہیں، قریب قریب لیگ اسی قالب میں ڈھل جائے گی، اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہم کو لیگ کی مخالفت کی کوئی وجہ نہیں ہوگی، اور ہم سب سے پہلے اس کے آگے گردن جھکا دیں گے۔"

لیکن ہندو مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلہ میں مولانا نے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا اس میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہیں رہے تھے یعنی ہندوؤں کی رواداری کا تمام پلہ جھکا ہوا تھا، دوسری طرف مسلمان مجرم نظر آتے تھے، اس لئے اخیر نمبر میں یہ دکھایا کہ ہندوؤں میں یہ رواداری مسلمانوں کی بے تعصبی کے جواب میں تھی، اور تاریخی واقعات سے اس پر استدلال کیا، مگر افسوس کہ یہ نمبر زندگی کے بعد شائع ہوا۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، نظام بدلا، نصب العین کسی قدر اونچا کیا گیا۔ سلف گورنمنٹ کو لیگ کا مقصد قرار دیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ایک دو خفیف لفظ بڑھا کر سرکار اور احرار دونوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی یعنی سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ:

مولانا مرحوم نے لیگ کی اس بوالعجبی پر خوب طنزیہ نظمیں لکھیں، جو کچھ لکھیں وہ ایسی مقبول نکلیں

کہ آج تک اُن کی صحت میں فرق نہیں آیا، بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لیگ میں اس وقت جو کچھ انقلاب پیدا ہوا اس میں دوسرے اسباب کے ساتھ مولانا کے نثر و نظم کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہوا۔ مولوی نظام الدین صاحب بدایونی، اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں، نے کسوف شمسین کے نام سے ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی اور مولانا حالی کی وفات پر ایک رسالہ مع مرثیوں کے چھاپا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں: "اس کے علاوہ مسلم گورنمنٹ کے ریزولیوشن کے بانیوں میں بھی مولانا کا نام ایک وقیع جگہ رکھتا ہے۔ گذشتہ چند سال سے وہ تمام قومی اور سیاسی معاملات کے متعلق اپنی رائے بلند پایہ نظموں کی شکل میں اخبارات میں شائع کرتے رہے۔" (صفحہ ۴۰)

مولوی سید طفیل احمد صاحب اپنی کتاب مسلمانوں کا روشن مستقبل میں لکھتے ہیں: "سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر تمام جدید تعلیم یافتہ اصحاب آتے ہیں، مگر عجیب بات ہے کہ جب مسلمان فرقہ وارانہ سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں داخل ہوئے تو قدیم تعلیم یافتوں کا حصہ اس میں نمایاں ہو گیا، بلکہ انھوں ہی نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی دلدل سے نکالنے میں خاص کام کیا، جن میں سب سے اول مولانا شبلی نعمانی تھے۔۔۔ انھیں موقع ملا کہ وہ اپنا زور قلم مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بدلنے میں صرف کریں۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے۔" (طبع دوم از صفحہ ۳۰۷ تا صفحہ ۳۰۹)

مسلم لیگ اور کانگریس کا اتحاد

بہرحال مولانا کی یہ کوششیں ضائع نہیں ہوئیں اور ان ہی کے بقول خود زمانہ کے انقلابوں نے مسلمانوں کو بیدار کیا، ان میں روز بروز حریت پسندی کی تعداد بڑھنے لگی، ابو الکلام، محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر انصاری، اور بہت

نوجوان احرار، آگے بڑھے اور بوڑھوں کو بھی اپنے ساتھ لگالائے، حکیم اجمل خاں، نواب اسحاق خاں، میجر سید حسن بلگرامی، راجہ محمد علی محمد خاں والی محمود آباد وغیرہ بہت سے کہن سال رہنما بھی جوانوں کے قدم بہ قدم چلنے پر آمادہ ہوئے۔ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (پٹنہ) اور مسٹر محمد علی جناح (بمبئی) نے احرار لیگ کے اس مشترکہ اقدام کی رہبری کی، یہ دیکھ کر مولانا نے فرمایا،

لاکھ آزادی بھی ڈر کو روکا لیکن — یہ وہ افسوں ہے کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے

خیر بخت تو گستاخ تھے مدت سے مگر — اب تو کچھ آپ کے منھ کو بھی نکل جاتا ہے

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے — لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے

اب بھی آجاتی ہے کالج کو خوشامد کی صدا — جا چکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

مولانا کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ لیگ اور کانگریس کے تعلقات آپس میں بڑھتے گئے، یہاں تک کہ مولانا کی وفات کے ایک سال بعد اخیر دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، جس کے صدر مسٹر مظہر الحق بیرسٹر پٹنہ، اور صدر استقبالیہ مسٹر محمد علی جناح تھے، اسی زمانہ میں وہیں کانگریس کا اجلاس بھی تھا، دونوں کے رہنما آپس میں ملے اور خیالات میں اتحاد کی شکل پیدا ہوئی، اور لیگ اور کانگریس میں اشتراک عمل نمایاں ہوا، لیگ کے رہنماؤں نے کانگریس میں، اور کانگریس کے لیڈروں نے جن میں گاندھی جی، پنڈت مالوی جی، مسز سروجنی نائیڈو سر ایس پی سنہا صدر کانگریس، مسز اینی بسنٹ اور مسٹر ہارنی مین اڈیٹر بمبئی کرانکل وغیرہ شامل تھے، لیگ کے اجلاس میں شرکت کی، اور حاضرین نے پرتپاک جوش سے ان کا خیر مقدم کیا، دوسرے سال

۱؎ اس اجلاس میں راقم شریک تھا، اس وقت مولانا مرحوم کے رنگ میں لکھنے کی کوشش تھی، اس موقع

دسمبر ۱۹۱۶ء میں دونوں سیاسی مجلسوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے مسلم لیگ کی صدارت کا فرض مسٹر محمد علی جناح[1] نے انجام دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲۴) پر یہ نظم راقم نے لکھی :-

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا | ابر خورشید حقیقت پر بہت چھایا رہا
پرشب تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں | ملک میں پچھلے دنوں کچھ کچھ اُجالا سا رہا
وہ زمانہ جا چکا جب بُت پرستی عام تھی | جب خدا کا حکم ہر جبار کا ایا رہا
جب متاع رہنمائی تھی سزا وار خرید | جب کہ ہر قارون پہ ہم کو خضر کا دھوکا رہا
جبکہ تھی آزادگان عشق کی ہم میں کمی | جبکہ ہر فرعون ہم میں قوم کا موسیٰ رہا
پھر بھی تمیز حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا | جو ہمیشہ قوم میں شمع رہ صحرا رہا
رزمگاہ نور و ظلمت بنی مدت سے ہے | گر ہمیں انوار حق چھلکے تو کیا جیبا رہا

آیت قرآں کہ جاءالحق مصدق ہو گئی
مجلس دیں میں ہماری تنظیم حق ہو گئی

یہ اشارہ مسٹر مظہر الحق کی طرف تھا،

[1] راقم اس دوسرے اجلاس میں بھی شریک تھا اور یہ نظم موزوں ہوئی۔

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے | کوہ شعلہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا
جبکہ دارو بے دوا ہر درد کا درماں رہی | جبکہ ہر ناداں عطائی بوعلی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اُسے | جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے | دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
غفلت دیرین سے گو اعضائے قومی بیکار ہیں | گوش شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا

ہے مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

ہیں دونوں قوموں کے درمیان "لکھنؤ پیکٹ" طے ہوا، اور اب یہ اتحاد سال بہ سال آگے بڑھا، کئی سال تک متواتر دونوں مجلسوں کے اجلاس ایک شہر میں ایک ساتھ ہونے لگے، اور ایک دوسرے کے اکابر دوسرے کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے، اور ایک ہی قسم کے رزولیوشن دونوں جگہ منظور ہونے لگے۔ مسٹر محمد علی جناح نے لکھنؤ کے اس جلسے کے صدارتی خطبہ میں ایک جگہ فرمایا:- "تجدید ملی کا سب سے زیادہ پُر امید پہلو یہ ہے کہ ہندو و مسلمان مشترکہ مقصد کے لئے متحد ہو رہے ہیں۔ بمبئی کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ گذشتہ دسمبر میں پہلی بار لیگ و کانگریس کے اجلاس اسی شہر میں ہوئے۔ بڑی کٹھن منازل طے کرنے کے بعد اس اتحاد کا مظاہرہ نظر آیا۔ .... آج پھر لکھنؤ کا تاریخی شہر جو اسلامی ادب و تہذیب کا گہوارہ ہے، اور جہاں سے چند برس ہوئے لیگ کی بنیاد پڑی تھی، کانگریس اور لیگ کے متحدہ اجلاس کا منظر پیش کر رہا ہے[1]"۔

یہ وہ خوش آیند منظر تھا کہ جس کو اگر مولانا مرحوم دیکھتے تو اپنی تحریک کی کامیابی پر بے انتہا خوش ہوتے۔

احرار کو تنبیہ

اس موقع پر ایک اور بات بھی یاد دلانی ہے، احرار کے نام سے جو گروہ بن رہا تھا جیسا کہ قاعدہ ہے، قدیم سیاسی حد بندیوں کے ٹوٹنے سے وہ اعتدال سے آگے قدم رکھ رہا تھا، مولانا نے اس کو بھی ٹوکا، اور اپنی متعدد نظموں میں اس کی بے اعتدالی، لہجہ کی تلخی اور طرزِ کلام کی ناہمواری پر گرفت کی، پہلے تو قدیم بزرگوں کی مذمت میں معذرت کے طور پر فرمایا،

اعتدال آنے نہ پایا ہو نہ آئے گا کبھی — آپ کی طرح سے مجھ کو بھی یہی کھٹکا تھا
یہ تو جو ہو کہ پھسلے گی اسی زور سے آپ — آپ نے قوم کو جس زور سے دھکیلا تھا

---

[1] مسلم لیگ کی تاریخ مؤلفہ سید اختر حسین ص ۳۳۔

آشنائی میں تو اک عمر بسر کی میں نے — اب تو سب سے مجھے بیگانہ ہی رہنے دیجئے

مدتوں آپ نے عاقل تو مجھے دیکھا ہے — اب تو کچھ دن مجھے دیوانہ ہی رہنے دیجئے

ایک اور نظم میں احرار کی سیاست کو بھی زیرِ عتاب کر کے ان کی سیاسی خطاؤں سے درگذر کرنے کی درخواست کی

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے — احرار قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی

چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ — گم گشتہ طریق ہے یہ کارواں ابھی

زود اعتقادیاں ہیں تلوّن ہے وہم ہے — ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی

دل میں نہ عزم ہے نہ ارادوں میں ہے ثبات — جھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی

بے اعتدالیاں ہیں ادا سے کلام تک — باہر ہے اختیار سے ان کی زباں ابھی

ہر دم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر — ان میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی

یہ سب بجا درست مگر سچ جو پوچھئے — جو کچھ کہ ہے یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی

یہ ہے سیاستِ پارینہ کا اثر — گو شمع بجھ چکی ہے مگر ہے دھواں ابھی

موزوں نہیں ہے جنبشِ اعضا تو کیا عجب — شب کے خمار کی ہیں یہ انگڑائیاں ابھی

چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں — چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ خستہ جاں ابھی

بیکار کر دیئے تھے جو خود بازوئے عمل — گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی

تن سے کہاں ہے قوتِ رفتار پاؤں میں — کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی

[illegible] ہیں کچھ مباحثِ ملکی نہیں نئے — اک طفل ہے سیاستِ ہندوستاں ابھی

اس کے بعد احرار کو خطاب کر کے اُن کو بھی مناسب سرزنش فرمائی۔

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا ‏ ‏ قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد

لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر ‏ ‏ ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد

ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے یہ قابلِ غور ‏ ‏ یہ تو فرمائیے، اس باب میں کیا ہے ارشاد؟

بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن ‏ ‏ شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد

آبلہ قابلِ نشتر تھا، یہ مانا لیکن ‏ ‏ دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا ‏ ‏ خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد

اب کوئی مرکزِ قومی ہے، نہ توحیدِ خیال ‏ ‏ نہ کوئی جادۂ مقصد ہے، نہ کچھ توشۂ زاد

خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم ‏ ‏ خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ، نہ ہو پھر آباد

ذرے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اُڑ اُڑ کے فنا ‏ ‏ یونہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد

نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا ‏ ‏ یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیشِ نہاد

بھاپ پُرزور ہے، لیکن کوئی انجن بھی تو ہو ‏ ‏ کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہو گا فصّاد

بعض پُرجوش احرار کا قلم خاص طور سے تیز و نشتر تھا، اس کی طرف رُخ کر کے یہ نظم ارشاد کی،

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید ‏ ‏ سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہو کہ نہیں؟

رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام ‏ ‏ اس میں کچھ شائبۂ رشکِ حسد ہے کہ نہیں؟

افتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر ‏ ‏ اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہو کہ نہیں؟

نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئینِ سخن ‏ ‏ بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہو کہ نہیں؟

جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ ‏ ‏ کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہو کہ نہیں؟

شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہو بساط — اس میں اُن پر بھی کہیں ہو کوئی مہرہ کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب غیروں کی — اس دورِ جدید کی بیچ کی حد ہو کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے ہیں ذرا دیکھ تو لوں — تجزیہ جیسا تھا اُس کا وہی مد ہو کہ نہیں؟

حریتِ خیال کے مسافر نے یہاں تک منزل طے کی تھی کہ بہت سے کہنہ سال وفادارانِ قوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے نوجوانوں کی خیرہ سری ہمارے ازلی آقاؤں کو ہم سے سرگراں نہ کردے اور طرابلس، بلقان، کانپور، اور یونیورسٹی کے معاملات میں ہماری آزادہ گوئی، اور مسلم لیگ کے انقلاب، مسلم لیگ و کانگریس کے اتحاد اور لکھنؤ پیکٹ وغیرہ میں ہماری سیاسی آزادہ روی سے حکومتِ وقت کے دل میں ہماری طرف سے غلط فہمی نہ ہو، اس لئے بظاہر صلح کانپور کے شکریہ میں اور درحقیقت مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلانے کی خاطر مہاراجہ صاحب محمود آباد کی تحریک میں ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا، جس میں حزب الاحرار کے بھی بعض نامور افراد نے افسوس ہے کہ شرکت کی، اور گویا انھوں نے اس طرح اپنے پچھلے گناہوں کا کفارہ ادا کیا، اس وفد نے ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء کو وائسرائے سے ملاقات کی، اور ایک ایڈریس پیش کیا، لیکن مولانا ابوالکلام اور بعض دوسرے احرار نے اس وفد سے قطعاً احتراز کیا، اور اس کے خلاف سخت مضامین لکھے،

مولانا نے اس عجیب و غریب وفد کے متعلق تین قطعے ارشاد فرمائے،

سچ تو یہ ہے کہ وفا کیشِ ازل ہیں ہم لوگ — ہم کو شکوہ نہیں آئینِ جہاں بانی کا
ہم نے یہ لکھ کے جو دی آپ کو تحریرِ وفا — یہ نوشتہ ہے ہماری خطِ پیشانی کا

مشق ہے جادۂ طاعت پہ ہمیں چلنے کی — ہم سے اس راہ میں اغیار کبھی بڑھ نہ سکے

ہم نے تحریر وفا پڑھ کے سنائی اُن کو — کہ ذرا خط جو خفی تھا، تو وہ خود پڑھ نہ سکے

احرار اور تدبیرانِ وفا ہیں اب — دونوں کا جو طریقہ سود و زیاں الگ

دونوں کا منتہائے نظر گو ہو مختلف — ہو خود بخود ہر ایک کا طرز بیاں الگ

اس پر بھی صاف صاف تھا امتیازِ حق — کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے کہاں الگ

دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا — قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ

اب صاف ہو گیا حق و باطل میں امتیاز — اب فصلِ نوبہار الگ ہے خزاں الگ

اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا — اب شمع و فروزاں الگ ہے دھواں الگ

وہ اختلاط دور رہے صاف اب نہیں — گم گشتگانِ راہ ہوئے کارواں الگ

جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار — کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ

یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے — لکھیں گے مفصل میں یہ داستاں الگ

مولانا کے سیاسی کلام کا یہ آخری بند ہے، اور اسی کے چند مہینوں کے بعد انھوں نے وفات پائی۔

سیاست میں بھی اعتدال تھا

تاہم اس زمانہ میں آزاد سے آزاد آدمی کا حکومتِ وقت سے مطالبہ صرف اصلاحات کا تھا، مولانا کی سیاست بھی اس سے آگے نہ تھی، اور نہ اس کے آگے کوئی راستہ کسی کو معلوم ہوتا تھا، یہی سبب ہے کہ اس سیاسی حریت طلبی کے باوجود وہ حکومتِ وقت سے انحراف کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں نہیں رکھتے تھے، اور ذرا سے دباؤ سے وہ اپنی مسلمہ وفاداری کا اقرار کرانے لگتے تھے۔

یاد ہوگا کہ ترکی کے سفر سے واپسی کے بعد سے اُن پر ترکی خلیفہ کے خفیہ سفیر ہونے کا الزام تھا،

سرسید کی وفات کے بعد ۱۹۰۰ء میں یونان و روم کی جنگ کے موقع پر جب مسلمانوں میں بڑا جوش تھا
انھوں نے علی گڈھ کالج میگزین میں خلافت پر تین چار صفحوں کا ایک مضمون لکھ کر یہ بتانا چاہا کہ تاریخ
اسلام میں اب تک کسی غیر قریشی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اس لئے ترکوں کا دعوائے خلافت
بھی تسلیم کے قابل نہیں، لیکن چونکہ یہ مضمون "آورد" تھا، "آمد" نہ تھا، اس لئے ایک نمبر کے بعد اس کے
دوسرے نمبر کا چھپنا، بلکہ شاید سپرد قلم ہونا بھی نصیب نہیں ہوا، اور یوں ہی ناتمام رہا، سنہ ۱۹۲۰ء میں جب
راقم وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے لندن میں تھا اور وہاں کے وزراء اور ارباب سیاست
سے ترکی خلافت کی نسبت بحث و گفتگو جاری تھی، تو پروفیسر آرنلڈ جو ان دنوں انڈیا آفس سے متعلق
تھے، اکثر کرم فرما کر میرے پاس تشریف لاتے، اور مولانا کے اس مضمون کا حوالہ دے کر ترکوں کے
دعوائے خلافت کو بے بنیاد ثابت کرنا چاہتے تھے، میں کہتا کہ یہ مضمون مولانا نے لکھا نہیں، اتفاق
لکھوایا گیا ہے اور اس کی ناتمامی خود اس کی دلیل ہے،

سنہ ۱۹۰۸ء میں جب کرنل عبد المجید خاں وزیر خارجیہ ریاست پٹیالہ جو انگریزوں کے بڑے
دوست تھے اور ان دنوں گورنمنٹ اور ندوۃ العلماء کے درمیان صلح و صفائی کی پیامبری کر رہے
تھے، مولانا نے الندوہ رجب ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں ایک مضمون لکھا کہ مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت
کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہئے؟ اور اس میں یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کا ہمیشہ سے یہ قومی شعار رہا ہے
کہ وہ جس قوم کی حکومت میں رہیں اس کے وفادار ہو کر رہیں[1]، یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ

---

[1] یہ دونوں مضمون مقالات شبلی جلد اول میں چھپ گئے ہیں، افسوس ہے کہ مولانا نے اس دوسرے مضمون
(مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہئے؟) میں رد تھا، کے جس فقرہ پر اپنے تقریہ کی بنا

کو اُس کے اُس چھ ہزار سالانہ امداد کی قیمت دو کی جو اُس نے دار العلوم کو دینا منظور کی تھی،

اس کے چند طرابلس، بلقان اور کانپور کے ہنگاموں میں مولانا نے جو تیز و تند نظمیں لکھیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا صوبۂ متحدہ کی حکومت اس واقعہ سے بے خبر نہ تھی، اُس زمانہ میں مسٹر برن نامی ایک لائق اور علم دوست انگریز حکومت یوپی کے چیف سکریٹری تھے، وہ اُردو بہت اچھی بولتے تھے، اور فارسی خوب سمجھتے تھے، اور اسی لئے ان سے اور مولانا سے مراسم تھے، لوگوں نے یہ نظمیں اُن تک پہنچائیں، اسی زمانہ میں بنگال کی حکومت نے سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک اُردو مجموعۂ اشعار کو ضبط کیا، جس میں مولانا کی نظم بھی تھی، اخبارات میں مولانا کی شہرت کی وجہ سے یا لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کے لئے اس کو یہ کہہ کر شائع کیا گیا کہ بنگال گورنمنٹ نے مولانا کی نظمیں خلافِ قانون قرار دیں، اور ضبط کرلیں[۱]،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳۱) رکھی ہو اس کے بیچ پڑھتے ہیں ان سے مسوجو ہو وفیقترض علینا اتباعہم میں انھوں نے اتباع پڑھا کہ ان کو تتّبعا پڑھ (پیچھے ہونا یا تابع ہونا) پڑھا ہو، اور یہ ترجمہ کیا ہو کہ اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر قبضہ کرلیں اور اس کو اپنے گھر میں جمع کرلیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے، اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہوگی لیکن یہ تمام تر غلط ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم حملہ کرکے مسلمانوں کے مال و دولت پر قبضہ کرلیں اور اس کو اپنے ملک یعنی دار الحرب میں لیکر چلے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے اور وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں باقی نہیں رہیگا، لیکن جب کفار دار الحرب سے اگر دار الاسلام میں حملہ کرکے مسلمانوں کے مال و دولت پر اس طرح قبضہ کرلیں تو مسلمانوں پر ان حملہ آوروں کو بھگانا اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ دار الاسلام کے حدود میں ہوں، البتہ جب وہ دار الاسلام کے حدود سے نکل جائیں اور مال لے کر دار الحرب میں داخل ہو جائیں تو پھر ان کو بھگانا مسلمانوں پر فرض نہ رہے گا، (دیکھئے شامی حاشیۂ رد المحتار علی الدر المختار، جلد ۳ صفحہ ۳۰۰ مصر)

[۱] اس زمانہ میں کلکتہ میں موجود تھا، تاہم اس کا حوالہ کتاب میں بھی ہے (دیکھئے عبد الحکیم بہ سلیمان ۱۰۰)

جنوری ۱۹۱۴ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی جس میں مولانا بھی شریک تھے، اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سے جب سامنا ہوا تو انھوں نے شکایت آمیز بلکہ کچھ طعن آمیز فقرے کہے چیف سکریٹری صاحب بھی کچھ سرگراں رہے اور دوستانہ شکایت کی مولانا نے کہا کہ یہ اتفاقی حالات ہیں، ورنہ میں نے تو ہمیشہ قوموں میں بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے، مولانا نے یہ پورا واقعہ ۸ فروری ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھ کر مجھ کو بھیجا، "میری نظموں کی ضبطی کا یہاں بہت برا اثر ہوا، لفٹنٹ گورنر صاحب کو ایک پارٹی میں سامنا ہوگیا، پہلے تو کہا "مزاج مقدس" پھر شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے، ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا، جاسوسوں نے اُن کو سب نظمیں پہنچا دیں اور معنی بھی سمجھائے، چیف سکریٹری صاحب بھی کچھ شاکی تھے، میں نے کہا یہ اتفاقیہ خلاف معمول بات ہوئی ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی ہے"

اس واقعہ کی مزید تفصیل مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کے ایک بیان سے معلوم ہوتی ہے، جو انھوں نے مکاتیب شبلی میں مولانا کے ایک رقعہ کی تشریح میں حاشیہ کے طور پر لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ (حاذق الملک) حکیم اجمل خاں مرحوم جو ان دنوں نہایت حکام رس تھے، اور ریاست رام پور سے تعلقات کی بنا پر مسٹر برن سے اُن کے خاص مراسم تھے، لکھنؤ آئے تو یکم فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا کو ساتھ لے کر مسٹر برن سے ملنے گئے، مگر مولانا کی طرف سے اُن کی پیشانی پر بل پڑے رہے، وہاں سے واپس آکر رات ہی کو مولانا نے ایک رقعہ لکھ کر (عبدالماجد) مولوی عبدالماجد صاحب کو بلوایا، جو ان دنوں سیرت کے انگریزی تراجم کے سلسلہ میں مولانا کے انگریزی کا روبار کو انجام دیا کرتے تھے، مولوی صاحب فرماتے ہیں:۔ "تحریر بالا شب کو ملی میں اسی وقت گیا، مولانا بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے، ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہے، خصوصاً سانحۂ کانپور

کے متعلق میری نظروں سے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے
تھے، وہ بہت کبیدہ تھے۔ حالانکہ اس سے پیشتر نہایت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے۔ تم ان کے نام ایک مفصل
چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدۃ العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں، میری
ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے، اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں
مدت دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں، چنانچہ اس پر میری تصانیف شاہد ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۰ء
میں میں نے ندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری
مذہباً فرض ہے، اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کرایا، پھر [illegible]
میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں
گالیاں سننا پڑیں، رہا واقعہ کانپور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں جس میں سارے ہندوستان
کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا،

خط کے اسی سلسلہ میں مولوی صاحب کو یہ دوسرا رقعہ لکھا، جو مکاتیب میں شامل ہے:۔
"جس خط کے لئے میں نے شب کو کہا ہے، وہ آدمی کے ہاتھ نہ بھیجئے گا، یہ بھی مناسب موقع پر بڑھا دیجئے گا
کہ میں نے اپنے کانشنس کے مطابق معاملہ میں پانچ ارکان کو ساتھ لے کر جو کیا، باوجود اس کے کہ بعد کو ملک
کے شور وغل کی وجہ سے سب نے اخبارات کے ذریعہ سے اپنی برأت ظاہر کی، اور یہ لکھا کہ ہم نے فلاں شخص کی
وجہ سے مجبور ہو کر ایسا کیا، لیکن صرف میں اپنی رائے پر اپنے فرض کے مطابق قائم رہا" (حصہ اول ص ۲۰۰)

آخری واقعات

ہم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ خط بھیجا گیا یا نہیں اور اگر بھیجا گیا تو اس کا کیا اثر ہوا، لیکن یہ معلوم
ہے کہ مولانا کی اس ساری مخلصانہ کوشش کی غرض یہ تھی کہ ندوہ سے گورنمنٹ کے تعلقات جو اس کڑکا

اور جدوجہد کے بعد درست ہوئے تھے وہ اُن کی بدولت پھر بگڑ نہ جائیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا کی سیاسی خوے بد" میں بقولِ سعدی اب بھی کوئی تغیر نہیں ہوا چنانچہ اس کے بعد ہی اگست ۱۹۱۴ء میں جب بڑی لڑائی چھڑی تو گو وہ اُس وقت اپنے بھائی کی ناگہانی وفات کے سبب سے نہایت نڈھال تھے، تاہم اس ناتوانی میں بھی اُن کی کمان سے یہ تیر نکل ہی گیا، جس میں انھوں نے غالب کے اس شعر کی

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا | لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تضمین کی تھی،

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور | آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم | اور اس پہ لطف یہ کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل | آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا "غلط ہے ترا ادعائے غرور | دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے | تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں
سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور | پھر بولا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا | لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ تیر پورے نشانہ پر بیٹھا، مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کی روایت ہے کہ اس نظم پر حکومت نے اُن کی گرفتاری کا حکم دیا، لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے، اتفاق سے ایک نیک دل مسلمان پولیس افسر اس زمانہ میں یہاں متعین تھے جو مولانا کے پورے قدرشناس تھے، وہ اُن کی اس بیماری کے عذر پر اس کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قیدِ عنصری سے آزاد ہو گیا

اخیر زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سننے کے قابل ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر شہر کے پرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڈھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برأت کا اعلان مناسب سمجھا، اور اس کے لئے قیامت یہ کی کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا جس کی مولانا کو کوئی خبر نہ تھی، عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرہ میں موت کے بستر پر پڑے تھے ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے کہ "آپ رضامندی دیں تو جلسہ کی صدارت میں ہو" مولانا یہ سنکر بے چین ہو گئے، ان کی طرف منہ کر کے فرمایا "بھائی صاحب آپ تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ ترک اپنی جوتیوں میں میری کھال کا تسمہ بھی لگائیں" یہ ان کی عالم کی بین الاقوامی سیاست کا آخر فقرہ تھا۔

ندوۃ العلماء میں مولٰنا کی مخالفت

اور

معتمدی سے استعفا

۱۹۰۵ء میں جب مدرسہ کا انتظام مولانا کے ہاتھ میں دیا گیا تو کسی لائق ناظم کی عدم موجودگی کے باعث یا یوں کہئے کہ کسی ایک واحد ذات پر پورا اعتماد نہ ہونے کے سبب سے ندوہ کے کاموں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر ایک کے لئے ایک ایک معتمدی قائم کر دی گئی تھی،

۱۔ دارالعلوم اور اس کے تعلیمی انتظامات   معتمد   مولانا شبلی نعمانی،

قرو اسلامات، معتمد مولنا حکیم سید عبد الحی صاحب،

بیتُ المال، معتمد منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری

انتظام تھا جس میں وحدت کا سررشتہ گم تھا، یہ تینوں نہریں الگ الگ بہتی تھیں، یعنی یہ
ہر کہیں ایک نہیں ہوتی تھیں اور کسی ایک شخص کے ہاتھ میں طاقت اگر سارے کاموں
اشتراک اور اتحاد نہیں پیدا ہوتا تھا، اس اتحاد و اشتراک کی صرف ایک ہی صورت تھی اور
وہ ان کارکنوں کا اخلاص اور باہمی اعتماد تھا جب تک ان کارکنوں میں یہ روح موجود رہی، کام
رفتار آگے کو بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا کہ اعتماد کی جگہ بدگمانی نے لی، اب اتحاد کا
ورد واحد سررشتہ بکھر گیا، اور ایک دوسرے کے ہر کام پر بدگمانی کی نگاہیں پڑنے لگیں؛

پھر اس تقسیم عمل سے ندوہ کے دفتری کام کا تو انتظام ہو گیا، مگر ندوہ کے اصل مقاصد کی تکمیل
اور اس کے ذریعہ سے اہم اصلاحات، اور قومی و مذہبی مطالبے کے لئے سعی و کوشش کا کام ان میں
سے کسی فہرست میں بھی داخل نہیں ہوا، دوسرے اصحاب اپنی اپنی ذاتی مصروفیتیں بھی رکھتے تھے
اور مولانا کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہر ذاتی کاروبار سے بے پروا ہو کر ندوہ کے آستانہ پر آبیٹھے تھے اور
ندوہ ہی کے کام کو اپنی زندگی کا کام بنا لیا تھا، اس لئے وہ ان کاموں کو بھی کر دینا چاہتے تھے، لیکن
دوسرے لوگ اس کو اپنے حدود فرائض سے تجاوز، اور دوسرے کے کاموں میں مداخلت سے تعبیر کرتے تھے

اب تک جو واقعات آپ کی نگاہ کے سامنے سے گذرے ہیں، اُن سے یہ اچھی طرح
معلوم ہو چکا ہو گا، کہ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی، اور اُس کا کام آگے کو بڑھتا جاتا تھا
اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا یعنی ندوہ کی کثرت

میں مولانا کی وحدت نمایاں تر ہوتی چلی جاتی تھی، یہ گو واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کرتے جانا ہر انسان کا کام نہیں اس لئے رشک و حسد نے بے اعتمادی کی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا،

لیکن یہ کہنا کہ مولانا کے سوا اُن کے تمام دوسرے مخالف رفقا، اخلاص اور حسنِ نیت سے خالی تھے، ایک بڑی جرأت ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ یعنی سولہ برس علیگڈھ میں بسر ہوا تھا، اور علی گڈھ تحریک سے اُن کی وابستگی شہرتِ عام رکھتی تھی، لیکن یہ واقعہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اُن کو اس وابستگی کے باوجود اس تحریک کے بعض حصوں سے سراسر اختلاف تھا، اور اسی بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہوئے تھے، مگر عام علما، اور اُن کے معتقد لوگ ان ہی سمجھتے تھے کہ یہ علی گڈھ تحریک کے آدمی ہیں، اور علی گڈھ چھوڑ کر ندوہ میں اسی لئے شریک ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کر دیں،

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورّع و تقدّس جو علماے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا، اور اس لئے اُن علما، کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا، اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لئے اُن کی تعلیم و صحبت کو مضر سمجھتے تھے،

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کی بزرگی کے باوجود علما، کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں، اُن کے بعض مباحث قدیم مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے علما، کی ایک جماعت جو متکلمین کی آرا و تحقیقات سے بے خبر تھی ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے اُن کو موزوں نہیں سمجھتی تھی،

[illegible]

اس پر مستزاد یہ کہ مولانا دارالعلوم کی تعلیم میں جس قسم کی اصلاح اور ترقی چاہتے تھے علما کا بڑا حصہ اس سے نفور تھا، وہ قدیم معقولات کی ان کتابوں کو جن سے علما کو صدیوں کا قلبی انس تھا یکسر الگ کر رہے تھے، اور ان کی جگہ نئے علوم لانا چاہتے تھے جن کو وہ اپنے خیال میں کفر و زندقہ جانتے تھے، مولانا انگریزی کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور ان کو اس ضرورت سے شدید انکار تھا

غرض ارکان میں مختلف مذاق کے افراد تھے، لیکن دوسرے قومی کارکنوں کی طرح مولانا نے کبھی اس کی تدبیر کی اور نہ پروا کی کہ ارکان میں ان کے خیال اور مذاق کے لوگوں کی اکثریت ہو، حالانکہ مخالف پارٹی نے اس کا پورا بندوبست کیا اور ایک ہی جلسہ میں زبردستی ممبروں کی تعداد ۵۰ سے ۸۰ کر لی اور خلاف قاعدہ اپنے ۳۰ آدمی دفعتہً بڑھا لئے (مکاتیب نواب علی حسن خاں صاحب ص۳۰) نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے ہمدردوں اور مددگاروں کی جماعت اقلیت میں آگئی اور جلسہ انتظامیہ کی کارروائیوں پر فریق ثانی کا پورا قبضہ ہوگیا،

مولانا خلیل الرحمان صاحب کا اختلاف

جب مولانا نے ندوۃ العلماء میں قیام کا ارادہ کیا تھا، اس وقت نواب محسن الملک نے کہا تھا کہ ندوہ کی اس کس مپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتہً تمام مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے، اور آمادۂ مخالفت ہوں گے، یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور جلسہ سنگ بنیاد ہی میں اس کی بنیاد پڑ گئی، مولانا خلیل الرحمان صاحب سہارنپوری مرحوم جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے، بطور حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے، اور اس کی ابتدا ایک خط سے ہوئی جس میں مولانا نے ان کو یہ لکھا تھا کہ اس

ندوہ کا کوئی ناظم نہیں (حالانکہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم اپنے آپ کو ندوہ کا قائم مقام ناظم سمجھتے
تھے) بہرحال اس کے بعد مولوی خلیل الرحمان صاحب نے اپنی مخالفت کا اظہار (جس کو کون کہہ سکتا
ہے کہ نیک نیتی پر مبنی نہ ہوگا) مختلف پردوں میں کیا، سب سے پہلے جلسۂ سنگِ بنیاد کے موقع پر ۱۹۰۸ء
میں مولانا نے جلسۂ انتظامیہ میں مسئلۂ وقف علی الاولاد کو بغرض منظوری پیش کیا، تو مولانا خلیل الرحمٰن
صاحب مرحوم نے اس کی مخالفت کی، اس کے بعد جب ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ ایڈ کی تقسیم اور جدید
مدرسین کے تقرر کے لئے جلسۂ انتظامیہ ہوا تو مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے ایک یادداشت
کے ذریعہ سے تمام ممبروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی معتمدی یعنی مولانا کا عہدہ توڑ دیا جائے
(مہدی-۱۰۵) جون ۱۹۰۹ء میں مولانا نے مولانا شروانی صاحب کو جو اپنی فطری متانت و سنجیدگی
اور صلح کل طبیعت کی بنا پر فریقین کے معتمد علیہ تھے یہ لکھا: "اگر آپ کو ندوہ کا درد ہے تو صرف سات
دن کے لئے آئیے، مولوی خلیل الرحمان صاحب کو بلائیے، پہلے آپس میں صلح اور نیک نیتی کے ساتھ تمام
مراتب طے ہو جائیں، اور ضرور ہو سکتے ہیں، پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسہ میں طے کر لیجئے، جب ہم لوگ متفق
ہوں گے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا، ورنہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب انجمن حمایت الاسلام
کی طرح ندوہ کی مالی کارروائیاں بھی اخبارات کے منظر پر نظر آئیں گی، چار برس ہوئے کوئی حساب کتاب
نہ مرتب ہوا نہ شائع ہوا، لوگ چاہتے ہیں کہ ماہ بماہ ندوہ میں جمع خرچ چھپے، یہاں کسی کو خبر بھی نہیں، مجلس تعمیر
کی ایک مجلس ہو، اس کا ایک اجلاس ابتدائی کے سوا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہوا، سب جمع خرچ بعض
ذاتی رائے سے ہو رہا ہے"۔ (۱۰۳)

مگر اس پر عمل نہ ہو سکا،

کمیشن کا معاملہ

سنہ ۱۹۱۰ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولوی خلیل الرحمان صاحب کی تجویز بالا جب ارکان نے منظور نہیں کی تو انھوں نے بلا اطلاع یعنی قاعدہ کے خلاف ایجنڈے میں درج ہوئے بغیر بر وقت یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے طلبہ کی مذہبی حالت کی تحقیق و تفتیش کے لئے ایک کمیشن بٹھایا جائے؛ مولانا اس تجویز پر خاموش رہے، اور جلسۂ انتظامیہ نے منظور کرلیا، اس کے بعد مخالفوں نے اُس کے طریق کار میں یہ وسعت پیدا کی کہ خود معتمد دارالعلوم کی بھی شہادت ہو یعنی گویا مجرم کی حیثیت سے اُن کو بھی سامنے لایا جائے۔

مولانا پر اس تجویز کا اس قدر بُرا اثر پڑا کہ وہ ندوۃ العلماء سے الگ ہونے کے لئے تیار ہوگئے چنانچہ ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۰ء کو اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، پھر ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو دوبارہ دوسرا اور زیادہ مفصل خط لکھا، یہ دونوں خط (۵۰ و ۵۸) مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، مولانا شروانی نے اس کے جواب میں غالباً کچھ تسلی آمیز باتیں لکھیں، اسی پر اُن کو فوراً ہی ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو لکھا: "ندوہ کے مواد فاسد کی ہر دفعہ اوپر سے لیپ پوت کردی جاتی ہے اور اندر اندر مواد پکتا رہتا ہے، اس لئے ہمیشہ ہیجان رہتا ہے، اگر واقعی ندوہ کا درد ہے (اور ضرور ہے) تو ایک ہفتہ کے لئے آئیے، اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمن صاحب بلکہ مولوی عبدالحی صاحب کو کسی قدر یقین ہوگیا ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں، اور اُن کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں، اور اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے، اس لئے اگر میری اور اُن کی نبھنے، اور دیکھئے کہ کیا واقعہ ہے، مجھ کو آپ کی رائے پر پورا بھروسہ ہے، اگر آپ کے نزدیک میں نے ایک ذرہ بھی اپنے حدود سے تجاوز کیا ہوگا، تو معترف ہو کر معافی مانگوں گا، ورنہ جب تک ان لوگوں

کا تعین نہ کیا نہ ہوگا، کوئی کمیشن اور اصلاح سود مند نہ ہوگی، یہ تو سب اسی رنجش کے بخارات ہیں، باقی مفصل خط پہلے لکھ چکا ہوں۔ (۲۰)

ارکان کی یہ باہمی کشاکش ختم نہیں ہوئی، اور فیصلہ کے لئے جلسۂ انتظامیہ کی ایک تاریخ مقرر ہوئی، مخالف ارکان نے اس تاریخ سے ایک ہفتہ پہلے تمام شہر میں گشت کیا، اور بہت سے معززین کو دارالعلوم کے ہال میں جو گولہ گنج میں واقع تھا اس لئے جمع کیا کہ وہ مولانا شبلی کی بطرفی کا تماشا دیکھیں، مگر اس اجتماع کا عجیب مضحکہ خیز انجام ہوا جو لطیفہ سے کم نہیں، ارکان اور شہر کے معززین کا یہ اجتماع جب دارالعلوم کے ایک ہال میں جمع تھا، مولانا ندوہ کے دستورالعمل کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے ہوئے ہال میں داخل ہوئے، اور جب جلسہ کی کارروائی شروع ہونے لگی تو سب سے پہلے انھوں نے یہ دریافت فرمایا کہ ندوہ کے جلسوں کی تین قسمیں ہیں، جلسۂ عام جلسۂ خاص جو کسی امر کے طے کرنے کے لئے ارکان اور دوسرے اہل الرائے حضرات کی شرکت سے ہوتا ہے، تیسرا جلسۂ انتظامیہ جس میں صرف ارکان شریک ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ اس وقت یہ کون سا جلسہ ہو، اس پر شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے فرمایا کہ یہ جلسۂ خاص ہے، مولانا نے فرمایا دستورالعمل میں جلسۂ خاص کی تعریف یہ کی گئی ہو "جلسۂ خاص وہ جلسہ ہے جس کو جلسۂ انتظامیہ کسی خاص مقصد سے کسی معین تاریخ میں طلب کرے، اور ملک کے سربرآوردہ اور اہل الرائے حضرات کی خدمت میں شرکت کی دعوت بھیجے"، اب اس اجتماع کی کیفیت پر غور کیجئے کہ نہ تو اس اجتماع کو جلسۂ انتظامیہ نے بلایا ہے نہ اس کی تاریخ متعین کی ہے، اور نہ ملک کے تمام اہل الرائے حضرات کو دعوت دی گئی ہے، اس قانونی اعتراض پر سب دم بخود رہ گئے اس پر بعض مخالف ارکان نے کہا کہ بہتر ہے ہم

ابھی دوسرے کمرہ میں بیٹھ کر جلسۂ انتظامیہ کئے لیتے ہیں، اور اس کو جلسۂ خاص بنا ڈالتے ہیں، اس تجویز کے مطابق سب ارکان اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلے گئے، اور جلسۂ انتظامیہ کی کارروائی شروع ہوئی، مولانا نے پھر فرمایا یہ جلسہ گو ارکان کا ہے، مگر یہ جلسۂ انتظامیہ نہیں ہے، کیونکہ جلسۂ انتظامیہ کے لئے ضروری ہے کہ انعقاد سے پندرہ روز پہلے اس کی تحریری یادداشت تمام ارکان کے پاس بھیجدی جائے، اس اعتراض پر ایک سادہ دل مولوی صاحب (مولانا احمد علی صاحب محدث میرٹھی) نے کیا خوب فرمایا: "یہ قاعدہ تو ہم ہی ارکان نے حل کر بنایا ہے، اب ہم کہدیتے ہیں کہ یہ قاعدہ غلط ہے" اس پر بہت سے لوگوں کو ہنسی آگئی، اور یہ سارا اجتماع بے نیل مرام منتشر ہوگیا،

مولانا نے قانون کی جو تعلیم حاصل کی تھی، شاید تمام عمر میں اس موقع سے زیادہ اس نے کبھی ان کو فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا،

بالآخر اس باہمی کشاکش کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ کرنل عبدالمجید خاں بہادر فارن منسٹر پٹیالہ نے جو اس وقت ندوہ کے عربی خاص اور ندوہ کے بڑے محسن تھے اس طرف خاص طور پر توجہ کی اور ان کے سامنے ایک انتظامی جلسہ میں تمام لوگوں نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کر کے مصالحت کی، اور باہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے،

مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا معاملہ

اس مصالحت کے بعد کچھ عرصہ تک ندوۃ العلماء میں ہر قسم کا سکون رہا، لیکن شروع ۱۹۱۳ء میں ایک دوسرا ہنگامہ برپا ہوا، مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم نامی ایک بزرگ تھے جو سرحد کے رہنے والے تھے، پہلے حیدرآباد میں مدرس تھے، پھر مولانا مسیح الزمان خاں صاحب کے تعلق سے شاہجہاں پور کے مدرسۂ عین العلوم میں مدرس ہوئے

اور وہاں سے مولانا کے آخیر زمانہ میں خفیہ اوّل کے عہدہ پر دارالعلوم میں رکھے گئے، موصوف اچھے
خاصے طباع اور ذہین تھے، مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رُخ دوسری طرف تھا، وہ بہت جلد
دوسروں کے حلقۂ اثر میں آگئے، جنھوں نے اُن کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مدِمقابل بنا کر کھڑا
کیا، مولانا نے الندوہ کی اڈیٹری سے جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۰ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۱۲ء کے پرچہ کے بعد
جب استعفا دے دیا، تو نائب ناظم صاحب نے جلسۂ انتظامیہ کی منظوری کی اُمید پر انھی مولوی عبدالکریم
صاحب کو اس الندوہ کا اڈیٹر مقرر کر دیا، جس کی منظوری چند ماہ بعد ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۲ء کے جلسۂ انتظامیہ
میں ہوئی، اس وقت جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑا اشتعال تھا،
مولوی عبدالکریم صاحب نے اس موقع کی مناسبت سے اپنے پہلے ہی مرتبہ پرچہ میں جو سنہ ۱۹۱۲ء کے
آخر میں جون سنہ ۱۹۱۲ء کے مہینہ کا چھپا، جہاد کے فضائل و مناقب پر ایک طویل مضمون لکھ کر شائع
کیا، اس زمانہ میں لفظ جہاد کے نام کی جو ہیبت انگریزوں اور مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی اس کا
تصور بھی آج مشکل ہے، اور ندوہ ابھی ابھی ان سیاسی الزاموں سے حکومت کی نگاہ میں بری ثابت
ہوا تھا، اس مضمون کی اشاعت نے ندوہ کے کارکنوں کو گھبرا دیا، مولانا نے ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء
کو معتمدین اور مقامی ارکان کو بلا کر صورتِ حال پیش کی، سب کی متفقہ رائے سے وہ چند روز کے
لئے معطل کر دیے گئے، اور اس کارروائی کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دی گئی، یہ کارروائی اگرچہ تمام معتمدین
اور مقامی ارکان کے اتفاقِ رائے سے کی گئی تھی، لیکن مخالفین نے اخبارات میں جب شور و
غل کیا تو اُن میں سے متعدد ارکان نے اپنی برأت ظاہر کی، اور آخر چند دیگر ارکان نے جن میں

۱؎ مولوی عبدالکریم صاحب نے افسوس ہے کہ دارالعلوم کی مدرسی ہی کے زمانہ میں اپریل سنہ ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں [illegible] کر وفات پائی۔

مقامی وکلاء تھے، ۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک جلسۂ استفائیہ کر کے اس قانونی نقص کی بنا پر اُس کو فسخ کرایا کہ اس سے مسلم کو قانونی اختیار نہ معتمدین کو تھا اور نہ صرف مقامی ارکان کو لیکن اس کے بعد جب منشی احتشام علی صاحب وغیرہ کمشنر سے ملے تو اس کی خواہش یہ معلوم ہوئی کہ اوزیر کو کچھ نہ کچھ تنبیہ ضروری ہو، اس لئے انھوں نے ۱۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو ارکان کے نام خطوط جاری کئے، اور چھ مہینے کے لئے مولوی عبد الکریم صاحب کو باقاعدہ معطل کرایا لیکن اس پوری کارروائی کو بھی بعض لوگوں نے مولانا ہی کی طرف منسوب کر کے اُن کو بدنام کرنا چاہا، اور خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر مولوی وحید الدین صاحب سلیم نے ایک خاص غرض سے اس فتنہ کے بڑھانے میں بڑا حصہ لیا، حالانکہ مولانا کو اس دوسری کارروائی سے کوئی تعلق نہ تھا،

مولانا ایک خط میں جو ۱۲ مئی ۱۹۱۳ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں:- "لکھنؤ میں میرے مخالف پہلے سے تھے انھوں نے موقع پا کر اس قصہ کو طول دیا اور ایک جتھا بنا لیا ہے، جو مختلف اخباروں میں مضامین لکھتا ہے، یہ ایک باقاعدہ اور مسلسل کوشش ہو جو ...... وغیرہ کی طرف سے جاری ہو حیرت یہ ہے کہ میں نے اس معاملہ کو گورنمنٹ تک پہنچانے میں مطلق حصہ نہیں لیا، البتہ جب سب نے کہا تو میں نے بھی اتفاق کیا، اس پر یہ حال ہے کہ آپ الگ ہیں، نفاق کا یہ حال ہے کہ پبلک میں اپنی علٰحدگی دکھاتے ہیں، اور گورنمنٹ افسروں سے مل کر تمام کام انجام دیئے، مجھ کو خبر تک نہیں ہونے پائی، حکام سے ملنا، خط و کتابت کرنا، چھ مہینے کی معطلی کا ممبروں سے منظور کرانا، مجھ کو ذرہ بھر اس سے تعلق نہیں" (عبد الحکیم ۔۲)

ایک اور خط میں ۴ جون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:- "میرے خلاف چند خود غرضوں نے ندوۃ

کے معاملہ میں جو طوفان بپا کیا تھا نیچے سنا ہی ہوگا، لطف یہ کہ شرکت سب نے کی اور اب سب الگ ہیں،
اور لطف یہ کہ گورنمنٹ افسروں سے گورنمنٹ ہی کا پہلو ظاہر کرتے ہیں، اور سرخرو بنتے ہیں، مولوی عبدالکریم
کی چند روزہ معطلی جو میں نے کی اس کو زندہ کر کے منسوخ کرایا پھر . . . . . . وغیرہ چپکے خود کمشنر کے پاس
گئے، اور ان کی مرضی سے کہ مخفی خطوط ارکان کے نام جاری کئے، اور چھ مہینے کے لئے مولوی صاحب کو معطل
کرایا، اور پبلک کو اب تک دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم کو ان کی معطلی سے واسطہ نہیں، شبلی نے کیا جو کچھ
کیا، میرے پاس تمام اصلی اور مطبوعہ کاغذات ہیں، موقع ہوا تو دکھاؤں گا، ہز آنر نے جو خط بھیجا اس میں
لکھا ہے کہ ندوہ کے مضمون کو سخت شرارت انگیز خیال کرتے ہیں، مجھ کو یہ پہلے سے معلوم تھا کہ
گورنمنٹ ایسا خیال کرے گی، اگر ندوہ کی طرف سے خبر نہ لی جاتی تو گورنمنٹ خود مقدمہ قائم کرتی اور
نواب وقار الملک کی طرح[1] ہم لوگوں کو عدالت میں جا کر گواہی دینی پڑتی (۱ مئی ۱۵ء)

مولانا کے ان بیانات کی تصدیق کے لئے حاشیہ پر ندوہ کے ایک غیر مطبوعہ دفتری خط کی نقل
درج کی جاتی ہے، جو ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو مولانا اور دیگر ارکان کے نام لکھا گیا تھا، اور جس کا دفتری
نشان ۲۰۱۳/۴۴۴ ہے، اور جس پر مولانا سید عبدالحی صاحب اور مولانا خلیل الرحمان صاحب کے دستخط ہیں،
اس خط سے واقعہ کی پوری کیفیت معلوم ہو سکتی ہے[2]۔

---

[1] غالباً ۱۹۰۸ء میں مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے اپنے اردوئے معلی میں جس کو وہ علی گڑھ سے نکالتے تھے مصر کے متعلق ایک پرجوش مضمون شائع کیا تھا جس کو گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا اور گرفتار کر کے عدالت میں حاضر کئے گئے اور نواب وقار الملک شہادت میں پیش کئے گئے، سید حسرت موہانی صاحب اسی مقدمہ میں پہلی دفعہ قید ہوئے تھے۔ [2] یہ خط حسب ذیل ہے:-

از دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۰ مارچ ۱۹۱۳ء ۲۰۱۳/۴۴۴

ندوہ کے اس دفتری مراسلہ سے ثابت ہوگا کہ کن لوگوں نے اس کو حکومت تک پہنچایا،
اور کس طرح اُن کی کوشش سے یہ معطلی عمل میں آئی، اُن کی چند روزہ معطلی کے پہلے جلسہ میں مولانا عبدالباری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۶) مخدومی مکرمی جناب شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی دام لطفہٗ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جلسۂ انتظامی ۹ مارچ ۱۹۱۳ء نے یہ طے کیا کہ اس جلسہ کی رائے میں کل
کارروائی جلسۂ غیر معمولی ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء کی کارروائی معتمد صاحب دار العلوم بہ نسبت معطلی مولوی عبدالکریم صاحب
خلاف دستور العمل ندوۃ العلماء بغیر کسی اختیار کے عمل میں لائی گئی ہے، لہٰذا کالعدم سمجھی جائے۔
صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر لکھنؤ نے قبل جلسہ کے منشی احتشام علی صاحب کو بلا کر اپنی خواہش ظاہر کی تھی کہ مولوی
عبدالکریم صاحب کو بے موقع اشاعت مسئلہ جہاد کی وجہ سے چھ مہینے کے لئے معطل کیا جائے چنانچہ اس کا اظہار منشی
صاحب نے جلسہ میں کیا، اور لکھا بھی گیا، مگر جلسہ نے اس کی اشاعت کو بخیال ناگواری حکام منع کیا، اور بطور خود تجویز کر کے
یہ چاہا کہ اراکین سے مولوی صاحب کی بابتہ رائے طلب کریں کہ اس اشاعت کی بابتہ مولوی عبدالکریم صاحب
سے کچھ تدارک کیا جائے یا نہیں، اور کیا جائے تو کیا؟
جلسہ کے بعد احتیاطاً میں اور منشی محمد احتشام علی صاحب ۱۰ مارچ ۱۹۱۳ء کو ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے
ملے اور اس بارہ میں گفتگو کی تو صاحب نے فرمایا کہ ضرور ہمارا یہ منشا اور خواہش ہے کہ مولوی عبدالکریم صاحب کو صرف
چھ مہینے کے لئے معطل کیا جائے، اور پھر وہ بدستور اپنا کام کریں، اور ہماری اس خواہش کا اعلان کر سکتے ہو، اور مولوی
عبدالکریم صاحب کی سچائی کی ہم نے ہز آنر سے سفارش کی ہے، اور معتمد صاحب ان کے اوپر یہ وجہ نہ لکھنے الزام مشتہر کنندہ
پرچہ کے چل سکتا تھا نہیں چلایا، مگر اس قدر معطلی کا اس اشاعت کی بابتہ ضرور خیال ہے، اس کے بعد ہم کو اُن سے
اور ندوہ سے کچھ شکایت نہیں، وہ اپنا کام کریں۔
چونکہ جلسۂ انتظامی ۹ مارچ کو ہوچکا ہے فوراً دوسرا جلسہ طلب نہیں ہوسکتا، اور اس کا التوا جلسۂ ثانی تک باعث
بدظنی حکام ہوگا، اور احتمال نقصان کا ہے، اس لئے بموجب دفعہ ۵۰ دستور العمل دربارۂ معطلی مولوی عبدالکریم صاحب تحریری
رائے کا خواستگار ہوں کہ زیادہ ایک ہفتہ کے اپنی رائے سے مطلع فرمائیے، تاکہ کثرت تحریر رائے پر عمل کر سکوں، اور صاحب ڈپٹی کمشنر
بہادر کو اُن کی خواہش کے نتیجہ کی اطلاع دے سکوں۔ والسلام خلیل الرحمٰن، نائب ناظم ندوۃ العلماء۔ بقلم عبدالحی۔

زنگی محلی بھی بحیثیت رکنِ انتظامی شریک تھے، مگر بعض مقامی اخباروں کے شور وغل کے بعد انھوں نے ایک اخبار میں اپنی شہادت شائع کرائی، اور اپنی برأت ظاہر کی، اس کا جواب مولانا نے ۲۰ مئی سنہ ۱۹۱۳ء کے وکیل امرتسر میں چھپوا دیا، یہ تحریر اور دوسری تحریر جو مولانا سید عبدالحیٔ صاحب کے جواب میں ہے، مقالاتِ شبلی جلد سوم صفحہ ۱۰۵-۱۱۰، اور صفحہ ۱۳۱ پر چھپی ہوئی ہے،

دارالعلوم کی معتمدی سے استعفا

بہرحال مولانا ان ہنگاموں سے ایسے بددل ہوئے کہ انھوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہوجانے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفا دفتر میں بھیجدیا، اُن کے ساتھ اور معتمدین یعنی مولوی سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب بھی اپنی اپنی معتمدیوں سے مستعفی ہوگئے، بعض اور دوسرے ارکان نے بھی رکنیت سے استعفا دیدیا، اس کے بعد ۱۰، ۱۵، ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کے جلسہ انتظامیہ میں مولوی خلیل الرحمن صاحب مرحوم مستقل ناظم بنائے گئے، اور ندوہ کی عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں دیدی گئی، (شذرونی ۹، ۱۰) اور مولوی سید عبدالحیٔ صاحب اور منشی احتشام علی صاحب عہدوں کے لحاظ سے نائب ناظم مقرر کئے گئے،

نظامت کے عہدے کے لئے مولانا خلیل الرحمن صاحب مرحوم کا انتخاب اگرچہ دستور العمل کے قواعد اور مولانا کی مصلحت بینی کے بالکل خلاف تھا کیونکہ وہ مولانا کے نزدیک دارالعلوم کے اصلی نصب العین اور مقصد سے متفق نہ تھے، اور وہ اس کو پرانی قسم کی ایک عربی درسگاہ بنادینا چاہتے تھے، تاہم چونکہ مولانا صرف ندوۃ العلماء کی اصلاح اور بہبودی کے خواستگار تھے، اس لئے اس یکسوئی میں ان کو ندوۃ العلماء کے فوائد نظر آئے، اور وہ اس پر خوش ہوئے، چنانچہ ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۳ء کو

مجھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:- "باوجود قرابت کے چند باتیں خود بخود ضبط بھی نقل نہیں ہیں، ہیڈ ماسٹر
نے دوسری جگہ تعلق کر لیا، اور سردست چھ مہینے کی رخصت لی، پھر غالباً مستعفی ہو جائے گا، اس سے انگریزی
کا جو سخت نقصان تھا رفع ہو جائے گا، مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کے اختیارات وسیع ہوئے اور
. . . . . کے استعفا سے ہر ہر کام میں رکاوٹ جاتی رہی . . . . . متعصبوں کے ٹوٹ جانے
سے اتنا فائدہ ہوا کہ بہرحال قوت ایک جگہ ہو گئی، یہ دوسری بحث ہے کہ اس وقت انجمن خراب ہو، لیکن
کوئی کام کا آدمی منتخب ہو گا تو کام میں رکاوٹ نہ ہو گی، ورنہ متعصبین کا منشا بہت مشکل تھا۔" (سلیمان)

مولانا کے استعفیٰ کا اثر

مولانا کے استعفے کی خبر جب طلبہ کو معلوم ہوئی تو اُن کو سخت افسوس ہوا،
پہلے سب نے ایک جلسہ کر کے مولانا کو بمبئی پے در پے کئی تار بھیجے، جن میں اُن سے استعفے کی واپسی
کی پُر زور خواہش کی تھی، اور فرداً فرداً دوسرے طالب علموں نے بھی اسی قسم کے خطوط لکھے، اور
التجائیں کیں کہ وہ اپنے استعفے کو واپس لے کر اُن کو مرہونِ منت فرمائیں، لیکن مولانا نے عہدہ
کی ذمہ داری لینے سے بدستور انکار کیا، لیکن اس انکار کے باوجود یہ اقرار کیا کہ معمولی رکن کی حیثیت
سے اب بھی ان کی زندگی کا مقصد ندوہ ہی کی خدمت ہے، چنانچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو طلبائے ندوہ
کے نام حسب ذیل خط لکھا:- "عزیزانِ من! السلام علیکم، آپ لوگوں کے پُر اثر خطوط اور تار پے در پے
آئے ہیں، میں ایسا سنگدل نہ تھا کہ ان سے متاثر نہ ہوتا، لیکن موجودہ حالت میں کام کرنا ناممکن تھا، اور دار العلوم
کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا، مجھ کو اپنی تمام کوششوں اور جانفشانیوں کی داد گو میں نے بے غرض کچھ کی ہیں،
داد مل گئی، اور یہ میرا پورا صلہ ہے کہ جن کی خدمت کی گئی وہ اس کی قدر کرتے ہیں، آپ لوگ مایوس نہ ہوں،
لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں، عام اسلامی جماعت بیدار ہو گئی ہے، وہ اپنے ہر قسم کے فوائد کو سمجھے گی،

مکاتیب [illegible] جلد اول

اور اس کی نگہداشت کرے گی، ممکن ہے کہ کچھ دیر ہو، لیکن جو تخم زمین پر پڑ چکا ہے، وہ ان شاء اللہ برباد نہ جائیگا
ندوہ کیا چیز ہے؟ موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں مذہب کی حمایت، یہ احساس عام ہو چلا ہے، معارف
قرآنیہ[1] دہلی اسی رفتار کا ایک قدم ہے، ندوہ بھی اپنے اولیت کے نتائج حاصل کریگا، ولو بعد حین؛
باوجود استعفا میری زندگی کا مقصد ندوہ ہی رہے گا، اور آپ لوگوں کی خدمت نہ صرف دل
بلکہ ہاتھ سے بھی کرسکوں گا، وعلی اللہ التکلان۔" (مکاتیب اول)

پھر مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدرس اعلیٰ دارالعلوم اور حضرات مدرسین کے جواب میں یہ خط
لکھا: "آپ صاحبوں کی ہمدردی اور قدردانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن فرمائیے چارہ کیا ہے؟ پورے چار
برس گذرے، بجز اس کے کہ ہر کام میں میری مخالفت کی گئی، اور کیا ہوا، اس بنا پر میں ندوہ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا
ہوں، دو ایک برس بھی آزادی سے کوشش کرسکتا تو ندوہ کو کچھ ترقی دے سکتا؛
اس لئے یہی بہتر ہے کہ اور لوگ یکسوئی سے کام کریں، ممکن ہے کہ وہ مجھ سے اچھا کرسکیں، بہرحال میں
مدرسہ کا اور طلبہ کا ویسا ہی خدمت گذار ہوں گا، اب محبت اور ہمدردی کا تعلق بالکل بے لاگ ہوگا، یعنی
یعنی افسری کی ظاہری بے کارگی بھی نہ رہے گی، اور بچے دیکھیں گے کہ میں کیونکر ان کا برابر کا بھائی بنکر کام کرتا ہوں
۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا: "ندوہ سے تعلق منقطع ہوا تو ملال
ہے، لیکن یہ وہیں اگر فیصلہ ہوسکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو۔" (مسعود علی ۲)

---

[1] شاید سنہ ۱۹۱۳ء میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے اس نام سے ایک قرآنی درسگاہ کی بنیاد مسجد فتحپوری دہلی
میں ڈالی تھی جس کا مقصد سند یافتہ عربی طلبہ اور مسلمان گریجویٹوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا تھا۔
سنہ ۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی میں مولانا عبیداللہ صاحب وغیرہ نے جب ہندوستان کو چھوڑا تو یہ ادارہ بند ہوگیا۔

ملک کے مختلف گوشوں سے بھی استعفے کی واپسی کے لئے تحریکیں اٹھیں، مگر مولانا اپنی رائے پر جمے رہے

حیدرآباد کا سفر اور ماہانہ میں اضافہ

مولانا بمبئی سے نواب عماد الملک کی طلبی پر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے دوسرے ہفتہ میں (امین ۷، و ابو الکلام ۳۰) حیدرآباد روانہ ہوگئے، نواب صاحب اس وقت مولانا کی تحریک سے قرآن پاک کا جو انگریزی ترجمہ کر رہے تھے اس میں مولانا سے مشورے درکار تھے، یاد ہوگا کہ سرکار آصفیہ سے مولانا کے سو روپے ماہوار جب ۱۹۰۱ء میں مقرر ہوئے تھے تو اس فرمان میں آیندہ کے اضافہ کا اشارہ بھی تھا، مگر اب تک نہ مولانا نے خواہش کی اور نہ سرکار آصفیہ نے توجہ فرمائی، اس سفر میں نواب صاحب نے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی سرکار میں اضافہ کی تحریک کی تو اعلیحضرت نے مسرت ظاہر فرمائی، (عبدالماجد ۱) اور دو سو ماہوار کا اضافہ منظور فرمایا، اس اضافہ سے مولانا کو اپنے بہت سے پیش نظر علمی و قومی کاموں میں سہولت حاصل ہوگئی،

حیدرآباد میں اس دفعہ ان کو مکان بہت دلخواہ اور تفریح بخش مل گیا تھا، اس لئے وہ دو تین مہینے حیدرآباد میں ٹھہر گئے، اور سیرت کی پہلی جلد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہوگئے،

لکھنؤ کو واپسی

آخر ہم سب لوگوں کے بڑے تقاضے سے ۸ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ کا قصد کیا (سلیمان ۱۱۴) اس اثنا میں میں الہلال کلکتہ سے الگ ہوکر پٹنہ میں ٹھہرا ہوا تھا، مولانا کے لکھنؤ کی آمد کی خبر سنکر میں بھی حاضر خدمت ہوا، اور چند ہی روز کے بعد مجھے دکن کالج پونہ کی ایک خدمت پر روانہ کیا، اور خود لکھنؤ میں قیام فرمایا،

طلبۂ دارالعلوم سے بدستور تعلق

طلبہ نے ان کے آنے پر ایک جلسہ کیا، جلسہ میں انھوں نے اپنی تقریر

پہلے طالب علموں سے مخاطب ہو کر بڑی حسرت سے اپنا یہ قطعہ پڑھا جس کو وہ عید کہنا چاہتے

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے ۔ یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا

اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں ۔ جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

درس بخاری کو روکنا

دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انھیں بخاری شریف کا درس دیں، مولانا نے اس کو قبول کیا، اور ہر روز مغرب کے بعد درس شروع ہو گیا، اور بہت سے لڑکوں نے اس میں شرکت کی لیکن ناظم صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا انھوں نے جناب مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی سے جو مہتمم و مدرس اعلیٰ تھے، خواہش کی کہ وہ طلبہ کو اس سے روکیں، مفتی صاحب نے اس میں تامل کیا، اور اس کا تذکرہ مولانا سے کیا، انھوں نے فرمایا کہ وہ آپ کو تحریری حکم بھیجدیں تو آپ اس پر عمل کیجئے، لیکن جناب ناظم صاحب نے اس ناگوار فرض کی انجام دہی سے پہلوتہی کی، اور مفتی صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے قلم سے حکم لکھیں، انھوں نے یہ کیا کہ بہ تخصیص بخاری کے درس کے روکنے کے بجائے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی، اس کا اثر طلبہ پر بہت برا پڑا، بہت سے طلبہ خارج اوقات میں دوسروں سے اپنے اسباق کی کمی کو پورا کرتے تھے، وہ سب بند ہو گئے،

میلاد میں مولانا کی تقریر کو روکنا

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ دار العلوم کے طلبہ ہر سال کسی نہ کسی تاریخ میں دھوم دھام سے بیان سیرت کی مجلس کرتے تھے جس میں تمام اہل شہر مدعو ہوتے تھے، اور مولانا عموماً سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی مفید و موثر تقریر فرماتے تھے، اس سال بھی اس مجلس کا اہتمام شروع ہوا، اور خیال تھا کہ طلبہ مولانا سے تقریر کی درخواست کریں گے، اس لئے

پہلے اس مجلس ہی کو روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن پھر بعد کو عام بدنامی کے ڈر سے مجبوراً چند شرطوں اور قیدوں کے ساتھ اس کی منظوری دیدی گئی،

اسٹرائیک اس کے بعد اور واقعات پیش آئے جو طلبہ میں ہیجان کا باعث بنتے گئے جن میں سے ایک طلبہ کو سیاسی جلسوں میں شرکت سے عملاً باز رکھنا بھی تھا، آخر مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا کی ہر قسم کی خواہش کے باوجود طلبہ نے اسٹرائک کا عام اعلان کردیا، اور چونکہ طرابلس و بلقان کی جنگوں اور کانپور کے ہنگاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پُرجوش مطالبوں کے باعث طبائع میں عام طور سے بےچینی تھی، اس لئے اسٹرائیک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلہ کی طرح پھیل گئی، زمیندار، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانہ کے مشہور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پُرزور مضامین لکھ رہے تھے، وقت کی سیاسی بےچینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کردیا تھا، ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام، محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخ طریقت مولانا شبلی تھے۔ دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا جنہیں اُس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے، احرار کا طبقہ ہر طرح طلبہ کی ہمدردی و حوصلہ افزائی کررہا تھا، اور دوسرا طبقہ ندوہ کے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا، مدارس کی عام ذہنیت اور کارکنان مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڈھ کالج کے ارباب اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے، اور یہ تصادم ملک کے طول و عرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم رہا۔

مولوی مسعود علی ندوی اور طلباے قدیم

اسٹرائک کے اعلان کے ساتھ بعض اُن قدیم طلبہ نے جو لکھنؤ میں رہتے تھے مناسب سمجھا کہ طلباے قدیم کی ایک مجلس کی بنیاد ڈال کر اس اسٹرائک کی رہنمائی کریں، اس مجلس کے پہلے ناظم مولوی مسعود علی صاحب ندوی منتخب ہوے، مولوی صاحب موصوف کی عملی قابلیت کا غیر معمولی اظہار اسی اسٹرائک کی رہنمائی کے دوران میں ہوا، انھوں نے بڑی قوت اور قابلیت سے طلبہ کی اسٹرائک کو پورے زور شور سے اس خوبی سے جاری رکھا کہ تمام ملک دنگ رہ گیا، ایک طرف تو سے زائد طلبہ کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام اُن کو قابو میں رکھنا، ان میں بددلی نہ پیدا ہونے دینا، اور ساتھ ہی اُن کے پڑھنے کے لئے مدرسین کا فراہم کرنا، اور دوسری طرف تمام ملک میں اخبارات، رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعہ سے رائے عامہ کو ابھارتے رہنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں،

اصلاحِ ندوہ کی کوشش

مولانا نے استعفا دینے کے ساتھ اپنے ہمدرد احباب اور شاگردوں کو ندوہ کے علاج سے مایوس ہونے کے بجاے اصلاحِ ندوہ کی تجویزوں کی طرف متوجہ کیا تھا، دوستوں میں سے خصوصیت کے ساتھ نواب سید علی حسن خاں، مولانا ابوالکلام اور شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور خاکسار کو متعدد خطوط لکھے[1]، اور ان کو ندوہ کی اصلاح کے لئے آمادہ کیا، ان ہی میں سے بعض خطوط کو ڈاک سے اُڑا کر دفترِ نظامت نے ۲۶-۲۷-۲۸ مارچ سنہ ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور اخباروں میں شائع کرایا، اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ مدرسہ میں یہ اسٹرائک اُن کی سازش سے ہوئی ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا لیکن جہاں تک اصلاح کا تعلق

---

[1] یہ خطوط اب بھی نواب صاحب، مولوی ابوالکلام صاحب، مولوی مسعود علی صاحب اور میرے نام کے مکاتیبِ شبلی میں چھپے ہوے موجود ہیں،

بزرگوں نے علی الاعلان اعتراف کیا کہ بے شبہہ یہ میری تحریک ہے، اور لوگوں سے میری یہ استدعا ہے کہ وہ ندوہ کی اصلاح کے لئے فوراً کھڑے ہو جائیں۔[1]

مجلس اصلاح ندوہ کا قیام

ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا، اور مختلف شہروں میں ندوہ کے کارکن اصحاب کے خلاف احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، آخر ندوہ کے ارکان میں سے ان لوگوں نے جو اصلاح کے حامی تھے اور جن کی تعداد دو تہائی کے قریب تھی متفق ہو کر اپریل ۱۹۱۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں مجلس اصلاح ندوہ کی بنیاد ڈالی۔ نواب سید علی حسن خاں مرحوم اس مجلس کے ناظم، اور مولوی نظام الدین حسن صاحب سابق منصب دار بھوپال وحیدرآباد صدر قرار پائے اور بہت سے حضرات نے اس کی ممبری قبول کی، اور تمام ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں، بلکہ قصبات و دیہات میں تقریباً پچاس جلسے مطالبۂ اصلاح کی تائید میں منعقد ہوئے

[1] یہ تمام واقعات مولانا کے اس مضمون میں مذکور ہیں جو "اسٹرائک کا سبب کون تھا؟" کے عنوان سے ہمدرد دہلی مورخہ ۵ اپریل ۱۹۱۳ء میں چھپا تھا، اور اب مقالات شبلی جلد ہشتم کے ص ۱۲۲ پر چھپا ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کے ایک خط نے بڑا ہنگامہ برپا کر دیا، انھوں نے ۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ "اب خاموشی کا وقت نہیں، مختلف مقاموں میں جہاں جہاں آپ کا اثر ہو اظہار افسوس اور ندوہ کے موجودہ نظام سے بے اطمینانی کے جلسے کرائیے، سرکشی اور اسٹرائک کا وقت اب آیا ہے" اس کے آخر میں لکھا تھا کہ "اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو، یہ مولانا کا حکم ہے" یہ خط بھی دفتر نظامت نے ڈاک سے اڑا لیا، اور بعد کو اسٹرائک کے بعد اس کو پبلک میں شائع کیا، مولانا نے اس خط کے متعلق بہ حلف اپنے مضمون میں لکھا کہ "نہ یہ خط میرے ایما سے لکھا گیا ہے، نہ میں نے اس کو دیکھا ہے، اور نہ میں اس کو اب بھی جائز سمجھتا ہوں" مولوی عبدالسلام صاحب نے اس خط کو اپنا قبول کیا، مگر یہ لکھا کہ میں نے مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مضطرب ہو کر لکھا، اور مولانا کی طرف اس لئے نسبت کی کہ طلبہ میں اس تحریک کی اہمیت بڑھ جائے، مگر یہ خط نہ مکتوب الیہ کو ملا اور نہ طلبہ تک پہنچا اور نہ وہ اس اسٹرائک کا سبب بنا۔

اصلاح ندوہ اور مولانا ابوالکلام

اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا، انھوں نے اصلاح پسندوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی، اور ہر طرف ندوہ ندوہ کا شور برپا ہوگیا،

حکیم اجمل خاں مرحوم

یہ حالت تھی جب حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنی مسیحا نفسی کا ثبوت دیا، انھوں نے بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کی اہمیت کو سمجھ کر تمام ملک کے اہل الرائے حضرات کو دہلی میں ایک مشورہ کی مجلس میں شرکت کی دعوت دی جو ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو وہاں ہونی قرار پائی،

مجلس اصلاح ندوہ کا اجلاس عام دہلی میں

مولانا کا قیام دہلی میں حکیم صاحب ہی کے مکان پر تھا، ہر روز اصلاح حال کے جلسے اور مشورے ہوتے رہتے تھے، مختلف ہمدرد اصحاب آتے اور معاملہ کی یکسوئی کی رائیں پیش کرتے تھے، ۲۹ راپریل ۱۹۱۳ء کو مولانا دہلی سے نواب علی حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں:- "مقامی کمیٹی جلسہ کے انتظام میں مصروف ہو، باہر سے بہت سے لوگ آتے نظر آتے ہیں، خطوط آرہے ہیں، مولوی خلیل الرحمان صاحب، منشی سخاوت علی، نواب وقار الملک، مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے مواجہہ میں مختلف جلسے معاملات کے طے ہونے کے ہوئے، اگرچہ میں شریک نہ تھا، اب تک جو امور طے ہوئے، بظاہر قابل اطمینان ہیں، دیکھئے اگر اخیر تک قائم رہ جائیں، ایک خاص امر میں زیادہ بحث ہے، اور وہ ۱۰ رمئی کے جلسہ کا انعقاد ہے، بہرحال دو ایک دن میں آخری نتیجہ معلوم ہو اور مطلع کروں گا، کوئی امر بغیر آپ کی اصلاحی کمیٹی کی منظوری کے طے نہ کیا جائے گا، ابھی تک مسودہ ہے۔" (نواب علی حسن خاں ۹۰)

محمد علی مرحوم ابھی تک پوری مستعدی سے اصلاحی کمیٹی میں شرکت نہیں کر رہے تھے، اُن کا خیال تھا کہ جب تک اصلاح کی تمام دوسری صورتیں ناکام نہ ہو جائیں، ۱۱ مئی کی کانفرنس کو ملتوی کرنا چاہئے، ۱۰ اپریل کے ہمدرد میں انھوں نے اپنے اس خیال کو پھیلا کر لکھا، مولانا نے ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کے ہمدرد میں ان کو جواب دیا، جس میں پہلے ان کی مخلصانہ کوشش کا اعتراف کیا، پھر لکھا کہ اب تک میں نے اور میرے ہمدرد ارکان نے مصالحانہ اصلاح کی کیا کیا کوششیں کیں، اور وہ ناکام رہیں، اور اب بجز مسلمانوں کی ایک عام کانفرنس کے کوئی دوسرا علاج باقی نہیں[1]

غرض، ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کی اصلاحی کانفرنس کی تاریخ قائم رہی۔

مولانا کی تکفیر

مخالفین نے اس اصلاحی تحریک کو ناکام کرنے کے لئے جو آخری ہتھیار اٹھایا وہ مولانا کی تکفیر کا فتویٰ تھا، دلّی میں مخالف ارکان و علماء کا مرکز مولانا عبد الحق صاحب حقانی کا مکان تھا، کہتے ہیں کہ اُن ہی کے مشورہ سے بعض علماء نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر تکفیر کا یہ فتویٰ مرتب کیا، جس میں اُن پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ قدم مادہ کے قائل ہیں، اور نبوت کو کسبی سمجھتے ہیں، یہ فتویٰ ملک میں شائع ہوا، اور اشتہار کے طور پر مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا[2]، اس موقع پر سید عبد السلام صاحب مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا کی خدمت میں ایک استفسار پیش کیا، جس میں یہ پوچھا تھا کہ کیا آپ مادۂ عالم کو قدیم اور نبوت کو کسبی سمجھتے ہیں؟ مولانا نے اس کے جواب میں پہلے ایک مفصل بیان لکھا کہ میں مادۂ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفاتِ الٰہی کے قدم کا قائل ہوں، اور اسی طرح نبوت کو کسبی بھی نہیں جانتا، بلکہ اس کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں، سید عبد السلام صاحب نے کہا کہ یہ تحریر فلسفی ہے، اور عوام اس کو سمجھ نہیں سکتے، مولانا نے

[1] یہ مضمون مقالاتِ شبلی جلد ہشتم میں ہے۔
[2] مکاتیب شبلی اول ۱۲۷ [partly illegible]

اسی مطلب کی ایک دوسری مختصر تحریر لکھدی، میں اس وقت پاس بیٹھا تھا، میں نے مولانا کے ہاتھ کی
وہ دونوں تحریریں اپنے پاس رکھ لیں (جو انشاء اللہ کسی موقع پر پیش ہوں گی) اور دوسری تحریر کی
نقل سید صاحب کے حوالہ کی جو عام طور سے شائع کی گئی جس سے اس فتنہ کا سارا تار و پود بکھر گیا،

دلی کی اصلاحی کانفرنس، محمد علی مرحوم اور اسٹرائک کا خاتمہ

بہرحال ۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کو دلّی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت
میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا
ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دلجمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا،
اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے، اور ہر طرف سے موافق و مخالف سمٹ کر
میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی روداد سنائیں، اور
تجویزیں پیش کیں، اس سلسلہ کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ محمد علی مرحوم جو حزب ندوہ کے دو مضبوط
دست و بازو تھے وہ ابھی تک گومگو میں تھے، اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے، میں اور
مولوی مسعود علی صاحب ان سے کئی دفعہ ملے، اور ان کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لئے آمادہ
کیا، انھوں نے کہا جب تک طلبہ اسٹرائک نہ ختم کردیں میں ان کی حمایت نہیں کرسکتا، ہم دونوں نے
کہا، اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمہ داری قبول کرلیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائک ختم کردیں گے
یہ سن کر وہ خوش ہوئے، کیونکہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لئے کوشش کرکے ناکام ہوچکے
تھے، غرض اسی وقت ہم نے اور انھوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام
جواب آیا، کہ ہم بخوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں، اور آپ کے حسب
مشورہ اسٹرائک کو ختم کرتے ہیں، یہ یہی خوشخبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑے،

اور فوراً تار لئے ہوئے جلسہ میں آئے، اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیا،

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنا دیا وہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحبزادہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہہ اُٹھے کہ "اگر استبداد مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو" آخر صاحبزادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے، اور ایسی گرم اور پُر زور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں ہل گئیں، اس سلسلہ میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں[1]۔

اصلاحی سب کمیٹی | بہرحال ان گرما گرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرت رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں، اور ایک سب کمیٹی بنی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لئے ایک ایسا نیا دستورالعمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، اس دستورالعمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا پیرزادہ محمد حسین (ریٹائرڈ سشن جج دہلی) کے سپرد ہوا، اور حکیم صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خاں مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے۔

---

[1] روداد جلسۂ عام انجمن اصلاح منعقدہ دہلی بتاریخ ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء۔

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیش نظر رکھے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں، اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آئندہ کسی کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے، غرض یہ قرار پایا کہ ۳۰ مئی کو ایک جلسہ بلایا جائے جس میں تمام ارکان جمع ہوں، اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کر دیا جائے کہ بار بار اجتماع کی ضرورت پیش نہ آئے، ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو بہ مقام جلسہ تجویز کیا گیا[1]، اور مجلس اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی، اس تجویز کے مطابق ۳۰ مئی کو ایک جلسہ ہوا، اور آئندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئیں، اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستور العمل بنایا جس کو مجلس اصلاح نے چھاپ کر شائع کیا،

مولانا بمبئی میں مولانا نے اس اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں پورا اپریل، مئی اور جون کا ایک حصہ دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے، اور سیرۃ النبی جلد اوّل کی تکمیل میں مصروف ہوئے، اور ساتھ ہی دار المصنفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے، اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستور العمل کے نقائص، اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستور العمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں،

علی گڈھ کانفرنس کا کمیشن چونکہ اس شورش کے زمانہ میں حیدرآباد کے سوا دوسری ریاستوں نے دار العلوم کی ماہانہ و سالانہ امدادیں روک دی تھیں، اور گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم نے بھی سخت اعتراضات کئے تھے، اس لئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز پیش کی جو موجودہ منتظمین کے موافق ایسا

[1] مکاتیب شبلی بنام نواب علی حسن خاں

معاینہ لکھے جس کو دو سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کر کے مسدود امدادوں کو دوبارہ جاری کرا سکیں،
چنانچہ اس تجویز کے مطابق کانفرنس کے کچھ اہل کار دار العلوم کے معاینہ کے لئے تشریف لائے اور منتظمین
نے اس ننگ کو گوارا کر لیا، مولانا گو الگ ہو چکے تھے، مگر ان کی خوددار طبیعت کو ندوہ کی اس پستی
سے ٹھیس لگی، اور آنسو کے چند قطرے شعروں کی صورت میں نکل گئے، اس سلسلہ کی پہلی نظم یہ ہے:
جس میں ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کے اجلاسِ دہلی میں علی گڈھ پارٹی کے طرزِ عمل کی تشریح ہے۔

کیا لطف ہو کہ حامیِ ندوہ ہیں اب وہ لوگ — جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ غریب — اک بیہودہ خیال تھا یا اک خواب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز — اعلانِ جنگِ "سیدِ" عالی جناب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ حقیر — تعلیمِ مغربی کے لئے سدِ باب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں ندوہ کا یہ طلسم — سرتا قدم فریب دہِ شیخ و شاب تھا

ندوہ کا نام سن کے جو کھاتے تھے پیچ و تاب — جن کے لئے وہ موجبِ رنج و عذاب تھا

حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی میں یہ گروہ — ندوہ کے "حل و عقد" کا نائب مناب تھا

ندوہ پہ حرف گیر جو ہوتا تھا کوئی شخص — وہ اس گروہِ پاک کا وقفِ عتاب تھا

ندوہ میں کوئی نقص بتاتا اگر کوئی — ان کی طرف سے ایک کا سو سو جواب تھا

سیارگانِ چرخِ علی گڈھ تھے پیش پیش — جن میں کوئی قمر تھا کوئی "آفتاب" تھا

حیرت میں تھے تمام تماشائیانِ بزم — یعنی یہ کیا طلسم تھا؟ کیا انقلاب تھا؟

ندوہ کہاں؟ کہاں وہ علیگڈھ کی انجمن — اس بزمِ قدس میں یہ کہاں باریاب تھا

کس دن کی دوستی ہو، یہ کب کا ہو ارتباط | یوں کب وہ موردِ کرمِ بے حساب تھا
شایانِ آفریں ہے وہی ندوۂ غریب | جو مدتوں سے موردِ خشم و عتاب تھا
سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ | جس کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا
بغضِ معاویہ ہے، یہ حُبِ علی نہیں | اک ایک کی زبان پہ یہ فصل الخطاب تھا
یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے | جو کچھ بیاں ہوا وہ آغازِ باب تھا

خاص اس کمیشن کے سلسلہ میں دوسری نظم ارشاد فرمائی،

آتا ہے اب سفینۂ ندوہ کا مشن | جو افتراقِ مجمعِ حکمت شعار ہے
جن میں ہیں کچھ شریکِ مزاجِ قدیم بھی | کچھ ابتدا سے بانیِ آغازِ کار ہے
جن میں ہے کوئی محرمِ راز کا شریک | مضمونِ انقلاب کا مضمون نگار ہے
خود گو نہ وہ گروہ، خودی کو بھی ہو وہی | جو صلح جو وہی روش کا رازدار ہے
کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم | جو مدعیِ بہتریِ روزگار ہے
جو داعیۂ امید ہے نسلِ جدید کا | جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پہ یہ حسنِ ظن ہے کہ ہو ذی کرام | جس کا گروہ مشرق و مغرب پہ یک وقار ہے
آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب[1] | جس کا مرقعِ ادبی "المنار" ہے
چھوتے ہیں جس کے نقشِ قدم پر حریف بھی | گو اعترافِ حق سے بھی ان کو عار ہے
جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج | جو فنِ جرح و نقد کا آموزگار ہے

[1] سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر۔

جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم | یہ انقلاب گردشِ لیل و نہار ہے
آتے ہیں اُنکی جانچ کو نا آشنائے فن | جو رہبر طریقۂ اصلاح کار ہے
تعلیم شرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض | ندوہ اب اُن کا نازکش اقتدار ہے
ارباب ریش وجبۂ اقدس کا وہ گروہ | اب چند فتنیوں کا اطاعت گذار ہے
یہ داستانِ درد، یہ افسانۂ الم | ندوہ کا نوحۂ غمِ احتضار ہے

بہرحال یہ کمیشن آیا، اور اس نے دارالعلوم کا معاینہ کیا، اور رپورٹ تیار کی جو گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم اور ریاستوں میں بھیجی گئی،

مصالحت کے لئے مولانا کی آخری کوشش

ہوا، جون ۱۹۱۴ء کو ندوہ کا جلسۂ انتظامیہ ہونا طے ہوا، اور اس کا ایجنڈا رکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجا گیا، اس میں غالباً دہلی کی اصلاحی کانفرنس کی مخالفت کی طرف بھی کوئی اشارہ تھا، اس پر مولانا نے ۵ مئی ۱۹۱۴ء کو اس کے جواب میں بمبئی سے ایک مفصل تحریر لکھ کر بھیجی، اور مصالحت کی تجویز پیش کی، خوش قسمتی سے اتفاقاً مجھے یہ تحریر دفتر ندوہ کے پرانے کاغذات میں اس وقت مل گئی گو نیچے سے اس کی ایک دو سطریں پھٹ کر الگ ہو گئی ہیں، تاہم مطلب کی بات اس میں سب کچھ موجود ہے :-

"جناب من! السلام علیکم - جلسۂ انتظامیہ مورخہ ۔ رجون ۱۹۱۴ء کا ایجنڈا پہنچا، اس زمانہ میں غالباً میں ان اطراف میں نہ ہوں گا، میری صحت اب اس کی مقتضی نہیں کہ میں سیرت نبوی کے سوا زیادہ تر اور کسی طرف متوجہ ہو سکوں، بعض ضروری امور گذارش ہیں،

(۱) جلسۂ دہلی کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا منشا ارکانِ ندوہ کی توہین یا شکست نہ تھی، بلکہ صرف

یہ تھی کہ چونکہ تین چار دفعہ خود ندوہ کے مختلف اور متعدد ارکان کی طرف سے اصلاح کی کوشش ہو چکی مولوی عبدالباری صاحب[1] اور میرزا ظفر اللہ خاں[2] صاحب کے خطوط مطبوعہ اور یادداشت مطبوعہ سب کے پیش نظر ہیں باوجود اس کے کوئی توجہ۔۔۔ اس لئے بعض لوگوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہ مسئلہ پوری قوم کے سامنے لایا جائے، لیکن بعض لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ (اس کا مقصد) کسی شخص کو معتمد یا ناظم بنانا ہے، یا موجودہ کارکن صاحب کو برطرف کرنا ہے، اس لئے نہایت فریق بندانہ جوش پیدا ہوا لیکن جلسہ میں ایک حرف ان امور کے متعلق نہیں کہا گیا، صرف چند اصحاب منتخب ہوئے کہ دستور العمل کے اصلی نقائص اور اس کی عدم پابندی کے متعلق اصلاحی اسکیم مرتب کریں، یہ اسکیم غالباً خود ارکان ندوہ کے سامنے پیش ہوگی، اس بنا پر جلسۂ دہلی کی کارروائی کے ساتھ مخالفت کی بظاہر وجہ نہیں معلوم ہوتی،

سچ تو یہ ہے کہ ندوہ اب بالکل نئے سرے باقاعدہ ہونے کا محتاج ہے،

(۲) مولوی عبداللہ صاحب[3] کی رپورٹ متعلق اسٹرائک دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کی شہادت صرف خدائے عالم الغیب پر محول ہے، مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبق رو کنے پر اپنی مجبوری بیان کی، اور کہا کہ میں کیا کروں ناظم صاحب سے متعدد دفعہ نماز کے اوقات میں مسجد میں ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہر دفعہ مجھ سے کہتے ہیں کہ بخاری پڑھنے والے لڑکوں کو خارج کر دیا یا نہیں، لیکن اب تک میں نے نہیں خارج کیا، میں نے کہا

---

[1] مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم [2] میرزا ظفر اللہ خاں صاحب ڈسٹرکٹ جج سیالکوٹ پنجاب،
[3] مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی مدرس اول دارالعلوم نے اسٹرائک کے متعلق ایک یادداشت لکھ کر موجودہ ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی جس کو انھوں نے چھاپ کر تمام ارکان کے پاس بھیجا تھا، اس میں انھوں نے اسٹرائک کے ان اسباب کی تردید کی تھی جو عام طور سے طلبہ نے اپنی شہادت میں بتائے تھے،

کہ آپ ان سے حکم لکھوا لیجئے، اس پر فرمایا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں، آئیں گے تو میں لکھواؤں گا، نیز یہ بھی کہا کہ اُن کے واپس آنے تک لڑکے اگر بخاری پڑھیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا،

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟

باقی قانونی حیثیت سے تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ مدرسہ جب سے قائم ہے، لڑکے باہر اساتذہ وغیرہ سے پڑھتے تھے، خود اس زمانہ میں جب یہ واقعہ پیش آیا، بہت سے لڑکے اور اسباق .... مثلاً خلیل صاحب (شیخ محبوب صاحب کے فرزند) سے .... کیں۔

بخاری شریف کے سبق کے متعلق چونکہ مولانا نے براہ راست مجھ کو مخاطب کیا ہے، اس لئے چند سطریں لکھی ہیں۔

(۳) اسی رپورٹ میں میرے دارالاقامہ کے تعلق کا بھی ذکر ہے، اس کے متعلق کوئی شکایت ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، لیکن دارالاقامہ میری نگرانی میں کبھی براہ راست نہیں رہا، جو مہتمم ہوتا تھا اسی سے اس کا تعلق رہتا تھا،

یہ امور ضابطہ کی حیثیت سے لکھے گئے،

خاص طور پر میری یہ گذارش ہے کہ بجائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، مسلمانوں کے مصالح کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم ان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجئے، جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کریں، پھر وہ جب انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجئے کہ جھگڑا کس سے شروع ہوا کیونکہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے،

ایسے اشخاص نمونۃً موجود ہیں جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔"

ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لئے اشخاصِ ذیل موزوں ہیں۔

ڈاکٹر فخرالدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سبحانی (کانپور)

مولوی سید سلیمان، پٹنہ - دکن۔

(شبلی ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء)

آخری مصالحت ۱۹۱۵ء

مولانا نے مصالحت کی جو تجویز اس وقت پیش کی تھی، وہ بدستور ناقابل قبول ٹھہری، لیکن کیا عجیب بات ہے کہ اس کے چھ مہینے کے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا نے وفات پائی تو ناممکن، ممکن، اور ناقابلِ قبول، قابلِ قبول ہوگیا۔ حادثۂ وفات کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی، اس موقع پر ۲۰ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفترِ نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آپہنچا تھا، اس لئے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا، اور مولانا ابوالکلام اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکانِ ندوہ نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا، اور یہ طے کیا کہ دس آدمیوں کی ایک مشترک مجلس ۲۰ مارچ کی شام کو منعقد ہو، اس میں پانچ ندوہ کے موجودہ ارکان، اور پانچ مجلس اصلاحِ ندوہ کے ارکان شریک ہو کر کثرتِ رائے سے تمام اختلافی معاملات کا تصفیہ کردیں۔ چنانچہ انجمن اصلاح کی جانب سے، حاذق الملک حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا ابوالکلام صاحب،

ابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج
ہائیکورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب، اور موجودہ ارکان ندوہ کی طرف سے
مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب وکیل
لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے،
یہ اصحاب ۱۰ مارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے، اور تمام امور پر نہایت
ہمدردی سے غور و فکر کیا، اور حسب ذیل امور اتفاق کامل سے منظور کئے۔

(۱) ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح و ترمیم۔

(۲) مسئلہ نظامت کا تصفیہ، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا، اور
ان کی جگہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا، جسکو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا

(۳) معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا۔

(۴) دارالعلوم کے طلباء قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوہ کا ممبر بنانا قبول کیا گیا۔

اس تصفیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے ضروری اجلاس میں شرکت
کے لئے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے، جہاں سے وہ ۵ اپریل کو واپس آکر ندوہ کے آخری سالانہ اجلاس
میں شریک ہوئے، اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسہ میں تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان
کیا، اور دونوں فریق نے اتحاد و اتفاق کے اس پُرمسرت منظر پر خوشی ظاہر کی، لیکن اس خوشی و شادمانی
کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لئے مجمع
میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح کس قدر شاد ہوئی ہوگی"

بھائی کی وفات

اور
وطن کی طرف بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم مولانا کے بعد اس وقت سب بھائیوں میں بڑے تھے، الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور کامیاب وکیل تھے، نہایت سنجیدہ، متین، کم سخن، بلند ہمت، مستقل مزاج، اور بہت صاحب رائے اور باتدبیر تھے، مولانا کو شیخ صاحب مرحوم یعنی اپنے والد کے قرضہ کے ادا ہونے کے بعد سے گھر کے معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا، گھر کی زمینداری، تحصیل وصول، مقدمات، اور دوسرے خانگی کاروبار کی دیکھ بھال یہی منجھلے بھائی مولوی سمیع اللہ صاحب مرحوم کیا کرتے تھے، اور جب سے مسلمانوں میں پالٹکس کا انقلاب پیدا ہوا تھا، وہ پالٹکس میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے، منٹو مارلے اسکیم کے زمانہ میں وہ یوپی کے ان بڑھتے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے جو الہ آباد میں رائے عامہ کی نمائندگی کر رہے تھے، سر علی امام جو اس سال (۱۹۰۸ء) کی مسلم لیگ امرتسر کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسلم لیڈر ہو رہے تھے، اسی اسکیم کے زمانہ میں انھوں نے جب اپنی رائے مخلوط انتخاب کی ایک خاص شکل کی حمایت میں ظاہر کی تو یوپی میں ان کے خلاف جو تحریک اٹھی

لے عام مسلمان جداگانہ انتخاب پر مصر تھے، سر علی امام نے یہ پیش کیا کہ کچھ مسلمان صرف جداگانہ انتخاب سے اور کچھ مخلوط انتخاب سے منتخب

اس کے رہبروں میں مولوی اسحاق صاحب مرحوم سب سے آگے تھے یہاں تک کہ سرعلی امام پر ملامت کا ووٹ تک الہ آباد میں پاس کرا لیا گیا،

مولانا نے اپنی برادری اور ضلع میں جو تعلیمی کام چھیڑ رکھے تھے، ان دنوں ان کی نگرانی بھی مولوی اسحاق صاحب ہی کرتے تھے، ایک تعلیمی کمیٹی بھی ضلع میں قائم کی تھی، اور اب اسی کے ماتحت شبلی نیشنل اسکول جو اتنے دنوں کی غفلت میں جا کر مڈل اسکول بن چکا تھا، اس کو محمدن شبلی اسکول کا نام دے کر اس کی اصلاح و ترقی کی تجویز بھی ان کے زیر غور تھی، اور عنقریب اس کام کے لئے وہ اعظم گڑھ میں آکر ضلع کا دورہ کرنے والے تھے، ساتھ ہی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھی پیش نظر تھا،

جولائی ۱۹۱۳ء کا اخیر تھا، مولانا بمبئی ہی میں تھے، ۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو قرآن پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ڈھائی سو میں بمبئی ہی میں خریدا تھا اس کی خوشی میں تھے، (شروانی ۱۱۶) اور ہمہ تن سیرت نبوی کی جلد اول کی تکمیل میں مصروف تھے، چنانچہ ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء کو اپنی مصروفیت کا حال ان لفظوں میں لکھتے ہیں: "سیرت کے تمام کے لئے بمبئی کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لئے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول بہ ہمہ جہت تمام کرکے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے، اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں" (شروانی ۱۱۸)

ان کا خیال تھا کہ وہ رمضان بھر وہیں رہیں گے، اور تکمیل کے طلبہ کو وہیں بلوائیں گے، (عبد الحکیم، مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۳ء) وہ ان ہی منصوبوں میں تھے کہ دفعۃً الہ آباد سے بھائی کی سخت علالت کی اطلاع آئی، یہ خبر سنتے ہی وہ فوراً الہ آباد روانہ ہو گئے، علالت ایسی سخت اور پیچیدہ تھی کہ خود ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی، شاید چودہ پندرہ روز کی مختصر علالت کے بعد نصف

نے ۵ اگست ۱۹۱۳ء کو الہ آباد میں وفات پائی، اور وہیں سپرد خاک ہوئے،

مولانا کے لئے یہ حادثہ بڑا روح فرسا ہوا، اُن کے سکون و اطمینان کی دنیا ہی لٹ گئی، اب ہر طرف سے منھ موڑ کر انھوں نے اس ویرانہ کو آباد کرنے کا عزم کیا جس کو عمر بھر آبادی کے قابل نہیں سمجھا یعنی اعظم گڈہ کو مراجعت فرمائی، اور شبلی منزل میں بیٹھ کر بقیہ عمر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں صرف کرنے کا عزم کر لیا، یہیں بیٹھ کر ان کی وفات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے، یعنی ایسا پُر درد مرثیہ[1] لکھا جس کا لفظ لفظ اُن کے خون شدہ دل کی ایک

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا ! ۔۔۔ وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا ۔۔۔ قوتِ دست و دلِ شبلیِ نعمانی تھا

جوش اُسی کا تھا جو میرے سرِ پُر شور میں تھا

بل اُسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا

ہم سے ناکاروں میں اک قوتِ عامل تھا وہی ۔۔۔ مایۂ حرمتِ اجداد کا حامل تھا وہی

مسندِ والدِ مرحوم کے قابل تھا وہی ۔۔۔ یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں

ہائے افسوس! میں اسحاق کہاں سے لاؤں

جب کیا والدِ مرحوم نے دنیا سے سفر ۔۔۔ گھر کا گھر تھا ہدفِ ناوکِ صد گونہ خطر

بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر ۔۔۔ تیر جو آئے لیا آپ وہ ان کی زد پہ

[1] یہ مرثیہ ستمبر ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈہ میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ (مسودہ ۳۳۳)

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لئے کھائے کہ میں شاد رہوں

اُس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بےغم　　گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج والم
اُن فراغت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم　　میں تھا اور شغلِ نامہ و قرطاس و قلم
اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے عمدۂ مرحوم کا داغ　　کہ مری قوت بازو تھا مرا چشم و چراغ
اسکو جنت میں جو خالق نے دیا گنجِ فراغ　　میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی ترو تازہ ہے یہ باغ
یعنی وہ آئینۂ خوبیٔ اخلاق تو ہے
اُٹھ گیا عمدۂ مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیّرِ تاباں بھی گیا　　میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا　　عشرتِ والدِ مرحوم کا درباں بھی گیا
گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو لے خاکِ لحد آج اجل نے سونپی　　وہ امانت جو مرے والدِ مرحوم کی تھی
بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاستِ طبعی　　نازپروردۂ نعمت تھا پہ ہیں سادہ وشی
دیکھنا اُڑ کے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں

گرد پڑ جائے نہ اس عارضِ روشن پہ کہیں

اس کے اخلاق کھٹکتے تھے دلِ دشمن میں مگر — وہ شکر ریز تبسم، وہ متانت، وہ وقار

وہ وفا کیشیِ احباب، وہ مردانہ شعار — وہ دل آویزیِ خو، وہ نگہِ الفت یار

صحبت رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی

اس کی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اُن کی تخمیر — خوبیِ خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر

بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر — اس کی اک ذات تھی مجموعۂ اوصاف کثیر

بسکہ خوش طبع تھا وہ صاحبِ تدبیر بھی تھا

سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا، پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا — وہ گرفتارِ کمندِ ہوسِ خام نہ تھا

اُنکی ہر بات میں اک لطف تھا ابرام نہ تھا — وہ کبھی مدعیِ رہبریِ عام نہ تھا

اس کو مطلوب کبھی گرمیِ بازار نہ تھی

اس کی جو بات تھی کردار تھی، گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعتِ تعلیم کا راز — اس نے دیکھو تھے جو منزل کے نشیب و فراز

اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز — مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخشِ تگ و تاز

کوششوں کے جو نتیجے تھے اُسے مل نہ سکے

ہائے وہ پھول کہ پھوٹے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن — وہ ترا اوجِ شباب اور وہ بچے کمسن

مسندِ حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن — تو ہی تھا اب خلفِ صدرنشینانِ سِن

دن جب آئے کہ تجھے ہمسرِ جمہور کہوں

چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور — اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور

ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور — کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سا اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے

کوئی جاتا ہو جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز — تیری نظروں میں برابر ہیں گہر اور پشیز

میں نے مانا ترے نزدیک تھا وہ کوئی ناچیز — رحم کرنا تھا کہ چھوٹے ہیں کئی اس کے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں

اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا! شبلیٔ دل خستہ بایں موئے سفید — لے کے آیا ہو ترے درگہِ عالی میں امید

مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید — خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

کیا لکھوں قصۂ غم تابِ ترنم بھی تو نہیں

اب مجھے خامۂ پرزور میں دم بھی تو نہیں

ان کے اس درد و غم کا اندازہ ان کے ان خطوط سے بھی کیجئے جو اس زمانہ میں اپنے دوستوں

اور عزیزوں کو لکھے، کیسے مختصر مگر کیسے بلیغ اور ساتھ ہی کس قدر اثر میں ڈوبے ہوئے، ۱۰ اگست ۱۹۱۴ء کو الٰہ آباد سے راقم کو ان لفظوں میں حادثہ کی اطلاع دیتے ہیں :- "میرا سب کچھ جاتا رہا، انا للّٰہ"

دو لفظوں کے اس کوزہ میں غم والم کا ایک سمندر بند ہے، ۹ اگست کو مولوی مسعود علی صاحب کو لکھتے ہیں :- "آخر ساری دنیا لٹ کے گھر آیا" (۱۹)

ان لفظوں میں غم والم کی ایک دنیا آباد ہے، ۵ ستمبر کو پھر مجھے لکھتے ہیں :- "واقعۂ حال نے میرے حواس کھو دیئے" (۸۰)

۱۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھتے ہیں :- "میں واقعۂ حال سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی" (۰)

بہر حال اس شدت غم نے گو اُن کی طبیعت کو اس قدر ملول اور افسردہ بنا دیا تھا کہ وہ خود مرنے کو تیار بیٹھے تھے، تاہم دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس عالم میں بھی دین وملت اور علم کی خدمت کے ولولہ میں کمی نہیں آئی، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دار المصنفین کے قیام اور سیرت نبویؐ کی تکمیل کا کام اسی طرح اُن کے دل سے لگا ہے۔ اس بارہ میں ان کا ایک مکتوب جو ۱۷ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی کو لکھا تھا پڑھنے کے قابل ہے، (یہ مکتوب خدا جانے کس طرح مکاتیب شبلی میں درج ہونے سے رہ گیا ہے، مولانا شروانی نے مولانا کی وفات پر جو مضمون علی گڈھ گزٹ میں لکھا تھا اس میں اس کو پورا نقل کر دیا ہے)

"عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا، حالانکہ مہدی مرحوم کا داغ بھی اسی درجہ کا گذر چکا تھا، بہر حال میں اعظم گڈھ چلا آیا۔ محمدن شبلی اسکول جو ۲۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا، ہائی اسکول

سے مڈل اسکول تک آگیا، عزیز مرحوم اُس کو انٹرنس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے، دو مہینے کا دورہ رکھا تھا، اور پانسو روپیہ مصارف دورہ کے لئے الگ کر دیئے تھے، اشتہارات اور رسید بہیاں سب چھپ گئی تھیں۔

مجھ کو اس کام کے علاوہ دار المصنفین اور دار التکمیل کی فکر ہے، ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا، دو برس تک کشمکش میں گذرے، جو ہوگیا وہ تعجب انگیز ہے، بہرحال صورت موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بیگہ پختہ ہے، اُس کو وقف کر رہا ہوں، اور شرکا بھی راضی ہو گئے ہیں، مسودہ لکھا جا چکا، رجسٹری کرانا ہے، دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں، کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا، بلکہ صرف تنخواہ کے لئے کافی ہوگا، دار المصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا، چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے ہم عصروں کے نام سے تعمیر ہوں، اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں، چندہ کی شرط نہیں، ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا، اس کے ساتھ دار التکمیل کھول رہا ہوں، یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبہ کو تیار کروں، وہ مددگار ہوں گے، انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا، سر دست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور اُن کے متعلق ذخیرۂ معلومات اور کتابیں اُن کو دی جائیں گی، جو کچھ لکھیں گے اس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا، پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصانیف کرائی جائیں گی، وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے، جو کم از کم ۲۰۔۲۵ روپیہ ماہوار ہوں گے، دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے، ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے، یہ آخر عمر کا خواب ہے، اور امید ہے کہ ع "چوں ہنرہائے دگر موجب حرماں نشود"

نواب عماد الملک نے دار المصنفین کی صدر انجمن قبول کرلی ہے، تکمیلِ دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد،
ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے، والتسلیم؛

مولانا شروانی اس مضمون میں فرماتے ہیں:- "اس تحریر (مذکورہ بالا خط) میں دو امر خاص قابل
لحاظ ہیں، ایک پاک اور کارآمد منصوبے، دوسرے یہ کہ شدتِ غم میں بھی دماغ علم کی غمخواری میں مصروف تھا۔
بعد وفات علامۂ مرحوم معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روے وصیت وقف کردیا ہے، اور جلد وصلہ
اعزۂ تعمیلِ وصیت پر آمادہ ہیں، قبر بھی باغ میں بنی ہے، اور وہیں تکمیلِ سیرت کے سامان ہورہے ہیں ؂

شدیم خاک ولیکن زبوے تربتِ ما ۔۔۔ توان شناخت کزیں خاک مردِ خیزد؛"

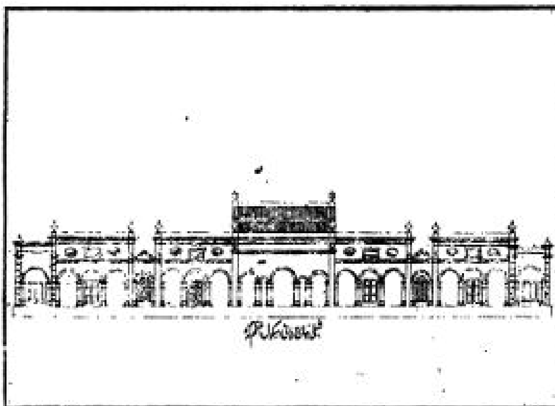
اس خط سے قیاس ہوگا کہ اس کرب وبیتابی کے عالم میں بھی وہ اپنے اصلی کاموں کو نہیں
بھولے تھے، مولوی حمید الدین صاحب، مولوی مسعود علی صاحب، اور راقم کے نام کے خطوط
سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت ان کے پیشِ نظر ندوہ کی اصلاح، سرائے میر کا انتظام، نیشنل اسکول
کی تعمیر، دار المصنفین اور دار التکمیل کے قیام اور سیرت کی تکمیل کی تجویزیں تھیں،

شبلی اسکول

۱۹۱۳ء۔۱۹۱۴ء

پچھلے صفحوں میں مولانا کے ابتدائی تعلیمی کارناموں میں نیشنل اسکول کا نام بار بار آیا ہے، مولانا
جب حیدرآباد گئے، اور وہاں سے واپس پر ندوہ کے کاموں میں اتنے منہمک رہے کہ وہ اپنے اس
اسکول کو جس سے انھیں بڑی محبت تھی بھول سے گئے، اتنے عرصہ میں اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ؛


شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ



ہائی اسکول سے تنزل کرکے مڈل اسکول ہوگیا، اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کا کام تھا انھوں نے شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر اسکول کا نام جارج اسکول بنا کر لفظی تغیر سے اس کی معنوی ترقی کا خیال باندھا جو تمام تر بے سود تھا، اسکول اپنی موجودہ حالت سے ذرا آگے نہ بڑھ سکا، آخر جب مولانا ندوہ کے ہنگاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی، ۵ نومبر ۱۹۱۳ء کو مولوی اسحاق مرحوم کو لکھا کہ "وہاں (اعظم گڈھ) مدرسہ اسکول کا بھی تفریحی شغلہ ہے" (اسحاق ۴۴)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کو اس کے لئے آمادہ کیا، اور لکھا کہ "اعظم گڈھ میں پہلے ایک بڑی تعلیمی کانفرنس ہو" مولوی اسحاق مرحوم نے کچھ اختلاف کیا، تو انھیں لکھا: "شور وغل فی نفسہ بیہودہ چیز ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ کوئی کام دنیا میں بے اس کے نہیں چلتا، انبیاء اور ریفارمر دونوں کی تقریریں دیکھو، علی گڈھ کالج صرف شور وغل سے قائم ہوا، اور اب تک اسی پر قائم ہے۔

تم نے کانفرنس تسلیم تو کر لی، لیکن اس کے لئے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور روساے دیہات کے پاس بھیجنا ضرور ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ دو چار منصف، عہدہ دار، اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے، نیشنل اسکول یا مڈل اسکول کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں، تم پرائیوٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار و تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو، مثلاً مولوی عبدالمجید سب جج، مولوی عبدالحلیم منصف، میاں جنید وغیرہ وغیرہ پر تمہارا بھی اثر پڑ سکتا ہے، میرا کہنا تو ان لوگوں کے لئے بھی ایک معمولی عام صدا ہوگی۔

کانفرنس کا مقام اعظم گڈھ ہوگا، نیشنل اسکول یا بنگلہ میں، اور اگر مڈل سے سیر میں ہو تو عالی مذاق تھا میرے لئے یہ مشکل ہے کہ علی گڈھ والوں کا سخت تقاضا ہے، وعدہ بھی کر چکا ہوں، تاہم زیادہ بلکہ

تعلیمی بیداری ہو کر اعظم گڈھ ہی آؤں،

اعظم گڈھ کانفرنس میں حکام کو بھی مدعو کیا جا سکتا ہے، بورڈنگ کو اگر وسعت دی جائے تو گورکھپور اور جونپور تک کے لڑکے آسکتے ہیں، غرض ایک نہایت وسیع پیمانہ خیال میں ہے،

افسوس ہے، قبل از وقت معذور سا ہو گیا ہوں، ۲۴ گھنٹہ میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹہ کام کر سکتا ہوں، یہ غنیمت وقت صرف سیرت پر صرف کرتا ہوں، ع عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت،

میاں حمید کو بھی یہ خط دکھاؤ، اور کانفرنس کا اعلان و پروگرام دونوں صاحب مل کر اور چھپوا کر بڑی تعداد میں لوگوں کے پاس بھیجو اور تقسیم کرو"

پھر دوبارہ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۳ء کو انھیں لکھا: "قابلِ غور یہ مسئلہ ہے کہ شبلی اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہئے، یا ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہئے، اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں، اور ان کے برابر شان کا اسکول بنانا آسان نہیں، اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں، کہ اسلامی بورڈنگ بنانا نہایت مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو شبلی کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہئے، جس کو رفتہ رفتہ بہت ترقی دی جا سکتی ہے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کر سکیں گے، اور کفایت شعاری کے ساتھ،

مولوی محمد عمر صاحب، اور مسیح، سال بھر میں پنشن لے لیں گے، یہ لوگ بورڈنگ یا مدرسے کے قیام و ترقی کے متعلق اپنا کافی وقت دے سکیں گے، اور ان پر برادری کو اعتماد بھی ہے:"

بہرحال مولوی اسحاق صاحب مرحوم نے ۱۹۱۳ء میں ضلع اعظم گڈھ میں ایک ایجوکیشن سوسائٹی

کی بنیاد ڈالی، اور اسکول کو اس کی نگرانی میں دے دیا، اور یہ عزم تھا کہ اس سال الٰہ آباد ہائیکورٹ کی بڑی تعطیل میں جو تین مہینہ کی ہوتی ہے، پورے ضلع کا دورہ کریں گے، اور نئے سرے اسکول کو اٹھائیں گے، لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس تعطیل کے آنے سے پہلے ہی انھوں نے ۸ اگست ۱۹۲۱ء کو انتقال کیا، ان کی وفات کے بعد جب مولانا نے اعظم گڈھ کا قیام اختیار کیا تو اسکول کی طرف توجہ فرمائی، مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی یادگار میں اسکول میں چند کمروں کی تعمیر کی تجویز منظور کی، اور متعدد عزیزوں سے چندے لے کر ان کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، ابھی یہ معاملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں خود مولانا نے رحلت پائی، مگر خدا کا شکر ہے کہ کام جاری رہا، بلکہ کام کرنے والوں میں اب ایک کے بجائے دو بزرگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا جذبہ پیدا ہوا، مولوی سمیع صاحب کے بڑے بھانجے مرزا مصطفےٰ بیگ مرحوم اس وقت ایل ایل بی ہو کر اعظم گڈھ آئے اور اسکول کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، اور پوری محنت و تندہی سے کام کر رہے تھے کہ دو تین سال کے بعد مبتلاے دق ہو کر وفات پائی، اس کے بعد شہر کے ایک ممتاز وکیل مولوی ولی جان صاحب بی اے ایل ایل بی نے اس کی خدمت کا جائزہ لیا، مگر وہ اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ سے کچھ زیادہ نہ کر سکے، آخر مولانا کے ایک ماموں زاد بھائی شیخ محمد صاحب (زمیندار بھریا) نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی محنت اور کوشش نے اسکول کو دوبارہ زندہ کر دیا، اور اس کو پھر ہائی اسکول تک پہنچایا، اور تعمیرات میں بھی اضافہ کیا، مولانا کے صاحبزادہ حامد صاحب نعمانی نے بھی اس کی تعمیر کی تکمیل میں پوری کوشش فرمائی

اس کے دوسرے انتخاب میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کے چھوٹے بھانجے اور مرزا مصطفےٰ بیگ مرحوم کے چھوٹے بھائی مرزا مرتضیٰ بیگ صاحب بی اے ال ال بی سکریٹری ہوئے، اُن کے دور میں جو اب تک جاری ہے، اسکول نے شاندار کامیابی حاصل کی، اور اب اس سال ۱۹۴۳ء میں اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مولوی بشیر احمد صاحب صدیقی کی کوشش اور حسن تدبیر سے اس اسکول نے ترقی کرکے "شبلی کالج" کا رتبہ حاصل کرلیا، کالج کی عمارت الگ بن گئی، جس کی تعمیر میں مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے جن کو شروع سے اپنے استاد کے اس ابتدائی تعلیمی کارنامہ سے دلچسپی رہی انتھک محنت کی، اور کالج کی پوری عمارت اُن ہی کی کوشش اور اہتمام سے بن کر تیار ہوئی،

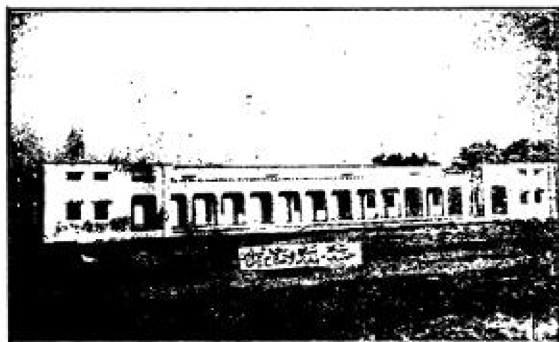
کالج کے کارکنوں نے مناسب سمجھا کہ اس کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد اس شخص کے ہاتھ سے رکھوایا جائے جو اس اسکول کے بانی کا حبیب حمیم تھا یعنی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی، چنانچہ موصوف سے عرض کیا گیا، اور وہ زحمت سفر برداشت کرکے اعظم گڈھ آئے، اور ۲۱، مارچ ۱۹۴۲ء کی شام کو ایک بہت بڑے جلسہ میں اس کے افتتاح کا اعلان کرکے بہت سے معززین کی معیت میں اپنے ہاتھ سے شبلی کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا،

کالج بحمد اللہ اسی سال جولائی سے کھل گیا، اور اس میں اس وقت ایف اے تک کی تعلیم ہو رہی ہے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء

سرائے میر اعظم گڈھ اور شاہ گنج کے بیچ میں ایک مشہور پرانا قصبہ ہے، حضرت میر علی عاشقاں علیہ الرحمۃ



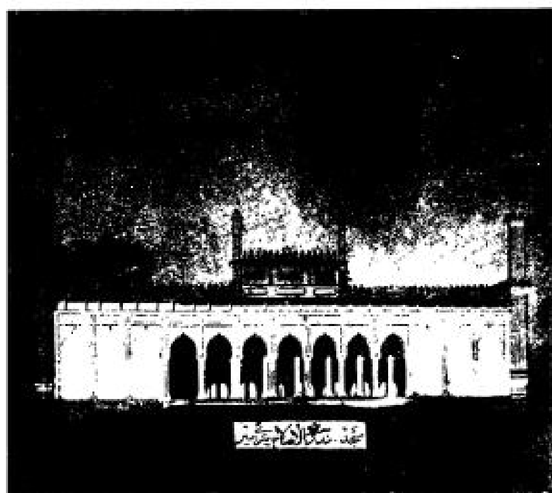


نیرشاہ اور ہمایوں کے عہد میں ایک صاحب دل گذرے ہیں اُن ہی کی نسبت سے یہ مشہور ہے، اُن کا مقبرہ اور اُن کی خانقاہ کی عمارتیں اب بھی گری پڑی قصبہ کے وسط میں موجود ہیں، اس کے آس پاس بعض دولت مند شیعہ زمیندار بھی آباد ہیں، مگر کثرت اُن لوگوں کی ہے جو مولانا مرحوم کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور اکثر نہایت محنت سے معمولی زمینداری اور کاشتکاری پر گذر کرتے ہیں، اور بعض لوگ اور ملکوں اور جزیروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں، یہ سب نیک اور دیندار لوگ ہیں، مولوی حمید الدین صاحب کا وطن پھریا بھی اسی کے قریب ہے،

مولوی شفیع صاحب نام ایک بزرگ نے جو نہایت نیک اور مقدس، اور ان ہی اطراف کے رہنے والے ہیں، اور دوسرے مقامی علما، اور علم دوست، اور دیندار مسلمان زمینداروں نے (جن میں مولوی حمید الدین صاحب کے خاندان کے بزرگ جو مولانا کے بھی ننھالی بزرگ تھے) مل کر شاید سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک انجمن اصلاح المسلمین قائم کی، جس کا عام جلسہ ہر مہینہ کسی نہ کسی آس پاس کے قصبہ میں ہوتا تھا، اور اصلاح و ترک بدعات کے مواعظ اس میں بیان کئے جاتے تھے، اس کے سالانہ جلسے بھی بڑے پیمانہ پر ہوتے تھے، اُن میں وقتاً فوقتاً مولانا عبد الحق صاحب حقانی دہلوی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری جیسے مشاہیر علما آتے، اور لوگوں کو مستفید کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک اسلامی مدرسہ کی بنا کا خیال پیدا ہوا، اتفاق یہ کہ اُسی زمانہ میں ان ہی اطراف کے ایک مدرس مولوی عبد الاحد صاحب (جو منجھریا نام ایک گاؤں کے باشندہ تھے جو سرائے میر سے ایک میل پر واقع ہے) جون پور کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے، وہ کسی سبب سے مدرسہ چھوڑ کر

اپنے گاؤں میں آگئے، اُن کے ساتھ کچھ طلبہ بھی آئے، جن کو وہ اپنے گاؤں میں بیٹھ کر پڑھانے لگے،
مدرسہ کی تحریک کرنے والوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، اور مدرسہ کے لئے سراے میر میں اسٹیشن
کے پاس ۴۴ بیگہ کی ایک زمین پسند کی، یہ زمین چند سنّی اور شیعہ زمینداروں کی ملکیت تھی، سب نے
بخوشی اپنے اپنے حصّہ کو اس نیک کام کے لئے وقف کیا، اسی زمین میں ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء
میں ایک چبوترہ بنا کر چھپر ڈال دیا گیا، اور وہ مدرسہ ہوگیا، اُس زمانہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب
جو آج دیوبند کے مدرسہ میں ہیں، اور نہایت مقدس بزرگ ہیں، اعظم گڑھ کی جامع مسجد جون پور میں
ہی پچیس برس سے مدرس تھے، وہ تشریف لائے اور اُن کے ہاتھوں سے مدرسہ کا افتتاح ہوا، مولوی
عبدالاحد صاحب یہیں آکر پڑھانے لگے، مولوی فیض الحسن صاحب میرٹھی ایک خوش بیان
واعظ، اتفاق سے انجمن کے ایک سالانہ جلسہ میں آئے، تو لوگوں نے اُن کو اور اُنھوں نے اس
مقام کو غنیمت سمجھا، چنانچہ اُنھوں نے چند سال یہاں رہ کر مدرسہ کے لئے چندوں سے سرمایہ جمع کیا
اور ایک بنگلہ اور کچھ کچے کمرے بنوائے،

مدرسہ کی تحریک اور بنیاد تک اس میں مولانا کا ہاتھ نہ تھا، لیکن جوں ہی اس نے برگ و بار
پیدا کیا، برادری کی ایک نیک تحریک کے خیال سے مولانا نے اس کی سرپرستی قبول کرلی، ۱۹۱۰ء
میں اس کا بڑا جلسہ ہوا، اطراف کے سارے مسلمان جمع ہوئے، دیوبند سے مولانا عبید اللہ صاحب
سندھی اور ندوۃ العلماء سے مولانا مرحوم دار العلوم کے دو چھوٹے طالب علموں، عبدالرحمان نگرامی
اور معین الدین کو لے کر جو باوجود کمسنی کے بہت اچھی تقریر کرتے تھے، جلسہ میں شریک ہوئے،
یہیں مولانا مرحوم اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی میں پہلی ملاقات ہوئی، اور تخلیہ میں گفتگو میں



ہوئیں، اور ایک نے دوسرے کو پہچانا، اس تعارف میں شاید اس واقعہ کو بھی دخل ہو کہ مولانا حمید الدین صاحب مدت تک کراچی میں رہے تھے، اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے اور اُن سے وہاں ملاقاتیں رہتی تھیں، دونوں میں قرآن پاک کے درس اور غور و فکر کا ذوق مشترک تھا،

اس زمانہ میں مولانا پر آریوں کے حملوں کی وجہ سے اشاعت و حفاظتِ اسلام کی تحریک بالکل چھائی ہوئی تھی، اور آریوں کے گروکل کی سادگی، اور مذہبی خدمات کے لئے اُن کی تیاری کے تصور سے بہت متاثر تھے، اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں بھی کوئی جماعت یا درسگاہ اسی اصول پر قائم کیجائے، یہ مدرسہ جو بالکل دیہات میں قائم تھا اس کام کے لئے ان کو بہت موزوں نظر آیا، ۹ ر اپریل ۱۹۱۰ء کو مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا:- "آپ تو چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خاص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت، اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو؛" (حمید ۵)

سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے اس کے انتظامی جلسوں میں شرکت فرمائی، اور مولوی فیض الحسن کو جن پر لوگوں کو بہت سے اعتراضات تھے، خوش اسلوبی سے الگ کیا گیا،

سنہ ۱۹۱۳ء میں جب مولانا نے دار العلوم کی معتمدی سے سبکدوشی حاصل کی تو مدرسۃ الاصلاح کی طرف مزید توجہ فرمائی، اس وقت وہ حیدر آباد میں تھے، اور دار العلوم حیدر آباد دکن میں مولانا حمید الدین صاحب کی تقرری کا مسئلہ گرانقدر مشاہرہ پر طے پا رہا تھا، تاہم انھوں نے مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا:- "بحث یہ ہے کہ ہماری قومی قوت سرائے میر پر صرف ہو یا اعظم گڈھ[1] پر، دونوں کے برداشت کے

---

[1] مقصود نیشنل سکول سے ہے، جو اب شبلی کالج کہلاتا ہے،

تاہم توہم نہیں ہے، کم سے کم یہ کہ دونوں کی جداگانہ پوزیشن قائم ہونی چاہئے، اور ان کا باہمی تعلق،

کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے،
یہیں خدامِ دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ
کام کرنے نہیں دیتے، تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہئے، ہم سب کو وہیں بود و باش کرنی چاہئے، ایک معقول
کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہئے اگر تم بعزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں،

آج ڈائرکٹر تعلیمات سے تمھارے متعلق فیصلہ کرنا ہے، صرف یہی ایک زینہ رہ گیا ہے، لیکن یہ فیصلہ
موافق بھی ہو جائے تب بھی میں اس کو قومی خدمت پر ترجیح نہیں دیتا، البتہ کچھ معاش کا سہارا ہونا چاہئے
وہ بقدر کفاف کسی نہ کسی طرح ہوتا رہیگا، آخر تمھارا بھی خود خیال تھا، پرنسپلی اور پیش قرار تنخواہ چند روزہ ہے
اور یہ کام ابدی ہے۔" (حمید، ۲)

مولوی اسحاق صاحب مرحوم کی وفات کے بعد جب مولانا اعظم گڈھ آئے اور یہاں کے
منتشر اداروں کو باہم ملا کر ایک منظم شکل دینی چاہی تو اس کی ایک کڑی مدرسہ سرائے میر بھی
قرار دی، مولوی حمید الدین صاحب نے اُن کو لکھا کہ آپ اس مدرسہ کی نظامت قبول فرما کر
اسی کو اپنی کوششوں کا محور قرار دے لیں"، اس کے جواب میں ۱۰ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو انھیں لکھا:
"بھائی! بایں ضعف و دل شکستگی مدرسہ سرائے میر کی نظامت کیونکر کر سکتا ہوں، کوئی دوسرا شخص
سوچو، امکانی مدد کرتا رہوں گا۔" (حمید - ۵)

بالآخر مولانا نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے شاگردوں میں سے مولوی مسعود علی صاحب
ندوی کو جن کے حسنِ انتظام کا ان کو تجربہ ہو چکا تھا، اعظم گڈھ بلالیں، اور دار المصنفین کے ساتھ

مدرسہ سرائے میر کی نگرانی بھی اُن کے سپرد کریں۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے شروع میں مولوی مسعود علی صاحب اعظم گڑھ آئے، اور انھوں نے مجوزہ دارالمصنفین کے مکان اور مدرسۂ سرائے میر کو جا کر دیکھا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو مولانا نے مجھے لکھا: "تمہارا انتخاب بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے بھی گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔" (سلیمان ۱۰)

مولوی صاحب نے واپس جا کر مولانا کو لکھا کہ مدرسہ میں جو مدرس اوّل ہیں وہ اس جگہ کے لئے موزوں نہیں۔ مولانا نے جواب دیا: "سرائے میر کے منتظم دیر نہیں ہیں، مدرس حال گو ان کے نزدیک ناقابل ہیں لیکن ان کو فوراً موقوف نہ کریں گے، اور شاید اس میں کچھ دیر لگے، درجہ تکمیل والوں کے ساتھ شبلی یہاں چلے آئیں جب تک کوئی انتظام نہ ہو وہ تکمیل میں رہیں۔" (مسعود ۲۱)

یہاں شبلی سے مقصود مولوی شبلی صاحب ندوی متکلم ہیں جو اعظم گڑھ ہی کے رہنے والے ہیں۔[1] دارالعلوم سے فارغ ہو کر دو برس سے دارالعلوم کے درجہ تکمیل میں علم کلام اور معقولات کی تکمیل میں مصروف تھے۔ مولانا اُن کو سرائے میر کے کام کے لئے تجویز فرما رہے تھے مگر چونکہ وہاں کے انتظام میں کچھ تاخیر تھی، اس لئے سردست ان کو اعظم گڑھ آنے کی ہدایت فرمائی۔ مولانا کے ذہن میں اب وقت دارالمصنفین، درجہ تکمیل اور سرائے میر کو ملا کر ایک اچھے خاصے جامعۂ اسلامیہ کا تصور قائم

---

[1] لطیفہ:- دارالعلوم میں بیک وقت تین شبلی جمع تھے، مولانا شبلی صاحب مہتمم دارالعلوم، مولانا شبلی صاحب مدرس اور یہ مولوی شبلی متعلم، ان بیچارے کے نام کے ساتھ ہی فرق کے لئے متعلم کا لفظ لگا دیا گیا، وہ احباب کی زبان پر اُن کے نام کا ایسا لازمی جزء بن گیا کہ اس کے علاوہ بغیر اُن کی شخصیت کا تصور نہیں آتا تھا، مگر جب انھوں نے علم کلام کی تکمیل کر لی تو اسی وزن پر متکلم کا لفظ ان کے نام کے ساتھ لگا دیا گیا جو اب تک قائم ہے۔ ہماری جماعت میں کلام و معقولات میں نہایت لائق و فاضل اور ساتھ ہی نہایت متواضع، خاکسار اور خیر پسند ہیں، مولانا ان سے محبت رکھتے تھے۔

ہوگیا تھا۔ مولوی مسعود علی صاحب کو اپنی ایسی غم انگیز حالت میں بھی کس خوشی سے اپنے اس خوش آئند
خواب کی اطلاع دیتے ہیں: "دارالمصنفین و جلد نکلیں سرائے میر و جبہ ابتدائی پورا جامعۂ اسلامیہ[۱] کا معاملہ
ہے، سو محکم کرنے کی ضرورت ہے، سرائے میر والے چند بار آئے، وہ تمہارے بہت آرزو مند ہیں، وہاں کے موجودہ
ناظم اور بانی مدرسہ مولوی محمد شفیع کی خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ، اور وہ واعظ بن کر قصبات کا
دورہ کرتے رہیں، کہ مالی حالت کی طرف سے اطمینان ہوجائے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو نظم و نسق نہیں آتا، یہ
بھی خیال تھا کہ انسپکٹر مدارس سے مل کر اس کی سرکاری امداد کا کوئی انتظام ہو، اسی خط میں لکھتے ہیں:
"انسپکٹر مدارس آئے تھے، وہ سرائے میر کو دو مہینہ کے بعد دیکھیں گے، اور امداد کی پوری توقع ہے۔" (مسعود ۲۵)

پہلی نومبر کو پھر مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا: "میں ایک مفصل اسکیم لکھ چکا ہوں، اب جو آنے والے
ہوں تو ذرا سنجائیں، تاکہ ایک صحیح اسکیم قائم ہوجائے، شبلی منزل بھی، اور وہ لوگ بھی، تم اپنی نسبت فیصلہ کرو کہ کہاں رہنا
بہتر ہے، لکھنؤ سے بالکل قطع تعلق مناسب معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ایک عمدہ اسکیم یہ تھی کہ سرائے میر کا انتظام تمہارے
ہاتھ میں ہو، اگر اس کا کچھ تدارک یعنی تلافی ہوسکے تو سرائے میر کے ارادہ سے آجاؤ، میرا دورہ بھی اکثر رہیگا۔" (مسعود ۲۶)

مولوی مسعود علی صاحب نے لکھا کہ وہ بالفعل چھ مہینے کے لئے سرائے میر کے مدرسہ کے کام کو آسکتے

۱؎ جامعہ کا لفظ جامعہ ملیہ دہلی کے بعد سے تو عام ہوگیا، مگر یہ ذرا تاریخی بات ہے کہ اس معنی میں پہلے مولانا ہی کے قلم سے نکلا،
اور بعد کو اشاعت پذیر ہوا، جامعہ ملیہ کے نام کی تاریخ بھی ایک اتفاقی واقعہ ہے، مسلم یونیورسٹی سے ٹوٹ کر اس کے
بالمقابل جو نئی قومی مسلم یونیورسٹی قائم کی گئی، اس کا لیٹر پیپر یعنی خط کا کاغذ مولانا ابوالکلام نے چھپوایا تھا، انہی نے
نیشنل مسلم یونیورسٹی کے انگریزی لفظوں کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی کردیا، پھر بعد کو یہ لفظ
چل گیا، جامعہ مصر کی نئی عربی زبان میں یونیورسٹی کو کہتے ہیں جو یونیورسٹی کا گو لفظی ترجمہ ہے لیکن چونکہ جامع عربی میں
مسجد اعظم کو کہتے ہیں، اور شروع میں مسجدیں ہی درسگاہیں تھیں، اس لئے جامع کے ساتھ جامعہ کا لفظ مع تانیث
رکھا گیا۔

ہاتھ میں لیں گے۔ مولانا نے ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو انھیں لکھا: "تمھاری نسبت یقیناً سرائے میر میں رہنا بہتر ہے، ۹ چھ مہینے کی رائے ٹھیک ہو، تم کو ہر بات کا تجربہ ہو جائے گا، اختیارات جس قدر چاہو گے مل جائیں گے" (مکتوب ۳۳)

مولوی مسعود علی صاحب جب آئے تو بلانے والا مرض الموت کے بستر پر تھا۔

مولوی شبلی صاحب متکلم مولانا کی وفات سے تین روز پہلے پہنچ گئے تھے، ان کو پاس بلا کر فرمایا کہ میری زندگی کے حاصل تم لوگ ہو، جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو۔

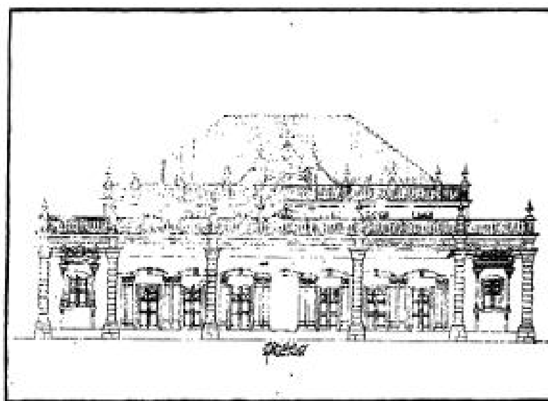
مولانا مرحوم کی وفات کے تیسرے روز گویا ماتم سے فارغ ہو کر مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا کے ان چند شاگردوں کو لے کر جو اس وقت جمع تھے ایک مجلس اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی، اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ مولانا مرحوم کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی جائے، اس مجلس میں اس وقت مولانا حمید الدین کے علاوہ حسب ذیل اشخاص شریک تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی اور خاکسار، اس مقصد کی بنا پر ہم لوگوں نے مولوی شبلی صاحب متکلم کو مدرسۂ سرائے میر کی صدر مدرسی، اور مولوی مسعود علی صاحب کو اس کی نگرانی کی خدمت سپرد کی جس کو ان دونوں صاحبوں نے قبول کیا، مولوی مسعود علی صاحب تو سال دو سال کے بعد دار المصنفین کے کاموں کے پھیلاؤ کے سبب سے اس کی نگرانی کی خدمت سے الگ ہو گئے، اور خود مولوی حمید الدین صاحب نے اس بوجھ کو اپنے سر اٹھا لیا، لیکن مولوی شبلی صاحب اس وقت سے لے کر اس وقت تک پوری جانفشانی محنت اور ایثار کے ساتھ ہر قسم کی مصیبتوں کو مردانہ وار جھیل کر اپنے کام کو انجام دے رہے ہیں، اور بحمد اللہ کہ ان کے اور ان کے ساتھیوں کی محنت اور ایثار کی بدولت مدرسہ آج ایک ممتاز علمی حیثیت رکھتا ہے، آخر عمر میں گویا مولانا کی آرزو کے مطابق جس کا پچھلے خط میں

ذکر ہے، مولانا حمید الدین صاحب نے حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اور قرآن پاک کی تعلیم و تدریس اس کا خاص مقصد قرار دے کر اس کا خاص نصاب بنایا، جس پر وہ آج تک گامزن ہے، اور اچھے نتائج پیش کر رہا ہے،

دار المصنفین

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء

ابتدائی خیال مولانا مرحوم کے ذہن میں دار المصنفین کی تجویز کتبخانہ ندوۃ العلماء کی عمارت کے سلسلہ میں سب سے پہلی بار آئی، مارچ ۱۹۱۰ء کے اجلاس دہلی میں دار العلوم کی جو سالانہ رپورٹ اُنھوں نے لکھ کر پیش کی تھی، اُس میں یہ بھی لکھا تھا:- "قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانۂ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے، تو ضرور ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق تمام اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں جس میں قدما کے مصنفین کی یادگار رہی ہوں، اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتبخانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو، تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں؛



یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا جائے؛

مولانا نے اسی جلسہ میں پڑھنے کے لئے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتبخانہ کی ضرورت" کا عنوان میرے حوالہ فرمایا تھا، اور ارشاد ہوا تھا کہ اسی سلسلہ میں ایک دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش کرو، میری یہ تقریر ندوہ کے اجلاس دہلی کی رپورٹ اور الندوہ میں چھپ چکی ہے، اس کے آخر میں صیغۂ تصنیف و تالیف کے عنوان کے نیچے ہے: "ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرانا چاہتا ہے وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے، کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تالیف و تصنیف قائم کیا جائے جس سے علوم و تاریخ اسلام کا احیاء ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں، اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے، لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ یہ پانچ سو صفحوں کی کتاب ہندوستان اور قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں کو کھنگال کر لکھی گئی ہے، یہ امر بدیہی ہے کہ ہر مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر شائع ہوتی ہیں، اگر قوم ندوۃ العلماء کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو مہیا ہو، تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہو جائے، اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہو گی کہ ممتاز طلباء دارالعلوم کا

ایک حصہ صیغۂ تالیف و تصنیف کے لئے وقف کیا جائے جس کی قوم کو اس وقت نہایت ضرورت ہے۔"

"دارالعلوم کی جدید عمارت میں اس کتب خانۂ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے جس میں کتب خانہ کے سوا ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لئے بنایا جائے جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف و تصنیف میں مشغول ہو، ہماری زبان کو جس کا گہوارۂ طفولیت یہی دہلی ہے، ان تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم و مصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہو، اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں، اور اس عمارت کا نام دارالمصنفین ہو، بظاہر یہ تجویز ایک خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہے، لیکن قوم کی امداد سے آج جہاں بہت سے مشکل اور بظاہر محال کام انجام پا رہے ہیں، اس کتب خانۂ اعظم کا قائم ہو جانا بھی بعید نہیں جس کے لئے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔"

اگست سنہ ۱۹۱۰ء میں نواب فضل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں مولانا کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوائیں گے تو مولانا نے الندوہ (اگست سنہ ۱۹۱۰ء) میں یہ نوٹ لکھا: "جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں۔ ہماری تصنیفات کی توقیر کیا وقعت ہے، لیکن نواب صاحب موصوف چونکہ علم دوست ہیں، اس لئے انہوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کر لیا ہے، لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں، ان کے لئے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم وفنون

کی کتابیں میار ہیں، چونکہ ندوہ کا کتبخانہ اعلیٰ درجہ کا کتبخانہ ہو جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لئے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے، نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لئے دس ہزار روپیہ درکار ہوں گے،

اسکے بعد ندوہ میں اختلافات کا دور پیدا ہو گیا اور یہ خیال اُنکے دماغ میں یونہی پیچیدہ رہا،

جولائی ۱۹۱۳ء میں جب ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہوے تو ادھر سے یکسو ہوکر اُن کے ذہن میں ایک تصنیفی ادارہ کا خیال زور پکڑنے لگا، چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب زبیری کو (جو اس وقت ہرہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے)، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :- "ہاں یہ دونوں (سلیمان ۔ عبدالسلام) اچھے بن گئے، کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہرحال یہ طے ہوئے کہ کہاں صدر مقام کروں، تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کر دوں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے، اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔" (۱۰)

سیرت اکاڈمی ایک خیال یہ بھی تھا کہ مخصوص طور پر سیرت کی ایک اکاڈمی بنائی جائے، اور اس کے ذریعہ سے اس فن کے ماہر تیار کئے جائیں، چنانچہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- "آپنے یہ لکھا کہ کونسا کام لے کر بیٹھوں، میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن ابھی

مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا قطعی انتخاب نہیں ہوتا، چاہوں تو خود سیرت کو ایک مقصد مستقل قرار دوں، یعنی ایک کا ذریعی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور نیلو شپ کے دیئے جائیں، کہ سیرت کی اشنذی کریں، اور خاص اس فن میں ماہر نہیں، اور سیرت پر تقریر و تحریر کریں وغیرہ وغیرہ، اس میں بہ قدر ضرورت مالی اعانت بھی مل سکتی ہے۔" (۳۹)

دارالمصنفین کی تجویز کی اشاعت بہرحال دارالمصنفین کا خیال اس قدر پختہ ہوگیا کہ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ سے اس تجویز کو عام طور پر ملک کے سامنے پیش کیا، اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا، اور مخصوص احباب کو خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسولپور (ضلع مظفر پور۔ بہار) کو ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھا:۔" ہاں دارالمصنفین کی تجویز الہلال میں کیا نظر سے نہیں گذری، ضرور دیکھئے، آپ اس کے خاص مخاطب ہیں، اس کیلئے خود و بمبئی تک آؤں گا، یہ میرا اخیر کام ہے اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔" (۲۳)

ابتداء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ چند طلبہ خود مولانا کے ساتھ رہیں، اور ان کو خاص خاص فنون میں تیار کرایا جائے، چنانچہ وہ مجھی کو جون ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "آزاد سے مشورہ ہوا، رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے، اس لئے میں خود دو چار طلبہ اپنے ساتھ رکھوں، اور ان کو کسی فن میں تیار کروں، اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کا تکفل بھی اگر ضرورت ہو، میرے ذمہ ہوگا، اگر تم اس رائے سے متفق ہو تو لکھو، اور کوئی طالب علم اس کے قابل ہو اور میرے ساتھ رہنا چاہے تو اس کے نام سے مطلع کرو، نیز ایک وظیفہ تو قائم ہونا چاہئے، اس میں کچھ اڑا تم بھی دو۔" (سلیمان ۶۰)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد اس زیر تجویز ادارہ کے اہتمام و انصرام کا کام مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو جن کی انتظامی قابلیت اور حسنِ تدبیر کے مولانا معترف تھے اور جو اب ندوہ کے اصلاحی کاموں سے فارغ ہو چکے تھے اور کسی عملی مشغلہ کی تلاش میں تھے، سپرد کرنا چاہا، اسی بنا پر دار المصنفین کے آیندہ قیام اور نظام کے مشورے اس زمانہ میں اُن سے ہوتے رہے، جن کے اکثر اُن کے خطوط میں بکثرت ہیں،

دار المصنفین کا مرکز: سب سے اہم سوال یہ تھا کہ دار المصنفین کو کہاں قائم کیا جائے، مولانا نے اس کے متعلق سب سے پہلے ارکانِ ندوہ سے اتمامِ حجت کرنا چاہا، ۱۳ فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا شروانی سے پوچھا "ہاں دار المصنفین پر کیوں آپنے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہو، میں اُس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا، اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" (۲۱)

پھر چند روز کے بعد ۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو انھیں دوبارہ لکھا "دار المصنفین کی تجویزیں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے، میں خود اپنے پاس سے ادا کر دوں گا، چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب بنواؤں گا، بہرحال اس وقت صرف آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے، اگر علی گڈھ کہیں، اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ خاں کا مقلد کہیں گے، اس لئے میں اتمامِ حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں اگر وہ منظور نہ کریں تو مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پُر لطف تجویزیں دار المصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں" (۳۱)

لیکن مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے غالباً اس کے لئے خود اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا، لکھا: "آپ دار المصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو

حضرت میں اعظم گڈھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڈھ میں اپنا باغ اور دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں" (۱۱۵)

لیکن مولانا کی اصل خواہش یہ تھی کہ دارالمصنفین ندوہ ہی میں قائم ہو، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب نے جب ان کو یہ لکھا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں اور ندوہ ہی کے احاطہ میں قائم ہو تو اس کے جواب میں ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء کو انہیں لکھا: "بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہیں بنا دو میری اصل خواہش یہی ہو لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے" (۱۳)

سنہ ۱۹۱۳ء

ندوہ سے الگ بھی وہ دارالمصنفین کا مرکز لکھنؤ ہی کو بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۱۰ جولائی کو ان ہی کو لکھا: "ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب محمود آباد[1] نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو میں تم کو بھی دلا دوں، لکھو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک پھوس کا مختصر بنگلہ اور چند اور چھپر کے کمرے بنوائے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالباً وہاں میری صحت بھی درست رہے" (۵۱)

بالآخر دارالمصنفین کے مرکز کے مسئلہ کا قطعی فیصلہ خود قاضی تقدیر نے کر دیا، یعنی اگست سنہ ۱۹۱۴ء میں اُن کے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم کی موت نے اُن کو اعظم گڈھ آنے پر مجبور کیا، یہاں سکون و اطمینان نظر آیا تو اسی شہر کو اپنے مقاصد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ ۴ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا: "میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلبہ کے نام مطلع کرو، اور خود ان کو لکھو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں،

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں

---

[1] سابق مہاراجہ محمود آباد محمد علی محمد خاں۔

کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہو گر پرایوٹ ہیں۔ اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہو اور سب حسب خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ غوغا میں مبتلا ہونا۔ دار المصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔ (۲۰)

اب اعظم گڈھ میں دار المصنفین کی بنیاد ڈالنی چاہی تو سب سے پہلے مولانا نے اس کے لئے اپنے ذاتی باغ اور بنگلہ کو وقف کرنا چاہا، لیکن چونکہ خاندان کے اور لوگ بھی اس میں شریک تھے، اس لئے ان کی رضامندی بھی حاصل کرنا چاہی۔ یہ لوگ راضی ہو گئے تو وقف نامہ لکھوانا شروع کیا، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مجھے لکھتے ہیں:- تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں، دار المصنفین، تکمیل وغیرہ کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔ کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہو گئی ہیں۔ چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں۔ وقف نامہ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دار التصنیف بن گیا ہے۔ (۲۱)

وظائف کا انتظام

چونکہ اب تک دار المصنفین کے لئے کسی قسم کی آمدنی نہ تھی اس لئے درجہ تکمیل کے وظائف کے لئے مولانا حمید الدین صاحب نے [illegible] روپیہ ماہوار مقرر کئے۔ اسی قدر مولانا نے اپنی طرف سے منظور کیا۔ کتب خانہ، باغ اور بنگلہ کی وسعت و ترمیم میں جو مصارف کثیر پڑنے والے تھے ان کا بار بھی مولانا نے خود اپنے سر لیا۔ دار التصنیف اور دار التکمیل کے طلبہ کے قیام کے لئے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا۔ باغ کے پہلو میں سڑک پر جو سرکاری مکان تھا اس کے خریدنے کا بھی سامان کرنا چاہا۔ (مسعود) [22]

دارالمصنفین کا تعلیمی حصہ	ان تمام مراتب کے طے ہو جانے کے بعد طلباء دارالمصنفین کے لئے حسب ذیل

قواعد داخلہ بنائے،

۱۔ مدت تعلیم دو سال،

۲۔ اس کی دو شاخیں ہوں گی تکمیل و تصنیف،

۳۔ ہر طالب العلم جو صرف و نحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہو سکیگا،

۴۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا،

درجۂ تکمیل اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے، ادب اور علوم ثلثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم کلام مع فلسفہ،

درجۂ تصنیف (۱) اس میں وہ شخص شامل ہو سکیگا جس کو انشاء پردازی کا فی الجملہ ذوق ہو، اور عربی صرف و نحو کافی طور سے جانتا ہو، اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو،

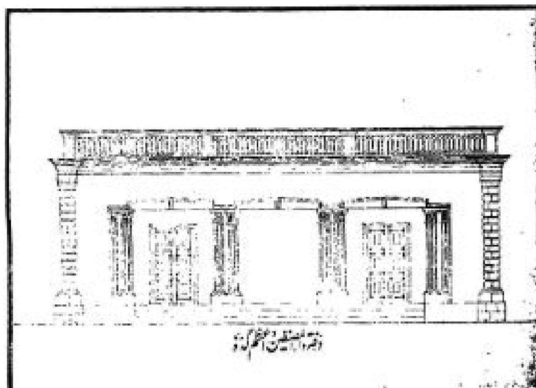
(۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشاء پرداز ہو، لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کرسکے،

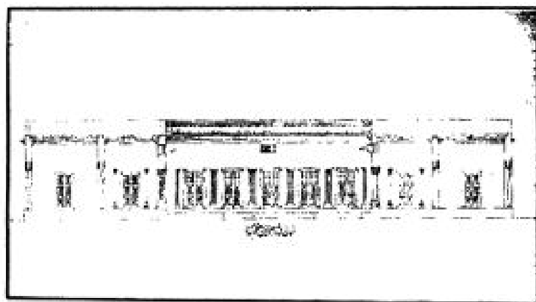
(۳) طریقۂ تعلیم فن تصنیف،

۱۔ پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دیئے جائیں گے، اور مضامین لکھوائے جائیں گے،

۲۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے،

۳۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے مآخذ بتائے جائیں گے، اور تمام ماخذ مہیا کر دیئے جائیں گے کہ مطالعہ کرسکے،





۴ - پھر جو (یہاں یہ عبارت ناتمام رہ گئی ہے)

اس کے بعد طلبہ کی جستجو ہوئی اور اس کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا کہ "برائے تکمیل یا تصنیف والوں کے متعلق نقشۂ ذیل کی خانہ پری کرکے بھیجدو:"

۱ - نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ،

۲ - مستطیع ہیں یا غیر مستطیع،

۳ - کس فن کی تکمیل چاہتے ہیں، سردست صرف تفسیر و ادب کی تکمیل کا انتظام ہو سکتا ہے،

۴ - کتنی مدت تک قیام کریں گے،

۵ - مقصد زندگی کیا ہے،

۶ - وضع[1] و لباس و فرائض میں علما کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں،

گو یہ جزئی بات ہے لیکن میں شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قلق[2] یہ ہے کہ تو صحت ناگوار ہے: میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں،[3] ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت[4] دونوں عالمانہ ہو، علما کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلبہ بھی اسی کے قریب قریب استعمال کرتے تھے:" (مسعود - ۳۱)

طلبہ کا انتخاب ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد طلبہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، مدتُ

---

[1] یہ تمام قواعد خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں [2] یہ دونوں نے اپنے ایک خط میں لکھی ہو جو انتخاب میں شامل ہے [3] وزنی تر شو ا [4] یہ وہ حقیقت ہے جو اس زمانہ میں مولانا پر منکشف ہو چکی تھی، اور اب اسی کی تلافی ان کے پیش نظر تھی،

کے فارغ التحصیل یا قریب فارغ التحصیل طلبہ میں سے جن سے وہ خود واقف تھے، چند طلبہ کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد متعدد طلباے ندوہ نے داخلہ کے لئے بشوق خطوط لکھے تو یہ قرار پایا کہ تمام طلبہ بقر عید کے بعد آجائیں (مسعود۔ ۲۲) مولوی ابو الحسنات عبد الشکور ندوی مرحوم سابق رفیق دار المصنفین کا انتخاب خود مولانا ہی نے فرمایا تھا چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "عبد الشکور کا ایک قصیدہ ملا، تمہارے پتہ سے جواب مانگا ہے، جواب کی کیا حاجت ہو، بقرعید کے بعد آ جانا چاہئے،

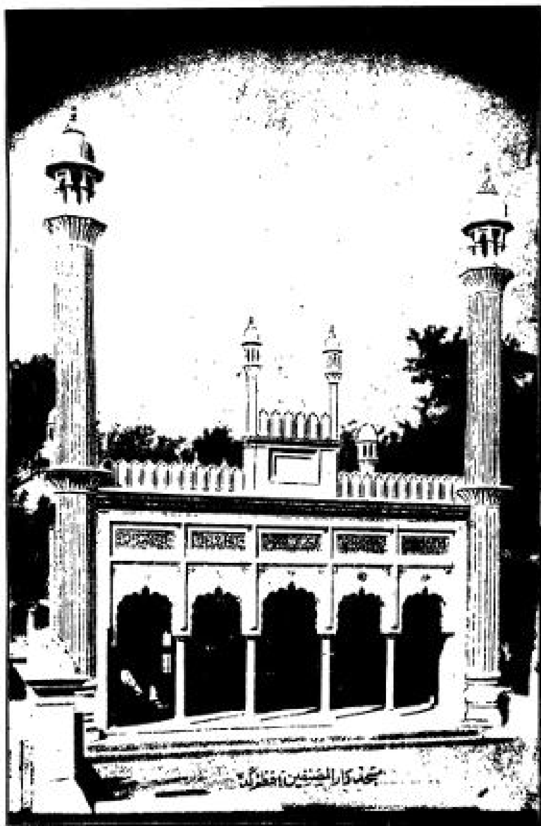
قصیدہ میں کچھ غلطیاں اور کمزوریاں ہیں لیکن طبیعت میں قابلیت ہے، اس لئے بہت جلد یہ خامیاں نکل جائیں گی" (مسعود۔ ۲۵)

اس رائے کے مستحکم ہو جانے کے بعد ندوہ کے جن طلبہ کو قابل تربیت سمجھتے تھے، ان پر خود بخود ان کی نگاہ پڑی، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "عبد الرحمٰن نگرامی بھی قابل تربیت ہو (مسعود)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "سید سلیمان نے عثمان کی تعریف لکھی ہے کہ وہ میرے پاس رہنے کے قابل ہیں، انشا پردازی کا بھی مادہ ہے، خلیل صاحب اگر میں تو بلاؤں، ان کے لئے تو وظیفہ بھی خود دیدوں گا

ــــــــــــــــــــ

لہ عین شباب میں وفات ہوئی، یہ بہار کے ایک قصبہ کے تھے، ان کے حالات کے لئے دیکھئے معارف نومبر ۱۹۲۰ء۔ لہ عین جوانی میں انھوں نے بھی وفات پائی، یہ نگرام ضلع لکھنؤ کے باشندہ تھے، اور ایک علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تفصیل کے لئے دیکھئے معارف مارچ ۱۹۲۰ء۔ لہ یہ بہار ملک کا ندی علاقہ کے باشندہ، اور ندوہ کے فارغ التحصیل تھے، کچھ دنوں ندوہ کے کتب خانہ میں کام کرتے رہے، پھر وطن چلے گئے، اور وہاں کے ایک مقامی اسکول میں ہیڈ مولوی ہو گئے، اور چند سال کے بعد مرض دق میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کو عربی ادب سے کافی ذوق تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ لہ یہ مشہور محدث شیخ حسین صاحب عرب کے جو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی قدر دانی سے بھوپال میں رہ گئے تھے، اور ہزاروں علما، اور محدثین کے استاد تھے، پوتے تھے، ان کے والد شیخ محمد صاحب عرب ندوہ میں مدرس ادب تھے، اسی سلسلہ میں شیخ محمد خلیل صاحب نے ندوہ میں تعلیم پائی، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، چند سال کے بعد مزاج کی ناسازی کے سبب مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے، اور اس وقت ۱۹۵۴ء مجلس علما بھوپال کے رکن ہیں جو ریاست بھوپال کا ایک معزز سرکاری منصب ہو۔



مسجد دارالمصنفین اعظم گڑھ

بہرحال کام جس سرگرمی سے ہو رہا تھا اس کے لحاظ سے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء تک مولانا اس قابل ہوگئے تھے کہ دو تین مہینہ کے بعد اپنے احباب خاص کو دارالمصنفین کے دیکھنے کے لئے مدعو کرسکیں چنانچہ نواب علی حسن خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میرا تو یہ حال ہے کہ میں نے اچھا وسیع قطعہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کیلئے لے لیا ہے، اور جو وقت اور رفاہ وہاں بیکار جا رہا تھا اس کو موزوں اور مناسب موقع پر صرف کردیا دو تین مہینہ کے بعد آپ کو تکلیف دوں گا کہ آپ خود بھی دیکھ لیں" (علی حسن خاں ۱۵)

لیکن اس کے سوا ہی دن کے بعد مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور دل کی حسرت دل میں رہ گئی، تاہم مولانا نے دارالمصنفین کے متعلق جو یہ پیشین گوئی کی تھی کہ "شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" (شروانی ۱۱۷) وہ پوری ہوئی، ان کی نیک نیتی سے اُن کے بعد ہی دارالمصنفین قائم ہوا، اور اب تک جس طرح چل رہا ہے اس کو ہر شخص بطور خود دیکھ سکتا ہے۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ذات نبوی سے عقیدت اُستاذ مرحوم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے بڑی شیفتگی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ اس نام نامی کے ساتھ اُن کی عقیدت کی کوئی حد و پایاں نہ تھی، یہاں تک کہ قصیدہ کے دیباچہ میں بظاہر اس حد سے بھی تجاوز کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

شیفتگانیم و پیمبر پرست[1] — سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

[1] پرستیدن کے دو معنی ہیں، پوجا اور خدمت کرنا، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی ہم خادم رسول ہیں۔ مگر شاعرانہ ابہام دو

بدء اسلام | انھوں نے علی گڈھ آکر نئی طرز پر جب تصنیفات کا آغاز کیا تو یہ آغاز بھی ذات مبارک کے ذکر خیر ہی سے فرمایا اور بدء الاسلام کے نام سے عربی میں سیرۂ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو علیگڈھ کے کالج کے نصاب میں داخل تھا،

سیرت کا ابتدائی خیال | اردو میں جب نامورانِ اسلام کا سلسلہ چھیڑا تو بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہئے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا ہے۔ اس لئے الفاروق و الغزالی کے بعد ۲۰ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۵ رجون ۱۹۰۴ء کو انھوں نے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں اس کام کا آغاز کیا، اور ہجرت تک کے واقعات قلمبند کئے (یہ مسودہ اب تک دار المصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہے) مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس انداز سے وہ اس کو لکھ رہے تھے وہ خود ان کو پسند نہیں آرہا تھا، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اس کو راز رکھا، اور سارے مکتوبات میں کہیں ایک حرف بھی اس کے متعلق انھوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی سے نہیں کہا، صرف ایک خط میں اس کا تذکرہ اس بنا پر آگیا ہے، کہ حیدرآباد میں مولوی حسین عطاء اللہ صاحب کے پاس بہت اچھا کتبخانہ تھا، اس کتاب کے لئے ان کو بعض کتابوں کی ضرورت پیش آئی تو ۲۰ رمئی ۱۹۰۳ء کو ان کو لکھا، "میں نے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنی شروع کی ہے، جو سعادتِ دارین کا ذریعہ ہے، اس کے لئے اس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے، میرا کتب خانہ تمام دکن میں ہے" (مکاتیب اول طبع دوم صفحہ ۳۰۴) لیکن اس پر بھی وہ غزوۂ خندق سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

اصل یہ ہے کہ ان کے ذہن میں اس زیر تجویز کتاب کا معیار بہت بلند تھا، اس سے کم کوئی

چیز ان کے دل کو نہیں بھاتی تھی۔ فرماتے تھے کہ سوانحِ عمری ایسی لکھنی چاہئے جس سے صاحبِ سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔ غالباً ان کے اسی خیال کا عکس اُن کے اِس قطعہ میں ہے جس کو غالباً ۱۹۱۳ء میں نظم فرمایا تھا:

فرشتوں میں یہ چرچا ہو کہ حالِ سرورِ عالم
دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے

صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدس سے آئی
کہ جو یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

فرماتے تھے کہ نعت کے متعلق عرفی نے بالکل صحیح کہا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

تالیفِ سیرت کا عزم | اس مشکل کے باوجود سیرت کی ضرورت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے بار بار رہ رہ کر آوازیں بلند ہوتی تھیں، اور وہ ان کو سُن کر چپ رہ جاتے تھے، لیکن جدید تعلیم جس تیزی کے ساتھ پھیلتی جاتی تھی، مذہبی بے خبری بھی اسی قدر بڑھتی چلی جاتی تھی، اور یہ صورتِ حال ایسی تھی جس کی روک تھام کی بڑی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کے احساس کا آغاز ان کو سب سے پہلی دفعہ ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اس سے ایک سال پہلے (۱۹۰۴ء) میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیوتھ نے محمد کے نام سے سیرت میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی اور بڑی محنت سے لکھی اور اس خصوصیت کے ساتھ لکھی کہ اس میں اکثر حوالے احادیث کی کتابوں کے تھے

یہ کتاب بڑی زہرناک تھی اور انگریزی تعلیم یافتہ اس کی تحقیق و تلاش کے نتیجوں سے نہایت متاثر ہو رہے
تھے، اور اس تاثر کا اظہار سب سے پہلے مولانا کے سامنے انہی نے کیا جو اس عہد میں جدید تعلیم کا سب سے مایۂ ناز
فرزند گنا جاتا ہے یعنی محمد علی مرحوم نے۔ مرحوم اس زمانہ میں بڑودہ کی ریاست میں ایک عہدہ پر ممتاز تھے
گو وہ نئی تعلیم کے سب سے بہترین پیداوار تھے، تاہم اُن کا دل حیثیت سے مسلمان تھا، ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء
کو چھندواڑہ (سی پی) سے جہاں وہ نظر بند تھے مجھے ایک خط میں لکھا جو اُن کے مجموعۂ خطوط میں
چھپ گیا ہے اور جو حسب ذیل ہے،

"۱۹۰۶ء میں مولانا و اُستاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے
ہی پاس مقیم تھے .... اس زمانہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمایئے کہ سیرۃ نبوی کا کیوں
انتظام نہیں فرماتے، ہندوستان میں کون ہے جو گنا کے پے در پے گرجا سے بیجا تر حملوں کا جواب
دیگا خصوصاً اپنے اوکسفورڈ کے ...... استاد مارگولیوتھ کی طرف اشارہ تھا ...... نہ معلوم اس سے
قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا، مگر طرز گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری
تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں ہو کر گیا" (خطوط محمد علی مکتبۂ جامعہ ص۹۵)

بہر حال جدید تعلیم کی اس ضرورت کے ساتھ اس کے بعد ہی ندوہ وغیرہ کے جو ہنگامے شروع
ہوئے اور اشاعت و حفاظت اسلام کی جو تدبیریں اُن کے سامنے آتی رہیں، ان سب نے مل کر
سیرت نبوی کی تالیف کے ارادہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں ان کے ارادہ
نے عزم کی صورت اختیار کر لی، چنانچہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنے
اس عزم کا اعلان کر دیا، اسی اعلان میں جو اسی ماہ رسالہ الندوہ میں چھپا ہو اس کو بھی درج کرد

ہوگا ان کو اس ضرورت کا احساس کیوں ہوا، فرماتے ہیں: "سیرت نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے، اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا، یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اگر جاننا چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی، اس لئے اس کو چار و ناچار انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن میں یا تعصب کی رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں: ...... میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بنا پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہو .... قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضا ہے کہ میں سب کام چھوڑ کر سیرت نبوی کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں، خود میں بھی اپنی پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں، اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں۔" (مقالات شبلی جلد [illegible])

اب مصنف نے احادیث وسیر کا مطالعہ شروع کیا، اور جیسے جیسے یہ مطالعہ بڑھتا گیا، نظر میں وسعت، دل میں تڑپ اور روح میں بالیدگی بڑھتی گئی، سیرت کے جو اوراق انھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں لکھے تھے ان کو سنہ ۱۹۱۳ء والے اوراق سے ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب صرف دماغ سے، اور دوسری دل سے لکھی گئی ہو، نقش اول میں مورخ کے قلم کی گلکاری ہے اور نقش ثانی میں جو سراپا کھینچا گیا ہے، اس میں مورخ کے ساتھ محدث کی قلمکاری بھی شامل ہے۔

ہمارے دوست اور رفیق درس اور مولانا کے عزیز شاگرد مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی (ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد) نے الندوہ کے سلسلۂ جدیدہ میں یاد ایام کے نام سے جو مسلسل مضمون لکھا ہے، اسی میں اس موقع پر لکھتے ہیں: "علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا،

دو ... ے کہ ندوہ میں اسٹرائک ہو چکی ہے، ہوویوں نے قبضہ کر لیا ہے، ایک آنکھ میں نزول آب شروع ہو گیا ہے،
اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں تو قلق ہوتا ہے، ان کی معذوری پیش نظر ہو جاتی ہے، اب وقت اس قسم کے
ہیجان برداشت کرنے کا نہیں ہو حقیقتہ شاگرد رشید دلجوئی کا ہو جاتا ہے، اور یہ عرض کرتا ہے کہ اس وقت
تک آپ نے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی، مگر اب فضیلین لا الہ دین کا وقت ہے، الامر
بالخواتیم، استاد و علامہ چپ ہو جاتے ہیں، استاد و شاگرد آبدیدہ ہو جاتے ہیں، استاد فرط محبت سے شاگرد
کو چپٹا لیتا ہے، اور پھر دو باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں، علوم القرآن اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم، شاگرد
عرض کرتا ہے کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہے، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہئے تھا، پھر ہندوستان میں اس کا
مخاطب کون ہے، دوسرے میں اس کو دلچسپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہے، جو آپ کے سن و سال و قوی
کے مناسب حال نہیں، آخر میں سیرت پر اختتام ہو جاتا ہے، دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودہ اعلان پہلے
تیار تھا، مجھے دکھایا پھر طباعت کر بھیجا، کچھ خدمت سیرت کے متعلق سپرد ہو جاتی ہے، جس کی تعمیل بشوق
ذاتی روانہ کر کے بھیجی گئی، مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ محض صحیح واقعات اور عمدہ
ترتیب پر مبنی ہونی چاہئے، اور کچھ نہیں، انما الاعمال بالنیات، یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کمی نہ تھی
علم و فہم میں کیا کسر تھی، تو برکت کیوں حاصل نہ ہوتی، عشق رسول کی آگ بھڑکی ہوئی تھی"

مجلس تالیف سیرت | بہرحال جیسا کہ ابھی گذرا ۱۹۱۲ء کی شروع تاریخیں تھیں کہ ان کے ارادہ نے عزم

؎ مضمون نگار کو واقعہ کی صحیح تاریخ میں کچھ تشابہ ہو گیا ہے، ندوہ کی اسٹرائک کا واقعہ اس کے دو سال بعد مارچ
۱۹۱۴ء میں پیش آیا، اور سیرت کی تالیف کا اعلان جنوری ۱۹۱۲ء میں ہوا ہے، بہرحال اختلافات شروع ہو گئے
تھے، اور مولانا بددل ہو رہے تھے، جس کا آخر نتیجہ اسٹرائک تھا، (س)

کی صورت اختیار کر لی، اور جنوری ۱۹۱۲ء کو صرف شروانی کو لکھا: "سیرۃ نبوی کا شروع سال ہو، عزم ہو، لیکن پچاس ہزار سرمایہ کی ضرورت ہے، کیا قوم سے یہ مہیا ہو سکتی ہے؟" (مکاتیب) مگر اس عزم نے چند ہی روز میں یہ شدت اختیار کی کہ محرم ۱۳۳۰ھ مطابق جنوری ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں سیرۃ نبوی کی تالیف کا برملا اعلان کر دیا اور قوم سے اس کے ماہانہ مصارف کے لئے ڈھائی سو ماہوار، اور خرید کتب کے لئے کچھ اور نقد روپے کی درخواست کی، اور تجویز پیش کی کہ مجلس تالیف سیرۃ نبوی کے نام سے ایک مجلس قائم کی جائے جس میں وہ ارکان شامل ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپے ماہوار دیں، یا جو عام ارکان میں داخل ہو کر ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں یا معین نہیں اور نایاب و قلمی کتابیں بہم پہنچائیں، یا اور کسی طریقہ سے مدد دیں، تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں، ان کو یکجا کیا جا سکے، اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں، اور کچھ علما ہوں جو روایات کی تلاش و تنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں، جو مسودوں کو صاف کریں۔

سرکار عالیہ بھوپال کی امداد اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا، اور فال نیک یہ کہ سب سے پہلے ایک مسلمان خاتون بنت نصیر الدین حیدر، بیوہ تہور یار جنگ (حیدرآباد دکن) کا خط، اشاعت کے قابل تھا، جس کو مولانا نے اپریل ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں شائع کیا۔ یہ مشیت الٰہی کی طرف سے اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کام کے لئے دانہ دانہ چننے، اور کوڑی کوڑی جوڑنے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ کوئی مخدومۂ جہاں خود آگے بڑھ کر روپیوں کی تھیلی سامنے رکھ دے گی، چنانچہ یہی ہوا، منشی محمد امین صاحب زبیری نے جو ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری تھے سرکار سے عرض کیا کہ حضور، آج کونین کی دولت لٹ رہی ہے، آپ

اس کو بُرا کر کیوں ادا نہیں لیتیں، یعنی ایک عاشقِ رسول مصنف گلے میں جھولی ڈال کر سیرۃ نبوی کی تصنیف کے لئے قوم سے بھیک مانگنے نکلا ہے، یہ عزت حضور کیوں نہیں حاصل کر لیتیں! اور اس فقیر کی جھولی میں دعائی سو ماہوار ڈال دیتیں کہ وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے کام میں معروف ہو جائے" یہ بات بیگم صاحبہ کے دل میں اُتر گئی، انھوں نے اس حصولِ سعادت کی رضامندی ظاہر کی، منشی صاحب نے مولانا کو مطلع کیا، اور اپریل ۱۹۱۲ء کے شروع میں اُن سے باقاعدہ درخواست منگوائی گئی جو ۸ اپریل ۱۹۱۲ء کو دو برس کے لئے دو سو ماہوار کے حساب سے منظور ہوئی، مولانا نے مئی ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں بڑی مسرت سے اس کا اظہار کیا۔" مجلس تالیف سیرت نبوی کے لئے چندوں کے وصول کرنے کی جن مختلف تدبیروں کا اعلان کیا گیا تھا، ایک ذریعہ وقت کی فیاضی نے اُن سب کو منسوخ کر دیا، عام مسلمانوں کو سیرت نبوی کے ساتھ جس شدت سے شغف اور اعتنا ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اعلان کے بعد ہی اس تحریک نے، جدید تعلیم کے افراد عالیہ نے، قدیم تعلیم یافتہ اشخاص نے، روساے ملک نے، عام مسلمانوں نے، اور نہ صرف جنس رجال نے بلکہ جنس اناث نے بھی نہایت جوش کے ساتھ مالی، علمی، اور عام امداد کے لئے آمادگی ظاہر کی، بعض لوگوں نے بلا طلب چندے بھی بھیجنا شروع کر دیئے، لیکن عدم ضرورت کی بنا پر واپس کئے گئے، بعضوں نے اصرار بھیجے، لیکن پھر واپس کئے گئے، یہ دلائل ہیں ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُس غیر فانی عقیدتمندی کے جس کو مسلمانوں کے سینوں سے نہ تعلیم جدید محو کر سکتی ہے، اور نہ مغربی بے اعتنائی کے قوی اثرات اس کو مٹا سکتے ہیں۔"

کتابوں کی خریداری کے لئے دو ہزار روپیے نواب زادہ حمید اللہ خاں موجودہ اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کی طرف سے منظور ہوئے،

معارف کی طرف سے مطمئن ہو کر مولانا نے سیرۃ نبوی کا دفتر قائم کیا، ایک عربی کا مددگار اور دو انگریزی کے مترجم رکھے، عربی کے مددگار کے عہدہ پر انھوں نے اپنی شفقت سے خاکسار کو منتخب فرمایا، اور صیغۂ تعلیم سے بنا کر سیرت کے اسٹاف میں لے لیا، اور یہ خدمت سپرد ہوئی کہ صحیح بخاری سے سیرۃ کے واقعات کو یکجا کروں اور انگریزی مترجموں میں سے ایک کو پروفیسر مارگولیوس کی کتاب محمد اور دوسرے کو سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد ترجمہ کے لئے دی گئی لیکن خود مولانا اشاعت اسلام وغیرہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے کام جلد شروع نہ کر سکے، اور یکم اپریل ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں :- "ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی لیکن اب قبول کرتے ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں،

میں آج کان پور روانہ ہوتا ہوں، نو مسلموں پر آریہ جو جال ڈال رہے ہیں وہ سخت خطرناک درجہ تک پہنچ گیا ہے، اس غرض سے تمام اضلاع میں دفاعی انجمنیں اور دیہات میں مکاتب قائم کرنا مقصود ہے، لیکن چونکہ گرمی سخت ہو رہی ہے اس لئے یہ دورہ مختصر ہوگا، اسی طرف سے بھوپال آ رہا تھا، بجز بنگلور یا بمبئی جاؤں گا، کتابیں ساتھ نہیں جا سکتیں، نہ اسٹاف ساتھ جا سکتا ہے، اس لئے سیرۃ نبوی کا کام بعد بارش سے شروع ہوگا، یہ بھی خیال ہے کہ یہ کام کسی طرح دو برس میں انجام نہیں پا سکتا، اس پر مستزاد یہ کہ ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لئے جلدی بھی کرتا ہوں کہ کچھ کر لوں، ورنہ جس قدر میں کر سکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر نہیں آتا، کتابوں کی فہرست تیار ہو رہی ہے، بہت سی کتابیں تو خود ندوہ میں موجود ہیں، زائد جو مطلوب ہیں ان کو منگوانا ہے، اشاعت کی فکر نہ کیجئے، میں خود کر سکتا ہوں۔" (م)

لکھنؤ میں رہ کر ان کو سکون نہیں ملتا تھا، اس لئے سیرۃ کی تالیف کی خاطر بمبئی کے کسی ایک

گوشہ میں بیٹھ کر عزلت گزیں ہونا چاہا، منشی صاحب کو ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء کو لکھا: "میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کر کے سیرت کو ختم کر دوں۔ یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے، اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسباب ساتھ لیجاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوشنویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی" (۱۵)

مئی کے آخر میں بمبئی جاتے ہوئے مولانا بھوپال اترے، اور حضور عالیہ نے شرفِ ملاقات بخشا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب مصنفِ البرامکہ کا جو اُن دنوں بھوپال میں تھے، بیان ہے کہ مولانا نے اسی موقع پر اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی	مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم ؐ	خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکارِ عالیہ اس کو سُن کر بیحد متاثر ہوئیں، اور مصنف کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی،

سرکارِ بھوپال سے سیرت کی امداد کا اجرا صرف دو برس کے لئے ہوا تھا، یہ زمانہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی اہم کتاب کے لئے بہت ہی کم تھا، چنانچہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا: "میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکارِ بھوپال رقم بند کر دیں، لیکن اب روپیہ کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں میں کام جاری رکھوں گا، اور اگر مر گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی ترتیب کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی" (۱۶)

دو برس تمام ہوتے ہوتے سرکارِ عالیہ خلد اللہ ملکہا نے اپنی امداد کی مدت تا تکمیل بڑھا دی، اس سے خوش ہو کر مولانا نے قطعہ کہا جس کو ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب کے خط میں لکھ کر بھوپال بھیجا،

معارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں قدرے — کہ بہ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے

رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

مولانا کا خیال تھا کہ سرکار عالیہ کی یہ امداد اس سلسلہ کی دوسری تالیفات کے لئے ہمیشہ جاری رہے تو بڑے کام نکلیں، چنانچہ ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء کو منشی صاحب موصوف کو لکھا: "سیرت کی رقم بھی مستقل ہو جاتی تو بہت اچھا تھا، اس مد کی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم رہتا، کاموں میں بھنک تو ڈال دیجئے یہ وسیع سلسلہ ہے، مثلاً سیرۃ الصحابہؓ، سیرۃ ازواج پیغمبر علیہ السلام وغیرہ وغیرہ"

عجیب بات ہے کہ مولانا اور سرکار عالیہ کی وفات کے بعد اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں کے عہد میں مولانا کی یہ آرزو تکمیل کو پہنچ گئی، سرکاری امداد مستقل ہو گئی، اور سیر الصحابہ وغیرہ بھی دس بارہ جلدوں میں لکھ کر پوری کر دی گئی،

تالیف سیرۃ کا آغاز سیرۃ کی تالیف کا آغاز باپ کعبہ یعنی بمبئی میں شروع کیا گیا، یعنی وہیں قلم نے سیرۃ کی پہلی سطریں لکھیں، آغاز کا زمانہ بھی معلوم ہے۔ ۱۹ جون سنہ ۱۹۱۲ء کو لکھتے ہیں: "ابھی تک میں نے لائف کا کچھ کام نہیں کیا، طبیعت مطمئن نہیں، کل سے کام شروع کروں گا ....

اگر وہاں کتبخانہ میں تفسیر فتح البیان مع تفسیر ابن کثیر موجود ہو تو ضرور لیتے آئیے گا، یہاں نہیں ہے، اور میں ساتھ نہیں لایا، سید سلیمان آ گئے" (اِیں ۱۰۰)

مولانا نے مجھے اس لئے بلایا کہ میں انھیں روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق

ہیں مدودوں، یہ بھی ذکر کے قابل ہے کہ بمبئی میں سیرت کے آغاز کا مقدس کام کس مکان میں ہوا، تھرڈ پارسی کے پاس پالن جی ہوٹل نامی ایک مکان تھا اس کے اوپر کے ایک کمرہ میں مولانا مقیم تھے، اور خاکسار بھی اسی عمارت کے دوسرے گوشہ کے ایک دوسرے بالائی کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا، اس سڑک کی خصوصیت یہ تھی کہ ادھر سے ٹرام نہیں گذرتی تھی، اور مکان بھی سڑک سے فاصلہ پر تھا، اس لئے بمبئی کے عام شوروغل سے یہ محفوظ تھا اور یہی اس کے انتخاب کی وجہ ترجیح تھی۔

مولانا نے بڑے روحانی جوش و سرمستی کے ساتھ کتاب کا آغاز کیا، ابھی چند ہی صفحے لکھنے پائے تھے کہ سفر ڈھاکہ کی ضرورت پیش آگئی، سفر کا باعث ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت تھی، مگر اس کا ثانوی مقصود کلکتہ میں، ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا تھا، اور جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھتے ہیں: "سیرت کے لئے ایشیاٹک سوسائٹی میں بعض کتابیں بھی دیکھنی ہیں، انگریزی کتابوں سے جس قدر اقتباسات ہو رہے ہیں، ان سے کذب و افترا کا عجب منظر سامنے آجاتا ہے، مرگولیس پروفیسر آکسفورڈ جو سب سے بڑا عربی عالم ہے، اس کی لائف آف محمد دیکھنے کے قابل ہے، لکھتا ہے کہ عبد المطلب، معلقے کے غلام تھے، کعبہ آنحضرت صلعم سے صرف سو برس پہلے کی عمارت تھی وغیرہ وغیرہ، یہ کام ہو رہا ہے، سیرت کی ماخذ اصلی صرف تین کتابیں ہیں، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ان کے تمام رواۃ کا استقصا کرکے ان کا اسماء الرجال، تہذیب وغیرہ سے مرتب کرا رہا ہوں، کہ روایتوں کے انتخاب میں آسانی ہو، سید سلیمان یہ کام کر رہے ہیں، اور وہ یہیں ہیں، خود الگ سیرت میں مشغول ہوں، انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔" (شروانی ۱۰۰)

وہ اگست کے شروع ہفتہ میں کلکتہ ہو کر ڈھاکہ گئے۔ (عبدالقادر ص ۲۰) اور پھر اُسی طرف سے کلکتہ میں کتابیں دیکھ کر بمبئی واپس آگئے۔ اس وقت تک انگریزی میں سیرت کی بہت سی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا، اگرچہ لائق گریجویٹ اُن سے بعض اہم کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے، پھر بھی ان ساری کتابوں کے ترجمہ کے لئے بڑی محنت اور بڑا سرمایہ درکار تھا، اس لیے یہ تجویز کیا کہ اپنے دوستوں میں سے اُن اصحاب کو جو انگریزی جانتے ہیں ایک ایک دو دو کتابیں بانٹ دیں، اور اُن سے خواہش کریں کہ وہ ان کو پڑھ کر قابلِ اعتراض مقامات پر نشان لگا دیں۔ چنانچہ اسی تجویز کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۱۲ء کو ان اصحاب کے نام خطوط جاری کئے جن میں سے مولانا شروانی اور شیخ عبدالقادر صاحب کے نام خطوط مکاتیب میں درج ہیں۔ (شروانی ص ۲۰، عبدالقادر ص ۱۰) جن صاحبوں نے اس خدمت کو قبول کیا اُن کے پاس کتابیں بھیج دیں، اور انھوں نے اُن کو دیکھ کر واپس کیا

ستمبر ۱۹۱۲ء تک مولانا بمبئی میں رہے، اس اثنا میں ولادتِ باسعادت سے لیکر خانہ کعبہ کی تعمیر کے باب تک لکھا جا چکا تھا کہ جنازہ سفر نے ہندوستان کا رُخ کیا یعنی مولانا وقف وغیرہ کے کاموں کے سبب سے لکھنؤ واپس چلے آئے، تاہم اس وقت تک کتاب کے سو صفحے ہو چکے تھے، ۸ نومبر ۱۹۱۲ء تک اُن پر نظرثانی ہوئی اور مضامین میں حذف و اضافہ ہوا۔ اسی تاریخ میں لکھتے ہیں: "سیرۃ کے سو صفحے ہو چکے تھے، لیکن نظرثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا، یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لئے سیکڑوں اوراق اُلٹنے پڑتے ہیں، یہ کمبخت کھلے ترجھوٹ ہیں، لیکن بے پتہ نہیں لکھتے، یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کی ہیں۔" (اسلم ص ۱۲)[1]

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۱۲۳ (طبع اول) تک۔

فروری ۱۹۱۲ء میں وہ چودہ جز تک پہنچے تھے۔ (عبدالباری ۴۰) لیکن اپنی ناسازی طبع کے
سبب سے اُن کے دل میں یہ خیال کانٹا سا کھٹکتا تھا کہ وہ اس کی تکمیل اس حالت میں کر سکیں گے
یا نہیں۔ یکم مئی ۱۹۱۲ء کو اپنے ایک عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں: "سیرۃ چل رہی ہے۔ اب نظر آتا ہے کہ
واقعی ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کر سکوں گا یا نہیں (عبدالباری)
یہاں تک کہ ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو سیرۃ کا سادہ مسودہ فتح مکہ و حنین تک پہنچ چکا تھا۔ (عبدالباری ۴۴)

سیرۃ حصہ | اس زمانہ میں ندوہ کے کاموں میں بہت سے جھگڑے پڑ گئے جن میں سب سے اہم
مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی کا مسئلہ تھا جس پر اخباروں میں بڑی بحثیں رہیں۔ اس لئے جون
۱۹۱۲ء میں وہ تنہائی اور دماغی سکون کی خاطر بمبئی چلے گئے۔ اس سفر میں میرے بجائے مددگا
ری کی حیثیت سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ان کے ساتھ تھے۔ اس دفعہ وہ نیو ناگپا
ڑہ روڈ بائی کلہ کیر بلڈنگ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر رہے، اور سیرت جلد اول کی تالیف میں
ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ بلکہ دارالعلوم کی معتمدی سے بھی استعفا دے دیا، تاکہ دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کے لئے دماغ کو پوری یکسوئی حاصل ہو۔ ۹ جولائی ۱۹۱۲ء کو شروانی صاحب کو لکھا: "پہلی جلد
کا نصف حصہ ہو گیا ہے۔ ہر ہفتہ میں طبیعت دو تین روز ناساز ہو جاتی ہے۔ اس لئے ناغہ ہو جاتا
ہے۔ بڑے بڑے معرکے طے ہوئے۔ اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھ کو
خود خیال تھا کہ ایسی کامیابی ہو گی، لیکن قدر کون کرے گا، کوئی شخص پہلے طبری و ابن الاثیر کو چھان
چکا ہو، تب اندازہ کر سکتا ہے۔" (شروانی ...)

اس پر بھی کام اس محنت سے کیا، کہ ۱۰ اگست ۱۹۱۲ء کو لکھا کہ دو تین مہینہ میں

سیرت کا پہلا حصہ تمام ہو کر طبع چلا جائے گا۔ (تذکرۂ شبلی، ۱۰) اسی لئے وہ بمبئی سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے اُن سے کلکتہ آنے کی فرمایش کی، تو ۷ اگست ۱۹۱۳ء کو انھیں لکھا: "کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں سیرت کے لئے کتابوں کی کثیر المقدار ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں لئے پھروں، یہاں سورتی سے، استعارۃً بھی کتابیں مل جاتی ہیں، اور بھی بہت سی خریدنی پڑیں، ایک کافی ذخیرہ ساتھ لایا تھا، پھر بھی ہر قدم پر ضرورت پیش آتی ہے، چونکہ بہت کچھ کام ہو بھی چکا ہے، اس لئے اب ہر منٹ گراں معلوم ہوتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پریس میں جا سکے" (ابوالکلام ۳۷)

اس بنا پر اس دفعہ بمبئی میں چار، پانچ مہینے جم کر اکتوبر ۱۹۱۳ء کے شروع میں جس طرح بنا سیرت کے پہلے حصہ کا مسودہ قریب قریب پورا کر لیا، اور ادھر سے یک گونہ اطمینان پا کر نواب عماد الملک کی خواہش پر حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر ۳ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھا: "کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالاتِ زندگی ہیں قریباً تیار ہو گیا ہے، اگرچہ اس میں بھی نہایت کدو کاوش اور تمام کتبِ حدیث و رجال کی چھان بین کرنی پڑی، تاہم اصل مرحلے آگے ہیں، کتاب پانچ جلدوں میں ہو گی، جو حصہ گویا تیار ہے وہ قریباً پانچ سو صفحوں میں ہے، بیدی کتاب کو اس کا چوگنا کر لیجئے" (امین ۱۴)

حیدرآباد میں اُن کو ایک نہایت پُر فضا مکان مل گیا، اس لئے وہاں کئی مہینے رہے (ابوالکلام ۳۹) یہاں طبیعت بھی فی الجملہ صحیح رہی، اور ارادہ فرمایا کہ جلد اول تمام کر کے یہاں سے اُٹھیں، وہاں کا کتب خانہ بھی اُن کے اس قیام میں معین رہا، (امین ۱۹) تاہم نومبر ۱۹۱۳ء تک سیرت کا پہلا

---

[1] اپنا سے غلام رسول سورتی تاجر کتب بمبئی،

دیباچہ سپرد قلم نہیں فرمایا، ہنوز اُس کا خاکہ اُن کے ذہن ہی میں تھا، (امین ۱۰) ۔ اور نومبر ۱۹۱۲ء تک اُن کی یہ خواہش تھی کہ وہیں چار پانچ مہینے رہ کر پہلی جلد تمام کر کے اٹھیں (عبدالماجد م) اسی لئے مولوی عبدالماجد صاحب (دریابادی) سے خواہش کی کہ وہ چند روز کے لئے سیرۃ کے انگریزی دفتر کی نگرانی قبول کریں تو پہلی جلد نکل جائے۔ کیونکہ معلوم نہیں کہ یورپ کے بے شمار ذخیرہ میں کیا کیا چیزیں لینے کے قابل ہیں، اور عام مترجم یہ نہیں بتا سکتے (عبدالماجد م) مولوی صاحب نے اس عہدہ کو قبول فرمایا، اور کئی مہینے تک لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتے رہے۔

دسمبر کے شروع میں ہم لوگوں کے اصرار سے مولانا حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور چاہا کہ یہاں بھی سکون نصیب ہو کہ کم از کم پہلی جلد اتمام کو پہنچے، (۱۴ جنوری ۱۹۱۳ء بنام شروانی صاحب (۱۱) لیکن اُن کے استعفے کی وجہ سے طلبا اور مدرسین میں ایک ہیجان برپا تھا جس کا نتیجہ طلبہ کی اسٹرائک تک جا کر نکلا، اور کئی مہینے اُس کے اوجھڑ بن میں گذر گئے، آخر مئی ۱۹۱۳ء میں اصلاحِ ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہوا، اور اصلاحِ ندوہ کی بہت سی تجویزیں منظور ہوئیں، اور جون ۱۹۱۳ء کے شروع تک وہ دہلی میں مصروفِ کار رہے، مگر ان جھمیلوں میں بھی جن میں ہر روز اُن کی تشویشِ خاطر کی ایک نئی صورت پیش آتی رہتی تھی وہ سیرت سے غافل نہ رہے، جیوں ہی اُن کو ذرا چھٹی ملی، وہ جون کے وسط میں بمبئی روانہ ہو گئے، بھائی کلا اکبر بلڈنگ میں قیام ہوا، اور سکون کے ساتھ پہلی جلد کو ہر جہت سے مکمل کرنے لگے، اور اب کتاب کی پہلی جلد اس حیثیت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی چھپائی کے مشورے بھی ہونے لگے، اسی درمیان میں سیرت کا وہ مقدمہ جو فنِ مغازی و سیر کی تاریخ اور اسلامی فنِ روایت کے اصول پر ہے مرتب فرمایا،

ایک فتنہ مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوشنما ٹائپ میں چھپے، مولانا نے نمونہ کے طور پر چھاپنے کے لئے اس مقدمہ کو انکے پاس الہلال پریس کلکتہ بھیج دیا، مولانا ابوالکلام نے اس مقدمہ کو الہلال میں بھی چھاپ دیا، تاکہ اہلِ نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے، لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۂ نبوی لکھی جائے وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے، کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظرِ عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کریں، یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبد الشکور صاحب اڈیٹر النجم نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی، مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا لیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا، اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ تک پہنچائی گئی، انھوں نے مولانا سے حقیقت حال دریافت فرمائی، اور اس کے جواب لکھنے کی فرمائش کی، بلکہ خود مولانا کو بھوپال آنے کا اشارہ فرمایا، مولانا نے منشی محمد امین صاحب کو لکھا کہ "نہایت مہمل و ردی نہ اعتراضات ہیں، جواب کے متعلق لکھا کہ وہ لکھ دیا جائے گا، لیکن میرے نام سے نہیں چھپے گا، نہ اظہارِ حقیقت ہو، نہ اظہارِ نام" وہ یا تو رسالہ کی صورت میں چھپے، یا الہلال میں بھیج دیا جائے[1]، آخر میں لکھا، "میں بارش کے قبل نہیں آسکتا، بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لئے آجاؤں، لیکن اس درجہ کے لوگوں کے لکھنے پر میری دوڑ دھوپ نہایت بیہودہ بات ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہو جاؤں" (ہی)

سرکاری مراسلہ کے جواب میں لکھا کہ سرکار عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں تاکہ مسودہ اُن کے پاس بھیج دیا جائے، اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کا

---

[1] سیرۃ النبی جلد اوّل کے صفحہ ۔ پر جو بڑا حاشیہ ہے وہ اسی جواب کا ایک حصہ ہے۔

نام اس کام کے لئے تجویز فرمایا، چنانچہ مولانا نے مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں مولانا عبید اللہ
صاحب سندھی کے ذریعہ سے اپنی خواہش پیش کی اور ساتھ ہی اپنا مسودہ بھی مولانا سندھی کے
پاس بھیجدیا کہ وہ اُن کو لے کر مولانا محمود حسن صاحب کی خدمت میں جائیں، لیکن اس تجویز کا جو
حشر ہوا وہ ان ہی کی زبان سے سنیے: "آج ان کا (مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کا) خط آیا کہ وہ گئے
لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحب کو باز رکھا کہ
وہ مسودہ کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں۔ دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہ
الگ ہیں، چنانچہ مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنایا، لیکن مولوی محمود حسن صاحب
کے تعلقات اب تک ان سے رہے ہیں، بہرحال اب غور کرنا چاہئے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں
نے ایک جتھا بنا لیا ہے، اس لئے سردست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگا
ورنہ سمجھیگا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا۔

اب اگر معاملہ اس پر موقوف ہو تو مجھ کو وظیفہ بھوپال سے خود دست بردار ہو جانا چاہئے۔ خیالات
میں تو یہ پہلے ہی شائع ہو چکا ہے، کوئی نئی بات نہیں، میں بھی کشمکش سے نجات پا جاؤں گا، اور کتاب
کو مطبع میں بھیجدوں گا۔

میں جانتا ہوں کہ سرکار کو بھی مولویوں کے بدنام کرنے کا خیال نہ ہوگا، اور ہونا چاہئے۔ اب اگر
سرکار چاہیں تو یا تو سرے سے اس رقم کو بند کر دیں یا دار المصنفین کی طرف منتقل کر دیں، یا جو اُن کی
مرضی ہو، مجھ کو ہر حال میں اُن کی رضامندی منظور ہے، یہ معلوم ہے کہ میرا کام رک نہیں سکتا، میں
خود مصارف کا متکفل ہو سکتا ہوں، اس کے علاوہ جس ریاست سے خواہش کروں، اعانت کے لئے

تیار ہو گی جواب جلد عنایت ہو، ورنہ نشانات کا خرچ ابھی سے کم کر دینا ہوگا۔" (امین۔ ۲۹)

قضیہ کی ناکامی

چنانچہ اس کارروائی سے جو بالکل صاف تھی سرکار عالیہ نے سمجھ لیا کہ یہ چند مولویوں کی محض معاندانہ باتیں ہیں، منشی محمد امین صاحب نے اس کی اطلاع مولانا کو دی، مولانا نے اُنکے جواب میں ۲۹ جولائی ۱۹۱۳ء کو لکھا: "آپ کا خط پہنچا اطمینان ہوا، میں جس تحقیق و تدقیق سے سیرت لکھ رہا ہوں، ناممکن تھا کہ مولوی محمود حسن صاحب اس کو دیکھتے اور تحسین نہ کرتے لیکن مخالفوں نے اُن کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرے سے دیکھنے ہی سے انکار کر دیں، البتہ مولوی عبیداللہ صاحب سندھی مسودہ دیکھ رہے ہیں، اُن کی رائے آجائے گی تو بھیجدوں گا، مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی پر اگر اطمینان ہو تو ان کے پاس بھیجدوں یا جو مصلحت ہو، یا یہ صورت ہے کہ سر دست اس قضیہ ہی کو خاموش چھوڑ دیا جائے۔" (۳۰)

اس پریشان خاطری کے باوجود سیرت کا کام بدستور جاری تھا، ۱۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "تسلیم، سیرت کو اتمام کے لئے بمبئی (بمبئی) کی خاموشی اور سکوت درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں، اس لئے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اوّل بہمہ جہت تمام کر کے اٹھوں، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا تاریخی اور تحقیقی راز کھلتا ہے، اور بعض مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ خوشنویس (کاپی نویس) کہیں لگا دیا ہے، ایک خاص دراندازی[۱] کی وجہ سے دیر ہو گئی، ورنہ مسودہ مطبع میں جا چکا ہوتا، ادھر پر زور ڈالا جا رہا ہے کہ سیرت چھپنے نہ پائے۔" (شروانی ۱۱۰)

منشی محمد امین کو یہ بھی لکھا کہ "اس دفعہ بمبئی میں پورے سال بھر قیام کا ارادہ ہے، بمبئی میں سارا دن کام کے لئے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لئے برس دن یہاں سے ہلنے کا ارادہ نہیں

[۱] بھوپال میں معاندین کی کارروائیوں کی طرف اشارہ ہے۔

بیرونی زندگی کا وداع | لیکن آہ وہ ع ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال، اس عزم پر ایک ہفتہ بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ جولائی کے تیسرے عشرہ میں ان کو الٰہ آباد میں اپنے بھائی کی شدید علالت کی اطلاع ملی، اور فوراً ہی وہ الٰہ آباد روانہ ہوگئے، بھائی نے ۵ اگست ۱۹۱۴ء کو وفات پائی، اور وہ دل شکستگی کے ساتھ گھر (اعظم گڈھ) واپس آئے، ۷ اگست ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی صاحب کو اپنے وطن واپس آنے کی خبر ان لفظوں میں دیتے ہیں: "آخر ساری دنیا ختم کر کے گھر میں آیا" (۱۹) لیکن اس حالت میں بھی سیرت کا خیال دل میں بسا تھا، ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو منشی محمد امین صاحب کو لکھتے ہیں: "میں اب بالکل دل شکستہ ہوگیا ہوں، برادر مرحوم کی موت نے دل بٹھا دیا ...... سیرت ادھوری ہی ہے گویا: تیری صحبت سے طبیعت ابھی طرح آگے نہیں بڑھتی" (ص ۳۱)

سیرت کے اُن مباحث میں جن کا تعلق صحف بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب سے جنھوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے جن کا حوالہ مکاتیب شبلی میں جا بجا ہے، اسی سلسلہ میں اُن کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کس حسرت سے لکھتے ہیں: "افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے"

وفات

۱۳۳۲ھ
۱۹۱۴ء

خرابی صحت | مولانا اگرچہ اپنی نوجوانی کے زمانہ میں بڑے قوی و توانا تھے، لیکن علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں میاں کی آب و ہوا کا اثر ان کی صحت و توانائی پر نہایت مضر پڑا، اور معدہ کی شکایت

شکایتیں مثلاً قبض، تبخیر وغیرہ پیدا ہو گئیں جو آخر عمر تک قائم رہیں۔ سفرِ کشمیر کے بعد علالت سخت کا سلسلہ جو برسوں قائم رہا، اس نے اُن کو اور بھی ضعیف و ناتواں کر دیا۔ چلنے پھرنے سے معدہ کو جو فائدہ پہنچتا تھا، واقعۂ شکستِ پا کے بعد اُس سے بھی محروم ہو گئے۔ اس نے معدہ کی شکایتوں میں اور بھی اضافہ ہوا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا نے ان شکایتوں کو اور بھی المضاعف کر دیا۔ اور پیچش اور اسہال کے دورے پڑنے لگے، اور حکیم عبدالولی صاحب لکھنوی اور حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب دہلوی کے علاج و تدبیر سے افاقہ ہوتا رہا۔ ان ہی شکایتوں کی بنا پر آخر عمر میں تبدیلِ آب و ہوا کے لئے بمبئی کو پسند کیا تھا، وہاں ہر سال موسمِ گرما میں جا کر چند مہینے قیام کرتے تھے اور وہاں کی آب ہوا کا اثر اُن کی صحت پر نہایت عمدہ پڑتا تھا۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "یہاں (بمبئی میں) بلا مبالغہ وہاں (لکھنؤ) کی بہ نسبت دونی غذا ہے۔ دعوتوں میں ثقیل غذائیں کھاتا ہوں کہ لکھنؤ میں دو مہینوں کی بیماری کے لئے کافی ہیں، یہاں صرف ایک آدھ وقت کا فاقہ کر دینا کافی ہو جاتا ہے۔" (وحید)

لیکن باایں ہمہ وہاں کی آب و ہوا کا اثر بھی اُن کی صحت میں کوئی ایسا نمایاں تغیر نہیں پیدا کر سکتا تھا کہ ان کو صحیح و تندرست کہا جا سکتا۔ اسی مہینہ اس سے ایک ہفتہ پہلے یکم ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود بمبئی سے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ہاں نسبتہً بہت اچھا ہوں، دوگنی بلکہ چوگنی ترقی ہوئی ہے، تاہم صرف ایک وقت کی غذا رہ گئی ہے، اور وہ بھی دو قرص۔" (رسیع ۵۰)

غرض پیچش و اسہال کے جو دورے اکثر پڑا کرتے تھے انہوں نے مولانا کو زندگی سے بہت کچھ مایوس کر دیا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء ہی میں جب لکھنؤ میں اسہال کا دورہ پڑا، اور اس سے صحتیاب ہو کر بمبئی تشریف لے گئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی ساتھ تھے، چونکہ ضعف سے خود خط

کا جواب نہیں لکھ سکتے تھے، اس لئے وہ اس فرض کو انجام دیتے تھے، اسی حالت مایوسی میں ایک دوست کو خط میں لکھوایا کہ اب اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے، اس لئے سال دو سال سے زیادہ جینے کی توقع نہیں؛ بہرحال وفات سے چند سال پیشتر صرف ایک حباب تھے جو ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ سکتا تھا، چنانچہ ایک عزیز شاگرد مولوی عبدالباری صاحب کو ۱۰ رجون ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں: "اب بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا، یعنی دن بھر دروازہ بند رکھتا ہوں، ہوا ذرا خنک ہوگئی جو تو اس کی برداشت نہیں ہو سکتی، ایک مرتبہ صرف ذرا بے احتیاطی سے بخار آچکا، بھائی تیل تمام ہو چکا بخدا اب مجھ میں کچھ نہیں رہا، خدا دو گھنٹوں میں سب مل کر یا دو چار بات کرناگراں ہوتا ہے، حالانکہ بخار وغیرہ کی کچھ شکایت نہیں" (عبدالباری ۔ ۵)

لیکن باایں ہمہ ضعف و علالت دل و دماغ صحیح تھے، اس لئے دل میں طرح طرح کے علمی مذاق، قومی اور مذہبی ولولے پیدا ہوتے تھے، اور جن کاموں کی تکمیل کا ارادہ کرچکے تھے، اس سے کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے، لیکن مولوی اسحاق مرحوم کی وفات نے دل و دماغ کو بھی ماؤف کردیا، اگرچہ اس حالت میں بھی اُن کا دماغ علمی تخیلات سے خالی نہ تھا، تاہم اب وہ اپنی زندگی سے قطعاً مایوس ہوچکے تھے، اور ہر کام کے لئے اپنا جانشین ڈھونڈتے تھے، چنانچہ مرض الموت سے تقریباً ایک مہینہ پہلے مولوی حمید الدین صاحب مرحوم کے نام ۱۶ راکتوبر ۱۹۱۳ء کو جو خط لکھا ہے اس سے اس مایوسی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے "دو دن اچھا، یا تو چار دن بیمار رہتا ہوں، لیکن بات چیت کرتا رہتا ہوں، لوگ جانتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہوچکا، ابھی ابھی سخت سردی گی، حالانکہ دوپہر کا وقت ہے،

افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے،

اور اگر دار المصنفین قائم ہو تو تمہارے سوا کون چلائے گا؟ آج سید سلیمان آ گئے اور کل پونہ چلے جائیں گے، لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے"

اسی زمانہ میں عید اضحیٰ کی تقریب سے، ۱۰ ذی الحجہ کو اپنے وطن بندول تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے دن پلٹ کر آئے تو اپنے قدیم مرض اسہال و پیچش میں مبتلا ہوئے،

یہ نومبر کی ۔۔ تاریخ تھی، تین دن تک پیچش، اور بواسیر کا دورہ رہا، ضلع کے سنٹ سرجن کا علاج رہا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا، چوتھے دن لوگوں نے طبی علاج شروع کیا، شہر کے طبیب نے پیچش کا معمولی نسخہ استعمال کرایا، نسخہ کے استعمال سے اس دن ۵۰-۶۰ دست آ گئے، اور ایک بار اس قدر خون آیا کہ طشت کا تین ثلث حصہ خون سے بھر گیا، یہ جسم کی قوت کی پہلی شکست تھی، اس کے بعد ضعف برابر ترقی کرنے لگا،

جب حالت نازک ہو گئی تو حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی اور حکیم عبد الولی صاحب مرحوم کو لکھنؤ تار دیا گیا، حکیم اجمل خاں مرحوم نہیں آ سکے، اتفاق یہ کہ حکیم عبد الولی صاحب مرحوم خود بیمار تھے، اور اسی بیماری میں انھوں نے وفات پائی، وہ لکھنؤ میں مولانا کے پرانے معالج تھے، انھوں نے نسخہ اور تجویز بتا کر اپنے چھوٹے بھائی حکیم عبد القوی صاحب کو بھیجا، مگر افسوس وہ اس وقت پہنچے جب بیمار "افاقۃ الموت" پا چکا تھا،

مولانا کو اپنی صحت سے پہلے ہی یاس ہو چکی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی اسی وقت سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام مسودے اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرا دیے، اور

عزیزوں کو جو تیمارداری میں تھے یہ وصیت فرمائی کہ یہ مسودے حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیئے جائیں۔ اس پر بھی سیرت کی ناتمامی کا داغ اُن کے دل کو رہ رہ کر بے چین کر رہا تھا۔ آخر وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین صاحب کو حیدرآباد، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور مجھے پونہ[1] کلکتہ اور دیسنہ کے پتہ سے تار دیئے۔ مولانا ابوالکلام کو جو تار دیا، اس کا مضمون یہ تھا۔ "اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی تکمیل کا کچھ انتظام ہو جاتا، ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی۔ سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلین سمجھا دیتا۔" (ابوالکلام ص ۳۰)

مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا معلوم نہیں اُن کو یہ تار ملا یا نہیں۔ میں اس وقت بانکی پور میں تھا، مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا، لیکن بلا اطلاع دل نے خود بخود یاد کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی کو کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا۔ "اب کیا! اب کیا!" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، تو معانقہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ضرور، ضرور!"

---

[1] پونہ میں گئے کہ [illegible] دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کا لیکچرر تھا، اور کلکتہ کا [illegible] الہلال کے تعلق سے [illegible] دیسنہ بہار کا ایک گاؤں ہے جو خاکسار کا وطن ہے۔

اس کے بعد اُن کی حالت روز بروز بلکہ ساعت بہ ساعت نازک تر ہوتی گئی، اسہال خونی اور آخر میں صرف اسہال برابر جاری رہا، ہاتھوں میں خارش سے زخم ہوگیا تھا، غذا تمام ایام علالت میں موقوف رہی، لاغری ونحافت کا یہ حال ہوگیا کہ پیٹ اور پیٹھ کے جرم میں شاید دو تین انگل کا حجاب ہو، طبی علاج واہتمام جاری تھا، لیکن مولانا نے دوا کے استعمال سے قطعاً انکار کردیا تھا، وہ پھر تین روز تک قطعاً دوا نہیں پی۔ ۱۷ کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے جن کے لئے مولانا ابتدا سے منتظر تھے، ۱۸ کی صبح کو مجھے اور دو تین یاد فرمایا، زبان مبارک سے تین مرتبہ "سیرت، سیرت، سیرت!!!" کہا، اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا "سب کام چھوڑ دیجئے"۔

ڈاکٹر محمد نعیم صاحب انصاری جو انصاری طبی وفد ترکی کے ایک ممبر رہ چکے تھے، اور ان دنوں جون پور میں مطب کرتے تھے، مولانا کی رحلت سے دو گھنٹے پیشتر پہنچ گئے، انھوں نے نہایت توجہ کے ساتھ مریض کو ایک ایک عضو دیکھا، اور بہ مایوسی کہا کہ دماغ کے سوا اور تمام اعضا معطل ہوچکے ہیں، اور اب تدبیر بے سود ہے۔ آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے بروز چہارشنبہ، روح نے آخری سانس لی، عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے کہرام برپا ہوگیا، تجہیز وتکفین کی فکر ہوئی، مقام دفن میں لوگوں کا اختلاف تھا، آخر اُن کا مسکن ہی جیسی اُن کی پیشین گوئی تھی مدفن بنا، عصر کے وقت لاش شبلی منزل کے ایک گوشہ میں جہاں آج سے آٹھ برس پہلے ان کے شکستہ پاؤں کے ریزے دفن کئے گئے تھے، سپرد خاک کی گئی، تمام شہر اور اطراف کے مسلمان نماز میں شریک تھے، سرکاری عدالتیں اور شہر کے مشن اور مسلم اسکول بند کئے گئے،

"استاد بزرگوار بجا جا، اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی لیکن نہ پائیگی"۔

لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہیگا،

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو   در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

تمام ملک میں اُن کی وفات کی خبر سے شورِ قیامت برپا ہوگیا، ہر طرف سے تعزیتی خطوط اور تار آنے لگے، اخبارات میں مہینوں اُن کا ماتم ہوتا رہا، مضمون نگاروں اور اخباروں کے اڈیٹروں نے اُن کے کارناموں پر بے شمار مضامین، اور شعراء نے اُن کے مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے، جو زمانہ تک اخباروں میں چھپتے رہے،

مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی یادِ رفتگاں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، کہ وہ اس وقت علی گڈہ میں تھے، اور اس وقت تک مولانا کی خبر وفات علی گڈہ نہیں پہنچی تھی، اسی رات کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ عیدگاہ میں ایک بہت بڑی محفل سیرت منعقد ہے، اور مولانا وہاں کھڑے ہوئے بیان فرما رہے ہیں، دوسرے روز خبر وفات ملی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

(شبلی)

آل و اولاد

مولانا کی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی شادی خود مولانا کے خاندان ہی میں اور گاؤں ہی میں ہوئی تھی یعنی بندول میں، اور اس محل سے متعدد اولاد ہوئی، جن میں بعض نے بچپن ہی میں انتقال کیا، اور دو صاحبزادیوں نے صاحب اولاد ہو کر مولانا کی زندگی ہی میں وفات پائی،

سنہ انتقال و وفات ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۵ء

ان میں سے ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام ربیعہ تھا، دونوں نے اچھی تعلیم پائی تھی، ربیعہ بی بی نے سنہ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا، فاطمہ بی بی کے نام مکاتیب میں کئی خط ہیں، مولانا اُن کو بہت چاہتے تھے، انھوں نے بھی مرض دق میں مبتلا ہو کر سنہ ۱۹۰۹ء میں وفات پائی، اس وقت مولانا کی اولاد ذرینہ میں صرف حامد نعمانی موجود ہیں سنہ ۱۸۸۰ء اُن کی پیدائش کی تاریخ ہے علی گڈھ میں ایف اے تک تعلیم پائی، گورنمنٹ میں تحصیلدار و سب ڈپٹی کلکٹر ہو کر اب پنشن یاب ہو چکے ہیں،

اس بی بی نے سنہ ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا، اُن کے انتقال کے بعد مولانا نے عدم تأہل کا ارادہ کر لیا تھا، اور پانچ سال تک غیر متأہلانہ زندگی بسر بھی کی، لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں جب ایک جگہ جمعیت خاطر سے بیٹھنا چاہا تو پاؤں میں ایک زنجیر ڈالنی پڑی، اس سے دوسری شادی بھی کی، چنانچہ ۲۰ جون سنہ ۱۹۰۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "افسوس اور سخت افسوس ہے کہ پانچ برس کے تعلق کے بعد جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لئے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے تاکہ مارا مارا نہ پھروں" (حصہ ۲ ص ۴۰)

مولانا کے اس محل سے بھی دو لڑکیاں اور سنہ ۱۹۰۳ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن تینوں نے بچپن ہی میں انتقال کیا، اس محل سے جو لڑکا پیدا ہوا تھا اس سے مولانا کو خاص وابستگی تھی، چنانچہ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۰۴ء کو حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں: "اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو باپ بنا کر ... کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں" (مہدی ۔ ۱۳۰)

لہ افسوس کہ اُن کی یہ جوانی یادگار بھی جو مدت سے مرض قلب میں مبتلا تھی ۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء کو رخصت ہو گئی، جو بمبئی میں جہاں بضرورت ۱۵ دن پہلے گئے تھے، وہیں رات کو یعنی ۱۹ مارچ کو دن گزر کر کی شب کو دفعۃً انتقال کیا، اور نعش اعظم گڈھ لا کر شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں دفن ہوئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن یہ کھونا بھی سنہ [illegible]ء میں جب مولانا حیدرآباد چھوڑ کر لکھنؤ آکر رہے تھے جاتا رہا، لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں منشی احتشام علی صاحب کا ایک بڑا مکان تھا اسی کو کرایہ پر لے کر مع اہل و عیال رہتے تھے، وہیں یہ حادثہ پیش آیا، اور کچھ ہی دنوں کے بعد اسی سال یہ بیوی بھی مرض دق میں مبتلا ہو گئیں، جب حالت بہت غیر ہو گئی تو ان کو اعظم گڈھ لے کر آئے، یہاں پہنچ کر انھوں نے بھی جدائی کا داغ دیا، جس سے مولانا بہت متاثر ہوئے، اس سفر میں مولانا کے ساتھ مولانا ابو الکلام بھی لکھنؤ سے اعظم گڈھ آئے تھے، وہ کہتے تھے، کہ بیوی کی وفات پر مولانا بہت بے چین ہوئے اور چیخ چیخ کر روئے،

اس کے بعد انھوں نے کوئی شادی نہیں کی، اور یہ دس برس تجرد میں بسر کئے۔

اخلاق و عادات

انسان کے جسم کو دیکھا جائے تو وہ در اصل خاک کا ایک تودہ ہے، اس کی اصل زندگی تو اس کے اچھے اخلاق اور عادات ہی سے ہے، مولانا کی پیدائش ایک آسودہ خاندان میں اور ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جس میں ان کے پھسلنے اور بہکنے کے کئی موقع تھے، مگر انھوں نے تعلیم و تربیت کی اس دشواری کو خیر و خوبی طے کیا، اور فرماتے تھے کہ یہ برکت ان کو اپنی والدہ ماجدہ کے بدولت حاصل ہوئی، وہ بہت نیک، عبادت گذار، سحر خیز اور وقت کی پابند تھیں، مولانا نے یہ سبق ان سے بہت کچھ سیکھا۔

مولانا کا شب و روز کا پروگرام | مولانا صبح سویرے ۵ بجے کے قریب اٹھ بیٹھتے تھے، پہلے تو یوں ہی بستر

پڑھے پڑھے قرآن پاک کی کچھ آیتیں جو ان کو یاد آجاتیں لحن کے ساتھ زور زور سے پڑھتے تھے، پھر حماسہ کے دو چار عربی اشعار ادھر ادھر سے گاتے تھے، ذرا مطلع صاف ہوتا پاس ہی چائے کا چولھا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا رکھا رہتا تھا خود اٹھ کر اس کو روشن کرتے اور چائے کا پانی اس پر رکھ دیتے تھے، ساتھ لوٹے میں پانی اور طشت رکھا رہتا تھا، اس سے وضو کرکے نماز سے فرصت کر لیتے تھے، اسی وقت چائے بھی پی لیتے تھے، ان کو قبض کی شکایت ہمیشہ رہتی تھی، اس لئے بیت الخلا میں جاکر دیر تک بیٹھتے تھے، اسی لئے وہ بیت الخلا ہمیشہ غیر مشترک چاہتے تھے، اور پکتہ تھے، اور وہ بھی نہایت صاف۔ ایسا صاف کہ وہاں اخبارات ساتھ لیجاتے تھے، اور وہیں پڑھتے تھے، کہ یہ وقت بھی ضائع نہ ہو، حاجت ضروری سے فارغ ہو کر لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے، نو بجے تک اس سے فارغ ہو جاتے تھے، ضروری خطوں کا جواب بھی وہ اسی وقت لکھ لیتے تھے، یہ وقت اُن کی پوری تنہائی کا ہوتا،

اس کے بعد وہ کتب بینی میں مصروف ہو جاتے تھے، کوئی باہر سے یا اور کوئی ملاقاتی آگیا تو ل بھی ہے، مگر وہ اس وقت خوشدلی سے نہیں ملتے تھے، لکھنؤ میں جب تھے تو بچاٹک پر ایک نوٹس لگا رکھی تھا، کہ کوئی صاحب ۱۰ بجے سے پہلے ملنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں،

اسی وقت نو دس بجے کے قریب وہ کھانا بھی کھا لیتے تھے، اب ۱۰ بجے شام تک وہ الٹ پلٹ کرکتابیں دیکھا کرتے جو آیندہ لکھنا ہوتا اس کا سواد تلاش کرتے، ضروری مقامات پر نشانات لگا دیتے۔ ۴ بجے کے بعد سے احباب، طلبہ اور ملنے والوں کی آمد ہوتی، نشست بالکل سادہ تھی، ایک دو کرسیاں، باقی دس بارہ مونڈھے، ایک کھری چارپائی جس پر وہ خود بیٹھتے تھے، لوگ

ادھر ادھر بیٹھ جاتے تھے، بڑی شگفتہ اور بامعنی مجلس ہوتی تھی، اس وقت وہ بلبل ہزار داستان بنے ہوتے تھے، عموماً مغرب تک یہ مجلس قائم رہتی تھی، اور کبھی مغرب کے بعد تک بھی، رات کا کھانا عام طور سے مغرب کے آگے پیچھے وہ کھا لیتے تھے، اور رات کو نو بجے وہ سونے کے لئے لیٹ جاتے تھے، سونے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس تو دور تک کسی سونے والے کے خراٹے کی آواز نہ سنائی دے، کسی کو سونے نہیں دیتے تھے۔ باہر والوں کی نقل و حرکت ناگوار ہوتی، وہ گھڑی تک نام بھی رکھتے تھے، اس کی ٹک ٹک کی آواز بھی ان کی نیند میں خلل انداز ہوتی تھی، اس لئے یا تو اس کو بھی دور رکھواتے تھے یا بند کر دیتے تھے

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ "کلکتہ میں ایک موقع پر میرا ان کا شب کو ایک کمرے میں سونا ہوا تو فرمایا آج عمر میں یہ پہلا اتفاق ہے، ورنہ ہمیشہ دوسرا کمرہ تجویز ہوا"

شکل و شمائل | قد بلند و بالا تھا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی، ناک لمبی گھڑی، دہانہ بڑا، چہرہ لمبا، رنگ گندمی، ہاتھوں کی انگلیاں لمبی، بھویں گھنی اور لمبی، گردن اونچی، سر کے بال چھوٹے رکھتے تھے، مونچھیں چھوٹی لبوں تک، داڑھی بھی نہ چھوٹی اور نہ لمبی، بال قبل از وقت پک گئے تھے، اور ستاون برس کی عمر میں وہ بالکل سن سپید ہو گئے تھے،

وہ اپنی جوانی میں بہت توانا و تنومند تھے، کہتے تھے کہ گھونسے سے وہ اینٹ توڑ ڈالتے تھے کرسی کو ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے تھے، پنجے بڑے مضبوط تھے پنجہ کشی کی مشق کبھی نہیں کی تھی، اس پر یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پنجہ کش ان کا پنجہ نہیں پھیر سکتے تھے، شجاعت اور پہلوانی کے قصوں اور کارناموں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اسی لئے وہ مغل بادشاہوں کے بڑے دلدادہ تھے، اور انکی شجاعت اور بہادری کے قصے بڑے جوش و خروش سے بیان کیا کرتے تھے، گو وہ خود کشتی کبھی

نہیں کھیلتے تھے لیکن وہ پہلوانوں کی کشتی اور دنگل دیکھنے کے شائق تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی فرماتے تھے کہ میں نے ان کو سب سے پہلے علی گڈھ کی نمائش میں دنگل میں دیکھا، نواب مزمل اللہ خاں مرحوم نے جو ساتھ تھے بتایا کہ یہی مولوی شبلی ہیں۔ تو وہ فرماتے تھے کہ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مولوی اور دنگل! الہ آباد کی ۱۹۱۱ء والی بڑی نمائش میں رستم ہند غلام پہلوان اور دوسرے پہلوانوں کی جو مشہور کشتی ہوئی تھی اس میں وہ شریک تھے، اور وہ بھی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے غلام کو تمغے پہنائے تھے۔

ان کی پیشانی کی رگ اور پٹھے جلد جلد حرکت کرتے رہتے تھے، ہم نے یہ بڑھاپے میں دیکھا، مولوی حمید الدین صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ جب مولانا کا شباب تھا تو پورے سر کی رگوں اور پٹھوں میں اتنی تیزی سے حرکت ہوتی رہتی تھی کہ لکھنؤ کے کام کی دوپلڑی ٹوپی جو وہ اس زمانہ میں پہنتے تھے وہ تھوڑی دیر میں سر سے جھک جاتی تھی، اور کبھی نیچے گر پڑتی تھی۔

لباس | ان کا لباس جب سے میں نے دیکھا یہ تھا موٹے ململ کا کرتہ جس سے بدن نمایاں نہ ہو، کسی قدر چوڑی مہری کا سپید چالٹی کا پائجامہ ڈھیلی شروانی جس کو وہ باہر نکلنے میں پہنتے تھے، پاؤں میں دلی کا معمولی کام کا سرخ سلیم شاہی جوتہ۔ پاؤں کے حادثہ کے بعد ایک مصنوعی پاؤں لگانے کے سبب سے جب پاؤں لگاتے تھے تو بوٹ پہن لیتے تھے، سر پر اونی یا سادہ کپڑے کی سیاہ ترکی ٹوپی، ترکی کے سفر پر بھی جب نکلے تھے تو وہ اسی قسم کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، اور اسی لئے عربوں نے انھیں شیعہ سمجھا۔

مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ میں نے جس زمانہ میں سب سے اول دنگل میں ان کو دیکھا تو سر پر سیاہ مخمل

کی گول ٹوپی تھی جس کی بناوٹ سادہ، اونچی ہوتی تھی، اوپر کا حصہ گول چپٹا دار ہوتا تھا، مدت تک یہ ٹوپی استعمال
فرماتے رہے۔ شیروانی زیب تن تھی۔

جاڑوں میں دو روئی دار صدری اور روئی دار دوگلا پہنتے اور کندھوں پر کشمیری شالی رومال رکھتے
تھے جس کو گلے سے لپیٹ لیتے تھے، جاڑوں میں نکلتے تو سرج کا پاجامہ پہنتے، عجیب بات ہو
کہ گرمیوں میں بھی دو توشک بچھاتے تھے، اور رضائی پائتانے رکھی رہتی تھی۔

مولانا شیروانی فرماتے ہیں: "سردیوں میں کوئی رضائی گرم نہ تھی حبیب گنج کے قیام میں پہلی شب کو
ساری رضائیاں اوڑھ لی گئیں، سردی کی شکایت رہی، دوسرے دن خاص طور پر ڈھائی سیر روئی کا لحاف
تیار کیا گیا، جب حبیب گنج سے بھیکم پور نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کے یہاں گئے تو شب کو وہی لحاف
طلب ہوا، اسی کے ساتھ کوئی پانی ان کے واسطے ٹھنڈا نہ تھا سرجی کا باسی پانی بھی پاس نہ ہو، برف دیہات
میں موسم سرما میں بھی نہیں، فرماتے تھے میرا دماغ گرم ہے جسم سرد، یہ میرے اس سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ
یہ جنجال منظور کیا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

وہ عام طور سے سر پر عمامہ نہیں باندھتے تھے، مگر قومی جلسوں اور تقریبوں میں وہ زردوزی کام
کا خوبصورت قیمتی عمامہ اور عمدہ عبا زیب تن کرتے تھے، اور اسی لئے ان کے پاس کئی کئی عبائیں
اور عمامے رہتے تھے، مگر ان سے قرینہ سے عمامہ بندھتا نہ تھا، ان کے استاد مولانا فاروق صاحب کا
بھی یہی حال تھا، وہ عمامہ کیا باندھتے تھے سر پر نیچے سے اس کو لپیٹ لیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم
ان سے تو اچھا باندھتے تھے مگر پیچ ٹھیک نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ ندوہ میں کوئی تقریب تھی مولانا
قیمتی ریشمی کام کا عمامہ باندھ کر آئے تھے، اتفاق سے راقم بھی سوتی ململ کا صافہ باندھ کر حاضر ہوا، فرمانے

لگے: "دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے؟ مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہو، وہ تنہا
چھ ٹکے کا صافہ ہے مگر اس قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔"

طعام

کھانے کے شائق تھے، لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ امراء کی طرح متنوع اور متعدد لذیذ
کھانوں کے دلدادہ تھے۔ فرماتے تھے کہ "کھانے کی عمدگی کے یہ معنی ہیں کہ عمدہ پکا ہوا ہو۔ میں عمدہ پکی
ہوئی دال کھا سکتا ہوں، اور برا پکا ہوا گوشت نہیں کھا سکتا۔"

کھانے میں نمک تیز پسند تھا۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے تھے اور کھانے میں ڈالتے جاتے تھے۔
شیرینی بہت مرغوب تھی، اور اس کے لئے کسی قسم خاص کی ضرورت نہ تھی، جو بھی ہو، اور جیسی
بھی ہو۔ فرماتے تھے کہ "شیرینی کے لئے صرف میٹھا ہونا کافی ہے۔" ایک دفعہ نواب علی حسن خاں صاحب
کے عزیز خواجہ رشید الدین صاحب عرف "اچھے صاحب" نے مولانا کے لئے چوگنے شکر کے میٹھے
چاول پکوائے۔ کھاتے وقت مولانا سے پوچھا کہ "مولانا میٹھا تو ٹھیک ہے؟ چوگنی شکر چھوڑی ہے۔"
مسکرا کر فرمایا "یہ کون کہتا ہے کہ شکر میں مٹھاس ہوتی ہے۔"

مولانا شروانی فرماتے ہیں: "ایک بار ندوہ کے اجلاس سے واپسی میں بریلی سے علی گڑھ مولانا کی
ہمراہی ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مٹھائی خریدی گئی، خواہ اچھی تھی یا ناقص۔ میں نے
استعجاب ظاہر کیا تو فرمایا مٹھائی ہے۔" شیرینی کے متعلق لطیفے خوب خوب یاد تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ "ایک
دوست نے دو شیرینی پرست دوست کو مدعو کیا تو انھوں نے کہا "کیا کیا کھلاؤ گے؟" کہا بہت عمدہ میٹھے چاول۔
گھر آ کر باورچی طلب ہوا، باصرار شیرینی کی مقدار بڑھوائی گئی، چوگنا میٹھا پڑا۔ فخر سے کھلایا۔ ختم طعام پر پوچھا
تو جواب ملا "بھنے چاول تھے، اسی قدر پھیکا سا تھا!"

بنارس کے قیام میں ایک روز دوپہر کو سخت لو کے وقت، ملا جی میرے رفیق اور اپنے ندیم کو فرمائش
کی کہ گنے کی گنڈیریاں بازار سے لاؤ۔ انھوں نے کہا کہ ایسی دھوپ میں؟ فرمایا: لطف رہیگا، ملا جی گئے،
گنڈیریاں لائے دونوں نے مل کر کھائیں، لطف کی باتیں ہوئیں: ع سخنانِ شیریں بہ از قند ہست؟

رساول بہت شوق سے کھاتے تھے، اور اس اہتمام سے کھاتے تھے کہ مصنوعی طریقوں سے
اس کو صاف کروانا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے اس کی طبعی مٹھاس کم ہو جاتی ہے، اسی لئے
رساول میں بالائی یا دودھ نہیں ملاتے تھے، ایک دفعہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے ان کے
پاس رساول بھیجی اور دودھ کے مذاق کے مطابق اس میں بالائی ملا دی، ملاقات ہوئی تو فرمایا
تم نے تو رساول کو غارت کر دیا، بالائی سے تو پھیکی ہو جاتی ہے۔

مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے انگریزی شکر کے ایک ایک دانے منھ میں ڈالا
کرتے تھے، اور بیکاری کے اوقات میں یہ ان کا لذیذ ترین شغل تھا، پیشاب میں شکر آتی تھی
طبیب، ڈاکٹر اور احباب اس طرح شکر کھانے سے روکتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے، ایک دفعہ
نواب سید علی حسن خاں صاحب اور اچھے صاحب فرماتے تھے کہ مولانا بیمار تھے تو ہم لوگ دیکھنے
کے لئے گئے، سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے تھے، منھ بھی بند تھا، مگر کچھ دانتوں کے چلنے کی
آواز آتی تھی، پوچھا آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا کچھ نہیں، لحاف الٹا تو دیکھا کہ سینہ پر شکر کی ایک
طشتری رکھی ہے، اور وہ ذرا ذرا اس کو کھا رہے ہیں، ہم نے عرض کی اس حالت میں شکر سے پرہیز
فرمایئے، فرمایا: "تو پھر جی کر کیا کروں گا"۔

چائے وہ دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے، لیکن صبح کو جب سویرے اٹھتے تھے، تو اس

وقت ملازم کو تکلیف نہیں دیتے تھے. بلکہ خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا لیتے تھے. چائے کی پیالیاں چھوٹی ہوتی تھیں. عموماً سادی چائے پیتے تھے. فرماتے تھے چا میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے:۔

کھانے میں عمدہ پکا ہوا صرف ایک قسم کا سالن ہوتا تھا، اور اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے تھے: دہی ضرور منگواتے تھے. باورچی کے ہاتھ کا سالن پسند نہیں آتا تھا تو اپنے سامنے منگوا کر اپنے ہاتھ سے گوشت بھونتے تھے، سامنے رہے کا چولھا یا آتشدان رکھ لیتے، اور اس پر دیگچی رکھ کر گوشت بھونتے تھے، کھانے میں سادہ پیاز شوق سے کھاتے تھے. مرچوں سے گھبراتے تھے. فرماتے تھے ہر مزہ میں شدت مرغوب مگر مرچ. باقی دال اور روٹی جو ندوہ کے باورچی خانہ میں عموماً پکا کرتی تھی، وہی ان کے دسترخوان پر بھی نظر آتی تھی. بمبئی میں ضعفِ معدہ کی وجہ سے جو کی پاؤ روٹی منگوایا کرتے تھے، اور اخیر میں تو صرف توس ہی کھایا کرتے تھے. کبھی کبھی میٹھے چاول بھی پکواتے تھے. پڈنگ بھی نہایت پسند تھی، اور بمبئی میں اکثر کھاتے تھے، فصل میں آم بہ شوق کھاتے تھے، برف کی قلفیاں بھی کھاتے تھے، لیکن اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، ایک بار برف کی قلفیاں بکنے کو آئیں، تو خریدنا چاہی، کسی نے کہا اچھی نہیں ہیں، فرمایا "منہ تو بہرحال ٹھنڈا ہو جائے گا" پانی ٹھنڈا پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ جاڑوں میں بھی برف استعمال کرتے تھے، تازہ اچھے گھی کے بہت شائق تھے، وطن آتے تھے تو اس کی فرمائش کرتے تھے. لکھنؤ میں لکھنؤ کے آس پاس کے رہنے والے شاگردوں سے ان کے گاؤں سے فرمائش کرکے گھی منگواتے تھے، مولوی مسعود علی صاحب گھی اور ساول کی خدمت انجام دیا کرتے تھے. بمبئی میں گھی اچھا نہیں ملتا تو باہر سے

ڈاک سے اچھا گھی دوستوں اور عزیزوں سے فرمائش کرتے تھے، یہ شوق اخیر اخیر تک قائم رہا، بمبئی سے ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو مظفر پور لکھتے ہیں: "اگر آپ سیر بھر تازہ اور عمدہ گھی بھیجیں تو میں ممنون ہوں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اگر سیر بھر سے ایک ماشہ بھی زیادہ ہوا تو گستاخی معاف ہو گی واپس کر دوں گا۔۔۔ تازگی کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کو بنے ہوئے دو تین روز سے زیادہ نہ مدت نہ رہو، یہاں گھی کے سوا ہر چیز ملتی ہے، میں نے وطن کی خلقت ہر چیز کی فرمائش بھیجی ہے، مگر صرف روغن ملتا ہے جو چنے کی بو" (ریاض ۲۲)

بمبئی میں اچھا گھی نہیں ملتا تھا تو خود کسی بیکراس کا گھی بنا لیتے تھے۔

دولت کی بے قدری: مولانا نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اس کا قدرتی نتیجہ تو یہ تھا کہ وہ دولت، عزت، شہرت، حکومت اور شان و شوکت وغیرہ کے اسی قدر دلدادہ ہوتے، جتنا ایک دنیادار آدمی ہو سکتا ہے، غور کرو، ایک ایسا شخص جس نے ایک آسودہ خاندان میں پرورش پائی ہو، جو ایک صاحب اقتدار زمیندار ہو، جس کے باپ جس کے بھائی اور جس کے عزیز و اقارب وکیل، بیرسٹر، ڈپٹی سرکاری عہدہ دار رہے ہوں، اور انگریزی طریق پر بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہوں، جس نے علی گڑھ میں سولہ برس تک قیام کیا ہو، اور اس کی نگاہوں سے دنیاوی جاہ و جلال کے نمونے گذر چکے ہوں، جو مدتوں حیدرآباد کے امرا کی سوسائٹیوں میں زندگی بسر کر چکا ہو، اس کے دل میں دنیوی جاہ و جلال، دنیوی نام و نمود اور دنیوی عیش و عشرت کے علاوہ اور کون خیال پیدا ہو سکتا تھا،

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی دنیاوی آرائش و آسائش کی طرف ان کو متوجہ نہ کر سکی،

انھوں نے عام طور پر اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے
چند دنوں نقل نویسی اور امانت کا کام کیا، جس کی تنخواہ نہایت کم تھی، امانت کی ملازمت میں جو دقت
کی بدولت جو مصیبتیں اٹھائیں ان کو لطف سے بیان فرماتے تھے، چند روز وکالت کی، اور آمدنی
کے لحاظ سے ان کا وہی حال رہا جو ایک نئے وکیل کا ہو سکتا ہے۔ علی گڑھ میں ملازمت کی تو ابتدائی
تنخواہ چالیس روپے ماہوار قرار پائی، اور سولہ برس کی مدت میں بتدریج سو روپیہ تک پہنچی، اسی
تنخواہ میں ایک بیوی، ایک بچہ، ایک بھائی، ایک عزیز، دو نوکر اور خود مولانا کے مصارف شامل تھے اور
ایک بنگلہ میں رہتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ اس قلیل رقم میں وہ کتنی صاف ستھری زندگی کیونکر
بسر کرتے تھے، علی گڑھ سے قطع تعلق کیا تو حیدرآباد سے جو وظیفہ مقرر ہوا اس کی مقدار بھی اس سے
زیادہ نہ تھی، بعد کو وہ اگرچہ حیدرآباد میں چند سال کے لئے بمشاہرہ پانسو ماہوار ملازم ہو گئے تھے
لیکن اس میں بھی ایک معقول رقم والد کے قرضہ میں نکل جاتی تھی، اور بقیہ وہاں کی کثیر المصارف
زندگی کی نذر ہوتی تھی، حیدرآباد سے مستعفی ہوئے تو پھر وہی سو روپیہ کا وظیفہ جاری ہو گیا، اخیر
میں اگرچہ اس میں دو سو کا اور اضافہ ہو گیا تھا، لیکن موت نے ان کو اس سے ایک سال سے
زیادہ متمتع ہونے کا موقع نہیں دیا، اور وہ بھی زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوا۔

ان کے خاندان اور سسرال کی دو تین ہزار کی جائداد بھی تھی، مگر کبھی انھوں نے اس سے
اپنا حصہ لینا پسند نہیں کیا، اور ہمیشہ اپنی ہی کمائی کی روٹی پر قناعت کی، اسی طرح اپنی کتابوں
کی آمدنی سے بھی انھوں نے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، جب تک علی گڑھ میں رہے ان کی تالیفات
کالج کی نذر ہوتی رہیں نیز اسی نے ان کو چھپوایا اور اسی نے منافع حاصل کیا، حیدرآباد گئے تو کئی

کتابیں سررشتۂ علوم و فنون کی ملکیت رہیں، اُن کی ذات کو اُن سے کوئی تعلق نہیں رہا، جب ۱۹۰۵ء

میں ندوہ آئے، اور سوانح مولانائے روم، موازنہ، اور شعر العجم چھپیں تو اُن کے زمانہ میں شاید کچھ

لاگت نکل آئی ہو تو نکل آئی ہو، اس زمانہ میں اگر اُن کو فائدہ ہوا تو یہ ہوا کہ ایک کتاب کی فروخت

سے جو کچھ ہاتھ آتا وہ دوسری کتاب کی چھپائی میں خرچ ہو جاتا۔

امتحانات کے پرچوں سے بھی ان کو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، مگر وہ بھی ضروریات ہی میں صرف ہو جاتی

حیدرآباد کے بعد بے سہارے ندوہ آکر بیٹھ جانا ایسا واقعہ تھا کہ علی گڈھ و یار، دلی کے لوگ

اس کو خودکشی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اس وقت مولانا کیلئے حصولِ معاش کے بیسیوں

دروازے کھلے ہوئے تھے، بالخصوص علی گڈھ کالج تو ان کے لئے بالکل چشم براہ تھا، اور نواب

محسن الملک مولانا کو ہر قسم کی ترغیبات دے کر کالج میں بلانا چاہتے تھے، چنانچہ جب مولانا

نے حیدرآباد سے الگ ہو کر ندوہ میں آنا چاہا تو نواب صاحب نے لکھا کہ فوراً کالج میں چلے آیئے

حیدرآباد کا سابق وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا، اور سو روپیہ کالج سے بھی ملیں گے، لیکن مولانا نے

اس کو نامنظور کیا، اس کے بعد ہرہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف سے اُن کو بھوپال جانے کی

ترغیب دی، لیکن یہ افسون بھی کارگر نہ ہو سکا، ندوہ میں آنے کے بعد بھی انھوں نے مولانا کا پیچھا

نہیں چھوڑا، چنانچہ جب کالج میں عربی کی ایک اعلیٰ کلاس کھولی گئی، اور اس کے لئے ایک مشہور

جرمن مستشرق یوسف ہارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار

پر ان کی اسسٹنٹی کیلئے بلایا، لیکن مولانا نے صاف لکھ دیا کہ

"شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست"

حیدر آباد میں علومِ شرقیہ کی یونیورسٹی قائم ہوئی تو نظامت کے لئے بشاہرۂ معقول مولانا کا نام پیش ہوا، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا، اور ایک خط میں لکھا: "یونیورسٹی کی نظامت مجھ کو دیتے ہیں، مشاہرہ بھی معقول ہے، لیکن اب کسی کے آگے کیا سر جھکاؤں"۔ (مہدی ۔ ۴۰)

بہرحال اگر مولانا کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو سَو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ ایک ایسی رقم ہے جو مولانا کے کمالات کے سامنے بالکل ہیچ ہے۔ سادہ زندگی کی وجہ سے اگرچہ اُن کے ذاتی مصارف کچھ بہت زیادہ نہ تھے، تاہم انھوں نے کبھی ہیچیتی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی۔ ایک دو ملازم ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ کپڑے متوسط درجے کے پہنتے تھے، کھانے کے شوقین تھے یعنی بدمزہ کھانا وہ کبھی نہیں کھا سکتے تھے۔ قلمی کتابوں کا شوق الگ تھا، ایک ایک کتاب کے سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے دے ڈالتے تھے۔ بڑے بڑے چندے بھی دیتے تھے۔ قومی اور علمی کاموں کے لئے اکثر اپنے کرایہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے، بلادِ اسلامیہ کے سفر کے کل مصارف خود برداشت کئے، اور کسی سے اس میں ایک حبّہ کی مدد قبول نہیں کی، اخیر میں تبدیلِ آب و ہوا اور ترقیِ صحت کے لئے ہر سال بمبئی چار، پانچ مہینے قیام کرتے تھے، اور اس حالت میں اُن کے مصارف بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ ان اسباب سے اُن کی مالی حالت کبھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار حیدر آباد سے وظیفہ آیا اور انھوں نے اسی وقت اس کو ضروری مصارف میں خرچ کرنا شروع کیا، اخیر میں صرف چند روپے رہ گئے، تو دبی زبان سے فرمایا کہ "یہ رقم کافی نہیں ہوتی"۔ اگر اتفاق سے کبھی روپے زیادہ بچ جاتے تو ان کو یوں ہی بے گنے ایک چھوٹے سے آہنی بکس میں ڈال دیتے، اور اس میں سے نکالتے رہتے

اور جب کچھ نہ رہتا تو سمجھ لیتے کہ سب خرچ ہوگیا، اور وہ اس باب میں ایسے سادہ تھے کہ ان روپیوں میں سے کوئی دوسرا نکال لیتا تو اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی، ایک دفعہ مولانا کے ایک عزیز طالب العلم جو اُن کے پاس ندوہ کے قیام کے زمانہ میں آتے جاتے رہتے تھے کئی مہینہ تک اس میں سے نکالتے رہے، اور مولانا کو کچھ پتہ نہ چلا، آخر میں اس میں سے ایک گنی نکال لی جو اس میں رکھی ہوئی تھی، تو احساس ہوا، روپے پیسے، نوٹ یونہی بے قدری سے فرش پر ڈال دیتے تھے، کتابوں میں رکھ دیتے تھے، وہ گم بھی ہوجاتے تھے،

ایک دفعہ مولانا پٹنہ گئے، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ملنے گیا تو فرمایا: "رات مچھروں نے بہت دق کیا، کسی پتلے کپڑے کی ایک چادر سلوا دو" یہ کہہ کر روپیہ دیا، میں شام کو کپڑا خرید کر اور چادر سلوا کر لایا، تو وہ موجود نہ تھے، میں نے اُن کے بستر کے سرہانے چادر رکھ دی، اور ایک کاغذ پر اس کا حساب لکھ کر رکھ دیا، اور باقی پیسے بھی وہیں رکھ دیئے، دوسرے دن ملنے گیا تو ملال کا اظہار کیا کہ تم کو ایک روپیہ کے حساب لکھنے کی کیا ضرورت تھی،

شروع شروع میں جب وہ ندوہ آئے ہیں تو مدرسہ گولہ گنج کے ایک مکان میں تھا، اس کی سب سے بالائی چھت پر ایک کمرہ تھا جس کی لمبائی چوڑائی ۱۰×۱۰ فیٹ ہوگی، مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خوابگاہ، یہی ملاقات کا کمرہ، یہی دارالمطالعہ، اور یہی کھانے کا کمرہ، یہی مہمان خانہ، سب تھا، ایک طرف پلنگ پر بستر تھا، باقی دری تھی جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے مجھے بارہا حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندوستان معمور ہے وہ کیونکر ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گذار رہا ہے، اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے

اور ان کا اثاثہ یہی تھا، بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ مونڈھے اور بس، غرض اُن کی زندگی گویا حدیث نبوی

کن فی الدنیا کانک غریب او	دنیا میں ایسے رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا
کعابر سبیل، (ترمذی)	راہ سے گذر رہے ہو،

کے مطابق تھی،

استغنا اور بے نیازی قدیم علما کی ایک بڑی خصوصیت بے نیازی تھی، اور مولانا میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر پائی جاتی تھی، آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کالج سے علٰحدہ ہونے کے چند روز بعد امیر حبیب الرحمٰن خاں والیِ کابل کو جب ترجمۂ ابن خلدون کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے اس کے لئے ایک معقول رقم یعنی دس ہزار روپیہ صرف کرنا چاہا، اور اپنے سفیر ہندوستان کو اس کی اطلاع دی اور سفیر موصوف نے اس کے لئے مولانا سے خط و کتابت کی، تو مولانا نے صاف انکار کیا، امیر صاحب نے نہایت وسیع پیمانہ پر کلکتہ میں ایک دار الترجمہ قائم کرنا، اور مولانا کو اس کا سکریٹری مقرر کرنا چاہا، تو مولانا نے اس عہدے کو بھی قبول نہیں کیا،

حیدر آباد میں چند سال کی ملازمت بھی جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، مجبوراً اختیار کی تھی چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچا دیا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں" (مکاتیب۔ ہیچ، ۷۴)

یہی وجہ ہے کہ جب حیدر آباد میں سیاسی تغیر ہوا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے لئے کسی قسم کا جوڑ توڑ کرتے نہایت خوشی کے ساتھ اس تعلق کو چھوڑ کر غریبانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گئے

اس کی نسبت خود لکھتے ہیں: "میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپے ہیں، بھاؤ نی، مایہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچیگا اس سے غریبانہ زندگی اچھی طرح بسر ہو سکتی ہو" (مکاتیب ص ۱۹)

مولانا جس طرح مال و دولت سے بے نیاز تھے، اسی طرح جاہ و شہرت کی بھی اُن کو ہوس نہ تھی، جاہ و عزت کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا، لیکن انھوں نے علی گڑھ کالج پر غریب ندوہ کی خدمت کو ترجیح دی، خود ندوہ میں سب سے بڑی چیز نظامت تھی، جس کے لئے اور بھی بہت سے مدعیانِ توکل و قناعت مدتوں اُمیدوار رہے، لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مولانا نے کبھی نظامت کی خواہش نہیں کی، اور ہمیشہ وزیر بن کر کام کرنا چاہا، یہ سچ ہو کہ ندوہ میں وہ تمام کام اپنے نام سے کرتے تھے، جس سے بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوتا تھا، کہ وہ یہ سب کچھ نام و نمود کے لئے کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت اس کے دو سبب تھے، ایک تو یہ کہ ان کاموں کی طرف اُن ہی کو توجہ پہلے ہوئی تھی، وہی ضرورت محسوس کرتے تھے، پھر دوسروں کو متوجہ کرتے تھے، اس لئے قدرتی طور پر اُن کی حیثیت اصل محرک کی، اور دوسروں کی مؤید کی ہوتی تھی،

دوسری بات یہ تھی کہ دنیا اس قدر ظاہر پرست واقع ہوئی ہے کہ جب تک کوئی تحریک کسی ممتاز آدمی کی طرف سے نہیں اُٹھتی، اس کی طرف توجہ نہیں کرتی، مولانا بار بار تجربہ کر کے اس کو دیکھ چکے تھے، اس لئے مجبوراً اپنے کو آگے رکھتے تھے،

ندوہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں ایک دفعہ میں نے جرأت کر کے مولانا کو لکھا کہ ان خطوں میں آپ کے بجائے کسی دوسرے رکنِ انتظامی کا نام لکھ دیا جائے تو

اچھا ہی ہے کہ مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ یہ ہر کام میں اپنے ہی کو آگے رکھتے ہیں، اس پر جواب کیا سمجھتے ہو کہ لوگ میرے نام سے گھبرا گئے، بھائی یہ کاغذات دو برس سے پیچھے پڑے ہیں، جیسی ضروری فرصت نکلتی دیکھتا ہوں، اور زبان سے ہر وقت ہائے پکارتا ہوں، اسی اشاعت کے متعلق اعلان میں خط لکھ چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے، تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور فخری کا شوق نہیں، کوئی کرے اس کے ساتھ ہوں، اور پیرو بن سکتا ہوں۔"

اسی خط میں لکھتے ہیں:- "تم کہتے ہو کہ بجائے اپنے شیر حسین یا نواب علی حسن خاں کا نام لکھوں، وقف اولاد کے متعلق ابتدا میں نے خود اشتہار دیا تھا کہ جو چندہ بھیجا جائے منشی مہتمم کے پاس بھیجا جائے، صرف آٹھ روپے ان کے پاس آئے، پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے، ایک شخص نے الٹ کر جواب نہیں دیا، شیر حسین وغیرہ کا نام لکھ کر دیکھو، ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے، تجربہ کرو تو معلوم ہو جائے گا، تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے نام کے لئے ہر کام میں اپنا نام رکھتا ہوں، لیکن سب تجربہ کر کے ایسا کرنا پڑتا ہے۔" ( )

آخیر زندگی میں جس کے چند ہی روز کے بعد انھوں نے وفات پائی، اپنے بھائی مولوی حمید الدین صاحب کو لکھا کہ ضرورت اس کی تھی کہ دارالمصنفین کے لئے چند لوگ یکجا ہو جاتے.... "لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق گذرتی ہے۔..........

مرا گر تو بگذاری اے نفسِ طامع ۔۔۔ بسے پادشاہی کنم در گدائی[1]

کتنے مؤثر فقرے ہیں،

[1] ترک خدمت و ذکری [illegible] ص ۹

خودداری مولانا اگرچہ مغرور نہ تھے، تاہم وہ فطرۃً سخت خوددار تھے، اور جب ان کو کوئی کام خودداری کے خلاف کرنا پڑتا تھا، تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا، ابتدائی زمانہ میں ان کو امانت و نقل نویسی کے کام سے خلافِ مذاق ہونے کے علاوہ، اس بنا پر بھی عار و شرم محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس کو اپنی خودداری اور عزتِ نفس کے خلاف سمجھتے تھے، نقل نویسی کی تنخواہ ان کو دس روپیہ ماہوار ملتی تھی، جس کی نسبت فرماتے تھے کہ جب اس کا تصور کرتا تھا تو مجھے رونا آتا تھا، کچہری کے معمولی ملازم عموماً پیدل جایا کرتے تھے، لیکن مولانا نے اس حالت میں بھی اپنی خودداری کو قائم رکھا تھا، اور فرماتے تھے کہ باوجودیکہ میری تنخواہ دس روپے ماہوار تھی، تاہم میں کچہری ہمیشہ یکہ پر جاتا تھا، اور تنخواہ کے نو روپے صرف یکہ کے کرایہ میں صرف ہو جاتے تھے، علی گڈہ میں گئے تو اگرچہ ابتداءً اسکول کی مدرسی قبول کرلی تاہم وہ اس کو اپنے لئے موجبِ ذلت سمجھتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ "تنہا کہ آرمیدہ ام وایں مذلت بر خویش پسندیدہ ام تا چرخ زادریں پردہ چہ نیرنگہاست۔" (مکاتیب۔ ۲)

اس زمانہ میں صرف چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، تاہم انھوں نے کبھی ذلت کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا، ابتداء میں وہ شہر میں رہتے تھے جو کالج سے دور تھا، اس لئے کالج میں پیدل نہیں آسکتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ باوجود قلتِ تنخواہ میں نے کبھی یکہ پر آنا جانا پسند نہیں کیا بلکہ ہمیشہ گاڑی پر آیا جایا کرتا تھا،

کالج میں اگرچہ ان کے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ دوستانہ اور مساویانہ تھے، اور سرسید، نواب محسن الملک اور مولوی سمیع اللہ خاں وغیرہ ان کی نہایت عزت اور قدر کرتے

تھے، تاہم جب کبھی اصول و قواعد کی رو سے اُن کو اپنی حیثیت اور لوگوں سے کم نظر آتی تھی تو اُن کو اس کا سخت صدمہ ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ "ایک بار اسٹریچی ہال میں جلسہ ہوا، اور لوگ تنخواہ کے لحاظ سے درجہ بدرجہ آگے پیچھے بٹھائے گئے، اور اس وقت میری کرسی بہت پیچھے رہی تو میں نے یہ منظر دیکھ کر گردن جھکالی، اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے"۔

ملازمت سے نفرت، اور آزاد وظیفہ کی خواہش اگرچہ اُن کو زیادہ تر اس بنا پر تھی، کہ وہ ملازمت کی پابندی کے ساتھ خالص علمی، اور قومی زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے، تاہم اس میں خودداری کا مخفی جذبہ بھی موجود تھا، کیونکہ ملازمت کی وجہ سے بعض اوقات ایسی باتیں پیش آجاتی تھیں جن کو وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے،

لیکن باوجود اس خواہش کے انھوں نے وظیفہ کے لئے کبھی اپنی خودداری کو صدمہ نہیں پہنچایا، وہ جس زمانہ میں علی گڈھ میں تھے، اُس وقت نواب علی حسن خاں بہادر بھوپال میں تھے، اور ریاست بلکہ خود نواب شاہجہاں بیگم پر اُن کا بہت بڑا اثر تھا، وہ مولانا کے بہت بڑے دوست، اور نہ صرف دوست، بلکہ سخت معتقد تھے، اور اپنے جاہ و اقتدار سے مولانا کو ہر قسم کے امکانی فوائد پہنچانا چاہتے تھے، اور اس کے لئے مولانا کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ مولانا کی طرف سے کسی خواہش کا اظہار ہو، لیکن ایک مدت تک تو مولانا کی خودداری نے اس کا موقع ہی نہیں دیا، اور اُن کے بار بار کے اصرار سے ایک بار وظیفہ کے لئے لکھا بھی تو شرم و غیرت نے آب آب کر دیا، فرماتے تھے کہ عرفی نے ایک قصیدہ پر کہا تھا،

زدود دامن احسان ہمیں گو اہم بس | کہ شرم ایں سخنم خوے زچہرہ بیروں داد

میں نے بھی جب نواب صاحب کو یہ خط لکھا تو مجھے پسینہ آگیا۔"

انھوں نے حیدرآباد میں بعض مجبوریوں سے جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے گو ملازمت قبول کر لی تھی، لیکن وہ اس کو دل سے پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:" بے شبہ اگر میں ملازمت کر سکتا، اور کسی قدر دنیا داری بھی مجھ سے بن پڑتی، تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع! عمر کا بہت بڑا حصہ صرف ہو چکا، چند برسوں کے لئے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند ہی بلند رہی، نئے گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا، ورنہ میں اپنے گوشۂ عافیت کو فلک نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔" (مکاتیب سمیع، ۹۰)

حیدرآباد کی ملازمت سے چند ہی سال کے بعد اُن کو الگ ہونا پڑا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی خودداری چھوڑ کر امرا کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوئے، چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک بہادر کو تحریر فرماتے ہیں:" مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا ذوق اس دنیا کی خوشبو سے بگڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی، اور بغیر اس کے کامیابی معلوم، اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔"

ایشیائی سلطنتوں میں مدح گستری، اور قصیدہ گوئی کامیابی کا ایک بڑا ذریعہ خیال کی جاتی ہے، اور دیسی ریاستوں میں اب بھی ایشیا کی یہ قدیم شان قائم ہے، مولانا فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، اس لئے اگر انھوں نے ایشیائی شعرا کی اس مبتذل روش کو اختیار کیا ہوتا اور امرا کی قصیدہ خوانی کرسکتے تو اُن کو اپنی کامیابی کا نہایت آسان ذریعہ ہاتھ آجاتا، لیکن انھوں

نے ہمیشہ امرا و سلاطین کی مداحی کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھا، سنہ ۱۹۱۰ء میں موجودہ حضور نظام حیدر آباد اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں بندوق کے صدمے سے بال بال بچ گئے، تو مولانا نے اس مسرت میں بے شبہہ ایک قصیدہ لکھا، لیکن یہ احبابِ حیدر آباد کی فرمائش بلکہ اصرار کا نتیجہ تھا، صلہ و عطایا کی خواہش کو اس میں دخل نہ تھا، اور وہ بھی تمامتر تہنیت اور دعائے سلامتی پر مشتمل رہا،

بیگم صاحبہ بھوپال نے جب سنہ ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء کے لئے دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمائے تو اس کے شکریہ کے لئے جو جلسہ کیا گیا، اس میں بھی مولانا نے ایک قصیدہ پڑھا تھا، یہ قصیدہ اگرچہ ایک قومی حیثیت رکھتا تھا، تاہم مولانا اپنی خودداری کو ذرہ برابر ٹھیس لگانا پسند نہیں کرتے تھے، آخر اخیر کے شعر میں اپنی خوددارانہ شان کا اظہار کر ہی دیا،

شبلیؔ خود را مدح شہاں شیوہ نبود — یک لطفت ہمہ را بندۂ احساں کردہ است

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر ہوئے تو بحیثیت ملازم سرکار وہ بھی ان کو نذر دینے گئے، تو اُن کے ایڈیکانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا، تو انھوں نے ذرا تیکھے ہو کر کہا: "یہ اوروں کا پیشہ ہے، میں یہ کام نہیں کرتا" اس پر ردّ و بدل ہوئی، اور انھوں نے ناگواری کے ساتھ کہا کہ میں کسی کی مدح نہیں کرتا،

اسی طرح سنہ ۱۹۰۹ء میں بیگم صاحبہ جنجیرہ نے ندوہ کی تعمیر میں ایک رقم بھیجی تو اس کے جواب میں ان کو شکریہ کا ایک قطعہ لکھ کر بھیجا، مگر ان میں سے کسی میں بھی شاعرانہ خوشامد و ذلت کی خو روا نہیں رکھی،

نذر و نیاز کے طریقہ کو بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے، اور اس پر کتنے ہی خوشنما پردے

ڈالا جائے، لیکن اس سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ نواب علی حسن خاں بہادر نے اُن کے ساتھ
ایک بار اس قسم کا سلوک کرنا چاہا، اور ریل پر چلتے وقت ایک معقول رقم نذر کرنی چاہی، لیکن
انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، ایک دفعہ مولانا شروانی فرماتے تھے "بہت ابتدائی زمانۂ
تعلّق و ملاقات میں جب مولانا کو میں نے پہچانا نہ تھا، ایک کتاب مطبوعہ میرے یہاں سے
طلب فرمائی جو میرے یہاں نہ تھی میں نے سادہ لوحی سے لکھ دیا کہ کتاب دوکان سے طلب
کر لیجئے، قیمت میں ادا کروں گا، اس پر اس گرمی سے ڈانٹا کہ آج تک یاد ہے، میری معذرت
ساختہ یہ تھی کہ مقصد یہ تھا کہ کتاب آجائے گی تو میرے یہاں رہے گی" ہر ہائینس بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال
نے اپنی ایک تصنیف کی اصلاح کے معاوضہ میں دو سو روپیے نذر کئے، لیکن مولانا نے ان کو
خود لینا پسند نہیں فرمایا، سرکاری اہل دفتر کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان کو ندوہ کے حساب میں منتقل کر دیں۔

ایک بار ترکی کے سفر میں اس قسم کا نہایت بدنما منظر سامنے آیا، مولانا ذکی پاشا سے ملنے
گئے، تو عربی وضع میں تھے، پاشا موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے
ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ترکی سکے) نکالیں، پہلے تو مولانا کو سخت تعجب ہوا
پھر خیال آیا کہ انھوں نے ان کو گداگر سمجھا، اس خیال سے مولانا کو سخت رنج ہوا، اور رنج کے ساتھ
غصہ آیا، اور چلا کر کہا:-

شوهنٹ - ماجئنا لعنکنا من الفقراء   یعنی یہ کیا ہے، ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں

شیخ علی ظبیان بھی مولانا کے ساتھ تھے، پاشائے موصوف نے اُن سے مولانا کے غصہ کی وجہ
پوچھی، انھوں نے مولانا کے آنے کی غرض وغایت بیان کی، تو پاشائے موصوف کو سخت ندامت

ہوئی، اور معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالاخانہ پر چلئے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، مولانا اس واقعہ کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:۔" مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ یہاں علماء اور متصوفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اسی غرض سے ملتے ہیں کہ کچھ نذرانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا لیکن اس فرقہ کے حال پر بہت افسوس ہوا، نذر و نیاز کے طریقہ کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہیں پائی۔ (سفرنامہ ص)"

صرف نذر و نیاز؛ بلکہ عموماً کسی قسم کی مالی اعانت قبول کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، ایک بار وہ بیمار تھے، ان کے بھائی مولوی اسحاق مرحوم نے بغرض علاج اُن کے پاس دو سو روپے بھیجے، لیکن انھوں نے واپس کر دیے،

انلی سے اُن کے نام اور نیل کانفرنس کی شرکت کا دعوت نامہ آیا، تو نواب علی حسن خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس علمی سفر کے مصارف قومی چندے سے ادا کئے جائیں لیکن مولانا نے ان کو لکھا کہ " میری مالی اعانت کی ضرورت نہیں، واگر کسی قدر ہے تو اس کو حمیت نفس نے رفع کر دیا ہے، اصل یہ ہے کہ ابھی ملک کی یہ حالت نہیں کہ اس قسم کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جائیں، آپ کو تو یہ پہلو پیش نظر ہے، کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا، اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی دریوزہ گری کرکے یورپ گیا" (مکاتیب دوم)

ندوہ کی کامیابی کے لئے اگرچہ وہ ہر قسم کی کوششیں کرتے تھے، تاہم اس کے لئے بھی ان کا لب سوال بمشکل کھلتا تھا، شملہ ڈیپوٹیشن میں گئے تو اپنے لکچر میں نہایت دبی زبان سے چندہ کی تحریک کی تو یہ شعر پڑھا،

عاشقِ تازہ ہوں اور وصل کی اوّل شب ہے
شرم سو کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے

ایک بار لکھنؤ میں جان محمد مالک ہوٹل کی نسبت مشہور ہوا کہ وہ ایک معقول رقم کسی قومی کام میں دینا چاہتے ہیں، بعض احباب کے اصرار سے مولانا بھی اُن سے ملنے گئے، اور اسی قسم کی قومی باتیں ہوئیں، مولانا فرماتے تھے: مجھے تعجب تھا کہ میں اس قدر ذلیل ہو گیا کہ زر کے لئے دولتمندوں کے گوشۂ چشم کا منتظر رہتا ہوں، میری یہ حالت تھی کہ علی گڈھ کے ایک رئیس نے مجھ سے ملنا چاہا، اور اس غرض سے اپنی گاڑی بھیجدی، لیکن میں نے صاف کہدیا کہ اگر ان کو ملاقات کا شوق ہے تو خود آئیں، میں نہیں جا سکتا۔

ایک بار حافظ عبد الحلیم صاحب رئیس و تاجر کانپور نے ندوہ میں پانچ سو روپے دیئے، مولوی عبد السلام صاحب ندوی اُس وقت الندوہ کے سب اڈیٹر تھے، انھوں نے اپنے شذرات میں اس کا ذکر منت پذیری کے ساتھ کیا، اور اخیر میں لکھا کہ اُن کی فیاضی ندوہ کو تنگ داماں کر سکتی ہے۔ چونکہ شذرات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا، مولانا کی طرف منسوب ہوتا تھا اس لئے مولانا نے اس کو دیکھا تو سخت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ میں اس قسم کے خوشامدانہ الفاظ کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہیں کر سکتا،

ایک بار کسی جشن کے موقع پر ندوہ کی طرف سے نواب صاحب بھاولپور کی خدمت میں دعانامہ بھیجنے کی تحریک ہوئی، اور مولانا سے دعانامہ لکھنے کی خواہش کی گئی، تو انھوں نے اس کو سخت ناپسند کیا اور لکھا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ نہایت دناءت کی بات ہے کہ موقع جشن پر اور منگتوں کی طرح ندوہ کا وفد بھی اپنا بھجن گائے، علماء کی شرکت اسی قسم کے خیالات پیدا کرتی ہے۔

کیا علی گڑھ کالج بھی ایسی بدتمیزی کر سکتا ہے؟ (جید الحق۔ ۱)

عدمِ قبولِ احسان خودداری اور بے نیازی نے مولانا کو ہمیشہ لوگوں کے احسانات سے سبکدوش رکھا، غریبی کی طالب علمی کے زمانہ میں تو یہ گناہ عموماً معاف ہوتا ہے، مگر وہ اس گناہ کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے، اور ہمیشہ اپنے کھانے پینے کا سامان خود کیا، اُن کے والد جو کچھ ماہوار بھیجتے تھے، اسی میں جس طرح بن پڑتا تھا بسر کرتے تھے، طالب علمی کے بعد جب خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہوئے تو والد ماجد کو بھی زحمت دینے سے احتراز کیا، حیدرآباد کے وظیفہ کے لئے تو بے شبہ انھوں نے بعض احباب کا احسان اٹھایا، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے کسی سے معمولی سے معمولی احسان کا اٹھانا بھی گوارا نہیں کیا، ممالکِ اسلامیہ کے سفر کو روانہ ہونے لگے تو اپنے والد سے بھی مالی امداد قبول نہیں کی، اور نہیں چاہا کہ اُن کی وجہ سے کوئی دوسرا زیر بار ہو، بعض بزرگوں نے اس پر بھی ان کے قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد ان کے پاس روپے بھیجے، تو واپس کر دیئے، واپسی کے بعد ریاست رامپور نے سفر کے کل مصارف ادا کرنے چاہے، تو اس سے بھی انکار کیا،

لکھنؤ میں نواب سید علی حسن خاں مولانا کے بہت بڑے دوست بلکہ بہت بڑے معتقد تھے، وہ بہت چاہتے تھے، کہ مولانا سال میں چند مہینے ان کی کوٹھی میں قیام کریں، لیکن مولانا نے اس کو کبھی پسند نہیں کیا، بمبئی میں اگرچہ مکانات بہت گراں ہیں، اور بعض حالات میں بمشکل ملتے ہیں، لیکن مولانا نے وہاں بھی کسی دوست یا کسی تاجر کے یہاں قیام کرنا پسند نہیں کیا، ایک دفعہ بمبئی میں ایک رئیس نے ان کو اپنے یہاں ٹھہرانا چاہا، لیکن انھوں نے

اس کو منظور نہیں کیا، بمبئی سے چار مہینہ کے لئے حیدرآباد گئے، تو وہاں بھی کرایہ کا مکان لیا،

اگر کسی موقع پر اُن کے ساتھ کوئی سلوک کرتا، تو جہاں تک ہوتا وہ اس کا معاوضہ ادا کرنے اور اس کے احسان کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے، سفرِ قسطنطنیہ میں حسین آفندی جو پہلے سفیر بمبئی رہ چکے تھے، مولانا کے ساتھ نہایت حسنِ اخلاق سے پیش آئے تھے، مولانا نے وہیں اُن کے احسانات کی گرانباری کو محسوس کیا، اور اُن سے سبکدوش ہونے کے لئے، اپنے والد کو لکھا: اُن کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گرانبار کر دیا ہے، اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اس لئے عرض ہے کہ نہایت اہتمام، نہایت تلاش اور جد و جہد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمایئے، کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے، جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت فرمایشی بنوا کر لائے، یہاں ہندوستان کے ظروف بھی آتے ہیں، مگر اچھے نہیں آتے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان، مگر نہایت عمدہ یعنی فردی بوٹیاں ہوں، نہایت باریک اور نازک کام ہو، اور قیمتی روپیہ سے کم قیمت کا نہ ہو، خواجہ عزیز اللہ صاحب کی معرفت اگر خریدا جائے تو غالباً اچھا ہوگا، میں یہاں آخر اگست تک رہوں گا، اس وقت تک آجائے، یہ بھی نہ ہو تو مراد آباد کا کوئی برتن، مگر نہایت عمدہ، غرض کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے؛ (مکاتیب)

راستبازی بیانِ واقعہ میں راست گوئی اور راست بازی اُن کی عادت تھی، وہ کسی کی غیبت و حکایت و شکایت نہیں کرتے تھے، اور یہ طریقہ اُن کو سخت ناپسند تھا، وہ جس زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے علما کے لئے اس وقت سب سے زیادہ آسان، اور سب سے زیادہ کامیاب ذریعۂ معاش جو تھا، وہ وکالت کا پیشہ تھا، مولانا نے بھی اگرچہ اعزہ و احباب، بالخصوص والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا، لیکن اُن کی فطری راست بازی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ

وہ اس پیشہ کے لئے ناموزوں ہیں، اور ایک موقع پر جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے خود اُن کے والد کو یہ کہنا پڑا کہ نہیں آپ وکیل بن چکے۔

اسی وکالت کے زمانہ میں پیشۂ وکالت کے متعلق جس کو انھوں نے مجبوراً اختیار کیا، لکھتے ہیں: "گرچہ کنم کہ والد قبلہ را تجویز وکالت روے ورا ہے نیست و بایں ہمہ از وڈلی اگر بہ وکالت نساختہ باشم در نظر انصاف مرا دریں سیاہ گناہے نخواہد بود، آہ ازاں ہنگام کہ دولت روے گرداند، و کار بدست می افتد، و دراں آشوب دل برجا نماند، درم و خواست و ناخواست روے بہ وکالت آرم و خویش را اندازہ نہم و مرداں را بہرزہ و لاف فریب دہم و ایں خواری بہ خویش در پذیرم" (مکاتیب)

وکالت کے پیشہ پر ان کی یہ تنقید اُنکی فطری راست پسندی کی غماز ہے،

بالآخر وکالت چھوڑ کر علی گڈھ گئے، اور وہاں سرکاری اسکول کی مدرسی قبول کرلی جس کی تنخواہ للعہ ماہوار تھی، اگرچہ مولانا کی خودداری اس کو بھی پسند نہیں کرتی تھی، تاہم انھوں نے وکالت پر اس کو ترجیح دی،

سفارشوں میں جھوٹ بولنا یا مبالغہ کرنا عموماً برا نہیں سمجھا جاتا، مگر وہ اس باب میں بھی بہت محتاط تھے اور وہیں تک کہتے یا لکھتے تھے جو اُن کے نزدیک صحیح ہوتا، اُن سے جب کوئی شخص کوئی خلاف قیاس بات روایت کرتا تھا تو وہ محدثانہ اصول سے اس سے مواخذہ کرتے تھے، اور اس کا سلسلۂ روایت دریافت کرتے تھے اور اس پر تنقید کرتے تھے، اور یہ واقعہ ہر دوسرے تیسرے دن ضرور ہی پیش آیا کرتا تھا،

سفارشوں میں احتیاط سفارش نیکی کا کام ہے، مگر درحقیقت یہ ایک قسم کی شہادت بھی ہے، اس لئے

اس میں احتیاط کی سخت ضرورت ہے، عام لوگ اس کی نیکی ہی کے پہلو کو دیکھتے ہیں، دوسرے سے
چشم پوشی کرتے ہیں، مولانا کا عمل اس کے برخلاف تھا، اس میں ایک تو ان کی خودداری کو دخل
تھا کہ وہ اس کو بھی امراء کے سامنے اظہارِ حاجت ہی سمجھتے تھے، جس سے ان کو ہمیشہ اجتناب رہا،
وہ جس قدر صاحب اثر تھے، اور جس قسم کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے ذریعہ سے اگر
وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے، تو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے، لیکن جس طرح انھوں نے اپنے لئے
کسی کے سامنے زبانِ سوال نہیں کھولی، اسی طرح اپنے اعزہ و احباب کے لئے بھی کسی سے سفارش
کرنا پسند نہیں کیا، حامد ان کے اکلوتے بیٹے تھے، اور مدتوں نائب تحصیلداری تک پہنچنے کی کوشش
کرتے رہے، لیکن مولانا نے ان کو اس میں کسی قسم کی مدد نہیں دی، چنانچہ مولوی سید ابو ظفر صاحب
ندوی کو جنھوں نے ان سے سفارش کی خواہش کی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں: "بات یہ ہے کہ
میں نے اپنے بیٹے کے لئے بھی کبھی سفارش نہیں کی، لیکن موقع آجائے تو ہر طرح کی تائید کرسکتا ہوں" (۹)

مولانا کے والد لوگوں پر اس قسم کے احسانات بہت کیا کرتے تھے، لیکن مولانا فرماتے تھے
کہ مجھے تعجب آتا تھا کہ وہ حکام سے اس طرح لوگوں کی سفارشیں کیا کرتے تھے کہ گویا معمولی بات
چیت کر رہے ہیں، ایک خط میں نواب محسن الملک کو جو اپنے کالج کے طالب علموں کے لئے
ہر قسم کی سفارشوں کے لئے تیار رہتے تھے، یہ لکھا: "رہا قوم کی خدمت تو اس کی یہ تدبیر نہیں کہ جھوٹی
سفارش کرکے دو چار کو نوکری دلا دی جائے، لوگوں کو اس قابل بنانا چاہئے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں" (۱۰)
فرمایا کرتے تھے کہ جھوٹی سفارش کرکے ایک کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے، اور سیکڑوں کو نقصان؛

اس سے یہ معلوم ہوا کہ خودداری کے علاوہ لوگوں کی سفارش نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ

یہ بھی تھی کہ جب تک اُن کو کسی شخص کی اہلیت و قابلیت پر کافی اطمینان نہیں ہوتا تھا وہ اس کے لئے سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور سفارش نامہ میں صرف اس قدر لکھتے تھے جتنا ان کو صحیح طور پر معلوم ہوتا تھا، محض سُنی سنائی باتوں کی بنا پر یا ایشیائی حسن ظن وحسن اخلاق کی بنا پر وہ کسی کی سفارش کرنا پسند نہیں کرتے تھے، مولوی منصور احمد صاحب ایم اے علی گڈھ سے تحصیل عربی کے لئے یورپ جا رہے تھے، اور سرکاری وظیفہ کے لئے سند چاہتے تھے، اگرچہ اُن کو خود ڈاکٹر اور دیگر مستشرقین سند دینے والے تھے، لیکن انھوں نے مولانا سے بھی سند لینا چاہی، اور چونکہ وہ مولانا کے مذاقِ طبیعت سے واقف تھے، نمونہ کے طور پر عربی عبارت بھی لکھ کر بھیجی، اس کے متعلق مولانا، مولوی ضیاء الحسن ندوی کو جو اس وقت کالج میں تھے، لکھتے ہیں: "عربی عبارت تو بہت معمولی ہو، اس سے گئی گذری اور کیا ہوتی، سرٹیفکٹ لکھوں گا تو یہ لکھوں گا، کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں"۔ (مکاتیب دوم ضیاء الحسن)

البتہ جو لوگ علمی مذاق رکھتے تھے، یا علمی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے وہ اس سے مستثنٰی تھے اور یہ مولانا کی علم پروری کی سب سے بڑی دلیل ہے، انھوں نے اپنے بیٹے کے لئے کبھی سفارش نہیں کی، لیکن اپنے فرزندانِ روحانی کی سفارش میں کبھی دریغ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ان کے لئے عمدہ مواقع کی تلاش میں رہے، ۱۹۰۸ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ایک مدرس کی جگہ خالی تھی، راقم نے آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کی وساطت سے درخواست دی، اور کلکتہ جانے لگا، مولانا نے سنا تو پاس بلوایا، اور از خود مولوی سید شرف الدین صاحب کے نام ایک تعارفی خط لکھ کر دیا جس میں راقم کا ذکر اچھے لفظوں میں فرمایا تھا، جامعۂ عثمانیہ میں بھی

نے سفارش فرمائی تھی (حیات ص ۲۰۲) لیکن جب اس کا موقع آیا اور ناظم تعلیمات سرکار نظام (الطاف حسین صاحب) نے مجھے بلانا چاہا تو مولانا کا انتقال ہو چکا تھا اور میرے سر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو گئی تھی، اس لئے انکار کرنا پڑا، دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری پر راقم کا تقرر مولانا ہی کی سفارش بلکہ کوشش سے ہوا، مولوی عبدالسلام صاحب کے لئے بھی مولانا نے بھوپال وغیرہ میں سفارشیں کیں، مولوی عبدالباری صاحب ندوی علی گڑھ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے مولانا نے اُن کیلئے بھی سفارش کی، اور وہ وہاں سے چلے گئے تب بھی وعدہ کیا کہ آئندہ مراحل کے لئے بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ موجود ہوں۔

اسی طرح جن لوگوں کی لیاقت وقابلیت پر اُن کو اعتبار تھا اُن کی سفارش پوری قوت سے کرتے تھے،

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کو علی گڈھ کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری مولانا ہی کی سفارش سے ملی، دارالعلوم حیدر آباد کی پرنسپلی پر اُن کا تقرر مولانا ہی کی کوشش سے ہوا،

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر حیدر آباد سے علیحدہ کئے گئے تو بھوپال میں اُن کے لئے پُر زور سفارش کی،

کالج میں نائب ناظم دینیات کی تجویز ہوئی اور اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی خدمت میں حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کے لئے سفارش چاہی گئی، تو مولانا نے اُن کو لکھا "مولوی محمد اسلم جیراج پوری کی مجھ سے سفارش چاہی گئی ہو میں صرف اُن کی نیک بختی کا حال جانتا ہوں باقی معلومات مذہبی اور پابندی فرائض کو آپ خود تحقیق کریں، مجھ کو علم نہیں" (مکاتیب اول شروانی)

ردوکد سے احتراز مولانا کے متعلق اخبارات میں رطب و یابس بہت کچھ لکھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات پر بعض لوگ مخالفانہ ریویو بھی لکھا کرتے تھے، ان کی متعدد کتابوں کا رد بھی لکھا گیا، لیکن وہ کسی کا جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک بار مولانا نے مسئلۂ ارتقاء پر ایک فلسفیانہ مضمون لکھا، اس پر بعض مذہبی حلقوں میں شورش پیدا ہوئی، اور بعض اشخاص نے سخت لہجے میں اس پر اعتراضات کئے، مولانا حسبِ عادت خاموش رہے، لیکن ایک قرشی نے "قرآن مجید اور مسئلۂ ارتقاء" کی سرخی سے ایک مضمون لکھا جس میں ثابت کیا کہ یہ مسئلہ قرآن مجید کے مخالف نہیں، اگرچہ یہ مضمون مولانا کے قلم سے نہیں نکلا تھا، تاہم ان کو ناگوار ہوا، اور مجھے لکھا: "ارتقاء پر جو مضمون تم نے لکھا، گو میں نے نہیں دیکھا، اور ممکن ہے کہ اچھا ہو، لیکن میری ناراضی کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مخالفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی اتنے ہیں کہ لوگ ان کا جواب لکھیں، یہ لوگ یقین کرتے ہوں گے کہ تم نے لکھا ہو، سب میری طرف منسوب کرینگے۔" (مکاتیب سلیمانی)

علم الکلام اور الکلام پر ایک طالبِ علم فلسفی نے رسالہ "الناظر" لکھنؤ میں نہایت سخت تنقید لکھی، جس کو پڑھ کر میں بے چین ہوگیا، اور اسی عالم میں مولانا کے پاس پہنچا، میں اپنی نادانی سے یہ سمجھے تھا کہ جب مجھے اتنا غصہ ہے تو خدا جانے مولانا کا کیا حال ہوگا، وہاں پہنچا تو دیکھا، دریا کی پوری طرح ساکن ہیں، مگر پھر بھی یہ عرض کیا کہ اس کا جواب لکھا جائے، ارشاد ہوا "جو وقت اس جواب میں صرف کیا جائے، اسی میں کوئی دوسرا نیا کام کیوں نہ کر لیا جائے؟"

دکن ریویو میں جب وہ حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا، مولانا کے بعض شاگردوں کو ان سے کد سی ہوگئی تھی، ان کے مضامین اور تصنیفات پر نہایت بدنما تنقیدیں لکھتے رہتے، مگر انہوں نے کبھی الٹ کر نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے گویا اپنا یہ مسلک ہی مقرر کر لیا تھا کہ جا و بیجا ان پر اعتراض کریں، مگر کبھی انھوں نے اس کے سوا کہ "یہ الزام صحیح نہیں" اُن سے کچھ اور نہیں کہا، (ہمارے معاصرین مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب سوانح مولوی سید علی بلگرامی)

سیرت نبوی کے دیباچہ پر جب لکھنؤ کے ایک مولوی صاحب نے اعتراضات کئے، اگرچہ بعض مصالح کی بنا پر مولانا نے اس کا جواب لکھا، لیکن اپنے نام سے چھپوانا پسند نہیں کیا، اور اسکی وجہ یہ لکھی کہ: . . . . کہ میں مخاطب نہیں کر سکتا اس نے کسی اور کے نام سے وہ چھپ سکتا ہے، میں اپنے نام سے نہیں چھپوا سکتا، غرض اظہار حقیقت ہو، نہ اظہار نام"

ابتدائے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے الماموں پر جو اعتراضات کئے تھے مولانا نے صرف اس کا جواب لکھا، اس کے علاوہ انھوں نے کسی ریویو کا جواب لکھنا پسند نہیں کیا، اور یہ نتیجہ تھا جیسا کہ خود مولانا شروانی فرماتے ہیں: "اڈیٹر اخبار آزاد لکھنؤ کے اصرار کا،" مولانا شروانی کا بیان ہے کہ "غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا ؎

دمی آنگہ بدر دبا کہ چو ما | خامہ گیری و حرف جنگاری

ندوہ کی مخالفتوں کے زمانہ میں جب بعض ارکانِ ندوہ کے غلط الزامات سے اُن کو قلب حقیقت کا خوف ہوا تو بے شبہہ اخبارات میں ایک دو صاحبوں کی تحریروں کا جواب دیا جو مقالات میں شامل ہے،

صفائی پسندی | مولانا باوجود سادگی کے نہایت صفائی پسند تھے، کپڑے ہمیشہ صاف پہنتے تھے

اور ہفتہ میں کئی بار بدلتے تھے۔ بعض لوگ جو نمائشی صفائی پسند ہوتے ہیں، یہ کرتے ہیں کہ اوپر سے صاف کپڑے پہن لیتے ہیں، اور نیچے میلی بنیائن، یا میلا کرتہ، رہنے دیتے ہیں، ایک دفعہ ایک ملازم نے یہ حرکت کی، تو سخت برہم ہوئے۔ فرماتے تھے کہ رات دن ایک ہی کپڑا پہننے سے جلد میلا ہوجاتا ہے، اس لئے ایک بار میں نے خیال کیا کہ رات کو کوئی دوسرا کپڑا پہن کر سویا کروں، لیکن پھر خیال ہوا کہ آخر وہ بھی تو میلا ہی ہوگا اور گو اُس پر دوسروں کی نگاہ نہ پڑے، لیکن خود میری طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی؛ جس کمرے میں رہتے تھے وہ باوجود سادگی کے نہایت صاف وشفاف رہتا تھا، اُس میں روزانہ جھاڑو دلواتے تھے، اور ہر چیز کو صاف کرواتے تھے۔ ندوہ کے کسی جلسے میں گئے تو ایک حجرہ ٹھہرنے کے لئے ملا، چونکہ کوئی ملازم ساتھ نہ تھا، اس لئے خود ہی جھاڑو دے لیا کرتے تھے ورنہ ملازم سے روزانہ جھڑواتے تھے، خود پان نہیں کھاتے تھے، اور پان کھانے والوں سے سخت نالاں رہتے تھے، اگر کوئی شخص پان کھا کر ان کے مکان میں تھوک دیتا تھا تو سخت منغص ہوتے تھے، اور اس کو چھڑواتے تھے،

جب آم کھاتے تو ملازم سامنے ایک طشت رکھ دیتا، اسی میں چھلکے اور گٹھلی رکھتے جاتے، زمین پر نہ پھینکتے، ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو فرمایا: آپ چھلکے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے؟ انھوں نے کہا: بھنگی آئے گا تو اٹھائے جائے گا؛ بولے کہ مولوی چھلکے رکھتے ہیں، بھنگی اٹھاتے ہیں:

کھانے میں ہاتھ بہت کم آلودہ کرتے، اُن کے دسترخوان پر چمچہ بلکہ کبھی کبھی چھری کانٹا بھی ہوتا، اور اسی سے بوٹیاں اور ترکاریاں وغیرہ کھاتے، بدبو سے سخت نفرت تھی، اور اسی لئے حقہ

پینے والوں کے پاس بیٹھنے سے سخت بیزار ہوتے تھے، پان کثرت سے چبایا، تمباکو والا کھانا سخت ناپسند تھا

نفاست پسندی مولانا اپنی سادگی کے باوجود بہت نفاست پسند تھے، اور اس کا اثر ان کی ایک ایک چیز سے نمایاں ہوتا تھا، مسودات ہمیشہ سفید اور فلسکیپ کاغذ پر لکھتے تھے، میز پر قلم دوات وغیرہ ہمیشہ عمدہ قسم کی رکھتے تھے، مسودات نہایت خوشخط کاتب سے صاف کرواتے تھے، فرماتے تھے کہ جتنا زیادہ صاف اور خوشخط ہو اسی قدر اس کے بنانے میں جی لگتا ہے، کتاب ہمیشہ بہتر سے بہتر چھپواتے تھے، یورپ اور بیروت کی عمدہ چھپی ہوئی کتابوں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے اور اس کی نہایت خوشنما جلد بندھواتے تھے، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ ایک بار بمبئی میں میرے سامنے اغانی خریدی، اور جلد بندی کے لئے دی، جلد ساز جلد جلدی باندھ کر دیا، تو سخت برہم ہوئے۔

مولانا میز پر لکھنے کے عادی تھے، میز پر بانات چڑھا رہتا تھا، ایک دفعہ یہ بانات میلا ہوگیا تھا، یا کوئی داغ پڑ گیا تھا، تو طبیعت میں وہ انشراح نہیں رہا جو ایک مصنف کے لئے درکار ہے، بڑھئی نہ ملا، اتفاق سے ایک طالب علم (مولوی سید محمد صاحب ندوی رائے بریلوی اور اب ایم اے) اس وقت موجود تھے، ان کو اس قسم کے کاموں کا ذوق تھا، بازار سے کپڑا آیا، اور اسی وقت انھوں نے پیچ سے میز کی ٹوٹ کھولی، اور پرانا کپڑا نکال کر نیا کپڑا منڈھا، تو ان کو خوشی ہوئی اور فرمایا کہ اب لکھنے میں خوب جی لگے گا۔

کپڑے اگرچہ بہت کم قیمت پہنتے تھے لیکن نفاست کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا۔

کھانے کی خوبی کے لئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ خوش ذائقہ ہو بلکہ یہ بھی لازمی تھا کہ خوشرنگ

ہو اور سلیقہ کے ساتھ دسترخوان پر چُنا جائے،

اسی نفاست پسندی کی بنا پر لکھنؤ کے تمدّن کو دلّی کے تمدن پر ترجیح دیتے تھے،

چائے ہمیشہ سادی پیتے تھے اور اس میں بہتر سے بہتر دانہ دار انگریزی شکر بلکہ کبھی کبھی مصری ڈالتے تھے، فرماتے تھے کہ دودھ ڈالنے سے چائے کی لطافت چلی جاتی ہے، اور دیسی شکر اگرچہ میٹھی زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس میں ایک قسم کی بیک ہوتی ہے، ہندوستانی عطر کی تیزی کو ناپسند فرماتے تھے، بلکہ انگریزی عطر البتہ انگیز کر لیتے تھے (اگرچہ استعمال نہیں کرتے تھے) فرماتے تھے کہ اُس کی خوشبو میں لطافت ہوتی ہے، ایک دفعہ میں نے غسل کیا تھا کپڑے بدلے تھے، اور کوئی تیز ہندوستانی عطر لگایا تھا، اور اسی شان سے اُن سے ملنے گیا، بیٹھا ہی تھا کہ فرمایا "تم نے عطر لگایا ہے، کیسی سخت بو ہے" میں نے چاہا ہٹ کر دور بیٹھوں، فرمایا "اس سے کیا ہوتا ہے"

خاکساری مولانا باوجود خودداری کے بے حد خاکسار تھے، ہر قسم کے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے تھے اور اُن سے گھنٹوں بات چیت کرتے تھے، اعظم گڈھ میں ایک جلد ساز تھے، جو مولانا کے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے، اخیر عمر میں اعظم گڈھ میں قیام کیا تو اُن سے روزانہ صحبت رکھتے تھے جب کبھی وہ نہ آتے تو اُن کو خود بلواتے تھے،

لکھنؤ میں رہتے تھے تو منشی محمد علی صاحب محرر دارالعلوم کے کمرے میں اکثر جا بیٹھتے اور چائے پیتے، تمام طلبہ سے بے تکلف ملتے، اور اُن کی عیادت کرتے، امین آباد اور چوک میں بے تکلف جاتے کبھی کبھی بعض دوکانوں پر بھی بیٹھ جایا کرتے،

جس زمانہ میں علاقہ کا انتظام کرتے تھے، اس وقت راجپوت وغیرہ جو اسامی تھے آتے تھے

تو زمین پر بیٹھتے تھے، لیکن مولانا خود ہی اُن کو برابر بٹھاتے تھے،

کبھی مکان پر جاتے تو تمام اعزہ و احباب کے مکان پر جاکر اُن سے ملاقات کرتے،

ایک دفعہ لکھنؤ میں گولہ گنج کی ایک سڑک پر جہاں دار العلوم تھا، مدرسے متصل کرو اپنے قیامگاہ (مکان نواب مرشد آباد جو اِن دنوں اخبار حق کا دفتر ہے) پر جا رہے تھے، راقم الحروف ساتھ تھا، اتفاق سے کچھ دیہاتی مسلمان دھوتی باندھے پیچھے سے آ رہے تھے، جب وہ میرے برابر آئے تو چپکے سے مجھ سے پوچھا کہ مولوی شبلی یہیں ہوں؟ میں نے کہا ہاں، وہ آگے بڑھ گئے، مولانا نے فرمایا یہ کیا کہتے تھے؟ میں نے کہا پوچھتے تھے کہ مولوی شبلی صاحب یہی ہیں، یہ سنکر مولانا مسکرائے اور فرمایا خدا کی قسم مجھے ان کے اتنے سے فقرہ سے جو خوشی ہوئی وہ بڑوں بڑوں کی تعریف سے نہیں ہوئی۔

مسلم لیگ سے اختلاف کے زمانہ میں کسی نے راجہ صاحب محمود آباد کی نسبت ان سے یہ کہا کہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں شبلی کو تباہ کر دوں گا، تو جواب میں کہلایا کہ راجہ صاحب مجھے آپ تباہ نہیں کر سکتے کیونکہ میں زمین کی گھاس ہوں، آندھیاں اونچے اونچے درختوں کو گراتی ہیں، زمین کی بے قدر گھاس کو نہیں[1]،

عموماً معمولی کپڑے پہنتے تھے، کھری چارپائی اور چٹائی پر بیٹھتے تھے، آرائش اور تکلف سے گریز تھا،

خصوصی اوقات میں خلوت پسندی

شہرت نے اگرچہ مولانا کو شمع محفل بنا دیا تھا، بہت سے لوگ اُن سے ملنے آتے تھے، وہ خود جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے، یار باش تھے،

---

[1] حدیث شریف میں مسلمان کی تمثیل یہی بیان آیا ہے، مثل المومن کمثل الزرع لاتزال الریاح تفیئه ولا یزال المومن یصیبه بلاء ومثل المنافق کمثل شجرة الارز لا تهتز حتی تستحصد (ترمذی، باب الامثال)

احباب پسند تھے، مگر کام کے اوقات اور سونے کے وقت میں اُن کو خلوت ہی پسند تھی، کام کے اوقات، اور آرام کے گھنٹوں میں کسی شخص کا وجود بلکہ تخیل بھی اُن کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا تھا، رات کو جیسا کہ پہلے گذر چکا ہمیشہ کمرے میں تنہا سوتے تھے، اور کتنا ہی تنگ مکان ہو، لیکن اس میں کسی دوسرے کو سونے نہیں دیتے تھے، فرماتے تھے کہ دوسرے شخص کے تخیل سے بھی مجھے نیند نہیں آسکتی۔

بعض اوقات بعض لوگ ان سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے، تو اُن کو سخت تکلیف ہوتی، خود فرماتے تھے کہ "میں نے عجیب متضاد طبیعت پائی ہے، احباب کی صحبت لازمی ہے، لیکن چند مخصوص گھنٹوں میں بالکل تنہائی ہونی چاہئے" صحبت کے لئے چار بجے شام سے آٹھ بجے شب تک کا وقت مخصوص تھا، ان کے دروازے پر جلی قلم میں لکھا ہوا یہ اعلان چسپاں رہتا تھا کہ چار بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں۔

بمبئی کو انھوں نے جن اسباب کی بنا پر پسند کیا تھا، ان میں ایک خلوت گزینی بھی تھی، فرماتے تھے کہ "یہاں شبلی پڑا ہوا ہے، اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے" (مکاتیب حصہ اول) اسی خلوت گزینی کی بنا پر بعض اوقات بمبئی میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:- "بمبئی میں تنہا دن کام کے لئے ملتا ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں، اس لئے برس دن تک یہاں سے نکلنے کا ارادہ نہیں"

اظہار رائے میں بیباکی مولانا اپنی جو رائے قائم کر لیتے تھے، اس کے اظہار میں بے باک تھے، جو لوگ اس رائے کے مخالف ہوتے تھے، اُن کے دلائل کا رد بھی اسی سختی سے کرتے تھے، مولانا شروانی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:- "دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں، لیکن دوستوں کی مروت

کبھی اُن کو بھی تملق اور چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے وہ پروا نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کے پس پشت بیانِ اختلاف میں بھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی سے کرتے تھے۔ اپنی رائے کے دلائل کا زور و شور سے اظہار کرتے، باوجود یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مخالف کے ذاتی یا اخلاقی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔

جس زمانہ میں وہ علی گڈھ تشریف لے گئے، تمام کالج بلکہ تمام قوم پر سید صاحب کا اثر محیط تھا۔ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ جب سید صاحب نے کانگریس کی مخالفت کی تو دفعتًہ تمام قوم سیاسیات میں حصہ لینے سے الگ ہوگئی، اور ایک مدت تک الگ رہی لیکن مولانا جیسا کہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا ہے، اسی وقت سے سید صاحب کی اس پالیسی کے شدت کے ساتھ مخالف تھے۔ اخیر میں انھوں نے پالیٹکس پر جو آزادانہ نظمیں اور آزادانہ مضامین لکھے اُن کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زمانہ اور قوم کی موجودہ روش کا نتیجہ تھے، اور بعض اس کو جاہ پرستی اور شہرت طلبی پر بھی محمول کرتے تھے، لیکن درحقیقت اُن کو ابتدا ہی سے اس پالیسی سے نفرت تھی اور اس وقت سے اخیر دم تک وہ اپنی اس رائے پر قائم رہے۔

اس وقت قدیم عربی نصاب کی مخالفت کرنا، اور ایک عربی مدرسہ میں انگریزی اور علومِ جدیدہ کا داخل کرنا ایک ایسا کام تھا جو ایک شخص کو تمام علما کی لعنت و ملامت کا آماجگاہ بنا سکتا تھا، لیکن مولانا نے لوگوں کی مخالفت مول لی، مگر جس راستہ کو انھوں نے صحیح سمجھا اس سے پیچھے نہ ہٹے۔ کمزور دل کے لوگ بدنامی کے خوف سے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار نہیں

کرسکتے لیکن مولانا اس قسم کی بدنامی سے بالکل نہیں گھبراتے تھے، ایک بار ندوہ میں انگریزی کے داخل کرنے کی تحریک مولانا نے نہایت شدومد کے ساتھ کی لیکن مولانا حبیب الرحمن خاں نے جو غالباً اس جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے بحث کا موقع نہیں دیا، مولانا نے جلسہ کے بعد اُن سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا: "تمھاری بدنامی کے ڈر سے"

لیکن علماء کے لئے انگریزی تعلیم کی ضرورت کی جو رائے انھوں نے قائم کرلی تھی اس پر برابر اڑے رہے، اور بالآخر وہ کامیاب ہوئے، ندوہ میں انگریزی تعلیم داخل ہوئی، اور اب بہت سے مدرسوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے، اور بے تکلف مولوی سیکھ رہے ہیں، مگر یہ سارا فیض انُ ہی کے استقلالِ رائے کا ہو۔

سچائی کے مقابلہ میں وہ عوام کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا اصول یہ ہے کہ انسان ہر کام کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے، اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہئے"

اور اگر ان کے سامنے کبھی یہ تذکرہ آتا کہ فلاں کام سے فلاں شخص ناراض ہوجائے گا، تو فرماتے تھے، کہ "میں یہ کب چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے" اور اس کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھتے تھے،

خاطر یک دو کس ار شاد شود از تو بس است   زندگانی بہ مرادِ ہمہ کس نتوان کرد

علم کلام کے سلسلہ میں بعض مذہبی مسائل کی تشریح میں انہوں نے عام شاہراہ سے الگ رستہ اختیار کیا، اور جن باتوں کو امام غزالی اور امام رازی نے صرف خلوت میں کہا تھا، ان کو علانیہ برسرِ عام

ظاہر کیا، جس کی بدولت اُن پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، مگر اس کی کچھ پروا نہ کی، البتہ جب آخر میں سیرت
نبویؐ کی تاثیر سے ان میں انقلابِ حال پیدا ہوا تو صورت اور ہوگئی،

وہ فقہی مسلک میں حنفی تھے، اور نہایت سخت حنفی تھے، اس کے بعد کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ
نظر سے سب کچھ بن گئے، مگر بہرحال وہ حنفی ہی رہے، اور عمر بھر اپنی حنفیت کا اعلان کرتے رہے،

سادگی

مولانا کا خاندان ایک آسودہ خاندان تھا، اُن کے والد بہت بڑے وکیل تھے، اور
رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے، اُن کے تین بھائی کامیاب وکیل، اور بیرسٹر، اور انگریزی طرزِ معاشرت
کے دلدادہ تھے، مولانا نے کامل سولہ سال علی گڑھ کالج میں بسر کئے، جو دنیوی جاہ و جلال کی نمائش گاہ
تھا، مدتوں حیدرآباد میں ایک معقول مشاہرہ پر ملازم رہے، جہاں کے تمدن کا اندازہ داغ کے
اس شعر سے ہو سکتا ہے،

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم　　یہاں بھی بجے ہیں مکاں کیسے کیسے

اس بنا پر خیال ہو سکتا ہے کہ اُن پر بھی اس طرزِ معاشرت کا اثر پڑا ہوگا، اور انھوں نے اس
قدیم سادگی کو کھو دیا ہوگا، جو گروہِ علماء کا طغرائے امتیاز ہے،

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا فطرۃً نہایت سادگی پسند تھے، اور ہمیشہ اپنے معتقدین و تلامذہ
کو سادگی کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ خودداری اور بلند ہمتی کی وجہ سے وہ کسی سوسائٹی میں
پست ہو کر رہنا نہیں چاہتے تھے، اس بنا پر وہ حیدرآباد میں کسی قدر تزک و احتشام کے ساتھ
رہتے تھے، چنانچہ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "مجھ کو سردست [illegible]
نہیں مل سکتے، اور یہی یہاں کا خرچ ہے، پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی جاتی ہے، خرچ بڑھتا جاتا ہے، البتہ اگر یہاں

کی سوسائٹی میں تبذل، بحیثیت بے وقعت ہوکر رہوں، تو بس اندازہ ہو سکتا ہے" (محسن الملک۔ ۱۱)

تاہم وہ طبعاً سادگی کی طرف مائل تھے، اور ابتدا سے انتہا تک انھوں نے اس شان کو قائم رکھا، اُن کو نہایت کثرت سے سفر کرنے پڑتے تھے، لیکن ان کا خود بیان ہے کہ میں نے سفر میں ملازم ساتھ نہیں لیا، تنہا گھوما کرتا تھا، قسطنطنیہ کے طویل سفر کے لئے اگرچہ اعزہ واحباب نے باصرار کہا،

"لاجرم خادمے نیز بہ ہمراہ بہ برد"

لیکن مولانا یکہ و تنہا روانہ ہو گئے،

مولانا صحرائیت وفضائیت کے بہت دلدادہ تھے، اس لئے اگرچہ مکان وسیع، پُرفضا اور خوش منظر پسند کرتے تھے لیکن اس کے علاوہ ان کو دوسرے قسم کے زیب وزینت اور سامانِ آرائش کی کچھ پروا نہ تھی، مولوی عبدالسلام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ان کو کانپور میں مسجد کے ایک حجرے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھا تھا، ندوہ میں مدتوں وہ اوپر کے ایک کمرے میں مقیم رہے، جو فرنیچر کی کل کائنات ایک چٹائی، ایک فرش اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی، البتہ صحن کسی قدر وسیع تھا، اور ادھر ادھر فضائیت تھی، اس کے بعد انھوں نے کرایہ کا ایک بڑا مکان لیا، جس میں متعدد کمرے تھے لیکن اُن کی ضروریات کے لئے صرف ایک کمرہ تھا، بقیہ میں طلبہ اور بعض مدرسین تھے، اخیر میں امین آباد پارک کے ایک بالائی کمرے میں اٹھ آئے تھے، جس کا کرایہ عشرہ ماہوار تھا، لیکن پارک کی فضائیت کے اس قدر شیفتہ تھے کہ فرماتے تھے کہ ایسی کوئی جگہ بمبئی میں بھی نہیں، ایک بار یہ دیکھ کر کہ بڑے بڑے لوگ اُن کے پاس آتے ہیں، اس کمرے کو فرنش بھی کیا، ایک

اور ایک قالین، متعدد کرسیاں منگوائیں، لیکن جب "خدام الدین" کی جماعت قائم کی، اور ان کو زہد وتقشف، اور سادہ زندگی اختیار کرنے کی طرف مائل کیا تو کرسیاں دفتر سیرت نبوی کو دیدیں، اور دری اپنے فرزند محمد حامد صاحب کو عنایت کی، اور خود ایک چٹائی پر بیٹھنا پسند کیا، فرماتے تھے کہ ایک میز اور ایک کرسی تو البتہ میرے لئے لازمی ہے کہ بغیر اس کے لکھ نہیں سکتا، اور تمام چیزیں غیر ضروری ہیں،

کپڑے بھی نہایت سادہ پہنتے تھے، کپڑوں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی، سات آٹھ سپید پائجامے، اسی قدر سپید کرتے، اور تین چار سرد اور گرم شیروانیاں، اور یہ کپڑے کوئی بہت زیادہ قیمتی بھی نہیں ہوتے تھے، عمامہ اور عبا کا استعمال صرف مخصوص جلسوں میں کرتے تھے، اور غالباً یہ چیزیں کسی قدر گراں قیمت ہوتی تھیں، اخیر اخیر میں تو طبیعت سادگی کی طرف بے انتہا مائل ہوگئی تھی، ایک بار مولوی عبد السلام صاحب سے فرمایا کہ دگلے کے لئے مجھے کوئی چھینٹ لادو، وہ ۴ گز کی ایک نقلی جامہ وار لے گئے، وہ دل میں ڈرتے تھے کہ اگر یہ ناپسند ہوئی تو مجھ پر جھلائیں گے، لیکن اس کو بار بار ادھر ادھر سے دیکھ کر فرمایا کہ ہاں نہایت عمدہ ہے، اب اس سے بہتر کپڑا دگلے کے لئے کیا ہو سکتا ہے؛ چنانچہ اسی کا دگلا بنوایا، اور دو سال اسی کو پہنتے رہے، ایک بار تو شیروانی وغیرہ سب بالائے طاق رکھدی تھی، اور صرف ایک کرتہ، ایک صدری، اور میرٹھ کی ٹوپی استعمال کرنی شروع کی تھی، ندوہ کے جس جلسۂ انتظامیہ میں مولانا پر کمیشن بیٹھا تھا اس میں مولانا اسی وضع میں گئے تھے، فرماتے تھے کہ اس لباس نے مجھ میں کچھ ایسا انکسار پیدا کر دیا تھا کہ میں خاموش تمام لوگوں کا منہ دیکھتا رہا، شیروانی پہننے سے بدن میں جو چستی پیدا ہوتی تھی اس کا

متعلق اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، ورنہ ایک وقت میں تمام کمیشن برا ہو جاتا۔

اپنے زیر تربیت طلبہ کو ہمیشہ سادہ وضع لباس اور عالمانہ وضع اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے، اور اُن کے سامنے خود اپنا نمونہ پیش کرتے تھے، وفات سے صرف ایک ماہ پیشتر اپنے ایک نوجوان عزیز شاگرد کو لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ مجھ کو اصولی مذہبی اختلافات بڑی ہیں، تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے، ہندوؤں سے بازی لے گئے، اور قیامت تک بیجا ہیں گے، میں اپنے مصارف بڑا پرکھ رہا ہوں، سرمایہ کچھ نہیں نیز دانی پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو بھی ختم کرے گی، اور انشاء اللہ فقیرانہ زندگی تک "جاؤں گا" بھائی! ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے، یہ سچ ہے کہ لوگ بے حیثیت کی وقعت نہیں کرتے لیکن یہ اُن لوگوں کے لئے ہے جن کو دو چار دن کا تجربہ ہو جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا، اور دیکھا، وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بیکار ہے" (مسعود ۳۳)

دار المصنفین میں تعلیم و تربیت کے لئے جن طلبہ کو انتخاب کرنا چاہا، اُن کے لئے یہ شرط بھی لگا دی: "وضع و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں، گو یہ جزئی بات ہے، لیکن میں شیروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قطع لحیہ[1] تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو" (مسعود ۴۱)

ندوہ میں خدام دین کی جماعت اسی اصول کے مطابق قائم کی تھی، اور وہاں سے الگ ہو کر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو تو بالکل گروکل کے اصول پر چلانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یو پی کے گورنر لاٹوش صاحب ولایت واپس جا رہے تھے، چونکہ وہ ہر دلعزیز رہے تھے

[1] داڑھی ترشوانا

اس لئے ان کو الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر بڑا مجمع تھا، مولانا بھی تشریف لے جا رہے تھے، لیکن ان کے پاس کوئی اچھی عبا نہ تھی، مجھے لکھا کہ تمہارے پاس کوئی اچھی عبا ہو تو بھیجدو، میں نے اپنی دو تین عبائیں بھیجدیں، مولانا نے ان میں سے ایک سبز رنگ کی عبا جس میں ریشم کی دھاریاں تھیں، اور مدنی وضع کی تھی پسند کی، اور اس کو پہنکر تشریف لے گئے، جب میں حسب معمول شام کو مولانا سے ملنے گیا تو فرمایا کہ آج تمہاری عبا نے مجھ کو بہت ذلیل کیا، وہاں مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) بھی تھے، وہ چار آنے گز کی شروانی پہنے تھے، مجھے بڑی شرم آئی،

رحمدلی وہ فطرۃً نہایت رقیق القلب تھے، اس لئے معمولی دردانگیز واقعہ سے اُن کا دل بھر آتا تھا،

ایک بار اعظم گڈھ سے پالکی پر سوار ہوکر مکان جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ چند آدمی شدت کے ساتھ گریہ وزاری کر رہے ہیں، واقعہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ غریب کاشتکار ہیں، ان کا بیل مر گیا ہے، فوراً ان لوگوں کو دس روپئے دیئے،

مولانا کے خاندان کے لوگ اسامیوں پر سختی کرتے، یا اُن کو مارتے پیٹتے، تو مولانا اس کو بہت ناپسند فرماتے، کسی کی فاقہ زدگی سے سخت متاثر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص فاقہ سے ہے تو میں کھانا نہیں کھا سکتا،

فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی بادشاہ کی رعایا میں ایک شخص بھی فاقہ سے رہ جائے، تو اس کو کھانا حرام ہے،

یہ رحمدلی ہی کا اثر تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر رو دیتے تھے، ادھر دل پر ذرا چوٹ لگی اور ادھر

انکھوں میں آنسو تیرنے لگے،

ایک دفعہ شام کے وقت امین آباد پارک کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، مکان کے پہلو میں ایک لڑکی کا کان چھیدا جا رہا تھا، وہ بار بار چیختی تھی، تو مولانا کے چہرہ و پیشانی پر شکن پڑ پڑ جاتی تھی جب ضبط نہ ہوسکا تو ملازم کو بلا کر کہا کہ "اس لڑکی کی ماں سے جا کر کہدو کہ اپنی لڑکی کو کیوں ذبح کر رہی ہے" مولانا سمجھتے تھے کہ ماں لڑکی کو مار رہی ہے، لیکن ملازم نے آکر کہا کہ لڑکی کا کان چھیدا جا رہا ہے۔

ذکاوتِ حس | دنیا میں جو بڑے بڑے اشخاص گذرے ہیں، وہ بیشتر نہایت شدید الاحساس تھے، اور اسی قوتِ انفعالی نے اُن کو قوم کی اصلاح، مذہب کی تجدید اور علم کی خدمت پر آمادہ کیا تھا، مولانا میں بھی یہ قوت شدت کے ساتھ موجود تھی، اور اسی قوت نے اُن کو ایک فطری شاعر، ایک پُرجوش مقرر، اور ایک قومی مصلح بنایا تھا،

اس قوت کا اثر مولانا کے اخلاق و عادات کے ایک ایک جزئیات سے نمایاں ہوتا تھا، معمولی سے معمولی ناگوار واقعہ پیش آجاتا تو ان کی پیشانی پر گرہ پڑجاتی تھی، کوئی بات خلافِ مزاج ہوجاتی تو سخت برہم ہوجاتے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد غصہ کافور ہوجاتا، سکونِ احتیاج میں ذرہ برابر خلل پڑتا تو بدحواس ہوجاتے، رات کو سوتے تو گھڑی کے کھٹکھٹانے کی آواز ناگوار ہوتی، امین آباد میں یکہ والے چلاتے تو ناگواری ظاہر کرتے، بمبئی میں مکان لیتے تو خاص طور پر اس کا لحاظ رکھتے کہ ٹریم کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز وہاں تک نہ پہنچے، بدن پر مکھی بیٹھ جاتی تو سخت ناگواری محسوس کرتے، فرماتے تھے کہ بمبئی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں مکھیاں نہیں ہوتیں، شور و غل

سخت ناپسند تھا، ہجوم و کشمکش سے سخت گھبراتے تھے، اور سکنڈ کلاس میں صرف اسی لئے سفر کرتے تھے اور اسی لئے دوستوں کے مکانوں کے بجائے ہوٹلوں میں ٹھہرتے تھے، ورنہ ان باتوں سے ان کو جاہ و اعزاز مقصود نہ تھا، اسی ذکاوت حس نے ان کو کسی قدر عجلت پسند بھی بنا دیا تھا، کسی کام کا خیال آتا تو اس کے کرنے میں نہایت عجلت سے کام لیتے، ہم لوگوں کو کسی بات کا حکم دیتے تو چاہتے کہ یہ کام فوراً ہو جائے، اگر ذرا دیر ہو جاتی تو سخت برہم ہوتے، اکثر ایسا ہوتا کہ وہ یاد فرماتے تو ہم سوچ کر سہم جاتے کہ کوئی کام ایسا تو نہیں کہ انھوں نے کرنے کو کہا اور ہم نے اب تک نہیں کیا اور وہ اسی کی باز پرس کے لئے یاد فرما رہے ہوں،

جب بیگم صاحبہ بھاولپور نے ندوہ کی عمارت کے لئے پچاس ہزار روپیے عنایت فرمائے تو ایک رات مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ندوہ کا بورڈنگ بھی تمام تر مستورات کے چندہ سے تیار ہو، یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ اضطراب سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگے، بالآخر ضبط نہ ہو سکا اور دو بجے شب کو شمع جلائی، اور مستورات کے نام ایک اپیل لکھی، جس کو صبح کے وقت چھپنے کے لئے بھیجا، ایک بار اعظم گڈہ میں برسات کا زمانہ تھا، اور نیشنل اسکول کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی، ایک رات کو شدت سے پانی برسنے لگا، اور مولانا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ پانی برس رہا ہے، عمارت کی دیواریں گر رہی ہوں گی، اس تخیل سے اس قدر پریشان ہوئے کہ لحاف پھاڑ کر روئی نکالی اور کان میں ڈالی، تاکہ پانی کی آواز سننے میں نہ آئے اور پریشانی دور ہو،

مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے اُن کی ذکاوت حس کے مظاہر کو ان کی وفات کے مضمون میں نہایت استقصار کے ساتھ جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:- "احساس بہت شدید تھا

اس نے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۸ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بچھو نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا، اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھ کو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ حساس شاعری کا لوازمہ تھا۔

عصبیت دینی مولانا کے مزاج میں سخت عصبیت پائی جاتی تھی، اور اس کا اثر مختلف حیثیات سے نمایاں ہوتا تھا، ابتدا میں وہ ایک متعصب حنفی تھے، اور حنفیوں کی تائید اور غیر مقلدین کی تردید میں رسالے لکھتے تھے، اور اُن سے مناظرے کرتے تھے، مولانا کے گاؤں کے متصل ایک موضع کا نام جیراجپور ہے، یہاں مولوی سلامت اللہ صاحب ایک غیر مقلد عالم تھے، اُن کا اور مولانا کا حریفانہ مقابلہ رہتا تھا،

عام قومی حیثیت سے وہ عربوں اور ترکوں کے سخت حامی تھے، عربوں کے اس لئے کہ وہ اسلام کے منبع و ماویٰ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہیں، اور قرآن اُن کی زبان میں ہے، اور ترکوں کے اس لئے کہ اُن کے زمانہ میں مسلمانوں کی عزت اور اسلام کی سلطنت اُن ہی کے دم قدم سے قائم تھی، قسطنطنیہ کے سفر میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، مسٹر آرنلڈ مولانا کے ساتھ تھے، اور مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے، جہاز پر اسپین کا ایک عیسائی بھی ساتھ تھا، جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے نہایت جلتا تھا، اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت برے لہجہ میں ادا کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ یہ اونٹوں کی زبان ہے، مولانا سفرنامہ میں اس واقعہ کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں، "اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا، لیکن جو قوم ایک مدت تک ذلت کے ساتھ

عربوں کی زبردست ہجو کی تھی، عرب اور عربی زبان کے ساتھ اس کا یہ سلوک بیجا نہ تھا۔

اسی سفر میں مولانا کی رگِ حمیت پر ایک اور نشتر لگا، جب جہاز عدن میں پہنچا تو سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار ہو کر جہاز کے قریب آئے، اور بہت سی مبتذل حرکتیں کرنا شروع کیں، ناچے، گائے، بغلیں بجائیں، اور ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ لوگ دونی چونی، پیسے جو کچھ انعام میں دینا چاہتے تھے اس کو سمندر میں پھینک دیتے تھے، اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے تھے، اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے، اور مسٹر آرنلڈ کو بھی اس میں مزا آتا تھا، لیکن مولانا کی حالت کچھ اور تھی، چونکہ غلطی سے اُن کا خیال تھا کہ یہ عرب کے بچے ہیں، اس لئے یہ طبعی بات تھی، کہ وہ ان کو عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے، لیکن وہ انعام لینے کے لئے ایسی مبتذل حرکتیں کرتے تھے کہ یہ مولانا کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا تھا، اُن کو غیرت ہوئی کہ عرب کی اب یہ حالت ہو گئی، کہ غیروں کے سامنے اُن کو اس قسم کے حرکات سے مطلق شرم نہیں آتی، اس لئے ان کا دل بے اختیار بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور بے اختیار زبان سے نکلا "قم یا عمر"! مسٹر آرنلڈ پاس تھے، ان کو مولانا کی تغیرِ حالت کا خیال ہوا، مولانا نے اپنے دل کی کیفیت اور اس کا سبب بیان کیا، تو انھوں نے ایک بار آنکھ اٹھا کر مولانا کی طرف دیکھا، اور چپ ہو رہے، لیکن بعد کو جب معلوم ہوا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے، تو مولانا کو کسی قدر تسکین ہوئی، اسی غصہ و رنج کا نتیجہ تھا کہ قصیدۂ سفریہ میں مولانا کے قلم سے اس قوم کی ہجو میں یہ اشعار نکلے :-

قرومٌ شہر کہ خود را بہ سمالی نامند | حیوان اند نہ بل از حیواں ہم بدتر

خوار و بدبخت و سیہ کار و سیہ چہرہ و زشت — سفلہ و ممتحن و کج روش و بدگوہر

خویشتن را بہ عرب بستہ و ما شاکہ عرب — ایں چنیں خوار و زبوں شاں نہ پسندد داوَر

چوں زبان عرب تازی بود و هم چو عرب — نام شان بستہ بود با لقب جد و پدر

عامیاں در غلط افتند و گماں باز برند — کہ مگر در نسب و نسل زسعد اند و مضر

تخم و هم ریشۂ ایں نخل زخاک عجمی است — کہ دریں جائے بیار آمد و افشاند ثمر"

جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ تمدن اسلامی" کی تردید جن اسباب کی بنا پر کی اُن میں ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس نے عرب کی تحقیر کی تھی، ان کی طرف بہت سے معائب منسوب کئے تھے چنانچہ الانتقاد میں مؤلف سے جو معذرت کی ہے، اس کی تمہید ان الفاظ میں شروع کی ہے:۔

" اے فاضل مؤلف! میں آپکے احسان کا انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ آپنے اس کتاب میں میرا نام شاندار طریقہ سے لیا ہے، مجھ کو مستند قرار دیا ہے، میرے اقوال سے استشہاد کیا ہے، اور مجھ کو مشاہیر علمائے ہند میں شمار کیا ہے، لیکن با ایں ہمہ کیا میں یہ پسند کر سکتا ہوں کہ آپ میری تعریف اور بزرگوں کی ہجو کریں، اُن کو اپنے تیروسناں کا آماجگاہ بنائیں، ان کی طرف ہر قسم کے عیوب و شنائع منسوب کریں، یہاں تک کہ ان کے اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں، اور ان کے پرنچے اُڑا دیں؟"

اسی عصبیت کی بنا پر ترکوں کے تمام معاملات سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے، جب ترکی پر کسی یورپین سلطنت کی طرف سے حملہ ہوتا تھا تو ہر ممکن طریقہ سے ترکوں کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ان کی کامیابی سے خوش اور ناکامیابی سے رنجیدہ ہوتے تھے، ترکوں اور روسیوں میں جو جنگ ہوئی تھی اس میں مولانا نے ترکوں کی امداد و اعانت کے لئے ایک انجمن قائم کی

خود اس کے سکریٹری بنے، اور اپنے ضلع سے تین ہزار کی رقم چندہ کر کے بھیجی، جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا، تو ندوہ میں مولانا نے ایک پُرجوش تقریر کی، تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اُن پر رقت طاری ہو گئی، اور مجلس گرفتہ ہو گئے، چندہ ہوا تو خود سو روپیہ کی رقم دی،

سلطان المعظم کو نہایت وقعت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، قسطنطنیہ میں عید کے دن سلطان کا جو جلوس دیکھا اس سے سخت متأثر ہوئے، اسی تأثر و انفعال کی حالت میں مثنوی صبح امید لکھی ہے، جس میں سلطان المعظم کا نام نہایت عقیدتمندانہ طریقہ سے لیا ہے، اور طرح طرح سے ان کے وجود کو اپنے قومی و اسلامی جذبات کی تسکین کا سرمایہ بنانا چاہا ہے،

ترکوں کے اخلاق اور حسن معاشرت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ سفرنامہ میں ترکوں کے اخلاق و طرزِ معاشرت کے عنوان سے ایک عنوان قائم کیا ہے، اور اس میں اُن کے تمام اخلاقی محاسن گنائے ہیں، سفرنامہ کا اختتام بھی ترکوں ہی کی مدح سرائی پر کیا ہے،

عربوں اور ترکوں کے علاوہ تمام سلاطین اسلام کے سخت حامی تھے، حضرت عمر فاروقؓ سے لے کر اورنگزیب، جہانگیر اور عالمگیر پر جو الزامات لگائے جاتے تھے شدت کے ساتھ اُن کی تردید کرتے تھے، جہانگیر کو تمام دنیا صرف ایک عیش پسند بادشاہ خیال کرتی تھی، لیکن مولانا نے اس پر الندوہ میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس قسم کے مذہبی، سیاسی، اور علمی واقعات اس کثرت سے جمع کئے ہیں جن سے اس خیال کی بہت کچھ تردید ہو جاتی ہے، عالمگیر پر تعصب و تنگدلی کا جو الزام قائم کیا جاتا تھا، ایک سلسلہ مضمون میں اس کی تردید نہایت پُرزور طریقہ سے کی ہے، ۔۔۔

اُن کی یہ عصبیت اُن کے اس خیال کا نتیجہ تھی کہ یہ بادشاہ بہرحال مسلمانوں کے نمائندے اور

اسلام کے فرمانروا تھے، مخالفین اُن کی برائیاں اس لئے دکھاتے تھے کہ اس سے اسلام اور مسلمان بدنام ہوتے، مولانا کو یہ بدنامی کسی حال میں گوارا نہ تھی،

پابندیِ اوقات وہ اپنے معمولات اور فرائض کے سخت پابند تھے، فرماتے تھے کہ جب میں علیگڈہ میں تھا تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب کالج کی گھنٹی ہوتی تھی تو ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لئے میں اس تیزی سے دوڑتا تھا کہ پاؤں میں درد ہوجاتا تھا، علی گڈہ سے علحدہ ہوکر اگرچہ انھوں نے تمام عمر آزادانہ بسر کی لیکن اس حالت میں بھی جو معمول تھا، اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا تھا، عموماً صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے، اور دن نکلنے تک تمام ضروریات سے فارغ ہوکر تصنیف وتالیف کے لئے بیٹھ جاتے تھے، اور آٹھ بجے تک اس سے بھی فارغ ہوجاتے تھے، اس کے بعد اخبار بینی، کتب بینی، اور دوسرے متفرق کام کرتے تھے، خطوط کا جواب روزانہ دیتے تھے، قاضی تلمذ حسین صاحب جو ایک زمانہ میں مولانا کے سخت مخالف ہوگئے تھے، فرماتے تھے کہ تمام عیوب کے ساتھ مولانا شبلی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خط کا جواب ٹھیک وقت پر دیتے ہیں؛ وہ خطوں کا جواب اس پابندی سے دیتے تھے، کہ ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتے تھے، ہم لوگ ڈاک آنے جانے کے دن گن کر جواب کی اُمید باندھتے تھے، اور ٹھیک وقت پر جواب آجاتا تھا،

الندوہ کی اشاعت میں اکثر دیر ہوجایا کرتی تھی، اس سے سخت پریشان ہوتے تھے اور اس کے لئے صاحب مطبع اور مضمون نگاروں پر سخت پابندیاں عائد کرتے تھے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا تھا، تو فرماتے تھے کہ اب تو یورپ میں رہنے کو جی چاہتا ہے، جہاں کام ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے،

اعزہ واقارب سے محبت

مولانا اگرچہ بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتے تھے، تاہم اعزہ واقارب سے نہایت محبت رکھتے تھے، والدہ کے انتقال کو اگرچہ ایک مدت ہو چکی تھی، لیکن مولانا کے دل میں آج تک اُن کی محبت کی یاد تازہ تھی، فرماتے تھے کہ جب کبھی والدہ یاد آجاتی ہیں تو تڑپ تڑپ جاتا ہوں۔

مولانا کے والد نے مولانا کی والدہ کی زندگی ہی میں ایک دوسری شادی کر لی تھی، اور مولانا کو اس سے اس قدر اختلاف تھا کہ جب تک مولانا کے والد زندہ رہے، انھوں نے اس مکان میں قدم تک نہیں رکھا جس میں یہ دوسری بی بی رہتی تھیں، لیکن والد کے مرنے کے ساتھ ہی محبت اور انسانیت کے اقتضاء سے مولانا نے خود اسی مکان میں قیام کیا، اور باوجودیکہ سوتیلے دوسرے بھائی وکیل تھے، اور مولانا سے زیادہ آمدنی رکھتے تھے، لیکن مولانا نے خود اپنے وظیفہ سے جب تک رہا ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر کر دی، اور اس کو برابر دیتے رہے، چنانچہ اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپے ہیں، چھاؤنی، مالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا، اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہو سکتی ہے۔" (اسحٰق - ۱۹)

بھائیوں سے اس قدر الفت رکھتے تھے کہ مہدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں کسی سے بات چیت تک نہیں کی، فرماتے تھے کہ "والد مرحوم آتے تھے اور لوگوں سے ہنستے بولتے تھے، تو مجھے تعجب ہوتا تھا" ایک بار مولوی عبدالسلام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے اُن کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا تو بولے کہ ہوش کب بجا تھے،

مہدی مرحوم کی بیوہ سے اگرچہ مولانا بذاتِ خود ناراض رہتے تھے، لیکن اپنے وظیفہ میں

ان کو بھی شریک کر لیا تھا، اور ایک ماہوار رقم اُن کو ہمیشہ دیا کرتے تھے،

اخیر میں مولوی اسحاق صاحب کی موت نے تو اُن کی زندگی کا خاتمہ ہی کر دیا، مولانا پر اس حادثہ کا جو اثر ہوا اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اس زمانہ میں لکھے ہیں، ان کے انتقال کے بعد جتنے دنوں زندہ رہے، اُن ہی کے ماتم میں رہے، اور آخر کار اسی غم میں جان دی،

پہلے محل سے اولاد نرینہ میں صرف ایک حامد صاحب ہیں، وہ ایک دفعہ والد سے ناراض ہو کر کہیں چلے گئے تھے، تو اس قدر بدحواس ہوئے کہ کئی دن تک کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، وہ ایک دفعہ اعظم گڈہ میں طاعون میں مبتلا ہوئے، مولانا لکھنؤ میں تھے، خبر ملی تو فوراً لکھنؤ سے اعظم گڈہ روانہ ہو گئے، اور اُن کی تیمارداری کی،

مولانا کی دوسری شادی سے جو لڑکا پیدا ہوا، اس سے بھی وہ بڑی محبت رکھتے تھے، اُن کی محبوب ترین چیز صرف کتاب تھی، لیکن صرف یہی لڑکا تھا جو اس معاملہ میں کتاب کی قائم مقامی کر سکتا تھا، چنانچہ حیدرآباد سے ایک خط میں لکھتے ہیں :- "اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں" (مہدی - ۱۳)

افسوس ہے کہ اس لڑکے نے وطن میں انتقال کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے، یہ افسوسناک خبر پہنچی تو ان پر بدحواسی کا عالم طاری ہو گیا، فرماتے تھے کہ تین دن تک پڑا پڑا ہائے !! کر کے رویا کرتا تھا،

لڑکیوں سے نہایت محبت رکھتے تھے، چھوٹی لڑکی فاطمہ بیمار ہوئی، اور بیماری نے طول

کھینچ، تو لکھنؤ بلا کر نہایت اہتمام کے ساتھ علاج کیا، لیکن افاقہ نہ ہوا، اور وطن میں جا کر اُس نے انتقال کیا، مولانا کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو ہٹا دیا اور کمرے میں جا کر خوب روئے اوس کی علالت کی حالت میں اس کے نام جو خطوط لکھے ہیں، اُن سے محبت کا اظہار ہوتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں :۔ "قرۃ العین میں، سخت افسوس ہے سن کر تم کو ابھی تک افاقہ نہیں ہوا، عزیزی! میری اولاد میں جن کو مجھ سے پدری محبت ہے، صرف تمھیں ہو اس لئے تم سمجھتی ہو کہ مجھ کو کس قدر تمھاری بیماری کا رنج ہے، میں اس وقت لکھنؤ سے بہت دور ہوں، ورنہ فوراً پہنچتا، خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچکر سب سے پہلے بندوبست دوں گا" (فاطمہ خانم ۔۔)

نواسوں سے بھی محبت رکھتے تھے، ایک بار بڑی لڑکی کے لڑکے کو اپنے ساتھ لکھنؤ لائے اور اس کو چند دنوں ساتھ رکھا،

پوتے سے نہایت الفت تھی، ایک مرتبہ غازی پور میں حامد صاحب کا بچہ بیمار ہوا تو مولانا بنارس میں تھے، خبر ہوئی تو سخت پریشانی کی حالت میں غازی پور گئے، اور کئی دن مقیم رہ کر اس کا علاج کیا، چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں :۔ "میاں حامد کا بچہ سخت علیل ہو گیا، اس میں نہایت پریشانی میں غازی پور گیا، اور آج آکر پھر واپس جاتا ہوں" (مہدی ۔۔)

بدقسمتی سے اسی علالت میں اس بچے نے انتقال کیا، اس کے بعد تا مرگ دوسرے پوتے کے پیدا ہونے کی حسرت دل میں رہی،

دوسری بی بی سے بھی بہت محبت رکھتے تھے، چنانچہ اُن کا انتقال ہوا تو فرماتے تھے کہ میں اس زور سے چیخ کر رویا، کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہو گیا"

اپنے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولوی حمید الدین صاحب مرحوم سے نہایت خلوص تھا اور ان کو ہر بات میں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، کابل سے ترجمۂ ابن خلدون کی تحریک ہوئی تو انہی کا نام پیش کیا، علی گڈہ کی عربی پروفیسری کے لئے نواب محسن الملک نے لکھا تو انہی کے لئے کوشش کی، اور وہ اسی کوشش سے وہاں کے پروفیسر مقرر ہوئے، دار العلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کے لئے بھی مولانا کا انتخاب ہوا تو انھوں نے یہ جگہ بھی مولوی حمید الدین صاحب کو دلائی، اُن کی فارسی سخن نکتہ آفرینی، اور آخر میں اُن کی قرآن فہمی کے بیحد معترف تھے، مسائل کی تحقیق میں اُن سے مشورے کرتے تھے، اُن کے فارسی کلام کی نسبت کہتے تھے کہ یہ زبان ہے، اُن کی مذہبی علمی وعملی شیفتگی اور پابندی کی بنا پر ان کو درویش کہتے تھے، اور تھے بھی وہ ایسے ہی عقیدۃً اور عملاً نمونۂ سلف، رحمۃ اللہ تعالیٰ، دیندار، عبادت گذار، تہجد گذار، متقی، متوکل، صابر وقانع، متواضع وخاکسار، غرض مجموعۂ اوصاف

اعزہ میں مولوی محمد سمیع صاحب سے بھی بہت اُنس تھا، چنانچہ سفر قسطنطنیہ میں ان کو ساتھ لینا چاہا تھا، اسی تعلق کی بنا پر ان کے بھائی علی حسن کا بہت خیال رکھتے تھے، اور تعلیمی معاملات میں اُن کو مالی اعانت دیتے تھے،

وہ اپنے تلامذہ سے بھی مثل عزیزوں ہی کے محبت رکھتے تھے، راقم الحروف فراغت کے بعد ۱۹۰۷ء میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ایک ملازمت کے خیال سے لکھنؤ سے چلنے لگا تو مولانا سے رخصت ہونے گیا، انھوں نے پہلے آنریبل مولوی شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دیا، کہ وہ سر ڈینی سن راس[1] صاحب سے جو ان دنوں مدرسۂ عالیہ کے

[1] سر ڈینی سن راس صاحب نے ان دنوں ستمبر ۱۹۴۰ء میں قسطنطنیہ میں وفات پائی، جہاں وہ انگریزی وزیر کی سفارت کے باب عظیم تھے،

صدرتے مجھے ملا دیں، خط لکھ کر میرے ہاتھوں میں دیا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اور پھر فرمایا۔ سلیمان اگر ندوہ میں گنجائش ہوتی تو میں تم کو کہیں جانے نہ دیتا"

دوسرے تلامذہ سے بھی اُن کا برتاؤ یہی تھا، اور ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھی سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، حالانکہ مولانا کا مزاج بہت جھلا تھا یعنی اُن کو غصہ جلد آتا تھا، پھر بھی ہر شاگرد اُن پر سے نچھاور ہونے کو تیار رہتا تھا، اور اس غصہ کو بھی ان کی محبت ہی کا مظہر سمجھتا تھا،

کتب بینی مولانا کو بچپن ہی سے کتب بینی کا نہایت شوق تھا جب اعظم گڈہ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، تو روزانہ ایک کتب فروش کی دوکان پر جاکر اسی کی کتابیں دیکھا کرتے تھے، ایک روز مولانا کے والد نے ان کو کتب فروش کی دوکان پر دیکھا تو منع فرمایا، اب مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی دوکان سے کتابیں لے آتے تھے اور مکان پر دیکھتے تھے، بڑے مزے کی بات تو یہ تھی کہ باوجود اس شوق کے کتاب کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جاتا تھا لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی، اور اسی کو غنیمت سمجھتا تھا،

تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر کسبِ معاش کے کاموں میں مصروف ہوئے، تب بھی یہ شوق قائم رہا، امانت کا کام کرتے تھے اور ادھر اُدھر گھوڑے پر سوار ہو کر دورہ کرتے پھرتے تھے لیکن اس حالت میں بھی دیوان حماسہ ساتھ رہتا تھا جہاں ذرا سا آرام لینے کا موقع ملا اس کا مطالعہ شروع کر دیا،

حج و زیارت کے سلسلہ میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو وہاں کے کتب خانوں کی بھی سیر کی، فرماتے تھے کہ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کتبخانوں میں نظر آیا، تمہید ابن عبدالبر

نہیں دیکھی تھی،

علی گڈہ تشریف لے گئے تو اس شوق کے پورا کرنے کا کافی سامان ہاتھ آیا، سید صاحب کا کتب خانہ بہترین کتابوں کا مجموعہ تھا، اور انھوں نے مولانا کے ذوقِ علم کو دیکھ کر مطالعہ کی عام اجازت دیدی، اور مولانا نے دل کھول کے اس گنجینۂ علم سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ ایک خط میں نہایت مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں:۔ "سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے، اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عرب کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے، گو یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں، گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے" (مکاتیب ۔ ۳)

علی گڈہ میں مولانا کے ایک اور دوست تھے، جن کو کتابوں کا بڑا شوق تھا، وہ مولانا کے پاس نادر کتابیں بھیجتے تھے، اور مولانا نہایت شوق سے اُن کا مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ ایک عزیز کو نہایت مسرت کے ساتھ اس کی اطلاع دیتے ہیں:۔ "یہاں ایک شخص عبدالمجید نامی اہلمد کلکٹری ہیں، یہ صاحب دیوان ہیں، اور کتابوں کے بڑے شائق، بہت سا حصہ ان کی تنخواہ کا کتابوں میں صرف ہوتا ہے، ان کو دعویٰ تھا کہ کوئی دیوان وغیرہ فارسی کا ایسا نہیں جو چھپا ہو اور میرے پاس نہ ہو، میں نے ان کو بہت سی کتابیں لکھوا دی ہیں، اور وہ بہت جلد ان کو منگوانا چاہتے ہیں، یہ خوب آدمی ہیں، ان کے ذریعہ سے کتابیں دیکھنے کو خوب ملتی ہیں، یہ بیچارے نادر کتابیں بھیج دیا کرتے ہیں، ...... ممکن ہے سامان سامرہ و مطالب دیکھنے کو مل جائے" (مکاتیب ۔ ۲)

اور کم از کم یہ خیال تو ہر شخص کے دل میں گذرتا ہوتا ہوگا، کہ اُن کے مطالعہ میں تاریخ و سیر کے سوا اور کسی فن کی کتابیں نہیں رہتی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے فلسفہ، منطق، فقہ، تفسیر، حدیث غرض تمام علوم کو بالاستیعاب پڑھا تھا، اور ہمیشہ ان علوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے تاریخ و ادب کی نسبت جس کو اُن کی تمام تر کائنات سمجھا جاتا ہے مولانا خود فرماتے تھے کہ یہ تو ہمارے دستر خوان کی چٹنی ہے۔

صحت و علالت، سفر و حضر، جلوت و خلوت، غرض ہر حالت میں کتابیں اُن کی رفیق رہتیں، سفر کشمیر سے واپس آکر جب سخت بیمار پڑے تو اس حالت میں بھی مطالعہ برابر جاری تھا، فرماتے تھے کہ میں اس زمانہ میں اکثر صدرا دیکھا کرتا تھا۔

ایک بار جب اعظم گڈھ میں سخت طاعون آیا، اور خود مولانا کے فرزند محمد حامد صاحب مبتلائے طاعون ہوئے، تو لوگ شہر سے باہر جھونپڑوں میں نکل گئے، مولانا بھی مع حامد کے چھپر میں مقیم تھے، اور شبلی منزل کو چھوڑ دیا تھا، ایک روز اسی حالت میں محقق طوسی کی شرح اشارات دیکھ رہے تھے، محقق طوسی نے امام رازی پر ایک اعتراض کیا تھا، جو مولانا کو غلط معلوم ہوا، باوجودیکہ شہر میں طاعون تھا، اور بنگلہ بند تھا، لیکن فوراً اُٹھے اور بنگلہ کھول کر کتاب نکالی، اور اس میں دیکھا، تو واقعی محقق طوسی کا اعتراض غلط تھا،

وہ بذاتِ خود اگرچہ ہر چیز میں ترتیب و نظام چاہتے تھے لیکن مطالعہ کے معاملے میں اُن کو مجبوراً یہ اصول توڑ دینا پڑتا تھا، کمرے میں کتابیں ادھر اُدھر پڑی رہتی تھیں، مولانا کو اگرچہ یہ بے ترتیبی ناگوار تھی لیکن فرماتے تھے کہ کیا کیا جائے؟ اگر کتابوں کو مرتب رکھوں، تو مطا

میں خلل واقع ہو،

مولانا کی کثرتِ تصنیفات کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہوں گے کہ اُن کے اوقات کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ صبح کو صرف ایک دو گھنٹے تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے، اور صرف مخصوص وقت مخصوص تھے بقیہ اوقات کتب بینی کے نذر ہوتے تھے، فرماتے تھے کہ میں تنہائی میں کبھی بغیر کتابوں کے نہیں بیٹھ سکتا، مولوی وحید الدین سلیم جب لکھنؤ میں علم گزٹ کے اڈیٹر تھے، اور امین آباد پارک میں مولانا کے پہلو میں رہتے تھے وہ کہتے تھے کہ مولانا شبلی کیوں واقف ہوگئے ہیں؟ میں جب جاتا ہوں کبھی ان کو بیکار نہیں پاتا، ہر وقت کتابیں اُٹھا پٹا کرتے ہیں، یہ صحت کے لئے سخت مضر ہے، مولانا عبدالحی مرحوم فرنگی محلی کو اسی کی بدولت صرع کا عارضہ ہوا، اور وہی اُن کی موت کا سبب ہوگیا۔"

اس طرح مولانا کی نظر سے تمام موجودہ کتابیں گذر چکی تھیں، فرماتے تھے کہ اب تو کتابیں دیکھنے کو نہیں ملتیں جب کسی نئی اور نادر کتاب کا پتہ چلتا تو اس کے دیکھنے کے شوق میں بیتاب ہوجاتے، بمبئی کی جامع مسجد میں ایک مختصر سا کتب خانہ ہے، مولوی عبدالسلام صاحب جب بمبئی میں اُن کے ساتھ تھے تو ان سے فرمایا کہ جاکر اس کتب خانہ کو دیکھ آؤ، اور اگر کوئی نادر و قلمی کتاب ہو تو اس کا نام لکھ لاؤ، وہ چند کتابوں کے نام لکھ لائے، ان ہی کتابوں میں قفال کی محاسن الشریعہ کا نام بھی تھا، قفال بہت بڑے متکلم ہیں، اور عقلی طرز پر قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، تفسیر کبیر میں جابجا اُن کے اقوال مذکور ہیں، اور مولانا نے اُن کو علم کلام کے بانیوں میں قرار دیا ہے، اور علم کلام اور الکلام میں ان کے جستہ جستہ اقوال سے جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں فائدہ اٹھایا ہے، مولانا

نے ان کی کتاب کا نام پڑھا تو شوق کے لہجہ میں فرمایا کہ یہی ایک کتاب دیکھنے کے قابل ہے، اور دوسرے روز خود گئے اور اس کو دیکھا۔

مولانا کتب بینی کے لئے نہایت نادر اور بلند کتابیں انتخاب کرتے تھے، اور جو لوگ معمولی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اُن کی حالت پر سخت افسوس کرتے تھے، اور اس کو نظام تعلیم کی ابتری کا نتیجہ بتاتے تھے۔ قسطنطنیہ میں جو مسلمانوں کے تمام قدیم علمی جواہرات کی کان ہے جب اُن کو نظر آیا کہ یہاں لوگ معمولی درجہ کی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں تو سخت متاسفانہ انداز میں یہ ریمارک کیا: "کتب خانوں میں جب لوگوں کو کتابوں کے مطالعہ میں مشغول دیکھتا تھا، تو ہمیشہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کس قسم کی کتابیں اُن کے پیش نظر ہیں لیکن میں نے کسی کے سامنے مختصر معانی، ایساغوجی، شرح وقایہ، جلالین وغیرہ کے سوا کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے، اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے آیندہ اس کی بھی امید نہیں۔" (سفرنامہ ص ۹۷ و ۹۸)

کتابوں کا نہایت شوق تھا مصر، بیروت، شام اور یورپ میں جو بہترین کتابیں شائع ہوتیں اُن کو بہت شوق سے منگواتے، اور عمدہ جلد بندھوا کر ان کو میز یا الماری میں رکھتے، قدیم قلمی کتابوں کی جستجو میں ہمیشہ مصروف رہتے، اور جب کوئی عمدہ کتاب مل جاتی تو نہایت فیاضی کے ساتھ خریدتے، موفق الدولہ کا ایک معطلہ مذہب نسخہ ہاتھ آیا، تو اس کو سو روپیہ پر خرید

ایک قرآن دو سو روپیہ پر ہدیہ لیا، بہت سی قلمی کتابیں نقل کرواتے تھے اور ان پر بیدریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ خصائص ابن جنی، اخبار الحکما، شہرزوری، کشف الاولہ، رباعیات سحابی، ردّ المنطق لابن تیمیہ کے نسخے ان کے کتب خانے میں اسی طرح دور دور سے نقل ہو کر آئے تھے لیکن اس شوق کے پورا کرنے کے لئے اُن کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، اس لئے اگر کہیں بہترین کتابیں اُن کی نظر سے گذر جاتی تھیں، تو ان کو اپنی مفلسی پر سخت افسوس ہوتا تھا، ایک بار مولوی سید علی بلگرامی کے کتب خانہ میں مطبوعات یورپ نظر سے گذریں، تو مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھا،" مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوگیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں کیا کہوں اپنے علما کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے۔" (شروانی-۳۲)

جن نادر چیزوں کو خود نہ خرید سکتے، اپنے علم دوست دولتمند دوستوں کو ان کے خریدنے کی ترغیب دیتے، چنانچہ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام اس قسم کے متعدد خطوط ہیں، ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-" اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کی علمی نفاست پسندیوں کے وہ نمونے آج کل یہاں آگئے ہیں کہ عقل کی وسعت اس کے اندازہ سے کمی کرتی ہے، ہیئت کے نوادر، اس میں کتاب الالات کا بھی ایک عمدہ نسخہ ہے۔"

لیکن میں جس چیز کی ترغیب دیتا ہوں، وہ خوشنویسوں کے قطعے اور تصاویر ہیں۔ خدابخش خاں وغیرہ کے خزانے بھی ان جواہرات سے خالی ہیں، ابھی قیمتیں متعین نہیں ہوئیں، ایک آدھ پر میں بھی حوصلہ آزمائی کروں گا۔" (شیروانی-۱۰)

مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ "میں نے وہ مرقع مولانا کی تحریر پر خرید کر کتاب خانے میں رکھا، منصور کے بنے ہوئے ترکہ سرخ سوسن کا پھول اس میں ہے۔ امریکہ کے ایک مؤلف نے اس میں لکھا ہے کہ ساری دنیا میں عجیب ہے منصور کے ہاتھ کی گل کاری (FLORAL WORK) تصویر ہے۔"

درس و تدریس علماء کے فرائض و اعمال میں تصنیف و تالیف، وعظ و پند اور ہدایت و ارشاد کے علاوہ درس و تدریس بھی ہے۔ مولانا نے اگرچہ اور مشاہیر علماء کی طرح اپنا کوئی مستقل حلقۂ درس قائم نہیں کیا، تاہم بہت سے خوش قسمت لوگوں کو ان کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوا، تحصیل علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اعظم گڈھ میں خود بھی ادب کی تکمیل کرتے تھے، اور ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "دریں فرصت با دب کار دارم خود چیزے از ادب می خوانم و دیوان حماسہ بدیگرے می آموزم۔" (مکاتیب ج ۲)

وکالت کی غرض سے بستی میں چند روز کے لئے طرح اقامت ڈالی، تو وہاں بھی یہ شغلہ جاری تھا، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں: "دریں روزہا درس کافی کتب دوام دارم و دریں باموختن کتب ادب درواں"

مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اسی زمانہ کے تربیت یافتہ ہیں۔

وکالت چھوڑ کر علی گڈھ میں آئے، تو اگرچہ کالج کے تعلق سے یہ مستقل مشغلہ ہوگیا، لیکن ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کے سر میں صدرا، شمس بازغہ، و حمداللہ کی وقعت از قبیل کا نشہ ہو، جس کی زبان پر عرب جاہلیت کے اشعار چڑھے ہوئے ہوں، جو حدیث و فقہ کے بہترین علماء سے درس حاصل کر چکا ہو، فارسی کے چند انتخابات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، اس لئے یہاں بھی خارجی طور سے بعض لوگ مولانا سے ادب کا درس حاصل کرتے رہے،

ندوۃ العلماء میں تشریف لاتے تو بکثرت طلبہ کو مولانا سے مستفید ہونے کا موقع ملتا، لیکن ندوہ میں انھوں نے باضابطہ طور پر کبھی درس نہیں دیا، بلکہ اس کی صورت یہ تھی کہ کبھی قرآن مجید کے حقائق و معارف پر درس دیتے، کبھی حمد اللہ شروع ہوتی، اور اوپر کے درجہ کے طلبہ شریک ہوتے، مولانا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے اور مولانا اس پر نکتہ چینی کرتے، یا خود کسی مسئلہ پر تقریر کرتے، کبھی ادب کی کوئی کتاب شروع کراتے کبھی صحیح بخاری پڑھاتے، بعض اوقات قدیم طریقہ کے موافق کسی علمی مسئلہ پر خطبہ دیتے، اور اس میں تمام طلبہ شریک ہوتے، اسی طرح ہمیشہ طلبہ کو مولانا سے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کا موقع ملتا، با تصنیف و تالیف اور تحریر و تقریر کی تعلیم اس سے الگ تھی، اور ندوہ کے طلبہ میں مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا جو مذاق پیدا ہوگیا ہے، وہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے،

علی گڈھ کالج کے زمانہ میں مولانا فارسی، عربی اور قرآن مجید کا درس کالج کے طلبہ کو دیتے تھے، یہ طلبہ ان علوم کے علاوہ ادب و شاعری کا ذوق بھی مولانا سے حاصل کرتے تھے، چنانچہ چودھری خوشی محمد ناظر، سید سجاد حیدر یلدرم، مولوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی وغیرہ ان کے اسی فیض صحبت سے مستفید تھے۔

لطف صحبت مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اپنے مضمون مندرجہ انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڈھ، (مورخہ ۸ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء) میں تحریر فرماتے ہیں: "صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، ان کے کمال کی خوبیاں متفرق ہیں، علمی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی، ان کے بیان کے رنگین و

ہدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتیں اُن کی زبان سے میں نے کبھی نہیں سُنیں۔"

عام طور پر مولانا کی صحبت سے مستفید ہونے کا وقت ۴ بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور آٹھ بجے شب تک ختم ہو جاتا تھا۔ چار بجے شام کے بعد اُن سے ملنے کی عام اجازت تھی، اور ہر کہ و مہ بلا تکلف اُن سے مل سکتا تھا، مولانا اس مخصوص وقت کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے، نہ اُن کے یہاں ترتیب سے کرسیاں بچھائی جاتی تھیں، نہ لوگوں کی خدمت میں پان اور سگرٹ پیش کیا جاتا تھا، اور نہ چائے وحقہ کا دور چلتا تھا، چند کرسیاں اور چند مونڈھے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے، اور مولانا کبھی آرام کرسی پر اور کبھی کھرے پلنگ پر بیٹھے ہوتے تھے، جو آتا کرسی یا مونڈھا گھسیٹ لیتا، اور بیٹھ جاتا، ظاہر داری اور تصنع سے کسی کی تعظیم و تکریم بالکل نہیں کرتے تھے، اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو پلنگ سے اُٹھ بیٹھے یا کرسی پر ذرا سنبھل کے بیٹھ جاتے، عموماً طور پر صرف یہ پوچھ لیتے "کہاں سے آنا ہوا؟" "کیا مقصد ہے؟"

محاضرات کی کتابوں میں بعض کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جن کو کشکول کہتے ہیں، ان کتابوں کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا، بلکہ ان میں تمام علوم و فنون کے متعلق نادر اور لطیف نکتے جمع کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے انسان اُن سے دل بھی بہلا سکتا ہے، اور علمی فوائد بھی حاصل کر سکتا ہے، بعینہ یہی حال مولانا کی صحبت کا بھی تھا، وہ ایک مختلف الحیثیات صاحب کمال تھے، یعنی بہت بڑے شاعر تھے، بہت بڑے فلاسفر تھے، بہت بڑے مورخ تھے، بہت بڑے انشا پرداز تھے، بہت

بڑے سیاح تھے، بہت بڑے وسیع المعلومات تھے، بہت بڑے سیاسیات کے نکتہ شناس تھے،
بہت بڑے جامع الفنون تھے، اس بنا پر ان کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور وہ
ہر فن کے متعلق نہایت بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، شعر و شاعری کا ذکر آجاتا تو عربی، فارسی
اردو کے سینکڑوں منتخب اشعار سنا دیتے، اور اس کے ساتھ ان پر تنقید بھی کرتے جاتے، کسی فن کے
متعلق کتابوں کا ذکر آجاتا تو سیبوں مطبوع اور قلمی کتابوں کا نام بتا دیتے، فلسفہ اور منطق کے کسی مسئلہ
کا ذکر آجاتا تو مع ادلہ و علیہ اس پر تقریر کر دیتے، وسعتِ نظر کی بنا پر سیکڑوں تاریخی واقعات اور
سیکڑوں مہذب لطیفے یاد تھے، سیر و سیاحت میں ہر قسم کی چیزیں نظر سے گذر چکی تھیں، بڑے بڑے
علماء و فضلاء اور رہبرانِ قوم سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو چکا تھا، اور ان کے خیالات سے واقف
تھے، اس بنا پر ان چیزوں کی آمیزش سے یہ علمی صحبت نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہو جاتی تھی،
صحبت میں فضول، لغو یا عام باتیں کبھی نہیں ہوتی تھیں، کبھی کوئی علمی مسئلہ چھڑ جاتا، کبھی کسی زیرِ
تالیف کتاب کے متعلق کوئی گفتگو شروع ہو جاتی، کبھی قومیات و سیاسیات کا تذکرہ ہو جاتا، کبھی
کسی مضمون کا ذکر ہوتا،

بڑے بڑے اربابِ کمال کی صحبتوں میں عموماً یہ عالم نظر آتا ہے کہ حاضرین مؤدبانہ
کے ساتھ بیٹھے ہیں، اور ایک باوقار اور پر عظمت ہستی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کو کانوں
سے سُن لیتے ہیں، لیکن بے تکلفی، سادگی اور خاکساری کی بنا پر مولانا کی صحبت اس سے بالکل
مختلف تھی، ان کے یہاں ہر شخص نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گفتگو میں حصہ لے
سکتا تھا، ان کے خیالات کی مخالفت، اور ان پر نہایت بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کر سکتا تھا

اُن کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم صفائی وغیرہ سے سخت تنفر تھا، اس لئے علی الاعلان اس کی بھی برائی کرتے تھے، لیکن اگر کسی شخص میں کوئی خوبی نظر آتی تو اسی طرح اس کا تذکرہ بھی کرتے، اور نہ صرف تذکرہ کرتے بلکہ لوگوں کو خطوط میں بھی لکھتے مولوی حمید الدین صاحب کی فارسی زباندانی کے قائل تھے، اور تعریف کرتے تھے، آخر میں اُن کی تفسیر نظام القرآن کے متعلق دوسرے رسائل کی بھی مدح فرماتے تھے۔ ندوہ میں جو طلبہ کسی قابل نکلے مولانا نے ان کو اسی طرح ہر جگہ روشناس کیا، مولانا حفیظ اللہ صاحب فرماتے تھے کہ طلبہ کی تعریفیں کر کر کے مولوی شبلی اُن کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے اساتذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے حسن اخلاق و تورع، مولانا رشید احمد صاحب کے تفقہ، مولانا فیض الحسن صاحب کی ادبیت اور مولانا فاروق صاحب کی ادبیت و معقول دانی کا تذکرہ ہمیشہ نہایت مدح و ستایش کے ساتھ کرتے تھے، معاصرین میں مفتی عبد اللہ صاحب ٹونکی اور مولانا شیر علی صاحب (حیدرآباد) کی نکتہ رسی کی داد دیتے تھے، مولانا شاہ سلیمان صاحب کے حسن تقریر اور مولانا عبد الحق صاحب حقانی کی خوبی بیان کی مدح فرماتے تھے، اور علمائے دیوبند میں سے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی روشن خیالی اور سیاسی گہرائی اور مولانا محمود حسن صاحب کے علم و فضل اور تقویٰ کے معترف تھے، کبھی کبھی ان سے خط و کتابت بھی رہتی تھی، اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی دینی برکت و صحبت اور بے نیازی کی بھی قدر کرتے تھے، (شیروانی، ص ۷۰)

اسی طرح سرسید کی انشاپردازی، مولانا حالی کی سخن فہمی اور نواب وقار الملک کی اخلاقی قوت کے بے حد مداح تھے، اور ہر موقع پر اس کا ذکر فرماتے تھے،

احباب | مولانا کے تعلقات نہایت وسیع تھے، اس لئے اُن کے احباب کے ناموں کا استقصا نہایت مشکل ہے، تاہم جن لوگوں سے اخیر تک تعلقات قائم رہے، اُن میں نواب محسن الملک مولنا حالی، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، مولوی سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، حاذق الملک حکیم اجمل خاں، نواب سید علی حسن خاں ایم مہدی حسن، مولوی ریاض حسن خاں صاحب اور خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی کے نام خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں،

نواب محسن الملک کے ساتھ مولانا کے تعلقات علی گڑھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں ان تعلقات نے استحکام کیا، نواب صاحب مولانا کے فضل و کمال کے معترف تھے، اور مولانا اُن کے فضل و احسان، اور لطف عمیم کے ہمیشہ مداح رہے، ساتھ ہی کچھ پیچ پالیسی سے ہمیشہ گھبراتے بھی تھے، تاہم گورنمنٹ سے اُن کی صفائی کرانے میں نواب صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ شامل تھا، حیدرآباد کی ملازمت اور اجراء وظیفہ میں بھی نواب صاحب کی کوششیں شامل تھیں، نواب صاحب نے مولانا کو بار بار علی گڈھ بلانا چاہا، لیکن مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا، سفر کشمیر سے واپس آکر مولانا علیل ہوئے تو نواب صاحب عیادت کے لئے خود اعظم گڈھ تشریف لائے، واقعہ شکست پا کے بعد مولانا لکھنؤ آئے تو نواب صاحب نے لکھنؤ آکر مولانا کی عیادت کی، نواب صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کے ماتم میں مولانا نے الندوہ میں ایک پُر درد مضمون لکھا، جس میں اُن کی تمام خوبیاں گنائیں،

اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ایک ریویو لکھا، بعض ہم مسائل پر اعتراض کیا، غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا، یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا،

بسی آنکہ بدرو ما کر چو ما   خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلاف باعثِ ملاقات ہوا، ملاقات بڑھ کر سرحدِ نیازمندی تک پہنچی، نیاز مندانہ محبت سے مبدل ہوا، اور الحمدللہ کہ وہ اخلاص علامۂ ممدوح کی رحلت تک قائم رہا[1] اور یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے محو نہ ہوگا، موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی بلکہ حسرت کا اضافہ کر دیا، قریباً بیس سالہ مدت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں، بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا، حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا، ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے، اس تمام تجربے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے۔"

تعلقات کی شگفتگی کا اندازہ ان مراسلوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ ہو سکتا ہے جو دونوں دوستوں میں باہم ہوئی ہیں، مولانا حبیب الرحمان خاں فارسی میں غزلیں کہتے ہیں، اور مولانا کی خدمت میں بھیجتے ہیں اور وہ اُن کے نوکِ پر تغیر و تبدل کرتے ہیں، مولانا کی تصنیفات پر ریویو لکھتے ہیں، اور مولانا داد دیتے ہیں، اُن کے زورِ تحریر کو دیکھ کر

---

[1] یہ مسودہ دیکھتے وقت مولانا شروانی نے اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے۔
"یہ رشتہ تعلق و اخلاص آخر تک بھی اسی درجہ پر رہا جو علامہ کی حیات عارضی میں تھا، حالانکہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تعلق و محبت کو ہو گیا"

مولانا کو مضمون نگاری کا میدان تنگ نظر آتا ہے، اور ایک مستقل تصنیف کا مشورہ دیتے ہیں، ایک مشترک کتاب کی تصنیف کی تجویز ہوتی ہے، جس کا نام حبیب شبلی تجویز کیا جاتا ہے، تصنیفی مشورے ہوتے ہیں، اور مولانا اُس کا خاکہ پیش کرتے ہیں، مولانا علیل ہوتے ہیں، تو اُن سے حکیم عبدالمجید خاں کے نام خط لکھواتے ہیں، غسلِ صحت کے بعد ایک جلسۂ دعوت ترتیب دیتے ہیں، تو اُن کو خصوصیت کے ساتھ مدعو فرماتے ہیں، ندوہ میں جو اہم معاملات پیش آتے ہیں ان میں اُن کی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں، نادر اور بیش قیمت کتابیں نظر سے گذرتی ہیں تو اُن کو خریدنے کا مشورہ دیتے ہیں، تصنیف و تالیف کے لئے کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے تو بلا تکلف ان کے کتب خانہ سے منگواتے ہیں، دینا کتب خانہ فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اس راز کی صرف اُن ہی کو خبر دینا چاہتے ہیں، غرض ان گوناگوں تعلقات کی بنا پر وہ مولانا کے دوست بھی تھے، ممنون مشورہ بھی تھے، محسن بھی تھے اور ایک عزیز بھائی بھی تھے،

حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے تعلقات کی ابتدا معلوم نہیں، غالباً حکیم صاحب کے قیام رامپور کے زمانہ سے ہوئے، جب رامپور کا کتبخانہ حکیم صاحب کے زیر انتظام تھا، اس زمانہ میں جب حکیم صاحب رامپور سے چلے آئے تھے اور قومی کاموں میں دلچسپی لینے لگے تھے تو ان تعلقات میں مزید وسعت ہوئی، اصلاحِ ندوہ کے سلسلہ میں اور بھی تعلقات بڑھ گئے تھے، اور حکیم صاحب ہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، دہلی میں ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ حکیم ہی صاحب کی کوششوں سے ہوا، اور مولانا کے مخالفین کی قوت ان ہی

اثر نے نمایاں نہیں ہونے دیا، اصلاحِ ندوہ کے لئے دلّی میں جو جلسہ ہوا، اس میں اگر حکیم صاحب کا ہاتھ کام نہ کرتا تو اس کا انعقاد ناممکن ہو جاتا،

نواب سیّد علی حسن خاں صاحب مولانا کے بیحد معتقد و معترف تھے، تعلقات کی ابتدا گذشتہ تعلیم اور الماسون سے ہوئی ۱۹۰۱ء میں جب حیدر آباد کا سفر کیا تو نواب صاحب نے راستہ میں مولانا کو اپنے ہاں بھوپال میں روک لیا، یہ پہلی ملاقات تھی، نواب صاحب کو نواب شاہجہاں بیگم نے جب اپنی ریاست کا ڈائرکٹر تعلیم مقرر کیا، تو نواب صاحب نے مولانا سے مشورے طلب کئے، اور اس سلسلہ میں وہ کئی دفعہ بھوپال جا کر اُن کے ہاں ٹھہرے،

نواب صاحب نے متعدد بار مولانا کو مالی نذرانے بھی پیش کرنا چاہے، لیکن مولانا کی خودداری اور بے نیازی نے اُن کو قبول نہیں کیا، اتفاق سے ۱۹۰۳ء میں نواب صاحب بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے، اور مولانا بھی معتمد دار العلوم کی حیثیت سے ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ رہنے لگے، تو تعلقات میں اور زیادہ استواری پیدا ہو گئی، اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، نواب صاحب مولانا کو گاڑی بھیج کر بلواتے تھے، اور اپنی کوٹھی کے قیام پر اصرار کرتے تھے، کبھی کبھی مولانا وہاں چند روز کے لئے قیام بھی کرتے تھے،

ندوہ پر انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ مولانا ہی کے اثر سے وقف کیا، ندوہ کی زرکثیر اور دلچسپی بھی مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ جب مولانا نے استعفا دیا تو وہ بھی مستعفی ہو کر اصلاحِ ندوہ کی کوششوں میں مصروف ہو گئے، اور آخر میں ندوہ کی نظامت کا کام انھوں نے اسی دوستی و محبت کی یادگار میں قبول کیا، جس کو وہ سالہا سال

انجام دیتے رہے،

ایم مہدی حسن سے لطفِ ادب اور حسنِ معاشرت کے تعلقات تھے، ان میں اور مولانا میں نہایت پُرلطف اور بے تکلفانہ خط و کتابت ہوتی تھی، وہ نہایت عمدہ قسم کے لفافے اور خط کے کاغذ بھیجا کرتے تھے، کہ ان کے نام جو خطوط بھیجے جائیں، اُن کے لئے یہ کاغذ مخصوص کرلئے جائیں، مولانا کی ذات سے انھوں نے اُن کے مرنے کے بعد بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی، اور شبلی سوسائٹی اور "معاصرانہ چشمک" کے عنوان سے معارف میں جو مضامین لکھے وہ اسی دلچسپی کا نتیجہ تھے،

ان کے علاوہ مختلف شہروں مثلاً بمبئی، علی گڈہ، پٹنہ، کلکتہ اور الٰہ آباد میں مولانا کے بہت سے احباب تھے، اور جب مولانا ان شہروں میں جاتے تھے تو ان کو صحبتیں رہتی تھیں،

احباب علماء مولانا کے احباب کی اس فہرست پر نظر ڈالنے سے مولانا کے مذاقِ طبیعت کا اندازہ نہایت آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے، مولانا کے ان تمام احباب کی حیثیتیں اگرچہ مختلف ہیں، تاہم ذوقِ علم ایک ایسی چیز ہے جو سب میں مشترک ہے، علماء میں سے ان کے تعلقات ندوہ کے سبب سے سب سے قائم تھے، ان میں قابلِ ذکر اشخاص یہ بزرگوار ہیں، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا سید محمد علی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، مولانا شیر علی صاحب حیدرآبادی، مولانا فضلِ حق صاحب رامپوری، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، اگرچہ وہ قدیم و جدید کے درمیان

واسطہ تھے، اس لئے کبھی کبھی قدیم کی خاطر جدید اصحاب سے اور کبھی جدید کے سبب سے قدیم علما،
سے اُن کا تصادم ہوتا رہتا تھا، اور یہی سبب ہے کہ بے غرض اصحاب علم کے سوا ان سے
سب ہی سے اَن بَن ہوتی ہی رہتی تھی، چنانچہ مولانا شروانی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"علامہ شبلی چونکہ ۱۶ سال تک کالج میں رہے تھے، ایک حد تک اُن کے خیالات آزاد تھے، علمأ
کے موجودہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے، اعتراض کرنے میں بے باک تھے،
ان کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے، لہذا متاخرین کے اندازکے خود وہ مُلتزم
نہ تھے یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علما کو اُن کی جانب سے شبہات تھے بعض کا عرصہ
تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے، تاکہ یہاں بھی ہمارا رنگ جمائیں،
خلاصہ یہ کہ اخیر وقت تک علامہ شبلی قدیم طبقہ کے علما میں شیر و شکر نہ ہو سکے، تاہم اس قدر کہنا بیجا
نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی قدیم و جدید سوسائٹی کی صلح و آشتی کا، لیکن افسوس کہ
مذکورہ بالا اختلافات نے ان کوششوں کو بار آور نہ ہونے دیا۔"

باہم معاصرین کے اعترافات مولانا نے اپنے معاصرین کے ساتھ اور اُن کے معاصرین نے
اُن کے ساتھ ہمیشہ خوشگوار تعلقات قائم رکھے، دونوں نے ایک دوسرے کے فضل
وکمال کا اعتراف کیا، اور علانیہ ایک نے دوسرے کی مدح و ستایش کی،

مولانا کو نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا آزاد اور خواجہ
عزیز الدین کے ساتھ شرفِ معاصرت حاصل تھا، اور ان میں ہر ایک دوسرے کے فضل و
کمال کا معترف تھا، نواب محسن الملک کو مولانا کے ساتھ جو حسن ظن تھا، اس کا اعتراف

انھوں نے ایک تقریر میں نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ چنانچہ شمس العلما، کے خطاب پر مولانا کو مبارکباد دینے کے لئے علی گڈھ کالج میں جو جلسہ ہوا، اُس میں بحیثیت پریذیڈنٹ کے انھوں نے یہ الفاظ فرمائے، "وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحتِ بیان اور سلاستِ عبارت اور تحریر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کو کام فرمایا، اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ اور استعارہ، عبارت آرائی اور تصنع سے پاک اور بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانحعمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا"

نواب محسن الملک اور مولانا کے اخلاق و فطرت میں بہت بُعد تھا، اس بنا پر گو متعدد بار اختلاف کے اسباب بھی پیدا ہوگئے اور علی گڈھ پارٹی کے بہت سے لوگوں نے اُن کی مخالفت بھی کی لیکن بایں ہمہ مولانا اور نواب صاحب کے تعلقات میں اخیر دم تک ذرا فرق نہیں آیا۔

مولانا کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور اُلفت تھی، اور اُن کی وقتِ نظر اور اُن کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے، فرماتے تھے کہ وہ جوہر کو خوب سمجھتے تھے، اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ یہ نثر کا حماسہ ہے "مولانا کہتے تھے کہ ان کے اس ایک فقرے نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا، اور اُس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آگیا، جو پہلے سامنے نہ تھا،

فرماتے تھے "میں دریا ہوں، اور حالی کنواں ہیں" میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے، اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں، لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، اُن کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے، مولانا حالی کی تصنیفات میں حیاتِ سعدی کو نہایت پسند فرماتے تھے، شعر العجم حصۂ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں آپ نے پس و پیش کرتے تھے کہ حالی کے بعد اُس میں کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن مجبوراً سعدی کے حالات لکھے تو اس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا ہے "مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیاتِ سعدی میں، سعدی کے حالات، اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا، اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا"

حیاتِ سعدی شائع ہوئی تو اُس پر ریویو لکھا، مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ جب چیز کو خود پسند کرتے تھے، اپنے اعزہ، تلامذہ اور احباب کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، حیاتِ سعدی بھی اسی قسم کی پسندیدہ چیزوں میں تھی، چنانچہ ایک عزیز کو لکھتے ہیں "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے، اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا، اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ کچھ واقعی بے مثل ہے، اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں

پاؤں کے حادثہ کے بعد مولانا حالی نے ایک رباعی لکھ کر اندوہ میں چھپنے کے لئے بھیجی، تو اس کے شکریہ میں مولانا نے شذرات میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی کے عنوان سے یہ نوٹ لکھا: "مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض اُن کی ذرہ نوازی ہے، وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا کرتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے، کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں، جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے"

مولانا حالی کو بھی مولانا سے نہایت عقیدت اور محبت تھی، سیرۃ النعمان شائع ہوئی تو مولانا حالی نے اس پر ریویو لکھا، جس میں فرماتے ہیں: "انھوں نے (شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں اُن کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے، اور جہاں تک میری نگاہ پہنچی ہے، سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں، جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے و قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقۂ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے پردے اٹھا دیئے ہیں"

مولانا حالی مولانا کی تصنیفات کو شوقیہ منگاتے تھے، اور لائبریری میں رکھتے تھے، ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لئے منگائیں، اور لکھا کہ خود تو آنکھوں سے معذور ہوں، لیکن یہ کتابیں دوسروں کے لئے منگائی ہیں کہ

قبہ چوں پر شود پیشہ کند دلالی

بعض اوقات مولانا خود اپنی تصنیفات اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیجتے تھے، اور وہ اس کی نہایت قدر کرتے تھے، دستۂ گل شائع ہوا، اور اس کو مولانا نے اُن کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا تو مولانا حالیؔ نے اُس کے جواب میں لکھا کہ: "کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے، جس کے نشہ میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اُس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اُس سے بہت زیادہ گرم ہیں:"

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبے است سالک را خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کونسی بات ہے، مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا، الا الذی ابتلی بمثل ما ابتلی بہ القائل،

میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے اُس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں، ولیس فی ذلک شائبۃ من التصنع:

مولانا نے سوانح مولانا روم ہدیۃً بھیجی تو مولانا حالیؔ نے رسید میں لکھا: "سوانح کو میں اب تک ایک سرسری نظر سے دیکھ سکا ہوں، اول مولوی وحید الدین دیکھنے کو لے گئے اس کے بعد غلام حسنین نے مانگ لی، آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، کہ من عرف منزلتکم فی التصنیف کلّ لسانہ، آپ کا وجود قوم کے لئے

باعثِ فخر ہیں خدائے تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ و سلامت رکھے۔"

باہم اخلاقی تعلقات بھی نہایت شگفتگی کے ساتھ قائم تھے، سفرِ کشمیر کے بعد مولانا کو ایک طویل علالت سے صحتیاب ہونے کی توقع ہوئی، اور اس مسرت میں ایک جلسۂ دعوت کرنا اور اُس جلسہ میں جن احباب کو مدعو کرنا چاہا، اُن میں ایک مولانا حالیؔ بھی تھے۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:- "آپ اس بات کے لئے تیار رہیں کہ اگر خدا نے صحتِ کامل دی، تو میں اپنے تمام خاص دوستوں کو مدعو کروں گا جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے۔ آپ کو بھی تحصیت کرنی پڑیگی وغیرہ الخ"

صحتیاب ہونے کے بعد مولانا نے قصیدۂ کشمیریہ لکھا، اور مولانا حالیؔ کی خدمت میں بھیجا، تو مولانا حالیؔ نے ایک طویل خط لکھا، جس کی ابتدا اس قطعہ[1] سے کی جس کا پہلا شعر ہے

شد بمحدِ پس از ناخوشیٔ رنج دراز ۔۔۔۔ شبلیؔ ما بمراد از سرِ بالینِ برخاست

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:- "مولانا! قصیدۂ کشمیریہ کی متعدد کاپیاں وصول ہوئیں، پہلے اس سے کہ آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کروں، مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے جس نے مدت دراز کے بعد آپ کی صحت کا مژدہ آپ ہی کی زبان سے سنوایا، فی الواقع آپ کی حالت نازک ہو گئی تھی، اور مرض کو حد سے زیادہ امتداد ہو گیا تھا، باوجودیکہ تبدیلِ آب و ہوا کی بہت ضرورت تھی، مگر آپ کو اس کا موقع نہیں ملا، اب درحقیقت صرف خدا کے فضل پر اور بجب ظاہر شفیق و ہمدرد معالج پر صحت کا انحصار تھا، اذا اراد اللّٰہ شیئاً ھیّاً اسبابہ، ایسی حالت میں ڈاکٹر مصطفےٰ خاں صاحب

---

[1] اشعار پہلے گذر چکے ہیں، دیکھیے ص ۳۳۶)

کاآنا صاف دلالت کرتا ہے کہ خدا نے تعالیٰ کو ابھی آپ کی قومی خدمات کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رکھنا منظور تھا، فالحمد للہ ثم الحمد للہ علی ما انعم علینا ببقائکم فینا وبصحۃ وجود کم اللہ

مولانا کے پاؤں میں گولی لگی تو مولانا حالی کو اس سے سخت تشویش لاحق ہوئی، اخبارات میں جو حالات شائع ہوئے، اس کے سننے سے تسکین نہیں ہوئی، تو مولانا کے فرزند محمد حامد نعمانی کو بغرض استفسار حال ایک خط لکھا، اور باوجود اس ضعف کے مولانا کی عیادت کے لئے اعظم گڈھ آنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اُس خط میں تحریر فرماتے ہیں:- "آج تک جو کچھ اخبارات کے حوالے سے جناب مولانا کے حالات سُنے گئے ہیں، اُن سے کچھ تشفی نہیں ہوئی، اس لئے ناچار آپ کو تکلیف دیتا ہوں، کہ آپ میرا یہ خط مولانا کو دکھا کر، اور جو کچھ وہ اپنا حال لکھوائیں اس کو قلمبند کر کے اندر ملفوف میرے پاس بھیج دیں، نیز یہ بھی لکھیں کہ بمبئی کے ڈاکٹر رجب علی جو مولانا کو وہاں بلاتے ہیں، وہاں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں،

بہت دن سے ارادہ کر رہا ہوں کہ میری پوتی یعنی غلام الثقلین کی اہلیہ جو لکھنؤ میں ہے اس سے ملنے کے لئے لکھنؤ آؤں، اور وہاں سے مولانا کو دیکھنے اعظم گڈھ آنے کا بھی قصد ہے، مگر اب تک ایسے موانع پیش آتے رہے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا، اگر لکھنؤ آنا ہوا تو اعظم گڈھ آنے سے پہلے آپ کو وہاں سے اطلاع دوں گا، مولانا کی خدمت میں بصد حسرت دیدار و اشتیاق زیارت سلام و نیاز کہہ دیجئے"

لیکن باوجود ان مخلصانہ تعلقات کے مولانا کی بعض عبارتوں اور بعض خطوط سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ دونوں معاصرین میں باہم چشمک بھی تھی، مثلاً ایک موقع پر سوانح مولنا روم میں لکھتے ہیں:- "تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی،

اور مولانا روم ہیں اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور حافظ سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے، اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں، اور چونکہ مولانا ہمارے پیرو ہیں اس لئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرض کے بالکل خلاف تھا۔[1]

موازنۂ انیس و دبیر میں ایک موقع پر لکھتے ہیں:- "ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعوائے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں۔[2]

موجودہ سوانح نگاری کے متعلق اسی قسم کی تنقید مولانا نے اپنے بعض مضامین میں بھی کی ہے، اور لکھا ہے کہ "یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اور دوکی اصل سے اصلی سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔"

ان عبارتوں سے یہ ظاہر ہے کہ یہ چوٹ مولانا حالی پر ہے، اور اصلی سے اصلی سوانح عمری سے "حیاتِ جاوید" مراد ہے، کتابیں سے گذر کر مولانا نے خطوط میں حیاتِ جاوید کے متعلق تصریحاً بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "حیاتِ جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں، اور وہ بھی غیر مکمل خیر وللناس فیما یعشقون مذاھب۔" (مکاتیب ثانی- ۲۵)

لیکن یہ چوٹ مولانا حالی کی ذات پر نہیں، جن کی وہ بیحد قدر کرتے تھے، بلکہ سرسید کے تمام بائیگرافی، سوانح عمری پر تھا رخیال ہے، اگر حیاتِ جاوید کا مصنف مولانا کا کوئی عزیز بھی ہوتا

[1] سوانح مولانا روم ذکر دیوان صفحہ طبع اول [2] موازنہ زیرِ عنوان اعتراضات ص۲۳۵ طبع اول

تب بھی وہ اس تصنیف کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کرتے۔

مولوی نذیر احمد اور مولانا میں اگرچہ وہ ربط و اخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ تھا، تاہم بالکل بے تعلقی بھی نہ تھی، کانفرنسوں کے اجلاس میں اکثر دونوں بزرگ ایک ساتھ پبلک اسٹیج پر نظر آتے تھے، اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ کہتا تھا، اُس سے بے تکلفانہ تعلقات کی جھلک نمودار ہوتی تھی، ایک بار اسٹریچی ہال میں کانفرنس کا اجلاس ہوا، تو مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں ظریفانہ لہجہ میں کہا، "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہوگیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں":

دہلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو مولانا، مولوی نذیر احمد سے ملے، اور چونکہ چند لڑکوں کو عربی میں تقریر کرنے کے لئے ساتھ لے گئے تھے، اس لئے مولانا نے خصوصیت کے ساتھ اُن کو جلسہ میں شریک ہونے کے لئے دعوت دی، الندوہ جاری ہوا، تو مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کی تعریف میں ایک خط لکھا اور چند عربی شعر لکھ کر بھیجے، جن کو مولانا نے الندوہ کے شذرات میں شائع کیا، شعر یہ تھے:۔

يقولون ان العلم والفضل والنهى	حبيس على المتقدم المتبختر
فلما تصفحنا صحائف ندوة	وجدنا بان الفضل للمتأخر

ترجمہ:۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضل و کمال اگلوں کا حصہ تھا، مگر جب میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ فضل و کمال تو پچھلوں ہی کا حصہ ہے۔

مولانا نے ۱۹۰۷ء کی کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا تھا، اُس میں ان دونوں بزرگوں کے

نام بڑی عزت سے لیتے ہیں،

نگہ از ہر سوے حالیؔ آزادہ تُلمن   و آں نذیر احمد طوطیِ شکر خا بنگر

مولانا محمد حسین آزاد سے تعلقات نہ تھے، اُن سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی جبکہ اُن کا دماغ خراب ہو چکا تھا، بایں ہمہ مولانا اُن کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز مانتے تھے، اور فرماتے تھے کہ آزاد اردوئے معلّیٰ کا ہیرو ہے، اُس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

الندوہ میں جہانگیر پر جو مضمون لکھا ہے، اس کی تمہید میں نیرنگ خیال کی عبارت کا اقتباس ان الفاظ میں کیا ہے: "ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے:"

جس زمانہ میں شعر العجم لکھ رہے تھے، آزاد کی کتاب سخندانِ پارس نکلی، اُس کی نسبت ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں: "آزاد کی کتاب آج منگوائی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم وہ ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وہی معلوم ہوتا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ گیا یہاں تک اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا، بارھویں صدی کے میدان میں اترا ہے، لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، اس لئے یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔" (مہدی ۳۴۰)

مولانا محمد حسین آزاد کی وفات کی خبر جب مولانا کو پہنچی تو اُن پر بے حد اثر ہوا، اسی وقت مدرسہ بند کرا دیا، اور تعزیت کا ایک جلسہ کرایا جس کے پہلے مقرر وہ خود تھے، اس تقریر کے وقت نہ صرف ان کے چہرہ سے بلکہ ایک ایک لفظ سے شدتِ غم کا اثر محسوس ہوتا تھا

تقریر میں سب سے پہلا فقرہ جو اُن کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا:۔

"آج خدا سے سخن مرگیا"

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی سے نہایت وسیع تعلقات تھے، قیصر نامہ ان کی مشہور فارسی مثنوی ہے، مولانا اُن کی فارسی دانی اور قادر الکلامی کے قائل تھے، تعلقات کا آغاز غالباً اُس وقت سے ہوا جب علی گڈھ جاکر مولانا نے اپنی اور حزیں کی فارسی غزلیں خواجہ صاحب کے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجی تھیں، اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے، ندوہ کے قیام سے پہلے مولانا جب لکھنؤ جاتے تھے تو اکثر اُن ہی کے یہاں قیام فرماتے تھے، قیام لکھنؤ کے زمانہ میں بھی بعض اوقات اُن کے یہاں جاکر دن دن بھر رہتے تھے، مولانا خواجہ صاحب کی بلند ہمتی اور خودداری کے دل سے معترف تھے، البتہ شاعری میں اُن کے مراعاتِ لفظی کو پسند نہیں فرماتے تھے، مولانا کے پاؤں میں گولی لگی، تو خواجہ صاحب نے ایک رُباعی لکھی، مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے، ایک بار "الناظر" نے مولانا کو خواجہ صاحب کا شاگرد لکھ دیا تھا، اس کی تردید میں مولانا نے لکھا کہ

"خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں"۔ (مکاتیب ۱۰)

خواجہ صاحب کو الناظر کے اس بیان کا حال معلوم ہوا تو سخت افسوس کا اظہار کیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء تھا کہ مولانا نے حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں بہادر کی خدمت میں ندوہ کی طرف سے ایک خریطہ پیش کرنے کے لئے یہ شعر کہا تھا،

تا جہاں باشد و ایں گنبد گرداں باشد ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ دہر فرماں بر محبوب علی خاں باشد

پھر یہ شعر بغرضِ مشورہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجا، جو صاحب گئے تھے، انھوں نے آکر کہا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ گنبدِ گرداں کی ترکیب اچھی نہیں معلوم ہوتی، مولانا نے یہ سن کر فرمایا کہ اب ہمارے خواجہ صاحب سٹھیا گئے،

آخر میں مولانا کے معاصر دوستوں میں سے ایک بزرگ کا نام لینا چاہتے ہیں، جو بفضلہ تعالیٰ اس وقت تک ہم میں ہیں، اور کہنہ سالی کے باوجود قلم و کاغذ کی تفریحات، و علمی شغل میں مصروف ہیں، میری مراد مولوی عبد الرزاق صاحب کانپوری سے ہے جو مصنفِ البرامکہ کی حیثیت سے مشہور ہیں، اور اس وقت تک جبکہ اُن کی عمر اسّی کے قریب ہوگی، بھوپال کے محکمۂ تاریخ کے مہتمم ہیں، اور ابھی اپنی کتاب البرامکہ کا دوسرا اڈیشن جو پہلے سے دونا ہے مرتب کرکے چھپوایا ہے، مولوی صاحب ممدوح کو مولانا سے اُن کے علی گڈھ کے زمانۂ قیام سے بے تکلفانہ دوستی، آمد و رفت اور مشاغلِ علمی میں استشارہ کا تعلق تھا، گویا علمی میدان میں مولانا مرحوم کے ہم رکاب تھے، مولانا نے جو سلسلہ فرماں روایانِ اسلام کا شروع کیا تھا، اس کی مناسبت سے انھوں نے سلسلۂ وزرائے اسلام شروع کیا تھا، اور اس سلسلہ میں البرامکہ اور نظام الملک طوسی دو کتابیں لکھیں، اور دونوں کے مسودے چھپنے سے پہلے مولانا کی نظر سے گذر چکے تھے، مولوی صاحب نے آجکل اپنی زندگی کے دلچسپ مشاہدات یادِ ایام کے نام سے لکھے ہیں، اس میں مولانا کے اور اپنے بے تکلفی کے واقعات اور آمد و رفت کے حالات بھی درج کئے ہیں، مگر

عہدِ پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

امراء اور والیانِ ملک سے تعلقات | مولانا کے علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں بڑے بڑے امراء اور والیانِ

ملک کالج کو دیکھنے آتے تھے، اور وہاں اُن کے خیر مقدم کے جلسے ہوتے تھے، اُن جلسوں کے پروگرام کا ضروری جز مولانا کی نظم ہوتی تھی، اس تعلق سے تمام معزز مہمانوں سے وہ نہ صرف روشناس ہو جاتے تھے، بلکہ اُن کے فضل و کمال کا سکہ ان مہمانوں کے دلوں پر ثبت ہو جاتا تھا، خلیفہ محمد حسین وزیر پٹیالہ، سر آسمان جاہ صدر اعظم حیدر آباد، جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام رام پور وغیرہ سے وہ اسی طرح سے روشناس ہوئے تھے، اور سبھی نے اُن کی قابلیت کا اعتراف کیا۔

پہلے پہل جب سرسید کے ساتھ ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد گئے تو اکثر امرائے کبار نے اُن کی قدر و منزلت کی، اور خود اعلیحضرت میر محبوب علی خاں تک ان کی شہرت پہنچی، دوبارہ ۱۹۰۱ء میں جب وہ حیدر آباد گئے تو امراء اور اکابر دکن کی قدر دانی اس حد تک پہنچی کہ انھوں نے جلسہ کر کے اُن کو ایڈریس پیش کیا، اور اعلیحضرت میر محبوب علی خاں نے ازراہِ قدر دانی سو روپیہ ماہوار اُن کا وظیفہ مقرر کیا، اور ۱۹۰۱ء میں ان کو اپنے ہاں ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز فرمایا، جس سے ۱۹۰۵ء میں وہ مستعفی ہوئے تو پھر بدستور پہلا وظیفہ جاری فرما دیا، ۱۹۱۶ء میں جب اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر تک دار المصنفین کی امداد کے تعلق سے مولانا کا اسم گرامی پہنچا تو تعریف فرمائی اور اُن سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس ظاہر فرمایا، منجملہ اُن امرائے دکن میں سے مولانا کے تعلقات زیادہ تر نواب فخر الملک بہادر وزیر تعلیم، نواب افسر الملک بہادر سپہ سالار آصفیہ اور نواب عماد الملک بہادر معتمد تعلیمات سے تھے۔

دوسرے والیان ریاست میں سے بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال سے متعدد بار اُن کی ملاقاتیں ہوئیں، ایک دفعہ تو ۱۹۰۸ء میں ندوۃ العلماء کی امداد کے تعلق سے اور دوسری دفعہ ۱۹۱۳ء میں سیرۃ نبوی کے لئے ان ملاقاتوں میں اُن سے مولانا بہت متأثر ہوئے، پہلی ملاقات

کے تاثرات مُسی زمانہ میں الندوہ میں لکھے ہیں ۔ دوسری دفعہ کی ملاقات کا ذکر مکاتیب میں بڑا (شروانی (۱۰) اس سفر میں ہر ہائینس مرحومہ نے مولانا سے دریافت فرمایا تھا آپ کی صحت کی یہ حالت ہے، آپ اپنا جانشین تو تیار کریں، مولانا نے سیرت کے متعلق دو شعر کہے تھے، جن میں ایک یہ ہے ،

غرض دو ہا تو ہیں اس کام کے انجام میں شامل　　کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطان ہے

سلطان کا اشارہ، سلطان جہاں بیگم کی طرف تھا ،

جب مولانا کا انتقال ہوا تو بیگم صاحبہ نے بحسرت فرمایا، کہ فقیر بے نوا تو چل بسا، سلطان باقی ہے؛ بیگم صاحبہ نے اپنی بعض تصانیف میں بھی مولانا سے مشورہ لیا ہے ،

نواب حامد علی خاں بہادر والی رام پور سے اُن کے تعلقات اُن کی ولیعہدی کے زمانہ سے تھے، جب زمام انتظام جنرل عظیم الدین خاں کے ہاتھ میں تھی، اور مولانا مدرسہ عالیہ اور کتب خانہ کے تعلق سے رامپور آیا جایا کرتے تھے مولانا جب سفر ٹرکی سے واپس آئے تو ریاست رامپور نے اُن کے اس سفر کے مصارف ادا کرکے اُن کی اس علمی زحمت فرسائی کا شکریہ ادا کرنا چاہا، مگر مولانا نے قبول نہیں کیا، سرسید کی وفات کے بعد رام پور میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اُس میں پھر ملاقات ہوئی ۱۹۰۱ء میں ندوہ کے تعلق سے پھر جا کر ملے اور نواب صاحب نے پانچسو روپیہ سالانہ ندوہ کے لئے مقرر فرمائے جو چند سال جاری رہے ،

نواب صاحب جزیرہ (جنجیرا) اور اُن کا پورا خاندان مولانا کا شیدائی تھا، چنانچہ جب

بمبئی جاتے تھے، تو اکثر ان لوگوں سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہتی تھیں، ایک بار اکتوبر ۱۹۱۲ء
میں خود جزیرہ (جنجیرہ) تشریف لے گئے تھے،

مولانا کو صرف ہندوستان ہی میں یہ عزت حاصل نہ تھی، بلکہ ان کی شہرت کا غلغلہ بیرونی ممالک میں بھی پہنچ گیا تھا، اور وہاں سے عملاً اس کا اعتراف ہوتا تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے تو وہاں کے تمام اکابر سے ملاقاتیں رہیں، اور گورنمنٹ ترکی کی طرف سے تمغۂ مجیدی عطا ہوا، امیر عبدالرحمان خاں والیٔ کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا تو اس کی سکریٹری شپ کے لئے مولانا کا انتخاب کیا، لیکن مولانا نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا،

انگریزی گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا، اور اپنی مختلف علمی و تعلیمی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بنایا، دربار میں بھی بحیثیت شمس العلماء ان کی کرسی تھی، دربار تاجپوشی کے موقع پر بھی شریک دربار ہوئے تھے، اور شاہ ایڈورڈ نے ان کو بار بخشا تھا،

مذہب | مولانا کی مذہبی زندگی میں مختلف تغیرات پیدا ہوتے رہے، ابتداء میں وہ ایک متعصب حنفی اور متشدد مولوی تھے، غیر مقلدوں سے مناظرے کرتے تھے، ان کی تردید میں رسالے لکھتے تھے، خود فرائض و سنن کے سخت پابند تھے، اور دوسروں سے نہایت سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے، فریضۂ حج سے تو زمانۂ طالب علمی ہی میں مشرف ہو چکے تھے، اور دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے،

ان کے خالو نے اعظم گڈھ میں ایک برف خانہ بنوایا تھا، فرماتے تھے کہ جب ہم لوگ گرمی کے زمانہ میں افطار کے وقت برف پیتے تھے تو اپنے خالو کے حق میں دعائیں کرتے

تھے، امامت کا کام کرتے تھے تو نہی گرمی کے زمانہ میں متصل کئی کئی کوسوں کا دورہ کرنا پڑتا
تھا، لیکن باایں ہمہ وہ روزہ قضا نہیں کرتے تھے، علی گڈھ کے زمانۂ قیام میں سخت گرمیوں
میں سرسید کے ساتھ نینی تال گئے تھے، اس سفر میں بھی روزہ کا اہتمام تھا، اثنائے قیام
ندوہ میں ۱۳۲۷ھ کے رمضان میں جو اگست ۱۹۰۹ء میں پڑا تھا، دن میں کثرتِ مطالعہ
کے سبب سے ایک آنکھ میں پانی آنے لگا، اور اس کی بینائی جاتی رہی، تاہم روزے رکھے،

ندوہ میں آنے کے بعد بعض اوقات جماعت میں شریک ہوتے تھے، البتہ پاؤں
کے حادثہ کے بعد معذوری ہوگئی تھی، پھر بھی ایک دفعہ یہ اہتمام کیا کہ کہار مقرر کئے اور ڈولی
پر بیٹھ کر مسجد جانے لگے، مگر چونکہ مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم جو امامت فرماتے تھے
نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے اور رکوع و سجود میں دیر تک رہتے تھے، اور مولانا اپنے
پاؤں کی معذوری کے سبب سے اس کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اس لئے چند روز کے بعد
جماعت کی شرکت چھوڑ دی،

اسی طرح اخیر زمانۂ قیام اعظم گڈھ میں ایک دفعہ ایک حافظ صاحب نے جو بہت کھینچ کھینچ کر
قرأت کرتے تھے، مغرب کی نماز میں امامت کی، مولانا مقتدی تھے، نصف ساق تک ایک
پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے دیر تک ایک پہلو پر بیٹھنے میں اُن کو تکلیف ہوتی تھی، اس لئے
نماز کے بعد بہت جھلائے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا
کہ "آپ لوگوں کو معذوروں کا ذرا خیال نہیں ہوتا" وہ صبح کو بہت سویرے اٹھتے تھے اور
سویرے ہی وضو کرکے نماز پڑھتے تھے،

سے کبھی زبانی اور کبھی قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کا معمول تھا، اور اس میں بھی اُن کے مزاج میں یہ نفاست پسندی تھی کہ وہ تلاوت کے لئے مطبوعہ قرآن کے نسخوں کو بہت کم پسند کرتے تھے، وہ ہمیشہ اس کے لئے قرآن پاک کا کوئی نہ کوئی قلمی نسخہ رکھتے تھے، اور آخر عمر میں بھی بمبئی میں اس کے لئے جو نسخہ خریدا تھا وہ بڑا قیمتی تھا،

علی گڈھ جاکر اُن کی مذہبی زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا، اس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں، اور عوام بلکہ علما تک کا خیال ہے کہ وہ علی گڈھ میں جاکر وضع قطع، عقائد و اعمال کے لحاظ سے معاذ اللہ بالکل آزاد خیال نیچری ہوگئے تھے، لیکن یہ تمامتر خلافِ واقعہ ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ علی گڈھ جاکر اُن کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ وسعت اور آزادی پیدا ہوگئی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ جس شدت کے ساتھ وہ پہلے پابند تھے، علی گڈھ میں وہ اہتمام و تشدد باقی نہیں رہا، بلکہ حیدرآباد تک یہی حال رہا، اور یہ متکلمین کی ہر قسم کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، اور کچھ ماحول کا اثر بھی، لیکن اس پر بھی ان کی حنفیت کا غلو اپنی جگہ پر قائم رہا،

لطیفہ:۔ دارالعلوم کی پرانی عمارت کے صحن میں ایک مسقف حوض تھا، خاکسار نے ایک دفعہ حوض کے پائپ سے وضو کیا، اور اُس کی چھت پر نماز پڑھنے لگا، ساتھ ہی میلانِ خاطر کی بنا پر اتفاقاً اُس وقت رفع یدین بھی کیا، میں نے مولانا کو نہیں دیکھا، وہ مولانا حفیظ اللہ صاحب کے چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے، نماز پڑھ چکا تو پاس بلایا، پھر فرمایا، میری عجیب قسمت ہے، میں تو پکا حنفی ہوں، اور جو مجھ سے پڑھتا ہے وہ اہلِ حدیث

ہوجاتا ہے، حمید الدین کا یہی حال ہوا، اور تمہارا بھی یہی حال ہے۔

جب وہ کالج میں گئے ہیں تو طلبہ کی مذہبی زندگی اُن کو پسند نہ آئی، گو یہ اُن کے فرائض منصبی میں نہ تھا، تاہم انھوں نے طلبہ میں نماز کی پابندی کا شوق پیدا کر دیا، بجنۃ الصلوٰۃ کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن قائم ہوئی جس میں وہ شریک تھے، کالج کے طلبہ میں مذہبی معلومات پیدا کرنے کی خاطر وہ سال میں ایک دفعہ مجلس میلاد کیا کرتے تھے، اور خود اس میں بیان فرمایا کرتے تھے، اور دینیات کے درس میں وہ دلچسپی پیدا کر دی تھی کہ طلبہ اُن کے کلاس میں شوق سے شریک ہونے لگے، خود سرسید کی اس شکایت پر کہ طلبہ نماز میں کیوں شریک نہیں ہوتے، صاف کہہ دیا کہ چونکہ آپ شریک نہیں ہوتے، (سرسید سلسل البول کی شکایت کے سبب گھر جا کر نماز پڑھتے تھے، اور جمع بین الصلوٰتین بھی کرتے تھے)

وضع و قطع کے لحاظ سے مولانا اگرچہ کوئی متقشف مولوی نہیں معلوم ہوتے تھے، تاہم انگریزی لباس انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا، لطیفہ سیرۃ النعمان کے جواب میں مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی نے حسن البیان نام کتاب لکھی تھی، اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا، مولانا فرماتے تھے کہ اتفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنتا، مولانا رحیم آبادی نے پشیمانی ظاہر کی، اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا۔

لہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم اپنے چچا مولوی سلیم صاحب کے اثر سے جو عامل بالحدیث تھے ایک زمانہ میں اہل حدیث ہو گئے تھے، پھر رجوع کر لیا۔

داڑھی کی غیر شرعی ہیئت سے بھی اُن کو سخت بیزاری تھی،

ایک عزیز کی شادی کی تقریب میں لوگوں نے رقص سرود کا سامان کیا، اُن کو معلوم ہوا تو سخت خفگی ظاہر فرمائی، اور شرکت سے انکار کر دیا، آخر وہ حرکت ملتوی کی گئی، تب اُنھوں نے شرکت کی،

اپنے صاحبزادہ کی پہلی شادی میں ہر قسم کے رسوم و بدعات سے احتراز کیا، اور اس موقع پر ایک موثر تقریر کی جس میں اُن تمام رسوم کی جڑ کاٹ دی، اور اہلِ برادری کے لئے شادیوں میں جہیز وغیرہ کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا، جس کی تعمیل بہت دنوں تک ہوتی رہی، اور اب بھی کسی قدر ہے،

قسطنطنیہ کے سفر میں جہاز پر پرندوں کے گوشت کھانے سے کئی روز تک اس بنا پر اجتناب کیا کہ اُن کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ جہاز پر پرند ذبح نہیں کئے جاتے، مگر انھوں نے خود جا کر دیکھا کہ اس جہاز پر پرند ذبح کئے جاتے ہیں گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے تب گوشت کھانا شروع کیا،

عقائد و خیالات | تاہم عقائد و خیالات کے لحاظ سے وہ عقلیت پسند تھے، لیکن اُن کی عقلیت پسندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ احکامِ مذہبی کو مصالح و حِکَم پر مبنی سمجھتے تھے، اسی لئے وہ احکامِ الٰہی کی مصلحتوں اور حکمتوں کی تلاش میں رہتے تھے، اور اشاعرہ کے اس خیال کے کہ احکامِ الٰہی کا منشا محض مشیئتِ الٰہی ہے[1] اور وہ کسی مصلحت و حکمت پر مبنی نہیں سخت مخالف تھے

[1] حالانکہ ان دونوں باتوں میں جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ثابت کیا ہے اور ماتریدیہ کا مسلک بھی یہی

اسی بنا پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ معجزات کے بھی قائل نہ ہوں گے، کیونکہ وہ خرقِ عادت پر مبنی اور خلافِ عقل ہوتے ہیں، لیکن یہ سوءِ ظن قطعاً غلط ہے، وہ معجزات کے قائل تھے، اور سرسید وغیرہ کی تاویلات کو دور از کار اور مہمل سمجھتے تھے، چنانچہ الکلام میں لکھتے ہیں: "لیکن خرقِ عادت تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے، اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ اسلام میں بھی کچھ نہ کچھ اس کی جھلک موجود ہے، اس لئے اس عقدہ کا حل کرنا ضرور ہے، قرآن مجید میں اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں، فرقۂ جدیدہ ان کی عموماً تاویل کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا ایک واقعہ بھی مذکور نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس قسم کے واقعات کے مذکور ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا، بے شبہہ اشاعرہ کی افراط بچوں کی وہم پرستی کے درجہ تک پہنچ گئی ہو، لیکن انکارِ محض کرنا بھی کچھ کم ہٹ دھرمی نہیں ہے، ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جو تاویلیں کی ہیں، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں، بے شبہہ یہ تاویلیں نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے کافی ہیں، جو بیچارے عربی زبان اور اس کے طرزِ بیان سے ناآشنا ہیں، مگر ماہر عربیت کے سامنے یہ تلبیع کیا کام دے سکتی ہے" (ص ۶ - ۱۱۵)

لیکن با ایں ہمہ وہ بات بات کو معجزہ نہیں مانتے تھے، اُن کے نزدیک معجزات کے ثبوت کے لئے قطعی شہادت کی ضرورت تھی، اور قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہے، اس لئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱۷) سے کوئی تضاد نہیں، بے شبہہ یہ احکام مصالح و حکم پر مبنی ہیں، لیکن یہ بھی مشیتِ الٰہی کا کرشمہ ہے، خاکسار کا ایک شعر ہے:

تری قدرت وہ کر سکتی ہے جو تیری مشیت ہے ۔۔۔ مگر تیری مشیت آپ ہی پابندِ حکمت ہے

لیکن یہ ضرور نہیں کہ یہ مصالح و حکم پوری طرح بندوں کی سمجھ میں بھی آجائیں، اور جو بندے سمجھیں وہ تمامتر صحیح بھی ہو،

اس میں جہاں خرقِ عادت کا ذکر ہوگا، واجب التسلیم ہوگا،

لیکن مولانا کے نزدیک یہ امر نہایت غور اور وقتِ نظر سے طے کرنا پڑے گا، کہ فی الواقع قرآن مجید کے الفاظ اس کے ثبوت میں قطعی الدلالۃ ہیں یا نہیں مفسرین میں بقول مولانا جو محقق گذرے ہیں، مثلاً قفال، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر اصم وغیرہ، ان کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید میں بہت کم خرقِ عادات مذکور ہیں، اور جو واقعی مذکور ہیں اُن کی صحت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

ان کا یہ خیال الکلام کے لکھتے وقت یعنی ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۳ء تک تھا، لیکن سیرت کی تصنیف کے وقت وہ اپنے پچھلے خیال سے پھر چکے تھے، چنانچہ احادیثِ صحیحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو معجزات مذکور ہیں، اُن کا ذکر خود سیرۃ النبیؐ کی دو جلدوں میں کیا ہے، اور مقدمہ میں لکھ بھی دیا ہے "البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہیں، مثلاً معراج اور تکثیرِ طعام وغیرہ اُن کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے،" (خاتمہ دیباچہ سیرت جلد اوّل)

وہ جن اور شیطان کے وجود کو بھی تسلیم کرتے تھے، لیکن ان کے متعلق عوام جو واقعات بیان کیا کرتے ہیں ان کو وہم پرستی سمجھتے تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ کے حال میں اُن کا جو مضمون ہے اس میں لکھتے ہیں :- "جن کے وجود سے انکار نہیں لیکن جن یوں صورت بدل کر لوگوں کے پاس آیا جایا نہیں کرتے"، مقالاتِ شبلی ج ۵ ص

اس سے شاید مولانا کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ دوسروں کی صورت بن کر نہیں یا انہیں

لہ الکلام بحث معجزات ،

ہوا کرتے، ورنہ شخصیتوں سے امان اٹھ جائے، ہاں احادیث میں شیاطین کا بہ تبدیلِ صورت نظر آنا صاف وصریح مذکور ہے،

وہ گو فرشتوں کے وجود کے پہلے بھی قائل تھے، لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ملائکہ کا اطلاق حسب تصریح مولانا روم و مولانا بحر العلوم شارح مثنوی بعض ملکاتِ نبوی اور ملکاتِ بشری پر بھی ہوا ہے، جیسا کہ سوانح مولانا روم میں انھوں نے لکھا ہے، لیکن سیرت کی تالیف کے زمانہ میں اس حقیقت کے چہرہ سے بھی پردہ اٹھ چکا تھا، اور جبریلِ امین اور دوسرے فرشتوں کے مستقل شخصی وجود کے نام ان کی اس کتاب میں اسی طرح آئے ہیں جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں،

حشر و نشر، جنت اور دوزخ اور واقعاتِ ما بعد الموت کے متعلق جہاں تک ان کی قدیم کلامی تصنیفات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی کلامی مشغولیتوں کے زمانہ میں ان چیزوں کو فقط روحانی سمجھتے تھے، مگر جب سے انھوں نے اوعرِ چند اخیر برسوں میں سیرۃ النبیؐ کے تعلق سے احادیث کا مطالعہ شروع کیا تھا، ان کے خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا تھا، ان کے ذہن و عقل کی دنیا ہی بدل گئی تھی، ان کے اس انقلاب میں علامہ ابن تیمیہ کی تصنیفات کو بھی بڑا دخل تھا،

بدعات سے ان کو ہمیشہ سے سخت نفرت تھی، بدعاتِ شعبان و محرم کا ان کے ہاں پتہ بھی نہ تھا، اسی طرح بزرگوں کے مزارات پر جا کر عوام جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں وہ ان کو شرک سمجھتے تھے، بلکہ بعض دفعہ وہ غصہ میں احتیاط سے آگے بڑھ جاتے تھے،

ایک بار ایک صوفی ان سے ملنے آئے، سلسلۂ کلام میں مولانا نے فرمایا کہ اجمیر وغیرہ کے بتکدوں کو گرا دینا چاہئے، اس وقت تو وہ صاحب خاموش رہے لیکن وہاں سے اٹھ کر آئے تو مولوی عبدالسلام صاحب ندوی سے کہا کہ ان حضرت کو مراق تو نہیں ہو گیا ہے، اگر ان کا یہ خیال تھا تو اُن کو میرے سامنے اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہئے تھا،

لطیفہ:۔ ایک دفعہ مولانا بمبئی سے اجمیر کے راستے سے لوٹے، اجمیر کے اسٹیشن پر پہنچے تو مجاور جو اسٹیشن پر زائروں کو لینے کے لئے آتے ہیں، مولانا کی طرف بڑھے، مولانا نے ان سے بے رُخی برتی تو انھوں نے کہا کہ یہ حضرت فرعون بے سامان معلوم ہوتے ہیں؛ مولانا نے فرمایا "ہاں میں تو فرعون بے سامان ہوں، مگر آپ فرعون باسامان ہیں"۔

الفاروق میں ایک ضمنی موقع پر لکھتے ہیں:۔ "اسلام نے شرک کو کس زور شور سے مٹایا لیکن غور سے دیکھو تو قبروں اور مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرزِ عمل ہے، اس میں آج بھی کس قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استمداد، عرض مقصود اور حصولِ برکت کے خوشنما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے"۔

الکلام میں مولانا نے ملحدین کے بہت سے اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات دئیے ہیں، بعض لوگوں نے دیدہ و دانستہ یا نادانستہ ان اعتراضات کو مولانا کے عقائد میں داخل کر لیا ۱۳۳۱ھ میں معاملاتِ ندوہ کی تحقیقات کے لئے دلّی میں جو جلسہ ہوا، اس میں بعض مخالف علماء نے ان ہی عقائد کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، اور ظاہر کیا کہ وہ مادہ کو قدیم اور غیر مخلوق اور نبوت کو کسبی سمجھتے ہیں، اس پر سید عبدالسلام صاحب مرحوم [illegible] ندوی

عکس تحریر مولانا شبلی مرحوم

(متعلقہ صفحہ ۳۰۲)

آپ نے جو عقائد لکھے ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد میں سلام

اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں

شبلی

۹ مئی ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی کی غزل خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی

غزل

هر جا که روی روشن تو جلوه ساز بود
هر ذره را نظر به جمال تو باز بود

هر جا حدیث فتنهٔ ایام کرده‌ایم
روی سخن به آن نگه فتنه ساز بود

جانا زبان و لب نشود ترجمان دل
ما را امید ها ز نگه‌های راز بود

آن شوخ را به وسوسه‌ها چون گذر فتاد
یکباره عشق‌های حقیقی مجاز بود

با چرخ سفله صحبت آن شوخ در گرفت
کو فتنه دوست بوده و این فتنه ساز بود

ما خود سر نگه به رندی و مستی نداشتیم
این‌ها گناه دیدهٔ معشوقه باز بود

مستور و رند هیچ یکی سر به در نبرد
زان حلقه‌ها که در خم زلف دراز بود

لذت شناس رندی و مستی نبوده است
آن بوالهوس که در گرو غمزه و ناز بود

گفتم معاش هر سخن از مدعا نه نیست
شبلی نمونهٔ اول راز و نیاز بود

دہلی نے مولانا سے اس کے متعلق سوال کیا، مولانا نے اس کا یہ جواب لکھا :- "جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے، اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں، نہ قدیم بالزمان، البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں،

الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں، تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں، اور اس غرض سے نقل کئے ہیں، کہ اُن کا رد کیا جائے،

نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے، اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں، اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا، باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف، اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت وجماعت سے ہوں :"

اس اعلان میں آخری سطریں یونہی چھپی ہوئی ہیں، مگر چونکہ میں اس واقعہ کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اس لئے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا اس کی اخیر سطریں انھوں نے یہ لکھی تھیں، جو اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب میرے پاس ہیں :- "باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں، میں عقائد اسلام اور مسائل فقیہ دونوں میں حنفی ہوں :" شبلی ۹ مئی ۱۹۱۰ء

فوٹو

وعد مما يستظرف ان يكون حنفياً اشعرياً۔ یعنی یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی شخص حنفی
ہو کر اشعری ہو، (علم الکلام ص [illegible])

اس کے بعد مصنف نے ماتریدیہ کے ان عقائد کی فہرست دی ہے، جن میں وہ اشاعرہ
سے الگ ہیں،

مولانا مرحوم اپنی کتابوں میں سے علم الکلام کو بہت ناقص سمجھتے تھے. فرماتے تھے کہ مجھ کو
افسوس رہ گیا کہ جس تفصیل سے اشاعرہ کے علم کلام کا ذکر میں نے کیا، ماتریدیہ کا کیوں نہیں کیا؟
اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ انھوں نے اس کتاب کو علالت کے زمانہ میں لکھا جس کے
سبب سے پوری تفصیل نہ کی جا سکی، اور شاید یہی وجہ ہو کہ علماے احناف نے علم کلام پر بہت
کم کتابیں تصنیف کیں، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:- "ماتریدیہ کی گمنامی کی وجہ یہ ہوئی کہ علماے حنفیہ
نے علم کلام میں بہت کم تصنیفات کیں، اس فن میں جس قدر مشہور اور معرکہ آرا کتابیں ہیں وہ شافعیہ
کی تصنیفات ہیں، جو عموماً اشعریہ تھے، (علم الکلام ص ۵۰)

فروری ۱۹۰۵ء میں شیخ عبدالقادر صاحب (پونہ) مولانا سے ایک کلامی مسئلہ کی
تشریح چاہتے ہیں، وہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:- "جملہ مستفسرہ اشاعرہ کا عقیدہ ہے،
اشاعرہ سنی فرقہ کی ایک شاخ ہے، لیکن اب تو تمام سنی اسی حماقت میں گرفتار ہیں، خیر اس فقرہ کو رہنے
دیجئے گو میرے ذاتی عقیدہ کے خلاف ہے" (۴)

اس خط پر میرا حاشیہ ہے جو ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا ہے،

"عقائد میں (مولانا) ماتریدیت کو ترجیح دیتے تھے"

بہرحال اہلسنت کے یہ دو مقابل کے فرقے تھے، علامہ سبکی جو مشہور اشعری ہیں، شرح عقیدۂ ابن حاجب میں لکھتے ہیں :-

وبالجملة هم (اى اهل السنة) بالاستقراء ثلاث طوائف الاول اهل الحديث ومعتقد مباديهم الادلة السمعية والثانى اهل النظر العقلي الصناعة الفكرية وهم الاشعرية والحنفية وشيخ الاشعرية ابو الحسن الاشعرى وشيخ الحنفية ابو منصور الماتريدى

(اتحاف السادة ج ۲ ص ۶)

حاصل یہ کہ اہل سنت کے تین گروہ ہیں، پہلا گروہ اہل حدیث ہے، اور اُن کے اصول کی بنیاد نقلی دلیلوں پر ہے، اور دوسرا گروہ عقلی اور فکری علم و استدلال والے، اور وہ اشعریہ اور حنفیہ ہیں، اشعریہ کے امام ابو الحسن اشعری، اور حنفیہ کے امام ابو منصور ماتریدی ہیں،

یہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اُسی طرح باہم مختلف اور دست و گریباں ہیں، جس طرح اسلام کے اور دوسرے فرقے، گو ان میں صلح پسندوں کے بیچ بچاؤ سے کبھی کبھی روک تھام بھی ہوتی رہی، ان اختلافات کی شدت کی صحیح حیثیت اگر کسی کو دیکھنی ہو تو امام ماتریدی کی شرح فقہ اکبر (منسوب الیہ) امام فخر الاسلام بزدوی کی کتاب العقیدہ، ابو شکور سالمی کی کتاب التمہید، ابن ہمام کی مسایرہ، اور متاخرین میں ملا علی قاری کی شرح فقہ اکبر دیکھئے،

جن مسائل میں حنفیہ اور اشعریہ کا اختلاف ہے، اُن میں چند مسائل حسب ذیل ہیں :-

۱- اللہ تعالیٰ کے صفات فعلیہ جیسے خلق و رزق و رحمت وغیرہ اشعریہ کے نزدیک حادث ہیں، اور ماتریدیہ کے نزدیک تمام صفات الٰہی قدیم ہیں،

۲- اشیا میں حسن و قبح اشعریہ کے نزدیک فقط شرعی ہے، اور ماتریدیہ کے نزدیک شرعی کے ساتھ عقلی بھی ہے،

۳- اشعریہ کے نزدیک بندوں میں اپنے افعال پر جو قدرت ہے وہ وہی ہے اس کو افعال کے صدور میں کوئی دخل و تاثیر نہیں، ماتریدیہ کے نزدیک بندوں کی قدرت کو اُن کے افعال کے صدور میں دخل و تاثیر ہے، اور اسی لئے اُن سے مواخذہ ہے،

۴- ماتریدیہ کے نزدیک خدا جس طرح جور و ظلم سے اور جو صفات اُس کے شایانِ شان نہیں اُن سے شرعاً پاک ہے، اسی طرح عقلاً بھی پاک ہے، اشاعرہ کے نزدیک شرعاً پاک ہے، عقلاً نہیں،

۵- ماتریدیہ کے نزدیک خدا نے اپنے احکام اپنے بندوں پر اپنی رحمت سے مصالح اور حکمت پر مبنی کئے ہیں، اشعریہ کے نزدیک مصالح و حکمت پر مبنی نہیں،

۶- ماتریدیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اشیا میں خواص اور تاثیرات ودیعت کی ہیں، اشاعرہ کے نزدیک اشیا میں کوئی خاصہ اور تاثیر نہیں، اللہ تعالیٰ ضرورت کے وقت اُن میں تاثیر پیدا کرتا ہے،

۷- ماتریدیہ کہتے ہیں کہ خدا کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا، اشعریہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ وہ دے سکتا ہے بلکہ اس نے دی ہے،

۸- ماتریدیہ کے نزدیک ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا، اشاعرہ کے نزدیک ہوتا ہے،

مولانا شبلی نے علم الکلام اور الکلام دونوں کتابوں میں طرح طرح سے اشاعرہ پر گلے

کئے ہیں، اور بڑے زور شور سے اُن کے دلائل کا رد کیا ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشاعرہ کا رد انھوں نے معتزلہ کی حمایت میں کیا ہے، حالانکہ یہ معتزلہ کی حمایت میں نہیں، بلکہ ماتریدیہ کی حمایت میں ہے، البتہ اُن کا قصور یہ ہے کہ وہ اس مخالفت پر بھی اپنی کلامی تصنیفات میں اشاعرہ کے چکر سے نہیں نکل سکے، اور امام غزالی اور امام رازی کی گرفت میں، جو راس الاشاعرہ ہیں، عرصہ تک رہے،

امام غزالی اور امام رازی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے عام رسائل میں اشعریت کا شدّ و مد سے التزام کرتے ہیں، حتیٰ کہ امام رازی تفسیر میں کسب کیا جبر تک کے ثابت کرنے کے لئے قدم قدم پر رُکتے ہیں، مگر وہ مطالب عالیہ وغیرہ مخصوص کتابوں میں بلکہ تفسیر میں بھی بعض حقائق کی حکیمانہ تشریح میں اشعریت کی کوئی پروا نہیں کرتے، امام غزالی کبھی معتزلہ کے ہم زبان ہوتے ہیں، کبھی صوفیہ کے، کبھی حکما کے، یہی سبب ہے کہ قاضی ابن رشد نے اپنی کتاب کشف الادلہ میں امام غزالی کی نسبت جل کر یہ لکھدیا کہ "ابو حامد غزالی کا کیا کہنا وہ اشعریوں کے ساتھ اشعری، معتزلیوں کے ساتھ معتزلی اور صوفیوں کے ساتھ صوفی ہیں:"

امام غزالی کی کتابوں میں سے جواہر القرآن، المنقذ من الضلال، التفرقہ بین الاسلام والزندقہ، المضنون بہ علی غیر اہلہ وغیرہ ابتدائی کلامی رسائل مولانا کے زیر نظر ہے، اور ان دونوں اماموں کی انہی تصانیف سے مولانا نے اُن کے ان خیالات کو چن لیا ہے جو آجکل کے خیال اور مذاق کے مطابق ہو سکتے تھے، اور یہی اُن کا علم کلام ہے،

غرض الکلام لکھتے وقت اُن پر سب سے زیادہ غزالی کا اور پھر رازی کا اثر تھا، لیکن

اس کے بعد جب علامہ ابن تیمیہ کی کتابیں چھپ چھپ کر آنے لگیں تو علامۂ ممدوح کا اثر اُن پر غالب آنے لگا، اس اثر کا آغاز علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الرد علی المنطقیین" سے شروع ہوا، اور آخر یہاں تک بڑھا کہ وہ جولائی ۱۹۱۳ء میں یعنی وفات سے چار ماہ پہلے مجھے لکھتے ہیں کہ "تم نے شروع کر دیا تو خیر ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی وغزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، اُن کی تصنیفات میں ہر روز نئی باتیں ملتی ہیں" (ص-۸۴)
آخر میں مجھ سے فرماتے تھے کہ "میں اب ہر چیز میں ابن تیمیہ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کو تیار ہوں"
آخر زمانہ میں اُن میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہو گئی تھی، اسی زمانہ میں بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں، ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن صاحب[1] جن سے مولانا کے بھائی مولانا حمید الدین صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کی عربی پروفیسری کے زمانہ میں جو شاید ۱۹۱۰ء ہو، بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی، مگر ان کو مانتے تھے،

مولانا کے اخیر زمانہ کی فارسی غزلوں میں خواجۂ شیراز کی شراب کا رنگ صاف نظر آتا ہے، اس کو دیکھ کر بعض صاحبوں کو خیال ہوا تھا کہ مولانا پر تصوف کا رنگ آ رہا ہے، اور

---

[1] کوڑہ جہاں آباد وطن تھا، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے فیض حاصل کیا تھا، لکھنؤ میں شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد میں قیام فرمایا تھا، وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں، لکھنؤ کے بہت سے تعلیم یافتہ صاحبوں نے ان سے تربیت پائی، اور بہت سے شہروں میں ان کے فیض روحانی نے وسعت حاصل کی، خاکسار کو بھی ان کی زیارت سے بارہا سعادت ہوا،

اس کی تلاش تھی کہ اُن کی اس شرابِ حقیقت کا پیرِ مغان کون ہے، مگر یہ واقعہ نہ تھا، تاہم اتنا درست ہے کہ فلسفہ و حکمت کا نشہ اُن کے سر سے اُتر چکا تھا، اور یہ کہنے لگے تھے:۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالکؔ را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایمان ہم

فلسفی سرِّ حقیقت نتوانست کشود
گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

لطیفہ:۔ سنہ ۱۹۱۳ء کے شروع میں جب اصلاحِ ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا، تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے حلقۂ مشائخ میں، انھوں نے تصوف پر تقریر فرمائی، جو بڑی جامع و مانع و مؤثر تھی، تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف نقالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔[1]

اسی زمانہ میں دلی میں اہلِ حدیث کے زیرِ اہتمام ایک مجلس میں توحید پر ایسا عمدہ، مدلل اور مؤثر بیان فرمایا کہ خود اہلِ حدیث، اس نمانی حنفی کی پاکیزہ توحید سے متاثر نظر آتے تھے، اگر کچھ، وہ زندگی اور وفا کرتی تو عجب نہیں کہ یہ قال حال بنجاتا، اور جو انقلاب روحانی گذشتہ مشکلوں کے حالات و خیالات میں پیش آیا وہ چودھویں صدی کے اس متکلم میں بھی نظر آتا جس کے آثار اُن میں روز بروز نمایاں تر ہوتے چلے جاتے تھے، شاید اسی عالم میں یہ فرمایا ہو،

ساختم زندگیم حیف کہ جز دردِ نداشت
جز ہمیں تجربۂ آخر کہ بپایاں زدہ ام

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ناقل ہیں کہ جس زمانہ میں مولانا الکلام لکھ رہے تھے

[1] بروایت مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی، ڈونیز کا لفظ سن کر ہنس گئے، یہ مولانا کے آخری زمانہ میں ندوہ میں زیرِ تعلیم

متکلمین نے وجود باری پر عقلی دلیلیں قائم کی ہیں اُن میں سے ہر ایک کے ضعف و قوت
پر تنقید کر رہے تھے ایک دن ایک صحبت میں انھوں نے اقبال صاحب سے فرمایا کہ تم وجود
باری پر کوئی مضبوط عقلی دلیل دے سکتے ہو؟ انھوں نے متداول عقلی دلیلیں پیش کیں، مولانا
نے ایک ایک کی کمزوری ظاہر کر دی، اسی طرح وہ دیر تک ایک کے بعد دوسری دلیل
پیش کرتے رہے، اور مولانا اُن کو توڑتے رہے، آخر میں انھوں نے تھک کر کہا کہ "اچھا تو
اس کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعویٰ کیا وہ معاذ اللہ غلط اور جھوٹ ہے؟"
ان الفاظ کا سننا تھا کہ مولانا پر تاثیر کا ایک عالم پیدا ہوا، اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو
جاری ہو گئے، اور دیر تک روتے رہے، اور جب ذرا سکون ہوا تو اُن سے کہا: "عزیز من

ع با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار صلی اللہ علیہ وسلم

اصل یہ ہے کہ مولانا وجود باری کی ان فلسفیانہ دلیلوں کو جن کو متکلمین نے پیش کیا
ہے، اعتراضات اور شبہات سے بری نہیں سمجھتے تھے، وہ وجود باری کے اقرار کو فطری
کہتے تھے، اور اس کو دلیلِ منطقی کا محتاج نہیں سمجھتے تھے، اور اس کے لئے قرآن پاک نے جو
بیّن شہادتیں پیش کی ہیں، اُن ہی کو مفید یقین تصور کرتے تھے، چنانچہ الکلام میں بحث کے
خاتمہ پر لکھتے ہیں:- "آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہو گئی ہے جبکہ کائنات کے سیکڑوں
اسرار فاش ہو گئے ہیں، جب کہ حقائق اشیاء نے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے، بڑے بڑے
فلاسفر اور حکما انتہا سے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں یہی استدلال پیش کر سکے، جو قرآن مجید نے
تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔"

الکلام مطبوعہ … طبع اول

اور یہی صحتِ ایمان کا وہ اخیر نقطہ ہے جس پر امام جوینی، امام غزالی اور امام رازی، بلکہ حکیم ابنِ رشد بھی جو عمر بھر عقلی دلیلوں کی جمع و ترتیب میں سرگرداں رہے، بالآخر رُکے تھے، اور اُسی پر اُن کا خاتمہ ہوا۔

یہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ہے، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه یہ کہ

حضرت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ اُن کو جو غیر معمولی شیفتگی ہمیشہ سے تھی، جیسا کہ سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں علانیہ فرمایا، شیفتۂ نیم و پیمبر پرست وہ سیرتِ نبوی کی تالیف و تصنیف کے زمانہ میں جوں جوں آگے بڑھتے جاتے ترقی کرتی جاتی تھی، احادیث کے مطالعہ نے اُن میں روحانیت کی ایک سرخوشی پیدا کردی تھی، اور آخر میں ہمیشہ اسی پاک شراب کے نشہ میں مخمور رہتے تھے، چنانچہ اس زمانہ میں اخلاقی نظموں کا جو سلسلہ اُنھوں نے شروع کیا تھا وہ اسی ذاتی اور وجدانی حالت کا نتیجہ تھا یہی سلسلۂ وفات میں، اور آپ پڑھ چکے کہ مرتے وقت بھی جو چیز اُن کے لبِ ناتوان پر بار بار آتی تھی وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی،

تمہارے نام کی رٹ ہو خدا کے نام کے بعد

آخر اُن کی یہ پیشین گوئی بھی جو اسی سال کی تھی پوری ہوئی،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

دو سال پہلے ۱۹۱۲ء میں ایک ادب نواز دوست کو کس حسرت سے لکھا تھا۔

"شعرالعجم اب کہاں، ایک آنکھ میں پانی اترآیا، دوسری بھی ضعیف ہوگئی، سیرت پر خاتمہ ہو جائے تو یہ حسنِ خاتمہ ہے۔"[1]

بحمداللہ کہ یہ دعا قبول ہوئی اور محبوبؐ کی سیرت ہی پر خاتمہ ہوا جو حسنِ خاتمہ کی نشانی ہے۔

خاتمہ ناظرین! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثنا میں آپکے اس شریکِ سفر اور رفیقِ نظر نے ایک مجمعۂ علم و فن اور پیکرِ خدمتِ دین وقت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوریوں کی جھائیاں بھی ہوں گی، لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آئیے ہم اور آپ اس کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ،

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۳۰ اپریل ۱۹۴۱ء

شبلی منزل اعظم گڑھ



[1] مکاتیب ۲ - مہدی ۷۶،

مراثی و قطعات

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اخبارات و رسائل میں اس کثرت سے مرثیے اور تاریخی قطعے شائع ہوتے رہے کہ اُن کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے لیکن اس موقع پر اُن چند خاص مرثیوں اور تاریخی قطعوں کا ضمیمہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُن کے خاص عقیدتمندوں نے لکھے ہیں، اور جو اُن کی زندگی کے سوانح کے بیان میں تکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں،

مرثیہ فارسی

از

مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ اعظمگڑھ

جائے نشاط در چمن روزگار نیست / آنجاست سرو جنبشِ باد بہار نیست

گو لالہ کہ داغِ جگر در نہاد داشت / گو غنچہ کہ چاکِ دلش آشکار نیست

خونی است تو بتو کہ گلش نام کردہ اند / زہریست سربسر کہ زوائین سبزہ زار نیست

سنگ است دیدہ گر زغم اشکش نمی چکد / کو راست دل گرش نگہِ اعتبار نیست

زنہار چشمِ دل بفریب خرش مدوز / دنیا عجوزہ ایست عروسِ نگار نیست

بنیاد کاخ عمر به بادے نهاده اند
آرے بنا به باد تو دانی قرار نیست

در کاروان سرا نتوان خانه ساختن
خود این زمانه چیست اگر رهگذار نیست

پائے کزین خرابه رود در غش منال
آگاه کاخ را اساسِ بقا استوار نیست

ابرو گشاده دار به شیون مسنج دهر
دانی که نوش و نیش جهان پایدار نیست

نتوان چو جام عیش درین خاکدان زدن
بر تلخیِ زمانه نیز زد و فغان زدن

لیکن کنون که سیلِ حوادث ز سر گذشت
باید ز شیون من بیچاره در گذشت

بگذار تا به ناله دل از غم تهی کنم
کارم کنون ز سعی تو اے چاره گر گذشت

پیچد به خود ز تلخ نوائی من که باز
زهر آبهٔ غم ز گلو تا جگر گذشت

چون کعبه گر سیاه بپوشیم می سزد
کان نقشبندِ سیرتِ خیر البشر گذشت

آواره گشته گله و چوپان بخواب رفت
در ره بماند قافله و راهبر گذشت

آرے اگر ز دولت نگرانند بکاب ترم
بارے ببین چه بر سرِ علم و هنر گذشت

زیبا اگر فتد علم علم سرنگون
کز کشور کمال شهِ دادگر گذشت

زینت گر بجز که جهان برگ و ساز بود
بارش نگر که گنبد و چرخ سپهر گذشت

نالم به دجله باری فرمان ما مگیر
کاین گریه نیست بهر عزیزی که برگذشت

ما این فغان به بیکسیِ علم و فن کنیم
یا شیونے به زندگیِ خویشتن کنیم

دانشور یگانه به دار القرار شد
زیبد اگر جهان همه اش سوگوار شد

باد سحر به ماتم او آه برکشید
چشم ستاره در غم او اشکبار شد

دانشوران دهر به ماتم نشسته اند
کز روزگار نادرهٔ روزگار شد

تاریخ نهضت ساقی میخانهٔ علوم
آب بقا به کام خضر ناگوار شد

دردا که گنجدار معارف ز دهر رفت
واحسرتا که شبلی معجز نگار شد

ای جهل شاد باش که گیتی به کام تست
وے علم خون بشو که در دفت فگار شد

آوخ که همچو گنج به خاکش نهان کنند
کز وے هزار گنج نهان آشکار شد

گلزار دین که از نم کلکش بهار داشت
بی برگ مانده است که آن آبیار شد

عیسی دمے که جان به تن مردگان دمید
آخر چه شد که خود ز جهان برکنار شد

خفته ز خواب را همه هشیار کرد و خفت
بخت هنر به زمزمه بیدار کرد و خفت

دردا که وجه نازش اهل جهان نماند
فخر زمین ز عربدهٔ آسمان نماند

اکنون که جامه گوی نظیری نظیر برد
در شیوهٔ سخن شرف هندیان نماند

یکتا گلے که باد بهار گذشته داد
آن هم کنون ز غارت باد خزان نماند

از صرفه پاست ماتم رازی و ابن رشد
کان یادگار دانش پیشینیان نماند

دردا که باز دامن اردو زبان تهی است
گلکے که بود شاخچهٔ گلفشان نماند

دریوزهٔ شرار غمے از کجا کنیم
کان دل که بود در غم ملت تپان نماند

آوخ که باد رفته چه سازند و چون زیند — اکنون که خضر جادهٔ اسلامیان نماند

چرخ خمیده پشت چه جوئی نظیر او — کان نیک گلی چو او سر این گلستان نماند

سیرت نه شد تمام و دریغا که کس ز ما — شایستهٔ نگارش آن داستان نماند

تخمی فشانده بود و برش بر نچیده رفت
شاخی نشانده بود و بهارش ندیده رفت

ای شمع جمع فضل که از ما جدا شدی — ما را به غم گذاشته آخر کجا شدی؟

بیگانگان کمال تو نشناختند حیف — زین رو مگر به بزمگه آشنا شدی؟

شاید که تیر علم به گردون هم آرزوست — کاین خاکدان گذاشته سوی سما شدی

دانست کسی نه داد هنر از جهانیان — کای دادخواه قوم به پیش خدا شدی

در بارگاه قدس مگر شاعری نبود — تا بهر نعت خوانی حمد و ثنا شدی

در بزم هست حاجت تحقیق نکته — تا خوشنوی به بارگه مصطفی شدی

یا جلوهٔ بی حجاب تماشاست کز جهان — مستانه وار در حرم کبریا شدی

ما غافلان هیچ نه پرسی ز حال ما — آخر کنون چه شد که تو ناآشنا شدی

بی خسته را به منزل مقصود هم رسان — آخر نه خود ز لطف و کرم رهنما شدی

ای راهبر بیان که شتابت نمی سزد
تو بخت قوم بستی و خوابت نمی سزد

غافل ز حال ملت بیضا مگو مرا — خامش درین قیامت صغری چگونه‌ای

ما خاکیان به ماتم تو خاک بر سریم
تو بر فراز چنبر مینا چگونهٔ

اینجا دلت طپید به هجران مصطفیٰ
در خلوت وصال بفرما چگونهٔ

در فکر قوم سیر چمن خوش نداشتی
در حیرتم بخلد شکیبا چگونهٔ

اهل جهان بحسن کلام تو کی رسند
در بزم خلد انجمن آرا چگونهٔ

در چار دانگ دهر نظیرت نداشتی
اینجا یگانه بودهٔ آنجا چگونهٔ

ما بی تو هم چو عسکر بی شاه مانده‌ایم
ای تاجدار فضل تو بی ما چگونهٔ

با خاکیان تیره درون سخت زیستی
با قدسیان عالم بالا چگونهٔ

دیر است تا ز حال تو آگاه نیستیم
بارے بگو بجاگزخود تا چگونهٔ

وقت است سرورا که سر از خواب بر کنی
بر حال خستگان به عنایت نظر کنی

بنگر که حال ما بفراق تو چون شده است
از دیده خواب رفته و از دل سکون شده است

هر نقش آرزو که برانگیختم ز دل
چون رشته نگاه کنون غرق خون شده است

آن ندوه کز فیوض تو صد کمال بود
هر خام را ستیزه گه آزمون شده است

وان [illegible] که همت تو داده اش وجود
یکسر خراب و خسته و خوار و زبون شده است

باغی کز آبیاری تو خرمی گرفت
تاراج فتنه سازی چرخ حرون شده است

جایی که جز به باده نابش گذاشتی
چون کاسه سپهر دگرواژگون شده است

دار المصنفین که بهشت فیوض تست
می سود سر به چرخ مگر بی ستون شده است

بدخواہِ دین کہ چید اساسِ حصارِ کذب
تو چون کلیمِ طور نشینِ وصال و قوم

باز از گلولہ باریِ کلکت مصون شدست
از سادگی فریفتۂ ہر فسون شدست

برخیز و باز لطف بہ اہلِ نیاز کن
بر ما درِ خزینۂ تحقیق باز کن

نوحۂ استاذ

از

خاکسار سلیمان ندوی

اے متاعِ عزتِ پیشین کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبالِ گذشتہ! مقطعِ عہدِ سلف!
شمعِ بزمِ صحبتِ آخر! نشانِ رفتگاں

غنچۂ فصلِ بہیں! موجِ نسیمِ صبحدم!
نغمۂ آخرِ سحر! مرغِ گلستانِ خزاں

علم و فن کا عشق تھا جسکی طبیعت کا خمیر
صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جسکی ہر فریاد تھی صوتِ درائے کارواں

جس کی ہر رائے رزیں آزادیٔ ملت کا علاج
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں

جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جسکی رگ رگ میں تھیں سوزِ دروں کی چنگاریاں

جس کے ہر مصرع میں سوزِ آتشِ زخمِ دروں
جس کے ہر فقرہ میں مخفی مرہمِ دردِ نہاں

جس کے نامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریائے عماں

پیکرِ آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ در | یکہ تازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لئے وہ آہ! ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا ناخدا اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیبِ دلفگار | جس کی دولت لٹ گئی کب اُس کو دل پر قابو تھا
جانتا ہوں ہر بشر کو رہروِ عاجل سفر | جانتا ہوں زندگی کو اک بنائے مستعار
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا | پھر دلِ اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار
یاد آئے جب وہ اُس کا فقرۂ نا مختتم | آہ حسرت! آہ حسرت چھوڑ کر سب کاروبار
اُس طرف لب توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل | اُس طرف جاں مبتلائے رنج و دردِ احتضار
پھر نہ کس طرح پُر شور ہو قلبِ مضطرب | کس طرح رک جائے خونابِ چشمِ اشکبار
اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں | پوچھ لوں اے احمدِ مختار کے سیرت نگار
تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں | کچھ طریقِ نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار
جب سوادِ خط ترا آئے گا آنکھوں کو نظر | کس طرح پائے گا قلبِ مضطرب صبر و قرار
اہلِ میت اک توقف! پوچھ لوں آقا سے میں | میرے آقا میں فدا! اور جاں بھی تجھ پر نثار
تو نے فرمایا کہ تاریخِ عرب تحریر ہو | ہو چکی تعمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار

بہرِ تسکینِ دلِ بے صبر کچھ فرمائیے
میرے آقا پھر ذرا سحرِ بیاں دکھلائیے

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں | کون پھونکے گا اب مُردے بے جاں فقروں میں جاں

رکنِ امیّد جو تھا آہ وہ جاتا رہا — جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں
ب پر پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے — پست مضمون کون پہنچائیگا اب تا آسماں
ون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن — کون سمجھائیگا رمزِ حسنِ اسلوبِ بیاں
ون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوے قلم — کون دیکھیگا مری جولانیٔ طبعِ رواں
ون نامہ میں کرے گا اب عزیزی ہی خطاب — کس کا تم کہنا بڑھائیگا مری توقیر و شاں
س کے نامہ کا بناؤں اب میں عنوانِ خطاب — "سیدی" "مولائی" "استاذی" "عزالی الزماں"
س کی مجلس بھی تماشا گاہِ اربابِ نظر — آہ اے دستِ اجل تونے مٹایا وہ سماں
یں نے جب پوچھا بتائے اُس نے ہر فن کے رموز — اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستاں
ب اُسے دکھائی رُخِ گل پیدا ہوئی — اُس کی باتیں جب سنیں پائی نئی آب و تواں

اس دلِ پُرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر کچھ زور تھا تو اس سے تھا

یرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر — کمسنی ہے سہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر
چھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں — رو کے مچلے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر
یا ابھی جانیں یہ خونناب فشانیٔ چشم کی — کس طرح سمجھائیں اُن کو صدمۂ داغِ جگر
وجوان جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو — ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزمِ سفر
س ہوس سے تونے اُنکی تربیت فرمائی تھی — آہ کس اُمید سے تونے لگائے تھے شجر
اغباں کیا ڈک نہیں سکتے ہو اگلی فصل تک — لوگ کہتے ہیں کہ ابکی لائیں گے یہ برگ و بر

عاقبت پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور
جب کبھی باہر ہوا جانا تو ان سے مل گئے
اُن کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی
اور اگر کارِ ضروری ہو کہ ٹل سکتا نہیں

اب تحمل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال و پر
وعدۂ دیدار کیوں اٹھا رکھا ہے اب حشر پر
ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لئے عزمِ سفر
غرض اتنی ہے کہ ہو اُن کی یتیمی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہو دُور

عزمِ اہم

تو نے جب چھیڑا ہو کوئی سخت یا آسان کام
مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درس گاہ
شائقِ فن کے لئے سامانِ تکمیلِ علوم
تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے
ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور
کام ادھورے ہیں بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر

نا پسند آیا ہو اس کو چھوڑ دینا ناتمام
جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام
اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام
نشرِ دیں، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقفِ عام
تیرے ہاتھوں سے ابھی پانا تھا جن کو انصرام
اس قدر تو ہو توقف اُن کا بن جائے نظام

لوگ ٹھہرائیں جنازہ پوچھ لوں بھولا نہ ہو
یا ہو اس وقت اور عالم میں کہیں ایسا نہ ہو

کوچ ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غم خوار کا
شغلِ دائم جس کا تھا غمخواریِ دینِ مبین
وقفِ ماتم جو رہا جب تک کہ نہیں جاں رہی

کون ہو اب چارہ ساز اس ناتوان بیمار کا
اب تو داغِ دائمی ہوتا ہے اس غم خوار کا
کون اب ماتم کرے اس جانِ ماتم کار کا

قطعاتِ مرثیہ و تاریخ

از

ہیچمدان سلیمانؔ

کون کہتا ہے کہ زیرِ خاک ناپیدا ہوا	شبلیِ سیرت نگار مرقعِ قدسی سرشت
عشقِ پیغمبر میں فرقت سے بہت بے چین تھا	لے گیا ہے شوقِ دیدارِ نبیؐ سوئے بہشت
فلک پہ دھوم ہوئی عاشقِ رسولِ امم	سوانحِ نبوی کر رہا ہے خوب رقم
ہوا یہ حکمِ الٰہی مجھے پسند آیا	حضور میں اسے لاؤ بصد وقار و حشم

برائے لوحِ مزار

سعدیِ عصر و غزالیِ زماں، خلدونِ وقت	شبلیِ نعمانیِ دانا گہر عالی سرشت
سیزدہ صد بود و سی و دو و روزِ تخمین چہار شنبہ ۱۳۳۲ھ	بست و ہشتم ماہِ ذیحجہ کرد ایں منزل بہشت ۳۰ ذیحجہ

قطعۂ تاریخ

از مولوی سید احمد مرتضیٰ نظرؔ صاحب وکیل سرونج (مالوہ) مؤلف آثارِ مالوہ و لغت و شمشیر شاہی

چو علامہ شبلیِ پاک باطن	بحکمِ الٰہی ز دارِ فنا رفت
نظرؔ ہاتفِ غیب سالِ وفاتش	بگفتا کہ "شبلی بدارِ بقا رفت" ۱۳۳۲ھ

ضمیمہ (صفحہ ۵۰۵ کے بعد)

ناگپور یونیورسٹی میں مشورہ سنہ ۱۹۱۳ء

ناگپور یونیورسٹی یعنی صوبہ متوسط و برار کی یونیورسٹی جس کا صدر مقام ناگپور ہے۔ اس وقت تجویز و خیال کی منزل میں تھی مسٹر جونس اس زمانہ میں وہاں کے ڈائرکٹر اور اس تجویزی کمیٹی کے سکرٹری تھے، موصوف نے مولانا کو ۲۰۔ اگست سنہ ۱۹۱۳ء کو حسب ذیل سرکاری چٹھی لکھی:

"آپ شاید واقف ہوں گے کہ صوبہ متوسط اور برار کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی گئی ہے اور اس کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، مقامی حکومت کی طرف سے اس اُمید کا اظہار کیا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کمیٹی کی امداد کریں گے۔

مجھ کو آپ تک یہ اطلاع پہنچانے کی ہدایت دی گئی ہے کہ عربی اور فارسی کی تجاویز کے لئے ایک سب کمیٹی کی تشکیل ہوئی ہے اور غالباً اس کام کی تکمیل کے لئے آپ کی امداد اور مشورے کی ضرورت ہو، آپ سے امداد اس سے زیادہ نہیں لی جائے گی کہ آپ بعض مسائل سے متعلق خطوط کا جواب دیں، ان مسائل کے متعلق آپ کی معلومات اور تجربے قیمتی ہوں گے، اس لئے میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ اس قسم کی ضرورت پیش آئی تو کیا آپ خطوط پاکر جواب دینے پر رضامند ہوں گے۔

اُمید ہے کہ اس کا جواب ۵ ستمبر تک رحمت فرمائیں گے۔"

مولانا نے اس کا جواب ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۳ء کو دیا مگر یہ وقت مولانا کے لئے بڑی مصیبت

کاتھا، اور چند ہی مہینوں کے بعد وفات پائی، اس لئے مجھے امید نہیں کہ انھوں نے اس یونیورسٹی کے مشرقی صیغہ کی تشکیل میں کچھ زیادہ مشورے دیئے ہوں گے۔ یونیورسٹی کا یہ خاکہ چند برس میں تکمیل کو پہنچا، اور ۱۹۱۸ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، نیز اس کا مشرقی صیغہ جو عربی و فارسی و اردو پر مشتمل ہے نامور ہے، اور اس کو یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ علامہ شبلی کی تجاویز کا بھی کسی حد تک ممنون ہے۔